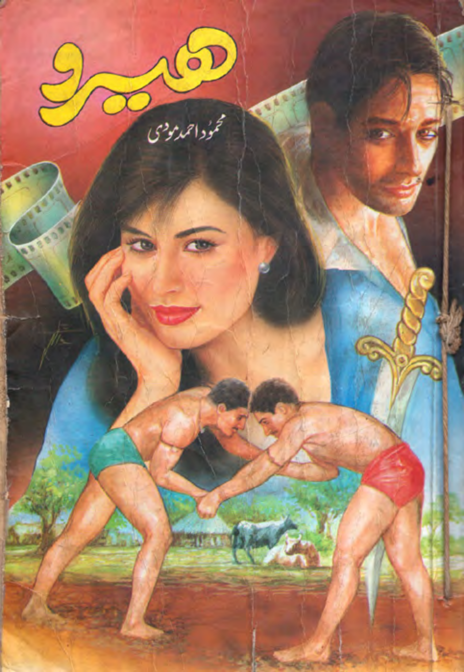

ھیرو
محمود احمد مودی

بار اوّل ـــــــــ ۱۹۹۹ء
مطبع ـــــــــ یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
قیمت ـــــــــ ۸۰/- روپے

ISBN 969-8429-60-3

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال
لاہور فون: ۷۲۲۳۸۵۳

پیش رس

"ہیرو" کتابی شکل میں حاضر خدمت ہے۔

سب سے پہلے یہ کہانی "اشارہ ڈائجسٹ" میں جس کے مدیر مرحوم اظہر کلیم تھے، شائع ہوئی تھی۔ اشارہ ڈائجسٹ نیا ڈائجسٹ تھا اور اس کی مقبولیت میں اس کہانی کا بڑا حصہ رہا۔

اپنی وفات سے کچھ عرصے قبل اظہر کلیم مرحوم میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ کہانیوں اور رسالوں کی نشر و اشاعت سے میں تائب ہو گیا ہوں اور یہ کام میں نے ختم کر دیا ہے۔ میری خواہش تھی کہ کہانی "ہیرو" کتابی شکل میں شائع ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین پڑھ سکیں اور اس لیے میں نے کتابی شکل میں اس کی کاپیاں بھی تیار کر لی تھیں لیکن چونکہ اب میں کوئی کتاب شائع نہیں کروں گا اس لیے آپ یہ کہانی مجھ سے لے لیں اور اسے اپنے ادارے "کتابیات پبلی کیشنز" کے تحت شائع کر دیں۔

اس وقت کتابیات پبلی کیشنز وہ واحد ادارہ تھا جو ڈائجسٹوں کے سلسلوں کو کتابی شکل میں شائع کرتا تھا اور یہ ریت اسی ادارے نے ڈالی تھی۔

پھر معاوضے کی بات آئی تو مرحوم نے ایک رقم بتائی۔ میرے اور اظہر کلیم کے انتہائی بے تکلفانہ و مخلصانہ تعلقات تھے اس لیے معاوضے کے بارے میں میں کوئی سودے بازی نہیں کر سکا اور ان کی مطلوبہ رقم میں نے اسی وقت بصورت چیک انہیں ادا کر دی اور کتاب کی کاپیاں جو وہ ساتھ ہی لائے تھے لے لیں۔

اس وقت کئی سلسلے کتابی شکل میں تیار ہو رہے تھے۔ اس لیے اس کہانی کو شائع کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔ اس کے بعد اچانک کتابوں کا کاروبار گھٹ گیا اور کاغذ کے بھاؤ میں بے پناہ اضافہ اور ڈاک خرچ کی ناقابل برداشت زیادتی کی وجہ سے کتابوں کا کاروبار ناممکن ہو گیا۔ پھر میری ذاتی صحت بھی اس قابل نہ رہی کہ کاروبار کو صحیح طور پر دیکھ سکوں اور یوں یہ کہانی جوں کہ توں پڑی رہی۔

چند دن پہلے عبدالغفار صاحب مالک علی میاں پبلشرز۔ لاہور سے گفتگو ہو رہی تھی تو انہوں نے کہا کہ اتنی اچھی کہانی آپ نے قارئین تک نہیں پہنچنے دی۔ یہ قارئین کے ساتھ زیادتی ہے آخر آپ اسے کیوں نہیں شائع کرتے؟ اس پر میں نے ان سے اپنی صحت کا عذر کیا تو وہ کہنے لگے کہ پھر وہ کہانی آپ مجھے دے دیں تاکہ میں اسے شائع کر سکوں اور میں نے فوری طور پر حامی بھر لی۔ اس طرح یہ کہانی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس سلسلے میں آپ کو "علی میاں پبلشرز" کا مشکور ہونا چاہیے کہ اگر وہ یہ کتاب شائع نہ کرتے تو شاید ایک اچھی کہانی قصہ پارینہ بن جاتی۔ "خدا ان کے ادارے کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔" آمین

اعجاز رسول پروپرائٹر
کتابیات پبلی کیشنز۔ کراچی



زندگی
رنگ اور روپ کی اس دنیا میں قدرت کا سب سے قیمتی اور حسین تحفہ ہے
جو زندگی کو برتنا نہیں جانتے
زندگی
خود انہیں برت کر یہ ہنر تعلیم کرتی ہے

□

ایک نوجوان کی سرگزشت
جس کی زندگی
عمل اور تقدیر کے دائرہ ہائے کشش کے درمیان
ایک پلِ صراط طے کرنے سے مشروط ہو گئی تھی

✱ ہر ماں یہی سوچتی ہے کہ اس کا بچہ جوان ہو کر بہت بڑا افسر بنے گا، بہت شاندار کار اُس کے پاس ہوگی اور وہ بہت بڑے بنگلے میں رہے گا۔ وہ کبھی یہ نہیں سوچتی کہ اس بہت بڑے بنگلے میں بیٹا، ماں کو بھی ساتھ رکھے گا یا نہیں؟ بہت بے لوث ہوتی ہے ماں کی ذات... اسے بس اولاد کے ہی ٹھاٹ باٹ کی فکر ہوتی ہے اپنے بڑھاپے کی نہیں۔ اولاد کے بارے میں خواب دیکھنا اس کی فطرت ہوتی ہے اور خوش فہمیوں کا شکار رہنا اس کا شعار... میری ماں نے بھی میرے بارے میں نہ جانے کتنے خواب دیکھے تھے مگر جب بی۔ اے کی ڈگری ہاتھ میں تھامے ایک عرصے تک فیصل آباد کے کوچہ و بازار میں جوتیاں چٹخاتا رہا.. کارخانوں سے دھکے کھا کر نکلتا رہا اور دفتروں سے معذرتیں سن سن کر باہر آتا رہا تو میری ماں کے خوابوں کی بنیادیں خاصی خطرناک حد تک لرز گئیں۔

ہمارا گھر فیصل آباد کے ایک قریبی قصبے ماما نوالہ میں تھا لیکن مَیں نے تعلیم فیصل آباد میں پائی اور تلاشِ معاش میں بھی یہیں کی سڑکیں ناپتا رہا۔ آخر جب چہرے پر مایوسی کی گرد خاصی جم گئی تو والدین کے باہمی مشورے اور اجازت سے مَیں نے لاہور کے لیے رختِ سفر باندھا۔ والدین کا خیال تھا کہ لاہور بڑا شہر ہے، وہاں قسمت آزمائی کے مواقع زیادہ ہیں، اس لیے کامیابی کے امکانات بھی زیادہ ہیں۔ اُن کے اس خیال سے مَیں بھی متفق تھا۔

لاہور ہمارے قصبے سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے اور کسی حد تک یہ شہر میرا پہلے سے دیکھا بھالا تھا لیکن والدین نے مجھے یوں آنسوؤں اور دُعاؤں کے ساتھ رخصت کیا جیسے مَیں سات سمندر پار جا رہا ہوں اور وہ بھی کسی محاذِ جنگ پر... اس وقت مجھے پوری طرح اندازہ نہیں ہوا تھا کہ زندگی کی جنگ ہی سب سے کٹھن ہوتی ہے۔ والدین اب پہلے جیسے خوش فہم تو نہیں رہے تھے پھر بھی انہیں توقع تھی کہ لاہور میں ضرور میری پذیرائی ہوگی لاہور آخر لاہور ہے۔ لوگ کہتے ہیں جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ مَیں نے بھی سوچا کہ چلو نوکری ملے یا نہ ملے کم از کم پیدا تو ہو جاؤں گا۔ والدہ نے اب میرے لیے افسری کے خواب دیکھنے چھوڑ دیے تھے۔ اب انہوں نے ارمانوں کا دائرہ کچھ محدود کر لیا تھا اور کہنے لگی تھیں کہ بس بچے کو گزارے لائق کوئی نوکری مل جائے، اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اور کل کو شادی وادی کر کے اپنا گھر بار بسانے کے قابل ہو جائے بس اتنا ہی کافی ہے۔

لاہور آ کر مجھے اندازہ ہوا کہ بیشتر شہر ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ فرق تو صرف انسان کے مقدر سے پڑتا ہے جو اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ لاہور میں بھی زندگی کی خوشیاں پھلوں کی طرح درختوں پر نہیں لگی ہوتیں کہ ہاتھ بڑھا کر توڑ لیں جب تک مقدر آپ کا ساتھ نہ دے، جب تک تقدیر آپ پر مہربان نہ ہو اور جب تک قدرت کو آپ کی بہتری منظور نہ ہو، ہر جگہ اس وقت تک پاپڑ بیلنے ہی پڑتے ہیں۔ اس وقت تک مَیں نے دوسرے شہر نہیں دیکھے تھے لیکن مجھے یقین ہو چکا تھا کہ دوسرے شہروں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

لاہور میں کئی ماہ تک مجھے کوئی نوکری نہیں مل سکی اور نہ

ہی نوکری ملنے کے آثار پیدا ہوئے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ نوکری دراصل کوئی ایسی چیز نہیں کہ کوئی بھی شخص ڈگری ہاتھ میں لے کر نکل کھڑا ہو اور وہ اسے مل جائے۔ تھوڑی بہت واقفیت، تعلق در تعلق، کوئی رشتہ ناتا، کوئی شناسائی ضرور ہونی چاہیے... یا پھر آدمی کے پاس ہنرمندی کی کوئی غیر معمولی سند موجود ہو۔ والدین نے گھر سے جو جمع پونجی نکال کر میرے حوالے کی تھی وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی تھی اور میں والدین کو سوائے تسلی بھرے خطوں کے کچھ نہیں بھیج سکا تھا۔ میں نے ایک عقل مندی ضرور کی تھی کہ مزنگ کے علاقے میں دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیتے وقت از خود ہی مالک مکان کو چھ ماہ کا کرایہ پیشگی دے دیا تھا تاکہ اس طرف سے تو چھ ماہ کے لیے بے فکری رہے ورنہ لاہور میں ان دنوں غریبانہ قسم کے علاقے میں ایڈوانس وغیرہ مانگنے کا رواج شروع نہیں ہوا تھا البتہ مجھ جیسے چھڑے چھانٹ کو مکان یا کمرہ حاصل کرنے میں خاصی دشواری پیش آتی تھی اور کسی حد تک اب بھی آتی ہے۔

نوکری تو نہ ملی البتہ ایک روز اشرف خان مجھے مل گیا۔

اس شام میں نیلا گنبد کے علاقے میں اس طرف سے گزر رہا تھا، جدھر سائیکلوں کی دکانیں ہیں کہ عقب سے ایک آواز آئی۔

"بھائی صاحب! ذرا بات سنیے گا۔"

معلوم نہیں مجھے میری کس حس نے بتایا کہ مجھے ہی پکارا گیا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو ایک دراز قد اور خوش شکل نوجوان بے بس نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہوا نظر آیا۔ اس کے قریب ہی ایک سفید فام غیر ملکی بھی کھڑا تھا جس کی پشت پر ایک بڑا سا سفری بیگ بندھا ہوا تھا۔ وہ صرف نیکر اور بنیان میں تھا اور اس کے لمبے لمبے سنہری بال کسی دوشیزہ کی زلفِ پریشان کی طرح اس کے استخوانی کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ داڑھی مونچھیں بھی جھاڑ جھنکار کی طرح بڑھی ہوئی تھیں لیکن ناک پر ٹکی ہوئی سنہری اور پتلے فریم کی عینک اور سر پر رکھی ہوئی گول ٹوپی کی وجہ سے وہ اٹھارہویں صدی کا کوئی فلاسفر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ سفید گول ٹوپی اس نے غالباً لاہور میں کہیں میلے ٹھیلے میں خریدی تھی۔ ایک لمحہ توقف کر کے میں ان کے پاس چلا گیا۔

مجھے آواز دینے والا معذرت آمیز لہجے میں بولا "بھائی صاحب! آپ کچھ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں۔" پھر گویا اسے جملے کی تصحیح کا خیال آیا۔ فوراً ہی بولا "پڑھا لکھا تو میں بھی ہوں لیکن ان حضرت کی انگریزی میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ خدا آپ ہی پوچھیں کہ یہ کیا جاننا چاہتا ہے؟" اس نے غیر ملکی [illegible]

میرے کچھ پوچھنے سے [illegible]

میں بتانا شروع کر دیا کہ وہ جرمن سیاح [illegible] ہوا لاہور پہنچا ہے لیکن اب جیب جواب دے [illegible] کسی ایسے ہوٹل کی تلاش میں ہے جہاں کم سے [illegible] چار دن گزارے جا سکیں۔ اس ضمن میں محکمہ سیاحت [illegible] گیا۔ بچوں نے بھی اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی جنہیں وہ [illegible] ہوئے تھا۔ اس کی انگریزی ٹوٹی پھوٹی ضرور تھی مگر اتنی بھی نہیں [illegible] میں نہ آتی۔ میں نے چند لمحے سوچا پھر اسے انارکلی کے سب سے [illegible] ایک ہوٹل کا پتہ سمجھا کر رخصت کیا۔ اس ہوٹل کے اخراجات کا مجھے [illegible] طور پر اندازہ تھا کیونکہ مزنگ میں مکان ملنے سے پہلے میں نے [illegible] سات آٹھ دن وہیں گزارے تھے۔

جرمن سیاح میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو چکا تو مجھے آواز دینے والے نوجوان نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا "مجھے اشرف خان کہتے ہیں۔ میں [illegible] پر رہتا ہوں۔ انارکلی سے چند چیزیں خریدنے آیا تھا۔ آپ نے اس غیر ملکی کا مسئلہ حل کر کے گویا میری بھی مدد کی ہے۔ اس کی زبان [illegible] سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔"

وہ خاصا باتونی، خوش مزاج اور جلد بے تکلف ہونے وا[illegible] معلوم ہوتا تھا۔ میں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور جواباً صرف کہا "میرا نام نسیم جمال ہے۔"

وہ میرا ہاتھ تھام کر آگے بڑھتے ہوئے بولا "آؤ یار کہیں [illegible] کچھ ٹھنڈا یا گرم پیتے ہیں۔"

میرے خیال میں دو ہی طرح کے لوگ جلد بے تکلف ہو[illegible] ہیں۔ لوسر باز اور جعلساز یا پھر بے حد مخلص، اچھے اور کھرے لوگ... وہ لوسر باز اور جعلساز تو ہرگز معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ عمر میں تو شاید مجھ سے کچھ بڑا ہی تھا لیکن اس کے چہرے پر معصومیت اور سادگی [illegible] میں اس کے ساتھ چل دیا۔ ہمارا رخ کافی ہاؤس کی طرف تھا۔

"آپ انگریزی اچھی بول لیتے ہیں۔" اس نے راستے میں کہا۔

"چھوڑو یار!" میں واقعی شرما گیا۔ "میں تو ایسے ہی بس [illegible] سا آدمی ہوں... خالص دیہاتی...!"

"لیکن شخصیت تو انگریزی فلموں کے ہیرو والی پائی ہے۔" وہ رشک آمیز لہجے میں بولا۔

"طنز کر رہے ہو شاید؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کیونکہ انگریزی فلموں میں تو اندھے، لنگڑے اور کبڑے ہیرو بھی ہوتے ہیں۔"

"میں پرانی ایکشن فلموں کی بات کر رہا ہوں جن کے ہیرو لمبے تڑنگے، وجیہہ اور توانا ہوتے تھے۔ ہمارے زنانہ رسالوں میں چھپنے والے افسانوں کے ہیرو کی طرح جو دراصل بیشتر مشرقی لڑکیوں کے خوابوں کا شہزادہ ہوتا ہے... مگر عملی دنیا میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔" وہ واقعی بڑا باتونی تھا۔ یک لخت اسے کوئی خیال آیا۔ قدرے چونک کر مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "سچ سچ بتانا یار! لڑکیاں تو تم پر بھی بہت مرتی ہوں گی؟"

"معلوم نہیں۔" میں نے دیانت داری سے کہا "میں نے جس کالج میں پڑھا ہے، وہاں تو لڑکی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔"

اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے ہم کافی ہاؤس جا پہنچے، جو لاہور میں ادیبوں اور شاعروں کا گڑھ ہے لیکن کبھی کبھی مجھ جیسے اجڈ بھی وہاں جا بیٹھتے ہیں۔ چائے نوشی کے دوران میں نے اشرف خان کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا کہ دیہات کی پیداوار ہوں۔ کالج سے نکلے ایک سال ہو چلا ہے۔ فکرِ معاش میں سرگرداں ہوں۔ نوکری ملنے کے آثار نظر نہیں آرہے اور جیب بھی اب ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کروں تو کیا کروں۔

اشرف خان اپنے بارے میں بتانے لگا "میں فلموں میں کام کرتا ہوں۔ ایکسٹرا ہوں۔ ایکسٹرا کا مطلب تو تم سمجھتے ہی ہو... فالتو... میں کچھ زیادہ ہی فالتو ہوں، اس لیے ابھی تک کوئی خاص کام نہیں ملا۔"

"افسوس کہ میں نے تمہاری کوئی فلم نہیں دیکھی۔" میں نے بڑے خلوص سے کہا۔

"دیکھی بھی ہوگی تو تمہیں بھلا کیا پتہ چلا ہوگا کہ میں اس میں تھا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ہمارے ہم پیشہ لوگوں میں ایک لطیفہ بہت مقبول ہے۔ شاید تم نے سنا ہو۔ بہرحال میں اس لیے سنا رہا ہوں کہ اس سے تمہیں بات سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ایک صاحب اپنے دوست سے بولے 'تم نے فلاں فلم دیکھی ہے؟ اس میں میں نے بھی کام کیا ہے۔' دوسرے صاحب بولے 'ہاں دیکھی تو ہے مگر تم تو اس میں کہیں نظر نہیں آئے۔' پہلے صاحب بولے 'فلم میں ایک جنازہ جا رہا تھا نا! اس چارپائی پر میں ہی تو لیٹا ہوا تھا۔' تو بھیا! کچھ عرصہ پہلے تک تو مجھے اسی قسم کے کردار ملتے تھے۔ اب کسی کسی فلم میں ایک دو ڈائیلاگ بھی مل جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمارا نام بھی بہت باریک حروف میں اسکرین پر آجاتا ہے لیکن وہ فہرست اتنی لمبی ہوتی ہے کہ اسے پڑھنے کے لیے آدھا گھنٹہ چاہیے جبکہ فہرست اسکرین سے ایک سیکنڈ میں ہٹ جاتی ہے تو بھیا! یہ ہے اپنی زندگی کا خلاصہ...!"

وہ ایک طویل سانس لے کر گویا عزمِ نو کے ساتھ بولا "مگر وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ کبھی نہ کبھی مجھے چانس ضرور ملے گا۔ تمہارا یہ خادم ملک بھر میں صفِ اول کا ہیرو ہوگا۔ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر میرے آگے پیچھے دم ہلاتے پھریں گے۔"

"مگر جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کے تو دم نہیں ہوتی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا جس پر کئی مشکوک اور دانشور قسم کی شخصیات نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ اشرف خان فوراً سنجیدہ ہو گیا اور سنجیدہ ہوتے ہی گویا اسے کوئی بات یاد آگئی۔

"تم فلمی لائن میں قسمت آزمائی کیوں نہیں کرتے؟" وہ از سرِ نو میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "تم تو اچھے بھلے ہیرو ہو۔ ایک بار چانس مل گیا تو بڑے بڑوں کا بستر گول کر دو گے۔ کل ہی میں نے چودھری فضل داد کو کسی سے کہتے سنا تھا کہ وہ اپنی نئی فلم میں سائڈ ہیرو کے طور پر کسی نئے لڑکے کو آزمانا چاہتا ہے۔ چودھری فضل داد خاصا معقول فلم ساز ہے۔ اپنی فلموں کی ڈائریکشن بھی خود دیتا ہے۔ تم کل ہی میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں اس سے ملوا دیتا ہوں۔"

"نہیں بھائی! مجھے تو معاف ہی رکھو۔ مجھے اس قسم کا کوئی شوق نہیں۔" میں نے بلا تامل کہا۔

"بات شوق کی نہیں، مجبوری کی ہے۔" اشرف خان بولا "تمہیں اس وقت کوئی ذریعۂ معاش چاہیے۔ قسمت آزمائی میں کیا حرج ہے۔ دفتروں میں جا کر انٹرویو بھی تو دیتے ہو۔ یہی سمجھ لینا کہ کسی دفتر میں انٹرویو دینے جا رہے ہو۔ کامیاب ہو گئے تو عیش کرو گے، ورنہ تم سے کوئی کچھ چھین تو نہیں لے گا۔"

اس کی دلیل معقول تھی۔ میں نے ہر پہلو سے غور کیا... اور بالآخر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ یوں خوش ہو گیا جیسے میں نے اس پر کوئی احسان کر دیا ہو۔

"اگر تم آمادہ ہو تو کل کا انتظار کیوں کیا جائے، چلو ابھی چلتے ہیں۔" وہ مسرور لہجے میں بولا۔

چائے کا بل ادا کر کے ہم باہر آئے اور کچھ دور پیدل چل کر اس چوراہے پر آن کھڑے ہوئے، جہاں سے ہمیں اسٹوڈیوز کی طرف جانے والی ویگن مل سکتی تھی۔ ملتان روڈ پر تینوں فلم اسٹوڈیو ایک ہی جگہ ہیں اور ملک بھر میں بننے والی بیشتر فلموں کی شوٹنگ انہی میں ہوتی ہے۔ جلد ہی ایک ویگن آگئی۔ اس میں صرف ایک سیٹ خالی تھی۔ اشرف خان نے مجھے تو بڑے اصرار سے بٹھا دیا اور خود مرغا بن گیا۔

اسٹوڈیو کا تصور میرے ذہن میں کچھ عجیب سا تھا جیسے وہ

دُنیا سے الگ تھلگ سی کوئی جگہ ہوگی لیکن وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر قدرے مایوسی ہوئی کہ وہ بھی دیگر عمارتوں جیسی ایک عمارت ہی تھی۔ اس کے کمپاؤنڈ میں عام سے لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ ایک طرف کینٹین تھی جہاں لوہے کی میز کرسیوں پر بیٹھے ہوئے گاہک بھانت بھانت کی آوازیں نکال کر بیروں کو بلا رہے تھے۔

کینٹین کے ساتھ دوسری دیوار کے ساتھ گندے پانی کی نکاسی کے لیے ایک نالی تھی جس کے صبر کا پیمانہ غالباً کئی دن پہلے ہی لبریز ہو چکا تھا اور اب غلیظ پانی کمپاؤنڈ کے کچھ حصے میں پھیل رہا تھا۔ کہیں کہیں لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے مصروفِ گفتگو تھے۔ ان میں سے بعض اپنے اندازِ گفتگو سے ہی بے حد تیز و طرار اور شاطر معلوم ہو رہے تھے۔ اِکّا دُکّا عورتیں بھی اِدھر اُدھر آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ مَیں نے محسوس کیا کہ کئی آدمیوں نے مُڑ مُڑ کر متجسس نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔

راستے میں اشرف کے کئی شناسا بھی رُک کر اس سے ملے۔ انھوں نے بھی متجسس نظروں سے میری طرف دیکھا تاہم کچھ پوچھا نہیں اور نہ ہی اشرف نے تعارف کرانے کی ضرورت محسوس کی۔ اُن لوگوں کی نظروں میں مجھے ہلکا سا تمسخر بھی محسوس ہُوا جیسے وہ دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں: اچھا... تو آپ بھی ہیرو بننے تشریف لائے ہیں!

ابھی تک مجھے کوئی بڑا ہیرو، ہیروئن یا ایسا اداکار دکھائی نہیں دیا تھا جس کی شکل میرے لیے مانوس ہوتی۔ ایک اور گیٹ سے گزر کر ہم اندر پہنچے۔ سامنے ہی ایک مستطیل سا لان تھا جس کے وسط میں فوارہ نصب تھا۔ لان پر معمولی سی شکل و صورت کی کئی لڑکیاں ایک جیسے کپڑے پہنے بیٹھی تھیں اور بیزار نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ لان کے اردگرد کچھ فاصلہ چھوڑ کر طویل برآمدے کے عقب میں کمروں کی قطاریں تھیں، جن پر فلم کمپنیوں کی تختیاں آویزاں تھیں۔ ایسے ہی ایک کمرے کے دروازے پر اشرف خان رُک گیا۔ اس دروازے پر "اشار فلمز" کی تختی لگی ہوئی تھی۔

"یہ چودھری فضل داد کا پروڈکشن آفس ہے۔" اشرف نے بتایا۔ "تم یہیں ٹھہرو۔ مَیں دیکھ کر آتا ہُوں، چودھری صاحب موجود بھی ہیں یا نہیں۔"

مَیں نے اثبات میں گردن ہلادی اور اشرف چق اُٹھا کر اندر چلا گیا۔ برآمدے سے گزرنے والے لوگ میرا سر تا پا جائزہ لیتے ہوئے جا رہے تھے اور مجھے خفت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ یقیناً یہی سوچ رہے ہوں گے کہ ہیرو بننے کا ایک اور شوقین کھڑا کسی کے انتظار میں سوکھ رہا ہے۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ مَیں کس طرح اشرف کے استدلال سے قائل ہو کر یہاں آگیا تھا اور اب میرا جی چاہ رہا تھا کہ واپس دوڑ پڑوں۔ شاید مَیں اس ارادے پر عمل بھی کر بیٹھتا مگر اسی دوران اشرف چق اُٹھا کر باہر آگیا۔

"آؤ اندر آجاؤ۔ تمھاری قسمت اچھی ہے کہ چودھری صاحب بقائمیِ ہوش و حواس موجود ہیں اور تم سے ملنے پر آمادہ بھی ہیں حالانکہ اس وقت ان کے قریب ایک حسینۂ دلنواز موجود ہے جس کی موجودگی میں عام طور پر وہ کسی نئے آدمی کو شرفِ ملاقات بخشنا پسند نہیں کرتے۔" اشرف نے مسکراتے ہوئے مجھے نوید سُنائی۔

مَیں اس کے پیچھے پیچھے دفتر میں داخل ہُوا۔ دفتر خاصا کشادہ تھا لیکن فرنیچر اور دیگر ساز و سامان معمولی قسم کا تھا۔ دیواروں پر جا بجا فلمی پوسٹر اور تصویریں چسپاں تھیں۔ ایسی ہی ایک بڑی سی تصویر کے قریب، دیوار کے ساتھ خاصی لمبی چوڑی میز لگی ہوئی تھی۔ میز پر کاغذوں، فائلوں، فلمی اخباروں اور سگریٹ کے پیکٹوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور ان کے درمیان جہاں جہاں جگہ بچی تھی اُسے چائے کی خالی پیالیوں نے پُر کر دیا تھا۔ کمرے میں سگریٹوں کے دھوئیں کی کثافت اتنی زیادہ تھی کہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے بھی صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

مَیں اس دُھند سے کچھ مانوس ہُوا تو لوگوں کے چہرے کچھ صاف دکھائی دیے۔ لمبی چوڑی میز کے عقب میں لمبی چوڑی مونچھوں والا ایک شخص براجمان تھا اور اس کی قریب ترین کرسی پر ایک عورت ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی اور گود میں ٹیلی فون ڈائریکٹری رکھے اُس کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ عورت ایسی تو نہیں تھی کہ دیکھتے ہی اس کے حُسن کی چکا چوند سے کسی کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں... لیکن ایسی ضرور تھی کہ پہلی ہی نظر میں آنکھوں کے راستے دل میں اُتر جائے۔ وہ گوری چٹی نہیں تھی، اس کی آنکھیں غزالی نہیں تھیں، اس کی زُلفیں کالی گھٹا سے مشابہ نہیں تھیں، اس کے باوجود وہ خوبصورت تھی۔

جی ہاں، خوبصورتی تو وہ ہے نا جو آنکھوں کو بھائے اور اس کا یہ عالم تھا کہ کسی بہت ہی غیر معمولی تصویر کی طرح آنکھوں میں نقش ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے حُسن میں ایک عجیب سی ملاحت تھی، بڑی کشش تھی اس کی شخصیت میں... وہ بہت ہلکے سے میک اپ میں تھی۔ اس کی ذات میں شعلے کی لپک نہیں تھی... پھر بھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں موجود تمام مرد اس کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہوں۔

لمبی چوڑی مونچھوں والے کے علاوہ کمرے میں تین آدمی اور بھی تھے۔ وہ کرسیوں پر کچھ ایسے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھے تھے جیسے کہیں سے مار کھا کر آئے ہوں مگر ان کی آنکھوں سے تیزی و طرّاری عیاں تھی۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ لمبی چوڑی مونچھوں والا شخص ہی چودھری فضل داد ہے۔ اشرف نے مجھے بازو سے پکڑ کر گویا اُس کے حضور پیش کرتے ہوئے کہا: "چودھری صاحب! یہ ہے میرا دوست نسیم جمال!"

"ماشاءاللہ بڑا سوہنا ہے۔" چودھری نے میرا سر تا پا جائزہ لیتے ہوئے مربیانہ انداز میں گردن ہلائی۔ "اب مسئلہ یہ ہے کہ اسے تھوڑی بہت ایکٹنگ بھی آنی چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ لکڑی کے بندر کی طرح کیمرے کے سامنے کھڑا رہے۔"

سب لوگ تنقیدی انداز میں میرا جائزہ لے رہے تھے اور مَیں سوچ رہا تھا کہ شاید قصائیوں میں گھرا ہُوا بکرا بھی یہی کچھ محسوس کرتا ہو گا جو اس وقت مَیں محسوس کر رہا تھا بشرطیکہ بکروں کے بھی محسوسات اور جذبات ہوتے ہوں۔

چودھری بات جاری رکھتے ہوئے بولا: "ہاں بھئی برخوردار! پہلے کبھی کہیں کام کیا ہے؟ کوئی چھوٹا موٹا کیریکٹر... ٹی وی پر، اسٹیج یا فلم میں؟"

"نہیں جی! مَیں نے کبھی اداکاری نہیں کی۔" مَیں نے کہا۔

"کسی لڑکی شڑکی کے سامنے تو سینے پہ ہاتھ رکھ کر ڈائیلاگ شائیلاگ بولے ہوں گے؟" چودھری صاحب مونچھ مروڑتے ہوئے مسکرائے۔

اشرف فوراً ہی گویا میری صفائی پیش کرتے ہوئے بولا: "اس بے چارے کو تو اتنا موقع بھی نہیں ملا چودھری صاحب! بالکل سیدھا سادا نوجوان ہے۔"

معلوم نہیں کیوں اس موقعے پر مَیں اچانک ہی بول پڑا: "وہ... جی... دراصل مجھے ایکٹنگ وغیرہ کا بالکل شوق نہیں... مجھے تو یہ اشرف پکڑ لایا ہے۔"

شاید میری اس صاف گوئی اور سادگی نے عورت کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے ایک مترنم قہقہہ لگایا اور فضا میں جیسے جلترنگ بج اُٹھے لیکن اس کے ساتھ ہی گویا زمین پر ڈرم بھی لڑھکنے لگے۔ دراصل اس عورت کو ہنستے دیکھ کر سب نے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ یوں جلترنگ کا ترنم، ڈرم لڑھکنے کی گڑگڑاہٹ میں دب کر رہ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہاں موجود ہر شخص اس عورت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو۔ اس لیے وہ لوگ، عورت کے ہنستے ہی اس طرح ہنسنے لگے تھے جیسے ان کی ہنسی، عورت کی ہنسی سے مشروط رہی ہو۔ میرے لیے اس عورت کا چہرہ شناسا نہیں تھا مگر اس کی جو اہمیت نظر آ رہی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی اچھی بھلی ہیروئن یا پھر شاید فنانسر قسم کی کوئی چیز ہے۔ مَیں نے سُنا تھا کہ آج کل فلم انڈسٹری میں دو تین ایسی خواتین بھی قدم رکھ چکی تھیں جنھیں خود اداکاری یا ہدایت کاری وغیرہ کا شوق نہیں ہے لیکن وہ فلموں میں صرف سرمایہ کاری کر رہی ہیں۔ وہ اپنا پیسہ لگا کر فلمیں شروع کرواتی ہیں، بعد میں تو ڈسٹری بیوٹرز سے قسطیں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ ان خواتین کے پاس دولت کہاں سے آئی تھی اور فلمی دُنیا میں ان کے انداز و اطوار کیا تھے، اس سلسلے میں طرح طرح کے افسانے مشہور تھے۔

میری بات سُن کر اشرف نے یوں مجھے گھُورا جیسے دل ہی دل میں کہہ رہا ہو: "تم ضرور کام خراب کرو گے۔ تھوڑی دیر اور اپنی چونچ بند نہیں رکھ سکتے؟ یہ اچھا صلہ دے رہے ہو میرے احسان کا۔"

خلافِ توقع میری بات کا شاید چودھری پر اچھا ہی اثر ہُوا تھا۔ چند لمحے پہلے تک اپنی تمام تر خوشگوار گفتگو کے باوجود اس کے چہرے سے سخت گیری جھلک رہی تھی مگر اب اس کی جگہ ملائمت نے لے لی تھی۔ وہ میز پر کہنیاں ٹکا کر آگے کو جھکتے ہوئے سنجیدگی سے بولا: "چلو اشرف تمھیں لے ہی آیا ہے تو یہ بتاؤ کہ اب کام مل جائے تو کرو گے؟"

مَیں نے جواب دینے میں توقف کیا اور قدرے بے بسی سی محسوس کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سبھی کی توجہ میری طرف تھی حتّٰی کہ وہ عورت بھی متجسس و منتظر نگاہ سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک بھی تھی۔ شاید انھیں آج تک ایسے ہی لوگوں سے پالا پڑا تھا جو فلموں میں رول کی بھیک مانگتے تھے۔ یہاں اُن کے سامنے ایک ایسا شخص تھا جسے لانے والا کہہ رہا تھا کہ اُسے فلموں میں کام چاہیے اور وہ خود کہہ رہا تھا کہ جی مجھے تو فلموں میں کام کرنے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔

غیر ارادی طور پر مَیں نے اپنی سادگی کا دوسرا ہتھوڑا ان کے سروں پر رسید کیا: "وہ... جی... اصل مسئلہ یہ ہے کہ مجھے رقم کی ضرورت ہے اگر کوئی ڈھنگ کا کام مل جائے جس میں باعزت طریقے سے کچھ آمدنی ہونے لگے تو کیا ہی بات ہے۔"

مَیں نے دیکھا کہ عورت کے ملیح چہرے پر دھیرے دھیرے مسکراہٹ طلوع ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں ستاروں کی سی مدھم چمک نمودار ہو رہی تھی۔ وہ بے حد دلچسپی سے مسلسل میری طرف دیکھے جا رہی تھی اور اس ضمن میں اسے گویا کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔

میری طرف سے اثبات میں جواب پاکر چودھری فضل داد مطمئن انداز میں ریوالونگ چیئر پر نیم دراز ہوگیا اور عورت کے چہرے سے بھی اطمینان جھلکنے لگا جیسے اس کا اپنا کوئی مسئلہ حل ہوگیا ہو۔ اب چودھری نے ہمیں بیٹھنے کی دعوت دی اور ہمارا صحیح طور پر ایک دوسرے سے تعارف ہوا، تھوڑی ہی دیر میں ہمارے درمیان بے تکلفانہ گفتگو ہونے لگی۔

اُس عورت کے متعلق بھی مجھے معلوم ہوگیا۔ اس کا اصل نام تو معلوم نہیں کیا تھا، بہرحال فلمی دُنیا میں وہ نازو کے نام سے آئی تھی۔

نازو گفتگو میں بہت کم حصہ لے رہی تھی پھر بھی مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگیا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہُوا کہ وہ حال ہی میں کرشن نگر میں واقع اپنا مکان چھوڑ کر گلبرگ کی کسی کوٹھی میں شفٹ ہوئی تھی۔ کوٹھی فی الحال تو کرائے کی تھی لیکن فلمی دُنیا میں کامیابی کا سہرا ہاتھ آجائے تو کوٹھی اپنی ہونے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔ سب سے متعارف چونکہ چودھری فضل داد نے کرایا تھا، اس لیے اس کے ساتھ نازو کا رویّہ ایسا ہی تھا جیسا کسی بھی باضمیر انسان کا اپنے محسن کے ساتھ ہوتا ہے۔

نازو کے بائیں طرف جو ایک مجہول سا شخص کرسی پر نیم دراز تھا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا اُس سے تعارف ہُوا تو پتہ چلا کہ وہ مشہور موسیقار ناصر شاہ ہے۔ دوسرا شخص جو خاصا بھاری بھرکم تھا اور جس کا چہرہ کچھ عجیب سے نشانات کی وجہ سے کھردرا نظر آ رہا تھا اور جو کسی بھی اعتبار سے رائٹر دکھائی نہیں دیتا تھا وہ کہانی نویس اکرم ملک تھا۔ اس کا شمار کامیاب فلمی مصنفوں میں ہوتا تھا۔

مجھے چودھری فضل داد نے میز کے دوسری طرف اپنے مقابل بٹھایا تھا۔ کافی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد چودھری نے اچانک میری طرف جھکتے ہوئے میز پر ہاتھ مار کر کہا: "نو برخوردار! تمھیں ہم سائیڈ ہیرو کا رول دے رہے ہیں۔ تمھیں چاہے اداکاری آتی ہو یا نہ آتی ہو، میں تم سے اداکاری کرا کے چھوڑوں گا۔ اسی لیے میں اسکرین ٹسٹ اور دوسری رسمی کارروائیاں کیے بغیر ہی تم سے کنٹریکٹ سائن کرا رہا ہوں۔"

اُس نے زور سے ہانک لگائی: "اُو فیقے! جلدی سے کنٹریکٹ فارم لے کر آ...!"

دفتر کے ایک گوشے سے ایک شخص برآمد ہُوا جو حلیے سے چپراسی لیکن حرکات و سکنات سے ناکام فلمی ہیرو نظر آتا تھا۔ اس نے ایک کونے میں میز کے ساتھ لگی ہوئی الماری کھولی اور اس میں سے ایک کتاب نما شے نکال کر لے آیا۔ یہ فارم بک تھی جو اُس نے چودھری کے سامنے رکھ دی۔

"کیوں بھئی... پانچ ہزار روپے [illegible]" چودھری نے ایک ہاتھ میں قلم سنبھال کر دوسرے سے [illegible] ہوئے مجھ سے پوچھا۔

میں نے مشورہ طلب نظروں سے اشرف کی [illegible] نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ ہاں کر دو۔ چنانچہ [illegible] کہا: "منظور ہے، چودھری صاحب!"

چودھری نے خود ہی مجھ سے میرے بارے میں سب کچھ پوچھ کر فارم پُر کیا پھر فارم بک میری طرف کھسکاتے ہوئے ایک جگہ انگلی رکھ کر بولا: "لو یہاں سائن کر دو۔"

میں نے سائن کر دیے تو سب یوں زور و شور سے تالیاں بجانے لگے جیسے سالگرہ کی تقریب میں کیک کٹ گیا ہو۔ پھر سب نے مجھے مبارک باد دی لیکن خلوص کی مہک صرف نازو کے لہجے میں تھی۔ میں خود بھی اس عورت کے لیے یکایک ہی اپنے دل میں بے پناہ خلوص محسوس کرنے لگا تھا اور مجھے حیرت تھی کہ کیا دو انسان اس طرح پہلی ملاقات میں ہی ایک دوسرے کے دلوں میں گداز بھی محسوس کر سکتے ہیں؟ نازو کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے محسوسات بھی مجھ سے مختلف نہیں ہیں... پھر میں نے فوراً ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا: "میاں! اتنی زیادہ خوش فہمیوں کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں، یہ تصنع کی دُنیا ہے۔ کسی چہرے پر بھروسا مت کرو، کیا معلوم کون کب اداکاری کر رہا ہو۔ پہلے ہی قدم پر خوش فہمیوں کے جال میں اُلجھنے لگے تو تمھاری گاڑی چل چکی... مگر یہی کمبخت دل کہتا تھا: نہیں... تیزی سے کامیابی کی رفعتوں کی طرف اُڑتی ہوئی اس عورت کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ تمھارے لیے... ایک مفلس اور بے حیثیت اجنبی کے لیے... اپنی آنکھوں میں خلوص کی جوت جگائے۔ تم جیسے معلوم نہیں کتنے یہاں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔"

میں بار بار بے اختیار اسی کی طرف دیکھنے لگتا تھا اور عین اُسی وقت اس کی نظریں بھی میری جانب اُٹھتی تھیں اور میں سٹپٹا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا کہ کوئی اور تو ہماری نظروں کے اس تصادم کو محسوس نہیں کر رہا۔ صرف کہانی نویس اکرم ملک کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے اور نازو کے درمیان نظروں کے غیر محسوس رابطے کی آہٹ سُن چکا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں رقابت کی ہلکی سی جھلک دیکھی۔ شاید وہ خود نازو کی نظرِ التفات کا اُمیدوار تھا۔

موسیقار ناصر شاہ تو گویا کسی اور ہی دُنیا میں گم تھا۔ اسے شاید سگریٹ سے سگریٹ سُلگانے اور ہوا میں دھوئیں کے مرغولے چھوڑنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ تیسرا شخص عنایت اللہ چودھری فضل داد کا اسسٹنٹ تھا۔ خاصا سنجیدہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ باتوں کے دوران بھی بار بار کلپ بورڈ پر لگے ہوئے کاغذی پلندے کو اُلٹ پلٹ کرنے لگتا تھا۔ یہ غالباً فلم کا اسکرپٹ تھا۔ باقی رہا چودھری فضل داد... تو اُسے گرد و پیش کی فکر شاید کم ہی تھی وہ یوں مطمئن و مسرور نظر آتا تھا جیسے دُنیا کی ہر چیز اُس کی ملکیت ہو اور ہر کام اس کے حکم کے مطابق ہو رہا ہو۔

تالیوں کا شور تھما تو چودھری نے اپنے پرس سے ایک سو ایک روپے نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اسے سائننگ اماؤنٹ کہتے ہیں۔ کنٹریکٹ سائن کرنے کے بعد پہلی ادائیگی۔ اب سمجھو کہ ہمارے درمیان کنٹریکٹ مکمل ہوگیا۔"

مصنف محمد اکرم ملک بولا: "اور رسم یہ ہے کہ جو سائننگ اماؤنٹ وصول کرتا ہے، وہ کم از کم تین سیر مٹھائی منگواتا ہے۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے، ضرور منگوائیں مٹھائی۔" میں نے لاپروائی سے کہا اور سو کا نوٹ ہیرو نما چپراسی کی طرف بڑھا دیا، جو نوٹ لیتے ہی یوں ہوا ہوگیا، گویا اسے ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو شاید میں ارادہ ہی بدل دیتا۔

نازو نے اکرم ملک کو مخاطب کیا: "اکی! تم نے تین سیر مٹھائی منگوا کر اچھا نہیں کیا۔ مٹھائی تو صرف منہ میٹھا کرنے کے لیے منگائی جاتی ہے۔ اس وقت بھلا یہاں آدمی ہی کتنے ہیں؟"

"کیا بات کر رہی ہو نازو بیگم... ایک سیر مٹھائی تو میں اکیلا ہی کھا جاؤں گا۔" اکرم ملک تیکھے لہجے میں بولا: "اور ایک سیر چودھری صاحب کے حصے کی ہوئی، باقی تم سب کے لیے... صحیح حساب سے تو منگائی ہے میں نے۔"

نازو نے جواباً خاموشی اختیار کر لی۔

میں اشرف کی طرف متوجہ ہوگیا جو آج ہی مجھے ملا تھا آج ہی دوست بن گیا تھا اور آج ہی اس کی وجہ سے گویا میری زندگی میں انقلاب آگیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بُجھا بُجھا سا نظر آنے لگا ہے۔ میں نے سوچا کہ وہ خواہ کتنا ہی مخلص سہی لیکن ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال تو ضرور آیا ہوگا کہ وہ برسوں سے اسٹوڈیوز کے چکر لگا رہا ہے لیکن وہی ایکسٹرا کا ایکسٹرا ہی رہا جب کہ مجھے وہ محض قسمت آزمائی کے لیے ساتھ لایا تھا اور مجھے پہلے ہی دن بغیر کسی منت سماجت کے سائڈ ہیرو کا رول مل گیا تھا۔

مٹھائی آئی تو اس کا بیشتر حصہ واقعی اکرم ملک اور چودھری فضل داد ہی ہڑپ کر گئے۔ مجھے پہلی حیرت تو اکرم ملک کا جثہ دیکھ کر ہوئی تھی کیونکہ میرے تصور کے مطابق مصنف کو بڑا منحنی، مرنجاں مرنج اور نستعلیق قسم کا دُبلا پتلا سا انسان ہونا چاہیے تھا جب کہ اکرم ملک لحیم شحیم اور ایسی کرخت صورت والا آدمی تھا کہ فلمی ولن کا بھی... سرپرستِ اعلا معلوم ہوتا تھا۔ دوسری حیرت مجھے اس کو مٹھائی ہڑپ کرتے دیکھ کر ہوئی۔

مٹھائی صاف ہو چکی، چائے کا دور چل چکا تو اسسٹنٹ ڈائریکٹر عنایت اللہ میری طرف جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا: "تین دن بعد یعنی پیر کو شوٹنگ ہے۔ شوٹنگ نائٹ شفٹ میں ہے لیکن تم دن میں ہی آ جانا۔ تمھیں ریہرسل کے لیے زیادہ وقت مل جائے گا۔ میں اسکرپٹ کی ایک کاپی تمھیں دے دوں گا۔ اس میں جس کردار کا نام ظہیر ہے، وہ تم ہو۔ اس کے ڈائیلاگ یاد کرنے کی کوشش کرنا۔ محنت اور لگن سے کام کرو گے تو زندگی بن جائے گی تمھاری... کیا سمجھے؟"

"جی بالکل سمجھ گیا۔" میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

کچھ دیر بعد بالآخر سب سے ہاتھ ملا کر میں اور اشرف باہر آئے۔ برآمدے میں پہنچ کر اشرف مجھ سے لپٹ پڑا: "واہ پیارے! قسمت ہو تو ایسی ہو۔"

"واقعی! آج تو مجھے بھی اپنی قسمت پر کچھ رشک آنے لگا ہے۔" میں نے اسے سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے کہا: "ورنہ آج تک میرا بیشتر وقت قسمت کو کوستے ہوئے ہی گزرتا تھا... لیکن یہ سب کچھ تمھاری وجہ سے ممکن ہُوا ہے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا: "مگر یار! وہ اصل مسئلہ تو رہ ہی گیا۔"

"وہ کیا؟" اشرف نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے شاید تمھیں زیادہ وضاحت سے نہیں بتایا تھا کہ مالی حالت آج کل کچھ زیادہ ہی پتلی ہے۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "چودھری نے جو سو کا ایک نوٹ دیا تھا، وہ بھی چپراسی نے مٹھائی اور چائے پانی میں برباد کر دیا۔ شوٹنگ تین دن بعد شروع ہوگی۔ معاوضہ تو پانچ ہزار روپے طے ہوگیا لیکن معلوم نہیں ادائیگی کی صورت کیا ہوگی۔"

"ارے ہاں یار... اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا، ورنہ اسی وقت ایڈوانس کی بات کرتا۔" اشرف بولا: "لیکن خیر، تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی بات کر کے آتا ہوں۔"

وہ ایک بار پھر چق اُٹھا کر دفتر میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد باہر آیا تو اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور ہاتھ میں چند نوٹ دبے ہوئے

تھے میرے قریب آکر وہ سرد لہجے میں بولا: "لو بھئی! تمہارا کام تو بن گیا" میں نے چودھری سے ایڈوانس کی بات کی تو اس نے پرس میرے سامنے اُلٹ دیا۔ اس میں کُل پندرہ روپے تھے۔ کہنے لگا کہ وہ جو میں نے سائننگ اماؤنٹ دیا ہے، وہ پیسے تو میں نے گاڑی میں پٹرول ڈلوانے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ فلمی دُنیا کے بڑے آدمیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ ابھی تم ان کی جیبوں میں نوٹوں کی گڈیاں دیکھو گے، دو تین گھنٹے بعد دیکھو گے کہ چپراسی کو تنخواہ دینے کے لیے کسی دوست سے اُدھار مانگ رہے ہیں۔ اس وقت ویسے بھی بینک بند ہو چکے ہیں چنانچہ نازو نے اپنے پرس سے پانچ سو روپے نکال کر دے دیے۔ تم میں ضرور کوئی خاص بات ہے۔ ہر انسان تم پر پہلی نظر میں ہی مہربان ہو جاتا ہے۔"

اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ یوں میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے میں خوشی سے اُچھلنے لگوں گا مگر میں نے نوٹوں کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ کھینچ لیا: "میں یہ رقم نہیں لے سکتا۔" میں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "ایک اجنبی عورت سے رقم لینا مجھے کچھ بے غیرتی سی لگ رہی ہے۔"

"ارے بھائی یہ احمقانہ بلکہ چھچھوروانہ باتیں چھوڑو۔ سب جگہ اور خاص طور پر فلمی دُنیا میں اسی طرح کام چلتا ہے اور پھر یہ تو اُدھار ہے۔ مرد نے دیا ہو یا عورت نے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ نازو فلم کمپنی سے تمہارے حساب میں خود ہی وصول کر لے گی۔ تم اس کی فکر مت کرو۔"

اشرف کے سمجھانے بجھانے پر مجھے وہ رقم رکھنی پڑی۔ ویسے بھی آنے والے دنوں کا تصور میرے ذہن میں رینگ آیا تھا اور رقم قبول کر لینے ہی میں عافیت محسوس ہوئی تھی۔ جیب میں رقم کیا آئی گویا جسم میں توانائی آگئی۔ باہر آکر ہم نے ایک بارونق ہوٹل میں ڈٹ کر کڑاہی گوشت اُڑایا پھر ویگن میں بیٹھ کر واپس شہر روانہ ہو گئے۔ چوبرجی پہنچ کر میں ویگن سے اُتر گیا کیونکہ مجھے مزنگ جانا تھا۔ اشرف اسی ویگن میں بیٹھا رہا۔ اسے سیکرٹیریٹ اُترنا تھا کیونکہ اس کا گھر کرشن نگر میں تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنا ایڈریس سمجھانے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور خیال یہی تھا کہ ہم بیچ درمیان گلیوں میں واقع ان گھروں کا محلِ وقوع اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ میں ویگن سے اُترنے لگا تو اشرف نے غالباً پچاسویں مرتبہ مجھے تاکید کی کہ پیر کو وقت پر اسٹوڈیو پہنچ جانا۔ سائڈ ہیرو کا چانس ہے، کہیں مس نہ کر دینا۔

مجھے معلوم تھا کہ یاد دہانی کرانے کا ایک مقصد ویگن کے باقی مسافروں پر رُعب ڈالنا بھی تھا اور وہ اپنے مقصد میں واقعی کامیاب رہا۔ لوگ کن انکھیوں سے کبھی اُس کی طرف اور کبھی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک نوجوان کے چہرے پر میں نے قدرے حسد [illegible] بھی دیکھی گویا وہ دل ہی دل میں کہہ رہا ہو [illegible] بننے کی... اور دھکے کھا رہے ہیں [illegible] دل میں کہا: کچھ عرصے کی بات ہے، برخوردار [illegible] میری ٹویوٹا کراؤن فراٹے بھر رہی ہوگی۔"

تیسرے دن میں اسٹوڈیو پہنچا تو اشرف [illegible] سے ٹیک لگائے میرا انتظار کر رہا تھا۔ تب مجھے یاد [illegible] میں کئی فلموں میں دیکھ چکا ہوں۔ کئی فلموں میں ہیرو [illegible] فوارے سے ٹیک لگا کر ہیرو کے انتظار میں دردناک [illegible]

ہم دونوں اشارہ فلمز کے دفتر میں آگئے۔ آج وہاں کا ماحول بڑا سنجیدہ اور بوجھل تھا۔ چودھری فضل داد آج تھری پیس سوٹ میں تھا مگر اس کی ٹائی کی گرہ ڈھیلی تھی، بال بکھرے ہوئے تھے [illegible] وہ بڑی سنجیدگی سے اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ اسکرپٹ پر تبادلہ [illegible] خیال میں مصروف تھا۔ کمرے میں اور کوئی بھی نہیں تھا [illegible] نہایت مستعدی سے نہ جانے کیوں اِدھر سے اُدھر ہو رہا [illegible] تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی، جس کا بھی فون آیا، چودھری نے اس سے بڑے مضطربانہ لہجے میں ہی بات کی۔

میری طرف چودھری نے کوئی خاص توجہ نہیں دی [illegible] اسکرپٹ کی کاپی ساتھ لایا تھا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر عنایت اللہ [illegible] مجھے چند شاٹس پر نشان لگا دیے اور ہدایت کی کہ میں ان شاٹس [illegible] میں اپنے ڈائیلاگ اچھی طرح یاد کر لوں۔ کچھ ریہرسلیں ابھی کمرے [illegible] ہوں گی پھر کیمرہ ریہرسل سیٹ پر جا کر ہی ہوگی۔

مجھے یہ ہدایات دینے کے بعد وہ دونوں پھر چودھری کے ساتھ [illegible] بحث و تمحیص میں مصروف ہو گئے۔ ڈائیلاگ مجھے تقریباً یاد [illegible] تھے پھر بھی میں انھیں زیرِ لب دُہرانے لگا۔ کچھ دیر اشرف بھی وہیں رہا پھر وہ معذرت کر کے چلا گیا۔ اسے ایک فلم میں خانساماں کے کردار میں اپنا دو جملوں کا سین شوٹ کروانا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس میں اسے پورا دن لگ جائے گا۔

میں ایک طرف بیٹھا ڈائیلاگ دُہراتا رہا اور کچھ بور بھی ہوتا رہا۔ میں وہ جوش و خروش اور اشتیاق محسوس نہیں کر رہا تھا جو میرے خیال میں فلمی دُنیا میں ایک نووارد کو محسوس کرنا چاہیے تھا [illegible] یونہی گزر گئے۔ اس دوران ٹیلی فون کر کے مصنف اکرم ملک کو بھی بُلا لیا گیا۔ پہلے تو وہ غالباً آنے پر ہی آمادہ نہیں تھا، چودھری نے [illegible] تو اس کی منّت کی پھر فون پر اسے دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں [illegible] بالآخر آدھ گھنٹے بعد وہ آ ہی گیا۔

اس نے اسکرپٹ میں کسی سین میں کوئی تبدیلی کرائی تھی، جس کے دوران خوب بحث مباحثہ ہوا۔ بہت سی گالیوں کا تبادلہ ہوا، بہت سی چائے کی پیالیاں خالی کی گئیں، بیسیوں سگریٹوں کا دھواں اُڑایا گیا۔ بالآخر اکرم ملک اپنا کام کر کے چلا گیا تو چودھری اور اسسٹنٹ بھی کاغذوں کے پلندے اُٹھا کر چل دیے۔

"فلور نمبر چار پر ہمارا سیٹ لگ رہا ہے۔" اسسٹنٹ نے مجھے بتایا۔ "ہم ذرا اس کا جائزہ لینے جا رہے ہیں۔ تم پانچ بجے نجے کے ساتھ میک اپ روم میں جا کر نذیر میک اپ مین سے میک اپ کرا لینا۔ اسے تمہارے مکمل گیٹ اپ کے بارے میں بتا دیا گیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ چودھری کے پیچھے تقریباً دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

میں مزید ایک گھنٹے تک اسکرپٹ سامنے رکھے بیٹھا رہا۔ حتّٰی کہ مجھے جمائیاں آنے لگیں۔ ڈائیلاگ مجھے ازبر ہو چکے تھے۔ کوئی خاص تھے بھی نہیں۔ بہت آسان اور روزمرہ کی بول چال کے عام سے جملے تھے۔ خدا خدا کر کے پانچ بجے تو چپراسی نجے نے خود ہی مجھ سے کہا: "چلیے صاحب! میک اپ روم میں چلیے!"

میں اس کی رہنمائی میں میک اپ روم میں پہنچا تو پہلی نظر میں وہ مجھے کسی حجام کی دُکان دکھائی دی۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ دکان ذرا بڑی تھی، کاؤنٹر لمبے تھے، آئینے اور ساز و سامان زیادہ تھا۔ کام کرنے والے بھی کئی تھے۔

وہاں شاید میرے بارے میں پہلے سے ہی ہدایات پہنچ چکی تھیں۔ مجھے فوراً کھینچ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا اور میرے چہرے پر یوں لیپا پوتی شروع کر دی گئی جیسے میں کوئی چوبی مجسمہ ہوں اور مجھ پر رنگ و روغن کیا جا رہا ہے۔ میک اپ مین کی انگلیوں میں سُلگتی ہوئی سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ وہ چٹکی بجا بجا کر اس کا گُل بھی جھاڑے جا رہا تھا، کش بھی لگا رہا تھا، میرا میک اپ بھی کر رہا تھا اور ساتھ ہی اس کی زبان بھی قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

میرے بال نہایت باریک کنگھی سے سنوار کر ان پر اسپرے کر کے انھیں جما دیا گیا اور آئینے میں وہ یوں دکھائی دینے لگے جیسے ان پر استری کی گئی ہو۔ آئی برو پنسل سے میری بھوویں تیکھی کی گئیں، رخساروں پر رُوج استعمال کیا گیا حتّٰی کہ ہونٹوں پر لپ اسٹک بھی لگائی گئی۔

میرے نقش و نگار میں تیکھا پن آگیا اور میں پہلے سے کچھ زیادہ خوبصورت دکھائی دینے لگا لیکن اس خوبصورتی میں کچھ نسوانیت سی آگئی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے شرم سی آنے لگی۔

"یار، یہ تم نے مجھے کیا بنا دیا ہے؟" میں نے دبی دبی زبان میں احتجاج کیا۔

"اللہ نے تو تمہیں جو کچھ بنایا ہے وہ تو بنایا ہی ہے میری جان! لیکن ماسٹر نذیر کا ہاتھ لگ جانے کے بعد تم دو آتشہ ہو گئے ہو... دو آتشہ...!" میک اپ مین کی ایک لمحے کے لیے رُکی ہوئی زبان پھر قینچی کی طرح چل پڑی: "تا ایک ایک نقش پردے پر یوں اُبھرے گا جیسے کسی عظیم مصوّر کا شاہکار سامنے آگیا ہو۔"

خدا خدا کر کے میرا میک اپ ختم ہوا اور مجھے 'وارڈ روب' میں بھیج دیا گیا۔ یہ ایک کمرہ تھا جہاں چاروں طرف الماریوں میں ہر طرح کے ملبوسات ٹنگے ہوئے تھے۔ رُومن سپاہیوں کی وردیوں سے لے کر جدید تراش خراش کے سُوٹ تک موجود تھے۔ میرے لیے ایک سُوٹ ہی منتخب کیا گیا۔ فلم میں میرا کردار ایک خوشحال تاجر کے بیٹے کا تھا۔ سُوٹ میرے جسم پر فٹ تو نہیں تھا لیکن کچھ ایسا بُرا بھی نہیں تھا۔ مجھے سب سے بڑا نقص یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس میں سے پسینے کی بُو آ رہی تھی۔ میں کچھ دیر پہلے سُن چکا تھا کہ بڑے ہیرو اور ہیروئنیں شوٹنگ کے دوران اسٹوڈیو سے وہ لباس نہیں لیتے جنھیں یہاں استعمال کیا جاتا ہے۔

میں تیار ہو کر نجے کی رہنمائی میں سیٹ پر پہنچا تو سبھی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ دو ایک آدمیوں نے آپس میں کھُسر پھُسر بھی کی۔ سیٹ ایک ڈرائنگ رُوم کا تھا جس کی دیواریں ہارڈ بورڈ کی تھیں جنھیں کیلوں کی مدد سے ایک دوسرے سے جوڑا جا رہا تھا۔

چھت کی جگہ لوہے کی بیموں کا جال سا بنا ہوا تھا جن پر بڑی چھوٹی لائٹس نصب تھیں۔ ان بیموں پر دو آدمی یوں چڑھے بیٹھے تھے جس طرح چڑیا گھر میں بند بندر کبھی چھت سے لٹک کر کرتب دکھاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح وہ لائٹس کے زاویے بدل بدل کر اور انھیں جلا بجھا کر دیکھ رہے تھے۔ فرش پر تاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور آوازیں گونج رہی تھیں: "بے بی لائٹ آن... دو نمبر آف... چار نمبر آن...!"

کچھ لوگ سر جوڑے ایک طرف کھڑے جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔ ہتھوڑیوں کی ٹھک ٹھک، لائٹ مین اور قلیوں وغیرہ کا شور شرابا اور ایک عجیب سی بُو تھی جیسی عموماً سیلن زدہ جگہوں پر ہوتی ہے۔ میرے تصورات سے خاصا مختلف اور کچھ غیر تخلیقی سا ماحول تھا۔

اسسٹنٹ ڈائریکٹر عنایت اللہ کئی آدمیوں کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ چودھری فضل داد ایک طرف کھڑا موٹے اور بے ہنگم قسم کے ایک شخص کے ساتھ زور و شور سے گفتگو کر رہا تھا اور کافی مضطرب نظر آ رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتا تھا اور کبھی اپنی ٹائی کو کھینچنے لگتا تھا۔ بالآخر موٹے آدمی نے اپنی ڈھیلی ---

ڈھالی قمیض کے نیچے ہاتھ ڈالا اور غالباً واسکٹ کی جیب سے سو سو کے نوٹوں کی موٹی موٹی دو گڈیاں نکال کر چودھری کی طرف بڑھائیں، جنھیں اُس نے فوراً ہی کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیا اور پھر جیسے اُسے کچھ قرار آگیا۔

مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ میرے خیال میں چونکہ چودھری ہدایت کار ہونے کے ساتھ ساتھ فلمساز بھی تھا، اس لیے اسے بہت دولت مند ہونا چاہیے تھا اور اسے کسی سے رقم لینے کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیے تھی پھر میں نے حسبِ عادت دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا "میاں! تمھیں یہاں کے اسرار و رموز کا علم ہی کیا ہے۔ تمھیں یہاں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے، ابھی تو آنکھوں سے کوئی چیز دیکھ کر بھی اس کا مطلب نہیں سمجھ سکتے، اس لیے ان اُلجھنوں کو چھوڑو اور صرف اپنے کام سے کام رکھو، اپنی فکر کرو۔"

میں لوہے کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس ماحول میں اُلجھن سی ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اُٹھ کر بھاگ جاؤں لیکن اب یہ میرے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ موٹا آدمی رخصت ہُوا تو چودھری سیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا پھر اُس نے اسسٹنٹ کو آواز دی "عنایت وہ نازو ابھی تک نہیں آئی کیا؟"

"میڈم آچکی ہیں، سر!" عنایت اللہ نے مستعدی سے لپک کر اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا "وہ چھ نمبر پر رانا صاحب کی فلم کا اوپننگ شاٹ دیکھ رہی ہیں۔ وہاں سے سیدھی اِدھر ہی آئیں گی۔"

"اچھا... اچھا..." چودھری نے طمانیت سے سر ہلایا پھر وہ میری طرف متوجہ ہُوا "تم کمرہ ریہرسل کے لیے تیار ہو جاؤ برخوردار! اپنی ٹائی شائی ٹھیک کر لو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی ٹائی کی گرہ کچھ اور ڈھیلی کر لی۔

مجھے وہاں بیٹھے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ دروازے کی طرف سے مبہم سا شور سُنائی دیا "میڈم آگئیں... میڈم آگئیں..."

فلور کا دروازہ کھلا اور میں نے نازو کو سیٹ پر آتے دیکھا۔ کیا شاہانہ چال تھی اس کی۔ وہ زرق برق لباس میں تھی اور ہر قدم پر قیامتیں اس کے ساتھ چل رہی تھیں۔ سبھی نے مُڑ کر بیک وقت اس کی طرف دیکھا اور سبھی کی سانسیں بیک وقت گویا سینوں میں اٹک کر رہ گئیں۔

وہ بھی گیٹ اپ میں تھی اور شاید فلم میں اُسے کلب ڈانسر کے طور پر کوئی گانا وغیرہ پکچرائز کرانا تھا... اس کا حلیہ کچھ اسی قسم کا تھا۔ اس کے چہرے پر میک اپ کی گہری تہیں تھیں۔ اس طرح اس کا چہرہ اسکرین پر تو شاید زیادہ حسین نظر آتا ہوگا لیکن مجھے وہ اس روز زیادہ خوبصورت نہ لگی تھی جس روز میں نے اسے پہلی بار نہایت ہلکے میک اپ میں چودھری کے کمرے میں دیکھا تھا۔ ایک لڑکا بیوٹی باکس اُٹھائے اُس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

اُس نے سیٹ پر آ کر ہاتھ ہلا کر دُور دُور ہی سے سب سے علیک سلیک کی پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی تو سیدھی میری طرف آ گئی۔ میں نے اُسے آتے دیکھا تو بوکھلا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے مجھے مناسب الفاظ نہ سُوجھے تو میں محض دانت نکال کر ہی رہ گیا۔

"بیٹھیے... بیٹھیے..." وہ خود بیٹھتے ہوئے ہاتھ ہلا کر بولی "آپ تو یوں کھڑے ہو گئے جیسے میں کسی ملک کی ملکہ ہوں اور آپ میری رعایا میں شامل ہیں۔"

"ہو سکتا ہے اس صورت میں میرے دل میں آپ کے لیے اتنا احترام نہ ہوتا جتنا کہ اب ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ اُس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور ایک ہی لمحے میں گویا میری رُوح تک اُتر گئی۔ اس ایک لمحے میں اُس نے مجھے اچھی طرح پڑھ لیا۔

میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ اس نے کوئی بہت ہی اعلیٰ قسم کا کلون اسپرے لگا رکھا تھا۔ اس کی آمد سے پورا سیٹ مہک اُٹھا تھا۔ چودھری اس کے سامنے آن کھڑا ہُوا کچھ دیر وہ دونوں خالص پیشہ ورانہ گفتگو کرتے رہے پھر اُن سچویشنز کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں، جن کی شوٹنگ آج ہونا تھی۔ چودھری، نازو کو سمجھا کر فارغ ہُوا تو ایک لڑکے نے رازدارانہ انداز میں چودھری کو کوئی پیغام دیا اور وہ فوراً سیٹ سے نہ جانے کہاں چلا گیا۔

نازو کچھ دیر سوچ میں ڈوبی رہی پھر اِدھر اُدھر نظر ڈال کر جماہی لیتے ہوئے مجھ سے بولی "تم بہت سادہ آدمی ہو۔ پہلے تو کبھی کبھی میں صرف اپنے بارے میں سوچ کر حیران ہُوا کرتی تھی کہ میں کس طرح فلم انڈسٹری میں پہنچ گئی۔ اب میں تمھیں دیکھ کر اس سے بھی زیادہ حیران ہو رہی ہُوں۔ یہاں تو بڑے بڑے شاطر اپنا راستہ نہیں بنا پاتے، بڑے بڑے خوب رُو، ناک رگڑتے پھرتے ہیں مگر انھیں ایک سین کا چانس بھی نہیں ملتا، تم کتنی سادگی سے مُنہ اُٹھائے آئے اور سائڈ ہیرو بن گئے۔"

...پھر وہ کچھ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی "شاید اس لیے کہ تمھیں فلموں میں کام کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ یہ دُنیا بڑی عجیب جگہ ہے۔ جس چیز کی طلب نہ ہو وہ خود بخود ہی انسان کو مل جاتی ہے اور جس کی تلاش میں انسان ہلکان ہوتا رہتا ہے، وہ اسے ملتی نہیں۔" پھر جیسے وہ کچھ سوچ کر چونکی اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی "میرے اندازے کے مطابق تو یہاں کام شروع ہونے میں کم از کم ایک گھنٹہ باقی ہے۔ آؤ کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں تو بہت شور شرابا ہے۔ بات کرنے میں لطف نہیں آ رہا۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

مجھے بھلا کیا انکار ہو سکتا تھا؟ میں بھی اُٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ سیٹ پر کام کرتے ہوئے کئی آدمی دزدیدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے لیکن نازو کو جیسے کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔

ہم فلور سے نکلے اور اسی عمارت کے گرد گھوم کر اس کے عقب میں پہنچے۔ یہاں سے ایک تنگ سا زینہ بل کھاتا ہُوا اُوپر جا رہا تھا۔ سیڑھیوں پر گرد کی ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ شاذ و نادر ہی کوئی ان سیڑھیوں کے راستے اُوپر جاتا ہے لیکن نازو کا رُخ انہی کی طرف تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالآخر ہم چھت پر پہنچ گئے۔

یہ عمارت ایک بہت بڑے گودام جیسی تھی اور اسے کئی حصّوں میں تقسیم کر کے کئی فلور بنائے گئے تھے۔ اسی حساب سے اس کی چھت بہت کشادہ تھی اور کسی میدان سے مشابہ معلوم ہو رہی تھی۔ چھت کی منڈیر کافی اُونچی تھی لیکن کھڑے کھڑے بہت دُور تک نظارا کیا جا سکتا تھا۔ چھت کے وسط میں ٹوٹے پھوٹے فرنیچر اور دیگر کاٹھ کباڑ کا انبار لگا ہُوا تھا غالباً اسی کاٹھ کباڑ میں سے ایک صوفہ جو قدرے بہتر حالت میں تھا ایک طرف ہٹا کر سیدھا رکھ دیا گیا تھا۔ نازو اُسی صوفے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ یوں میرے شانہ بہ شانہ چل رہی تھی جیسے ہمارے درمیان برسوں کی رفاقت اور شناسائی ہو۔ مجھے خود بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ میں اسے ایک مدت سے جانتا ہُوں۔

صوفے پر گرد کی ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی۔ میرے پاس رُومال نہیں تھا۔ میں صوفے کو صاف کرنے کا طریقہ سوچ ہی رہا تھا کہ نازو نے پرس سے رُومال نکالا اور نہایت اطمینان سے اسے صاف کرنے لگی۔ اس کی ذات میں تکلف تصنع اور احساسِ برتری کی ذرا سی بھی جھلک نہیں تھی۔ میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی دُنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں اور وہ اتنی آسانی سے مل بھی جاتے ہیں اور یوں مہربان بھی ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس کے ہاتھ سے رُومال لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "لائیے میں صاف کر دیتا ہُوں۔"

"تکلف کی ضرورت نہیں۔" وہ لاپروائی سے بولی "میں صاف کروں یا تم... اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

ہم صوفے پر بیٹھ گئے تو وہ گہری سانس لے کر بولی "کیسی پُر سکون جگہ ہے اور کیسی کھلی ہَوا ہے یہاں۔ سیٹ پر تو میرا دَم گھٹنے لگتا ہے اور کیمرے کے سامنے جاتے ہوئے تو وحشت ہوتی ہے مگر کیا کروں اب تصنع اور بناوٹ کی اس دُنیا میں آ ہی گئے ہیں تو جھوٹے تاثرات کا کاروبار کرنا ہی پڑے گا۔" اس نے صوفے کے پچھلے سے ٹیک لگالی اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "میرا دل جب زیادہ گھبرانے لگتا ہے تو میں چُپ چاپ سب کی نظر بچا کر یہاں آ بیٹھتی ہُوں اور دیر تک اُن دُور اُفتادہ کھیتوں اور سبزہ زاروں کو تکتی رہتی ہُوں اور اپنی تنہائیوں سے کھیلتی رہتی ہُوں۔"

اس کی باتیں واقعی میرے لیے بے پناہ حیرت کا باعث تھیں۔ جھوٹی اداؤں اور جھوٹے جذبوں کے اس بازار میں کوئی عورت اس طرح بھی سوچ سکتی تھی، یہ تو خود میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔ اندر سے وہ یقیناً بڑی اُجلی عورت تھی، بہت کھری اور قابلِ قدر... اس کی عمر زیادہ نہیں تھی، بظاہر الہڑ سی لڑکی لگتی تھی... مگر تھی بہت گہری اور اس کی ذات کی گہرائیوں میں یقیناً بہت سے اسرار دفن تھے۔

یہ تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اُس بازار سے تعلق نہیں رکھتی اور نہ ہی اُن لڑکیوں میں سے ہے، جو ہوتی تو اسی قبیل کی ہیں مگر بازار میں نہیں بیٹھتیں۔ بس کسی نہ کسی طرح جوڑ توڑ کر کے کسی فلمساز یا ہدایت کار کو شیشے میں اُتار کر فلمی دُنیا میں آ جاتی ہیں اور جن کی زندگی کا واحد مقصد شہرت اور دولت کمانا ہوتا ہے لیکن نازو کہاں سے آئی تھی اور کیونکر آئی تھی، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اشرف خان جیسے فلمی دُنیا کے پُرانے بھیدی کو بھی معلوم نہیں تھا۔

"اُس دن آپ نے مجھ پر جو احسان..." میں نے کہنا شروع کیا... لیکن اُس نے فوراً ہی میری بات کاٹ دی۔

"میں آپ کو اس قسم کی رسمی اور فضول باتیں سُننے یا سُنانے کے لیے یہاں نہیں لائی۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولی "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ رقم میں نے اگلے ہی روز چودھری سے آپ کے حساب میں وصول کر لی تھی۔ آپ خواہ مخواہ خود کو زیرِ احسان نہ سمجھیں۔"

میں قدرے کھسیاہٹ کے عالم میں خاموش رہا تو وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "میں آپ کو اس لیے یہاں لائی ہُوں کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں جان سکیں۔"

"میری ذات کے ساتھ کوئی خاص کہانی وابستہ نہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میں بس ایک سیدھا سادا دیہاتی نوجوان ہُوں۔ بی اے کر کے نوکری کی تلاش میں دھکّے کھا رہا تھا۔"

مجھے بات ادھوری چھوڑ کر چونک جانا پڑا اور دراصل مجھے چیت پہ دھمک سی محسوس ہوئی تھی۔ نازو کی نظر بھی سیڑھیوں کی طرف

اُٹھ گئی۔ چار لحیم شحیم آدمی ہماری طرف چلے آ رہے تھے۔ چلنے کا انداز فلمی غنڈوں جیسا تھا اور حلیے بھی کچھ اسی قسم کے تھے۔ کھلے گریبان چڑھی ہوئی آستینیں اور گلے میں لاکٹ یا زنجیر... وہ پیروں پر کچھ زیادہ ہی زور دے کر چل رہے تھے اس لیے چھت پر اچھی خاصی دھمک پیدا ہو رہی تھی۔

مَیں نے محسوس کیا کہ نازو انھیں دیکھ کر مضطرب نظر آنے لگی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو حتی الامکان پُراعتماد اور بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بدستور ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی رہی اور پاؤں ہلاتی رہی۔ مَیں بھی اضطراب چھپائے بیٹھا رہا۔

وہ چاروں یوں ہمارے سامنے آن کھڑے ہوئے جیسے ہم کھونٹے سے بندھے ہوئے مویشی ہوں اور وہ ہمارا سودا کرنے سے پہلے جائزہ لے رہے ہوں پھر انھوں نے مجھے گویا قطعی غیر اہم سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیا اور نازو کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن اُن کے کچھ بولنے سے پہلے ہی نازو بول اُٹھی: "آج تو تم چاروں اپنی اپنی کھال سے کچھ زیادہ ہی باہر آ گئے ہو۔"

"ابھی تم اتنی بڑی ہیروئن نہیں بنی ہو بائی جی کہ یوں گردن اُٹھا کر ہم سے بات کرنے لگو۔" ایک شخص جو اُن کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا خطرناک لہجے میں بولا۔

نازو یک لخت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ وہ غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی: "خبردار جو مجھے بائی جی کہا۔ مَیں اس بازار سے نہیں آئی ہُوں... اور مَیں خواہ چھوٹی ہیروئن ہُوں یا بڑی لیکن تم جیسے کرائے کے بدمعاشوں سے مرعوب نہیں ہو سکتی۔"

"صدقے جاؤں۔" وہ بدمعاش خالص فلمی انداز میں گردن کو جھٹکا دے کر بولا... پھر اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ ہم آہنگ ہو کر ہنس پڑے پھر وہ ایک جھٹکے سے نازو کی طرف مُڑتے ہوئے غضبناک لہجے میں بولا: "جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں تمھیں اس دُنیا میں آئے ہوئے اور نخرے ابھی سے آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔ ٹکے ٹکے کے مراثیوں کی فلمیں سائن کرتی پھر رہی ہو اور شاہ جی کی فلم سے انکار کر دیا۔ کسی نے تمھیں بتایا نہیں کہ شاہ جی کی فلموں سے انکار کرنے کی جُرأت کم از کم کسی نئی بچی کو کبھی نہیں ہوئی... اور یہ جو تم بڑی معزز بننے کی کوشش کر رہی ہو تا کہ میں اس بازار سے نہیں آئی تو جگہ جگہ یہ اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے لوگ تمھیں شریف زادی اور پارسا تسلیم نہیں کر لیں گے۔" پھر وہ پاؤں پٹخ کر بولا: "آخر تمھیں تکلیف کیا پہنچی تھی شاہ صاحب سے...؟"

اس کا انداز انتہائی ذلت آمیز تھا اور وہ کچھ اس طرح نازو کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ انسان نہیں بلکہ نالی کا کیڑا ہے۔ نازو غصّے سے تھرتھر کانپ رہی تھی مگر اس غصّے میں بےبسی کی آمیزش تھی۔ اپنی بےبسی کے احساس سے ہی غالباً اس کی آنکھیں چھلک آئی تھیں۔ یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر تھا۔ مَیں قدرے پیچھے ہٹ کر کھڑا تھا لہٰذا ایک قدم آگے بڑھ کر ان بدمعاشوں کے سرغنہ اور نازو کے درمیان حائل ہوتے ہوئے کہا: "تمھیں شاید کسی نے یہ نہیں بتایا کہ کسی خاتون سے بات کس طرح کی جاتی ہے...؟"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا: "اور تمھیں شاید کسی نے یہ نہیں بتایا کہ جو ہمارے سامنے ہیرو بننے کی کوشش کرتے ہیں، اُن کا انجام کیا ہوتا ہے؟" اس کے بعد اُس نے مجھے ایک موٹی سی گالی دی۔ میرا دماغ گھوم گیا۔ مجھے قطعاً اس بات کی پروا نہ رہی کہ مَیں جو کچھ کرنے والا ہُوں اُس کا انجام کیا ہو گا۔ مَیں نے پوری قوت سے اُس کی اُبھری ہوئی توند پر گھونسا رسید کر دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ اکثر موٹے آدمیوں کی طرح اس کی توند بھی پلپلی ہو گی مگر ایسا نہیں تھا۔ میرے گھونسے کا اس پر کوئی خاص اثر نہ ہُوا۔ البتہ اُس نے نہایت پھرتی اور ماہرانہ انداز میں میری کنپٹی پر جو گھونسا رسید کیا، اُس سے مَیں صوفے پر جا گرا اور صوفے سمیت اُلٹ گیا۔

مَیں چکرا کر رہ گیا تھا لیکن ان لوگوں کے حقارت آمیز قہقہوں نے گویا میری آنکھوں کے سامنے پھیلا ہُوا اندھیرا دُور کر دیا اور مَیں سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ نپے تُلے قدموں سے مَیں بدمعاشوں کے سرغنے کے سامنے پہنچا۔ باقی بدمعاشوں نے لپک کر مجھے پکڑنے کی کوشش کی مگر سرغنے نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں روک دیا۔ اس کے ہونٹوں پر خونخوار مسکراہٹ تھی اور وہ شاید میری کیفیت سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ مجھے سنبھالنا اُس کے لیے قطعاً کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

مَیں کوئی پیشہ ور لڑاکا نہیں تھا۔ لڑائی کے داؤ پیچ مجھے نہیں آتے تھے لیکن اس وقت میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ انتظار میں کھڑا ہے کہ مَیں اس کے مُنہ پر گھونسا رسید کرنے کی کوشش کروں تو وہ اس گھونسے کو بازو پر روک کر مجھ پر جوابی حملہ کرے لیکن مَیں نے اُس کی توقع پوری نہیں ہونے دی۔ مَیں نے اچانک ہی اس کی ناک پر ٹکر رسید کر دی اور جیسے ہی وہ بلبلا کر ہٹا، مَیں نے اس کی پسلیوں پر گھونسا رسید کیا اور ساتھ ہی اس کی پنڈلی پر ٹھوکر ماری۔ وہ ڈکراتا ہُوا چت گر گیا لیکن اس کے ساتھ ہی مجھ پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا۔ باقی تینوں بدمعاشوں نے بیک وقت مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھ پر ہر طرف سے ہتھوڑے برس رہے ہُوں۔ مجھے تو بس اتنا ہی احساس رہا کہ نازو ہسٹریائی انداز میں مدد کے لیے چیخ رہی ہے۔ اس کے بعد میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

●

آنکھ کھلی تو کافی دیر تک میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ مَیں کہاں ہُوں اور نہ ہی یاد آیا کہ مجھے کچھ ہُوا تھا پھر پسلیوں میں ٹیسیں اُٹھیں تو گویا ذہن سے دُھند چھٹتی چلی گئی۔ سب کچھ یاد آ گیا اور یہ احساس بھی ہو گیا کہ مَیں اپنے ہی مکان میں ہُوں۔ معلوم نہیں، کون مجھے یہاں لایا تھا پھر مجھے باورچی خانے کی طرف سے برتنوں کے کھنکنے کی آواز سُنائی دی اور مجھے کچھ اطمینان ہُوا کہ مکان میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ شاید وہی حالات پر کچھ روشنی ڈال سکے کہ میرے بےہوش ہونے کے بعد کیا ہُوا تھا۔ چند لمحے بعد اشرف کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس کے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے، جن سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کی باچھیں پھیل گئیں۔ کپ میرے قریب ہی تپائی پر رکھتے ہوئے بولا: "ڈاکٹر کا اندازہ ٹھیک تھا کہ آج کسی بھی وقت تم ہوش میں آ جاؤ گے۔ اب زیادہ تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی؟"

"نہیں...!" مَیں نے نفی میں سر ہلایا: "بس پسلیوں میں درد محسوس ہو رہا ہے۔"

"شکر کرو کہ درد صرف پسلیوں ہی میں رہ گیا ہے ورنہ ممکن تھا کہ تم سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں لیے اس دُنیا سے رخصت ہی ہو جاتے۔" اشرف میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا: "وہ تو نازو کی چیخ و پکار سُن کر کچھ لوگ بروقت تمھاری مدد کو پہنچ گئے، ورنہ بدمعاش تو تمھارا پتّہ ہی صاف کر دیتے... لوگوں نے تمھیں بچا لیا پھر تمھیں ہسپتال پہنچایا گیا۔ بےہوشی کے عالم میں ہی ایک دن تمھارا علاج ہُوا۔ معلوم نہیں کہ کس مصلحت کے تحت نازو نے پولیس کیس نہیں بننے دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خود اس معاملے سے نمٹے گی۔ اسی لیے اس نے تمھیں زیادہ دیر اسپتال میں بھی نہیں رہنے دیا اور تمھاری جیب میں موجود ایک لفافے پر تمھارا ایڈریس وغیرہ دیکھ کر تمھیں یہیں لے آئی اور یہیں کئی ڈاکٹر آ کر تمھیں دیکھتے رہے۔ خدا کا شکر ہے، تمھیں کوئی مہلک چوٹ نہیں لگی تھی۔"

"نازو کہاں ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"وہ چوبیس گھنٹے تمھارے پاس موجود رہی۔ یہ کباڑ خانہ جسے تم اپنا گھر سمجھتے ہو، اس کی اب جو اتنی بہتر حالت نظر آ رہی ہے، یہ اسی عورت کے دستِ کمال کا نتیجہ ہے۔" اشرف نے چاروں طرف ہاتھ گھماتے ہوئے کہا: "مَیں نے فلمی دُنیا کی کسی عورت کو ایسے گھریلو انداز میں کسی کی خدمت کرتے اور گھر کو سنوارتے نہیں دیکھا۔ اس وقت وہ کسی ضروری کام سے کہیں گئی ہے۔ مجھ سے کہہ گئی تھی کہ جب تک تمھیں ہوش نہ آ جائے تمھارے پاس ہی موجود رہوں۔ اچھا اب تم باتیں بند کرو اور اس سے پہلے کہ یہ شربت میں تبدیل ہو جائے، چائے پی لو۔"

"آخر وہ لوگ تھے کون؟" مَیں نے کپ اُٹھاتے ہوئے اُلجھن سے پوچھا۔

"مَیں ان کے متعلق زیادہ نہیں جانتا۔" اشرف بولا: "مَیں تو نازو کے متعلق بھی زیادہ نہیں جانتا اور نہ ہی مَیں تمھارے متعلق ہی زیادہ جانتا ہُوں۔ گویا عمومی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ میری معلومات عامّہ بہت ہی کمزور ہے۔" وہ چائے کی ایک چُسکی لے کر بولا: "بس اب تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ تمھاری وجہ سے چودھری کو تمھارے سین چھوڑ کر دوسرے مناظر کی شوٹنگ کرنی پڑ رہی ہے۔"

"چھوڑو یار!" مَیں نے بےزاری سے کہا: "مَیں نے فلمی دُنیا کو بگڑنے سے پہلے ہی چھوڑ دیا ہے۔ اتنا ہی تجربہ کافی ہے۔ مَیں بھر پایا فلم لائن سے۔ میرا دل پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ لائن مجھے راس نہیں آئے گی۔ فلم انڈسٹری میں آگے بڑھنا میرے بس کی بات نہیں۔"

"ارے یار! ایسی بھی کیا بددلی۔ اتنا اچھا چانس ملا ہُوا ہے۔" اشرف نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہاں، واقعی بہت اچھا چانس ملا ہے۔" مَیں نے مسکرانے کی کوشش کی: "شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے ہی دو دن بےہوش رہا ہُوں۔ میرا خیال ہے، پہلا سین ہی پکچرائز کرانے کی کوشش میں راہیِ ملکِ عدم ہو جاؤں گا بھائی! مجھے تو معاف ہی رکھو۔ مَیں مفلس و گمنام ہی ٹھیک ہُوں۔" پھر مَیں نے گویا اسے ایک اور پہلو سے اپنا نکتہ نظر سمجھانے کی کوشش کی: "مجھ پر اتنا بڑا حادثہ گزر گیا، یہ بتاؤ کہ چودھری مجھے دیکھنے یا میرا حال پوچھنے آیا؟"

"نہیں...!" اشرف نے ہچکچاتے ہوئے تسلیم کیا: "بلکہ وہ تو تمھارا کنٹریکٹ فارم چھپاتا پھر رہا تھا کہ تم سے فی الحال اس کا کوئی تعلق ظاہر نہ ہو اور اگر پولیس کیس بنے تو کہیں اسے خواہ مخواہ تفتیش میں ملوّث نہ ہونا پڑے۔ اس کا کہنا تھا کہ فلم میں تمھارا کام مکمل ہونے تک وہ پریس میں تمھاری پبلسٹی بھی نہیں ہونے دے گا اور اس بات کو خفیہ رکھے گا کہ کس نے سائڈ ہیرو کے طور پر کسے کاسٹ کیا ہے جب یہ لڑائی جھگڑے والا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تب وہ اس بات کو سامنے آنے دے گا... اور مجھے اس کا خوف دیکھ کر حیرت ہوتی ہے

کیونکہ چودھری لڑائی جھگڑے سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہے۔ اس کے اپنے آج تک معلوم نہیں کتنے پھڈے ہو چکے ہیں... مگر اس معاملے نے تو جیسے اسے بھی کچھ پریشان کر دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ کنٹریکٹ ہی منسوخ کرنے کا نہ سوچ رہا ہو۔ تم مزید دو ایک شوٹنگز پر نہ پہنچے تو شاید وہ معاہدہ منسوخ کر دے۔"

"میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب تو تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو نا؟ اگر میں کوئی سپرہٹ ہیرو ہوتا اور چودھری صاحب کی فلم میں میرا کچھ کام فلم بند بھی ہو چکا ہوتا تو اس وقت وہ میری چارپائی کا طواف کر رہا ہوتا۔ اس دُنیا میں صرف چڑھتے سورج کی پُوجا ہوتی ہے۔ مجھے اس دُنیا میں جاتے ہوئے خوف آنے لگا ہے۔ معلوم نہیں میرا کیا انجام ہو۔"

"ہاں! یہ تو تم درست کہہ رہے ہو۔" اشرف خان دھیمے لہجے میں بولا۔ "ویسے تو خیر پوری دُنیا ہی چڑھتے سورج کی پُجاری ہے لیکن فلمی دُنیا میں بالخصوص میں نے بڑے عبرت ناک تماشے دیکھے ہیں... مگر ہر جگہ ہر طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ اب نازو ہی کو دیکھ لو۔ اس لڑکی سے تمھاری چار دن کی بھی شناسائی نہیں مگر وہ گویا تم پر جان نچھاور کرنے کو بے قرار ہو رہی ہے۔"

"وہ کیچڑ میں کھلا ہُوا کنول ہے۔" میں نے بے اختیار کہا۔ میرے لہجے میں شاید کچھ زیادہ ہی والہانہ پن پیدا ہو گیا تھا کیونکہ اشرف نے چونک کر عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھا تھا... پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "یار! مجھے اب اجازت دو۔ تمھاری حالت اب تسلی بخش ہے۔ نازو بھی تھوڑی دیر میں آ جائے گی۔ میرا اس وقت اسٹوڈیو پہنچنا ضروری ہے۔ ایک تو مالی حالت بہت پتلی ہو گئی ہے۔ دوسرے آج ایک ایسی فلم کی شوٹنگ ہے جس میں بڑی منت سماجت کے بعد مجھے چھوٹا سا رول ملا ہے اگر بروقت شوٹنگ پر نہ پہنچا تو کہیں مجھے فلم سے کٹ ہی نہ کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ شاید کچھ رقم بھی مل جائے۔ جیب میں کُل سات روپے پڑے ہیں۔"

"ارے یار! رقم کی کیوں فکر کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "میرے پاس تھوڑی بہت رقم موجود ہے۔ شوٹنگ پر تو معلوم نہیں تمھیں کچھ ملے یا نہ ملے، تم تھوڑی بہت رقم مجھ سے لے جاؤ۔"

میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ مارا۔ میں اپنی پونجی وہیں رکھا کرتا تھا۔ اس وقت بھی میرے اندازے کے مطابق وہاں ڈیڑھ دو سو روپے ہونے چاہئیں تھے لیکن میں نے ہاتھ مارا تو وہاں مجھے کافی نوٹوں کی موجودگی کا احساس ہُوا۔ میں نے تکیہ ذرا سا اُٹھا کر دیکھا تو وہاں سو سو کے بہت سے کڑاکے نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ کم از کم بیس تو ضرور ہوں گے۔ مجھے یک لخت جھٹکا سا لگا کہ یہ رقم کہاں سے آ گئی... پھر میں سمجھ گیا کہ یہ نوازش نازو کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ اس احساس سے مجھے ایک بار پھر ندامت محسوس ہوئی کہ ایک عورت میری اتنی مدد کیے جا رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ وہ آئے گی تو اس موضوع پر اس سے ضرور بات کروں گا۔ اشرف سے اس سلسلے میں کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے خاموشی سے [illegible] سو روپے اشرف کی طرف بڑھا دیئے، جو اس نے میرے بے پناہ اصرار پر شرماتے شرماتے لیے اور رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک بستر پر پڑا اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ منظر میری چشمِ تصور میں ایک بار نہیں، کئی بار اُبھرا کہ تین بدمعاش مجھے فٹ بال کی طرح اُچھال رہے تھے، گھونسے مار مار کر ایک دوسرے کی طرف دھکیل رہے تھے۔ ہر بار اس منظر کو ذہن میں دُہراتے ہوئے میری رگوں میں چنگاریاں سی تیرنے لگتیں۔ میں اپنی پسلیوں کا درد بھی بھول گیا اور اُٹھ کر مضطربانہ انداز میں ٹہلنے لگا۔

غیر ارادی طور پر بار بار میری مٹھیاں بھنچ جاتی تھیں۔ خود پرستی سے قطع نظر میں نے جب اس صُورتِ حال کا تجزیہ کیا تو اسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ بدمعاش اتنی آسانی سے مجھے زیر نہیں کر سکتے تھے۔ لحیم شحیم اور تندرست و توانا ہونے کے باوجود ایک بار تو انھیں ضرور ماتھوں پسینہ آ جاتا بشرطیکہ میں لڑائی بھڑائی کے داؤ پیچ سے کچھ واقف ہوتا۔ وہ پیشہ ور بدمعاش تھے۔ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود وہ مجھ پر اندھا دُھند نہیں ٹوٹ پڑے تھے۔ انھوں نے بڑی مشاقی اور نپے تُلے انداز میں مجھے محض دو منٹ میں ہی بے حال کر دیا تھا۔

دیہات میں کبھی نوعمری میں مجھے چھوٹے موٹے جھگڑوں سے واسطہ پڑا تھا اور ہمیشہ جیت چونکہ میری ہوتی تھی، اس لیے مجھے اپنے اُونچے قد، چوڑی چھاتی، مضبوط ہاتھ پیروں اور مستعدی یا چُستی پر ناز رہا تھا لیکن اب مجھے اندازہ ہُوا تھا کہ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ اگر انسان کو تھوڑے بہت داؤ پیچ اور لڑائی کی مخصوص تیکنیک پر بھی عبور حاصل ہو تو وہ بیک وقت کئی کئی بدمعاشوں کو سنبھال سکتا ہے اور اکیلے دُکیلے کو تو اچھا خاصا سبق دے سکتا ہے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ اس ذلت آمیز صُورتِ حال کو یاد کرتے ہوئے میرے اعصاب پر تناؤ طاری ہو رہا تھا اور فی الحال یہ چیز میرے لیے ٹھیک نہیں تھی کیونکہ میں مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہُوا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے آپ کو دوسری چیزوں کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

میرا یہ مکان جس کے ڈربہ نما کمرے آج سے پہلے کسی ایسے ریچھ کی کھوہ سے مشابہ نظر آتے تھے جسے تغیراتِ زمانہ نے تھوڑا سا مہذب بنا دیا ہو، اب باقاعدہ کسی سُلجھے ہوئے انسان کا مسکن معلوم ہو رہے تھے۔ ہر چیز سے صفائی و ستھرائی اور سلیقہ عیاں تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ نازو نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔

مجھے بے چینی سے نازو کا انتظار تھا۔ میں واقعی اس عورت کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس عورت نے میری زندگی میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ میں اس سے اَن گنت باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنا دل چیر کر اس کے سامنے رکھ دینا چاہتا تھا۔ میرے ذہن نے اس کے بارے میں نہ جانے کتنے سپنوں کے جال بُن ڈالے تھے... مگر اس کی آمد کے تو آثار ہی نظر نہیں آ رہے تھے۔

کئی گھنٹے گزر گئے... مگر وہ نہ آئی۔

ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ میرا انتظار، میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ میرا رُواں رُواں جیسے کسی اذیت میں گرفتار تھا۔ ذرا سی آہٹ ہوتی تو میں لپک کر دروازے پر پہنچتا کہ شاید وہ آ گئی... لیکن گلی میں جھانک کر دیکھتا تو کہیں اس کا نشان تک دکھائی نہ دیتا۔ کہیں دُور بھی کوئی رکشہ آ کر رُکتا تو میں انتظار کی زنجیر سے بندھا دروازے پر آتا مگر کسی اور مکان پر کوئی اور عورت یا مرد اُتر کر اندر جاتا دکھائی دیتا تو میں دلِ وحشی کو سمجھاتا ہُوا اندر لوٹ آتا۔

"وہ فلمی عورت ہے... کیا تم اُس کی مصروفیات کا اندازہ نہیں کر سکتے؟" میں عقل ہی دل میں اپنے آپ سے کہتا۔ "یہی کیا کم ہے کہ اس بے مہر دُنیا کی دوڑ بھاگ میں وہ اُس وقت تمھارے ساتھ رہی جب تم بے یار و مددگار، بے خبر اور نیم جاں پڑے ہوئے تھے۔ اب اسے کچھ اپنی ذاتی ذمے داریاں بھی پوری کرنے دو۔" اپنے آپ کو ہر حیلے بہانے سے سمجھانے کے باوجود اپنے ہی گھر میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اسی کربناک انتظار میں رات آ گئی... اور آنکھوں میں کٹ گئی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اندازہ ہُوا کہ انتظار کی اذیت کیا ہوتی ہے۔ دورانِ شب کئی بار میں نے سونے کی کوشش بھی کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دُور رہی۔

صبح طبیعت میں بے پناہ کسلمندی تھی اور اسی طرح دل و دماغ پر بھی افسردگی، یاسیت اور قنوطیت کا غلبہ تھا۔ اس عالم میں میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ "جاہل! اس عورت نے ذرا سا التفات کیا برتا، تم تو بولانے ہی ہو رہے ہو۔ بھئی اُس نے اپنا اخلاقی فرض ادا کر دیا۔ جہاں تک تمھیں مدد کی ضرورت تھی، وہ تمھارے شانہ بہ شانہ رہی۔ آخر اُس کی بھی تو کچھ مصروفیات ہوں گی۔ تم نے تو خواہ مخواہ ہی اتنی توقعات وابستہ کر لی ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ وہ تم پر مرمٹی ہو۔ تم نے اس کی عنایات و التفات کا غلط مطلب لیا ہے۔ اگر کوئی مہربان ہو ہی جائے یا اچھا سلوک کرے تو اس پر مسلط ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اسے اپنے کاروبارِ حیات میں مگن رہنے دو اور تم بھی اب ان فضول چکروں سے نکل کر کارزارِ حیات میں ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرو۔"

یوں اپنے آپ کو سمجھا بجھا کر بمشکل میں نے دل سے اس انتظار کا بوجھ کم کیا... لیکن ایک خلش بہرحال باقی رہی۔ یوں بھی کرنے کو کوئی کام نہیں تھا جس میں دل لگتا اور تو جہ بٹاتا۔ اسٹوڈیو جانا بیکار تھا۔ جی بھی نہیں چاہتا تھا اور اندیشہ تھا کہ کوئی اور حادثہ نہ پیش آ جائے۔ ابھی تو میں پہلے حادثے سے ہی نہیں سنبھل پایا تھا۔

اُکتاہٹ حد سے بڑھی تو میں تیسرے روز اشرف سے ملنے کا ارادہ لے کر نکل کھڑا ہُوا۔ اپنا ایڈریس اُس نے مجھے سمجھا دیا تھا۔ اس کا مکان تلاش کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ وہ گھر پر ہی موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر کچھ شرمندہ سا نظر آنے لگا حالانکہ میں نے اس سے یہ شکوہ بھی نہیں کیا تھا کہ اُس نے میری خبر کیوں نہیں لی۔ وہ خود ہی صفائی پیش کرنے لگا۔ "یار! وہ ایک ساتھ کچھ زیادہ ہی فلمیں مل گئی ہیں۔ مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی، اس لیے میں تم سے ملنے نہیں آ سکا۔ سخت شرمندہ ہُوں۔ مجھے ایک اطمینان یہ تھا کہ نازو تمھاری دیکھ بھال بہت عمدہ طریقے سے کر رہی ہو گی۔"

"نازو؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "میں نے تو ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک اسے دیکھا ہی نہیں۔"

"کیا واقعی؟" اشرف نے بے یقینی سے پوچھا۔

"میں قسم کھانے کو تیار ہُوں۔" میں نے کہا۔ "اس روز تم کہہ کر گئے تھے کہ وہ جلد ہی آ جائے گی لیکن وہ آج تک نہیں آئی۔ میں تو یہی سمجھ کر خاموش ہو بیٹھا تھا کہ شاید وہ شوٹنگوں میں زیادہ مصروف ہو گئی ہے۔"

"صرف چودھری کی فلم میں اس کی شوٹنگز ہونی تھیں اور چودھری نے اس کا انتظار کر کر کے آخر شیڈول ہی بدل لیا ہے۔" اشرف نے بتایا۔ "نازو کے گھر پر فون بھی نہیں ہے۔ چودھری نے آدمی بھیجا تو وہ گھر پر نہیں ملی۔ ہم سمجھے کہ وہ تمھاری ہی خدمت گزاری میں مصروف ہے۔ خیر... اب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں غائب ہے؟"

"اگر تمھیں اس کا ایڈریس معلوم ہو تو مجھے بتا دو۔ میں اپنے طور پر بھی اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے اب واقعی

نازو کے بارے میں تشویش ہو چلی تھی۔

"ایڈریس، مجھے تو معلوم نہیں البتہ چودھری سے پوچھ کر بتا دوں گا" اشرف نے وعدہ کیا۔

میں واپس آ گیا لیکن اب گویا میں ایک نئی خلش اپنے دل میں بسا لایا تھا۔ نازو کا یوں غائب ہونا میرے لیے معمہ بن گیا تھا۔ بڑی شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ ایک بار وہ مل جائے تو خلوصِ دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کروں... مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اشرف کا انتظار کروں۔ اشرف نے اس کا ایڈریس لانے کا وعدہ کیا تھا۔

... مگر اُس دن کے بعد تو اشرف کا ملنا بھی ایک مسئلہ بن گیا۔ کئی دن تو میں اس کا انتظار ہی کرتا رہا۔ وہ نہ آیا تو میں نے اس کے گھر کے چکر لگانے شروع کیے مگر جب بھی جاتا، اس کے چھوٹے سے مکان کو تالا ہی لگا ہوا نظر آتا۔ اس کی مکان مالکن اُوپر کے حصے میں رہتی تھی ہر بار وہ یہی بتاتی کہ اشرف اسٹوڈیو گیا ہوا ہے۔

... پھر ایک دن میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اور میں اسٹوڈیو جانے کے ارادے سے نکل کھڑا ہوا۔ یوں بھی میں چودھری فضل داد سے معاہدہ سائن کر چکا تھا اور ایڈوانس بھی لے چکا تھا اگرچہ اب میرا فلموں میں کام کرنے کا موڈ نہیں تھا... لیکن وضعداری کا احساس ضرور تھا۔ میں رزقِ حلال کی جستجو میں شہر آیا تھا۔ اس وقت میری مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ بطور ایڈوانس لی ہوئی رقم چودھری فضل داد کو لوٹا سکتا۔ ایسی صورت میں میرا ضمیر گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایڈوانس لینے کے باوجود چودھری سے منہ چھپاؤں۔ ویسے روشنیوں کی اس دُنیا نے مجھ پر جو پہلا تاثر چھوڑا تھا، اس کے بعد میں اسے اپنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں اسٹوڈیو پہنچا تو اشرف مجھے لان میں ہی مل گیا۔ وہ بہت تپاک سے ملا۔ اس کا انداز بے حد مخلصانہ تھا۔ اس لیے میں نے کوئی شکایت نہیں کی۔ نازو کے سلسلے میں براہِ راست پوچھنا مناسب نہ تھا، اس لیے میں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا کہ میں کام کرنے آیا ہوں۔

"چھوڑو یار، بھول جاؤ۔" اشرف بولا۔ "چانس نکل گیا تمہارے ہاتھ سے۔ چودھری صاحب نے تمہاری جگہ کسی اور کو کاسٹ کر لیا ہے۔"

میرے ذہن سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔

"ویسے یار تم نے غلطی کی۔" اشرف نے مزید کہا۔ "اس دُنیا میں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ کسی کے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑائی جاتی۔ یہاں تو نہ جانے کیا کیا ہوتا رہتا ہے۔"

اس کی اس بات پر میرے ذہن میں وہ منظر گھوم گیا۔ نازو یاد آ گئی اور میرے رُوئیں رُوئیں میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ "نازو کہاں ہے؟" میں نے خود کو قدرے سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"چودھری صاحب نے اس کی جگہ دوسری ہیروئن لے لی ہے۔" اشرف نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب؟" میرا دل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا۔

"وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے۔ کوئی سُراغ ہی نہیں ملتا!"

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ یوں تو سارا زمانہ ہی خود غرض ہو گیا ہے لیکن روشنیوں کی یہ دُنیا تو حد سے زیادہ خود غرض تھی۔ یہاں انسان آرائشی اشیاء سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ کوئی کھو جاتا ہے تو اس کے بیسیوں نعم البدل سامنے آ جاتے ہیں... لیکن میرے پاس نازو کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ وہ میرے لیے ایسی ہی اہمیت اختیار کر گئی تھی جیسے جسم کے لیے رُوح اہم ہوتی ہے۔

"میں چودھری سے ملوں گا۔"

"کیا کرو گے اُس سے مل کر؟" اشرف نے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس سے حتمی بات کر لوں۔" میں نے کہا۔ "کم از کم ایڈوانس لوٹانے کا وعدہ ہی کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے دوست تم اس سے مل آؤ۔"

اشرف کو وہیں چھوڑ کر میں چودھری کے دفتر کی طرف چل دیا۔ دفتر میں حسبِ معمول اس کے حواریوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ چودھری کے سامنے شاید وہ نئی لڑکی بیٹھی تھی جسے اس نے نازو کی جگہ کاسٹ کیا تھا۔ اس کے چہرے پر میک اپ کی گہری تہیں تھیں۔ وہ کم عمر تھی لیکن اس کے چہرے پر کچا پن تھا۔ اس کی آنکھیں جہاندیدگی کا تاثر چھوڑ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر بے اختیار میرے ذہن میں نازو کا چہرہ گھوم گیا۔ میرے دل میں درد کی ایک تند و تیز لہر اُٹھی جس نے میرے وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

چودھری فضل داد نے بڑی سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ "وہ کنٹریکٹ کینسل سمجھو جوان!" اس نے مجھ پر نگاہ پڑتے ہی کہا۔

"میں نے کچھ رقم ایڈوانس لی تھی۔"

"اُسے بھول جاؤ۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" میں نے ایک طویل سانس لی۔ "نازو کا کچھ پتہ چلا؟" کچھ توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

چودھری کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ "اس چکر میں مت جوان! پہلے ہی تم اس کی خاطر مرتے مرتے بچے ہو۔" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"نہیں، چودھری صاحب! وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ میری نظر

میں اس کی بڑی عزت ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اسے شاہ صاحب کے آدمیوں نے اغوا کر لیا ہے۔"

"کون سے شاہ صاحب کی بات کر رہے ہو۔ یہاں درجنوں شاہ صاحب ہیں۔"

یہ سن کر میں بھونچکا رہ گیا اور کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا۔

"میں اُن غنڈوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔" کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ "ان کے حوالے سے شاہ صاحب کی شناخت ہو جائے گی۔"

"میں نے تمہیں بہترین مشورہ دیا ہے جوان!" چودھری نے سرد لہجے میں کہا۔ "آگے تمہاری مرضی۔"

میں اُسے سلام کر کے باہر نکل آیا۔ اشرف سے ملاقات نہ ہو سکی۔ شاید وہ کسی شوٹنگ میں مصروف ہو گیا تھا۔ میں اسٹوڈیو سے نکل آیا۔ اچانک ہی مجھے ایک عجیب سے احساس نے گھیر لیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی میری نگرانی کر رہا ہو۔

اندھیرا دھیرے دھیرے پھیلنے لگا۔ دُور تک کسی گاڑی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ ابھی میں اسٹوڈیو سے تھوڑی ہی دُور آیا تھا کہ مجھے پیچھے سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سُنائی دینے لگی۔ پلٹ کر دیکھنا چاہا لیکن اس وقت تک وہ میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔ ان کو پہچاننے میں مجھے کوئی دُشواری نہ ہوئی۔ یہ وہی تھے جن کا تذکرہ میں چودھری کے دفتر میں کر رہا تھا۔

"جاتے کدھر ہو جوان!" ان کے سرغنہ نے کہا۔ "ہمیں ایک ایک پل کی خبر رہتی ہے۔ ابھی تم بڑی لاف و گزاف کر رہے تھے نا؟"

میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ "اچھا ہوا، تم مل گئے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تمہاری ہی تلاش تھی۔"

اُس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "سُن لیا تم نے...؟" اس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ "یہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔" پھر وہ میری طرف پلٹا۔ "کس خوشی میں پہلوان؟"

"میں تم سے نازو کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"اسے بھول جاؤ۔ فی الحال اپنی خیر مناؤ۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "اب تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔"

"نہیں دوست! تم مجھے اس کا پتہ بتاؤ گے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اور یہی نہیں بلکہ تم مجھے اس شاہ صاحب کے بارے میں بھی بتاؤ گے، جس کے حکم پر تم نے اس اچھی لڑکی کو غائب کر دیا ہے۔"

"ضرور... ضرور... میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔" اس نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ان تینوں کی مدد سے بتاؤ گے؟" میں نے اس کے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا اُس کی غیرت کو للکارا۔

وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ "تیرے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔" اُس نے چیخ کر کہا۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ "تم تینوں الگ رہو گے۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں کمزور نہیں تھا۔ اس کے باوجود ان چاروں کو نہیں سنبھال سکتا تھا۔ میں نے ان کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے داؤ کھیلا تھا اور کامیاب رہا تھا۔ اب مجھے ان میں سے صرف ایک سے نمٹنا تھا اور کامیابی کے امکانات پہلے سے بہتر تھے لیکن مجھے پچھلا تجربہ بھی یاد تھا۔

"آدمی تو تم دلیر لگتے ہو۔" میں نے مزید نفسیاتی حربہ آزمایا۔ "اور دلیر آدمیوں کے کچھ اصول بھی ہوتے ہیں۔"

اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ چند لمحے بغور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ اگر میں نے تمہیں زیر کر لیا تو تم مجھے نازو اور شاہ صاحب کا پتہ بتا دو گے۔"

اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور مٹھیاں بھنچنے لگیں لیکن اگلے ہی لمحے اُس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ اُس کے ہونٹوں پر بے حد زہریلی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ "چل... یہ بھی منظور ہے۔" وہ پھنکار کر بولا اور بجلی کی سی تیزی سے میری طرف جھپٹا۔

میں نے جھکائی دے کر اُس کے جبڑے پر ہاتھ رسید کر دیا۔ میری دانست میں میرا وہ ہاتھ خاصا تگڑا تھا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ وہ مزید خونخوار ہو گیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے گردش کرنے لگے۔ میں مدافعت پر مجبور ہو گیا... پھر میری مدافعت بھی جواب دے گئی۔ وہ تاک تاک کر میرے جسم کے ایسے حصوں پر ضربیں لگانے لگا کہ چوٹوں کے نشان نظر نہ آئیں اور مجھے تکلیف بھی زیادہ سے زیادہ پہنچے۔ کچھ ہی دیر بعد میں زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ میرا سارا جسم کسی پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ ذہن میں اندھیرا اُترتا جا رہا تھا۔

"نہ جانے کیوں تجھے قتل کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" وہ میرے سر پر کھڑا غرّانے لگا۔ "عقل مند ہے تو تیرے لیے اتنا ہی سبق کافی ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے بندہ مار دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اب نازو اور شاہ صاحب کا نام تیری زبان پر نہ آئے۔"

ممکن ہے اس نے اور بھی بہت کچھ کہا ہو لیکن میرے ہوش و حواس ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

●●

اس بار میں ہوش میں آیا تو اندھیرا کافی گہرا ہو چکا تھا۔ میں

بمشکل اُٹھا... اور اُٹھنے کے دوران کئی بار میری چیخیں نکل گئیں۔ سیدھا کھڑا ہونا محال ہو رہا تھا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا جیسے تیسے بس اسٹاپ تک پہنچ گیا۔ مجھے اس طرح مارا گیا تھا کہ کھلی چوٹ ایک بھی نہیں آئی تھی۔ دیکھنے والے زیادہ سے زیادہ مجھے بیمار ہی تصور کر سکتے تھے اور یہ میرے حق میں بہتر بھی تھا۔ میں اسپتال یا پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

اذیت کے سوا مجھے کسی چیز کا احساس نہیں تھا۔ نہ جانے کس طرح میں گھر پہنچا، بستر پر گرا اور بے سُدھ ہو گیا۔ تکلیف کی شدت سے مجھے رات بھر نیند نہ آئی... پھر اذیت کے احساس میں بے بسی اور ذلت کا احساس بھی شامل ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ میں تندرست و توانا سہی، طاقت ہی سب کچھ نہیں ہوتی اور لڑنے بھڑنے کے لیے مجھے تربیت کی ضرورت ہے۔

تین دن میں چارپائی سے لگا رہا۔ اس عرصے میں مجھے خودشناسی کا موقع ملا اور پھر میں نے خود کو دریافت کر لیا۔ مجھے پتہ چلا کہ میں کچھوے کی سی سُست رفتاری کے باوجود اپنی منزل کا تعین کر کے اس کی طرف ثابت قدمی سے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میں نے ان تین دنوں میں طے کر لیا کہ وقت نے مہلت دی تو فنونِ حرب اور دفاع کا فن ضرور سیکھوں گا۔ نازو کا نقش ان دنوں میں میرے دل پر مزید گہرا ہو گیا اور انتقام کی آگ مجھے اندر ہی اندر جلانے لگی... لیکن فکرِ معاش کا عفریت منہ پھاڑے میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میرے پاس رقم ختم ہو چلی تھی۔ میں اگر جلد از جلد کسی ذریعۂ معاش کی تلاش میں کامیاب نہ ہو سکا تو یقیناً فاقوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ میں نے غمِ جاناں کو ذہن سے جھٹکا اور غمِ دوراں کا مداوا کرنے نکل کھڑا ہوا۔

ایک اخبار میں اشتہار چھپا تھا کہ موہنی روڈ پر رہنے والے کسی آسودہ حال تاجر کو اپنے دو بچوں کے لیے کسی ایسے ٹیوٹر کی ضرورت ہے جو بچوں کو روایتی ٹیوٹر کے برعکس کافی وقت دے سکے اور پڑھانے کے علاوہ اُن کے ساتھ کھیل کود میں بھی حصہ لے سکے۔ ان کا دوست بن کر وقت گزار سکے۔ کچھ عجیب سا ہی اشتہار تھا۔ معلوم نہیں تاجر صاحب کیا چاہتے تھے۔ کیا... ایک موہوم سی اُمید کے سہارے انٹرویو دینے ان کے ہاں جا پہنچا۔

تاجر ایک خاندانی آدمی تھا۔ زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا مگر پڑھے لکھوں سے لاکھ درجے بہتر اور سلجھا ہوا تھا۔ اس کی باتوں میں برسوں کا تجربہ جھلکتا تھا۔ اس کے دیے ہوئے اشتہار میں بھی درحقیقت کوئی پیچیدگی نہیں تھی، بس اتنی بات تھی کہ اس کی بیوی مر گئی تھی اور بچے بہت زود رنج ہو چکے تھے۔ ان بچوں کی خاطر ہی تاجر نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کوئی ایسا مخلص شخص مل جائے جو اس کے بچوں کو خوب محنت سے پڑھانے کے علاوہ ان کے ساتھ دوستی بھی استوار کر سکے۔ ان کی شوخی و طراری واپس لا سکے۔ انھیں اپنے بچوں یا بہن بھائیوں کی طرح وقت دے سکے۔ آدمی اسے کئی ملے تھے لیکن ہر ایک میں بس ایک ہی کمی نظر آئی تھی اور وہ تھی خلوص کی کمی...

معلوم نہیں میری ذات میں اس نے کس طرح خلوص تلاش کر لیا۔ شاید میرے پاس خلوص کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں، اس لیے یہ احساس نافذ فوراً میری ذات کی پوٹلی سے چھلک پڑتا تھا۔ اس شخص نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے منتخب کر لیا۔ معاوضہ بھی اتنا معقول مقرر کر دیا کہ شاید کسی اچھی بھلی کُل وقتی ملازمت میں بھی اتنی تنخواہ نہ ملتی۔ اس بھلے آدمی نے مزید یہ بھی کہا کہ اگر میں اس کی توقعات پر پورا اُترا تو وہ اس معاوضے میں اضافہ بھی کر دے گا۔

میں پوری تندہی سے ان بچوں کی تعلیم و تربیت اور دلداری میں لگ گیا۔ مجھے بھی ایک مدت کی آوارہ گردی کے بعد کوئی مصروفیت اور مقصدیت ہاتھ آئی تھی، اس لیے اس کام میں واقعی میرا دل لگ گیا۔ مجھے خلوص کی اداکاری نہیں کرنی پڑی اور ان بچوں کے ساتھ دل لگانے میں اپنے آپ پر جبر بھی نہیں کرنا پڑا۔ سو وہ مجھے واقعی پیارے لگنے لگے۔ ان میں ایک تو چھ سات سال کی بچی تھی اور دو اُس کے بڑے بھائی تھے۔

میں مزنگ سے بس یا ویگن کے ذریعے بھاٹی آتا اور وہاں سے کچھ فاصلہ پیدل طے کر کے موہنی روڈ پر واقع اس حویلی نما مکان تک پہنچتا تھا۔ دس بجے اسکول سے آ کر کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہوتے تھے، اُدھر میں ان کے پاس جا پہنچتا تھا اور شام ڈھلے واپس آتا تھا۔ زندگی میں کچھ دلچسپی پیدا ہو چلی تھی۔

بھاٹی پہنچ کر میں جس موڑ پر ویگن سے اُترتا تھا، اس کے مقابل سڑک کے دوسری طرف اُن دنوں بہت بڑا المبوترا سا ایک پلاٹ ہُوا کرتا تھا جس پر ایک اکھاڑہ قائم تھا۔ یہ مجّو پہلوان کا اکھاڑہ تھا۔ پلاٹ کے گرد محض حد بندی ظاہر کرنے کے لیے لکڑی کا ایک جنگلا لگایا گیا تھا، جو اگر نہ بھی ہوتا تو شاید کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ اس جنگلے کے قریب ایک جگہ دو پایوں پر مجّو پہلوان کے نام کا بورڈ بھی نصب تھا جس پر ایک پہلوان کی لمبی چوڑی تصویر بھی بنی ہوئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ مجّو پہلوان کی اپنی ہی تصویر تھی۔

تصویر میں مجّو پہلوان لنگی کس کر کے اور دھوتی میں سینہ تان کر کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کے کندھے پر ایک بڑا سا گرز تھا۔ تصویر اُس کی جوانی کی تھی اور بورڈ بھی نہ جانے کس زمانے سے وہاں استادہ تھا چنانچہ امتدادِ زمانہ سے اس میں بڑی ہیبت ناک تبدیلیاں واقع ہو گئی تھیں۔

رنگ اُڑ چکے تھے جس کی وجہ سے بہت سی چیزوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ مثلاً اب یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ گرز کون سا ہے اور مجّو کی پگڑی کون سی ہے۔ اگر پگڑی کا محلِ وقوع دریافت کر بھی لیا جاتا تو یہ پتہ چلانا دشوار ہوتا تھا کہ پگڑی کہاں ختم ہوتی ہے اور چہرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس مایۂ ناز لیکن نامعلوم مصوّر نے مونچھیں بنانے پر البتہ موئے قلم کا سارا زور صرف کر دیا تھا۔ مونچھیں اب بھی نہ صرف برقرار تھیں بلکہ انہی کی وجہ سے چہرے کا حدود اربعہ متعین کرنے میں مدد ملتی تھی۔ اس بورڈ سے کچھ فاصلے پر ایک اور بورڈ نصب تھا جس پر ایک جامع قسم کی اپیل درج تھی، جس میں شہر کے نوجوانوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔ مختصراً یہ اپیل کچھ یوں تھی۔

اے نوجوانو! تم جو یہ شام کو ہوٹلوں میں بیٹھ کر اور آوارہ گردی کر کے اپنی صحت کا خانہ خراب کرتے ہو، چائے پان اور سگریٹ نوشی کی عادت میں مبتلا ہو کر اپنی جڑیں کھوکھلی کرتے ہو، اب بھی وقت ہے کہ سنبھل جاؤ۔ یہی وقت جو تم اِدھر اُدھر ضائع کرتے ہو، آ کر مجّو پہلوان کے اکھاڑے میں صَرف کرو اور یہی پیسہ جو تم منشیات پر ضائع کرتے ہو، مقوّی غذا کھانے پر صَرف کرو تو تھوڑے ہی دنوں میں قابلِ فخر نوجوان بن جاؤ گے۔ فوراً آ کر اکھاڑے کے رُکن بنو۔ مجّو پہلوان اپنے شاگردوں سے کوئی فیس نہیں لیتا۔

بلاشبہ یہ ایک نہایت ہی مخلصانہ پیش کش تھی اور آج کے دور میں ایسے کردار تیزی سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں جو بے غرض، بے لوث ہو کر معاشرے کے اجتماعی مفاد کے بارے میں سوچنے میں وقت صَرف کرتے ہیں اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر فلاح کی طرف لاتے ہیں۔ میرا اپنا بہت جی چاہتا تھا کہ اس اپیل پر لبیک کہتے ہوئے فوراً جا کر اکھاڑے کا رُکن بن جاؤں لیکن فکرِ معاش سے فرصت نہیں ملتی تھی۔

میں جب بھاٹی پہنچتا تھا، اس وقت اکھاڑے میں پہلوانوں برائے تربیت نوجوانوں کی آمد شروع ہوتی تھی اور جب میں واپس ہوتا تھا اُس وقت اکھاڑے کی رونق عروج پر ہوتی تھی...

اکھاڑے میں روشنی کا عارضی بندوبست تھا۔ درختوں اور لکڑی کی بلیوں میں کئی بڑے بڑے بلب لٹکے ہوئے تھے اور تیز روشنی میں پہلوان ورزش کرتے، ایک دوسرے سے زور آزمائی کرتے، مٹی اور پسینے میں لتھڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ اکھاڑہ سڑک کے ساتھ ہی تھا۔ سڑک پر ٹریفک رواں رہتا تھا۔ لوگ بسوں، ویگنوں اور تانگوں وغیرہ سے اُچک اُچک کر پہلوانوں کو دیکھتے رہتے تھے مگر وہ گویا گرد و پیش سے بے نیاز، اپنے اپنے کام میں مگن رہتے تھے۔

میں اس علاقے میں تو نہیں رہتا تھا مگر محض آتے جاتے ہی مجھے مجّو پہلوان کے متعلق خاصی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ واپس جاتے وقت کئی بار میں دُور ہی دُور سے اسے دیکھ بھی چکا تھا۔

اکھاڑے کے طویل و عریض پلاٹ پر ایک طرف تین چار نیم پختہ کمرے بھی بنے ہوئے تھے جن میں غالباً ورزش کا ساز و سامان رکھا جاتا تھا۔ ان کمروں کے سامنے ایک بہت بڑا چوبی تخت پڑا رہتا تھا۔ شام کو اس تخت پر چادر بچھائی جاتی تھی اور گاؤ تکیہ رکھا جاتا تھا۔ اکثر و بیشتر اسی تخت پر مجّو پہلوان گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا نظر آتا تھا۔ وہ غالباً ساٹھ کے پیٹے میں تھا مگر اب بھی اس کی شخصیت میں کسی شیر کا سا دبدبہ تھا۔ اس کے سر پر سفید بالوں کی صرف ایک جھالر سی باقی تھی۔ اس کی گردن اب بھی گینڈے کی گردن کی طرح مضبوط نظر آتی تھی۔ اس کی رنگت تپے ہوئے تانبے سے مشابہ تھی۔ وہ اب بھی باقاعدگی سے کسرت اور زور کیا کرتا تھا۔ اس نے غالباً کئی سینئر پہلوانوں کو اُستادی سونپی ہوئی تھی جو نو آموزوں کو داؤ پیچ سکھاتے رہتے تھے۔ کئی بار میں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ مجّو پہلوان آرام سے تخت پر نیم دراز تھا۔ دو چار پٹھے اس کی مالش کر رہے تھے کہ اُس نے بار بار کسی کو غلط داؤ لگاتے دیکھ لیا۔ وہ جلال میں آ کر اُٹھا اور اُس نے نالائق شاگرد کو دو چار پٹخنیاں دے ڈالیں... پھر اسے صحیح داؤ سمجھایا۔

مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مجّو ماضی میں شہر کا ہی نہیں بلکہ ملک کا نامور پہلوان رہ چکا ہے اور اب بھی شہر میں اس کی بڑی عزت اور اثر و رسوخ ہے۔

ایک روز میں ٹیوشن پر پہنچنے میں کافی لیٹ ہو گیا۔ ویگن سے اُتر کر میں خاصی عجلت میں سرکلر روڈ پر چلا جا رہا تھا۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ اس روز داتا دربار پر حاضری دینے کے لیے آنے والے عقیدت مندوں کی وجہ سے سڑک پر اور ملحقہ گلیوں میں بہت رش تھا... مجھے معلوم تھا کہ ٹیوشن پر دیر سے پہنچنے پر کوئی مجھ سے باز پرس نہیں کرے گا لیکن بچے مجھ سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ میرے

لیٹ پہنچنے پر رونے لگتے تھے مجھے انہی کی فکر تھی۔ غالباً اسی عجلت کے باعث معمول سے زیادہ بھیڑ بھاڑ میں، میں خاصے زوردار طریقے سے کسی سے ٹکرا گیا۔ غلطی شاید میری ہی تھی۔

میں جس سے ٹکرایا تھا، اس کی طرف زیادہ توجہ دیے بغیر میں نے لجاجت سے کہا: ”معاف کیجیے بھائی صاحب! جلدی میں ٹکر گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن گڑبڑا کر رہ گیا کیونکہ اس شخص نے گریبان سے پکڑ کر مجھے واپس کھینچ لیا تھا۔ قریب ہی میں نے دو ایک آدمیوں کو قہقہہ لگاتے بھی سُنا۔ خجالت اور بے عزتی کے احساس سے ایک لمحے کے لیے میری رگوں میں چنگاریاں سی تیر گئیں۔

میں نے اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے اس شخص کی طرف دیکھا، جس نے میرا گریبان پکڑ کر کھینچا تھا۔ بلاشبہ اس کی گرفت کسی فولادی شکنجے سے کم نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان تھا۔ میری ہی طرح دراز قد اور مضبوط تھا۔ وہ ململ کے سفید کُرتے اور ریشمی لُنگی میں تھا۔ گریبان کُھلا ہُوا تھا اور اس کے چوڑے سینے کو دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کسرت کا عادی ہے۔ گلے میں تعویز اور چاندی کی زنجیر بھی پڑی ہوئی تھی۔ لمبے لمبے بالوں کو خوب تیل چپڑ کر اچھی طرح جمایا گیا تھا۔ ایک کان میں سونے کا چھلا بھی پڑا ہُوا تھا۔ اس کی مونچھیں ابھی زیادہ گھنی نہیں تھیں لیکن جتنی بھی تھیں، انھیں اس نے خوب بل دے کر بچھو کی دُم کی طرح اوپر کو اُٹھا رکھا تھا۔ اس کے پیروں میں زری والے سلیم شاہی ٹائپ جُوتے تھے جنھیں پنجاب میں کھُسّہ کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک جُوتا بھی غالباً میرے جُوتے تلے مَسلا گیا تھا اور کچھ خراب ہو گیا تھا۔ اس کا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد میں نے ٹھیٹھ پنجابی میں معذرت کی لیکن وہ جیسے میری بات سُن ہی نہیں رہا تھا۔ میرے گریبان کو ایک زوردار جھٹکا دے کر غرّایا۔ ”اندھے ہو کر چل رہے تھے؟“ پھر اس نے مجھے ایک موٹی سی گالی دے ڈالی۔

میں آپ کو بتا ہی چکا ہُوں کہ کوئی مجھے گالی دے تو میری کھوپڑی فوراً ہی گھوم جاتی ہے۔ اس نے صرف گالی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ میرے مُنہ پر تھپڑ رسید کرنے کے لیے ہاتھ بھی بلند کیا۔

میں بالکل ہی بھول گیا کہ اس وقت بہت عجلت میں ہوں! بچوں کا خیال بھی میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے بازو پر روکا اور پوری قوت سے اُس کے پہلو میں گھونسا رسید کر دیا۔ ’اوغ‘ کی آواز کے ساتھ میرا گریبان اُس کی گرفت سے نکل گیا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میں نے اس کی ناک پر ٹکر رسید کر دی اور جیسے ہی وہ بلبلا کر لڑکھڑایا، میں نے اڑنگا مار کر اسے سڑک پر دے مارا اور اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر بیٹھ گیا۔

یہ سب کچھ گویا پلک جھپکتے میں ہو گیا۔ بہرحال وہ اتنا بودا اناڑی نہیں تھا۔ وہ صرف خوش فہمی میں مارا گیا تھا۔ وہ میری شرٹ پینٹ اور دھوپ کا چشمہ دیکھ کر شاید مجھے ذرا [illegible] سمجھ بیٹھا تھا تاہم اس نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی اور مجھے [illegible] سے اچھال پھینکا۔ ہم دونوں بیک وقت ہی اُٹھے اور وہ [illegible] طرح مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میرے حواس نے میرا ساتھ دیا اور میں [illegible] ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں اوندھے مُنہ گرا [illegible] اس کے گھٹنے بھی چھل گئے تھے۔

میں اس موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس پر جھپٹنے ہی والا تھا کہ بھیڑ کو چیر کر ایک بھاری بھر کم شخص ہم دونوں کے [illegible] آ گیا اور بازو پھیلا کر مجھے روکتے ہوئے بولا: ”بس جوان، بس... اس کے لیے اتنا ہی سبق کافی ہے۔“

میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے دیکھا کہ وہ مجّو پہلوان تھا۔ پہلی بار میں اسے اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ خود دُور [illegible] تو اکھاڑے میں اس کا جاہ و جلال دیکھ ہی چکا تھا۔ اس لمحے کے لیے میں کچھ بدحواس سا ہو گیا لیکن یہ دیکھ کر اطمینان [illegible] کہ مجّو پہلوان شفقت آمیز انداز میں میرے کندھے پر تھپکی [illegible] رہا تھا۔ بدمعاش نوجوان اُٹھ کھڑا ہُوا اور مجّو پہلوان کو دیکھ کر [illegible] اور پریشان بلکہ کسی حد تک خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔ چند [illegible] مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔

مجّو پہلوان نے حقارت بھری نظر سے اس کی طرف [illegible] کہا: ”مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ میں تجھ جیسے نوجوان کو اپنا شا[illegible] کر اور اپنے اکھاڑے کا ممبر بنا کر اچھا نہیں کر رہا ہوں لیکن میں نے صرف یہ سوچ کر ایسا کیا تھا کہ اکھاڑے پر آتے ہوئے جوان کو [illegible] بھیجنا ہماری روایت نہیں... مگر آج تُو نے پہلوانی کے اصول [illegible] دیے ہیں۔“

”وہ... دراصل پہلوان جی...!“ نوجوان منمنایا۔

”صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔“ مجّو پہلوان نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں سامنے مٹھو حلوائی کی دکان میں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ تمھارے ڈائیلاگ بھی میں نے سُنے ہیں۔ مجھے [illegible] ہی سے اندازہ تھا کہ تم دراصل بدمعاش بننے کے لیے پہلوانی میں قدم رکھ رہے ہو لیکن میں تمھیں سدھرنے کا موقع دے رہا تھا۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے تمھیں اکھاڑے میں آتے ہو[illegible] نے سڑکوں پر فلمی بدمعاشوں کی طرح بڑکیں لگانا اور لوگوں کے گریبانوں پر ہاتھ ڈالنا بھی شروع کر دیا۔ اگر پورے پہلوان بن گئے تو معلوم نہیں کیا غضب ڈھاؤ گے۔ اس شریف آدمی نے تجھ سے معافی مانگی تھی حالانکہ غلطی اس کی نہیں تھی۔ تُو کچھ زیادہ ہی پھیل کر سڑک پر چل رہا تھا۔ پہلوان تو قصوروار کو بھی معاف کر دیا کرتے ہیں، تُو کیسا پہلوان ہے کہ راہ چلتے بے قصور آدمی کے معافی مانگنے کے باوجود اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ اپنی اس حرکت پر آخر تجھے ذلیل ہونا پڑا۔ خدا نے تجھے تکبّر کی سزا دی ہے۔“

ہمارے گرد ہجوم ہو چکا تھا۔ سب لوگ دم بخود کھڑے تھے۔ نوجوان ایک بار پھر منمنایا: ”پہلوان جی! میں معافی چاہتا ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں۔ معافی شافی مانگنے کی...!“ مجّو پہلوان گرجدار آواز میں بولا: ”آج سے تُو میرے اکھاڑے سے خارج اور تیری جگہ میں اس نوجوان کو شاگرد بناؤں گا... دفع ہو جا... آئندہ مجھے شکل نہ دکھانا۔“

یہ کہہ کر مجّو پہلوان میرا ہاتھ پکڑ کر مجمعے کو چیرتا ہُوا ایک طرف چل دیا۔ اس نے مجھے اپنا دھوپ کا چشمہ تلاش کرنے کی بھی مہلت نہیں دی، جو نہ جانے کہاں گر گیا تھا۔ ہجوم سے نکلتے ہی وہ مجھے ساتھ لیے حلوائی کی دُکان میں گھس گیا۔ شاید یہی مٹھو حلوائی کی دُکان تھی جہاں مٹھائی کم ہی نظر آ رہی تھی۔ زیادہ کاروبار دودھ ہی کا تھا۔ اندر دیوار کے ساتھ چھوٹی چھوٹی میزیں اور لوہے کی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم آخری میز پر جا بیٹھے۔

میں نے محسوس کیا کہ دُکان میں موجود ہر شخص مجّو پہلوان کے سامنے مؤدب نظر آ رہا ہے۔ حلوائی کا ملازم مستعدی سے دوڑا آیا۔ مجّو پہلوان نے زیرِ لب اسے نہ جانے کیا کہا، دُکان کے شور شرابے میں میں صحیح طور پر سُن نہیں سکا۔ ویسے بھی میرے اعصاب پر ابھی تک ہیجان طاری تھا۔ چند ہی لمحے بعد بیرے نے میز پر دودھ سے بھرے ہوئے دو بڑے بڑے پیالے جن میں چھوٹا موٹا آدمی تو بوقتِ ضرورت غوطہ بھی لگا سکتا تھا، لا کر رکھ دیے۔ دودھ پر موٹی ملائی کا بڑا سا ٹکڑا ابھی تیر رہا تھا۔

”پیو جوان! پیو...!“ مجّو پہلوان نے شفقت سے کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنا پیالا اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ چند ہی لمحے میں پیالہ خالی ہو چکا تھا۔ میں کچھ ہچکچا رہا تھا۔ میں کوئی نازک مزاج شہری نوجوان تو نہیں تھا، اچھا خاصا کھانے پینے والا دیہاتی تھا لیکن اب کافی عرصے سے شہر میں رہتے ہوئے وقت بے وقت کھانے پینے کی عادت نہیں رہی تھی۔ بہرحال، پہلوان کے سامنے انکار کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور میں نے بھی پیالا خالی کر دیا۔

”کہاں زور کرتے ہو جوان؟“ مجّو پہلوان نے گویا اصل موضوع پر آتے ہوئے پوچھا۔

”کہیں بھی نہیں۔“ میں نے دیانت داری سے جواب دیا۔ ”کئی سال پہلے جب میں دیہات میں تھا تو لڑکپن میں کبھی کبھار اکھاڑے چلا جایا کرتا تھا۔ جب سے شہر آیا ہُوں تب سے تو سوائے پیدل چلنے کے اور کوئی ورزش نہیں کی۔“

”بہت خوب...!“ مجّو پہلوان اور بھی زیادہ خوش نظر آنے لگا۔ ”اگر بغیر زور کیے اور بغیر تربیت حاصل کیے یہ عالم ہے تو اکھاڑے کی مٹی بدن سے لگتے ہی کندن بن جاؤ گے۔ نام کیا ہے تمھارا؟“

”نسیم جمال!“ میں نے ہونٹ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

”نسیم...؟“ مجّو پہلوان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ”بھئی یہ تو کچھ زنانہ سا نام ہے۔ ہم تمھیں صرف جمال کہا کریں گے... تو بھئی جمال! بات یہ ہے کہ ہم تمھیں شاگرد بنائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ بہت تھوڑے عرصے کی محنت میں تم بہت نامور پہلوان بن سکتے ہو۔“

”چھوڑیں جی...!“ میں قدرے شرمندگی سے ہنس دیا۔ ”پہلوان بننا اپنے بس کی بات کہاں... ہمیں تو غمِ روزگار سے فرصت نہیں۔ دن میں کسی معقول نوکری کی تلاش میں پھرتا ہُوں۔ سہ پہر سے رات تک ٹیوشن پڑھاتا ہُوں۔“

”یہ تمھارا وہم ہے کہ تمھارے پاس وقت کم ہے اس لیے تم پہلوان نہیں بن سکتے۔“ مجّو پہلوان گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ٹیوشن سے کتنے بجے واپسی ہوتی ہے؟“

”سات بجے... کبھی کبھی آٹھ بھی بج جاتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”بس تو سات آٹھ بجے سیدھے اکھاڑے پر آ جایا کرو۔ اکھاڑے پر تو رات کے دس بجے تک رونق رہتی ہے۔ تمھارے لیے ڈیڑھ دو گھنٹے کی کسرت اور تربیت کافی ہے۔ تم صرف ارادہ کرو۔“ مجّو پہلوان مُصر ہو گیا۔

”دوسرا مسئلہ بھی تو ہے پہلوان جی!“ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میرے مالی حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں پہلوانوں کے شایانِ شان مقوّی خوراکیں کھانے پر رقم خرچ کر سکوں۔ خوراک کے خرچ کی وجہ سے تو آج کل بڑے بڑے خاندانی پہلوان بھی اس شوق سے مُنہ موڑتے جا رہے ہیں۔“

”یہ خیال بھی بالکل غلط ہے کہ بیش قیمت غذائیں کھا کر ہی آدمی پہلوان بنتا ہے۔ میرا طریقہ کار ہر شاگرد کے حالات کے مطابق مختلف ہوتا ہے۔ آدمی چنے کھا کر بھی جسم کو فولاد بنا سکتا ہے۔ بس

استاد کا مشورہ اور رہنمائی چاہیے۔" مجو پہلوان نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اور اگر روپے پیسے کی ضرورت پڑی تب بھی تمھیں اس سلسلے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجو پہلوان تمھیں صرف شاگرد نہیں بنا رہا تمھاری ہر طرح کی ذمے داری لے رہا ہے، کیا سمجھے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

▽ ▽
▽ ▽

پہلوانوں کی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے، جوش و خروش، ہیجان اور مسابقت سے بھرپور... شروع شروع میں تو اس دنیا میں میرا دل نہ لگا لیکن پھر میں ایسا مگن ہوا کہ دن بھر مجھے انتظار رہنے لگا کہ کب شام ڈھلے گی اور کب میں اکھاڑے میں جاؤں گا۔ پھر تو اس جسے شوق بڑھنے لگا تھا کہ جسم کی اب شکل ہی کچھ اور نکلتی آ رہی تھی، بازوؤں میں مچھلیاں تڑپنے لگی تھیں، رگ و پے میں گویا ایک ایسی طوفانی طاقت مقید رہنے لگی تھی، جو کبھی کبھی تو دیواروں پر گھونسے برسانے پر اکسانے لگتی تھی اور یقین دلاتی تھی کہ میرے گھونسوں سے دیوار گر پڑے گی۔

مجو پہلوان مجھ پر خصوصی توجہ دے رہا تھا اور میں خود بھی اپنے آپ پر بہت توجہ دینے لگا تھا۔ مشقت، کسرت اور زور آزمائی کا شوق مجھ میں اتنا بڑھ گیا تھا کہ بعض اوقات تو اکھاڑے کے پرانے پہلوانوں کو بھی حیرت ہونے لگتی تھی۔ دراصل انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ میرے سینے میں کیسی آگ بھڑک رہی ہے۔

میں نے جس وقت مجو پہلوان کا شاگرد بننے کی ہامی بھری تھی، اس وقت دراصل میرے ذہن میں وہ بھولا بسرا منظر ابھر آیا تھا جس میں اسٹوڈیو کی چھت پر چار پیشہ ور بدمعاش مشاقانہ انداز میں مجھے گھونسوں اور لاتوں سے پیٹ رہے تھے، ایک دوسرے کی طرف اچھال رہے تھے۔ اس وقت بھی میں نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ ایک لمحے کے لیے ضرور سوچا تھا کہ اگر میں لڑائی بھڑائی کی تکنیک اور زیادہ آدمیوں سے مقابلہ کرنے کے داؤ پیچ سے واقف ہوتا تو نہ صرف اس انجام سے بچ سکتا تھا بلکہ ان کرائے کے بدمعاشوں کو سبق بھی دے سکتا تھا کیونکہ وہ جسمانی طور پر کچھ ایسے زیادہ طاقت ور بھی نہیں تھے۔

اب میں اکھاڑے میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ پہلوانوں سے مقابلہ کر کے ہر طرح کی لڑائی میں جلد از جلد مہارت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بس وہی ایک منظر جو ذہن میں کسی زخم کی طرح تازہ تھا، میری صلاحیتوں کو کئی گنا بڑھا دیتا تھا۔ میرے رگ و پے میں شعلے سے بھر دیتا تھا۔

مجو پہلوان واقعی بے مثل استاد تھا۔ میں آج بھی سوچتا ہوں کہ اس جیسے استاد قسمت والے ہی کو میسر آ سکتے ہیں۔ وہ بہت پہلوان ہی نہیں، ایک عظیم انسان بھی تھا، اسی لیے علاقے میں اس کی دیگر معززین سے کہیں زیادہ عزت تھی۔ اس کا اکھاڑہ کارپوریشن کی زمین پر تھا اور کارپوریشن کافی عرصے سے [illegible] تھی مگر پورا علاقہ اس کے ساتھ تھا اور لوگوں کی [illegible] وہ جما ہوا تھا۔ اس کا موقف بجا تھا، اسی لیے سب [illegible]

"یہ عجیب کارپوریشن ہے یارو!" وہ کہتا تھا۔ "بجائے [illegible] کہ قوم میں صحت مند رجحانات پیدا کرنے کی حوصلہ افزائی کرے، [illegible] سے یہ ٹھکانہ بھی چھین لینا چاہتی ہے جہاں میں بغیر کسی لالچ [illegible] کسی معاوضے کے قوم کے جوانوں کو صحیح معنوں میں جوان بنا[نے کی] خدمت انجام دے رہا ہوں۔ میں دکانداری کر کے اپنی روزی [کماتا] ہوں اور الٹا اپنے پیسے سے اس اکھاڑے میں رقم لگاتا ہوں۔ [اکھاڑے] کے نام پر چندے اور نذرانے جمع نہیں کرتا، اسی لیے ہمارے پاس [اتنی] رقم نہیں ہے کہ شہر میں کہیں اور معقول جگہ لے لیں۔ کارپوریشن ہمیں شہر سے دور ایک پلاٹ دینے پر تیار ہے لیکن میں سو[چتا] ہوں کہ لڑکے تو یہاں... شہر کے مرکز میں ہی مشکل سے اکھا[ڑے] پہنچتے ہیں، شہر سے دور تو دو چار بھی مشکل سے ہی آئیں گے۔"

وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے پیسے کا قطعاً لالچ نہیں تھا۔ اکھاڑے کے اخراجات معمولی تھے۔ رقم عام طور پر وہ اپنی جیب سے ڈالتا تھا اور کچھ رقم ذرا خوشحال [گھرانوں] کے شاگرد اپنی مرضی سے چندے کے طور پر دیتے تھے اور کچھ [اس] علاقے کے معززین اور شرفا بھی اکھاڑے کو مالی مدد فراہم کر[تے] تھے لیکن مجو پہلوان اشد ضرورت کے وقت ہی یہ امداد قبول کر[تا] تھا ورنہ انکار کر دیتا تھا۔

اکھاڑے کے جو تھوڑے بہت اخراجات تھے، وہ بھی در[اصل] اس لیے تھے کہ خوراک وغیرہ کے معاملے میں مجو پہلوان اپنے غر[یب] اور تنگ دست شاگردوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ ان کی بہتر نشوونما کے لیے جو چیزیں ضروری سمجھتا تھا، خود منگوا کر انھیں [دیتا] تھا۔ بعض لڑکوں کو تو وہ کپڑے تک بنوا کر دیتا تھا۔ مجھے حیرت ہو[تی] تھی کہ جن بے چاروں کو تن ڈھانپنے کی توفیق نہیں تھی ان میں اس نے پہلوانی کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ وہ کچھ عجیب ہی قسم کا پہلوان تھا۔ پہلوان ہونے کے ساتھ ساتھ گویا ایک قسم کا سماجی کارکن بھی اور سماجی کارکن بھی اس قسم کا نہیں، جو غریبوں میں آٹے کی ایک بوری بانٹ کر دس اخباروں میں تصویر چھپواتا ہے بلکہ اس قسم

جو کوشش کرتا ہے کہ دائیں ہاتھ سے کسی کو کچھ دے تو بائیں ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہو۔ اس کے کردار پر لوگ بلا وجہ ہی اعتماد نہیں کرتے تھے۔ اس کی بے غرضی کی مثال ایک بار میں نے خود دیکھی تھی۔

اس رات سبھی شاگرد جا چکے تھے، صرف میں استاد کے پاس اس کے حجرہ نما کمرے میں بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ فاضل وقت میں، میں مجو پہلوان کے پاس بیٹھ کر اس کی زندگی کے تجربات اور دیگر کام کی باتیں اور نصیحتیں ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرتا تھا۔ اس رات بھی کچھ اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ہم نے باہر جنگلے کے قریب ایک لمبی اور چمکیلی کار رکتے دیکھی۔

ایک دبلا پتلا، دراز قد اور خوش پوش شخص ایک بریف کیس ہاتھ میں لیے کار سے اترا اور اکھاڑے کی مٹی سے بچ بچا کر چلتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ مجو پہلوان ہر ایک کو مسکرا کر بڑی محبت اور شفقت سے خوش آمدید کہتا تھا۔ اپنی روایت کے مطابق اس نے اجنبی کو بھی مسکرا کر خوش آمدید کہا۔

"خادم کو شوکت علی کہتے ہیں۔" اجنبی مسکراتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "میں ایسٹرن ٹیکسٹائل ملز کا جنرل منیجر ہوں۔" اس کے لہجے میں بے پناہ انکسار تھا اور چہرے پر کچھ ایسے ہی تاثرات تھے جیسے اس کا بس نہ چل رہا ہو کہ مجو پہلوان کے قدموں میں لوٹنے لگے۔

"فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" مجو پہلوان نے خوش خلقی سے کہا۔

"آپ ہمارے لیے اور ہم آپ کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" اجنبی بدستور دھیمے لہجے میں بولا پھر اس نے اچانک بریف کیس کھول کر استاد کے سامنے رکھ دیا۔ بریف کیس نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ "یہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لایا ہوں۔" اجنبی بولا۔

مجو پہلوان کے تاثرات میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نہایت ٹھہرے لہجے میں اس نے پوچھا۔ "کس سلسلے میں؟"

"کل ہمارے مل کی یونین، مل کے احاطے میں بہت بڑا جلسہ کر رہی ہے۔" اجنبی کی آواز کچھ اور دھیمی ہو گئی۔ "ہم وہ جلسہ درہم برہم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں آپ کے سارے آدمیوں کی ضرورت ہے، طاقت ور اور لڑنے بھڑنے والے آدمیوں کی... کام زیادہ مشکل نہیں... مزدور لوگ ہیں، منٹوں میں دہشت زدہ ہو جائیں گے۔"

"سوال یہ ہے..." مجو ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "کہ وہ لوگ جلسہ کیوں کر رہے ہیں اور تم لوگ اسے درہم برہم کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"وہ تنخواہوں میں اضافے اور بونس کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اگر وہ اپنی طاقت اور اتحاد کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کے لیڈروں کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور وہ اپنے مطالبات منوا کر چھوڑیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پرسوں کا جلسہ درہم برہم کیا جائے تو خاص طور پر ان لیڈروں کی ٹھکائی ہو جائے۔ ایک آدھ مہینہ وہ لوگ اسپتال میں گزار کر آئیں تو دماغ ٹھکانے آ جائیں گے۔" وہ شخص بڑی ملائمت سے اپنا مقصد سمجھا رہا تھا۔

مجو پہلوان نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی اور رسانیت سے پوچھا۔ "مل منافع میں جا رہی ہے نا؟"

"ہاں منافع میں تو جا رہی ہے۔" شوکت علی نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر تم لوگوں کو تنخواہوں میں اضافہ کرنے اور بونس منظور کرنے میں کیا تکلیف ہے؟" مجو نے بڑی متانت سے پوچھا۔

"لاکھوں روپے سالانہ کا فرق پڑتا ہے۔" شوکت علی گڑبڑا کر بولا۔

"اچھا ایک بات تو بتاؤ۔" مجو پہلوان نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "یہاں آنے سے پہلے تم نے میرے بارے میں کسی سے معلومات بھی حاصل کی تھیں یا نہیں؟"

"اس کی ضرورت نہیں تھی۔" وہ شخص بولا۔ "ہمیں معلوم ہے، اس قسم کی صورت حال میں تم جیسے لوگ ہی ہمارے کام آتے ہیں۔ ہم پہلے جن لوگوں سے کام لیتے رہے ہیں ان سے ہمارے تعلقات کچھ خوشگوار نہیں رہے، اس لیے ہم نئے انتظامات کرنا چاہتے تھے۔ کسی سے تمھارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے تو بات پھیلنے کا اندیشہ تھا۔"

"بات یہ ہے میاں شوکت علی!" استاد نے اپنے مخصوص شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر مجھے اس قسم کے کام کرنے ہوتے تو اس وقت میں لکھ پتی ہوتا۔ تم مجھے کافی بے وقوف معلوم ہوتے ہو، اس لیے میں تمھیں تمھاری گستاخی کی زیادہ سخت سزا نہیں دے رہا ہوں۔" پھر استاد نے میری طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "صاحب کا بریف کیس بند کر کے ان کے ہاتھ میں تھماؤ اور انھیں اٹھا کر باہر پھینک آؤ۔"

مجو پہلوان نے اتنے سرسری سے لہجے میں مجھے یہ حکم دیا تھا جیسے کوئی بزرگ کھانا کھاتے ہوئے کسی بچے سے کہے۔ "ذرا دہ گلاس تو بڑھانا۔"

میں نے نہایت سعادت مندی سے بریف کیس بند کر کے

شوکت علی کے ہاتھ میں تھمایا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو چکا تھا لیکن اسے شاید یہ اُمید نہیں تھی کہ میں واقعی اُستاد کے حکم پر عمل کروں گا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس طرح اُسے کندھوں پر اُٹھایا کہ وہ مکمل طور پر میرے قابو میں تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتا اور "ارے... ارے..." ہی کرتا رہا لیکن میری گرفت سے نہ نکل سکا اور میں نے باہر گاڑی کے پاس لا کر اُسے واقعی پھینک دیا لیکن اتنی بھلائی ضرور کی کہ سڑک پر نہیں پھینکا ورنہ اس کی ایک آدھ ہڈی پسلی ضرور ٹوٹ جاتی۔ میں نے اُسے کچے میں پھینکا تھا... پھر میں نے یہ دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ وہ کس طرح اُٹھا اور کس طرح کار میں سوار ہوا۔ ہاں، یہ دیکھ کر ضرور حیران ہوا کہ جب میں واپس مجّو پہلوان کے پاس پہنچ کر مونڈھے پر بیٹھا تب تک شوکت علی صاحب کار میں بیٹھ کر جا چکے تھے۔ اس نے بھاگنے میں حیرت انگیز پھرتی دکھائی تھی۔ اس واقعے سے مجّو پہلوان کی عظمت کے نقوش میرے دل میں کچھ اور بھی گہرے ہو گئے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی ماہ گزر گئے۔

ایک روز میں نے کسرت کے دوران میں ذرا سستاتے ہوئے اور اکھاڑے کے قدِ آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے، اپنی شخصیت کی تبدیلیوں کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ انسان کو خود اپنے آپ میں رُونما ہونے والی تبدیلیوں کا احساس ذرا کم ہی ہوتا ہے چنانچہ میں نے آنکھیں بند کر کے چشمِ تصور سے اپنا چند ماہ پہلے کا سراپا دیکھا پھر آنکھیں کھول کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو خاصا نمایاں فرق نظر آیا۔ میں نے چونکہ پہلوانی کے ساتھ ساتھ باڈی بلڈنگ بھی کی تھی، اس لیے میرے عضلات بڑے خوبصورت سانچے میں ڈھل گئے تھے۔ میرا چہرہ اب گول مٹول نہیں رہا تھا، کچھ کھنچ سا گیا تھا۔ پہلے میں کلین شیو ہوا کرتا تھا، اب میں نے مونچھیں رکھ لی تھیں، جو خاصی گھنی تھیں۔ غرضیکہ چند ماہ بعد مجھے اپنا آپ کافی بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔

اُدھر میری محنت کا یہ عالم تھا کہ اس عرصے میں پہلے تو میں نے اپنے اکھاڑے کے تمام زیرِ تربیت اور تربیت یافتہ پہلوانوں کو یکے بعد دیگرے شکست دی... پھر دوسرے کئی اکھاڑوں کے خاص خاص پہلوانوں کو چت کیا اور بالآخر رستمِ لاہور کا غیر رسمی اعزاز حاصل کر لیا۔ مجّو پہلوان میری صلاحیتوں کو دیکھ کر پھولا نہیں سماتا تھا اور اسی خوشی سے بے قابو ہو کر اس نے میری طرف سے... رستمِ پنجاب کو چیلنج دے دیا۔ یہ کشتی میں ہار گیا۔ اس کشتی میں ابتدا ہی میں میری ناک پر چوٹ آ گئی تھی اور خون کسی طرح بند ہونے میں

نہیں آ رہا تھا۔ منصفین نے میری اس چوٹ کو ہی شکست کی وجہ قرار دیا لیکن پھر بھی مجھے اعتراف تھا کہ رستمِ پنجاب، بلاشبہ بہت اچھا پہلوان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا تجربہ اور مہارت مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔

مجّو پہلوان اسی پر بہت خوش تھا کہ ہم [illegible] تو کیا۔ مقابلے کے اختتام پر اسپتال میں میری ناک کا [illegible] کے بعد اس نے بڑے زور و شور سے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا: "برخوردار! یہ کیا کم ہے کہ چند ماہ کی تربیت کے بعد ہی تم نے اس پر ہاتھ ڈال دیا، جو تین سال سے رستمِ پنجاب چلا آ رہا ہے اور نو سال سے اکھاڑوں کی مٹی چاٹ رہا ہے۔ اللہ کرم کرے گا۔ اس سال خوب زور کرو، میں لکھ کر دیتا ہوں کہ اگلے سال تم اس سے رستمِ پنجاب کی پیٹی چھین لاؤ گے۔"

ممکن ہے، مجّو پہلوان کا اندازہ درست ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے دوسرے پہلوانوں کی پیٹیاں چھیننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کوئی خاص کشتی جیتنے پر جب اکھاڑے والے مجھے جیپ میں بٹھا کر، میرے گلے میں پچاسوں ہار ڈال کر، اس طرح جلوس نکالتے تھے کہ آگے پیچھے پہلوانوں سے بھرے ہوئے تانگے چلتے تھے اور سب سے آگے رنگ برنگے کرتوں اور لنگیوں میں نئے پٹھے ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالتے ہوئے چل رہے ہوتے تھے تو میں یوں سر جھکائے بیٹھا ہوتا تھا جیسے مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو اور اب اپنا تماشا بننے پر شرمندہ ہو رہا ہوں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ بنیادی طور پر میں تھوڑا بہت شرمیلا آدمی ہوں۔

اس دوران میں مجھے ایک ملازمت بھی مل گئی تھی۔ میں ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی بھاگم بھاگ اُن بچوں کے پاس پہنچتا تھا، جن سے مجھے بے حد اُنسیت ہو چکی تھی۔ ان کے والد جن کا نام اقبال تھا، اب وہ بھی مجھ سے آجروں کی طرح نہیں دوستوں کی طرح پیش آتے تھے۔ اب تو اس مختصر سے گھرانے سے ترکِ تعلق کرنے کو میرا بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ اس دوران کئی بار میں نے سنجیدگی سے سوچا کہ کیوں نہ پہلوانی کو ہی [illegible] اور اپنا کیریئر بنا لوں؟ شاید میں اس فن میں بہت آگے [illegible] بہت نامور پہلوان بن جاؤں لیکن دل اس طرف کوئی خاص رغبت نہیں رکھتی تھی اور احساس ہوتا تھا کہ میری دراصل حقیقت اس لائن کی نہیں ہے۔ میں محض حادثاتی طور پر اِدھر آ گیا ہوں۔ معلوم نہیں کب کوئی دوسرا حادثہ اس دنیا سے بہت دُور لے جائے۔ اس لیے

اپنی زندگی کے بارے میں زیادہ منصوبے نہیں بنانے چاہئیں۔ بس اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہیے۔ قسمت جہاں چاہے گی، خود ہی لے جائے گی۔ یہ سوچ کر دل کو قرار سا آ جاتا تھا۔

اس عرصے میں دو تین مرتبہ میں اشرف کی طرف بھی گیا لیکن اس سے ملاقات نہ ہو سکی پھر میں اپنی مصروفیات میں ایسا گھن چکر بن گیا کہ جانے کی مہلت ہی نہ مل سکی اور رفتہ رفتہ اس سے ملنے کی خواہش ہی کمزور پڑتی چلی گئی۔ اس اللہ کے بندے نے بھی پلٹ کر میری خبر نہ لی۔ اس نے میرے لیے نازو کا پتہ لانے کا وعدہ کیا تھا... مگر ایسا غائب ہوا کہ اس کا اپنا ہی کوئی پتہ نہ رہا۔

نازو کا تصور تمام تر مصروفیت کے باوجود میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک خلش کی طرح دل میں بس گئی تھی۔ عجیب پُراسرار لڑکی تھی۔ یوں ایک نئی زندگی کی جھلک دکھا کر غائب ہو گئی تھی جیسے گھور اندھیرے میں بجلی کڑکے اور معدوم ہو جائے جیسے آسمان سے تارا ٹوٹے اور کائنات کی لامتناہی تاریکی میں کہیں کھو جائے جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکے اور غائب ہو جائے۔ کبھی کبھی راہ چلتے اس کا خیال آ جاتا تو میں یوں آتے جاتے راہ گیروں کے چہرے تکنے لگتا جیسے ابھی ان کے درمیان ہی کہیں وہ بھی مجھے دکھائی دے جائے گی... مگر یہ معجزہ کبھی رُونما نہ ہوا۔

ایک رات میں تھکا ہارا، کپڑے بدل کر بستر پر گرنے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے نیم دلی سے دروازہ کھولا تو جسم میں جیسے برق لہر سی دوڑ گئی۔ میرے سامنے اشرف کھڑا تھا۔ میں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا: "آہستہ یار آہستہ... کوئی اَٹ پھوٹ ہو گئی تو اپنے اسپیئر پارٹس بھی نہیں ملیں گے۔ تم نے بڑی زبردست جان بنا لی ہے۔ کس چکی کا آٹا کھا رہے ہو آج کل؟ چکی ہی کھا گئے ہو؟"

"اور یہ تم اتنے مُردار کیوں نظر آ رہے ہو؟" میں نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے کہا: "رنگت گویا جھلس گئی ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں، چہرہ سُت گیا ہے۔"

"بس یار! برسوں کی محنت کچھ رنگ لانے لگی ہے۔" وہ تھکے لہجے میں بولا: "کام اب کافی ملنے لگا ہے۔ سپورٹنگ رول ملنے لگے ہیں، بلکہ ایک فلم میں تو ولن کا رول بھی کیا ہے جو حال ہی میں ریلیز ہوئی ہے، شاید تم نے دیکھی ہو۔"

"اپنا تو یہ حال ہے پیارے کہ فلم تو کیا فلم کا پوسٹر دیکھنے کی بھی

مہلت نہیں ملتی۔" میں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: "بس تمہاری یاد دل میں لیے پھرتے رہے۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں یار!" وہ ایک طویل سانس لیتے ہوئے بولا: "مصروفیت اتنی رہی... اور میری حالت تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔ فلموں میں کام کرنا لوگ آسان سمجھتے ہیں لیکن یہ بڑا اعصاب شکن کام ہے۔ اللہ معافی دے! جس مقام پر فی الحال میں ہوں اس مقام پر تو بڑی ہی اعصابی توڑ پھوڑ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

ہم دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ایک دوسرے کو اپنا حال سناتے رہے، گلے شکوے کرتے رہے، معذرتوں کے سہارے لیتے رہے۔ میں نازو کے بارے میں جاننے کے لیے بیتاب تھا لیکن اشرف کی زبان پر اس کا ذکر ہی نہیں آ رہا تھا۔ آخر ڈھیٹ بن کر مجھے خود ہی پوچھنا پڑا: "یار! وہ نازو کا کیا ہوا؟ تم تو اس کا ایڈریس لینے گئے تھے، جس کے بعد آج پلٹے ہو۔"

"نازو؟" اُس نے حیرت سے دُہرایا: "ارے ہاں! اس کے بارے میں تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ وہ تمہاری عیادت کے دوران میں کسی کام کا کہہ کر گئی تھی، نا؟ اس کے بعد سے آج تک غائب ہے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئی۔ ابھی چونکہ وہ بڑی ہیروئن نہیں بنی تھی، اس لیے اس کی گمشدگی کا زیادہ واویلا بھی نہیں ہوا بلکہ یوں لگا جیسے فلم انڈسٹری والوں نے جان بوجھ کر اس معاملے کو دبا دیا ہو۔ اس کے ورثا نے بھی اس کی گمشدگی کی کوئی رپورٹ وغیرہ درج کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ عام خیال یہی تھا کہ وہ ایک لاابالی سی اور اپنی مرضی کی مالک لڑکی تھی۔ کسی پر دل آ گیا ہو گا، اس کے ساتھ بھاگ گئی ہو گی اور شاید ملک کے کسی دُور اُفتادہ مقام پر کسی کچے پکے گھر میں بیٹھی روایتی انداز میں ہانڈی چولہا کر رہی ہو گی۔ وہ تو شکر ہے کہ پہلی فلم ہٹ ہونے کے بعد اس نے صرف تین فلمیں سائن کی تھیں اور تینوں میں اس کا بہت معمولی سا کام شوٹ ہوا تھا۔ اُن فلم سازوں نے دوسری ہیروئنوں کو سائن کر کے فلمیں مکمل کر لیں۔"

اشرف تو خاصی لاپروائی سے یہ سب کچھ بتا رہا تھا لیکن اس کے ہر لفظ کے ساتھ میرا دل گویا ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ نیم خوابیدہ سی خلش، وہ میٹھی کسک جو اب تک مصروفیت اور غمِ روزگار کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی، ایک دم ہی جیسے زخم بن گئی تھی۔ مجھے ہر حال میں اس زخم کا مرہم چاہیے تھا۔ اس دُکھ کا مداوا چاہیے تھا۔ اس تشنگی کا علاج درکار تھا، جو آج تک زندگی کے ساتھ چلتی

آ رہی تھی۔ "تم نے چودھری سے اس کا پتہ معلوم کیا تھا؟" میں نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

"ہاں... بلکہ بعد میں تو میری اس کے گھر والوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی جو اُسے تلاش کرنے دو تین دن تک اسٹوڈیوز آتے رہے پھر یکایک ہی وہ بھی غائب ہو گئے۔" اشرف بولا۔ "نازو کو دھڑا دھڑ فلمیں اور ایڈوانس رقمیں ملیں تو وہ یہ سوچ کر گرگ شفٹ ہو گئے تھے کہ اب تو دن پھر گئے... لیکن معلوم ہوا کہ نازو کی گمشدگی کے بعد وہ لوگ واپس کرشن نگر چلے گئے تھے جہاں وہ پہلے رہتے تھے۔ وہ مکان غالباً ان کا ذاتی ہے۔ بیچارے ان پر تو وہی مثال صادق آتی ہے کہ چھٹے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی۔" یہ کہہ کر اشرف نے قہقہہ لگایا کہ اس نے گویا اپنی دانست میں گفتگو میں مزاح پیدا کیا تھا مگر میرا ہنسنے کو تو کیا مسکرانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"وہ کرشن نگر والا ایڈریس یاد ہے تمہیں؟" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"ہاں... بلکہ دو ایک مرتبہ میں کسی کام کے سلسلے میں اُدھر سے گزرا بھی ہوں۔ ان دنوں میں نے موٹر سائیکل نہیں خریدی تھی، حسبِ معمول ویگن میں جا رہا تھا۔ ویگن ان کے گھر کے سامنے سے گزرتی ہے۔ میں ویگن میں بیٹھا سوچ بھی رہا تھا کہ وہ ہے نازو کا مکان... لیکن میں اُتر کر حال احوال معلوم کرنے نہیں جا سکا۔ میں کسی اور کام سے جا رہا تھا۔ بہرحال تم کاغذ پنسل لاؤ، میں تمہیں ابھی اُس کے گھر کا نقشہ سمجھا دیتا ہوں اگر ویگن سے جاؤ تب تو سیدھے اس کے گھر کے تقریباً سامنے ہی اُتر سکتے ہو۔"

میں نے جلدی سے اُٹھ کر کاغذ قلم تلاش کر کے اشرف کو دیا اور اُس نے چند سیکنڈ میں ایڈریس مجھے اچھی طرح سمجھا دیا۔

دوسرے روز شام ڈھلے میں اُس مکان کے سامنے موجود تھا۔ اس روز میں نے اکھاڑے میں پہلوان سے جلد اجازت چاہی تھی اور اس سے پہلے سارا دن نہ جانے کس طرح ایک عجیب سی آگ کو سینے میں چھپائے پھرتا رہا تھا۔

مکان زیادہ عسرت زدہ نہیں تھا تو زیادہ خوش حال بھی نہیں تھا۔ دروازے پر چق لگی ہوئی تھی۔ میں نے چق کے پیچھے ہاتھ لے جا کر دروازے پر دستک دی تو دس گیارہ برس کا ایک لڑکا دوڑتا ہوا باہر آیا۔

"بیٹے! کیا نازو صاحبہ یہیں رہتی ہیں؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار اُبھر آئے۔ "آپ شاید نازو باجی کی بات کر رہے ہیں؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"شاید وہ آپ کی باجی ہی ہوں بیٹا! مجھے ان کا پورا نام نہیں معلوم۔ وہ فلموں میں کام کرتی تھیں۔"

لڑکا کوئی جواب دیے بغیر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد چق کے پیچھے سے لڑکے کی آواز آئی۔ "بھائی جان! اندر آ جائیے۔"

میں چق اُٹھا کر اندر چلا گیا۔ مکان کا وہ حصہ ڈیوڑھی نما تھا اور وہاں روشنی خاصی کم تھی۔ اندر پہنچتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں بائیں دو دراز قد اور خاصے جسیم نوجوان کھڑے ہیں اور سامنے ایک ادھیڑ عمر کا شخص کھڑا مجھے گھور رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں صورتِ حال کو سمجھ پاتا، ایک نوجوان نے گھوم کر تیزی سے نہ صرف دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی بلکہ اس میں کھٹکے دار تالا بھی لگا دیا۔

مجھے کچھ تشویش ضرور ہوئی لیکن اتنی زیادہ بھی نہیں۔ نازو کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش ہر جذبے اور ہر احساس پر غالب آ چکی تھی۔ تاہم میں پوری طرح چوکنا ضرور ہو گیا تھا۔ دونوں نوجوان سخت جان تو معلوم ہوتے تھے لیکن ایسے بھی نہیں کہ آسانی سے مجھ پر قابو پا لیتے۔ تاہم مجھے اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے کوئی ہتھیار نہ نکال لیں۔

"آؤ... آؤ اندر آ جاؤ۔" ادھیڑ عمر کا شخص پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

میں بے خوفی سے اُن کے نرغے میں برآمدہ عبور کر کے کشادہ کمرے میں پہنچا جہاں صرف ایک بلب روشن تھا اور اس کی روشنی ناکافی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں معمولی قسم کی کرسیاں اور تپائی وغیرہ موجود تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" ادھیڑ عمر کے شخص نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود مجھ سے کافی فاصلے پر ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ دونوں نوجوان میرے دائیں بائیں باڈی گارڈز کی طرح کھڑے رہے۔

"کیا نازو گھر پر موجود نہیں ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"یہ تو تم ہمیں بتاؤ گے کہ وہ کہاں ہے۔" ادھیڑ عمر کا شخص بولا۔ "کہاں چھپا رکھا ہے تم نے؟"

"یہ کیا بکواس ہے؟" میں نے بھی اپنے لہجے سے برہمی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "میں تو خود اس کی تلاش میں آیا ہوں اگر میں نے اُسے چھپایا ہوتا تو اس کے بارے میں پوچھتا ہوا یہاں کیوں آتا؟"

"ممکن ہے یہ تمہاری ڈرامے بازی ہو؟" ادھیڑ عمر کے شخص نے اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں کہا۔

"کیا آپ یہ بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ مجھے ڈرامے بازی کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"پہلے تو ہمیں یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور نازو کو تلاش کرنے کا ڈراما رچانے کے لیے یہاں کیوں آئے ہو؟" بوڑھا بولا۔ "اور ہم صرف سچ سننا چاہتے ہیں۔ ہمیں سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنا بھی آتا ہے اور جھوٹ بولنے والوں سے سچ اگلوانا بھی آتا ہے۔"

اُس کے لہجے میں برہمی بڑھتی جا رہی تھی۔ ماحول میں کشیدگی میں یوں اور بھی اضافہ ہو گیا کہ دونوں نوجوانوں نے کھٹکے دار چاقو نکال لیے۔

"یہ کھلونے جیبوں ہی میں رکھو۔" میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر حقارت سے کہا۔ "ورنہ ممکن ہے جو بات زبانی طے ہو سکتی ہو اُس کا اختتام ایک آدھ قتل پر ہو۔ تم لوگوں کو جب یہی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں تو تم نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ میں ڈرامے بازی کر رہا ہوں؟"

میں نے خونخوار انداز میں ادھیڑ عمر کے شخص کی طرف دیکھا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔

میں نے ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں کہا۔ "تم مجھے ان چاقوؤں سے خوفزدہ نہیں کر سکتے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں لیکن ضرورت پڑنے پر ایسے سُورماؤں سے نبٹ سکتا ہوں، جو گھر میں آئے ہوئے مہمان پر خنجر تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں کون ہوں اور نازو کے متعلق مجھے کیا معلوم ہے، یہ سب کچھ میں آپ کو سچ سچ بتا دیتا ہوں۔ اس کے بعد فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ میرا مشورہ ہے کہ جو قدم بھی اُٹھائیں سوچ سمجھ کر اُٹھائیں۔ بعض فیصلوں پر پچھتانے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔"

یہ کہہ کر میں نے انہیں چند ماہ پہلے کے واقعات بلا کم و کاست سُنا دیے۔ ساری بات سُن کر اُن کی اکڑ اور برہمی یوں رخصت ہو گئی جیسے اچانک ہی کسی غبارے کی ہوا نکل گئی ہو۔ نوجوانوں نے چاقو بند کر کے جیبوں میں رکھ لیے اور ادھیڑ عمر کا شخص یکدم ہی تھکا تھکا سا اور شکست خوردہ نظر آنے لگا۔

"اچھا... تو تم ہو وہ نوجوان...!" ادھیڑ عمر کا شخص بڑبڑایا پھر قدرے بلند آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہمیں تمہاری بات کا یقین آ گیا... نازو جن دنوں تمہاری تیمارداری کر رہی تھی اُس نے یہ سب کچھ ہمیں بتا دیا تھا۔ ایک روز وہ تمہارے ہاں سے گھر آئی اور کہنے لگی کہ ایک فلم میں اس کے چند مکالموں کی ڈبنگ ہونی ہے جو بہت ضروری ہے۔ وہ صرف اس کام کے لیے گھر سے روانہ ہوئی اور اس کے بعد سے ہم نے اُسے نہیں دیکھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اسٹوڈیو پہنچی ہی نہیں تھی۔ کئی دن تو ہم نے تذبذب کے عالم میں ہی گنوا دیے... پھر پولیس کو اطلاع دی۔ متعلقہ افسر پہلے تو اس بات پر گرجتا برستا رہا کہ ہم نے اتنی تاخیر کیوں کی پھر بادلِ ناخواستہ رپٹ درج کی۔ اس کے بعد بھی کوئی کارروائی کرنے کے بجائے ہمیں سمجھانے لگا کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ وہ فلمی عورتوں کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کہانی خاص طور پر کسی نے اس کے ذہن میں ڈالی تھی۔"

میں چند لمحے تک گم سم بیٹھا رہا پھر دھیمے لہجے میں کہا۔ "عین ممکن ہے نازو کو اسی شاہ جی نے اغوا کرایا ہو، جس نے مجھے سرزنش کرنے کے لیے غنڈے بھیج دیے تھے اور جن سے میرا جھگڑا ہوا تھا؟"

"ہو سکتا ہے۔" ادھیڑ عمر کا شخص بولا۔ "لیکن مجھے تو صحیح طور پر یہ بھی نہیں معلوم کہ شاہ جی کون ہے۔ نازو نے ایک دو مرتبہ سرسری انداز میں اس کا تذکرہ کیا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی خطرناک آدمی ہے، جس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میرا خیال ہے، نازو اس سے خوفزدہ بھی تھی لیکن وہ بہت خوددار لڑکی تھی۔ اس کی پوری پوری کوشش ہوتی تھی کہ ہمیشہ ورانہ پریشانیوں کے سائے گھر تک نہ پہنچیں۔ وہ اپنی پریشانی میں کسی سے مدد طلب نہیں کرتی تھی۔"

میں کئی لمحے تک خیالات میں اُلجھا رہا پھر ادھیڑ عمر کے شخص سے پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

"میں نازو کا چچا ہوں، کرم الٰہی۔" وہ بولا۔ "یہ دونوں میرے لڑکے ہیں، خورشید اور افضل... جس نے دروازہ کھولا تھا، وہ میرا چھوٹا بیٹا ہے، رشید... نازو کو دراصل میں نے ہی پالا ہے۔ میں اس کا سرپرست ہوں... مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے فرائض زیادہ اچھی طرح انجام نہیں دے سکا۔" اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔

"نازو بہت اچھی لڑکی ہے، چچا میاں!" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "اس کے مجھ پر کئی احسانات ہیں۔ معلوم نہیں وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں اس کی طرف سے لاتعلق ہو کر نہیں بیٹھ سکتا اور اس کی تلاش کے سلسلے میں جو کچھ بھی کر سکتا ہوں، ضرور کروں گا۔ میں آپ سے رابطہ رکھوں گا اور اگر نازو کا کوئی سُراغ ملا تو آپ کو اطلاع دے دوں گا۔"

میں بوجھل دل لیے اُس مکان سے نکل آیا اور وہ رات میں

نے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی۔ رہ رہ کر افسوس ہوتا تھا اور اپنے آپ پر غصہ بھی آتا تھا کہ اتنا عرصہ اس مفروضے کے سہارے کس طرح اطمینان سے گزار دیا کہ نازو خیر و عافیت سے ہوگی... اور اب جبکہ مجھے اس کی گمشدگی کا علم ہوگیا تھا تو اس کی بازیابی مجھے مکمل طور پر اپنی ذمے داری محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اس کے لیے ایک تڑپ سی محسوس کر رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ یہ احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا کہ اگر اسے تلاش نہ کیا تو زندگی کا ایک دن بھی چین سکون سے نہیں گزار سکوں گا۔

دوسرے دن میں نے ملازمت سے چھٹی لی اور سیدھا اُسی اسٹوڈیو جا پہنچا جہاں پہلی بار نازو سے ملاقات ہوئی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ نازو کا سُراغ یہیں سے مل سکتا ہے۔

میں اتنے رُعب سے چلتا ہوا اسٹوڈیو میں داخل ہوا کہ چوکیدار کو مجھے روکنے کی ہمت ہی نہ ہوئی بلکہ اُلٹا اس نے دانت نکال کر مجھے سلام بھی کیا۔ معلوم نہیں بے چارہ مجھے کیا سمجھا تھا۔

اسٹوڈیو کا ماحول وہی تھا جو میں چند ماہ پہلے دیکھ کر گیا تھا۔ اندر پہنچ کر میں تمام کمپنیوں اور ڈائریکٹروں کے دفاتر کی تختیاں پڑھتا چلا گیا لیکن کسی کے نام کے ساتھ شاہ جی کا لاحقہ نہیں تھا۔ قطعاً اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ کون سا دفتر شاہ جی کا ہو سکتا ہے۔ بالآخر میں نے ایک تیز و طرار سے نوجوان کو روکا اور خالص جمبئی والے انداز میں پوچھا۔ "بھائی صاحب! آپ کو معلوم ہے شاہ جی کا دفتر کون سا ہے؟"

"کون شاہ جی؟" اس نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ انہیں شاہ جی کہا جاتا ہے۔ میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں۔"

"اس طرح تو معلوم ہونا تقریباً ناممکن ہے، بھائی!" نوجوان نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "یہاں تو ہر دوسرے فلم ساز یا ڈائریکٹر کو شاہ جی کہا جاتا ہے۔ معلوم نہیں اب تم کون سے شاہ جی کو ڈھونڈ رہے ہو۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے مزید کافی دیر تک ادھر اُدھر پوچھ گچھ کی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ مجھے خود صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ میں تلاش کسے کر رہا ہوں؟ میں کسی کو کیا سمجھاتا؟ ان غنڈوں میں سے بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا جنہوں نے اسی اسٹوڈیو میں میری زبردست پٹائی کی تھی۔ ان کی صورتیں تو میرے ذہن پر نقش تھیں۔ اشرف بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس سے ان غنڈوں کے متعلق کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔

مایوس ہو کر میں اسٹوڈیو کے لان میں جا بیٹھا۔ میں حقیقتاً تھکا ہوا نہیں تھا لیکن ناکامی نے مجھے تھکن زدہ کر دیا تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر مختلف عمروں کے چند آدمیوں کی ٹولی بیٹھی تھی۔ ان کے لباسوں سے افلاس اور چہروں سے ناکامیوں کی تھکن عیاں تھی۔ یہ ایکسٹرا تھے۔ معلوم نہیں ان میں سے کون کیسے خواب آنکھوں میں لیے اس دُنیا میں آیا تھا۔ معلوم نہیں اب ان کے پاس ان خوابوں کی کرچیاں بھی باقی تھیں یا نہیں۔

دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ ان لوگوں میں کچھ ہلچل سی مچ گئی ہے۔ ایک شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا لان پر آیا تھا اور وہ سب لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ آنے والا دراز قد تھا اور کسرتی جسم کا مالک تھا لیکن پیٹ تھوڑا سا نکلا ہوا تھا۔ اس کا گریبان کھلا تھا۔ گلے میں ایک طلائی لاکٹ نظر آ رہا تھا۔ ہر ایکسٹرا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کسی کو ڈانٹ رہا تھا، کسی کو تسلی دے رہا تھا، کسی کو کسی سیٹ پر پہنچنے کی تاکید کر رہا تھا اور کسی کو محض ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ کچھ ٹھٹک سا گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے کچھ سوچا، شاید کسی فیصلے پر پہنچ کر سب کو ادھر اُدھر ہٹاتے ہوئے میری طرف بڑھنے لگا۔ میں کچھ چونکتا ہو گیا لیکن بظاہر لاپروا بنا بیٹھا رہا۔

"کیوں بھئی صاحبزادے... ہیرو بننے آئے ہو؟" اس کا سوال کچھ طنزیہ معلوم ہوتا تھا لیکن لہجہ طنزیہ نہیں تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے حیرت بھی ہوئی کہ جو لوگ ہیرو بننے کا ارمان دل میں لیے جانے کب سے یہاں دھکے کھا رہے تھے انہیں ہر ایک سے جھڑکیاں سننے کو ملتی تھیں اور میں جو کسی اور ہی چکر میں سے یہاں آیا تھا تو مجھے یہاں پکڑ پکڑ کر کام دینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ شخص مجھ سے فلم میں کام کی بات کرنا چاہتا ہے۔

میں نے تمام ایکسٹراز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دکھ سے کہا۔ "ان سب کو ہیرو بنا کر فارغ ہو گئے ہو کیا؟ جو اب مجھ سے پوچھنے آ گئے ہو؟"

"بہت کڑوے لگتے ہو۔" وہ بُرا مانے بغیر ہنس کر بولا اور میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "مجھے غلام احمد کہتے ہیں۔ اسٹوڈیو میں گگو نام سے مشہور ہوں۔ میں فائٹ انسٹرکٹر بھی ہوں اور ایکسٹرا سپلائر بھی... میں دراصل تم سے یہ پوچھنے آیا تھا کہ فائٹ کرو گے؟"

"میں بلاوجہ کسی سے فائٹ نہیں کرتا۔" میں نے بدستور ر[illegible]

سے جواب دیا۔

"مذاق بھی اچھا کر لیتے ہو۔" غلام احمد عرف گگو ایک بار پھر ہنس کر بولا۔ "تم یقیناً سمجھ چکے ہو کہ میں فلمی فائٹ کی بات کر رہا ہوں۔ یار... دراصل اپنے ایک مہربان فلم ساز ہیں اخلاق صاحب... بناتے تو فالتو فلمیں ہی ہیں لیکن ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی ہر چیز کی اپنی ہی ایک شان ہو۔ سیٹ ہوں تو بہت اعلا قسم کے ہوں۔ ایکسٹرا لڑکے لڑکیاں ہوں تو بہت صاف ستھرے اور خوش شکل قسم کے ہوں۔ غربت کے مارے اور فاقہ زدہ نظر نہ آئیں۔ فائٹر ہوں تو واقعی فائٹر نظر آئیں تاکہ انہیں ایکشن میں دیکھ کر پبلک کا خون جوش مارنے لگے۔ غرضیکہ اخلاق صاحب کو اپنی فلم میں ہر چیز کے معیار کی بہت فکر ہوتی ہے۔ روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ بڑی بجٹ فلمیں بناتے ہیں۔ نقصان کی پروا نہیں کرتے۔ مطلب کا آدمی مل جائے تو منہ مانگا معاوضہ دیتے ہیں۔ آج کل ایک فائٹ سین اٹکا ہوا ہے۔ مین فائٹر انہیں اپنے مطلب کا آدمی چاہیے۔ انہوں نے تفصیل سے تو نہیں بتایا لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کے ذہن میں کس قسم کے آدمی کا نقشہ ہے۔ بالکل تمہارے جیسے آدمی کا... اسی لیے میں تمہیں دیکھتے ہی تمہاری طرف کھنچا چلا آیا۔ معاوضہ وہ شاندار دیں گے۔ اپنا کمیشن بھی ٹھیک ٹھاک بن جائے گا۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ درحقیقت میں فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ وہ میری خاموشی کو ہچکچاہٹ سمجھتے ہوئے بولا۔ "کام قطعاً مشکل نہیں ہے... اور دن بھی زیادہ نہیں لگیں گے۔ زیادہ سے زیادہ تین دن میں فائٹ کے سارے سین شوٹ ہو جائیں گے۔ میں سب کچھ سکھا دوں گا۔"

میں اب بھی خاموش رہا۔ بیشتر ایکسٹرا رخصت ہو چکے تھے، جو اب بھی وہیں بیٹھے تھے ان میں سے ایک اُٹھ کر ہماری طرف آنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے۔ شیو بڑھا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟" گگو نے اسے قریب کھڑے دیکھ کر ملائمت سے پوچھا۔

"وہ... اُستاد...!" ایکسٹرا نحیف آواز میں صرف اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔ اس کی نظر گگو کی طرف اُٹھی اور جھک گئی۔ پھر وہ قمیص کا ایک حصہ پکڑ کر اسے اضطراری انداز میں مروڑنے لگا۔ اس کی آواز گویا حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی لیکن جس طرح اس نے گگو کی طرف دیکھا تھا، اس ایک نظر نے ہی ساری کہانی سُنا دی تھی۔ بیمار راتوں کے افسانے، مجبوریاں، ذلتیں، ناکامیوں کا اضمحلال... نہ جانے کیا کچھ تھا اس ایک نظر میں... اسے لفظوں کی ضرورت نہیں تھی۔

"اچھا... اچھا... میں سمجھ گیا۔" غلام محمد ملائمت سے بولا اور جیبیں کھنگالنے لگا۔ بالآخر ایک جیب سے اس نے پچاس کا نوٹ نکالا اور ایکسٹرا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "فی الحال میں تجھے کام تو نہیں دلا سکتا، شکورے! لیکن یہ رکھ لے۔ یہ قرض نہیں ہے۔ دوست کی طرف سے بچوں کے لیے مٹھائی سمجھ کر رکھ لے۔ ایک آدھ دن میں تیرے لیے کام بھی ضرور نکال لوں گا۔"

ایکسٹرا نے نوٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے دیکھا کہ اس کی استخوانی انگلیوں میں لرزش تھی۔

"بہت بہت شکریہ استاد...!" میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے وہ تیزی سے مُڑا اور تقریباً دوڑتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی اجنبی کے سامنے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں۔

اس شخص نے مجھے افسردہ کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی غلام محمد یک لخت مجھے بہت بھلا لگنے لگا تھا۔ اپنے حلیے اور انداز و اطوار سے وہ ککڑ بدمعاش اور بے حس نظر آتا تھا مگر اندر سے وہ یقیناً نرم خو، شریف اور حساس تھا۔ فلمی دُنیا بدنام سہی... لیکن یہاں بُرے لوگوں کے پہلو بہ پہلو بہت اچھے، روشن اور اُجلے لوگ بھی موجود تھے۔ غلام محمد جیسے شخص کو یقیناً دوست بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ نازو کا سُراغ لگانے کے لیے اور شاہ جی نامی اُس پُراسرار ہستی کا صحیح حدود اربعہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ میں بھی اسٹوڈیو کا بھیدی بنوں۔ یہاں کے لوگوں کو قریب سے جاننے لگوں۔ غلام محمد اس سلسلے میں میرے لیے سیڑھی ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ خود ہی میری مدد کو آن پہنچا تھا۔ مجھے اس سے بے اعتنائی نہیں برتنی چاہیے۔ چنانچہ ایک لمحہ توقف کے بعد جب غلام محمد عرف گگو نے اپنی فرمائش دُہرائی تو میں نے فوراً ہامی بھر لی۔

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم یہی فیصلہ کرو گے۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔ آؤ اب میں تمہیں ڈائریکٹر اور سیٹھ اشفاق صاحب سے ملوا دوں۔"

اس مرتبہ مجھے جس فلم کمپنی کے دفتر میں لے جایا گیا، اس کا نام "آغا انٹرنیشنل" تھا۔ یہ دفتر چودھری فضل داد کے اس دفتر سے زیادہ مختلف نہیں تھا جہاں میں ایک سال قبل گیا تھا۔ دفتر میں

میرا مختصر سا انٹرویو لیا گیا۔ ڈائریکٹر کم بول رہا تھا۔ زیادہ باتیں تو سیٹھ جی یعنی فلم ساز اشفاق صاحب ہی کر رہے تھے۔ انٹرویو کے دوران اشفاق صاحب بولے "فلم میں فائٹ سین کرنے کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ آدمی کو داؤ پیچ بھی آتے ہوں لیکن اگر اسے داؤ پیچ آتے ہوں یعنی وہ حقیقتاً فائٹر ہو تو ہمارا کام بہت آسان ہو جاتا اور منظر میں زیادہ خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔ تمھیں کچھ آتا ہے؟"

"ہاں... بہت کچھ آتا ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "کچھ کر کے دکھاؤں؟"

"مثال کے طور پر کیا دکھا سکتے ہو؟" سیٹھ صاحب نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ان دونوں کو ایک ہی وقت میں ہوا میں قلابازی کھلا کر چت گرا کر دکھاؤں؟" میں نے اپنے دائیں بائیں کھڑے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ان میں سے ایک تو چپراسی تھا، دوسرا معلوم نہیں کون تھا۔ میری بات سن کر ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"ہمیں یقین ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔" سیٹھ اشفاق مسکراتے ہوئے بولے۔ "اس لیے عملی مظاہرے کی ضرورت نہیں۔ کمرہ بہت تنگ ہے۔ کرسیوں اور میزوں سے ٹکرا کر ہمارے دونوں قیمتی آدمی اللہ کو پیارے بھی ہو سکتے ہیں۔ میں تمھیں اوکے کرتا ہوں۔ کیوں جان صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟" انھوں نے ڈائریکٹر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"بس جی... آپ نے اوکے کر دیا تو میری طرف سے بھی اوکے ہے۔" جان صاحب نے جواب دیا۔

اب سیٹھ اشفاق، گلّو کی طرف متوجہ ہوئے اور کھنکار کر گلا صاف کرنے کے بعد گویا کوئی مشکل موضوع چھیڑتے ہوئے بولے۔ "یہ تو ہو گیا... اب مسئلہ یہ ہے بھائی گلّو کہ تمھارے لیے میرے پاس ایک افسوس ناک خبر ہے۔"

"وہ کیا؟" گلّو نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ ہم تمھارے ساتھ کنٹریکٹ سائن نہیں کر رہے۔" سیٹھ صاحب دھیمے لہجے میں بولے۔

"وہ کیوں؟ کیا غلطی ہوئی ہے مجھ سے؟" گلّو گویا اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"غلطی تو کوئی نہیں ہوئی۔ میرا بس چلے تو میں اپنی آیندہ تمام فلموں کے لیے صرف تمھیں فائٹ انسٹرکٹر کے طور پر سائن کروں۔ میری نظر میں تم اس لائن کے بہترین آدمی ہو لیکن تم سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے کہ میں صرف نام کا سیٹھ ہوں۔ میری فلموں کے اصل فنانس ملک صاحب ہوتے ہیں اور وہ صرف فنانسر ہی نہیں، اس اسٹوڈیو کے مالک بھی ہیں۔ انھوں نے آج پیغام بھیج دیا ہے کہ فائٹ انسٹرکٹر کے طور پر ان کے آدمی فواد کو سائن کیا جائے گا۔"

"یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا جی۔" گلّو بھڑک کر بولا۔ "آپ کے ایک سے ایک ہیرو ڈھونڈ کر میں لایا۔ لوکیشنز میں نے تجویز کیں۔ معاوضے میں نے طے کیے۔ اپنے بہت سے آدمیوں کو ناراض کیا۔ پر پتھر رکھ کر بہت سے ضرورت مندوں کو مایوس کیا اور ہر آدمی آپ کی مرضی کا منتخب کیا اور جب کام شروع ہونے کا وقت آیا تو آپ مجھے ٹکا سا جواب دے رہے ہیں۔ دراصل مجھے کنٹریکٹ سائن کرنے کے بعد ہی کوئی کام شروع کرنا چاہیے تھا۔ میں نے غلطی کی کہ ... کی طرح زبانی کلامی ہی آپ سے معاملہ طے کر کے کام شروع ...

"تمھیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ میں کتنا مجبور ہوں۔" سیٹھ اشفاق کے لہجے میں واقعی بے بسی کی جھلک تھی۔ "ملک صاحب کے علاوہ کسی کا بھی معاملہ ہوتا تو میں کوئی پروا نہ کرتا۔"

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" گلّو نے بجھے ہوئے ... میں کہا اور اٹھ کر دروازے کی طرف چل دیا۔ میں بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔

اشفاق صاحب نے آواز دے کر مجھے روکا اور حیرت سے ... "تم کہاں چل دیے بھئی؟"

میں نے گلّو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو اس ... کے ساتھ آیا تھا۔ جب یہی جا رہا ہے تو میں یہاں کیا جھک ماروں ..."

گلّو رک گیا اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اشفاق ... نے اسے مخاطب کیا۔ "بھئی اس نوجوان کو سمجھاؤ۔ اس کے لیے ... چانس ہے۔"

"مجھے تمھارا جذبہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے جوان!" گلّو نے میرا کندھا تھپک کر کہا۔ "لیکن میرا بھی یہی مشورہ ہے کہ جذباتی مت ... چانس مل رہا ہے تو ضرور فائدہ اُٹھاؤ۔ ہم پرانے لوگ ہیں، ہماری فکر نہ کرو۔ ہمارے لیے کام کی کمی نہیں۔" پھر وہ سیٹھ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اسے باہر کہیں تنہائی میں بیٹھ کر سمجھاتا ہوں۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا اور ایک ستون کے قریب ... ہوئے بولا۔ "تم جوان مرد ہو۔ چند لمحے کی دوستی میں، میں نے کسی کو ... طرح کسی کا ساتھ دیتے نہیں دیکھا لیکن سچے دل سے میرا مشورہ ... ہے کہ میرا ساتھ دینے کے چکر میں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مت مارو۔"

"کہاں کی کلہاڑی اور کیسا چانس یار!" میں نے بے نیازی ... سے کہا۔ "میں اسٹوڈیو میں کام تلاش کرنے تو آیا نہیں تھا۔ وہ تو بس ویسے ہی... تم اچھے آدمی لگے تو اُٹھ کر تمھارے ساتھ چل دیا۔"

گلّو مجھے قابلِ اعتماد آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اسے اصل بات بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ "درحقیقت میں یہاں کسی کی تلاش میں آیا تھا۔ فلموں میں کام کرنا میرا مقصد نہیں تھا۔" میں نے مختصراً اُسے ساری بات بتادی۔

میں نے محسوس کیا کہ میری داستان سن کر اس کی رنگت کچھ پھیکی پڑ گئی تھی۔ وہ مضطرب سے لہجے میں بولا۔ "بہتر ہوگا کہ تم نازو کو بھول جاؤ، ورنہ ضرور کسی بڑے چکر میں پھنس جاؤ گے۔ کہیں جان سے ہی ہاتھ نہ دھو بیٹھنا۔ نازو بہت اچھی لڑکی تھی۔ معلوم نہیں کس طرح اس دُنیا میں آگئی تھی۔ میں اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ میں نے اُڑتی اُڑتی سی بات سنی ہے کہ اس کے اغوا میں بہت بڑے بڑے آدمیوں کا ہاتھ ہے۔ تم اس چکر میں مت پڑو۔ یہاں کبھی کبھی اس قسم کے واقعات رُونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی کوئی نو وارد لڑکی اغوا ہو جاتی ہے اور دوبارہ کسی کو اس کی صورت بھی نظر نہیں آتی اور کبھی کسی کو بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیا جاتا ہے۔ تھوڑا عرصہ ہلچل سی رہتی ہے پھر لوگ سب کچھ بھول بھال جاتے ہیں۔"

"وہ شاہ جی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا... یہاں بہت سے شاہ جی ہیں۔"

"کاش میں ان غنڈوں کے ناموں سے ہی واقف ہوتا جنھوں نے مجھے بے ہوش کیا تھا۔" میں نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ نازو کی گمشدگی میں انھی کا ہاتھ ہے۔"

دفعتاً گلّو آنکھوں ہی آنکھوں سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ جو لمبا سا آدمی گلے میں پھول دار اسکارف باندھے آرہا ہے، یہ فواد ہے جسے میری جگہ فائٹ انسٹرکٹر کے طور پر سائن کیا جا رہا ہے۔ اگر تم نے اشفاق صاحب کی فلم میں کام کرنے کی ہامی بھری تو تمھیں اس شخص کی ہدایات کے تحت کام کرنا ہوگا۔"

میں نے غیر محسوس انداز میں اس طرف دیکھا۔ وہ شخص اپنے ہی دھیان میں چلا آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرا دل اُچھل کر گویا حلق میں اٹک گیا۔ لہو میری کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں نے بمشکل اپنے آپ کو قابو میں رکھا ورنہ شاید میں کسی درندے کی طرح جھپٹ کر اسی وقت اس شخص کو دبوچ لیتا۔

"کیا ہوا؟ یہ تمھارے تاثرات کیوں بدل گئے؟" گلّو نے قدرے گھبرا کر پوچھا۔

میں نے اس شخص کی طرف سے نظر ہٹاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "شاید یہی ان بدمعاشوں کا سرغنہ ہے جو چھت پر نازو کو دھمکانے آئے تھے اور جن سے میرا جھگڑا ہوا تھا۔ اس کی شکل تو خاص طور سے میرے ذہن پر نقش ہے۔"

"اوہ...!" گلّو نے ایک گہری سانس لی۔ "پھر تو کڑیاں کچھ ملتی نظر آرہی ہیں۔ یہ شخص محض وقت گزاری کے لیے فائٹ انسٹرکٹر بنا ہوا ہے۔ درحقیقت یہ مجھے کسی بہت بڑے گروہ کا رکن معلوم ہوتا ہے اور اسے یقیناً بہت بڑے بڑے آدمیوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ اس اسٹوڈیو کے مالک یعنی ملک کے اشارے پر بھی کام کرتا ہے۔ اسی نے اس کی سفارش کی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ تم جس شاہ جی کا تذکرہ کر رہے تھے، وہ کون ہو سکتا ہے۔ اس کا نام مکرم شاہ ہے۔ وہ ملک کا گہرا دوست ہے۔ بدقماش قسم کا فلم ساز ہے۔ اس نے یا اس کی فرمائش پر ملک نے فواد اور اس کے ساتھیوں کو بھیجا ہوگا کہ نازو کو دھمکائیں اور اتفاق سے اس چکر میں تم بھی اُلجھ گئے۔"

اس وقت تک فواد، سیٹھ اشفاق کے دفتر میں داخل ہو چکا تھا جس کے دروازے پر "آغا انٹرنیشنل" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ایک تو یہ چکر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اداروں پر تختی کسی نام کی لگی ہوتی تھی اور سامنے کوئی دوسرا بیٹھا ہوتا تھا۔ اصل مالک کوئی اور ہوتا تھا، روپیہ کسی اور کا لگا ہوتا تھا۔ میں نے مصافحے کے لیے گلّو کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں اندر جا رہا ہوں استاد... اب میں اس فلم میں کام ضرور کروں گا۔"

اس نے شاید مجھے کچھ سمجھانے کا ارادہ کیا مگر فوراً ہی ترک کر دیا اور میرا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "جی دار مردوں سے یاری رکھنا اپنا شوق ہے۔ اس لیے آج سے تم بھی ہمارے یار ہو۔ کبھی مدد کی ضرورت پڑے تو اسی اسٹوڈیو میں مجھے تلاش کر لینا۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سیٹھ اشفاق کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ فواد سامنے ہی ایک صوفے پر خوب پھیل کر بیٹھا تھا اور بے نیازی سے سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ جیسے کسی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ چہرے مُہرے سے وہ ایک سفاک آدمی معلوم ہوتا تھا۔

"سیٹھ صاحب! میں آپ کی فلم میں کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"بہت خوب!" سیٹھ صاحب کھل اُٹھے۔ "تم نے اپنے حق میں اچھا ہی فیصلہ کیا۔" پھر وہ فواد کی طرف متوجہ ہوئے اور بڑی ملائمت سے بولے۔ "فواد! وہ جو اپنی فلم میں نائٹ کلب کے بدمعاش

قسم کے مالک کا رول ہے نا... اس کے لیے میں نے اس نوجوان کا انتخاب کیا ہے۔ فائٹ تو اسے آتی ہے لیکن تم ذرا اسے عملی فائٹ کے طور طریقے سکھا دو۔ اس کے زیادہ تر سین فائٹ ہی کے بعد لگے پرسوں سے شوٹنگ کا جو شیڈول شروع ہو رہا ہے' اس میں اس کا کام بھی شامل ہے' اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد اسے ضروری ٹریننگ دے دو۔

اب گویا فواد نے میری آنے والی نسلوں پر احسان کرتے ہوئے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی سفاک آنکھوں میں ایک ثانیے کے لیے چمک نمودار ہوئی جیسے اس کے ذہن میں کوئی جھماکا ہوا ہو... مگر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں پہلی سی سرد مہری در آئی۔ شاید اسے شبہ ہوا تھا کہ میری شکل اس کے لیے شناسا ہے پھر اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ میری شکل و صورت اور خدوخال میں بہت تبدیلیاں آ چکی تھیں۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ اٹھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔

میں بڑی سعادت مندی سے اس کے پیچھے چل دیا۔ دفتر سے نکل کر ہم فوارے والے لان کے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ یہ دیکھ کر میری دھڑکن کچھ تیز ہو گئی کہ اس کا رخ انہی سیڑھیوں کی طرف تھا' جن پر چڑھ کر ایک سال قبل میں نازو کے ساتھ چھت پر پہنچا تھا اور وہاں سے میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا تھا۔

فواد خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ اسٹوڈیو بہت چھوٹا ہے۔ ہر جگہ رش رہتا ہے۔ فائٹ کی ریہرسل کے لیے فلور کی چھت سب سے اچھی جگہ ہے۔" اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اس کی تائید میں سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

چھت پر پہنچ کر میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کا وہ انبار اسی طرح پڑا تھا۔ وہ نیم شکستہ صوفہ اب بھی موجود تھا۔ اتنا عرصہ نہ جانے کب اور کیونکر گزر گیا تھا۔ یہاں تو وقت جیسے اسی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔ صرف نازو نہیں تھی۔ اس کی عدم موجودگی احساس دلا رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے اور لمحوں کے ان گنت پنچھی اڑ چکے ہیں۔ چھت کے وسط میں پہنچ کر فواد بولا۔ "سب سے پہلے میں تمہیں کھونسا کھا کر قلا بازی کھانے کا طریقہ سکھاتا ہوں۔ فرش پر اکڑوں بیٹھ جاؤ۔ دونوں ہاتھ فرش پر رکھ لو۔"

میں نے نہایت تابع داری دکھاتے ہوئے اس کی ہدایات کے مطابق پوز بنا لیا تو اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے جیکٹ کی جیب سے کھٹکے دار چاقو نکالا اور اس کی نوک میرے حلقوم پر رکھ دی۔

"کیا تھا کہ میں تجھے پہچانوں گا نہیں۔" وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ "بتا... تو یہاں کس لیے آیا ہے؟"

بحث کرنا اور خصوصاً اداکاری کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے حتی الامکان سادگی سے کہا۔ "میں... میں تو یہاں فلم میں کام کرنے آیا ہوں۔ یہ آپ میرے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں؟ آپ تو مجھے فائٹ سکھانے لائے تھے۔"

"فائٹ تو میں تجھے ایسی سکھاؤں گا کہ تیری آنے والی نسلیں بھی یاد کریں گی بشرطیکہ وہ آنے میں کامیاب ہو سکیں۔" اس نے دانت کچکچاتے ہوئے بھیڑیے کی طرح ہونٹوں کے عقب سے جھانکتے ہوئے پھر وہ چاقو کی نوک کا دباؤ بڑھاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بتا تجھے کس نے بھیجا ہے؟ زبان نہیں کھولے گا تو گلا کاٹ کر یہیں پھینک دوں گا۔ تیری لاش کا بھی اس وقت پتا چلے گا' جب بدبو اٹھنے لگے گی اور چیل کوے اسے نوچ رہے ہوں گے۔ اس چھت پر شاذونادر ہی کوئی آتا ہے۔"

بالآخر میں نے گویا خوفزدہ ہو کر ہتھیار ڈال دیے اور پھنسی پھنسی سی آواز میں کہا۔ "بتاتا ہوں... لیکن چاقو تو ہٹا مجھ سے بولا نہیں جا رہا۔"

وہ فاتحانہ انداز میں مسکرایا اور چاقو میری گردن سے ہٹا کر قدم پیچھے ہٹ کر فاتحانہ انداز میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے حلقوم کو سہلایا اور اسی دوران میری ٹانگ یوں حرکت میں آئی جیسے کوئی اسپرنگ ٹوٹ کر اچھلا ہو۔ میری ٹانگ اس کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرائی تھی اور دوسرے ہی لمحے وہ چت گر چکا تھا۔

بلاشبہ وہ بے پناہ پھرتیلا تھا۔ یوں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے گرا ہی نہیں تھا تاہم میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ چاقو اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا لیکن میں نے اس کی کلائی پر جوتے کی نوک سے ٹھوکر رسید کی تو نہ صرف چاقو ہاتھ سے نکل کر کہیں جا گرا بلکہ اس کا بازو بھی بے جان سے انداز میں جھول کر رہ گیا۔

وہ غرا کر مجھ پر جھپٹا لیکن میں نے اسی تیزی سے اسے کندھے پر لاد کر اچھال پھینکا۔ وہ بے پناہ سخت جان ہونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھر اٹھا لیکن میں نے اسے وار کرنے کی مہلت نہیں دی۔ اس مرتبہ میری ٹھوکر اس کے چہرے پر پڑی اور وہ کھڑا ہونے سے پہلے ہی بلبلا کر الٹ گیا۔ پھر تو میں نے اسے ٹھوکروں پر ہی رکھ لیا۔

آخر تک اسے شاید یہی گمان رہا کہ وہ ابھی اٹھے گا اور مجھے قابو کر لے گا۔ شاید اسی لیے وہ چیخا چلایا بھی نہیں۔ اس نے کسی کو مدد کے لیے بھی نہیں پکارا حتیٰ کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔

وہ ساکت ہوا تو میں نے بمشکل اپنے آپ کو روکا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اور گردن مروڑ کر یہیں چھوڑ دوں لیکن بے ہوش پڑے آدمی پر ہاتھ اٹھانا میری فطرت میں شامل نہیں۔ اس کا چہرہ بگڑ چکا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ اسے اس سے کہیں زیادہ دن بستر پر گزارنے پڑیں گے جتنے میں نے گزارے تھے...

فی الحال اس کے لیے اتنا ہی سبق کافی تھا۔ مجھے ابھی اس سے مزید ملاقاتیں بھی کرنا تھیں۔ اس سے بہت کچھ اگلوانا تھا۔ میرے دل میں اس کے نامعلوم اور خطرناک گروہ کا کوئی خوف نہیں تھا بلکہ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ بدمعاشی کی زنجیر کی ایک ایک کڑی تلاش کر کے اسے توڑ ڈالوں گا۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ سوچنا تھا جس کی مدد سے اسی طرح باقی بدمعاش بھی ایک ایک کر کے میرے ہتھے چڑھتے جائیں' جس طرح فواد بزعم خود میری گرفت میں آ گیا تھا۔

میں نے اس پر الوداعی نظر ڈالی۔ وہ اوندھا پڑا کسی خوابیدہ بلی کی طرح خر خر کر رہا تھا۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور اپنا حلیہ درست کر کے چھت سے اتر آیا۔ غنیمت یہ تھا کہ کسی نے مجھے فواد کے ساتھ چھت پر جاتے اور تنہا واپس آتے نہیں دیکھا تھا۔

نیچے آ کر میں نے غلام محمد عرف گگو کو تلاش کیا۔ وہ مجھے کینٹین میں بیٹھا مل گیا۔ کینٹین میں خاصی بھیڑ بھاڑ تھی' اس لیے میں اسے ساتھ لے کر اسٹوڈیو کے ایک ویران گوشے میں چلا گیا جہاں ہارڈ بورڈ کے وہ بیکار ٹکڑے پڑے ہوئے تھے' جو سیٹ تیار کرنے میں استعمال ہو چکے تھے۔

"فواد سے سامنا ہوا؟ کیا کہا اس نے؟" گگو نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"مجھے فائٹ سکھانے چھت پر لے گیا تھا... اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔" میں نے بتایا۔

"اوہ... پھر کیا ہوا؟" اس نے مضطربانہ لہجے میں پوچھا۔

"اس وقت وہ چھت پر بے ہوش پڑا ہے۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

گگو قدرے پریشانی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ فواد کو مار مار کر بے ہوش کرنا ایک کارنامہ ہے کیونکہ وہ بہت اچھا فائٹر ہے... لیکن فی الوقت یہ صورت حال تمہارے حق میں اچھی نہیں۔ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ بعد میں سوچیں گے کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے' اپنا ایڈریس مجھے دے جاؤ۔ ہو سکا تو میں تم سے رابطہ قائم کروں گا۔"

میں نے زمین سے سگریٹ کی ایک خالی ڈبیہ اٹھا کر پھاڑی اور اس پر اپنا ایڈریس لکھ کر گگو کو دے دیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر اسٹوڈیو کے گیٹ کی طرف چل دیا۔ میرے خیال میں گگو کا مشورہ مناسب ہی تھا۔ مجھے فی الوقت اسٹوڈیو سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔

اسٹوڈیو سے میں سیدھا اکھاڑے پہنچ گیا۔ اس روز وہاں کسرت اور زور آزمائی وغیرہ میں میرا معمول سے کچھ زیادہ ہی دل لگا۔ اس اکھاڑے کی بدولت ہی یہ ممکن ہوا تھا کہ آج میں نے اس شخص کی درگت بنادی تھی جس نے کچھ عرصہ قبل نہایت حقارت سے مجھے گالیاں دی تھیں اور جس کے ساتھیوں نے میری مرمت کی تھی۔ آج میرے سینے میں ٹھنڈک سی اتر گئی تھی۔

دوسرے روز میں دفتر جانے سے پہلے محلے کے ایک معمولی سے ریستوران میں ناشتہ کر رہا تھا کہ بیرے نے اخبار لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اخبار تازہ ہی تھا اور شاید گھنٹہ بھر پہلے ہی آیا تھا... مگر ریستوران میں اتنی سی دیر میں ہی اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ آج کل میں اپنے حالات اور ملازمت سے مطمئن تو تھا... لیکن اخبار میں 'ضرورت ہے' کے کالم میں اشتہارات دیکھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ کچھ عادت سی پڑ گئی تھی۔ خبروں وغیرہ پر میں کم ہی توجہ دیتا تھا... لیکن اس روز مڑا تڑا اور چکنائی زدہ اخبار اٹھانے لگا تو صفحہ اوّل کی ایک چھوٹی سی سرخی پر نظر جم کر رہ گئی۔

'اسٹوڈیو میں فائٹ انسٹرکٹر کا پراسرار قتل'

سرخی پڑھ کر ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ ڈرتے ڈرتے میں نے خبر پر نظر ڈالی۔ خبر میں زیادہ تفصیل تو نہیں بتائی گئی تھی۔ بس اتنا ہی لکھا تھا کہ فواد علی نامی ایک کہنہ مشق فائٹ انسٹرکٹر کی لاش اسٹوڈیو کی چھت پر پڑی پائی گئی تھی۔ اس کے سینے میں ایک کھٹکے دار چاقو پیوست تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ قتل کرنے سے پہلے فواد کو بری طرح زدوکوب بھی کیا گیا تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی تھی اور خبر کے آخر میں وہی روایتی جملہ درج تھا کہ پولیس سرگرمی سے نامعلوم مجرم یا مجرموں کو تلاش کر رہی ہے۔

خبر پڑھ کر میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے... سری پائے اور تندوری روٹی کا نوالہ میرے حلق میں اٹکنے لگا۔ بمشکل تمام میں نے اسے حلق سے اتارا اور چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ سب ناشتے میں جتے ہوئے تھے۔ سب کو اپنے اپنے کام پر جانے کی جلدی تھی۔

میں نے ناشتہ ختم کرنے کی بجائے برتن ایک طرف کھسکا دیے اور ٹھنڈی ٹھنڈی لسی کے دو تین گھونٹ بھرے جس سے اعصاب کو کچھ سکون ملا اور میں نے صورتِ حال پر غور کرنے کی کوشش کی۔

فواد کے سینے میں جو چاقو گھونپا گیا تھا وہ یقیناً اُس کا اپنا ہی تھا۔ مجھے یاد تھا کہ میں نے فواد کی کلائی پر ٹھوکر رسید کی تھی تو چاقو اُس کے ہاتھ سے نکل کر نہ جانے کہاں جا گرا تھا۔ اس کے بعد تو میں اُسے بھول ہی گیا تھا۔ کس نے اُسے تلاش کیا تھا اور کس نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھایا تھا؟ میں دیر تک یہی سوچتا رہا۔

فواد نے تو مجھے دھمکاتے وقت کہا تھا کہ چھت پر شاذ و نادر ہی کوئی آتا ہے مگر اس کی لاش نہ صرف اتنی جلدی دریافت کر لی گئی تھی بلکہ اگلی ہی صبح کے اخبار میں اس کی خبر بھی آ گئی تھی۔ اتنی مستعدی کس نے دکھائی تھی؟ کس نے میرے لیے یہ جُوہے دان تیار کیا تھا؟ وہاں تو کوئی مجھے جانتا بھی نہیں تھا سوائے غلام محمد عرف گلو کے... اور وہ بھی صرف نام کی حد تک ہی جانتا تھا۔ کہیں اسی نے تو مجھے قربانی کا بکرا نہیں بنایا؟ لیکن میں نے خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ ایسا بھی کر سکتا ہے۔ وہ بزدل اور سازشی آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے اگر اس نے یہ سازش کی ہوتی تو وہ اسے پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچاتا۔ اسے میرا ایڈریس معلوم تھا۔ یقیناً اخبار میں خبر آنے سے پہلے ہی پولیس مجھ تک پہنچ چکی ہوتی۔ اتنا احساس تو اُسے بھی ہوتا کہ اخبار میں خبر آنے پر میں خبردار ہو سکتا ہوں اور رُوپوش بھی ہو سکتا ہوں۔

کہیں اُسے ابھی لوگوں نے تو ٹھکانے نہیں لگا دیا جن کا وہ آلۂ کار تھا؟ شاید انھیں معلوم ہو گیا ہو کہ میں اس تک پہنچ گیا ہوں اور انھیں خدشہ ہو کہ کہیں میں اس سے نازو کے بارے میں کچھ معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو جاؤں۔

سوال یہ تھا کہ میری بے گناہی کا کون یقین کرتا۔ سیٹھ اشفاق اور اس کے کمرے میں موجود دوسرے دو تین آدمی مجھے فائٹ سیکھنے کے لیے فواد کے ساتھ جاتے دیکھ چکے تھے اور میں ان کے پاس واپس نہیں پہنچا تھا۔

لسی کا بڑا سا گلاس خالی کر کے میں اُٹھ کھڑا ہوا اور کاؤنٹر پر پیسے دے کر دفتر جانے کی بجائے گھر کی طرف واپس چل دیا۔ میں کچھ دیر تنہائی میں بیٹھ کر غور کرنا چاہتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

گھر میں بیٹھ کر بھی مجھے خوف محسوس ہوتا رہا۔ ذرا سے کھٹکے پر یوں لگتا تھا کہ ابھی پولیس والے دندناتے اندر گھس آئیں گے اور مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر گھسیٹتے ہوئے تھانے لے جائیں گے۔ میری تو اس شہر میں کام کے کسی آدمی سے شناسائی بھی نہیں تھی سوائے مجّو پہلوان کے...!

کافی دیر سوچ و بچار کے بعد بالآخر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ مجھے مجّو پہلوان کے پاس چلنا چاہیے۔ وہی شہر میں اپنا اک مہربان تھا اور کوئی معمولی آدمی بھی نہیں تھا۔ شہر میں اس کا خاصا اثر و رسوخ تھا اور یوں بھی اس نے ایک دُنیا دیکھ رکھی تھی اور کچھ نہیں تو وہ اس قسم کی صورتِ حال میں معقول قسم کا مشورہ تو دے ہی سکتا ہے۔ اس فیصلے پر پہنچ کر میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

میں دروازے کو تالا لگا رہا تھا کہ عقب سے بھاری جوتوں کی دھمک سنائی دی پھر کسی نے کھردری لیکن دھیمی آواز میں کہا "بھائی صاحب! ذرا سنیے...!"

میں نے مڑ کر دیکھا اور تالا میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

وہ پولیس کا ایک اے ایس آئی تھا۔

"آپ کا نام نسیم جمال ہے؟" اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!" میں نے تھوک نگل کر جواب دیا۔

"آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا" اے ایس آئی نے سنجیدگی سے کہا۔

شاید میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں تبھی وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دیا اور ملائمت سے بولا "آپ گھبرا کیوں گئے؟"

"تھانے کا نام سن کر ہر شریف آدمی گھبرا جاتا ہے" میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

"ہاں یہ ہماری بدقسمتی ہے" وہ کافی مہذب اور شائستہ آدمی معلوم ہوتا تھا "بہرحال آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بات معمولی سی ہے میں کسی سپاہی کو بھیج کر بھی آپ کو بلوا لیتا... لیکن میں خود ایک کام کے سلسلے میں ادھر آیا تھا سوچا آپ کو بھی ساتھ لیتا چلوں۔"

"بات کیا ہے؟" میرے دل کو کچھ ڈھارس سی ہوئی۔

"بھئی وہ بعض منچلے لوگ کبھی کبھی پی پلا کر قانون کی دھجیاں بکھیرنے لگتے ہیں ایسے کچھ لوگوں کو پچھلی رات ہم نے ایک بیٹھک سے پکڑا تھا اور حوالات میں ڈال دیا تھا۔ ان میں اشرف خان نامی ایک شخص ہے۔ ہوش و حواس بحال ہونے پر اس نے آپ کا نام و پتہ دیا تھا کہ آپ اس کی ضمانت دے سکتے ہیں اگر آپ

تھانے چلنے کی زحمت کریں تو ہم ذاتی مچلکے پر ضمانت لے کر اُسے رہا کر دیں گے۔ ہمارے پاس ویسے بھی حوالات میں جگہ نہیں ہے۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی اور مکان کو تالا لگا کر... اے ایس آئی کے ساتھ چل دیا۔ گلی کے موڑ پر اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی اور وہ غالباً کسی سے میرے بارے میں پوچھ کر ہی مکان تک پہنچا تھا۔ میں اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسٹوڈیو کے قریبی تھانے میں پہنچا۔ تھانے میں کافی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ اس تھانے میں افسران بہت مصروف رہتے تھے۔

اے ایس آئی نے اشرف کو اپنے کمرے میں ہی بُلوا لیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ندامت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اے ایس آئی کو متاثر کرنے کے لیے اشرف کو تھوڑی سی جھاڑ پلائی۔ اخلاقیات پر مختصر سا لیکچر دیا جسے اس نے سر جھکا کر بڑی سعادت مندی سے سُنا... پھر میں نے ضمانت نامہ پُر کر کے اس پر دستخط کر کے اے ایس آئی کے حوالے کیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے اشرف کے ساتھ دروازے کی طرف چل دیا۔

ہم باہر برآمدے میں آئے تو سامنے سے دو سپاہیوں کی معیت میں غلام محمد آتا دکھائی دیا۔ میرا سارا اطمینان اور اشرف خان کو رہا کرانے کی خوشی ہوا ہو گئی اور ایک بار پھر میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔ اسی لمحے مجھے یاد آیا کہ فواد کے قتل کا کیس بھی تو یہیں درج ہوا ہوگا۔ غلام محمد کو یقیناً اسی کی تفتیش کے سلسلے میں لایا گیا تھا۔

میرے قریب پہنچ کر غلام محمد صرف ایک لمحے کے لیے چونکا لیکن پھر اس نے یوں نظر پھیر لی جیسے وہ اپنے اور میرے درمیان شناسائی نہ ظاہر کرنا چاہتا ہو۔ اس کی یہ مصلحت کوشی میرے لیے اطمینان کا باعث بن گئی۔ میں اس کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ اشرف نے اُسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ کسی ناخلف مگر شرمسار فرزند کی طرح سر جھکائے میرے ساتھ چل رہا تھا۔

غلام محمد کو تھانے میں دیکھ کر ایک بار پھر میرے دل میں کُھد بُد سی شروع ہو گئی تھی۔ ممکن تھا کہ اسی پر قاتل ہونے کا شبہ کیا جا رہا ہو۔ کئی آدمیوں کو معلوم تھا کہ اُسے پروڈکشن سے نکالا گیا تھا اور اس کی جگہ فواد کو دی گئی تھی۔ گویا غلام محمد کے پاس فواد کو قتل کرنے کا ایک معقول جواز موجود تھا۔

بعید نہیں تھا کہ اگر اس پر سختی کی گئی اور اسے ڈرائنگ روم کی سیر کرائی گئی تو وہ میرے بارے میں سب کچھ پولیس کو بتا دے کہ کس طرح میں فواد کے ساتھ فائٹ سیکھنے چھت پر گیا تھا اور کس طرح اسے مار مار کر بے ہوش کر کے چھت پر چھوڑ آیا تھا۔ وہ اگر صرف سچ بولتا تب بھی اُس سے آگے پولیس خود ہی کر لیتی تو پولیس کا اخلاقی فرض بن جاتا کہ میں نے فواد کو صرف بے ہوش کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہوگا بلکہ اس کے سینے میں چاقو بھی گھونپ دیا ہوگا۔ ادھر میرا نام و پتہ بھی تھانے کے ریکارڈ پر آ چکا تھا۔

اشرف معلوم نہیں کیا کیا باتیں کیے جا رہا تھا لیکن میری اس کی طرف توجہ ہی نہیں تھی۔ ایک ریستوران میں بیٹھ کر چائے وغیرہ پینے کے بعد ہم ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر اپنی اپنی راہ پر ہو لیے۔

میں مجّو پہلوان کی دکان پر پہنچا۔ وہ رنگ محل میں پنساری کی دکان کرتے تھے اور ویسے بلامعاوضہ ان لوگوں کی ہڈیاں جوڑنے کا کام بھی کر دیتے تھے جو کسی حادثے وغیرہ میں ہاتھ پاؤں تڑوا بیٹھتے تھے۔ وہ وہاں موجود نہیں تھے۔ ان کے ملازم نے بتایا کہ وہ اکھاڑے پر اپنے ڈیرے میں ہوں گے۔

میں اکھاڑے میں پہنچا تو مجّو پہلوان نے میری صورت دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ میں پریشان ہوں۔ میں ان کے کمرے میں اطمینان سے بیٹھ چکا تو انھوں نے اطمینان سے کہا "چکر خواہ کچھ بھی ہو مجھے ہر بات تفصیل سے بتا دو۔ میرے ہوتے ہوئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ کوئی قتل ہو گیا ہے تمھارے ہاتھ سے...؟"

"دیکھا جائے تو بات تقریباً ایسی ہی ہے" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا... پھر میں نے شروع سے لے کر آج تک کے تمام واقعات بلا کم و کاست انھیں سنا دیے۔

"تم نے تو اس چھوٹی سی عمر میں ہی اپنے آپ کو بہت اُلجھا لیا ہے، برخوردار!" مجّو پہلوان پُرخیال لہجے میں بولا "بہرحال، میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے گھر تک ہی محدود رہو۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو اُستاد؟" میں مجّو پہلوان کی عقیدت کرتا تھا۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا لیکن اس سے میرا اندازِ تکلم بے تکلفانہ ہوتا تھا "تم نے شاید غور نہیں کیا کہ غلام محمد کو میرا پتہ معلوم ہے۔"

"میں غلام محمد سے ملا تو نہیں لیکن تمھاری زبانی اس کا ذکر سن کر میرے ذہن میں اس کا جو نقشہ بن گیا ہے، اس کے مطابق وہ کوئی اوچھا آدمی معلوم نہیں ہوتا" اُستاد بولا "ایسے لوگ جان پر کھیل جاتے ہیں... مگر جسے دوست کہہ دیتے ہیں اس پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ وہ اگر تمھیں پھنسوانا چاہتا تو تھانے میں

دیکھ کر ہی ہوا ہو بلا مچا دیتا۔ اسے تمہاری بےگناہی کا یقین ہے۔ کسی اور کو بھی تم پر شک نہیں بلکہ کسی کو تمہارے بارے میں صحیح طور پر معلوم ہی نہیں ہے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تمھیں اپنے گھر پر ہی رہنا چاہیے… اگر کسی مرحلے پر تفتیش کرنے والے تمہارے گھر تک پہنچے تو تمھیں غائب پا کر وہ یہی سمجھیں گے کہ مجرم تم ہی ہو' اس لیے روپوش ہو گئے ہو۔ تم بے دھڑک ہو کر گھر پر رہو اگر کوئی اونچ نیچ ہوئی تو میں ہر قسم کی مدد کے لیے بیٹھا ہوں تم فکر مت کرو۔ مردوں کی زندگی میں ایسے چکر چلتے ہی رہتے ہیں۔"

مجو پہلوان کی باتوں سے دل کو ڈھارس مل گئی۔ رگ پٹھے میں توانائی لوٹ آئی۔ طبیعت میں قرار سا آ گیا۔ اس شام حسبِ معمول اکھاڑے میں زور کیا البتہ رات کو کچھ جلدی گھر لوٹ آیا۔

گلی میں داخل ہوتے وقت دھڑکن معمول سے کچھ تیز ہوئی کہ شاید گھر کے دروازے پر پولیس میری منتظر ہو… مگر ایسا نہیں ہُوا تھا۔ گلی میں سب کچھ معمول کے مطابق ہی تھا۔ ماحول بالکل پُرسکون تھا لیکن جب میں دروازے پر پہنچا تب احساس ہُوا کہ کوئی نہ کوئی چیز خلافِ معمول ضرور ہوئی ہے۔

میرے گھر کے دروازے پر تالا نہیں تھا بلکہ دروازہ یوں بند تھا جیسے اندر کوئی موجود ہو۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور بتی جلائی تو معلوم ہُوا کہ کوئی آیا ضرور تھا… مگر وہ جا چکا تھا اور پاس پڑوس میں شاید کسی کو بھی اس کی آمد و رفت کا علم نہیں ہُوا حالانکہ وہ مکان کی ہر چیز کو تہ و بالا کر گیا تھا۔

میرا مکان دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک کو میں نے ڈرائنگ رُوم کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس عظیم الشان ڈرائنگ رُوم میں چار ہلکی پھلکی کرسیوں اور ایک تپائی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ان چیزوں کو صرف اُلٹنے پر اکتفا کیا گیا تھا۔

میرا بیشتر ساز و سامان اور کاٹھ کباڑ دوسرے کمرے میں تھا۔ جسے ویسے تو میں بیڈ رُوم کہتا تھا تاہم یہی میرا سب کچھ تھا۔ اس کمرے کی حالت غیر تھی۔ بیڈ اُلٹ دیا گیا تھا۔ گدا اور تکیے پھاڑ دیے گئے تھے۔ چھوٹی سی میز اور الماری کی درازیں وغیرہ نکال کر فرش پر اُلٹ دی گئی تھیں۔ کچن اور باتھ رُوم تک کی چیزیں اُلٹ پلٹ کر دی گئی تھیں۔

میں ایک کرسی سیدھی کر کے کچھ دیر تک تو گم صُم بیٹھا رہا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ اب کون سا چکر شروع ہو گیا ہے اور مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟ پہلے تو میں نے سوچا کہ پاس پڑوس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں کہ کیا انھیں معلوم ہی نہیں ہو سکا کون اتنی دیدہ دلیری سے میرے گھر کا یہ حال کر گیا… لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا کہ معلومات حاصل ہونا تو مشکل ہی ہے البتہ اگر کسی نے پولیس میں رپٹ کرنے کا مشورہ دے دیا تو بغلیں جھانکنا پڑیں گی کیونکہ میں پولیس کا سامنا کرنے سے بچنا چاہتا تھا۔

بالآخر صبر و شکر کے ساتھ میں نے اُٹھ کر گھر کی حالت درست کرنی شروع کر دی۔ اس کام میں دو ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ اس وقت تک میں تھکن سے چُور ہو چکا تھا۔ اس لیے بیڈ پر ڈھیر ہو گیا اور بے سُدھ ہو کر سو گیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی… جلد ہی آنکھ کھلنے کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ میں نے اُٹھ کر بتی جلائی اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔

اس وقت کسی کا آنا خالی از علت نہیں ہو سکتا تھا۔

"کون ہے؟" میں نے حتی الامکان بارعب آواز میں پوچھا۔

"دوست ہی سمجھیے… ہمیں آپ سے ایک کام آن پڑا ہے اس لیے بے وقت زحمت دے رہے ہیں۔" نہایت ہی شائستہ اور التجا آمیز لہجے میں کہا گیا۔

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد میں نے تن بہ تقدیر ہو کر دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک دراز قد اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ وہ پینٹ شرٹ میں تھا اور بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا۔ دوسرا ناٹا تھا اور شلوار قمیص میں تھا مگر وہ بھی خوب گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا اور خاصا طاقت ور معلوم ہوتا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ ان میں سے کسی کے بھی ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ان کی آمد کا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے رات گئے کسی کے گھر مہمان آ گئے ہوں۔

"ہم اندر آ سکتے ہیں؟" لمبے نے پوچھا۔ لہجہ اب بھی شائستہ ہی تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ بہرحال اندر آنے کا تہیہ کر کے آئے ہیں۔ میں نے بھی یہ سوچ کر ابتدا ہی میں مزاحمت کرنا مناسب نہیں سمجھی کہ شاید انہی کے ذریعے ان واقعات کا کوئی سرا ہاتھ آ جائے جنھوں نے مجھے اُلجھا کر رکھ دیا تھا۔ یہ اندازہ تھا کہ بوقتِ ضرورت میں ان دونوں سے نمٹ بھی سکتا ہوں۔ میں نے خاموشی سے ایک طرف ہٹ کر انھیں راستہ دیا… اور دروازہ بند کر دیا۔ بیٹھک سے گزر کر ہم بیڈ رُوم میں آ گئے۔ میں نے مکان کی حالت کافی حد تک درست تو کر لی تھی لیکن گدا اور تکیے ظاہر ہے' اب بھی پھٹے ہوئے تھے بعض دوسری چیزیں بھی صحیح جگہ پر نہیں رکھی جا سکی تھیں۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کمرے میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ دونوں گہری نظر سے کمرے کا جائزہ لے رہے تھے اور میں ان کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

گفتگو کرنا شاید لمبے کے ذمّے تھا۔ اس مرتبہ بھی وہی بولا۔ "بے چاروں نے کوشش تو سر توڑ کی ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ انھیں مطلوبہ چیز نہیں ملی۔ یہ بات ہم دونوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔ اب ہم اطمینان سے بیٹھ کر سودا کر سکتے ہیں۔"

"کس چیز کا؟ خربوزوں کا، چقندروں کا یا پھر بند گوبھی کا؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

دونوں خوش دلی سے ہنس پڑے… پھر دراز قد بولا۔ "ٹھیک ہے تمہارا رویّہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ہمیں خوشی ہے کہ تم نے آج تک اس امانت کو سنبھال کر رکھا ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا ہضم کر چکا ہوتا۔"

"او میرے خدا… اب میں پاگل ہو جاؤں گا۔" میں نے حقیقتاً اپنے بال نوچ لیے۔ ایک تو میں اتنی گہری نیند سے جگا دیے جانے پر بے حال تھا۔ اوپر سے اُن لوگوں کی گفتگو مجھے وحشت زدہ کیے دے رہی تھی۔ "مختصر ترین لفظوں میں بلا تمہید بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو ورنہ میں تم دونوں کی کھوپڑیاں دیوار میں دے ماروں گا۔" میں نے سنجیدگی سے دھمکی دی۔

"خیر… ہماری کھوپڑیاں اتنی بے وقعت بھی نہیں ہیں کہ انھیں اتنی آسانی سے دیوار میں مارا جا سکے۔" دراز قد شخص مسکرا کر بولا۔ "مختصر ترین الفاظ میں ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہمیں وہ ڈائری چاہیے' جو نازو تمھیں دے گئی تھی۔"

"ڈائری… نازو…؟" میں ہکلا کر رہ گیا۔ "کیسی ڈائری؟ اور نازو کہاں ہے؟"

"بہت خوب…!" اس نے گویا میری اداکاری کی داد دیتے ہوئے کہا۔ "یہی غنیمت ہے کہ تم نے نازو کے وجود سے لاعلمی کا اظہار نہیں کیا۔ خیر… ہمیں ڈائری وصول کرنے کی بہت زیادہ ضرورت تو ہے لیکن ہم بہت زیادہ عجلت میں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ہم پہلے اپنے مسائل' سودے بازی کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر اس میں کوئی دشواری ہو تو پھر کوئی دوسرا… طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ تمہارے ساتھ فی الحال ہمارا یہ سودا ٹھہرا کہ ہم تمھیں پچاس ہزار روپے دے جاتے ہیں۔ رات بھر نوٹوں کی خوشبو سونگھو۔ اس طرح رفتہ رفتہ تمہارا ارادہ بھی کمزور ہوتا رہے گا۔ کل رات ہم آ کر تم سے ڈائری لے لیں گے۔ ویسے بھی وہ تمہارے کسی کام کی نہیں۔ ایک چیز جو تمہارے لیے بیکار ہے! اس کے تمھیں پچاس ہزار مل جائیں' اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟"

"بھائی خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔" میں نے حقیقتاً اُن کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "میں بہت پریشان ہو چکا ہوں۔ اب مجھے مزید پریشان نہ کرو۔ نازو نے مجھے کوئی ڈائری وغیرہ نہیں دی۔ اس سے تو میری صرف ایک مرتبہ چند منٹ کے لیے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے میں آج تک اُسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں بلکہ اگر تمھیں اس کے متعلق کچھ معلوم ہے تو مجھے بتا دو۔ میں تمہاری طرح دولت مند تو نہیں کہ پچاس ہزار کی آفر کر سکوں تاہم ان معلومات کے عوض اپنی حیثیت کے مطابق پچاس ساٹھ روپے تو دے ہی دوں گا۔"

"بڑی شگفتہ طبیعت پائی ہے تم نے…" دراز قد شخص مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر اُس نے نہایت اطمینان سے بریف کیس کھولا اور سو سو کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں نکال کر لاپروائی سے تپائی پر پھینکتے ہوئے بولا۔ "پچاس ہزار ہیں۔ کیا یاد کرو گے کہ ایسے سخی خریداروں سے پالا پڑا تھا جنھوں نے مال دیکھے بغیر ہی قیمت ادا کر دی تھی۔ کل ہم ڈائری لینے آئیں گے۔ جہاں بھی ہو' وہاں سے لا کر رکھ لینا اور فرار ہونے کی کوشش مت کرنا۔ ہم آدمی کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں لیکن اس کے بعد وہ زندہ نہیں رہتا۔"

وہ مجھے حیران و پریشان چھوڑ کر اطمینان سے اُٹھے… اور بے آواز طریقے سے دروازہ کھول کر رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں دھم سے بستر پر گر پڑا۔ میرا ذہن بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اب ایک نیا ہی قصہ شروع ہو گیا تھا کہ بیک وقت دو پارٹیاں کسی ڈائری کی تلاش میں تھیں جس کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا لیکن دونوں ہی پارٹیاں وہ ڈائری میرے قبضے سے برآمد کرنے کے لیے تگ و دو میں لگی ہوئی تھیں۔ ہاتھیوں کی لڑائی میں جھاڑیوں کا نقصان… کچھ اسی قسم کی صورتحال معلوم ہوتی تھی۔

میں نے رقم تو اُٹھا کر اپنے چھوٹے سے سُوٹ کیس میں رکھ دی اور سُوٹ کیس بیڈ کے نیچے کھسکا دیا۔ میرا ذہن شل ہو رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ صبح اُٹھ کر ہی سوچوں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ فی الحال سو جانا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد بالآخر میں سو گیا۔

دوسری صبح میں نے تیار ہو کر گھر سے نکل کر پہلے اپنے دفتر فون کیا کہ میں نہیں آسکوں گا پھر شہباز کے ریستوران میں جا بیٹھا جو میرا خورد و نوش کا مستقل اڈہ تھا۔ یہ ایک ایسا ہمہ گیر قسم کا ریستوران تھا کہ یہاں ایسر دکی گولی سے لے کر گائے کی روسٹ ران تک سبھی کچھ دستیاب تھا۔

ناشتے کا آرڈر دے کر میں نے خاص طور پر اخبار کا جائزہ لیا۔ فواد کے قتل کے سلسلے میں آج بھی خبر موجود تھی... لیکن اندرونی صفحے پر۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ اس قتل کے سلسلے میں پوچھ گچھ کے لیے کئی آدمیوں کو حراست میں لیا گیا تھا لیکن بالآخر انہیں چھوڑ دیا گیا۔ ان میں غلام محمد کا نام بھی شامل تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ واقعی یاروں کا یار اور کھرا آدمی تھا۔ اس طرف سے اطمینان ہوا تو میں نے اُن لوگوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا جو میری جھولی میں پچاس ہزار روپے ڈال گئے تھے۔

یہ بات تو طے تھی کہ وہ بہت خطرناک لوگ تھے اسی لیے لاپروائی سے پچاس ہزار روپے میرے حوالے کر کے اطمینان سے چل دیئے تھے۔ صبح جب میں گھر سے نکلا تو میں نے ہر طرح سے اطمینان کیا تھا اور بالآخر اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ کوئی میری نگرانی نہیں کر رہا تھا لیکن اس بات سے مجھے اطمینان کے بجائے مزید تشویش ہوئی تھی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اگر میں نے غائب ہونے کی کوشش کی تو وہ لوگ مجھے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ ان کا دعوا محض گیدڑ بھبکی نہیں تھا۔

بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ رقم تو مجو پہلوان کے پاس رکھوا دینی چاہیے یوں یہ ہاتھ آئی ہوئی چیز تو محفوظ رہے گی ویسے بھی مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے یہ کہہ کر ان لوگوں کو رقم واپس کرنے کی کوشش کی کہ ڈائری میرے پاس نہیں ہے تو رقم شاید وہ ضرور واپس لے لیں لیکن یہ یقین ہرگز نہیں کریں گے کہ ڈائری میرے پاس نہیں ہے... پھر وہ بعد میں میرے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں۔ انہیں اگر میری بات کا یقین کرنا ہوتا تو رات کو ہی کر لیتے۔ انھوں نے تو بس طے کر لیا تھا کہ ڈائری میرے ہی پاس ہے۔

ناشتہ کر کے میں گھر واپس آیا اور بیڈ کے نیچے سے سوٹ کیس نکال کر اس میں رکھی ہوئی رقم کا جائزہ لینے لگا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اتنی بڑی رقم اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ رقم کو دوبارہ سوٹ کیس میں رکھ کر میں نے اُسے مقفل کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔

"خدایا خیر..." میں نے سوچا۔ "کہیں ڈائری کی تلاش میں تیسری پارٹی تو نہیں آگئی۔"

... لیکن دروازہ کھولا تو غلام محمد کو سامنے پایا۔ وہ بڑے محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"ارے تم...؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "یوں اس طرح اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں اندازہ کر رہا تھا کہ یہاں تک کسی نے میرا تعاقب تو نہیں کیا۔ احتیاط اچھی چیز ہے نا؟" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے بھی حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ادھر اُدھر دیکھ کر مطمئن ہونے کے بعد غلام محمد اندر آگیا۔

"سب سے پہلے تو میں تمھارا شکریہ ادا کروں گا کہ تم نے پولیس کے سامنے مجھے مشکوک قرار نہیں دیا۔" میں نے اس کے لیے کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔

"پیارے! میں جس لائن میں ہوں وہاں آدمی اور کچھ سیکھے نہ سیکھے لیکن بہت کچھ گنوانے کے بعد انسان کو پہچاننا ضرور سیکھ جاتا ہے۔" غلام محمد مسکرا کر بولا۔ "جب تم نے آکر مجھے بتایا کہ فواد کو بے ہوش کر کے چھت پر چھوڑ آئے ہو تو مجھے یقین تھا کہ تم سچ بول رہے ہو لیکن کوئی نہ کوئی تمھاری تاک میں تھا جس نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھالیا۔ آخر وہ کون تھا اور اسے تم سے کیا دشمنی تھی؟"

"یہی مسئلہ تو دن بدن اُلجھتا جا رہا ہے۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "خیر تم یہ بتاؤ کہ پولیس سے تمھاری جان کیونکر چھوٹی...؟"

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق جس وقت فواد قتل ہوا تھا اس وقت میں بیسیوں آدمیوں کے سامنے کینٹین میں موجود تھا اور اس کے بعد ایک اور فلم سازکے دفتر میں جا بیٹھا تھا۔ ان کی تصدیق سے میری جان چھوٹ گئی، ورنہ میں تو رگڑا ہی گیا تھا۔ تم سناؤ... کوئی تم تک تو نہیں پہنچا؟"

"مجھ تک تو بہت سے لوگ پہنچ رہے ہیں اور مجھے بھی کہیں اور پہنچانے کی فکر میں ہیں۔" میں نے جواب دیا پھر میں نے اسے اپنی ساری رام کہانی سنا دی۔

"واقعی تم تو بڑے بے ڈھب چکر میں پھنس گئے ہو۔" وہ تشویش آمیز لہجے میں بولا۔ "اب تم نے کیا سوچا؟"

"دُنیا میں صرف دو ہی آدمی مجھے بھروسے کے قابل دکھائی دیتے ہیں۔ ایک مجو پہلوان اور دوسرے تم۔" میں نے کہا۔ "تم سے شناسائی اگرچہ صرف دو دن پرانی ہے مگر تم پر آنکھیں بند کر کے اعتماد

کرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ رقم تو مجو پہلوان کے ڈیرے پر رکھوا دیتا ہوں مگر میں خود وہاں پناہ نہیں لے سکتا۔ وہ میرا ایسا ٹھکانا ہے جو نہ جانے کتنے آدمیوں کی نظر میں ہو چنانچہ اب میرے سامنے مسئلہ دو چار دن غائب رہنے کا ہے۔ تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکتے ہو؟"

اس نے کچھ دیر سوچا پھر قدرے ہچکچا کر بولا۔ "ٹھکانے تو میں تمھیں کئی مہیا کر سکتا ہوں لیکن ایک ٹھکانا مجھے سب سے زیادہ مناسب دکھائی دے رہا ہے۔ شاہی بازار میں ایک رقاصہ ہے گلنار... رہتی تو وہ کہیں اور ہے لیکن شاہی بازار کی ایک تنگ و تاریک اور ٹیڑھی میڑھی گلی کے ایک کوٹھے پر مجرا کرتی ہے۔ لڑکی کیا ہے ہیرا ہے ہیرا... اور اس کے قدردان جوہری اس تنگ و تاریک اور ٹیڑھی میڑھی گلی میں بھی قطار در قطار پہنچتے ہیں حالانکہ وہ مجرا بس کبھی کبھار اور اپنے بہت ہی خاص چاہنے والوں کی فرمائش پر کرتی ہے ورنہ صرف غزل سرائی ہی کرتی ہے، گانا سناتی ہے۔ اس کا خاص طبلہ نواز عبداللہ اسی کمرے کے پیچھے ایک کوٹھری میں رہتا ہے جہاں گلنار مجرا کرتی ہے۔ لوگوں کی نظر اگر پہنچتی ہے تو صرف اسی روشن، اُجلے اور سجے سجائے کمرے تک پہنچتی ہے جہاں رقاصہ بیٹھتی ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اس کمرے کے عقب میں کوئی تنگ و تاریک کوٹھری بھی ہوگی جہاں کسی یکتائے روزگار نے زندگی کے چالیس برس گزار دیے ہوں گے۔ میرے خیال میں شاہی بازار کی اس پیچیدہ سی گلی کی وہ حجرہ نما خفیہ کوٹھری تمھارے لیے مناسب ترین پناہ گاہ ہوگی۔ میرے کہنے پر عبداللہ تمھیں چند روز کے لیے ساتھ رکھ لے گا بشرطیکہ تم خود پر جبر کر کے وہاں رہ سکو۔"

"جان کے خوف سے تو آدمی غار میں بھی رہ لیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھارا مشورہ مناسب ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" غلام محمد بولا۔ "فی الحال میں چلتا ہوں۔ ٹھیک ایک بجے تم مجھے لوہاری گیٹ پر پھول والوں کی دکانوں کے سامنے مل جانا۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ ہم یہاں سے ایک ساتھ نہ نکلیں۔"

اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد میں نے سوٹ کیس اُٹھایا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس بار بھی میں نے حتی الامکان ہوشیاری سے جائزہ لینے کی کوشش کی، دو چار گلیوں میں بے مقصد چکر بھی لگائے بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا ہے تب میں رکشے میں بیٹھ کر مجو پہلوان کے اکھاڑے پر جا پہنچا۔ وہ وہیں اپنے ڈیرے پر موجود تھا۔

میری رام کہانی سن کر مجو پہلوان بولا۔ "رقم تو میں رکھ لیتا ہوں، تمھاری امانت میرے پاس محفوظ رہے گی لیکن میرا مشورہ ہے کہ تم بھی یہیں رہ جاؤ۔"

"میرا دل کہہ رہا ہے اُستاد کہ یہاں رہنا مناسب نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں ایک ایسے ٹھکانے پر جا رہا ہوں، جہاں کسی کو میری موجودگی کا شبہ نہیں ہو سکتا۔"

"چلو ٹھیک ہے جیسے تمھاری مرضی۔" اُستاد نے بادل ناخواستہ کہا۔ "بہرحال میرے دونوں ٹیلی فون نمبر تو تمھارے پاس ہیں جب بھی ضرورت پڑے اور حالات مہلت دیں تو فون گھما دینا۔ مجو پہلوان پانچ دس بندے لے کر چراغ الدین کے جن کی طرح تمھاری مدد کو پہنچ جائے گا۔"

مجو پہلوان کی رنگ محل والی دکان کے برابر کپڑے کی ایک دکان پر فون تھا۔ دوسرا فون یہاں اکھاڑے کے قریب ایک میڈیکل اسٹور پر تھا۔ ان دونوں نمبروں پر مجو پہلوان کو فون کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے ان دونوں علاقوں میں تو پہلوان کی بہت ہی زیادہ عزت تھی۔ لوگوں کی دلی خواہش ہوتی تھی کہ وہ کسی طرح مجو پہلوان کے کام آئیں۔

میں نے رقم ایک کپڑے میں لپیٹ کر اُستاد کے حوالے کی اور سوٹ کیس لے کر چل دیا جس میں میرے تین جوڑے کپڑے موجود تھے۔ میں پیدل لوہاری گیٹ پہنچا۔ ایک بج چکا تھا... غلام محمد حسب وعدہ مجھے پھول والی دکانوں کے قریب کھڑا مل گیا۔ وہ ایک موچی سے جوتے پالش کرانے کے بعد اُن کے فیتے باندھ رہا تھا۔ فیتے باندھ کر وہ ایک طرف چل پڑا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن اب بھی احتیاطاً اجنبی بنا ہوا تھا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

انارکلی والی سائڈ پر تانگے والے، لاری اڈے کی آوازیں لگا رہے تھے۔ غلام محمد ایک تانگے میں جا بیٹھا جس میں دو سواریاں پہلے ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چھ سواریاں پوری ہوئیں تو تانگہ چل پڑا۔

شاہی بازار پر تانگہ رُکوا کر غلام محمد اُترا تو میں بھی اُتر پڑا۔ اپنا اپنا کرایہ ادا کر کے ہم اجنبیوں کی طرح ہی آگے پیچھے شاہی بازار میں داخل ہوئے۔ ابھی چونکہ دن کا وقت تھا اس لیے شاہی بازار میں وہ رونق نہیں تھی جس کے میں نے افسانے سن رکھے تھے۔ اس وقت تو منظر ایسا ہی تھا جیسا عام گلی کوچوں کا

ہوتا ہے البتہ وہاں کے مکانوں پر دن کی روشنی میں ایک عجیب سی یاسیت چھائی ہوئی تھی۔

میں نے دو ایک فلموں میں بازارِ حسن کی جھلکیاں دیکھی تھیں اور یہاں آنے کا معمولی سا اشتیاق بھی تھا لیکن لاہور میں اتنا عرصہ رہنے کے دوران پہلے تو فکرِ معاش نے مہلت نہیں دی۔ بعد میں دو ایک مرتبہ خیال بھی آیا تو اکیلے یہاں آنے کی ہمت نہیں پڑی۔ بڑی ہیبت سی طاری تھی اس بازار کی۔ بارہا سرکلر روڈ پر اس کے سامنے سے گزرنے کا اتفاق ہوا مگر کبھی اندر جانے کا ارادہ نہیں کیا۔ آج یہاں آنا ہوا بھی تھا تو عجیب سے حالات میں...!

کچھ دور چلنے کے بعد غالباً غلام محمد کو اطمینان ہو گیا کہ کوئی ہماری نگرانی نہیں کر رہا تب وہ میرے شانہ بہ شانہ چلنے لگا۔ بالآخر ہم ایک گلی میں پہنچے جس میں زلفِ یار سے بھی زیادہ پیچ و خم تھے۔ اس گلی میں دن کو بھی بمشکل روشنی پہنچ رہی تھی۔ رات میں تو جانے کیا عالم ہوتا ہوگا۔ اس گلی میں بھی اگر تماش بین گلنار نامی اس مغنیہ اور رقاصہ کے کوٹھے تک پہنچ جاتے تھے تو پھر وہ واقعی اس کے قدردان تھے۔

بالآخر غلام محمد ایک کہنہ سال اور بے ڈھنگے سے دو منزلہ مکان کے سامنے رک گیا جس کے نیچے دودھ دہی اور پان سگریٹ کی دوکانیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی غالباً وہ کمرہ تھا جہاں گلنار نغمہ سرا ہوتی تھی۔ اس وقت اس کا بڑا سا دروازہ بند نظر آ رہا تھا۔

غلام محمد نے دو سیڑھیاں چڑھ کر اس چھوٹے سے دروازے پر دستک دی جو مکان میں داخل ہونے کا اصل راستہ تھا۔ خاصی بڑی عمر کے ایک منحنی سے آدمی نے دروازہ کھولا۔ اس کا اپنا رنگ تقریباً سیاہ ہی تھا اور اپنے سفید بالوں کو اس نے مہندی سے سُرخ کیا ہوا تھا۔ غلام محمد کو دیکھتے ہی وہ اس سے لپٹ پڑا۔ مجھ سے بھی وہ بے حد عاجزانہ طریقے سے ملا تاہم غلام محمد کے تو وہ قدموں میں بچھا جا رہا تھا جیسے وہ اس کے کسی بہت بڑے احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو۔

وہ ہمیں مکان کے اندر لے گیا۔ کنواں نما صحن میں اردگرد اور کمروں کے دروازے بھی نظر آ رہے تھے مگر ان پر اس وقت تالے لگے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں جس کمرے میں لے گیا اس کی چھت نیچی اور فرش اینٹوں کا تھا اگر وہاں بلب روشن نہ ہوتا تو دن میں بھی شاید ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ وہاں ایک چارپائی موجود تھی اور اس کے قریب ہی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک ٹرنک اور چند برتن رکھے ہوئے تھے۔ ضروریاتِ زندگی کی اور بھی دو چار چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔ ایک کونے میں پختہ چبوترا بنا ہوا تھا جس پر بالٹی اور لوٹا وغیرہ رکھا تھا۔ یہ غالباً اس کمرے کا باتھ روم تھا۔ یہ طبلہ نواز عبداللہ کی کُل کائنات تھی۔

"آج کیسے میرے نصیب جاگ اُٹھے؟ آج کیسے تم راستہ بھول پڑے؟" عبداللہ نے ہمیں چارپائی پر بٹھانے کے بعد خود چٹائی پر بیٹھتے ہوئے غلام محمد کو مخاطب کیا۔

"کام پڑ گیا ہے تم سے۔" غلام محمد دھیمے لہجے میں بولا۔

"میری اتنی حیثیت کب سے ہو گئی کہ تمھارے کسی کام آ سکوں؟" عبداللہ لجاجت سے بولا۔

"میرے اس دوست کو دو چار دن کے لیے یہاں پناہ چاہیے" غلام محمد نے میری طرف اشارہ کیا۔

"یہاں...؟" عبداللہ نے چاروں طرف ہاتھ گھمایا اور اپنی کم مائیگی پر گویا پانی پانی ہو گیا "یہاں رہ لیں گے یہ...؟"

"بُرے وقت میں تو یہ جگہ بھی کسی محل سے کم نہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے... اگر آپ رہ سکتے ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ غلام محمد کا حکم سر آنکھوں پر...!" عبداللہ مطمئن ہو گیا پھر سرسری سے لہجے میں بولا "کیا کوئی قتل وغیرہ ہو گیا ہے آپ کے ہاتھ سے...؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں" میرے بجائے غلام محمد نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد غلام محمد رخصت ہو گیا۔ عبداللہ اُسے دروازے تک چھوڑنے کا کہہ کر گیا لیکن خاصی دیر بعد واپس آیا۔ اس تاخیر کی وجہ فوراً ہی میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ ایک ہاتھ میں چائے کی کیتلی اور دوسرے میں بسکٹوں سے بھری ہوئی پلیٹ اُٹھائے ہوئے تھا۔ بصد اصرار اُس نے مجھے بسکٹ کھلائے اور چائے پلائی۔

"جتنے دن یہاں رہیں گے آپ چارپائی پر سوئیں گے اور میرا قیام چٹائی پر رہے گا" اس نے چارپائی کے نیچے سے ایک گدا نکال کر چٹائی پر بچھا لیا۔

میں نے بہت اصرار کیا کہ میں نیچے سو جاتا ہوں مگر اس نے میری ایک نہ چلنے دی۔ وہ بہت ہی مخلص آدمی معلوم ہوتا تھا شاید مفلس تھا اس لیے مخلص تھا... یا پھر یہ اس کے اور

غلام محمد کے مراسم کا کمال تھا۔

شام ہوئی تو اس کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے ہی احساس ہونے لگا کہ اب باہر کوچہ و بازار میں زندگی انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھی ہے۔ آوازوں سے چہل پہل کا اندازہ ہونے لگا تھا کبھی کبھار کہیں دُور سے گھنگروؤں کی جھنکار اور ہارمونیم کی آزمائشی سی دُھن دُھن بھی سُنائی دینے لگی تھی۔

عبداللہ نے دیوار پر لٹکے ہوئے ایک آئینے میں دیکھ کر اپنے مہندی زدہ بالوں میں کنگھی کی دوپلی ٹوپی بڑی احتیاط سے سر پر جمائی اور بولا "اب میں سامنے والے کمرے میں جا رہا ہوں۔ بی بی کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ دھندے کا وقت ختم ہوگا تو تم سے ملاقات ہوگی" پھر اسے جیسے کوئی خیال آ گیا "اکیلے پڑے پڑے تو تم بیزار ہو جاؤ گے" وہ بولا "یہ دیکھو تمھارے پائینتی کی طرف جو بند دروازہ نظر آ رہا ہے اس میں ایک روزن ہے۔ اس سے آنکھ لگا کر تم گلنار کے فن کا مظاہرہ دیکھ سکتے ہو۔ یہ اجازت میں کسی کسی خوش نصیب کو دیا کرتا ہوں۔ اس طرح تمھاری تنہائی کے طویل لمحے یوں بیت جائیں گے کہ تمھیں وقت کا احساس ہی نہیں ہو سکے گا اور جب گلنار خاموش ہوگی تو تمھیں یوں لگے گا جیسے کوئی حسین سپنا ٹوٹ گیا ہو" وہ مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں خاصی دیر تک کوٹھری میں ٹہلتا رہا حالانکہ وہاں ٹہلنے کی گنجائش بہت کم تھی۔ اس دوران میں درمیانی دروازے کے دوسری طرف سے ایسی آوازیں سنائی دیتی رہیں جیسے ساز ٹھیک کیے جا رہے ہوں پھر بہت سے لوگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں ایک نسوانی آواز بھی شامل تھی... پھر یک لخت سکوت چھا گیا۔ دھیرے دھیرے نہایت پُرسوز انداز میں سارنگی کی لے اُبھری پھر ہارمونیم نے ہمنوائی کی اور طبلے پر تھاپ پڑی، تب ایک آواز اُبھری اور میرے سینے سے جیسے کسی نے دل ہی کھینچ لیا۔

ہے یہ عالم تجھے بھلانے میں
اشک آئے ہیں مسکرانے میں

میں اپنی جگہ مبہوت ہو کر رہ گیا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس سیلن زدہ اور بے ہنگم سے مکان میں اتنی خوبصورت آواز بھی سُنائی دے سکتی ہے۔ مجھے سُر اور گائیکی کا کچھ زیادہ علم تو نہیں تھا مگر مجھے یہ ضرور معلوم تھا کہ سوز کسے کہتے ہیں اور جو آواز میں سن رہا تھا اس کے سوز نے میرے دل کو دو مرتبہ تڑپا دیا تھا۔ میں لپک کر اس دروازے پر پہنچا اور چارپائی کی پائینتی پر بیٹھ کر اس روزن سے آنکھ لگا دی جس کے بارے میں عبداللہ نے بتایا تھا۔

اس قتالہ کی آواز ہی نہیں، صورت بھی مبہوت کر دینے والی تھی۔ میں ترچھے رُخ سے اسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ دوزانو بیٹھی تھی۔ ایک ہاتھ ہوا میں بلند تھا اور سپید مرمریں اور مخروطی انگلیاں جیسے کسی اَن دیکھے ساز کے تاروں پر مچل رہی تھیں۔ وہ زرق برق لیکن قدیم مغلیہ طرز کے لباس میں تھی۔ قدیم ہی طرز کا زیور بھی پہنے ہوئے تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر کسی مغل شہزادی ہی کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ وہ اس بازار کی مخلوق نہیں لگتی تھی۔ اس کے سامنے چار پانچ آدمی بیٹھے تھے۔ وہ سب سلیقے ہوئے اور شائستہ معلوم ہوتے تھے۔

میں دم بخود بیٹھا اس روزن سے گلنار کو تکتا رہا۔ اس کی آواز کے سحر میں کھویا رہا۔ وہ پنکھڑی سے لب ہر جنبش کے ساتھ مجھے ایک نئی دُنیا میں لے جاتے تھے اور میں دفورِ شوق سے مدہوش سا ہو جاتا تھا۔

دفعتاً کوٹھری کی بتی بجھ گئی۔ اس سے پہلے کہ سرشاری کا طلسم ٹوٹتا... اور میں چونک کر حقائق کی دُنیا میں واپس آتا گھپ اندھیرے میں ٹھنڈی سی ایک ٹھوس چیز میری گُدی سے چپک گئی۔

"یہ پستول ہے" قریب ہی سے کوئی سانپ کی طرح پھنکارا۔ "ذرا سی بھی حرکت کی تو گردن میں روشن دان کھل جائے گا"

مجھے یُوں لگا جیسے کسی نے آسمان کی رفعتوں سے اچانک ہی مجھے زمین پر پھینک دیا ہو۔ میں کیف و نشاط کی نہ جانے کن بلندیوں پر پہنچا ہوا تھا کہ اس آواز نے یک لخت مجھے حقائق کی سنگلاخ دُنیا میں گھسیٹ لیا۔ دروازے کے دوسری طرف گلنار کی محفلِ طرب اسی طرح شباب پر تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ دروازے کے دوسری طرف ایک غریبِ شہر کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مسئلہ اگر ریوالور کا نہ ہوتا تو میں اس انداز میں بات کرنے والے کو بلا تامل اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کر دیتا۔ ہتھیار، بہرحال ہتھیار ہی ہوتا ہے۔ خصوصاً جب اُسے عقب سے گُدی پر ٹکا دیا گیا ہو تو مزید خطرناک ہو جاتا ہے۔

"کھڑے ہو جاؤ" عقب سے حکم دیا گیا۔

میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ریوالور میری گُدی سے ہٹ کر کمر سے آن لگا۔ ساتھ ہی حکم ملا "گھوم جاؤ اور سامنے والے کمرے میں چلو"

میں اس کے حکم کی تعمیل میں کوٹھری سے نکل کر صحن عبور کر کے سامنے والے کمرے میں پہنچا۔ یہ کمرہ بھی اس کوٹھری سے مختلف نہیں تھا۔ تاہم یہاں بلب زیادہ طاقت کا روشن تھا اور کمرہ خوب منور تھا۔ "سامنے دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ اور میری طرف منہ کر لو۔" نامعلوم شخص نے حکم دیا۔ میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی اور تجسس سے اس شخص کا جائزہ لیا۔ حسبِ توقع وہ میرے لیے اجنبی ہی تھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا اور جسیم ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط بھی نظر آ رہا تھا... ریوالور پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ خطرناک کھلونا اس کے لیے نیا نہیں ہے۔ وہ بھی میرا سراپا جائزہ لے رہا تھا۔

"بہت خوب... تو اس مرتبہ تمھیں بھیجا ہے، نواب خان نے... آدمی تو تم کافی خطرناک معلوم ہوتے ہو لیکن قسمت نے تمھارا ساتھ نہیں دیا۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"میں کسی نواب کو نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا۔

"بکواس مت کرو۔" وہ دہاڑا۔ اس کا انداز مجھے بہت ناگوار گزرا۔ وہ اُن لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جو حد سے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں، کسی دوسرے کی نہیں سنتے اور محض سطحی صورتِ حال کو دیکھ کر جو رائے قائم کر لیتے ہیں، سختی سے اُس پر اڑے رہتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ صرف طاقت کی زبان ہی سمجھتے ہیں۔

اندر چاندنی بچھی ہوئی تھی جس پر تین چار میلے کچیلے سے گاؤ تکیے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک تکیہ تو میرے پاؤں کے بالکل قریب پڑا تھا۔ میری ٹانگ مشینی انداز میں حرکت میں آئی اور تکیہ توپ کے گولے کی طرح اس شخص کے منہ پر جا کر لگا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ غیر ارادی طور پر اس سے ریوالور کا ٹریگر دب گیا لیکن گولی چھت کی طرف اڑ گئی۔ میرے لیے ایک لمحے کی یہ مہلت کافی تھی۔ میں عقاب کی مانند اُس پر جھپٹا۔ کھڑے ہاتھ کا ایک وار میں نے کراٹے کے انداز میں اس کی کلائی پر کیا تو ریوالور اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ میں نے اُسے دبوچا اور دوسرے ہی لمحے وہ اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اب میں اس کی کمر پر سوار تھا اور اس کے دونوں بازو اس طرح میری گرفت میں تھے کہ میں اُنھیں ایک خاص انداز میں ذرا سا جھٹکا دیتا تو کندھوں کے جوڑ کھسک جاتے۔ وہ طاقتور ضرور تھا مگر بے بس تھا۔ "کیوں تیس مار خان! آیا کچھ عقل شریف میں؟" میں نے اس کے بازوؤں پر خفیف سا دباؤ ڈالا تو وہ زخمی بیل کی طرح ڈکرانے لگا۔ "اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ کبھی کبھی دوسروں کی بات بھی توجہ اور ہمدردی سے سُن لینی چاہیے۔" وہ سر کو یوں جھٹکے دے رہا تھا جیسے اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہو۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں چاہوں تو اس وقت تمھارے کندھوں کے جوڑ الگ کر کے تمھیں مہینوں تڑپنے کے لیے چھوڑ سکتا ہوں اور چاہوں تو ریوالور اٹھا کر تمھاری کنپٹی میں سوراخ بھی کر سکتا ہوں... لیکن میں اِن دونوں میں سے ایک بھی کام نہیں کروں گا کیونکہ مجھے کسی نواب خان نے نہیں بھیجا۔" یہ کہہ کر میں نے اُسے چھوڑ دیا... اور ریوالور اٹھا کر اُسے زد میں لے لیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن اس کی خونخواری ہوا ہو چکی تھی۔

اچانک دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ باہر سے کئی مردوں اور عورتوں کی تشویش آمیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید اُن لوگوں نے گولی کا دھماکا سُن لیا تھا۔

"دروازہ کھولو۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کرتے ہوئے اُس شخص کو حکم دیا۔ اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی گرا دی۔ گلنار، اُس کے دو سازندے اور دو لڑکیاں دروازے پر کھڑی تھیں لیکن اندر آتے ہوئے سب ہچکچا رہے تھے۔ بالآخر گلنار نے اندر قدم رکھا تو اس کے کرتے ہی گویا سب میں جرأت آ گئی اور وہ بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح اندر گھس آئے۔ عبداللہ بھی ان میں شامل تھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" گلنار نے بے خوفی سے مجھے گھورا۔

میں نے مسکراتے ہوئے، ریوالور کی مدد سے اس شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "اسی سے پوچھ لو۔"

"کیا قصہ ہے، فخرو؟" گلنار نے کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ جی... یہ شخص عبداللہ کے کمرے میں، درمیانی دیوار پر، بالاخانے کی طرف گھات لگائے بیٹھا تھا..." فخرو نے کھسیاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ تو میرا مہمان ہے... میں نے ہی اسے وہاں بٹھایا تھا۔" عبداللہ بول اٹھا۔

"بہرحال، مجھے غلط فہمی ہوئی اور میں ریوالور اس کی گردن پر رکھ کر اسے یہاں لے آیا۔" فخرو کے لہجے میں کھسیاہٹ بڑھ گئی۔

"اور یہاں آتے ہی اس نے تم سے ریوالور چھین کر اُلٹا تمھیں ہی نشانے پر لے لیا۔" گلنار طنزیہ لہجے میں بولی۔

فخرو نے سر جھکا لیا تو گلنار میری طرف متوجہ ہو گئی۔

"ہوں، بہت ہنرمند لگتے ہو، ورنہ فخرو کو قابو میں کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔" وہ میرا سراپا جائزہ لیتی ہوئی بولی۔

"میرے خیال میں زیادہ مشکل بھی نہیں۔"... میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر فخرو کا ریوالور اُس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ "لو سنبھالو، اپنا یہ کھلونا۔"

"تم ہو کون؟" گلنار نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"عبداللہ نے بتا تو دیا ہے۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "میں اس کا مہمان ہوں۔"

"شاید تم سب کے سامنے بات کرنا نہیں چاہتے۔" وہ نہایت دلکش انداز میں مسکرائی۔ اس کی گہری گہری آنکھوں میں بلا کا سکون تھا۔ وہ نہایت پُرتمکنت انداز میں مڑی اور بولی۔ "تم لوگ جاؤ۔ اپنا اپنا کام کرو۔" اُس کے لہجے میں شہزادیوں کا سا وقار تھا۔ وہ کسی بھی اعتبار سے مغنیہ، رقاصہ یا اُس بازار کی عورت نہیں لگتی تھی۔

فخرو سمیت سب لوگ کمرے سے رخصت ہو گئے۔ انداز ایسا ہی تھا، جیسے کسی ملکہ کے ہاتھ ہلانے پر غلاموں کا ہجوم منتشر ہو گیا ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ اس لڑکی کی صرف شخصیت ہی میں شاہانہ وقار نہیں بلکہ وہ عملاً بھی اپنے لوگوں پر کسی ملکہ ہی کی طرح حکومت کرتی ہے۔ سب جا چکے تو وہ دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

اس نے مُڑ کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ میں اس کے پیچھے آ رہا ہوں یا نہیں؟ اُسے گویا پورا یقین تھا کہ میں اس کی ہدایت پر عمل کیے بغیر نہیں رہ سکتا... اور حقیقت بھی یہی تھی۔ وہ گویا نسیمِ سحری کا ایک جھونکا تھا جو مجھے ایک ننھے سے پتے کی طرح اُڑائے لیے جا رہا تھا۔ اس کی راہنمائی میں چلتا ہوا میں صحن عبور کر کے اس کونے تک پہنچا جہاں سے سیڑھیاں اُوپر جا رہی تھیں۔ تنگ سی یہ سیڑھیاں چڑھ کر ہم پہلی منزل پر پہنچے اور گیلری نما ایک حصے میں چند قدم چل کر ایک کمرے میں داخل ہوئے جو بیک وقت خواب گاہ بھی معلوم ہوتا تھا، کمرۂ نشست بھی اور مطالعے کا کمرہ بھی... اس کمرے میں ایک طرف دیوار کے ساتھ شیشے کے دروازے والی ایک الماری کھڑی تھی جس میں کتابیں ہی کتابیں نظر آ رہی تھیں۔ الماری کے قریب ہی ایک چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل اور کرسی لگی ہوئی تھی۔ میز پر خوبصورت سا ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا، چند کتابیں اور لکھنے کا سامان بھی موجود تھا۔ اس بازار میں... ایک بالاخانے پر... ایک مغنیہ کے کمرے میں اتنی کتابیں... لکھنے پڑھنے کا سامان...؟ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ "یہ تمھارا کمرہ ہے؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیوں؟ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" اس نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کافی پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہو۔" میں نے آنکھیں سکیڑ کر کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہر طوائف تھوڑی بہت پڑھی لکھی ضرور ہوتی ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں نے اس شوق کو ذرا سا پروان چڑھا لیا ہے۔ میں قدرے باذوق قسم کی طوائف ہوں۔" وہ خود استہزائیہ سے انداز میں مسکرائی۔ میرے دل کو حقیقتاً دھچکا سا لگا۔

"اپنے آپ کو طوائف مت کہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں؟ اس میں کیا حرج ہے؟" وہ مسکرائی۔ "شرفا اس بازار میں بیٹھنے والی ہر عورت کو طوائف ہی کہنا پسند کرتے ہیں۔"

"میں اوروں کی بات نہیں کرتا اور نہ ہی میں کسی طوائف کو جانتا ہوں... لیکن تم پر یہ لفظ بہرحال بہت گھٹیا لگتا ہے۔ میری نظر میں تم بے حد نفیس اور اچھی لڑکی ہو۔" میں نے صدقِ دل سے کہا۔

"اتنی جلدی اتنی گہری رائے بھی قائم کر لی تم نے۔" اس نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی شربتی آنکھیں کچھ پھیل سی گئی تھیں۔

"میں رائے قائم کرنے میں دیر نہیں لگاتا اور عام طور پر اس پر قائم بھی رہتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تمھاری باتیں بڑی خوبصورت ہیں لیکن میں تعریف سے پگھلنے والی نہیں ہوں۔ اس بازار میں تعریفیں ہم پر یُوں برستی ہیں جیسے ساون میں گھر سے نکلنے والے بچوں پر بارش... میرے قبیل کی لڑکیاں بہت کم عمری میں ہی 'تعریف پروف' ہو جاتی ہیں لیکن ظاہر وہ یہی کرتی ہیں جیسے تعریف سُن کر پھولی نہ سما رہی ہوں... بہرحال، یہ بتاؤ کہ... عبداللہ سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

"عبداللہ سے تو میرا کوئی تعلق نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اپنا تعلق تو آج کل صرف بدقسمتی سے استوار ہے۔ بدنصیبی ہماری ہم سفر ہے۔"

"فلمی انداز میں مکالمے بولنے کی بجائے سیدھے سادے

اورصاف انداز میں بات کرو۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی ... "میں الجھے وار گفتگو پسند نہیں کرتی۔ میری اُلجھن صرف یہ ہے کہ تم پڑھے لکھے بھی معلوم ہوتے ہو اور بدمعاشوں سے نمٹنے کے فن میں بھی طاق ہو۔ تم جیسے یکتائے روزگار نوجوان اگر عبداللہ جیسے آدمی کے مہمان بن کر آنے لگیں تو اس کے پیچھے ضرور کوئی کہانی ہوتی ہے۔ کسی بہت بڑی مجبوری کی کہانی۔"

"تم بہت ذہین لڑکی ہو۔" میں ایک بار پھر اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں نے کہا نا کہ مجھے تعریف نہیں بلکہ اپنے سوالوں کے جواب چاہئیں۔" وہ ٹس سے مس ہوئے بغیر بولی۔ "یہ مت بھولنا کہ میری اجازت کے بغیر تم یہاں نہیں رہ سکو گے۔ اگر میں تمھاری طرف سے مطمئن نہ ہوئی تو تمھیں کوئی دوسرا ٹھکانہ تلاش کرنا پڑے گا۔"

میں نے چند لمحے سوچا، ہر پہلو پر غور کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے سب کچھ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ میں نے دھیرے دھیرے اُسے اپنی ساری رام کہانی سُنا دی۔ وہ انہماک سے سُنتی رہی لیکن اُس کا حسین چہرہ ہر تا ثر سے بے نیاز رہا۔

میں خاموش ہُوا تو وہ بولی: "عجیب کہانی ہے تمھاری بھی!"

"شاید تمھیں اس پر یقین نہیں آیا۔" میں نے غیر ارادی طور پر قدرے تلخی سے کہا۔ "میں حالات کے دھارے پر بہتا یہاں تک آ نکلا ہُوں۔ اگر تم کوئی خطرہ محسوس کرتی ہو اور تمھارے خیال میں، میں تمھارے لیے کسی مصیبت کا باعث بن سکتا ہُوں تو میں ابھی چلا جاتا ہُوں۔"

"میں نے تم سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔" وہ مسکراتے ہوئے پُرسکون لہجے میں بولی۔ "تم خود خطرات میں گھرے ہوئے ہو۔ بھلا کسی کے لیے کیا خطرہ بنو گے۔ میں تمھیں یہاں رہنے سے منع نہیں کر رہی بلکہ تمھارے قیام کے لیے اس سے بھی بہتر جگہ فراہم کر سکتی ہُوں لیکن میں سمجھتی ہُوں کہ چند دن رُوپوش رہنے سے سنگین خطرات ٹل نہیں جاتے۔ میرے خیال میں تو یہ شتر مُرغ کی طرح ریت میں مُنہ چھپا لینے کے مترادف ہے۔ بعض اوقات تو اس طرح خطرات سنگین تر بھی ہو جاتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اس کے الفاظ گویا میرے ذہن پر نقش ہوتے جا رہے تھے۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی: "درحقیقت تم نے خود ہی اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا ہے۔ بعض معاملات کی تکمیل دوسروں کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ خود تم بر تقدیر ہو کر آرام سے بیٹھ گئے ہو۔ بلکہ یُوں کہو کہ لیٹ گئے ہو۔" وہ مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

اس کی باتوں نے مجھے خود اپنی ہی نظر میں نیچا کر دیا۔ مجھے اپنا اب تک کا طرزِ عمل احمقانہ سا نظر آنے لگا۔ وہ عمر ہو کر شاید مجھ سے زیادہ ذہین اور جرأت مند تھی۔ یا شاید زندگی کے بارے میں اس کا مشاہدہ کافی گہرا تھا۔ میں ایک سیدھا دیہاتی تھا۔ مجھے اس سے رہنمائی طلب کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہُوئی۔

"تم ہی مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟" میں نے پوچھا۔

"تم مجھے بھلے آدمی لگتے ہو۔ دل چاہ رہا ہے کہ تمھاری جو بھی مدد کی جا سکتی ہے وہ ضرور کروں۔" وہ پہلو بدل کر بولی۔ "ویسے بھی اُلجھی ہُوئی کہانیوں کو سُلجھانا میری زندگی کا مشغلہ ہے۔ تم ایک گورکھ دھندے میں پھنس گئے ہو۔ بھول بھلیوں میں پھنس گئے اور تمھیں باہر جانے کا راستہ تلاش کرنا ہے۔ میرا خیال ہے تمھیں اس کام کی ابتدا نازد کے سے کرنی چاہیے۔ تمھارے مسائل کی جڑ نازد ہے۔ اگر وہ جاتی ہے ... تو سارے معمے حل ہو جائیں گے۔"

"میں نے بتایا نا کہ میں وہاں گیا تھا۔ اس کے چچا جنھوں نے اُسے پالا ہے، وہ خود پریشان بیٹھے تھے۔" میں نے کہا۔ "وہاں سے کیا سُراغ ملے گا؟"

"ممکن ہے اُنھوں نے تم سے کچھ چھپایا ہو اور یہ ممکن ہے کہ تم کچھ پوچھنا بھول گئے ہو۔ شاید دوبارہ وہاں جانے سے کوئی ایسا نکتہ سامنے آ جائے جس کے سہارے ہم آگے بڑھ سکیں۔" اس کے لہجے میں اعتماد تھا، اُمید تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی مجھ میں ایک نئی رُوح پھونک رہی ہے۔

"مسئلہ یہ ہے کہ میں یہاں سے نکلوں کیسے؟" میں نے کہا۔ "میں نکلنے سے اس لیے نہیں کترا رہا کہ خوفزدہ ہُوں لیکن میں بے مقصد طور پر سرِراہ مرنا نہیں چاہتا۔ میری نظر میں یہ بڑی قابلِ رحم موت ہے کہ اندھیرے سے گولی آئے، آپ سڑک پر پٹ سے گریں اور مر گئے اور اس کے بعد لاش اسپتال کے مردہ خانے میں پہنچ گئی۔ نہ آپ نے دُشمن کی صورت دیکھی اور نہ ہی کوئی مقابلہ ہُوا، حتیٰ کہ آپ کو اپنی موت کا سبب بھی معلوم نہ ہُوا۔ بس آپ کسی حقیر سے کیڑے مکوڑے کی طرح مر گئے۔ اس قسم کی موت سے مجھے بے حد خوف آتا ہے۔"

"اچھا... تو تم بڑے دھوم دھڑکے سے مرنا چاہتے ہو۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"دھوم دھڑکے سے نہ سہی لیکن ذرا وقار سے مرنا چاہتا ہُوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور میرے پیچھے جو لوگ لگے ہوئے ہیں، وہ شاید مجھے کتّے کی موت مارنا چاہتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ میرے سامنے ان کا معمولی سا بھی سُراغ موجود نہیں ہے اور وہ بہت ہی منظم اور بے پناہ وسائل کے مالک معلوم ہوتے ہیں۔ وہ مجھے گویا محض ایک کھلونا سمجھ رہے ہیں۔"

"پھر تو خواہ تم کہیں بھی رہو خطرے میں رہو گے۔" وہ گنگنا کر بولی۔ پھر جیسے اُسے کچھ یاد آیا۔ "تم اس فلمی فائنانسر غلام احمد یا عبداللہ پر کس حد تک اعتماد کر سکتے ہو؟"

"عبداللہ کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس سے آج ہی مُلاقات ہُوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی اس کے متعلق تمھیں بہتر طور پر معلوم ہونا چاہیے۔ وہ تمھارا سا ازدہ ہے۔"

"میں بھی اُسے زیادہ اچھی طرح نہیں جانتی۔ میں نے اُسے کسی کی سفارش پر رکھا تھا... بہرحال... آدمی بے ضرر ہی معلوم ہوتا ہے۔" اس نے خود ہی عبداللہ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

"غلام احمد بھی مخلص معلوم ہوتا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس پر اس لیے بھروسا کیا ہے کہ اُس نے اُس وقت بھی میرے بارے میں پولیس کو کچھ نہیں بتایا جب وہ بُری طرح میری گردن پھنسوا سکتا تھا۔"

"ہو سکتا ہے پولیس کے سامنے اُس نے تمھارے بارے میں اس لیے زبان نہ کھولی ہو کہ پولیس نے اس پر سختی یا تشدد نہ کیا ہو۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

عمر کے لحاظ سے وہ جوان بلکہ نوجوان تھی لیکن اس کی باتوں میں نہ جانے کتنے زمانوں کا تجربہ سمٹا ہُوا تھا۔ معلوم نہیں کہاں سے اور کیونکر سیکھا تھا اُس نے یہ سب کچھ؟ اس کا تجربہ اگر لفظوں تک ہی محدود تھا تب بھی میرے لیے قیمتی تھا۔ میں اس سے راہنمائی حاصل کر سکتا تھا۔ ورنہ میرے اپنے حواس تو کچھ ایسے مختل تھے کہ کوئی ڈھنگ کی بات بھی نہیں سُوجھ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے تم اس عمارت سے بھی نکل چلو۔" بالآخر اُس نے گویا فیصلہ دے دیا۔ "یہاں تمھاری موجودگی نہ صرف غلام احمد اور عبداللہ کے علم میں ہے بلکہ ایک تیسرے آدمی یعنی میرے باڈی گارڈ فرزند نے بھی تمھیں دیکھ لیا ہے۔"

"لیکن میں جاؤں کہاں؟ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا تبھی تو یہاں آ کر پناہ لی تھی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور حتی الامکان کوشش کی کہ میرے لہجے سے بے چارگی نہ جھلکنے پائے۔

"اتنا تو مجھے بھی معلوم ہو چکا ہے تمھاری رام کہانی سُن کر۔" وہ ایک بار پھر دلکش انداز میں مسکرائی۔ "میں تمھیں یہاں سے دھکا تو نہیں دے رہی ہُوں اور نہ ہی میرا تعاون اب محض لفظی مشوروں تک محدود رہے گا۔ میں تمھارا ساتھ دینے کا فیصلہ کر چکی ہُوں۔ ساتھ کا مطلب سمجھتے ہو نا؟"

"بہت اچھی طرح۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم بھی مجھے اپنے ساتھ ہی پاؤ گی۔ اگر تم میری خاطر اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہی ہو تو اپنی ہر اُلجھن میں مجھے بھی اپنے ساتھ پاؤ گی۔"

وہ ایک لمحے گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کا ذہن جیسے کہیں دُور پہنچا ہُوا تھا۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آنے لگی تھی۔ اس کے باطن میں شاید تلاطم برپا تھا مگر بظاہر وہ پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ مجھے یُوں لگا جیسے اُس کی رُوح مدّت سے ان لفظوں کی پیاسی تھی جو میں نے نہایت سادگی سے کہہ دیے تھے۔ یا پھر شاید وہ اس خلوص کی پیاسی تھی جو میرے ان سادہ سے لفظوں کی تہ میں چھپا ہُوا تھا۔ پھر وہ چونک کر گویا حقائق کی دُنیا میں واپس آئی اور گہری سانس لے کر اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ میرے سامنے سے گزر کر وہ کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھی اور مجھ پر گویا اپنے وجود کی انوکھی خوشبو کا ایک جھونکا پھینک کر گئی۔ الماری کھول کر کچھ دیر تک وہ اس کے اندر نہ جانے کیا اُلٹ پلٹ کرتی رہی۔ بالآخر وہ مُڑی تو میں نے دیکھا، اس کے ہاتھوں میں ایک شال اور ایک گرم ٹوپی تھی، جیسی عموماً پٹھان لوگ پہنتے ہیں۔ دونوں چیزیں اس نے میری طرف بڑھا دیں: "ٹوپی سر پر پہن لو اور چادر اس طرح لپیٹ لو کہ ٹھوڑی اور ہونٹ چھپ جائیں۔" اس نے دھیمے لہجے میں ہدایت کی۔

میں اس کی ہدایت پر عمل کر چکا... تو کپڑوں کی الماری کے قدِ آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ محض ان دو چیزوں کی مدد سے میری ہیئت بدل گئی تھی۔ میری اصل شخصیت چھپ کر رہ گئی تھی۔

"ہمارا ایک ساتھ جانا مناسب نہیں۔ میں تمھیں پچھلے دروازے سے باہر بھیجوں گی۔ تم اس گلی سے نکل کر مین روڈ پر پہنچ کر بائیں طرف چلنا شروع کر دینا۔ پندرہ بیس قدم چل کر تمھیں 'دلدار سویٹ ہاؤس' کے نام سے مٹھائی کی ایک دُکان نظر آئے گی۔ اس کے آس پاس ہی کہیں کھڑے ہو جانا۔ میں تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔ تم مجھ سے بات کیے بغیر کچھ فاصلہ چھوڑ کر میرے پیچھے چل دینا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ بالکونی میں چلتے ہوئے ہم کئی کمروں کے سامنے سے گزرے جن کے دروازے بند تھے۔ کمروں کے گرد گھوم کر ہم پچھلی طرف آ گئے۔ اُدھر سے بھی ایک تنگ سا زینہ نیچے جا رہا تھا۔ گلنار نے مجھے نیچے جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں کھڑی رہی۔ میں اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نیچے آ گیا۔ بازار میں پہنچ کر میں بائیں طرف چل دیا۔ اس بازار میں چونکہ راتیں جاگتی تھیں اور دن سوتے تھے، اس لیے رات کے اس پہر عید کا سا سماں تھا۔ بڑی چہل پہل تھی۔ لوگوں کی ٹولیاں اِدھر سے اُدھر رواں تھیں۔ بالاخانوں کی طرف بے قرار نگاہوں کی پرواز جاری تھی۔ دُکانوں کے آگے گاہکوں کی بھیڑ لگی تھی۔ اُن دُکانوں کے سامنے بھی جن پر اشیائے خورد و نوش بکتی تھیں اور ان دُکانوں کے سامنے بھی جہاں اَدائیں بکتی تھیں، آواز کا مدوجزر بکتا تھا، گھنگروؤں کی جھنکار بکتی تھی۔ مجھ جیسے حلیے کے بھی بہت سے آدمی اِدھر اُدھر گھومتے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ دلدار سویٹ شاپ مجھے دُور ہی سے نظر آ گئی کیونکہ اس دُکان کے ماتھے پر بڑا سا نیون سائن نصب تھا۔ دُکان پر خوب رونق تھی۔ مٹھائیاں تو یونہی شوکیسوں میں سجی اپنے گاہکوں کی منتظر تھیں۔ البتہ دُودھ ہی خوب بِک رہا تھا۔

میں ایک طرف ایک بند دُکان کے تھڑے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے وہاں کھڑے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ عقب سے دو آدمی میرے دائیں بائیں آن کھڑے ہوئے۔ ایک نے میرے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور دوسرے نے بائیں کندھے پر۔۔۔ ان میں سے ایک کے بازو کا وزن کسی شہتیر سے کم نہیں تھا اور وہ تھا بھی پورا دیوزاد۔۔۔ دوسرا بھی کچھ کم نہیں تھا۔ "ہماری رقم کوئی اتنی آسانی سے ہضم نہیں کر سکتا پیارے!" دیوزاد سرگوشی کے سے انداز میں غرّایا۔

میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا۔ کم بختوں نے کہاں آ کر پکڑا تھا۔ چند منٹ اور نہ آتے تو میں رُوپوش ہو چکا ہوتا، کسی محفوظ جگہ پر پہنچ چکا ہوتا۔ میرے ساتھ وہی 'دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا' والا معاملہ ہوا تھا۔ میں اُن سے خوفزدہ نہیں تھا۔ مانا کہ اُن میں سے ایک دیوزاد تھا، دوسرا بھی خاصا لحیم شحیم تھا اور وہ دونوں ہی شکل سے بدمعاش نظر آ رہے تھے مگر میں انھیں تھوڑا بہت نقصان پہنچا کر یا 'چَرکا' دے کر بھاگنا چاہتا تو یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں وہاں سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔ گلنار وہاں پہنچ کر اور مجھے نہ پا کر نہ جانے کتنی پریشان ہوتی۔ میں ان لوگوں سے باقاعدہ جھگڑا بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔

میں نے وہ ہاتھ شائستگی آمیز انداز میں کندھوں سے ہٹا دیے اور حتی الامکان پُرسکون لہجے میں کہا۔ "کون سی رقم پیارے بھائیو؟ جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے آج سے پہلے آپ لوگوں کے یہ حسین مکھڑے کبھی نہیں دیکھے۔"

"واہ بے۔۔۔" دیوزاد کے لہجے میں حقیقی حیرت کی جھلک تھی۔ "چادر کندھے پر ڈال کر گھومنے پھرنے والے کب سے اس لہجے میں بات کرنے لگے ہیں؟" یہ کہہ کر اس نے مجھے تھپڑ رسید کرنے کے لیے ہاتھ بلند کیا لیکن میں نے اُس کی کلائی پکڑ لی اور اُس کا بازو ہوا ہی میں اُٹھا رہ گیا۔ اُس نے بازو چھڑانے کے لیے خاصی طاقت صرف کی لیکن اسے یہ جان کر غالباً خاصی حیرت ہوئی کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ جن لوگوں کو اپنی طاقت کا حد سے زیادہ زعم ہوتا ہے، اُن کے لیے اس قسم کا دھچکا زیادہ ہی شدید ہوتا ہے۔ وہ یہ دیکھ کر دم بخود ہو جاتے ہیں کہ کوئی اُن کا بھی اُٹھا ہوا ہاتھ روک سکتا ہے، اُن کا وار سہہ سکتا ہے یا اُن کے حملے کا جواب دے سکتا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ کتنی رقم تھی جو تمھارے خیال میں میں ہضم کر گیا ہوں اور وہ کب اور کس سلسلے میں تم نے مجھے دی تھی؟" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اس کے بعد ہاتھ پاؤں ہلانے کی زحمت کرنا۔"

"دو ہزار روپے۔" وہ گویا بادلِ نخواستہ بولا۔ "جو تم نے ایڈوانس لی تھی، رضیہ بائی کے سلسلے میں۔"

میں نے قدرے سکون کی سانس لی۔ اگر معاملہ صرف دو ہزار کا تھا تو وہ یقیناً کسی اور کے دھوکے میں مجھ سے آن اُلجھے تھے۔ میں تو کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ مجھے وضاحت اور صفائی پیش کرنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئی کیونکہ میری چادر جس نے میرے چہرے کے نچلے حصے کو چھپا رکھا تھا، کچھ نیچے کو کھسک گئی اور وہ دونوں ہی چونک کر میری طرف دیکھنے لگے، پھر اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ اُن کے تاثرات بدل چکے تھے۔ میں نے دیوزاد کی کلائی چھوڑ دی۔ "معاف کرنا یار۔۔۔" دیوزاد شرمندگی سے بولا۔ "ہم کسی اور کے دھوکے میں تم سے اُلجھنے لگے تھے۔"

"شکر ہے کہ جلدی سُلجھ گئے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ وہ قدرے خجالت کے عالم میں، مزید کچھ کہے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ میری دھڑکنیں قدرے تیز ہو چکی تھیں۔ چند گہری سانسوں کے بعد دھڑکنیں اعتدال پر آ گئیں اور میں ایک بار پھر چادر سے تقریباً آدھا چہرہ چھپا کر تھڑے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

چند منٹ بعد گلنار آتی دکھائی دی۔ اُس کے ہاتھ میں میرا چھوٹا سفری سوٹ کیس بھی تھا جس میں میرا کُل سامان تھا۔ گلنار نے میری طرف نہیں دیکھا اور سیدھی نکلتی چلی گئی۔

میں بھی چل دیا۔ جلد ہی وہ ایک بغلی گلی میں مُڑ گئی۔ آگے ایسی ہی ٹیڑھی میڑھی گلیوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ ان گلیوں کا ماحول عجیب آسیب زدہ سا تھا۔ سیلن اور نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور یہاں بلا کی خاموشی اور بے رونقی تھی۔ کہیں کہیں اِکا دُکا انسان حرکت کرتا نظر بھی آ جاتا تھا تو محض ہیولے کی طرح خاموشی سے۔۔۔ ان گلیوں میں گلنار کی رفتار سُست ہو گئی۔ بالآخر وہ خود ہی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ ایک کہنہ سال مکان کے سامنے وہ رُک گئی جس کا نیچے والا دروازہ بند تھا اور اُس پر بڑا سا تالا جھول رہا تھا لیکن اس دروازے کے قریب سے ہی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں سے ہم اوپر پہنچے تو اس مکان کی ساخت بھی مجھے کچھ اُسی قسم کی نظر آئی جیسے مکان سے ہم آئے تھے۔ اسی طرح ایک لمبی سی بالکونی تھی اور اس میں کمروں کی قطار۔۔۔ اُس نے ایک کمرے کا تالا کھول کر بتی جلائی۔ یہ ایک صاف سُتھرا کمرہ تھا۔ یہاں فرنیچر تو زیادہ نہیں تھا لیکن ضرورت کی بُنیادی چیزیں موجود تھیں۔ یہ کسی ہوسٹل کا کمرہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ یہاں بھی اِدھر اُدھر بہت سی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

"یہ کس کا کمرہ ہے؟" میں نے یونہی ازراہِ تجسّس پوچھا۔

"یہ بھی میرا ہی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے حالات میں بھی اکثر و بیشتر تغیر آتا رہتا ہے۔ میرے کئی ٹھکانے ہیں۔ جیسے حالات ہوں، اُسی مناسبت سے مجھے موزوں ٹھکانے کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ تمھیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔۔۔ اور کوئی تم سے آ کر نہیں پوچھے گا کہ تم کون ہو اور یہاں کیوں نظر آ رہے ہو۔ تم بھی آس پاس کے کسی کمرے میں جھانکنے یا وہاں کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش نہ کرنا خواہ وہاں کچھ بھی ہوتا رہے۔"

پھر وہ مزید کچھ کہے سُنے بغیر مُڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

چند لمحے بعد میں نے سیڑھیوں پر اس کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ سُنی جو جلد ہی معدوم ہو گئی۔ میں بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ میں نے اُسے سیڑھیوں سے نکل کر گلی میں چلتے دیکھا۔ وہ اپنے مخصوص شاہانہ انداز میں سر اُٹھائے نپے تُلے قدم اُٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ گلی میں روشنی بہت کم تھی، اس لیے جلد ہی وہ محض ایک ہیولا نظر آنے لگی۔ گلی کے موڑ سے دو قدم پہلے اچانک ہی ایک مکان کی آڑ سے دو ہیولے نمودار ہوئے اور گلنار پر جھپٹ پڑے۔ میں نے گلنار کی گھٹی گھٹی ادھوری سی چیخ سُنی، دوسرے ہی لمحے غالباً اُس کے مُنہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا گیا۔ ایک ہیولا اُسے اُٹھا کر کندھے پر لادنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، اُچھل رہی تھی۔ میں نے چلنے یا دوڑنے کی بجائے کسی زخمی درندے کی طرح تڑپ کر زقند لگائی اور یوں نیچے پہنچا جیسے سیڑھیوں پر میرا قدم ہی نہ پڑا ہو اور کسی نے براہِ راست ہی مجھے نیچے پھینک دیا ہو۔ میں نے یہ پروا بھی نہیں کی تھی کہ ان اجنبی اور بے ڈھنگی سیڑھیوں پر غلط قدم پڑنے سے یا پاؤں پھسلنے سے میں لڑھک بھی سکتا ہوں، مجھے کوئی خطرناک چوٹ بھی آ سکتی ہے۔ اس وقت مجھے گلنار کے سوا کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ آندھی اور طوفان کی طرح میں گلی کے موڑ تک پہنچا۔ اس وقت تک وہ ہیولا گلنار کو کندھے پر ڈالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ دونوں ہیولے عفاریت کی طرح زقندیں بھرتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ غنیمت یہ تھا۔۔۔ کہ اُنھیں دوسری گلی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا اور میں کسی غلط سمت میں نہیں مُڑا تھا۔ گلنار کی چیخیں میری راہنمائی تو کر رہی تھیں لیکن اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

گلنار چیخ رہی تھی۔۔۔ اور جنونی انداز میں ہاتھ پاؤں بھی مار رہی تھی مگر اسے اُٹھانے والا شخص خاصا مضبوط اور اس قسم کے کاموں میں بہت ماہر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گلنار کو قابو میں کر رکھا تھا۔ گلی میں کئی دریچے کھلے، کئی دَر وا ہوئے لیکن

باہر کوئی بھی نہ آیا۔ شاید لوگ محض خوفزدہ انداز میں باہر جھانک کر رہ گئے تھے۔ حتیٰ کہ گلی میں جو اکا دُکا آدمی چلتے نظر آ رہے تھے، وہ بھی دیواروں سے چپک کر تاریکی کی آغوش میں پناہ لے کر کھڑے ہو گئے تھے۔

میں ان دونوں بدمعاشوں کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ جو پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا، اس کے ہاتھ میں چاقو تھا جس کا پھل کم روشنی میں بھی جھلملا رہا تھا اور وہ آدمی چاقو کو لہرا رہا تھا۔ یہ غالباً ایک طرح کی دھمکی تھی کہ کوئی اُن کے قریب آنے یا اُن کا تعاقب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ دونوں بھاری بھرکم تھے اور روایتی قسم کے بدمعاش نظر آتے تھے۔ یہ علم ہونے کے بعد کہ کوئی ان کے تعاقب میں آ رہا ہے... وہ رُک گئے اور چاقو والے نے چاقو لہرانے کا عمل تیز کر دیا... یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی میری تکا بوٹی کرنی شروع کر دی ہو۔ دوسرا بدمعاش جس نے گلنار کو اُٹھا رکھا تھا، اُس کی صورت نہایت کریہہ تھی۔ مجھے دیکھنے کے بعد اُس نے گلنار کو نہیں چھوڑا۔ بدستور اُسے قابو میں کیے کھڑا رہا جب کہ چاقو والے نے چاقو سیدھا کر کے پوزیشن لے لی۔ میں نے یہی ظاہر کیا جیسے میں اس قسم کے معاملات میں بالکل اناڑی ہوں اور سیدھا اس پر جھپٹنے والا ہوں اور وہ چاہے تو بڑے اطمینان سے میری آنتیں نکال سکتا ہے۔

اُس کی یہ اُمید دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ میرے انداز سے دھوکا کھا گیا۔ اُس نے اندھا دُھند چاقو چلایا لیکن میں جھکائی دے کر ایک طرف ہو گیا اور پھر میں نے اُس کے چاقو والے ہاتھ پر بُوٹ کی نوک سے ایسی ٹھوکر رسید کی کہ چاقو کا کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کہاں گیا۔ وہ بلبلا کر رہ گیا۔ اس نے مجھے دبوچنے کی کوشش کی لیکن میں نے جھکائی دے کر اچانک ہی اسے کسی بوری کی طرح اُٹھایا اور زمین پر پٹخ مارا۔ گلی کا فرش اینٹوں کا تھا اور گلی کے بیچوں بیچ نالی بہہ رہی تھی۔ جس انداز سے میں نے اُسے پٹخا تھا، اُسے یقیناً اپنی نانی یاد آ گئی ہو گی۔ وہ باقاعدہ آہ و بکا کرنے لگا، پھر کسی زخمی بھینسے کی طرح ڈکرانے لگا۔ ایک ہی جھٹکے میں اس کے بدمعاشی کے غبارے سے ہوا نکل گئی تھی۔

اس وقت تک دوسرے بدمعاش نے گلنار کو کندھے سے اُتار دیا تھا۔ اُس نے کوئی ہتھیار نہیں نکالا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُسے اپنی طاقت پر، اپنے ساتھی سے بھی زیادہ زعم ہے۔ اُس نے مجھے یوں دبوچنے کی کوشش کی جیسے کسی کو آغوش میں لیا جاتا ہے۔ یہ کوشش اسے بہت مہنگی پڑی۔ میں نے پوری قوت سے اس کے مُنہ پر گھونسہ رسید کیا۔ ... تنگ تھی۔ وہ دوسری طرف کھُردری دیوار سے جا ٹکرایا۔ ایک ہی گھونسے نے اس کے چہرے کو مزید مکروہ بنا دیا تھا۔ پچھلی دیوار سے ٹکرانے کی وجہ سے وہ مزید چکرا گیا تھا۔ وہ دھپ سے زمین پر گرا لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سنبھل کر اُٹھتے ہی وہ، گلنار تو کیا اپنے ساتھی کو بھی وہیں چھوڑ کر دوڑ پڑا۔ اس وقت تک اس کا ساتھی بھی اُٹھ چکا تھا۔ وہ بھی اُس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی پسپا ہو جائیں گے۔ وہ جنگلی سُوروں کی طرح بلبلاتے ہوئے تھے... نہ تو اُنھوں نے مجھے کوئی ہاتھ دکھایا تھا اور نہ ہی میرے دو چار ہاتھ برداشت کر سکے تھے۔ اِدھر میرا یہ عالم تھا ... رگ و پے میں گویا اَن گنت آتش فشاں پھٹ پڑنے کو بے تاب تھے۔ اُنھوں نے اس لڑکی پر ہاتھ ڈالا تھا جس کے احسانات کا بوجھ شاید میں کبھی نہ اُتار سکتا اور جو مجھے بہت اچھی بھی ... تھی۔ بلاشبہ وہ کیچڑ میں کھِلا ہُوا کنول تھی۔

میں جتنی مشکلات میں گھِرا ہُوا تھا اس قسم کے حالات سیاہ بختوں کو ہی پیش آتے ہیں لیکن جب سے گلنار نے میرا ساتھ دینا شروع کیا تھا میں اپنے آپ کو بے پناہ خوش قسمت محسوس کرنے لگا تھا۔ گلنار جیسی لڑکیاں روز روز نہیں ملتیں... ہر ایک کو نہیں ملتیں، اور اگر کسی کو مل بھی جائیں تو ... اس پر اس طرح مہربان نہ ہوں، جس طرح گلنار نے میرے ساتھ مہر و عنایت کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں اُن کے پیچھے دوڑ پڑا۔ میں کسی قیمت پر اُنھیں اتنی آسانی سے جانے نہیں دے سکتا تھا۔ خوف نے اُن کے جسموں میں گویا بجلی سی بھر دی تھی اور وہ ہَوا کے دوش پر اُڑے جا رہے تھے۔ دوڑنے میں میری رفتار بھی کچھ کم نہیں تھی لیکن اس وقت میرے لیے اُن کے قریب پہنچنا دشوار ہو رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے وہ بدبخت بازار میں نکل آئے۔ ممکن ہے اُنھیں یہ اُمید رہی ہو کہ بازار کی بھیڑ بھاڑ اور گہما گہمی میں لوگ اُنھیں بچا لیں گے یا شاید وہاں اُن کے ساتھی موجود تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بوکھلاہٹ میں غیرارادی طور پر بازار میں آ نکلے ہوں۔ بہرحال، ان کا اس طرف آنا میرے لیے اچھا ثابت ہُوا۔ حالانکہ لوگ اُنھیں دیکھتے ہی راستہ چھوڑتے جا رہے تھے۔ وہ جس طرف بڑھ رہے تھے اُدھر راہگیروں کا ہجوم کائی کی طرح پھٹتا جا رہا تھا۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی رُکاوٹ تو راستے میں آ ہی جاتی تھی۔ کوئی تانگہ، کوئی چھکڑا یا کوئی بے خبر اور اپنی ہی دُھن میں مگن راہگیر... اسی لیے اُن کی رفتار کم ہو گئی۔

میں نے اُن دونوں کو بیک وقت ہی جا لیا۔ ایک کو میں نے ٹانگ اڑا کر گرایا اور دوسرے کو کالر پکڑ کر کھینچ لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر ایک کو پکڑا تو دوسرا اُسے چھوڑ کر بھاگ نکلے گا جب کہ میں دونوں ہی کو سبق دینا چاہتا تھا۔ مگر وہ ...صورت والا بدمعاش جس کا میں نے کالر پکڑ کر کھینچا تھا انتہائی ... عالم میں غرا کر مجھ پر جھپٹا، جس طرح بلی فرار ہونے کی راہ مسدود پا کر جھپٹ پڑتی ہے۔ اس نے میرے مُنہ پر گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کا وار بازو پر روکا اور اُس کی پسلیوں میں گھونسا رسید کیا۔ وہ دوہرا ہو گیا اور اس کا مُنہ پہلے ہی خون سے لتھڑا ہُوا تھا، کچھ اور بگڑ گیا۔ میں نے ساتھ ہی پلٹ کر دوسرے کے سینے میں جوڈو کے انداز میں ٹھوکر رسید کی۔ وہ دوبارہ گر پڑا۔ اس کے بعد تو میں نے اُنھیں اس طرح گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا کہ ایک کو گھونسا پڑتا تو دوسرے ...لات... وہ دونوں ہی جان چھڑا کر بھاگ نکلنا چاہتے تھے ... میں کسی کو بھی موقع نہیں دے رہا تھا۔ بالآخر وہ بے دم ہو کر گر پڑے اور مدد کے لیے باقاعدہ چِلّانے لگے۔ "بچاؤ... بچاؤ..." لیکن مدد کی غرض سے قریب آنا تو درکنار، کوئی ویسے بھی نزدیک نہیں آ رہا تھا۔ لوگ دُور ہی دُور سے تماشا دیکھ رہے تھے... اور پھر میں ٹھٹھک گیا۔

اس دوران میں گلنار بھی وہاں آ پہنچی۔ وہ میرے بہت قریب آ گئی تو مجھے ہاتھ روکنا پڑا کہ کہیں اسے کوئی ضرب نہ لگ جائے۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ اور وحشت عیاں ... "اب بس کرو... انھیں جان سے مار دو گے کیا؟" وہ گھُٹی گھُٹی آواز میں بولی۔

"جان سے مارنا تو کوئی خاص سزا نہیں ہے۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "میں ان کا وہ حال کر دوں گا کہ یہ برسوں بستر پر پڑے سسکتے رہیں گے اور موت کی آرزو کریں گے۔" میں نے ان میں سے ایک کو گریبان سے پکڑ کر اُٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن گلنار نے تیزی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس دوران میں ایک شخص دوڑتا ہُوا میرے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "جوان، پولیس آ رہی ہے..."

"جاؤ... فوراً وہیں واپس چلے جاؤ جہاں میں نے تمھیں چھوڑا تھا۔" گلنار نے میرا بازو ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ گویا مجھے عالمِ وحشت سے عالمِ اعتدال میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "ہم پولیس کی کارروائیوں میں ملوث ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

بات معقول تھی۔ میں نے کپڑے درست کیے۔ میری چادر اور ٹوپی سڑک پر گر چکی تھی، وہ اُٹھائی اور اطمینان سے ایک طرف کو ہو کر چل دیا۔ غنیمت رہا کہ جب تک میں بغلی گلی میں داخل نہیں ہُوا تب تک پولیس جائے وقوعہ پر نہیں پہنچی تھی...

گلی میں داخل ہوتے وقت میں نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں بدمعاش جیسے تیسے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور لنگڑاتے ہُوئے ایک طرف کو دوڑے جا رہے تھے۔ یقیناً وہ بھی پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی کچھ حیرت ہُوئی کہ لوگ اُن کی حالت دیکھ کر اُن پر ترس کھانے کے بجائے خوش ہو رہے تھے۔ ان پر پھبتیاں کس رہے تھے بلکہ ایک نوجوان نے تو ہمت کر کے آگے بڑھ کر اُن پر تھوکنے کی بھی کوشش کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں لوگوں کے دلوں میں اُن کے خلاف کافی نفرت پائی جاتی تھی۔

اس کمرے میں پہنچ کر میں نے چادر اور ٹوپی ایک طرف پھینکی اور جُوتے اُتار کر بستر پر دراز ہو گیا۔ کمرے کی کنڈی بھی چڑھا دی تھی۔ مجھ پر واقعی ابھی تک وحشت سوار تھی۔ میرے اندر جیسے کوئی درندہ بیدار ہو گیا تھا اور وہ کسی کے خون کا پیاسا تھا مگر اس کی پیاس بُجھ نہیں سکی تھی۔ بہرحال، چند منٹ بعد میری کیفیت اعتدال پر آ گئی اور میں پُرسکون ہو گیا... پھر خیالات کی بھُول بھلیوں میں بھٹکتا ہُوا بالآخر سو گیا۔

صبح دن چڑھے میری آنکھ کھُلی۔ اپنے سُوٹ کیس سے برش، ٹوتھ پیسٹ اور شیو کا سامان نکال کر میں باتھ روم میں جا گھُسا جو کمرے سے ملحق تھا۔ کچھ دیر بعد تیار ہو کر میں اس مکان سے نکل آیا۔ چادر اور ٹوپی والی احتیاط میں نے اس وقت بھی برقرار رکھی تھی۔

بازار کے بیشتر حصّے میں کُندنی دھوپ پھیلی ہُوئی تھی لیکن ابھی اس بازار میں زندگی گویا اُونگھ رہی تھی۔ بیشتر دُکانیں بند تھیں۔ تماش بینوں کی وہ ٹولیاں، وہ ہار گجرے والے، وہ بھانت بھانت کے لوگ، سبھی غائب تھے۔ ایک عجیب

ویرانی سی چھائی ہُوئی تھی۔ اِس وقت تو اُس بازار کو دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ رات گئے تک یہاں کیا ہما ہمی تھی، کیا رونقیں تھیں۔ اب تو وہ کوئی اُجڑا ہُوا دیار لگ رہا تھا۔ تاہم دُودھ دہی، سری پائے اور نہاری اور دیگر اقسام کے ناشتے کی دُکانیں کھُلی ہوئی تھیں اور اُن کے سامنے بہت سے گاہک، آنکھوں میں نیند کا خمار اور ہاتھوں میں مختلف برتن لیے کھڑے تھے۔

میں ایک حلوائی کی دُکان میں جا بیٹھا جہاں باہر گرم گرم پوریاں تلی جا رہی تھیں۔ ڈٹ کر ناشتہ کرنے کے بعد میں باہر آیا اور دُکان کے دروازے کے قریب تخت پر بیٹھے ہُوئے اُدھیڑ عمر کے مالک کو ادائیگی کرنے لگا تو میری چادر تھوڑی نیچے کھسک گئی۔ دُکان کا مالک جو اپنی وضع قطع اور جسم کے اعتبار سے کوئی ریٹائرڈ پہلوان معلوم ہوتا تھا میرے ہاتھ سے نوٹ لیتے ہُوئے میری صورت پر نظر پڑتے ہی نوٹ چھوڑ کر تیزی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ایک ثانیے کے لیے تو میں چوکنا ہو گیا کہ آخر اس شخص کے ارادے کیا ہیں؟ لیکن وہ دونوں بازو پھیلائے یوں میری طرف لپک رہا تھا جیسے مدت سے بچھڑی ہُوئی کوئی عزیز ترین ہستی اُسے اچانک ہی سرِ راہ مل گئی ہو۔ "اوئے باؤ... توں تے شیر جوان ایں... ساڈا جگرا ایں... ساڈا یار ایں... تیرے کولوں پیسے لَے کے اَسی اپنی نظراں وچ ذلیل ہونا ایں۔" یہ کہتے ہُوئے وہ باقاعدہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

ایک بے عنوان قسم کے اشتیاق سے اُس کی باچھیں کھِلی جا رہی تھیں اور گھنی مونچھیں جن کے آدھے بال سیاہ اور آدھے سفید تھے خوب پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ میں نے اُس کی صورت پہلی بار دیکھی تھی اور اس نے ایک لمحے میں مجھے شیر جوان اور جگری یار قرار دے دیا تھا۔ وہ مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر تیزی سے پنجابی میں بولتا جا رہا تھا۔ الفاظ گویا اس کے منہ سے لڑھکتے چلے آ رہے تھے۔ معلوم ہُوا کہ موصوف کل رات مجھے اُن بدمعاشوں کی پٹائی کرتے ہُوئے بہت اچھی طرح دیکھ چکے تھے اور اُن کا کہنا تھا کہ میرا یہ کارنامہ دیکھ کر بازار کے سب دُکانداروں کے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی کیونکہ اُن بدمعاشوں نے کئی چھوٹے موٹے بدمعاشوں کا بستر بوریا گول کرانے کے بعد بازار میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ دُکانداروں سے غنڈہ ٹیکس لیتے تھے اور بات بات پر چاقو اور پستول نکال لیتے تھے۔ پولیس اُنھیں کئی بار پکڑ چکی تھی لیکن ہر بار تھوڑی بہت سرزنش کر کے چھوڑ [illegible] تھی۔ گزشتہ رات بھی وہ پولیس کی آمد کا سُن کر، پولیس [illegible] خوف سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کھسکے تھے کہ پولیس [illegible] کو اپنی حالت دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ بازار میں تو جو [illegible] بے عزتی ہو چکی تھی سو ہو چکی تھی لیکن پولیس کے سا[illegible] ذلت کی انتہا ہو جاتی۔ دُکاندار کا خیال تھا کہ پولیس بھی [illegible] بدمعاش کو زیادہ مارتی ہے جو باہر سے ... کھا کر آ رہا ہو۔

دُکاندار کے متعلق یہ اقیاف [illegible] ت ہی تھا۔ وہ [illegible] کوئی چھوٹا موٹا ریٹائرڈ پہلوان تھا۔ شریف محمد نام تھا [illegible] مگر اس علاقے میں شریفا حلوائی کے نام سے مشہور تھا [illegible] باتوں میں اُس نے یہ بھی کہا کہ اگر ہتھیاروں کا سامنا [illegible] کچہری کا خوف نہ ہوتا تو وہ دو چار دُکانداروں کو ساتھ [illegible] کب کا اُن بدمعاشوں سے نمٹ چکا ہوتا۔ میں نے ایک [illegible] پھر اُسے ناشتے کے سلسلے میں ادائیگی کرنا چاہی تو وہ [illegible] لہجے میں جو کچھ بولا، اس کا مطلب کچھ یہ تھا۔ "بابو جی، [illegible] علاقے کی اتنی بڑی خدمت انجام دی ہے اور ہمیں آ[illegible] خدمت کا حق بھی نہیں دے رہے ہو۔ تم نے بازار کے [illegible] حصّے کو ان بدمعاشوں سے نجات دِلا دی ہے کیونکہ ا[illegible] خصلت ہوتی ہے کہ جہاں یہ ایک مرتبہ خوب ذلیل ہو[illegible] دوبارہ وہاں کا رُخ نہیں کرتے... بھرم جو ٹوٹ جاتا ہے۔"

"یہ تو آپ کی محبت اور ذرّہ نوازی ہے پہلوان [illegible] مجھے کھاتے پیتے ہُوئے کچھ اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہ[illegible]

"کل کو آپ کہیں گے کہ ہمارے گھر جو مہمان آتے [illegible] اُن سے بھی کھانے کے پیسے لیا کریں۔ ہیں جی؟" پہلوا[illegible] ترکی بہ ترکی کہا اور محبت آمیز خفگی سے آنکھیں نکال [illegible] ڈانٹنے کے بعد رازدارانہ لہجے میں بولے: "ذرا اندر آ[illegible] تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

پہلوان جی مجھے دُکان کے پچھلے حصّے میں لے [illegible] دُودھ کے کڑھاؤ اور کنستر وغیرہ پڑے تھے۔ دو اسٹو[illegible] موجود تھے۔ پہلوان جی نے اپنے کُرتے سے ایک اس[illegible] میرے لیے صاف کیا۔ ہم بیٹھ چکے تو وہ بولے: "میں [illegible] خاص دُکانداروں سے بات کی تھی اور اُن سب کی متفق[illegible] ہے کہ یہ علاقہ آپ سنبھال لیں۔"

"میں...؟ علاقہ سنبھال لوں؟" میں نے حیرت [illegible] کہا: "بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"لو جی... اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کونسی بات ہے؟" [illegible]وان جی میرے گھٹنے پر ہاتھ مار کر بولے: "بھئی مطلب یہ [illegible] کہ تم اس علاقے کو... یعنی بازار کے صرف اس حصّے کو [illegible] شاہی بازار کا تقریباً آدھا ہے... غنڈوں اور بدمعاشوں [illegible]روائیوں سے محفوظ رکھنے کی ذمّے داری لے لو۔ ہم تمھیں [illegible] ہزار روپے مہینہ دیں گے... اور اگر تمھیں رہائش اور [illegible]نے پینے کا مسئلہ درپیش ہو تو وہ بھی ہمارے ذمّے۔"

"پانچ ہزار روپے!" مجھے حیرت در حیرت کا سامنا کرنا پڑ[illegible] "کون دے گا یہ پانچ ہزار روپے مجھے؟"

"بھئی یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ ہم دُکاندار مل جُل کر دیں گے۔" [illegible]ان جی بولے۔

"بات دراصل یہ ہے پہلوان جی!" میں نے گہری سانس [illegible] اُٹھتے ہُوئے کہا: "کہ میں پردیسی آدمی ہوں۔ کل کا مجھے خود [illegible]یں کہ کل کہاں ہوں گا۔ میں اس قسم کے دھندوں اور [illegible]اریوں میں نہیں اُلجھ سکتا۔ کل تو یہ دیکھ کر خون کھول اُٹھا [illegible] وہ بدمعاش بھرے بازار میں نہ جانے کس لڑکی کو اُٹھا [illegible]ے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور کوئی ان کا راستہ [illegible] روک رہا تھا۔"

"اچھا خیر... جیسے تمھاری مرضی۔" پہلوان جی مایوسی [illegible]ولے: "لیکن ایک وعدہ تمھیں بہرحال کرنا ہو گا کہ جب [illegible]م یہاں ہو، ناشتہ پانی میرے ہاں ہی چلے گا... اور اس [illegible]لاوہ بھی میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلاتکلّف چلے آنا۔"

میں نے ایک بار پھر خلوصِ دل سے اُس کا شکریہ ادا [illegible] وہاں سے نکل آیا کیونکہ پچھلے کمرے میں بہت حبس [illegible]وان سے مصافحہ کر کے میں نے مخصوص انداز میں چادر [illegible] اپنے کمرے کی طرف واپس چل دیا۔ کمرے میں پہنچ [illegible] سوچ رہا تھا... مجھے کیا کرنا چاہیے کہ دروازے پر دستک ہُوئی۔ میں نے کنڈی ہٹائی اور دروازہ کھولا [illegible] چونک گیا۔ میرے سامنے ایک برقع پوش لڑکی [illegible]ی۔ اس نے نقاب اس طرح لپیٹا ہُوا تھا کہ صرف [illegible] نظر آ رہی تھیں۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ [illegible]ن آنکھوں کو تو میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ [illegible]ان اور جھیل سی گہری آنکھیں گلنار کی تھیں۔ میں نے [illegible] لیے راستہ چھوڑ دیا اور وہ اندر آ کر ایک کُرسی پر بیٹھ [illegible] برقع اس نے نہیں اتارا۔ کمرے میں اسی مانوس سی خوشبو کا ایک جھونکا در آیا جو میرے حواس میں بسی جا رہی تھی۔

"حُسنِ مستور تو کچھ اور دلکش محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے، لڑائی جھگڑے سے تمھارے اندر شاعرانہ صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ اس نے نقاب نہیں ہٹایا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مسکرائی ہے۔ پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہُوئے بولی: "بازار میں آمد و رفت کے دوران میں زیادہ تر برقع استعمال کرتی ہُوں۔ اس لیے مجھے بازار میں شاید ہی کوئی پہچانتا ہو۔ کل تو افراتفری میں میں یونہی نکل پڑی تھی اور اُسی کے نتیجے میں خاصی مصیبت بھگتنی پڑ گئی۔"

"مجیتے اور بلے سے تمھاری کیا دُشمنی ہے؟" میں نے کہا۔

وہ چونک پڑی: "تو تمھیں اُن دونوں بدمعاشوں کے نام بھی معلوم ہو گئے ہیں؟" اس کے لہجے میں حیرت کی جھلک تھی۔

"ہاں۔ آج ایک قدردان مل گیا تھا... اس نے اُن بدمعاشوں کا خاصا حدود اربعہ بتا دیا۔" میں نے گلنار کو شریفا حلوائی سے ملاقات کا احوال سُنا دیا۔

وہ گہری سانس لے کر بولی: "یہ وہی نواب خان والا چکر ہے۔"

"اور نواب خان والا چکر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تو اس سلسلے میں کچھ نہیں معلوم۔ کل بھی بس اس کا نام ہی سُنا تھا۔"

"تمھیں یہ اندازہ تو ہو ہی چکا ہو گا کہ اس دُنیا میں ہر انسان کے ساتھ ایک کہانی لگی ہُوئی ہے۔" اُس کی آنکھیں ایک بار پھر مسکرائیں: "میرے ساتھ بھی ایک کہانی لگی ہُوئی ہے اور نواب خان اُس کا بہت اہم کردار ہے۔ کہانی بہت لمبی ہے، لہٰذا پھر کبھی سہی۔ ابھی تو تمھارے بکھیڑے ہی نہیں نمٹ رہے۔ چلو... ہمیں اب نازو کے گھر چلنا ہے۔" وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔

کمرے کو تالا لگا کر ہم نیچے آ گئے۔ گلنار نے اب چہرے پر پُورا نقاب ڈال لیا تھا۔ تانگے میں بیٹھ کر ہم کرشن نگر پہنچے۔ نازو کے گھر کا راستہ آسان ہی تھا۔ گھر سے کچھ پہلے ہی ہم اُتر گئے لیکن جب کرایہ ادا کر کے میں مکان کی طرف مُڑا تو یہ دیکھ کر دل دَھک سے رہ گیا کہ دروازے پر تالا جھُول رہا تھا۔

"لو... یہ سُراغ بھی گیا ہاتھ سے۔" میں نے بے اختیار کہا۔

"اتنی جلدی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔" گلنار نے گویا مجھے تسلی دی۔ "آس پاس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ وہ لوگ گھر چھوڑ کر جا چکے ہوں۔ ممکن ہے کسی کام سے کہیں گئے ہوں۔"

مکان کے سامنے ہی سائیکلیں کرایے پر دینے اور مرمت کرنے کی ایک دکان تھی جہاں ایک مجہول سا آدمی ڈیڑھ بالشت کی میز پر ایک بوسیدہ سا رجسٹر سامنے رکھے کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اُسے سلام کیا تو وہ یوں خوفزدہ سے انداز میں اُچھل پڑا جیسے میں نے اس کی میز الٹ دی ہو۔ میں نے نازو کے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "بھائی صاحب! اس مکان میں رہنے والے کیا کسی کام سے گئے ہوئے ہیں؟"

اُس نے سکون کی ایک گہری سانس لی اور جھینپی ہوئی سی نظروں سے گلنار کا، بلکہ یوں کہیے کہ گلنار کے برقعے کا جائزہ لینے کے بعد نہایت خوش خلقی سے منمناتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کام سے نہیں، وہ لوگ مکان چھوڑ کر جا چکے ہیں، لیکن کہاں اور کیوں گئے ہیں، اس سلسلے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔"

ہم خاصی مایوسی کے عالم میں واپسی کے لیے تانگے کی تلاش میں چل پڑے۔ دفعتاً میری نظر کھلونوں کی ایک دکان کے سامنے کھڑے ہوئے ایک بچے پر پڑی... اور میں فرطِ مسرت سے تقریباً اچھل پڑا۔ یہ وہی بچہ تھا جسے میں نے نازو کے مکان پر دیکھا تھا اور جس نے میرے لیے دروازہ کھولا تھا۔ خوشی کے ساتھ مجھے حیرت بھی ہوئی۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ باپ اور بھائی چلے گئے ہوں اور سب سے چھوٹے بچے کو یہیں چھوڑ گئے ہوں؟ میں گلنار کا ہاتھ تھام کر بچے کی طرف لپکا۔ چادر میں نے ٹھوڑی سے نیچے کھسکا لی تھی اور ٹوپی بھی اُتار لی تھی۔ بچہ دکان سے کوئی کھلونا خرید کر جا ہی رہا تھا کہ میں نے اُسے روک لیا اور نہایت شفقت سے مسکرا کر اُس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہچانا بیٹے؟"

بچے کی آنکھوں میں خفیف سی چمک اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی اور اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔ "تمہارے ابّو اور بڑے بھائی وغیرہ کہاں گئے برخوردار؟"

"میرا تو کوئی بڑا بھائی نہیں ہے۔" بچہ حیرت سے بولا۔ "میرے ابّو ہیں... وہ اس وقت گھر میں ہیں۔"

"مگر تمہارے گھر پر تو تالا لگا ہوا ہے۔" میں نے نازو کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ میرا گھر تھوڑا ہی ہے۔" بچہ گویا میری کم عقلی پر ماتم کرتا ہوا بولا۔ "وہ کرمو چاچا کا گھر ہے۔ میں تو ویسے ہی ان کے گھر آیا جایا کرتا تھا، نازو باجی کی وجہ سے۔ وہ مجھ سے پیار کرتی تھیں..." وہ نازو کے تصور سے گویا ایک لمحے کے لیے اُداس ہو گیا۔ پھر وہ نازو کے مکان سے اگلے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میرا گھر وہ ہے جس کے دروازے پر چق لٹک رہی ہے۔"

عین اُسی وقت دھوتی اور کرتے میں ایک شخص چق اُٹھا کر باہر آ گیا۔ وہ پکی عمر کا فربہی مائل ایک سانولا سا آدمی تھا۔ اس نے مشکوک سی نظروں سے مجھے اور گلنار کو دیکھا اور بچے کو آواز دی۔ "ابے رشید! اِدھر آ... کیا کر رہا ہے؟"

وہ یقیناً بچے کا باپ تھا۔ بچہ دوڑ کر اُس کے پاس جا پہنچا۔ ہم بھی اُس کی طرف بڑھے اور قریب جا کر دونوں نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں اُسے سلام کیا۔ تب اُس کے چہرے پر پھیلے ہوئے شکوک کے سائے کچھ کم ہوئے اور اس نے بھی حتی الامکان خوش خلقی سے جواب دیا۔

"میں دراصل اس مکان والوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" میں نے نازو کے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے بچے کو میں نے ایک دفعہ وہاں دیکھا تھا، اس لیے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ بلکہ میں آپ کو یہ بتا دینا شاید بہتر ہی ہو کہ اس مکان میں رہنے والے کرمو نامی ایک شخص نے تو اس بچے کے بارے میں مجھے یہی بتایا تھا کہ یہ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔"

"کرمو اسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "لیکن آپ لوگ اُن کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"وہ جی..." میں ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا لیکن گلنار نے فوراً بات سنبھال لی اور انتہائی شیریں اور مترنّم لہجے میں بولی۔ "دراصل ہم اُن کے بارے میں فکرمند نہیں بلکہ ہم ایک لڑکی نازو کے بارے میں پوچھنے آئے ہیں جو اس گھر میں رہتی تھی۔" پھر وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ میرے میاں ہیں..."

رشتہ گو کہ فرضی تھا مگر گلنار کے منہ سے ایسے شیریں لہجے میں یہ الفاظ سُن کر میرا دل اُچھل پڑا اور مجھے اپنے کانوں کی لوئیں تپتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

گلنار کو محوِ کلام پا کر شاید اُس شخص کو اخلاقیات کا خیال آ گیا اور وہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "اندر بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں جی۔ میں بیٹھک کھولتا ہوں۔ آئیں... آئیں... تشریف لائیں۔" وہ ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے مکان میں داخل ہوا۔ بیٹھک کا گلی کی طرف کا دروازہ کھولنے میں اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

اندر پہنچ کر ہم کرسیوں پر بیٹھ چکے تو وہ سراپا اخلاق بنتے ہوئے گلنار سے مخاطب ہوا۔ "ہاں بی بی! اب بتلائیے کیا قصہ ہے؟"

"میں کہہ رہی تھی کہ یہ میرے میاں ہیں۔" گلنار نے مرمریں سپید ہاتھ سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ سے ایک بار پھر میرے لہو کی گردش میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا۔

"وہ تو میں نے سُن لیا۔" وہ شخص گلنار کی بات کاٹتے ہوئے بدمزگی سے بولا گویا دل ہی دل میں کہہ رہا ہو کہ یہی تو افسوس کی بات ہے کہ یہ تمہارا میاں ہے!

"یہ اسٹوڈیو میں کام کرتے ہیں۔ فلم اسٹوڈیو میں۔" گلنار نے نہایت شیریں لہجے میں سلسلۂ کلام جوڑا۔ اس نے نقاب اب بھی نہیں اُٹھایا تھا لیکن وہ شاید ہزار پردوں میں ہوتی تب بھی اس کے متعلق یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ان پردوں میں کوئی چاند پنہاں ہے۔ "نازو نے بھی فلموں میں کام کرنا شروع کیا تھا۔" گلنار بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن ایک فلم ریلیز ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ان دنوں آڑے وقت میں... ایک بہت بڑی مصیبت میں اُس نے میرے میاں کی مدد کی تھی۔ اب جا کر ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ اس کا وہ احسان... وہ قرض اُتار سکیں۔"

وہ شخص گلنار کی گھڑی ہوئی کہانی سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ ویسے اگر میں گلنار کے اور اپنے میاں بیوی والے فرضی رشتے سے قطع نظر دیکھتا تو میرے لیے اس کہانی میں حقیقت کا پرتو جھلکتا تھا۔ بنیادی طور پر تو بات یہی تھی کہ نازو نے مجھ پر احسان کیا تھا۔ وہ شخص گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہاں بی بی! وہ لڑکی واقعی بہت نیک دل اور دوسروں کے کام آنے والی تھی۔ ہر ایک سے پیار محبت کے ساتھ پیش آتی تھی۔ میرے سلیمان پر تو جان چھڑکتی تھی اور جب سے اُسے معلوم ہوا تھا کہ سلیمان کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے تب سے تو اسے اور بھی زیادہ چاہنے لگی تھی۔ میں تو حیران ہوتا ہوں کہ ایسی نیک سیرت لڑکی فلموں میں کیسے چلی گئی..." اُس نے ایک آہ بھری۔

"فلموں میں کام کرنے والی ہر عورت بدکردار اور بُری نہیں ہوتی بھائی صاحب!" میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "گو کہ فلموں میں بیشتر عورتیں اُس بازار سے آتی ہیں لیکن آپ کو شاید یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ بعض اوقات اس بازار میں بھی بڑی نفیس اور نیک عورتیں مل جاتی ہیں۔"

"ہاں بھائی! آپ فلم اسٹوڈیو میں کام کرتے ہیں۔ آپ تو یہی کہیں گے۔" وہ شخص ایک طویل سانس لے کر بولا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا گلنار ہمیں اصل موضوع پر لاتے ہوئے بولی۔ "پہلے تو صرف نازو غائب ہوئی تھی اب اس کے گھر والے بھی غائب ہو گئے۔"

"وہ اُس کے گھر والے نہیں تھے جی!" اس شخص نے قدرے پُرجوش لہجے میں انکشاف کیا۔

"تو پھر وہ کون تھے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ بہرحال اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ وہ نازو کے آنے سے بہت پہلے سے یہاں رہتے تھے لیکن ہمیں اُن کے ناموں سے زیادہ اُن کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اور اب میں سوچتا ہوں کہ شاید انہوں نے اپنے نام بھی شاید فرضی مشہور کر رکھے تھے۔ اُن کے گھر میں کوئی عورت نہیں تھی اس لیے محلے والوں کا بھی اس گھر میں آنا جانا نہیں تھا۔ پھر اچانک ہی ایک دن نازو اُن کے ہاں آ گئی۔" وہ شخص گہری سانس لے کر آنکھیں سکیڑ کر ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو گھورنے لگا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو... بالآخر پہلو بدل کر بولا۔ "نازو کے ساتھ ایک معمر مرد اور عورت بھی تھی لیکن وہ بھی اُس کے والدین معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اپنی وضع قطع اور انداز و اطوار سے وہ نازو کے ملازم لگتے تھے۔ نازو خاصی پڑھی لکھی اور کسی بہت اچھے خاندان کی فرد معلوم ہوتی تھی۔ بڑا رکھ رکھاؤ تھا اس کے طور طریقوں میں۔ اس کے ساتھ رہنے والوں میں سے کوئی بھی اس کے خاندان کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔"

"وہ معمر جوڑا جو نازو کے ساتھ آیا تھا، کیا وہ بھی اُسی کے ساتھ ہی چلا گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں... نازو کے جانے کے بعد دو چار دن تو یہیں رہے پھر وہ بھی کہیں چلے گئے لیکن میرا بچہ اسی اُمید پر اُن کے گھر میں جاتا رہا کہ شاید کبھی اُس کی نازو باجی لوٹ آئے..."

"آپ کو یا کسی اور کو تشویش نہیں ہوئی تھی اس بارے میں؟" میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو یہی رائے قائم کی تھی کہ وہ جہاں سے آئی تھی وہیں واپس چلی گئی ہوگی۔" اُس شخص نے جواب دیا۔ "کرمو اپنے آپ کو نازو کا چچا کہتا تھا۔ اُس نے بھی مجھے گول مول انداز میں یہی تاثر دیا تھا۔ ویسے مجھے کچھ شک سا تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو لیکن جناب آج کل کے زمانے میں کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ دوسروں کے معاملات میں اُلجھتا پھرے۔ خصوصاً ایسے معاملات سے تو میں بہت گھبراتا ہوں جن میں کسی عورت کا کوئی چکر ہو..." اُس نے دُزدیدہ لیکن معذرت آمیز نگاہ سے گلنار کی طرف دیکھا۔

"آپ کو گڑبڑ کا شک کس بنا پر تھا؟" میں نے ایک بار پھر بے تابی سے اُس کی بات کاٹ دی۔

"نازو کے غائب ہونے سے ایک دن پہلے میں نے شام ڈھلے اس کے گھر کے سامنے ایک لمبی سی سیاہ گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔" وہ شخص دھیمی آواز میں بولا۔ "اس گاڑی کے شیشے بھی سیاہی مائل تھے۔ ان کے پار دیکھا نہیں جا سکتا تھا کہ اندر کون بیٹھا ہے لیکن اس وقت ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا شیشہ آدھا نیچے اُترا ہوا تھا، اس لیے میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی جھلک دیکھ لی تھی۔"

میری اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ میں ہمہ تن گوش تھا اور اس شخص کا ایک ایک لفظ اتنی توجہ سے سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ کبھی بھولنے نہ پاؤں... کوئی باریک سے باریک نکتہ میرے ذہن سے محو نہ ہو۔

وہ شخص پہلو بدل کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اُس وقت میں اِسی بیٹھک میں اُس سامنے والی کھڑکی میں کھڑا تھا جس میں تاروں والی باریک جالی لگی ہوئی ہے... آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ اس جالی کے پیچھے کھڑا ہوا آدمی عام طور پر اُس وقت تک باہر کھڑے لوگوں کو نظر نہیں آتا جب تک کمرے میں روشنی نہ ہو۔ اسی لیے شاید کرمو کو معلوم نہیں ہو سکا کہ میں اُسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اس وقت کے قریب ہی کھڑا تھا۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو کر

"آپ نے اس کار والے کو دیکھا تھا؟" میں نے ہو کر پوچھا۔

"دیکھا تو تھا لیکن نہ دیکھنے کے برابر سمجھیے۔" اُس نے گویا میری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ "ایک تو کار کا شیشہ صرف آدھا کھلا تھا۔ دوسرے میں اُس شخص چہرے کا صرف ایک حصہ دیکھ سکا تھا جسے عام فہم سائڈ پوز کہہ لیجیے... اس پر طرّہ یہ کہ اُس شخص نے ہیٹ سر پر رکھا ہوا تھا جو کچھ زیادہ ہی آگے کو جھکا اور اسی پر بس نہیں، اُس نے شام کا ملگجی اندھیرا پھیلنے کے باوجود تاریک شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اب خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دیکھنا کوئی دیکھنا تو نہ ہوا نا"

"کرم الٰہی... میرا مطلب ہے کرمو اُس کے پا کیا کر رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کبھی کھڑکی پر جھکتا اور کبھی سہمے ہوئے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ وہ غالباً رازدارانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔" اس شخص نے بتایا۔ "رمضان تھا اور روزہ کھلنے کا وقت قریب تھا اس لیے گلی میں پھیلا ہوا تھا۔ بچے بوڑھے سبھی یا تو مسجدوں میں گھروں میں روزہ کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں آ کوئی چیز لینے بیٹھک میں آیا تھا اور میری نظر کھڑکی چلی گئی تھی۔ نازو کے دروازے پر ایسی شاندار گاڑی میں کھٹک گیا تھا۔" وہ گویا میرے تجسس کی آگ کو کے لیے ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ میں ایک لمحے بھی

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کرمو نے گاڑی والے سے زیادہ دیر بات نہیں" اُس نے بتایا۔ "پھر میں نے گاڑی والے کو کرمو کے ہا کوئی چیز دیتے ہوئے دیکھا۔ میں ٹھیک سے تو نہیں سکا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ نوٹوں کی موٹی سی گڈ جسے کرمو نے فوراً قمیص کے نیچے کہیں چھپا لیا تھا۔ ہی لمحے گاڑی والے نے کھڑکی کا شیشہ چڑھا لیا اور گ واپس چلی گئی۔ دوسرے دن نازو غائب ہو گئی۔ اس ہم نے اُسے نہیں دیکھا۔"

"کرمو کا رویّہ اس دوران میں کیسا رہا؟" میں نے

"کچھ دن تو وہ حسب معمول پُرسکون ہی رہا۔ بلکہ ایک دن راہ ملاقات ہوئی تو میں نے سرسری انداز میں نازو کے بارے پوچھ لیا۔ کہنے لگا اپنی ممانی کے ہاں ایبٹ آباد گئی ہے لد ہی آ جائے گی لیکن بعد میں وہ خود بھی پریشان اور وحشت نظر آنے لگا۔ اس کے ساتھ رہنے والے دو تگڑے سے جوان، کرمو کے کہنے کے مطابق اُس کے بیٹے تھے، وہ بھی فکر مند سے نظر آتے تھے۔ کئی بار گھر میں میں نے اُن کے چیخنے برسنے کی آوازیں بھی سنیں۔ اتنا اندازہ تو ہو گیا کہ وہ بوڑھے میاں بیوی پر گرج برس رہے تھے جو نازو کے ساتھ ئے تھے... لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آ سکی۔ بالآخر وہ بوڑھا ابھی غائب ہو گیا اور اس کے چند دن بعد کرمو اور اُس بیٹے بھی... یہ ہے کُل قصّہ۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ لوم نہیں۔"

"آپ نے ہماری معلومات میں اتنا اضافہ کیا یہی بہت ہے۔" گلنار اُٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ نے آپ کو بڑی زحمت دی۔"

"ارے بی بی... بھائی صاحب! بیٹھیے تو سہی باتیں ہی چھڑ گئیں کہ میں آپ کو چائے پانی کے لیے تو پوچھ ہی ہیں سکا۔" وہ شخص میرا بازو پکڑ کر مجھے بٹھانے کی کوشش رتے ہوئے بولا لیکن ہم معذرت کر کے باہر آ گئے... اور ٹے کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہوئے واپس چل دیے۔

"معاملہ کچھ زیادہ ہی اُلجھتا جا رہا ہے۔" گلنار سوچ میں بے ہوئے لہجے میں بولی۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔" میں نے ن زدہ لہجے میں کہا۔

"خیر..." وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "میں بتاتی ں... کہ کیا کرنا چاہیے۔"

"جلدی بتاؤ۔" میں نے بے تابی سے کہا۔ "اب تو تم ہی ماغ ہو۔ میں تو محض جسم ہی جسم رہ گیا ہوں۔ تم جو کہتی جا ی تو میں وہ کرتا جا رہا ہوں۔"

"تمھیں اسٹوڈیو جانا چاہیے۔ اب وہی ایک جگہ نظر آتی جہاں سے نازو کا کوئی سُراغ ملنے کی توقع ہے۔ تم نے یا تھا کہ نازو تمھیں چھت پر لے گئی تھی اور وہاں ٹوٹے ٹے اور پُرانے فرنیچر کا انبار لگا تھا... وہیں اچانک معاش آ پہنچے تھے؟"

"ہاں... یہ سب کچھ تو میں نے تمھیں بتایا تھا... لیکن اس میں کون سا سُراغ پنہاں ہے؟" میں نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے اُس وقت بھی وہ ڈائری نازو کے پاس موجود رہی ہو جس کی وجہ سے یہ سارا فساد برپا ہے اور اُن بدمعاشوں کو جھگڑا شروع کرتے دیکھ کر نازو نے احتیاطاً وہ ڈائری وہیں شکستہ فرنیچر میں کہیں چھپا دی ہو... اور وہ ابھی تک وہیں پڑی ہو؟"

"اوہ..." میں تقریباً اچھل پڑا۔ "اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"فی الحال تمھارے حالات سوچ بچار کے لیے موزوں نہیں۔" اس نے نقاب کی اوٹ سے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ "لیکن تھوڑے دنوں میں ذہن استعمال کرنے کی عادت پڑ جائے گی تمھیں بھی۔ میری تجویز کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہے تو ٹھیک۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "لیکن عین ممکن ہے، میرے نامعلوم دشمن بھی اسٹوڈیو ہی میں پائے جاتے ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی اس فائٹ انسٹرکٹر کے قتل کے سلسلے میں بھی مجھے پہچان سکتا ہے... ویسے بھی مُنہ اُٹھا کر اسٹوڈیو جانے والے یُونہی مشکوک سے لگتے ہیں۔ کہیں بھی کوئی روک کر سوال جواب کر سکتا ہے۔ کسی معقول اور اہم آدمی کے مہمان کے طور پر جائیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔" گلنار بولی۔ "اسٹوڈیو جانا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم کسی معقول اور اہم آدمی کے مہمان ہونے کی بات کر رہے ہو، اگر تم کہو تو میں تمھیں کسی فلمساز کی آئندہ فلم کے ہیرو کے طور پر لے چلوں۔"

"نہیں بھئی۔ اس بات کو تو رہنے ہی دو۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں تو فلموں میں کام کرنے سے پہلے ہی توبہ کر چکا ہوں۔ ویسے کیا تمھارے بھی وہاں خاصے مراسم ہیں؟"

"اپنے کئی قدردان ہیں وہاں۔" وہ خوش دلی سے بولی۔ "گانا سُننے آتے رہتے ہیں۔ ایک دو تو دل و جان سے مجھ پر فدا ہیں۔ ایک تو سیٹھ کریم بھائی ہیں، جن کا اصرار ہے کہ میں اُنھیں صرف کریم کہا کروں۔ ساری دُنیا اُنھیں کریم بھائی کہتی ہے۔ میں کریم بھائی کہتی ہوں تو بڑے خفا ہوتے ہیں۔ انھوں نے میری خاطر ایک فلم بھی شروع کر دی تھی۔ مجھے ہیرو تن

لینے پر بضد تھے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ مجھے فلم میں کام کرنے کا قطعاً شوق نہیں اور میرے اُن قدردانوں نے مجھے آفرز دے دے کر میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ وہ میرے انکار پر حیران ہوتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ عورتیں اور خصوصاً اس بازار کی عورتیں تو چھوٹا سا چانس حاصل کرنے کے لیے مری جاتی ہیں اور میں ڈائرکٹ ہیروئن کے رول میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ میرا رویّہ اُن کے لیے ناقابلِ فہم ہے۔"

"یہی حال میرا بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں فلموں کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں اور لوگ مجھے گھسیٹ کر فلم لائن میں لے جانے پر تُلے ہوئے ہیں جب کہ آج کل کے نوجوانوں میں 'فلمیریا' عام ہے۔ بے شمار خوش شکل اور باصلاحیت نوجوان چھوٹے سے چھوٹا رول کرنے کے لیے فلم اسٹوڈیوز میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ فلمسازوں اور ہدایت کاروں کے سامنے منت سماجت کرتے ہیں۔"

"خیر... تم فلم میں کام کرو یا نہ کرو لیکن ہمیں اسٹوڈیو تو جانا ہی پڑے گا۔" وہ طویل سانس لے کر بولی۔ "اور جہاں تک تمھیں لوگوں کے پہچان لینے کا تعلق ہے تو اس خوف کو اب دل سے نکال دو اور اس نظریے پر پختہ یقین رکھو کہ اگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو کوئی تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا اور کوئی تمھیں سزا نہیں دے سکتا۔"

گلنار کے اندازِ گفتگو کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کی وجہ سے انسان کے جسم میں بجلی سی دوڑنے لگتی تھی۔ کم از کم میں تو اس کی باتیں سُن کر یہی محسوس کرتا تھا کہ میرے وجود پر سے برف پگھل رہی ہے۔ میری ذات میں کوئی انقلاب آرہا ہے اور میں لمحہ بہ لمحہ ایک نیا انسان بنتا جارہا ہوں۔ میری خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو رہی ہیں۔ درحقیقت وہ مجھے دریافت کر رہی تھی۔ میری ذات ایک گمشدہ جزیرہ تھی اور وہ میرے لیے گویا کولمبس سے ملتی جلتی کوئی چیز بنتی جارہی تھی۔ میں کئی مرتبہ حیرت سے سوچ چکا تھا کہ اگر وہ مجھے نہ ملتی تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ میرے اندر تلاطم برپا ہے اور میری ذات میں غیر محسوس سا تغیّر آرہا ہے۔ اس کے خیال میں شاید سرِدست اتنا ہی کافی تھا، موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ "فی الحال تم واپس اپنے کمرے میں جاکر آرام کرو۔ کل فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔"

اگلے چوراہے پر پہنچ کر ہمیں رکشہ مل گیا اور ہم ... بازار کی طرف چل دیے۔ بازار کے سرے پر پہنچ کر اُس نے ... اُترنے کا اشارہ کیا لیکن خود رکشے ہی میں بیٹھی رہی۔ ... اُتر گیا تو بولی۔ "اب تم سے کل ہی ملاقات ہو سکے ..." رکشہ آگے بڑھ گیا اور میں عورتوں کی طرح اپنی چا ... درست کر کے بازار میں داخل ہو گیا جہاں ابھی ویرانی ... تھا۔ شریفا حلوائی کی دُکان کے سامنے سے گزرنے لگا ... نے مجھے پہچان لیا اور آواز لگادی۔ "جمال باؤ! چھپ ... کے جارہے ہو غیروں کی طرح... نہ لسّی نہ پانی... نہ خ ... تواضع... ہمارا دل توڑ رہے ہو۔"

وہ بالکل فارغ ہی بیٹھا تھا۔ مجھے بھی کچھ بھوک ... رہی تھی۔ میں نے سوچا کھانے پینے کا کچھ ہلکا پھلکا سا ... جائے تو بہتر ہے۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس نے اپنے ملازم ... جانے کیا کچھ لانے کا حکم دے دیا اور اُس نے میرے سا ... پینے کی بہت سی چیزیں سجادیں۔ میں حسبِ خواہش ... چکا تو شریفا پہلوان گپ شپ کے سے انداز میں بولا ... باؤ! ویسے تم ہو کوئی اُونچی چیز... اب تو تمھاری شہرت ... تک پھیلنے لگی ہے۔"

"یہ شبہ تمھیں کیونکر ہوا؟" میں نے مسکرا کر پوچھ ...

"تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے ایک آدمی تمھارے ... میں پوچھ رہا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑا سیٹھ معلوم ہوتا تھا ... مسرور لہجے میں بولا۔ "اُسے شاید تمھارا نام بھی نہیں معل ... وہ صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کل رات جس شیر جوا ... دو بدمعاشوں کی پٹائی کی تھی اُس کا ٹھکانہ کسی کو معلوم ... مجھ سمیت کسی کو بھی معلوم نہیں تھا اس لیے اسے ما ... واپس جانا پڑا۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کس لیے میرا پتہ معلوم ک ..." میں نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں باؤ جی! بس خیال ہی نہیں آیا پوچھنے ... میں نے تو یہی سوچا تھا کہ ہوگا کوئی قدردان... تمھیں ... نوازنا چاہتا ہوگا یا پھر تم سے اسی قسم کا کوئی کام ... ہوگا۔ سچی بات یہ ہے کہ میری تو اس سے کچھ پوچھنے ... بھی نہیں پڑی۔ حالانکہ میں اچھی طرح اس کی شکل ... سکا لیکن باؤ جی... تھا وہ بڑا بارعب آدمی ...

... اس کی شخصیت میں۔"

"آخر کیسا آدمی تھا؟ کون تھا؟" میں نے قدرے مضطربانہ لہجے میں پوچھا۔

"میں کچھ نشانیاں بتا سکتا ہوں۔ وہ چم چم کرتی لمبی سی سیاہ گاڑی میں تھا۔ گاڑی کے شیشے بھی گہرے رنگ کے تھے۔ اس نے گاڑی سے اُترنے کی زحمت نہیں کی تھی اس لیے میں اس کی شکل بھی کچھ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا... اور وہ شاید کسی کو اپنی شکل صحیح طرح دکھانا بھی نہیں ... چاہتا تھا، اسی لیے اُس نے سیاہ ہیٹ پہن رکھا تھا اور ... دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ کیا تم اس حُلیے کے کسی آدمی کو ... جانتے ہو باؤ؟"

"نہیں۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "لیکن تم نے اُسے میرا نام تو نہیں بتایا؟"

"نام تو پورا مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" شریفا مسکرایا۔ "تم نے مجھے صرف جمال ہی بتایا تھا اور محض اتفاق سے باتوں ... باتوں میں یہ بھی زبان پر نہیں آیا۔"

"بہرحال... اگر وہ شخص دوبارہ میرے بارے میں پوچھنے ... آئے تو اُسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ بتانا کہ میں اس ... علاقے میں نہیں رہتا۔ شاید کل رات گانا وانا سُننے آیا تھا۔ ... سمجھے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"بالکل سمجھ گیا باؤ جی۔ مجال ہے اُسے کچھ معلوم ہو جائے ... بھی وہ آدمی کچھ ٹھیک نہیں لگا تھا۔" شریفا نے فوراً میری ... میں ہاں ملائی۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرا ذہن ایک بار پھر اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ ... سیاہ گاڑی والے کا ذکر میں نے نازو کے سلسلے میں بھی ... تھا۔

آخر یہ شخص کون ہے اور کیوں آسیب کی طرح میری زندگی ... در آیا ہے؟ اس کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟ اپنے کمرے ... پہنچ کر بھی میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ شاید مجھے یوں ... بیٹھ کر وقت گزارنا بہت مشکل محسوس ہوتا لیکن اپنی زندگی ... نشیب و فراز پر غور کرنے لگا تو وقت گزرنے کا احساس بھی ... ہو سکا۔ ذہن گویا بھول بھلیّوں میں اُلجھ کر رہ گیا۔ جب میں ... تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں بے دلی سے اُٹھ کر ... کھانا کھانے باہر گیا اور واپس آکر بوجھل ذہن لیے سو گیا۔

دوسری صبح میں سو کر اُٹھا تو ذہن بالکل ہلکا پھلکا تھا۔ نیند کیا آئی گویا ذہن سے بادل چھٹ گئے تھے۔ جیسے ہر فکر میں نے ذہن سے جھٹک دی تھی اور میں اپنے آپ کو بہت چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ چھلانگ لگا کر میں پلنگ سے اترا اور سیٹی بجاتا ہوا باتھ روم کی طرف لپکا لیکن اسی لمحے شناسا سی دستک نے مجھے روک لیا۔ میں نے پلٹ کر دروازہ کھولا تو گلنار کو سامنے کھڑے پایا۔ اُس نے نقاب اُلٹا ہوا تھا اور اُس کا چہرہ کچھ زیادہ ہی دمک رہا تھا۔ رخساروں پر گویا شفق لہرا رہی تھی۔ اندر آکر اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تہ شدہ اخبار میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے تمھارا پروانۂ رہائی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ خبر پڑھو۔" اس نے اخبار کھول کر ایک چھوٹی سی خبر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

میں اخبار پر جھک گیا۔ اس خبر کی سُرخی تھی: "اسٹوڈیو میں فائٹ انسٹرکٹر کے قتل کا معمہ حل ہو گیا۔" میں بُری طرح چونک پڑا اور بے تابی سے پوری خبر پڑھ ڈالی۔ خبر اس بدمعاش فائٹ انسٹرکٹر فواد کے متعلق تھی جسے میں نے اسٹوڈیو کی چھت پر مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا اور خود بھاگ آیا تھا۔ بعد میں اس کے سینے میں چاقو پیوست پایا گیا تھا اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے قتل کے الزام میں مجھے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ اُسے دراصل اُس کے ایک ساتھی نے قتل کیا تھا جو بالآخر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ مقتول کا اس سے خاصی بڑی رقم کے لین دین پر ایک دن پہلے ہی جھگڑا ہو چکا تھا اور وہ موقعے کی تاک میں تھا۔ اُس نے اچانک ہی فواد کو چھت پر بے ہوش پڑے پایا تو موقع غنیمت جانا اور اس کے سینے میں چاقو اُتار دیا۔ اس نے قتل کا اعتراف کر لیا تھا اور اُسے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ "شکر ہے خدایا تیرا!" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ میرے سر سے گویا بہت بڑا بوجھ گیا تھا۔

"دیکھا تم نے!" گلنار کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے شوخ لہجے میں بولی۔ "جب تم نے خود اپنی بے گناہی پر تکیہ کرنا شروع کیا اور اپنا یقین پختہ کر لیا تو خُدا نے بھی غیر متوقع طریقوں سے تمھاری مدد شروع کر دی۔"

"واقعی... اس بات کا تو میں قائل ہو گیا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ میں اب واقعی اپنے آپ کو ایک نیا انسان

محسوس کر رہا تھا۔

"اب تو تمھیں میرے اس فارمولے پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔" وہ بھی گہری سنجیدگی سے بولی۔

"کون سا فارمولا؟" میں نے پوچھا۔

"حیرت ہے۔ اتنی جلدی بھول بھی گئے؟" وہ حیرت سے بولی۔ "میں نے کہا تھا کہ اب دشمن سے چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ حالات بتاتے ہیں کہ وہ بالآخر تمھیں ڈھونڈ ہی نکالے گا۔ چھپنے کی وجہ سے وہ خواہ مخواہ تمھیں بزدل سمجھ کر اور شیر ہو جائے گا۔ اس لیے اب بہترین حکمتِ عملی یہ ہے کہ تم اچانک سامنے آجاؤ اور اتنے زور و شور سے آؤ کہ تمھارے نامعلوم اور نادیدہ دشمن دنگ رہ جائیں۔ اس عالم میں اُن سے حماقتیں سرزد ہوں گی جن سے ہم فائدہ اٹھائیں گے۔ میری بات تمھاری سمجھ میں آرہی ہے؟... چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں اسٹوڈیو جانا ہے۔"

"وہاں مجھے کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسٹوڈیو جانے میں تین مقاصد پیشِ نظر ہیں۔ ایک تو وہاں تم فرنیچر کے اس انبار کی تلاشی لے سکتے ہو جو اسٹوڈیو کی چھت پر پڑا ہے... دوسرے یہ کہ تم فضل داد سے دوبارہ رسم و راہ بڑھا کر نازو کا سراغ لگانے کی کوشش کر سکتے ہو۔ نازو اسی کی دریافت تھی۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوگا۔ تیسری بات یہ کہ اسٹوڈیو جا کر ہی وہ انتظامات ہو سکتے ہیں جن کے ذریعے تم ایک دو دن میں جانی پہچانی شخصیت بن سکتے ہو۔ اپنے دشمنوں کو حیرت زدہ کر سکتے ہو۔ ... ہم اس حکمتِ عملی پر متفق ہو چکے ہیں۔ ہمیں فوراً اس پر عمل درآمد شروع کر دینا چاہیے۔"

"بالکل درست!" میں نے اس کی باتوں پر غور کرتے ہوئے کہا۔ پھر مجھے گزشتہ روز کا واقعہ یاد آگیا اور میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ "میں تمھیں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ وہ کار والا پُراسرار اور آسیب نما شخص میرے تعاقب میں یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔"

"کیا واقعی؟ کیسے؟" گلنار چونکتے ہوئے بولی۔

میں نے اُسے سب کچھ بتایا جو شریفا حلوائی نے مجھے بتایا تھا۔ مگر گلنار فکر مند ہونے کی بجائے بولی۔ "اب تو طے کردہ حکمتِ عملی پر کام کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ اب تم کھل کر سامنے آہی جاؤ۔ پتہ تو چلے کہ آخر وہ لوگ ہیں کون؟ انھیں کس لیے ڈائری کی تلاش ہے؟ نازو کہاں ہے؟ سب سوالوں کا نہ سہی، کسی نہ کسی سوال کا جواب تو ملے گا۔ کچھ تو اُلجھن اور پریشانی کم ہوگی۔ اپنی جان کی تمھیں زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بات تو طے ہے کہ وہ لوگ ڈائری حاصل کیے بغیر تمھیں ہلاک نہیں کریں گے۔"

"جان کا خوف کس کم بخت کو ہے!" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو خواہ مخواہ ہی احمقوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ کوئی مشورہ دینے والا تھا نہ راستہ دکھانے والا۔ اب تم ساتھ دے رہی ہو تو کوئی کام مشکل نہیں لگ رہا اور کوئی خوف دل میں تھا تو وہ بھی نکل گیا ہے۔ اب جان سے ہاتھ دھونے کا تصور بھی میرے لیے خوفناک نہیں رہا۔ صرف تمھارے ساتھ ہونے سے مجھ میں کتنا... آگیا ہے!"

"حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تمھاری ذہنی کیفیت یہی ہونی چاہیے..." گلنار نے سر ہلایا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں گلنار کے ساتھ باہر آیا تو سورج سر پر آنے لگا تھا۔ اتفاق سے مین بازار... آتے ہی ہمیں ٹیکسی مل گئی اور ہم تقریباً آدھے گھنٹے کے... اسٹوڈیو جا پہنچے۔ گلنار نے ٹیکسی اسٹوڈیو کے اندر ہی... رُکوائی۔

چند لمحے بعد ایک بار پھر میں گلنار کی رہنمائی میں، اُ... برآمدے میں چلا جا رہا تھا، جہاں فلمی دفاتر کی قطار تھی۔ قسمت بار بار مجھے کھینچ کر یہیں لا رہی تھی۔ نہ جانے اس میں قدرت کی کیا مصلحت تھی؟

گلنار ایک دفتر کے سامنے رُکی جس پر بھائی بھائی کمپنی کی تختی آویزاں تھی اور دروازے کے قریب ہی اسٹول پر چپڑاسی بیٹھا تھا۔ گلنار نے نقاب اس وقت بھی اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ صرف آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ اس کے باوجود چپڑاسی اُسے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور نہایت عاجزانہ انداز میں دانت نکال کر سلام کرنے لگا۔ "بہت... بعد تشریف لائی ہیں میڈم!" وہ نہایت خوشامدانہ لہجے میں بو...

"بس... جب کوئی ضروری کام ہو تا ہے تبھی آتی ہ..." گلنار نے پُروقار لہجے میں جواب دیا۔ چپڑاسی نے مستعدی... اس کے لیے دروازہ کھولا اور ہم دونوں اندر چلے گئے۔ دائیں بائیں دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی دو تین میزوں... آدمی دفتری کاموں میں مصروف تھے لیکن گلنار نے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ سیدھی سامنے بنے ہوئے ایک کیبن نما حصے پر پہنچی جس کی آدھی دیواریں اور دروازہ شیشے کا تھا۔ وہ بلا تامل کیبن کا دروازہ کھول کر اندر پہنچ گئی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ طول و عرض میں یہ کیبن بھی ایک کشادہ کمرے سے کم نہیں تھا۔ یہاں کی آرائش قابلِ دید تھی۔ فرش پر جو قالین بچھا ہوا تھا وہ رُوئی کے گالوں سے بنا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ دیواروں پر شیشوں کی طرح جھلملانے والا وال پیپر چسپاں تھا اور بڑی خوبصورت ترتیب کے ساتھ کئی دل کش پینٹنگز آویزاں تھیں۔ دیوار گیر قمقموں اور گلوبس وغیرہ کے شیڈز بھی دیدنی تھے۔ دونوں طرف دو نہایت خوبصورت اور درآمدہ شدہ بریکٹ فین بھی لگے ہوئے تھے جن کے پَر اس وقت ساکت تھے۔ موسم حالانکہ خاصا ٹھنڈا تھا مگر کیبن میں زیادہ خنکی تھی کیونکہ ایک کونے میں ائرکنڈیشنر سرسرا رہا تھا۔

ایک طرف دیوار کے ساتھ نہایت نفیس اور پہلی نظر میں ہی نہایت بیش قیمت نظر آنے والی میز لگی ہوئی تھی جس پر نہایت ہی اعلا درجے کا دفتری سامان سجا ہوا تھا اور مختلف رنگوں کے تین ٹیلی فون سیٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس میز کے عقب میں نہایت خوبصورت اور گدیلی ریوالونگ سیٹ پر جو شخصیت تشریف فرما تھی وہ بھی قابلِ دید چیز تھی۔ پہلی نظر میں تو مجھے یہی شبہ ہوا کہ شاید کوئی مُردہ قبرستان کے سماجی حالات نامناسب دیکھ کر فرار ہو کر یہاں آن بیٹھا ہے۔ نہایت ہی استخوانی قسم کی شخصیت تھی وہ۔ رُخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی۔ سوکھا ہوا چہرہ۔ گنجے مرغ جیسی گردن۔ مینڈک کی طرح اُبھری ہوئی آنکھیں۔ سر پر چھدرے بال اور وہ بھی گویا عالمِ وحشت میں سیدھے کھڑے تھے اور سر کا بیشتر حصہ اُن 'وحشت زدہ بالوں' سے بھی محروم تھا۔ اُونٹ کے کوہان کی طرح اُبھری ہوئی ناک پر موٹے سے فریم کی عینک لگی ہوئی تھی۔

ہم کیبن میں داخل ہوئے تو وہ شخص سبز رنگ کے ٹیلیفون سیٹ پر مصروفِ گفتگو تھا۔ گلنار پر نظر پڑتے ہی اس نے بات کو اختتام تک پہنچائے بغیر، معذرت کیے بغیر اور خدا حافظ تک کہے بغیر کھٹ سے ریسیور رکھ دیا اور بوکھلائے ہوئے سے انداز میں احتراماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ تب میں نے دیکھا کہ اُس کی قمیص پتلون سے نکلی ہوئی تھی اور اسی قمیص پہ اس نے کوٹ بھی پہن رکھا تھا۔

"ارے... ارے... یہ آج عید کا چاند ہمارے دفتر میں کیسے اُتر آیا؟ یہ آج سورج مشرق کی بجائے مغرب سے کس طرح نکل آیا؟" اس شخص کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ بے پناہ حیران بھی نظر آ رہا تھا۔

"یہ دونوں تماشے ایک ساتھ نہیں ہو سکتے کریم بھائی! ایک وقت میں ایک ہی چیز کا ذکر کرو۔ چاند کا یا سورج کا۔" گلنار شریر لہجے میں بولی۔

"ارے... پھر وہی کریم بھائی..." اس شخص نے باقاعدہ اپنے نیم گنجے سر پر دو ہتڑ رسید کر دیا۔

"بھئی اس میں رونے کی کیا بات ہے؟" گلنار شریر لہجے میں بولی۔ "یہ تو تمھارے نام کا حصہ ہے!"

"ہاں... پھر تو ٹھیک ہے... بیٹھو... بیٹھو۔" کریم بھائی نے خوش نما کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ہم کرسیوں میں دھنس گئے تو کریم بھائی بھی بیٹھ گئے اور مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملنے لگے۔ میری طرف تو وہ گویا دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔ قربان جانے والے انداز میں بس گلنار ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "کیا خدمت کروں تمھاری گلنار بیگم؟ کھانے پینے کے لیے کیا منگواؤں؟" اُن کا شاید بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ گلنار کے قدموں میں لوٹنے لگیں۔ "کوئی انوکھی ڈش منگواؤں؟ کوئی کمیاب مشروب منگواؤں؟ کوئی ایسی فرمائش کرو جسے پورا کرنا میرے لیے مشکل ہو۔"

"سیٹھ صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ ہم آپ کو کبھی مشکل میں نہیں ڈالتے۔ ہم تو آپ کو ایسے ہی کام بتاتے ہیں جو بہت آسان ہوتے ہیں۔" گلنار مُسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ یہ درست ہے۔ ہم کو حسرت ہی رہی... کہ تم ہمیں کبھی کوئی بڑا کام بتاؤ۔ اور یہ بھی حسرت ہی رہی کہ تم کبھی بغیر کام کے بھی ہم سے ملنے آؤ۔" کریم بھائی نے ایک ٹھنڈی سانس لی جو میرے خیال میں اُن کے حق میں اچھی نہ تھی کیونکہ وہ پہلے ہی زکام کی وجہ سے شوں شوں کر رہے تھے اور بار بار رومال سے ناک رگڑ رہے تھے۔

"آپ اطمینان رکھیں سیٹھ صاحب!" گلنار نے گویا انھیں تسلی دی۔ "کبھی نہ کبھی ہم آپ سے بغیر کام کے بھی ملنے آئیں گے۔"

"ہم زندہ ہی اِسی آس پر ہیں۔" سیٹھ کریم نے پھر ایک

آہ بھری پھر شوں شوں کی اور اس کے بعد گویا چونکتے ہوئے بولے "ارے ہاں... تم نے بتایا ہی نہیں کہ ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟"

"کچھ نہیں چلے گا،" گلنار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہم کافی تاخیر سے ناشتہ کرکے آ رہے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں بازار میں کس قسم کا ناشتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد کافی دیر تک کچھ کھانے پینے کی طلب نہیں رہتی۔"

"اچھا تو پھر کام بتاؤ،" سیٹھ صاحب مزید شوں شوں کرنے لگے۔ ان کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔

"میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "قطع کلامی معاف سیٹھ صاحب! آپ کو زکام ہو رہا ہے تو آپ ائرکنڈیشنر بند کیوں نہیں کر دیتے؟"

سیٹھ صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا گویا انھیں پہلی بار احساس ہوا ہو کہ میں بھی وہاں موجود ہوں... پھر وہ خوش خلقی سے مسکرائے اور ایک طویل سانس لے کر بولے۔

"مجھے دراصل زکام اسی وجہ سے ہوا... کہ دو دن بغیر ائرکنڈیشنر کے رہنا پڑا۔ مجھے ایک فلم کے جھگڑے کے سلسلے میں اندرونِ ملک... ایک چھوٹے سے شہر جانا پڑا جہاں ایک ہی ذرا ڈھنگ کا ہوٹل تھا اور اس میں کوئی کمرہ ائرکنڈیشنڈ نہیں تھا جب کہ اپن نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے ہر چیز ائرکنڈیشنڈ ہی دیکھی ہے۔ گاڑی ائرکنڈیشنڈ۔ دفتر ائرکنڈیشنڈ بیڈروم ائرکنڈیشنڈ۔ کبھی کبھار تفریح کے لیے ہم جن ہوٹلوں میں جا کر بیٹھتے ہیں وہ بھی ائرکنڈیشنڈ ہی ہوتے ہیں۔ صرف سردیوں کے کچھ دن ائرکنڈیشنر کے بغیر گزرتے ہیں۔ اس لیے یہ حال ہے کہ دو دن بغیر ائرکنڈیشنر کے گزارنے پڑے تو زکام ہو گیا۔ اب میں واپس اپنے ماحول میں آ گیا ہوں تو دو ایک دن میں ٹھیک ہو جاؤں گا"... پھر کریم بھائی گلنار کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ "میں تو کئی دفعہ میڈم سے بھی کہہ چکا ہوں کہ بالاخانے کو بھی ائرکنڈیشنڈ کروالیں اور اگر کنجوسی آڑے آتی ہے تو میں وہاں ائرکنڈیشنر لگوا دیتا ہوں مگر یہ مانتی ہی نہیں... حالانکہ اگر ایسا ہو جائے تو مجھ جیسے قدر دان دو گھڑی زیادہ بیٹھ لیا کریں گے۔"

"میں کہہ تو چکی ہوں سیٹھ صاحب کہ ہمیں سرد اور گرم دونوں ہی کا عادی رہنے دیں۔ ہر چیز کے دو پہلو ہیں اور انسان کو زندگی میں دونوں پہلوؤں کا عادی ہونا چاہیے،" گلنار بولی۔

میں سیٹھ کریم کی رنگت میں رچی ہوئی عجیب سی پیلا[ہٹ]
کو دیکھ رہا تھا اور حیرت سے سوچ رہا تھا کہ اس شخص نے اپنے
کو فطرت کی خوبصورتیوں اور زندگی کے مدو جزر سے کیوں دور
ہے؟ اسے شاید معلوم نہیں کہ نسیمِ سحری کیا ہوتی ہے۔ دھو[پ]
چلنے پھرنے یا کوئی اور جسمانی محنت کرنے سے کس طرح ہر م[سام]
سے پسینہ پھوٹتا ہے اور موسمِ بہار کی ہوائیں کیسی فرحت
ہوتی ہیں؟ اسے کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا۔ کتنا محروم اور
تھا، وہ شخص...

"سیٹھ صاحب!" گلنار بولی۔ "اس نوجوان کا نام
جمال ہے اور یہ ایک طرح سے میرا محسن ہے..." اس نے
طرف اشارہ کیا۔ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے تو اس پر
احسان نہیں کیا تھا بلکہ الٹا اس کے احسانات کے بوجھ
ہوا تھا۔ گلنار نے میری طرف توجہ دیے بغیر اپنی بات جا[ری]
رکھی۔ "میں چاہتی ہوں اسے تھوڑی سی شہرت مل جائے
شہرت حاصل کرنے کا شوق تو نہیں ہے لیکن ایک مصلحت
کے تحت ایسا کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ آپ اسے اپنی آ[ئندہ]
کسی فلم میں بطور ہیرو لوگوں سے متعارف کرا دیں۔ خواہ
بنے یا نہ بنے۔ اور اگر بنے تو بے شک آپ بعد میں اعلان
کر دیں کہ آپ نے اس کی جگہ کسی اور کو ہیرو لے لیا ہے
اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی..."

"اس کی کیا ضرورت ہے،" کریم بھائی مسکراتے ہو[ئے]
بولے۔ "ہم اس کی خاطر فلم بھی بنا دیں گے۔ مانا کہ نئے چہرے
کو ہیرو لینا بہت بڑا رسک ہے۔ فلم فلاپ بھی ہو سکتی
مگر تم کہہ رہی ہو تو یہ میرے لیے حکم ہے۔ مجھے نقصان
کوئی پروا نہیں۔ ویسے بھی تمھیں معلوم ہے کہ میری کمپنی
کبھی کوئی بوگس فلم اناؤنس نہیں کی۔ جو بھی اعلان کیا،
کے مطابق ہی فلم بنائی۔ جس سے جو بھی معاہدہ کیا، اس
کبھی خلاف ورزی نہیں کی..."

"بس... بس..." گلنار ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "جمال
لیے حقیقتاً فلم بنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اسے فلم میں
کرنے کا قطعاً شوق نہیں۔"

"اچھا...؟" کریم بھائی نے عینک کے موٹے مو[ٹے]
شیشوں کے عقب سے مجھے گھورا۔ ان شیشوں کی وجہ
اس کی ابھری ہوئی آنکھیں کچھ زیادہ ہی ابھری ہوئی دکھا[ئی]
دے رہی تھیں۔ پہلی مرتبہ وہ ٹھیک سے میرا جائزہ لے

ہوئے بولا "حالانکہ یہ تو بنا بنایا ہیرو ہے... میں اس کی ایکٹنگ دیکھے بغیر صرف اس کی شکل و صورت دیکھ کر ہی... سنجیدگی سے اسے ہیرو لینے کو تیار ہوں۔"

گلنار پہلو بدل کر بولی "میں نے کہا نا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ جمال کو فلم میں کام کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں، اگر کبھی ضرورت پڑی یا اس میں بھی کوئی مصلحت ہوئی تو کر لے گا لیکن فی الحال تو ہمیں صرف اس کی شخصیت کو سامنے لانا ہے۔ ان لوگوں میں وہ لوگ بھی شامل ہوں گے جنھیں درحقیقت ہم متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"تم کسی لمبے چکر میں ہو گلنار بیگم،" کریم بھائی نے گلنار کو گھورتے ہوئے سر ہلایا۔

"بس ابھی سے خون خشک ہونے لگا!" گلنار نے گویا کریم بھائی پر آنکھیں نکالیں۔

"تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں خواہ کیسا ہی ٹیڑھی پسلی کا آدمی ہوں لیکن مجھ میں ایک خوبی ضرور ہے کہ میں سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتا،" کریم بھائی مسکرائے۔

"میں تو مذاق کر رہی تھی،" گلنار بھی مسکرائی۔ "مجھے تمھاری اس خصوصیت پر تو حیرت ہوتی ہے کہ تمھارا خاندان ڈرپوک خاندان ہے مگر ایک تم نہ جانے کس طرح نڈر نکل آئے۔ مزید حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ تم اردو کافی حد تک صحیح بولتے ہو۔"

"ہاں، اپنی اس خصوصیت پر مجھے بھی حیرت ہوتی ہے۔" کریم بھائی ہنس کر بولے۔ "خیر... ہم پھر موضوع سے ہٹ گئے۔ میں کہہ رہا تھا کہ خواہ تم کسی بھی چکر میں ہو؟ میں اس میں ملوث ہونے سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم اپنے آپ کو کسی مصیبت میں نہ پھنسا لینا۔"

"انسان اپنے آپ کو مصیبت میں نہیں پھنساتا، مصیبتیں خود ہی انسان کو پھانس لیتی ہیں،" گلنار مسکرائی۔ "تم اس کی فکر چھوڑو۔ تمھیں کرنا صرف یہ ہے کہ اپنی کمپنی کے تحت کچھ دن کے لیے اپنی ایک فلم کی ایڈوانس پبلسٹی کرا دو۔ فلم کا نام ہوگا 'ڈائری کی تلاش'۔ ہر اخبار اور رسالے میں اس فلم کا اشتہار آنا چاہیے۔"

"ڈائری کی تلاش..." کریم بھائی نے زیرِ لب دہرایا۔ "نام تو کچھ عجیب سا ہے لیکن اس میں تھوڑا سا سسپنس بھی ہے... صرف اسی بنا پر فلم ہٹ ہو سکتی ہے۔"

"تم پھر اس طرح سنجیدہ ہونے لگے ہو جیسے واقعی تمھیں فلم بنانی ہے،" گلنار تیوری چڑھا کر بولی۔ "میں نے کہا نا کہ یہ محض چند دن کا چکر ہے۔ چند دن میں بات صاف ہو جائے گی۔"

"میرا کوئی بھروسا نہیں کہ میں اس نام پر فلم بنا ہی ڈالوں،" کریم بھائی بولے۔

"وہ تو تم سے بعید نہیں لیکن فی الحال ہمیں صرف اپنے مسئلے سے دلچسپی ہے،" گلنار نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "میں کہہ رہی تھی کہ فلم کے اشتہاروں کے ساتھ ساتھ اخبارات و رسائل میں جمال کی تصویروں کے ساتھ خبریں اور مختصر سے انٹرویو بھی آنے شروع ہو جائیں کہ فلاں ہدایت کار کا دریافت کردہ نوجوان فلم 'ڈائری کی تلاش' میں جلوہ گر ہو رہا ہے جو فلم انڈسٹری کی تاریخ کی زبردست اور سب سے سنسنی خیز فلم ہوگی، وغیرہ... وغیرہ..."

"اس کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔ میرا پبلک ریلیشنز منیجر اس قسم کی تشہیری مہمات چلانے میں ماہر ہے،" کریم بھائی بولے۔ "میں ابھی اسے بلا کر اس سلسلے میں ضروری ہدایات دے دیتا ہوں۔ اسٹل فوٹوگرافر ابھی آ کر جمال میاں کی چند تصاویر بنا لے گا۔ پبلک ریلیشنز منیجر کو جمال میاں اپنے متعلق چند ضروری باتیں بتا دیں گے، جنھیں خبروں اور انٹرویوز میں اجاگر کرنا ضروری ہو گا اور بس... کل سے تشہیری مہم شروع ہو جائے گی۔"

جس کام کو میں خاصا مشکل سمجھ رہا تھا، کریم بھائی اس کا تذکرہ نہایت سرسری انداز میں کر رہے تھے اور طرزِ عمل سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہ واقعی ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

چند لمحے بعد سیٹھ کریم بھائی نے انٹرکام پر کسی سے بات کی۔ فوراً ہی ایک خوش لباس اور چرب زبان سا شخص اندر آیا اور ایک ڈائری اور پنسل سنبھال کر میرا انٹرویو لینے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے سب بنیادی باتیں بتا دی جائیں، ان کی مدد سے وہ خود ہی تفصیلی انٹرویو تیار کرکے خاص خاص اخبار نویسوں کو پہنچا دے گا جو نوک پلک سنوار کر اسے استعمال کریں گے۔ اس نے مجھ سے جو سوالات کیے ان کے زیادہ تر جواب گلنار نے دیے۔ ایک سوال کے جواب میں گلنار نے مجھے سی ایس پی آفیسر کا بیٹا بنا دیا حالانکہ میرا باپ بے چارہ ایک غریب کاشتکار تھا اور اسے کسی سی ایس پی آفیسر سے شرفِ ملاقات تک حاصل نہیں ہوا تھا۔ سیٹھ صاحب کا پبلک ریلیشنز منیجر میرا انٹرویو لے چکا تو ایک فوٹوگرافر بھی آن پہنچا۔ اس نے وہیں ایک چھوٹے سے اسٹینڈ پر لائٹس فٹ کرکے مختلف زاویوں سے میری تصویریں اتاریں اور چند منٹ میں میرا کام ختم ہو گیا۔

وہ دونوں آدمی چلے گئے۔

"بس... اب تمھارا کام ختم ہے" کریم بھائی مسکراتے ہوئے گلنار سے مخاطب ہوئے۔ "اب میرے آدمیوں کا کام شروع ہو گیا۔"

کچھ دیر بعد گلنار نے بھی اجازت طلب کی۔ کریم بھائی نے بادلِ نخواستہ اجازت دی اور ساتھ ہی بتا دیا کہ وہ جلد ہی گلنار کے بالاخانے پر آئیں گے۔

باہر آ کر ہم برآمدے میں رُک گئے۔ گلنار ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "تمھیں شاید کریم بھائی کی شخصیت مضحکہ خیز لگی ہو لیکن یہ ہیرا آدمی ہے، ہیرا۔ اب مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ اتنا بے لوث اور بے غرض آدمی ہے کہ بعض اوقات تو مجھے اس پہ حیرت ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگ عام طور پر اب صرف خوابوں ہی میں ملتے ہیں۔ اس نے میرے کئی ایسے کام کیے ہیں جن میں اس کے لاکھوں روپے خرچ ہوئے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے کبھی اس کا صلہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی اس نے میری طرف دستِ طلب نہیں بڑھایا۔ کبھی مجھ سے شادی کی درخواست نہیں کی۔ غرضیکہ اس نے کبھی انسانی وقار کی سطح سے گر کر کوئی بات نہیں کی۔ حالانکہ میں کیا ہوں؟ بظاہر ایک ذرا بہتر درجے کی طوائف... اور طوائف تو بہرحال طوائف ہی ہوتی ہے۔ اگر میں کسی کے سامنے یہ جتانے کی کوشش کروں کہ میں بڑی باعزت اور... نیک عورت ہوں تو وہ مجھ پر ہنسے گا لیکن یہ جو سیٹھ کریم ہے نا... یہ واقعی تہِ دل سے میری عزت کرتا ہے۔ بس گانا سُنتا ہے، سر دُھنتا ہے اور چلا جاتا ہے۔"

"پھر تو واقعی حیرت انگیز آدمی ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"زیادہ حیرت مجھے اس بات پہ ہے کہ جس برادری سے اس کا تعلق ہے، اس کے لوگ گانا وغیرہ سُننے یا اس قسم کے دیگر فضول مشاغل کی طرف قطعاً توجہ نہیں دیتے اور پیسہ دانتوں سے پکڑ کر خرچ کرتے ہیں۔ جوں جوں دولت بڑھتی جاتی ہے، توں توں کنجوسی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ دوسروں پر تو کیا خود اپنی ذات پر بھی خرچ نہیں کرتے... ایک سیٹھ کریم ہے جو میرے ایک اشارے پر سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔" وہ ایک طویل سانس لے کر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ "سیٹھ کریم مجھے اتنا اچھا لگتا ہے کہ کئی بار میں سنجیدگی سے سوچ چکی ہوں کہ اگر میرے حالات اجازت دیتے اور اس نے مجھ سے درخواست کی ہوتی تو میں اس سے شادی کر لیتی۔"

میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ "شادی... سیٹھ کریم سے" میں نے حیرت سے کہا۔

"کیوں؟ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" اس نے شر... مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

"نہیں... میں حیران نہیں ہوں۔" میں نے جلدی سے ک... "میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی شخصیت..." میں نے جم... ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا ہوا اُس کی شخصیت کو؟ شخصیت تو دراصل آدمی کے ... اندر ہوتی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "عام طور پہ جہاں تک آدمی کی نظر ... جاتی ہے، وہ صرف جسم ہی ہوتا ہے۔" پھر اس نے سر جھٹک د... "خیر... چھوڑو اس بحث کو۔ کیا خیال ہے، اب ذرا دوسرے مس... کی فکر کی جائے۔ وہ کون سے فلور کی چھت تھی جس پر تم نے ٹوٹ... پھوٹے فرنیچر کا انبار دیکھا تھا؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

اُسے ساتھ لے کر میں فلور نمبر چھ کی عمارت کے عقب... میں پہنچا۔ سیڑھیوں کی طرف حسبِ معمول ویرانی تھی۔ یہاں ایک... متروک سا گیراج تھا جس کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک... نیم شکستہ سی بینچ پڑی تھی۔ "اس پر بیٹھ جاؤ۔" میں نے بی... کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گلنار سے کہا۔ "اور کوئی سیڑھیوں... رُخ کرے تو اُسے باتوں میں لگا کر روکنے کی کوشش کرنا۔"

دھڑکتا دل لیے میں محتاط انداز میں چھت پر پہنچا تو... میرا دل ڈوب گیا کہ وہاں کہیں فرنیچر کا انبار تو کیا، کرسی کی ایک... ٹوٹی ہوئی ٹانگ تک نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں نے گو... آنکھوں پر اعتبار نہ کرتے ہوئے، احمقوں کی طرح پوری چھ... کا چکر لگا کر دیکھا۔ وہاں واقعی فرنیچر کا نام و نشان تک نہیں... میں مایوسی و پژمردگی کے عالم میں سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گی... میں نے دیکھا ایک مزدور قسم کا آدمی ایک ہاتھ گاڑی پر کچھ پُرا... اینٹیں لادے لیے آ رہا تھا اور وہ گلنار کی طرف شک آمیز نظر... دیکھ رہا تھا۔ میں جب نیچے پہنچا تب تک وہ ہاتھ گاڑی کھڑی کر... اس سے اینٹیں اُتار اُتار کر اس متروک گیراج میں پھینکنے لگا... اب وہ ترچھی ترچھی نظر سے میری طرف بھی دیکھنے لگا تھا۔... نے اس سے گفتگو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"سنو یار...!" میں نے اس کے قریب پہنچ کر دوست...

لہجے میں کہا۔ "وہ جو اُوپر چھت پر ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کا انبار پڑا تھا، وہ کہاں گیا؟"

"کیوں جی؟ آپ کو اُس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟" مزدور نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ گویا وہ کوئی سادہ لوح قسم کا آدمی نہیں تھا۔

میں نے دس کا ایک نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھا اور بے پروائی سے کہا۔ "وہ یار... میاں صاحب ہیں نا... چندا پروڈکشنز والے، اُن کو اپنی ایک فلم کے سین کے لیے بہت سا ٹوٹا پھوٹا فرنیچر چاہیے تھا۔ پراپرٹی رُوم میں تو اتنا کاٹھ کباڑ ہے نہیں، اس لیے میں یہاں دیکھنے چلا آیا تھا۔"

چندا پروڈکشنز کا میں نے ایک دفتر پر بورڈ دیکھا تھا، لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں کوئی میاں صاحب بھی بیٹھتے تھے یا نہیں۔ تاہم وہ مزدور ٹائپ آدمی بالکل مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ معلوم نہیں میرا بہانہ کارگر رہا تھا یا دس روپے کے نوٹ نے اُسے اطمینان دلایا تھا۔

"تمھیں اس کاٹھ کباڑ کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟" میں نے نہایت دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں جی... اچھی طرح معلوم ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "وہ کاٹھ کباڑ چودھری فضل داد نے خرید لیا ہے۔ انھیں اس ٹوٹے پھوٹے فرنیچر سے کوئی سیٹ تیار کرنا تھا لیکن صاحب... عجیب بات یہ تھی کہ انھوں نے وہ کاٹھ کباڑ نیچے کسی فلور پر منگوانے کی بجائے اپنے گھر بھجوا دیا تھا۔ میں ہی ٹرک پر لاد کر لے گیا تھا۔ وہ کاٹھ کباڑ اسٹوڈیو کی ملکیت تو تھا نہیں، ایک فلم ساز شریف بابو کا تھا۔ چودھری صاحب نے انھیں کچھ رقم بھجوا دی تھی۔"

"خیر... کوئی بات نہیں۔" میں نے بدستور بے پروائی سے کہا۔ "میں چودھری صاحب سے معلوم کر لیتا ہوں۔ وہ اپنے دار ہی ہیں۔ اس وقت شاید دفتر ہی میں بیٹھے ہوں گے۔"

"دفتر تو انھوں نے چھوڑ دیا ہے جی۔" وہ شخص تیزی سے بولا۔ "بلکہ شاید بیچ دیا ہے۔"

"تمھیں اُن کا گھر معلوم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں... میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ وہ کاٹھ کباڑ میں ہی اُن کے گھر پہنچا آیا تھا۔ وہ زیادہ دُور نہیں رہتے، یہیں ملتان روڈ پر رہتے ہیں۔" وہ مجھے ایڈریس سمجھانے لگا۔

ایڈریس سمجھنے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ چودھری کے گھر پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور گلنار کو ساتھ لے کر اسٹوڈیو کے مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر چودھری کے گھر کی طرف جاتے وقت میرا دل ایک بار پھر بوجھل سا تھا۔ اُمید و نااُمیدی، کامیابی اور ناکامی کی ایک عجیب کش مکش تھی جس سے میں دوچار تھا۔ کہیں ذرا اُمید کی کرن دکھائی دینے لگتی تو جھٹ سے جیسے کوئی غیبی طاقت آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ آنکھ مچولی کب تک جاری رہے گی؟ منزل کا ذرا سا سُراغ ہاتھ لگتا تھا اور میں خوشی خوشی آگے بڑھتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ سُراغ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔

چودھری کا مکان متوسط درجے کی ایک کالونی میں تھا۔ ایک صاف ستھری گلی میں خاصا قرینے کا مکان تھا۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبایا تو آٹھ دس سال کا ایک بچہ باہر آیا۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ چودھری صاحب گھر پر ہیں۔

"اُن سے کہو کہ اسٹوڈیو سے مسٹر جمال اور میڈم گلنار آئی ہیں۔" میں نے بچے سے کہا۔

وہ مستعدی سے اندر چلا گیا اور چند لمحے بعد اُس نے ڈرائنگ رُوم کا دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر ایک صوفے پر جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر بعد چودھری فضل داد کچھ اس طرح ہچکچاہٹ آمیز انداز میں اندر آیا گویا کسی اور کے گھر میں داخل ہو رہا ہو اور وہ بھی چوری چھپے۔ غالباً وہ بے چارا اُلجھن میں تھا۔ میرا نام شاید وہ بھول چکا تھا اور گلنار کا نام تو اس کے لیے تھا ہی اجنبی...

"آپ نے مجھے پہچانا؟" میں نے اُٹھ کر اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

اُس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی پیشانی سے شکنیں دُور ہو گئیں اور وہ قدرے پُرجوش لہجے میں بولا۔ "ارے... تم تو وہی نسیم جمال ہو جسے میں سائیڈ ہیرو کا چانس دے رہا تھا اور تم نہ جانے کیا کیا پھڈے کر کے کہیں غائب ہو گئے تھے۔"... پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ "بیٹھو... بیٹھو، کیسے آنا ہوا؟ اور یہ خاتون کون ہیں؟"

"یہ میری دوست اور ہمدرد ہیں۔ گلنار... فی الحال ان کا اتنا ہی تعارف کافی ہے۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور اب آپ نے یہ سوال کر ہی لیا ہے کہ کیسے آنا ہوا تو میں بھی بلاتمہید عرض کر دوں کہ میں درحقیقت نازو کی تلاش میں نکلا ہوں جس

کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ میں نے سوچا شاید آپ کو اس کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہو جس سے ہمیں اس کی تلاش میں کوئی مدد مل سکے۔ آپ ہی نے اُسے متعارف کرایا تھا۔ آپ تو اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوں گے۔"

"غلط فہمی ہے بھائی تمھاری۔" چودھری ایک آہ بھر کر بولا۔ "حقیقت یہ ہے کہ میں نے اُسے نہیں بلکہ اُس نے مجھے متعارف کرایا تھا۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک اُٹھا۔

"مطلب یہ کہ وہ میری پہلی فلم کی ہیروئن ہی نہیں بلکہ اس کی فنانسر بھی تھی۔ میری وہ پہلی کامیاب فلم جو شاید میری آخری فلم بھی ہو، مکمل طور پر اُسی کے پیسے سے بنی تھی۔"

"یہ نازو کے فنانسر ہونے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے اُلجھن سے کہا۔ "میری معلومات کے مطابق وہ کرشن نگر کے ایک عسرت زدہ مکان سے فلمی دُنیا میں آئی تھی اور وہ مکان بھی اُس کا اپنا نہیں تھا۔"

"پہلے پہل تو یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔" وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "بہرحال، میں تمھیں شروع سے بتاتا ہوں۔ میں نے پہلی مرتبہ اُسے ایک فلم کے سیٹ پر دیکھا تھا۔ اس وقت میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوا کرتا تھا۔ وہ نہایت انہماک سے شوٹنگ دیکھ رہی تھی اور سیٹ پر موجود بیشتر افراد نہایت انہماک سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ شوٹنگ ختم کر کے میں سیٹ سے نکلا تو وہ میرے پیچھے ہی آ گئی اور اطمینان سے بولی: 'اگر میں سرمایہ لگاؤں تو کیا آپ میرے لیے فلم ڈائریکٹ کرنا پسند کریں گے؟' میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"پھر آپ نے کیا کیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"بہت دیر تک تو میں کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "پھر میں نے اُسے پرکھنے کی غرض سے کہا: 'یہ فلمی دُنیا ہے۔ نئے آنے والوں کو یہاں روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے۔' مگر وہ ذرا نہیں ہچکچائی۔ کہنے لگی: 'میں روپیہ پانی ہی طرح بہاؤں گی۔' اور واقعی میری فرمائش پر وہ دوسرے دن ایک عام سے بیگ میں پانچ لاکھ روپیہ لے کر آ گئی۔ ساتھ ہی اس نے مجھے تسلی دی کہ ضرورت پڑنے پر مزید رقم بھی آتی رہے گی۔ پہلی فلم کی کہانی کا پلاٹ اُسی نے دیا تھا۔ اس کی فرمائش بس یہی تھی کہ ہیروئن وہ خود ہو گی۔ نئی ہونے کے باوجود اُس نے غضب کا کام کیا اور فلم سپرہٹ گئی۔ دوسری فلم کا کام ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ تم بیچ میں ٹپک پڑے اور فلم شروع ہونے کی بجائے پھڈے شروع ہو گئے۔ تمھارا آنا میرے حق میں کچھ اچھا ثابت نہیں ہوا۔ میں تقریباً برباد ہو گیا ہوں۔"

"آپ خاطر جمع رکھیں۔" میں نے کہا۔ "میں اور میری ساتھی گلنار شاید ایک فلم شروع کر دیں۔ اس کی پبلسٹی جلد ہی شروع ہو رہی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس فلم کے ذریعے آپ کو بطور ہدایت کار قدم جمانے کا موقع مل جائے۔"

چودھری فضل داد کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، میں نے جلدی سے کہا۔ "وہ اسٹوڈیو میں چھت پر جو ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کا انبار پڑا تھا، میں نے سنا ہے کہ وہ آپ نے خرید لیا ہے؟"

"ہاں... خریدا تو تھا... کیوں؟" اُس نے چونک کر پوچھا۔

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم اُس کاٹھ کباڑ کی مدد سے ایک انوکھا سیٹ تیار کرنا چاہ رہے تھے۔ میں نے سوچا ذرا پتہ کر لوں۔ اگر آپ کا کام ہو گیا ہو تو وہ انبار ہم خرید لیں۔"

"وہ تو میں نے ایک کباڑی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا بھائی۔" چودھری ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "وہ کاٹھ کباڑ تو میرے لیے ایک مصیبت کا باعث بن گیا تھا۔ میں نے بھی اُسے درحقیقت اپنے لیے نہیں خریدا تھا... ایک دوست کو آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے دیا تھا اور استعمال کے لیے آئیڈیا بھی میں نے ہی دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے وہ کاٹھ کباڑ اُٹھا کر گھر کے پچھلے حصّے میں ڈلوا دیا تھا کہ جب کسی کباڑی سے بات ہو جائے گی تو اُٹھوا دوں گا مگر اُسی رات تین آدمی رات کے پچھلے پہر دروازہ توڑ کر دندناتے ہوئے اندر آ گئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ اُس فرنیچر میں سے مجھے جو ڈائری ملی ہے، وہ میں اُن کے حوالے کر دوں۔ میری بیوی کی تو خوف سے حالت غیر ہو گئی۔ میں بھی کافی خوفزدہ ہوا۔ بڑی مشکل سے میری بیوی نے رو پیٹ کر اور میں نے منت سماجت کر کے اُنھیں یقین دلایا کہ مجھے فرنیچر سے کوئی ڈائری نہیں ملی۔ اس کے باوجود اُنھوں نے وہ انبار خود کھنگالا۔ ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے وہ تمام حصّے جو ذرا بھی سلامت تھے اور جن میں کوئی چیز چھپائی جا سکتی تھی، وہ اُنھوں نے توڑ ڈالے، ہر پوشش اُدھیڑ ڈالی پھر اُنھوں نے گھر کی مکمل تلاشی لی۔ تلاشی کا انداز ایسا تھا کہ اگر مطلوبہ ڈائری سوئی سے چھوٹی ہوتی تب بھی اُنھیں مل جاتی۔ صبح کا اُجالا نمودار ہونے پر بالآخر اُنھوں نے ہماری جان چھوڑی اور رخصت ہو گئے۔ میری بیوی نے اسی روز ایک کباڑی کو بلوا کر اونے پونے وہ انبار اُٹھوا دیا۔"

میں نے مایوسی سے گلنار کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی مایوسی تھی۔ ڈائری سے متعلق جو خیال اس کے ذہن میں آیا تھا، وہ ہمارے نادیدہ اور نامعلوم دشمنوں کے ذہن میں پہلے ہی سے آ گیا تھا اور وہ اس سلسلے میں عملی قدم بھی اُٹھا چکے تھے۔

اس دوران میں چائے اور لوازمات آ چکے تھے اور ہم چائے پی بھی چکے تھے۔ دفعتاً گلنار کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولی۔ "چودھری صاحب، دوسری فلم آپ نے کتنی بنائی تھی؟"

"اس کی صرف تین ریلیں بن سکی تھیں۔" چودھری آہ بھر کر بولا۔

"اگر آپ وہ ریلیں ہمیں دکھا دیں تو شاید ہم اُنھیں خرید لیں۔" گلنار بولی۔

"ان کا آپ کیا کریں گی میڈم؟"

"یہ سوچنا ہمارا کام ہے۔" گلنار ملائمت سے بولی۔ "ہم ان ریلوں کا شاید کوئی مصرف نکال لیں۔ وہ ریلیں ہیں کہاں؟"

"وہ ایڈٹ ہو کر اور ڈویلپ ہو کر اسٹوڈیو ہی میں پڑی ہیں... وہیں دیکھ کر فیصلہ کر لیجیے گا کہ وہ آپ کے کام آ سکتی ہیں یا نہیں۔ میں کل صبح پروجیکشن روم کے آپریٹر سے بات کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" گلنار بولی۔ "اب ہم چلتے ہیں۔ کل چار بجے آپ سے پروجیکشن روم میں ملاقات ہو گی۔"

"میں انتظار کروں گا۔" چودھری نے پُراشتیاق لہجے میں کہا اور ہمیں چھوڑنے دروازے تک آیا۔

وہ واپس اپنے گھر میں چلا گیا تو گلنار میرے ساتھ گلی میں چلتے ہوئے بولی۔ "شاید اُن تین ریلوں میں ہمیں نازو کے متعلق کوئی سُراغ مل جائے۔"

"میں تمھارا مطلب سمجھ گیا تھا۔ تم نے اچھا کیا کہ یہ بات کر لی۔" میں نے اس کی ذہانت کو سراہا۔ ہم ٹیکسی کی تلاش میں ملتان روڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"ہمیں نازو کی پہلی فلم بھی دیکھنی چاہیے۔" گلنار نے کہا۔ "تم نے دیکھی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن مجھے اس کا نام معلوم ہے۔ 'آخری تصویر' غیر روایتی سا نام ہے۔ شاید یہ فلم اب بھی شہر کے کسی نہ کسی سینما ہاؤس میں لگی ہوئی ہو۔ اخبار کے کسی کونے کھدرے میں شاید ہمیں اس کا اشتہار بھی نظر آ جائے۔"

"تب تو ہم اسے ضرور دیکھیں گے اور بہت باریک بینی سے دیکھیں گے۔" وہ فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔ اِس اثنا میں ہم ملتان روڈ پر پہنچ چکے تھے اور سڑک کے کنارے کنارے کچے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ ہمارے قریب سے ہر قسم کی گاڑیاں گزرتی جا رہی تھیں اور خوب دھول اُڑاتی جا رہی تھیں جس سے بے حد کوفت ہو رہی تھی اور میں دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ جلد از جلد ٹیکسی مل جائے۔

وہ میری چھٹی حس تھی یا قدرت کا اشارہ... کہ یکلخت میرے اعصاب میں ہلچل مچ گئی جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ جنگل میں، درندوں کو بھی شاید کچھ اسی انداز میں نادیدہ خطروں کا احساس ہوتا ہو گا۔ یک لخت میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے اپنے عقب میں انجن کی مدھم سی غراہٹ سُنی تو پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر گلنار کو ایک عمارت کی طرف دھکیلا اور خود بھی دیوار سے چپک گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ دیو پیکر سُرخ گاڑی ایک زناٹے سے ہمیں چھوتی ہوئی گزرتی چلی گئی۔ ایک منٹ کے لیے تو ہم گرد و غبار کے بادل میں چھپ کر رہ گئے۔ جب تک گرد و غبار کے بادل چھٹا تب تک وہ گاڑی غائب ہو چکی تھی۔ یہ اندازہ کرنا ایک بچّے کے لیے بھی آسان تھا کہ وہ گاڑی خصوصاً ہم دونوں کو لپیٹ میں لینے کے لیے لہریا لے کر سڑک سے کچے میں اُتری تھی۔ اگر بروقت قدرت کا اشارہ نہ ہوتا اور میری چھٹی حس اور درندوں کی سی جبلّت نے مجھے خبردار نہ کیا ہوتا تو شاید ہم راہیٔ مُلکِ عدم ہو چکے ہوتے۔

میرے اندازے کے مطابق گلنار نہایت مضبوط اعصاب کی عورت تھی لیکن اس وقت اس کی رنگت بھی زرد پڑ گئی تھی۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "حوصلہ

رکھو گلنار! جب تک خدا کو منظور نہیں، تب تک کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔"

اس کے چہرے پر رونق لوٹ آئی اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر مسکراتے ہوئے بولی: "میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ بس ذرا اعصاب کو دھچکا سا لگ گیا تھا۔ اب میں بالکل... ٹھیک ہوں۔"

میں دل ہی دل میں اس عورت کی ہمت کو سراہے بغیر نہ رہ سکا... ہم چند منٹ وہیں دیوار سے لگے کھڑے رہے۔ بالآخر ایک خالی ٹیکسی نظر آگئی جس میں بیٹھ کر ہم اُس جگہ واپس آگئے، جہاں میرا قیام تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی گلنار برقع اتار کر تھکے تھکے انداز میں صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔ میں نے بستر پر اُس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا: "میں نے ایک فیصلہ کیا ہے گلنار! میری وجہ سے تمھارے لیے بھی خطرات بڑھتے جا رہے ہیں اس لیے اب میں تمھاری مدد اور امانت سے دست بردار ہو جاؤں تو اچھا ہے... میری مدد کرنے کے چکر میں کہیں تمھیں بھی کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔"

"زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ مربیانہ انداز میں مسکرائی۔ "اب میں جہاں پہنچ چکی ہوں، وہاں سے واپسی کا مشورہ دینا فضول ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں تمھاری مدد کر کے تم پر احسان نہیں کر رہی ہوں۔ میرے حالات ایسے ہیں کہ مجھے کسی بھی وقت تمھاری مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اُس وقت میں تمھیں سہارا بنانے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاؤں گی۔ اب میں تمھارا ساتھ چھوڑنا چاہوں بھی تو نہیں چھوڑ سکتی کیونکہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں اُن کی نظر میں آچکی ہوں۔ میں نے تمھیں ایک بات نہیں بتائی تھی، اب بتاتی ہوں... جب سے میں نے تمھیں پناہ دی ہے، میں محسوس کر رہی ہوں کہ کوئی غیر مرئی طاقت میری نگرانی کر رہی ہے۔ اکثر مجھے وہم ہوتا ہے کہ دو آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں لیکن میں کوشش کے باوجود نہیں جان پاتی کہ وہ آنکھیں کس کی ہیں اور کہاں سے مجھے دیکھ رہی ہیں، وہ شخص کس طرح میری نگرانی کر رہا ہے؟ ابھی تک شاید کسی مصلحت کے تحت انھوں نے مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی میرے توسط سے تمھارا ٹھکانہ معلوم کرنے کے لیے کوئی قدم اُٹھایا ہے۔ لیکن اب شاید یک دم ہی انھوں نے کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب ہمیں بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آنا ہوگا!"

اس نے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی اس لیے میں نے اس موضوع پر بحث نہیں کی اور ایک لمحے کے توقف کے بعد پوچھا: "کیا خیال ہے، فلمی ہیرو کے طور پر شہرت پانے سے واقعی مجھے کوئی فائدہ ہوگا؟"

"ہماری جان کے لیے تو شاید خطرہ اور بڑھ جائے لیکن کم از کم بے یقینی کی کیفیت تو ختم ہوگی۔ انھیں جو کچھ بھی کرنا ہو گا یک دم کر گزرنے کی کوشش کریں گے اور اس چکر میں ان سے ضرور کوئی غلطی سرزد ہوگی اور ہمیں شاید اُس سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل جائے۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "بہرحال، میں نے تو آپ اپنی جان کی پروا کرنی چھوڑ دی ہے۔ زندگی ہر طرح سے خطرے میں ہے، کھل کر کوئی معرکہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ بس مجھے صرف تمھاری فکر تھی۔ اب تم نے بھی مجھے اپنی طرف سے بے فکر کر دیا ہے۔"

"اچھا میں اب چلتی ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تمھیں تنہا نہیں جانے دوں گا۔" میں نے کہا اور ساتھ جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اب تم کہاں جاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"آج شام بالاخانے میں بیٹھنے کا پروگرام نہیں۔ میں بہت تھک چکی ہوں۔ میرا اصل گھر راوی روڈ پر ہے۔ عام حالات میں، میں وہیں رہتی ہوں اور اس وقت میں وہیں جا رہی ہوں۔"

"میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔

ایک تانگے میں بیٹھ کر ہم راوی روڈ پہنچے۔ یہ مختصر سا سفر خیریت سے ہی کٹ گیا۔ ایک چھوٹے مگر خوب صورت مکان کے سامنے تانگہ رکوا کر اترتے ہوئے گلنار بولی: "یہاں میں اپنے چند قریبی عزیزوں کے ساتھ رہتی ہوں اور یہاں کسی بھی اجنبی کو مدعو نہیں کرتی۔ تم میرے لیے نہ سہی لیکن میرے عزیزوں اور پاس پڑوس والوں کے لیے اجنبی ہو، اس لیے تمھیں اندر آنے اور چائے وغیرہ پینے کی دعوت نہیں دے رہی۔ بُرا مت مان جانا۔"

"نہیں۔ اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "ہر انسان کی اپنی کچھ مصلحتیں ہوتی ہیں۔ تم جس حد تک میرا ساتھ دے رہی ہو، میرے لیے وہی کافی ہے۔"

"پھر شروع کر دیں رسمی باتیں۔" وہ خفگی سے بولی اور تانگے سے اُتر کر مکان کی طرف چل دی۔ تانگہ آگے بڑھتا چلا گیا اور میری ہدایت کے مطابق دوسری گلی میں گھوم کر کوچوان نے تانگہ موڑ لیا۔

سرکلر روڈ پر پہنچ کر اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ کئی دن سے مجّو پہلوان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ یقیناً میری طرف سے پریشان ہوں گے۔ بھاٹی وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا میں نے فوراً تانگے والے کو اسی طرف چلنے کے لیے کہہ دیا۔

مجّو پہلوان کے اکھاڑے میں رونق شروع ہو چکی تھی۔ چند پہلوان کسرت اور زور آزمائی میں مصروف تھے۔ ان میں سے چند ایک جو میرے شناسا تھے، بڑی گرم جوشی سے ملے اور تقریباً اُٹھا پٹخ کے سے انداز میں بغل گیر ہوئے۔ وہ سب یہی پوچھ رہے تھے کہ میں اتنے دنوں سے اکھاڑے کیوں نہیں آ رہا؟ انھیں پہلے سے سوچے ہوئے بہانوں سے مطمئن کرنے کے بعد میں حجرہ نما کمرے کی طرف بڑھا۔ مجّو پہلوان ابھی اندر ہی تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ چوبی تخت سے اُترے اور یوں گلے ملے جیسے برسوں سے بچھڑا ہوا باپ برسوں سے بچھڑے ہوئے بیٹے سے مل رہا ہو۔ آرام سے بیٹھنے کے بعد انھوں نے حکم دیا: "مجھ سے آخری ملاقات کے بعد سے اب تک تم پر جو گزری ہے فوراً تفصیل سے سنا ڈالو۔ تم جانتے نہیں کہ میں تمھارے بارے میں کس قدر پریشان رہا ہوں۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر میں نے انھیں وہ تمام واقعات سنا دیے جو اب تک مجھے پیش آچکے تھے۔

"حیرت ہے۔" وہ میرے خاموش ہونے پر بولے۔ "تمھاری زندگی تو ایک سنسنی خیز ڈرامہ بنتی جا رہی ہے۔"

"ڈرامہ تو نہیں ایک طویل فلم کہو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "معلوم نہیں ابھی اس فلم کی کتنی شوٹنگ باقی ہے۔"

"لیکن اس اعتبار سے تو بے حد خوش قسمت ہو کہ زندگی کے ہر موڑ پر تمھیں بہت اچھے اور ہمدرد ساتھی مل رہے ہیں۔ یہ گلنار بھی بڑی ہیرا عورت معلوم ہوتی ہے۔" مجّو پہلوان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے اُستاد۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "شاید تم اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکو۔"

"کہو... مجھ سے کچھ کہتے ہوئے اتنا ہچکچانے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ فوراً بولے۔

"ویسے تو مجھے خدا کی ذات اور اپنی جسمانی طاقت اور صلاحیت پر بھروسا ہے پھر بھی مجھے اپنے پاس کسی آتشیں ہتھیار کی کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ حالات نہ جانے کیا رُخ اختیار کریں۔ بعض اوقات ایسے کسی ہتھیار کی موجودگی ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔" میں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔" مجّو پہلوان لاپرواہی سے بولے۔ ان کا کچھ سامان یہاں ڈیرے پر بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ اُٹھے اور چوبی تخت سے اُتر کر انھوں نے تخت کے نیچے رکھا ہوا ایک ٹرنک کھینچ کر نکالا اور اُسے کھول کر چند کپڑے اِدھر اُدھر ہٹائے تو نیچے دو ریوالور پڑے نظر آئے۔ انھوں نے دونوں ریوالور نکال کر میرے سامنے ڈال دیے۔ "ہمیں ہر قسم کے حالات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، اس لیے ہر چیز اپنے پاس رکھنی پڑتی ہے۔" استاد بولے۔ "ویسے یہ میرے نہیں ہیں۔ میں نے یہ مختلف اوقات میں دو بدمعاشوں سے چھینے تھے۔ یہ سوچ کر رکھ لیے تھے کہ کبھی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے اور اسی خیال سے ان کی گولیاں بھی منگوا لی تھیں۔" انھوں نے گتّے کے دو ڈبے بھی نکال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ ان میں دونوں ریوالوروں کے لیے گولیاں موجود تھیں۔ "تمھیں جو بھی بہتر لگے وہ رکھ لو۔" مجّو پہلوان میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔ "ویسے میرے پاس ایک ذاتی ریوالور بھی ہے اس کا لائسنس بھی ہے لیکن وہ میرے گھر پر ہے۔ کہو تو کل وہ بھی لے آؤں۔"

"بس... میرے خیال میں یہ ٹھیک رہے گا۔" میں نے وہ ریوالور اُٹھا لیا جو نسبتاً چھوٹا تھا۔ میں نے اسے واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ سرسری نگاہ میں کسی کو اُس کی موجودگی کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری جیب میں، میں نے اتنی گولیاں ڈال لیں کہ جیب پھولی پھولی سی نظر نہ آئے اور ریوالور کو لوڈ بھی کر لیا۔ اپنے اس انتظام سے میں نے بڑی طمانیت اور اعتماد محسوس کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے پہلوان جی سے اجازت طلب کی۔ وہ مجھے رخصت کرنے اکھاڑے کے دروازے تک آئے۔ پھر انھیں جیسے کچھ یاد آیا۔ چونکتے ہوئے

بولے "تمھاری وہ امانت بھی تو رکھی ہے۔ وہ نہیں لے جاؤ گے؟" ان کا اشارہ پچاس ہزار کی رقم کی طرف تھا۔

"ابھی رہنے دو۔ فی الحال گزارہ ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ انھوں نے بہت سی دُعاؤں کے ساتھ مجھے رُخصت کیا اور میں پیدل ہی شاہی بازار جانے کے ارادے سے فٹ پاتھ پر چل پڑا۔

میں اس وقت مقامی پوسٹ آفس کی عمارت کے قریب سے گزر رہا تھا اور اپنی دانست میں چیتے کی طرح چوکنا تھا۔ اچانک ہی کوئی چیز سنسناتی ہُوئی میری ناک سے بمشکل ایک انچ کے فاصلے سے گزر گئی اور میں ہڑبڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پوسٹ آفس بند تھا۔ میں نے دیکھا کہ پوسٹ آفس کی دیوار سے تھوڑا سا پلاسٹر اُکھڑ کر گر چکا تھا ... وہ جگہ کچھ زیادہ ہی نرم تھی اس لیے وہاں ایک سُوراخ بھی نظر آنے لگا تھا جہاں یقیناً ایک گولی پیوست ہو چکی تھی۔ یہ کارکردگی کسی ریوالور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ گولی بلاشبہ کسی طاقتور رائفل سے چلائی گئی تھی لیکن میں نے نہ تو فائر کی آواز سُنی اور نہ ہی کسی شخص کو بھاگتے دیکھا اور نہ ہی کسی گاڑی کو غیر معمولی رفتار سے جاتے دیکھا تھا۔ میرے گرد کاروبارِ حیات معمول کے مطابق جاری تھا۔ نقل و حرکت میں کہیں کوئی تیزی نہیں آئی تھی۔ صرف میرے دل کی دھڑکن بڑھی تھی، باقی سب کچھ اُسی طرح تھا۔ گاڑیوں میں، تانگوں میں یا پیدل لوگ اُسی طرح اپنی اپنی دُھن میں مگن اپنی اپنی منزل کی طرف رواں تھے۔

میں ایک لمحے تک وہیں ساکت کھڑا رہ گیا۔ اس احساس سے میری کنپٹیوں میں دھمک سی ہو رہی تھی کہ شاید ابھی کسی طرف سے دوسری گولی آئے گی اور اس مرتبہ گولی چلانے والے کا نشانہ خطا نہیں ہوگا کیونکہ اس کا ہدف ساکت ہوگا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہُوا کہ اگر میں اسی طرح بُت بنا کھڑا رہا تو کہیں لوگ میری طرف متوجہ نہ ہو جائیں۔ میں چل پڑا اُسی طرح جیسے کوئی نوآموز بازی گر کسی تنے ہوئے رسّے پر چل رہا ہو۔ اعصاب وائلن کی تاروں کی طرح کھنچے ہُوئے تھے اور توقع یہی تھی کہ بس اب گولی آئی۔ واسکٹ کی جیب میں پڑا ہُوا ریوالور اب نہایت ہی حقیر محسوس ہونے لگا تھا۔ اس قسم کے حالات میں بھلا کیا فائدہ تھا اس ریوالور کا؟

کچھ فاصلہ بخیر و عافیت طے ہو گیا تو اعصاب کا تناؤ کچھ کم ہُوا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میرے نادیدہ دُشمنوں کا مقصد سرِ دست مجھے ہلاک کرنا نہیں بلکہ صرف خوف زدہ کرنا تھا لیکن وہ مجھے خوف زدہ یا بوکھلاہٹ میں مبتلا کر کے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے، یہ میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ کوشش تو مجھے ہلاک ہی کرنے کی کرتے رہے ہوں لیکن قدرت کا دستِ مہربان مجھے اب تک بچاتا رہا ہو۔

شاہی بازار واپس پہنچنے تک میں نے ایک بار پھر ہر فکر ذہن سے جھٹک دی۔ ایک دُکان سے ڈٹ کر میری پائے کھائے اور جا کر اطمینان سے سو گیا۔

گلنار دوسرے روز سہ پہر کے قریب آئی۔ میں اس وقت باہر جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ وہ بغور میری طرف دیکھتے ہُوئے بولی "آرام کر کر کے تمھارے چہرے پر خُوب رونق آتی جا رہی ہے ... اور لگتا ہے کہ کل کے واقعے کا اثر بھی دُور ہو چکا ہے۔"

"تم کل کے واقعے کی بات کر رہی ہو؟ یہاں ایک اور حادثہ بھی گزر چکا ہے جس میں ما بدولت کی کنپٹی میں سوراخ ہوتے ہوتے رہ گیا۔" میں نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"ارے ... کیا ہُوا؟" اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

میں نے اُسے گزشتہ روز کا واقعہ سُنایا تو اس کی رنگت چند لمحے کے لیے زرد پڑ گئی مگر جلد ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"چلو خیر ... کوئی بات نہیں۔" وہ مسکراتے ہُوئے بولی "خواہ وہ جان بُوجھ کر غلط نشانے لے رہے ہوں یا قدرت کی مرضی سے ان کے نشانے خطا جا رہے ہوں۔ تم بہر حال، یہی بے خوفی کا رویّہ اپنائے رکھو۔ جہاں تک بس چلے احتیاط برتو لیکن یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ تم اُن کے ہتھکنڈوں سے خوف زدہ ہو کر کسی بل میں گھس کر بیٹھ گئے ہو۔"

"اب تو میں واقعی بے خوف ہو گیا ہُوں۔" میں نے کہا "کئی بار موت اس طرح مجھے چھُو کر نکل گئی ہے کہ اب دل سے موت کا خوف نکل گیا ہے۔"

"اچھا چلو ... ہمیں اسٹوڈیو چلنا ہے۔" گلنار گھڑی دیکھتے ہُوئے بولی۔

ٹیکسی پکڑ کر ہم اسٹوڈیو پہنچے اور بالکل ٹھیک وقت پر پروجیکشن ہال میں جا پہنچے مگر چودھری وہاں نہیں تھا۔ ہم نے اِدھر اُدھر جھانکا، پھر باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔ پروجیکٹر روم میں ایک نوجوان موجود تھا جو دروازے سے سر نکال کر متجسّس انداز میں ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ بالآخر چند منٹ بعد وہ ہچکچاتے ہُوئے انداز میں ہمارے قریب آیا اور ملائمت سے بولا "آپ دونوں کہیں چودھری فضل داد کے انتظار میں تو نہیں کھڑے ہیں؟"

"ہاں برادر! ہم انہی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "انھوں نے کہا تھا کہ وہ ہمیں اپنی نامکمل فلم کی تین ریلیں دکھائیں گے۔"

"ریلیں تو وہ آج صبح ہی آ کر لے گئے تھے اور آپ کے لیے پیغام چھوڑ گئے تھے ... کہ ان کا انتظار نہ کریں۔ انھوں نے ارادہ بدل لیا ہے۔" نوجوان نے بتایا "اُن کے پاس اسٹوڈیو کا کلیرنس سرٹیفکیٹ موجود تھا۔ سرٹیفکیٹ دیکھ کر میں نے ہی پراپرٹی روم سے ریلیں نکال کر اُنھیں دی تھیں۔ پرنٹس کے شعبے کا انچارج بھی میں ہی ہُوں۔"

میں نے اور گلنار نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نوجوان کے سامنے کوئی بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس کا شکریہ ادا کر کے واپس روانہ ہو گئے۔ چند قدم دُور نکل آنے کے بعد میں نے کہا "چودھری نے ارادہ کیوں بدل دیا؟ وہ وعدہ خلاف آدمی تو معلوم نہیں ہوتا!"

"یہی تو میں بھی سوچ رہی ہُوں۔" گلنار بولی "اور اب وہ ریلیں مجھے زیادہ اہم محسوس ہونے لگی ہیں۔ خیر ... چل کر اُس سے بات کرتے ہیں۔"

ایک بار پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم چودھری کے گھر پہنچے۔ اس مرتبہ بھی کال بیل کے جواب میں بچّہ ہی آیا لیکن اندر جانے کے لیے اس نے ہمارے لیے ڈرائنگ روم نہیں کھولا۔ چند لمحے بعد چودھری خود ہی باہر آ گیا اور مکان کی چار دیواری کے قریب کھڑے ہو کر ہمارا حال چال دریافت کرنے لگا۔

"حال چال کو تو چھوڑیں چودھری صاحب!" میں نے اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں کہا "یہ بتائیں کہ آپ نے ہمارے ساتھ یہ کس قسم کی چال چلی ہے؟ وعدہ کر کے آپ اسٹوڈیو میں ہم سے نہیں ملے ... ریلیں بھی وہاں سے اُٹھا لائے۔"

چودھری پہلے ہی قدرے ندامت آمیز انداز میں ہاتھ مسل رہا تھا لیکن یہ ظاہر کرنے کے لیے معاملہ اس کی نظر میں زیادہ اہم نہیں ہے، وہ ہموار لہجے میں بولا "عجیب اتفاق ہے کہ وہ ریلیں کسی اور کو تو کیا خود مجھے بھی یاد نہیں آئی تھیں لیکن اِدھر کل آپ نے اُن کا ذکر کیا اُدھر جیسے اُن کے توسط سے میرے نصیب ہی جاگ اُٹھے۔ آج علی الصباح ہی ان کے لیے ایک گاہک آن پہنچا ..."

"لیکن بات تو پہلے ہم نے کی تھی۔" میں نے احتجاج کیا۔

"مگر آپ کی بات یقینی نہیں تھی۔" چودھری تحمّل سے بولا "آپ نے کہا تھا کہ ریلیں چلا کر دیکھیں گے۔ مقصد یہی ہُوا کہ انھیں خریدنے نہ خریدنے کا فیصلہ آپ دیکھنے کے بعد ہی کریں گے۔ جب کہ اُس شخص نے دیکھے بغیر ہی اُن کی قیمت لگا دی، اتنی کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"اور آپ فوراً پھسل پڑے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"ظاہر ہے۔ مجھے آج کل زیادہ سے زیادہ رقم کی ضرورت ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولا "کیونکہ میں کوئی کام شروع کرنا چاہتا ہُوں۔"

"آپ کام شروع کرنے کی بات کر رہے ہیں اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اس وقت آپ کا کام تمام کر دوں۔" میں نے کہا "جہاں تک قیمت کا سوال ہے تو شاید ہم آپ کی توقع سے کہیں زیادہ رقم دے دیتے مگر آپ نے پھسلنے میں جلدی کر دی۔"

چودھری نے سخت نظروں سے میری طرف دیکھا اور شاید کچھ کہنے کا ارادہ بھی کیا مگر میرے تیور دیکھ کر ملائمت سے بولا "بات وہی 'شاید' والی تھی۔ اِسی لیے تو میں نے عجلت دکھائی۔"

دفعتاً مجھے ایک خیال آیا اور میں نے حتی الامکان اپنے لہجے میں نرمی لاتے ہُوئے کہا "اچھا یہ تو بتائیں کہ وہ گاہک کون تھا؟ اور کس طرح یوں اچانک ہی آپ کے پاس آن پہنچا تھا؟"

"میں خود بھی حیران تھا لیکن مجھے اس سے کچھ پوچھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ اس نے کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا کہ میرے ہاتھ پیر ہی پھُول گئے اور میں ہر بات بھُول گیا۔ ذہن میں بس یہی خیال باقی رہ گیا کہ مجھے ہر حال میں اُسے ریلیں لا کر دے دینی چاہئیں۔ اس نے آتے ہی پوچھا کہ کیا میں ایک لاکھ روپے میں اپنی وہ ریلیں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے مجھے فوراً ریلیں باہر لانے کی ہدایت کی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ریلیں اسٹوڈیو میں ہیں تو وہ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے

بولا: "اگر تم ٹھیک ایک گھنٹے میں فلمیں لے آؤ تو قیمت یہی رہے گی۔ اس کے بعد جتنی دیر ہوتی جائے گی، فی گھنٹہ دس ہزار روپے کے حساب سے قیمت کم ہوتی جائے گی۔" میں نے سودا منظور کر لیا اور اسٹوڈیو کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایک گھنٹے بعد واپس آئے گا اور میری کوشش تھی کہ میں ایک گھنٹے سے پہلے ہی ریلیں لے آؤں۔ ظاہر ہے، ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ بہرحال، میں نے واقعی ٹھیک ایک گھنٹے بعد ریلیں اس کے حوالے کر دیں اور اس نے اطمینان سے رقم میرے ہاتھ میں تھما دی۔"

"میں نے آپ سے یہ ساری کہانی سنانے کی فرمائش نہیں کی تھی۔" میرے لہجے میں ایک بار پھر کھردرا پن آ گیا۔ "میں نے پوچھا تھا کہ آدمی کون تھا؟ کس قسم کا آدمی تھا؟"

"میرے لیے قطعی اجنبی تھا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اتنی دیر اس سے گفتگو رہی مگر میں صحیح طور پر اس کی شکل بھی نہیں دیکھ سکا۔" چودھری دھیمے لہجے میں بولا: "وہ لمبی سی سیاہ گاڑی میں تھا۔"

"سیاہ چشمہ لگائے ہوئے ہوگا... سر پر سیاہ ہیٹ رہا ہوگا۔" میں نے بات مکمل کی۔

"ہاں ہاں... بالکل یہی حلیہ تھا۔" چودھری چونک کر بولا: "تم اسے جانتے ہو، کیا؟"

"یہ مت پوچھو۔" میں نے دانت پیس کر کہا اور میں گیٹ کی طرف مڑ گیا۔ "آؤ گلنار، چلیں۔"

ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم واپس روانہ ہوئے تو گلنار قدرے بجھی بجھی سی تھی لیکن مجھ پر مایوسی و افسردگی سے زیادہ اب جھنجلاہٹ سوار تھی۔

"کتنی گھنٹے گزر چکے، اس بات کو..." میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "معلوم نہیں، وہ ریلیں اب کہاں ہوں گی۔"

"جس چیز کو بھی بنیاد بنا کر ہم آگے بڑھتے ہیں، وہ ہمارے سامنے سے کھینچ لی جاتی ہے۔" گلنار عجیب سے انداز میں مسکرا کر بولی: "لیکن جیز! ابھی تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاید... ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔"

"تمہارا کیا پروگرام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ آج بالاخانے چلی جاؤں۔ دو ناغے ہو چکے ہیں۔ کہیں میرے قدردان مایوس نہ ہو جائیں۔" گلنار مسکراتے ہوئے بولی: "چاہو تو تم بھی بیٹھ کر میرا گانا سن سکتے ہو۔"

"میں دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر تمہارا گانا نہیں سن سکتا۔" میں نے غیر ارادی طور پر کہا۔ "میں تو اب تم سے صرف وہی گانا سنوں گا جو تم میرے سامنے بیٹھ کر صرف میرے لیے گاؤ گی۔"

"کیا واقعی تمہارا دل یہ چاہتا ہے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا اور میری آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"کبھی... جب دن بہت خوبصورت ہوگا۔ دل و دماغ پر اطمینان، سکون اور انبساط کی حکمرانی ہوگی... تو میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گی۔" اس نے خوابناک لہجے میں کہا۔

ہم شاہی بازار پہنچے تو وہاں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ بازار میں داخل ہونے کے بعد ٹیکسی رینگنے کی سی رفتار سے چلنے لگی۔ تھوڑی دور جا کر بالآخر ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل ہی آگے چل دیے۔ ہم جب شریفے حلوائی کی دکان کے سامنے سے گزرے تو اس نے آواز دی: "باؤ جمال، ذرا بات سنتے جانا۔"

ہم اس کے پاس پہنچے تو وہ قدرے ہچکچاتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا: "باؤ جی! وہ کالی گاڑی والا پھر آیا تھا۔ آپ کا پوچھ رہا تھا۔ میں نے بہت کہا کہ بھئی وہ صاحب پردیسی تھے اور اب یہاں سے جا چکے ہیں مگر وہ مانا ہی نہیں۔ بڑے اطمینان سے کہنے لگا، اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ ابھی آپ یہیں ہیں بلکہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کس گلی میں رہتے ہیں لیکن اس کے پاس وقت نہیں تھا اس لیے وہ آپ کی ایک امانت میرے پاس چھوڑ گیا ہے۔" شریفے نے کاؤنٹر کے نیچے سے درمیانے سائز کا ایک ڈبہ نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ میں اسے اٹھاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن گلنار نے مجھے ٹہوکا دیا کہ میں اسے اٹھا لوں۔ چند لمحے بعد میں نے ڈبہ اٹھا لیا۔ ڈبہ زیادہ وزنی نہیں تھا اور اس پر عام سا کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ میں نے شریفے کا شکریہ ادا کیا... وہ کن انکھیوں سے برقع پوش گلنار کو دیکھ رہا تھا۔ ہڑبڑا کر بولا: "شکریے کی کیا بات ہے، باؤ جی! ہم تمہارے نوکر ہیں۔"

کمرے میں پہنچ کر میں نے ڈبہ تپائی پر رکھ دیا۔ گلنار بولی: "اسے کھول کر تو دیکھو، کیا تحفہ بھیجا ہے، ہمارے اس پُراسرار مہربان نے؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اسے کھولتے ہی ڈائنامیٹ

نہ پھٹ پڑے۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس میں کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔" گلنار نے خیال آرائی کی۔

"چلو میں تمہارے دل کے کہنے پر بھروسہ کر لیتا ہوں۔" میں نے ڈبہ کھولتے ہوئے کہا۔ ڈبہ کھل گیا تو گلنار بھی تجسس اور اشتیاق سے مجبور ہو کر جھک آئی۔ ڈبے میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر ہم بُری طرح اچھل پڑے۔

اس میں فلم کی تین ریلیں رکھی ہوئی تھیں اور یقیناً یہ وہی چودھری والی فلم کی ریلیں تھیں جن کے لیے ہم آج پریشان ہو کر آئے تھے۔ اور چودھری سے بھی میں نے سخت کلامی کی تھی۔

"یہ شیطان کا بچہ تو اب مجھ سے مذاق کرنے پر اتر آیا۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

گلنار بھی سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر وہ پُرخیال نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی: "یہ ریلیں تمہیں بھجوانے سے، اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟" پھر وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی بولی: "شاید اس نے ان ریلوں کو چلا کر دیکھ لیا ہو اور اسے یقین ہو گیا ہو کہ ان میں کوئی کام کی بات نہیں ہے۔"

"مجھے تو اب چوہے بلی کے اس کھیل میں جھنجلاہٹ سی ہونے لگی ہے۔" میں نے غصے میں ڈبے پر ہاتھ مار دیا اور وہ تپائی سے پھسل کر دور جا گرا۔ ایلومینیم کے خول میں بند ایک ریل ڈبے سے نکل کر لڑھکتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔

"زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔" گلنار مسکرا کر بولی... "چیزیں گرانے اور پٹخنے سے پاس پڑوس کے لوگ متوجہ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"ہونے دو۔" میں نے لاپروائی سے کہا: "تم نے مجھے پناہ دی تھی، تمہارا احسان اپنی جگہ... لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میں اب اس کمرے میں پڑے پڑے بھی تنگ آ گیا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں کسی غیبی قوت کا قیدی ہو کر رہ گیا ہوں۔"

میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا لیکن وہاں ٹہلنے کی جگہ بہت کم تھی۔ میرے سینے میں الاؤ سا بھڑک رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو بے حد مضطرب اور مشتعل محسوس کر رہا تھا۔ گلنار میرا جائزہ لے رہی تھی۔ بالآخر وہ ایک گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے سر ٹکاتے ہوئے بولی: "اس پُراسرار شخص کا مقصد بھی شاید یہی ہو کہ تم آپے سے باہر ہو جاؤ اور اپنی بوٹیاں نوچنے لگو۔ اس طرح شدید جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو کر شاید تم اس کا مقصد پورا کر رہے ہو۔ میرے خیال میں تمہیں ہر وقت اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ بشرطیکہ میرے خیال کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت ہو۔"

میرا غصہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ گلنار کی نصیحت کی افادیت تو اپنی جگہ تھی لیکن مجھے اس احساس سے بھی شرمندگی ہوئی کہ میرا طرزِ عمل گلنار کے نزدیک پسندیدہ نہیں تھا اور میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس کی نظر میں اچھی نہ ہو۔

"معاف کرنا۔ میں ذرا کھال سے باہر ہونے لگا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گلنار بھی مسکرا دی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ "اب میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "کل ملاقات ہوگی اور کل ہی ہم فیصلہ کریں گے کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے۔"

اس کے جانے کے بعد میں بستر پر دراز ہو گیا اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلا احساس یہی ہوا کہ میں خاصی دیر سوتا رہا ہوں کیونکہ جس وقت میں لیٹا تھا تو کمرے میں ڈوبتے سورج کی ملگجی روشنی باقی تھی اور اب گھپ اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں نے اٹھ کر بتی جلائی اور باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ بھوک بڑے زور کی لگی ہوئی تھی۔ میں کھانے کے ارادے سے کمرے سے نکلنے لگا۔ کنڈی گرا کر ابھی میں نے پٹ کھولے ہی تھے کہ دائیں بائیں دونوں طرف سے دو ریوالوروں کی نالیں میری پسلیوں سے آن لگیں اور ایک تیز سرگوشی سنائی دی: "واپس اندر ہی چلو، برخوردار! بڑا انتظار کرایا تم نے۔"

مجھے الٹے قدموں کمرے میں آنا پڑا اور تب میں نے دیکھا کہ میری پسلیوں پر ریوالور رکھ کر میرے ساتھ اندر آنے والے دونوں آدمی وہی ہیں جو چند دن قبل میرے مزنگ والے مکان پر آئے اور مجھ سے کوئی ڈائری طلب کرنے لگے تھے۔ پھر وہ خود ہی پچاس ہزار کی رقم دے گئے تھے کہ میں سوچ بچار کر لوں اور اس رقم کے عوض ڈائری ان کے حوالے کرنے کے لیے نکال رکھوں۔ ان کو دیکھ کر مجھے خوف نہیں محسوس ہوا بلکہ حیرت کا جھٹکا لگا۔ آخر وہ بدبخت کس طرح یہاں آن پہنچے تھے۔ کیا ان کا بھیجا ہوا کوئی آسیب اب تک میرے پیچھے لگا رہا تھا جسے میں دیکھ نہیں سکا تھا مگر وہ میرے بارے میں انھیں پل پل کی خبر دے رہا تھا؟ آخر یہ کیا اسرار تھا؟ شاید وہ بھی میری حیرت سے محظوظ ہو رہے تھے۔

دراز قد اور جسیم شخص نے مربیانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا: ”ہم سے بچ کر انسان صرف ایک ہی جگہ پناہ لے سکتا ہے برخوردار! اور وہ جگہ ہے قبر...“

انھوں نے ریوالور والی ہی کی مدد سے مجھے دھکیل کر کرسی پر بٹھا دیا۔ پستہ قد اور گٹھے ہوئے جسم والا شخص میرے عقب میں کھڑا ہو گیا اور دراز قد اپنے ریوالور کو جنبش دیتے ہوئے بولا: ”اگر اب بھی تم ڈائری ہمارے حوالے کر دو تو میں تمھاری اس حماقت کو نظرانداز کر دوں گا کہ تم نے ہمیں ڈاج دینے کی کوشش کی تھی۔“

میری کنپٹیوں میں ایک بار پھر شرارے دوڑنے لگے۔ میں نے دانت پیس کر کہا: ”یار تمھاری ڈائری نے تو میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ معلوم نہیں، تم لوگ کس ڈائری کے چکر میں ہو اور کس بدبخت نے تمھیں یہ یقین دلایا ہے کہ وہ میرے ہی پاس ہے۔ اگر وہ میرے پاس ہوتی تو میں کب کا تمھارے منہ پر مار چکا ہوتا۔ مگر تم جیسے لوگ جو خود دن رات جھوٹ بولتے ہیں، وہ دوسروں کو بھی جھوٹا سمجھتے ہیں اور کسی بات کا یقین ہی نہیں کرتے...“ میں غصے کے عالم میں بولے چلا جا رہا تھا: ”اس ڈائری کی خاطر تم لوگوں نے دو مرتبہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا...“

”دو مرتبہ؟ قاتلانہ حملہ...؟“ دراز قد نے حیرت سے دوہرایا: ”برخوردار! ہم اتنے اناڑی نہیں ہیں کہ دو دو مرتبہ قاتلانہ حملے کرتے پھریں۔ ہم کسی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو اسی وقت سے اُس شخص کا شمار مُردوں میں ہونے لگتا ہے۔ آج تک ہمارے پہلے ہی حملے سے کوئی نہیں بچ سکا۔ ہمیں کبھی دوسرا حملہ کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ تم کن حملوں کی بات کر رہے ہو؟“

”وہ جو تم نے یا تمھارے کسی جدِ امجد نے ملتان روڈ پر مجھے اپنی ملبی سے سرخ گاڑی تلے کچلنے کی کوشش کی تھی... اور وہ جو سرکلر روڈ پر بھاٹی کے قریب مجھ پر رائفل سے فائر کیا تھا۔ کیا وہ قاتلانہ حملے نہیں تھے؟ دل لگی تھی؟“ میں نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

اُنھوں نے عجیب سی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر استفہامیہ انداز میں سر ہلایا۔ ان کے انداز سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا کہ میں جن حملوں کا تذکرہ کر رہا تھا وہ واقعی اُن سے لاعلم تھے اور ان حملوں میں اُن کا ہاتھ نہیں تھا لیکن شاید وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ کس کا کام ہو سکتا ہے۔

”چلو خیر... اس بحث کو چھوڑو۔“ دراز قد آدمی گویا بات ختم بات کرتے ہوئے بولا: ”فی الحال تو ہمیں صرف ڈائری سے مطلب ہے، وہ ہمارے حوالے کر دو۔ یہ بات طے ہے کہ ڈائری دیے بغیر تمھاری جان نہیں چھوٹ سکتی۔“

”پھر وہی ڈائری۔“ میں نے شدید جھنجلاہٹ سے کہا اور پھر گویا غیر ارادی طور پر ہی میری ٹانگ چل گئی۔ میری ٹھوکر دراز قد کے گھٹنے پر پڑی۔ وہ کراہا اور لڑکھڑایا۔ تب تک میں عقب سے پستہ قد کے حملے سے بچنے کے لیے کرسی سے گھٹنوں کے بل گر چکا تھا۔ اسی حالت میں میں نے دراز قد کے دوسرے گھٹنے پر کراٹے کا ہاتھ رسید کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا کیا ردِعمل ہوا۔ میں اس وقت پلٹ کر پستہ قد پر وار کرنا چاہتا تھا مگر مجھے اس کی مہلت نہ مل سکی۔ پستہ قد نے عقل مندی یہ کی کہ مجھ سے لڑنے بھڑنے کی بجائے شارٹ کٹ اختیار کیا اور ایک ثانیے کی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریوالور کا دستہ میری کنپٹی پر رسید کر دیا۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ مجھے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے اچانک کمرے کا بلب فیوز ہو گیا ہو، حالانکہ بلب میری اپنی کھوپڑی کا فیوز ہوا تھا۔

معلوم نہیں کتنی دیر بعد میری آنکھ کھلی۔ سب سے پہلے مجھے اپنی کنپٹی میں شدید درد کا احساس ہوا۔ میں نے کان کا پچھلا حصہ ٹٹول کر دیکھا۔ وہاں ایک چھوٹا سا گومڑ ابھرا ہوا تھا اور شاید کھال بھی پھٹ گئی تھی کیونکہ اردگرد کچھ خون جما ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کمرے میں بلب روشن تھا۔ اور یہ کمرہ وہ نہیں تھا جو گلنار نے مجھے سر چھپانے کے لیے فراہم کیا تھا۔ یہ کسی معقول مکان کا صاف ستھرا کمرہ تھا۔ اس میں فرنیچر کے نام پر ایک بیڈ تھا جس پر میں دراز تھا اور یہ خاصا عمدہ بیڈ تھا۔

غنیمت یہ تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے گئے تھے۔ میں نے اُٹھ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں صرف ایک دروازہ تھا جو موٹے اور ٹھوس تختے کا بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن اس نے جنبش تک بھی نہیں کی۔ اس کے علاوہ کمرے میں صرف ایک روشندان تھا لیکن وہ بہت چھوٹا تھا اور اس کے درمیان بھی ایک

موٹے سے سریے کے ساتھ گھومنے والا پٹ لگا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ پیٹا مگر کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ میری جھنجلاہٹ عود کر آئی اور میں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ جوش میں شاید میں نے اپنے نادیدہ دشمنوں کو برا بھلا بھی کہا اور انھیں خوب للکارا مگر چاروں طرف وہی پہلا سا سکوت طاری رہا۔ ایک مرتبہ البتہ مجھے کچھ شبہ ہوا کہ شاید کافی فاصلے پر کچھ لوگ دبی دبی سی آواز میں ہنس رہے تھے لیکن جب میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی تو کچھ سنائی نہ دیا۔ غصے کے مارے میری باچھوں سے کف بہنے لگا تھا۔

خوب چیخنے چلانے کے بعد گویا میرے دل کا بخار نکل گیا۔ مجھے کچھ قرار سا آ گیا۔ منہ پونچھ کر میں واپس بستر پر آ لیٹا اور خود کو یاد دلانے لگا کہ گلنار نے مجھے آپے سے باہر نہ ہونے کی نصیحت کی تھی۔ پُرسکون ہونے کے بعد میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ میری واسکٹ کی جیب سے صرف ریوالور نکالا گیا تھا۔ تھوڑی بہت رقم جو میرے پاس رکھی تھی، وہ جوں کی توں موجود تھی۔ حتیٰ کہ ریوالور کی گولیاں بھی چھوڑ دی گئی تھیں۔ ظاہر ہے انھیں میں ہاتھوں سے تو کسی کے جسم میں نہیں اُتار سکتا تھا۔

دفعتاً دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور گھومتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ غالباً نہایت خاموشی سے تالا کھولا گیا تھا۔ پھر دروازے پر زوردار ٹھوکر رسید کی گئی تھی تاکہ اگر میں نے دروازے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی ہو تو دروازہ خاصے زور سے مجھ سے ٹکرائے اور آنے والے کو بھی اس کا علم ہو جائے۔

میں نے فوراً چہرے پر ایسے تاثرات طاری کر لیے جیسے میں جاں کنی کے عالم میں ہوں۔ دروازے پر وہی پستہ قد کھڑا تھا جس نے ریوالور کا دستہ مار کر مجھے بے ہوش کیا تھا۔ اس وقت اس ناہنجار کے ہاتھ میں میرا ہی ریوالور تھا۔ وہ چوکھٹ پر ہی کھڑا محتاط انداز میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ غرایا۔

”میرے پیٹ میں شدید تکلیف ہے۔“ میں نے کسمساتے ہوئے کہا: ”تم لوگوں نے میرے پیٹ میں کوئی ضرب تو نہیں لگائی تھی؟“

”یہ بہلاوے اب پرانے ہو چکے ہیں۔“ وہ وہیں کھڑے کھڑے اطمینان سے بولا: ”میں بچوں کی کسی کہانی کا کوئی چغد قسم کردار نہیں ہوں جو تمھارے پیٹ میں درد کی شکایت سن کر... تمھارے اوپر جھک جاؤں گا اور تم کوئی داؤ آزما کر مجھے قابو میں کر لو گے۔“

میں نے کسمسانا، تڑپنا اور چہرے سے اذیت کا اظہار کرنا ترک کر دیا۔ میرا یہ حربہ کارگر نہیں رہا تھا۔ وہ بن مانس کا بچہ کچھ زیادہ ہی گھاگ تھا۔ میرا چہرہ اعتدال پر آتے دیکھ کر اُس کے موٹے موٹے ہونٹ کچھ پھیلے۔ شاید اُس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے بولا... ”چلو اٹھو... مجھے حکم ملا ہے کہ تمھیں کہیں اور ٹرانسفر کر دوں اور میں چاہتا ہوں کہ مجھے تمھاری دوسری کنپٹی پر بھی [illegible] اس لیے شرافت سے چلنا۔ زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کرنا۔ ہم تمھارے ساتھ ابھی تک نرمی برت رہے ہیں لیکن اب مزید چالاکی دکھانے کی کوشش کرو گے تو...“ اس نے گلے پر ہاتھ پھیر کر گردن الگ ہونے کا اشارہ کیا۔

میں اُٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میں دروازے کے قریب پہنچا تو وہ دیوار کے ساتھ ایک طرف کو ہو گیا... چوکھٹ تک پہنچ کر میں نے محسوس کر لیا کہ مکان پر ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ ڈرائیو وے میں ایک کار کھڑی تھی لیکن میں اندازہ نہ کر سکا کہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی موجود ہے یا نہیں؟ دروازے سے باہر آ کر میں نے اپنے آپ کو برآمدے میں پایا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب پستہ قد میرے خاصا قریب تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے بعد وہ مناسب فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے چلے گا۔ مجھے اس کی مکاری پر سخت غصہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ مجھے ایک بار بے ہوش بھی کر چکا تھا۔ میں اس کی گردن مروڑ دینے کے لیے بے چین تھا لیکن اس بار پھر مجھے صرف ایک ٹانگ ہی چلانے کا موقع مل سکا اور اس مرتبہ ٹانگ اُلٹی چلی۔ اس کا پستہ قد ہونا میرے حق میں اچھا رہا۔ میری لات سیدھی اس کے منہ پر پڑی۔ اس نے بلا تامل فائر کر دیا لیکن گولی برآمدے کی چھت کی طرف گئی اور وہ کمر کے بل گر پڑا۔ میں نے اسے ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں دی اور اس پر جا گرا۔ میری ایک کلائی اس کی گردن پر تھی اور دوسرے ہاتھ سے میں اس کا وہ ہاتھ مروڑنے کی کوشش کر رہا تھا جس میں ریوالور تھا۔ بلاشبہ وہ کسی گینڈے کی طرح مضبوط تھا۔

ممکن تھا کہ وہ مجھے ایک طرف اچھال دیتا لیکن میں

نے پینترا بدل کر اُس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑا اور پھر میں جنونی انداز میں اس کا سر پختہ دیوار سے ٹکراتا چلا گیا۔ کئی لمحے بعد مجھے احساس ہُوا کہ وہ تو پہلی بار سر فرش سے ٹکراتے ہی ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر نیچے فرش پر گر پڑا تھا۔

میں نے ریوالور اُٹھا لیا اور مکان کی چار دیواری کی طرف دوڑا جو زیادہ اُونچی نہیں تھی۔ میری توجہ کار کی طرف بھی تھی لیکن نہ تو اُس کا دروازہ کھُلا تھا اور نہ ہی اس کے اندر کوئی ہلچل نظر آئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اس کے قریب سے گزر کر گیٹ کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ دیوار پھلانگنے میں مجھے زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ باہر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اِکا دُکا تاروں کی موجودگی میں گرد و پیش کو سمجھنے میں معمولی سی مدد مل رہی تھی لیکن چند گز سے زیادہ فاصلے کی کسی چیز کا ہیولا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہاں شاید اِکا دُکا مکانات موجود تھے مگر میں اس علاقے کو پہچان نہیں سکا۔

قدرے سنبھل کر میں ایک طرف دوڑنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد اس مکان سے دُور نکل جاؤں۔ سڑک عبور کر کے میں کچے میں آ گیا اور ناک کی سیدھ میں دوڑنے لگا۔ چند گز دوڑ کر مجھے رُکنا پڑا۔ ایک طرف مجھے دو ہیڈلائٹس نمودار ہوتی دکھائی دی تھیں جو غالباً کسی کار کی تھیں۔ اگر وہ کار جلد قریب آ جاتی تو میں روشنی کی زد میں آ سکتا تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ کار اس مکان سے تعلق رکھنے والے بدمعاشوں ہی کی ہو۔

خوش قسمتی سے مجھے قریب ہی ایک تناور درخت نظر آ گیا اور میں اس کی اوٹ میں دم سادھے کھڑا ہو گیا۔ کار واقعی غیر معمولی تیز رفتاری سے قریب آ گئی۔ وہ مکان کے سامنے سے گزرتی چلی گئی لیکن میں نے دیکھا کہ کار کی عقبی کھڑکی سے دو بیضوی سی چیزیں مکان کی طرف اُچھالی گئی تھیں۔ کار تو زنّاٹے سے گزرتی چلی گئی لیکن دوسرے ہی لمحے، یکے بعد دیگرے دو خوفناک دھماکے ہوئے اور میں بے اختیار گھٹنوں کے بل گرتا چلا گیا۔

چند لمحے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو گویا کسی طلسمی عمل کے تحت میرے سامنے منظر ہی کافی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ کار اب کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مکان کی سامنے والی دیوار آدھی سے زیادہ غائب ہو چکی تھی۔ گیٹ اُکھڑ کر نہ جانے کہاں جا گرا تھا۔ مکان کا کافی حصہ منہدم ہو چکا تھا اور ایک طرف سے شعلے بھی بلند ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ یقیناً خاصے طاقتور بم تھے جو اُس مکان پر پھینکے گئے تھے اور پھینکنے والوں نے غالباً ایک ثانیے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ اگر اندر کچھ لوگ ہوئے بھی تو ان کا کیا حشر ہو گا؟ شاید اُن کا مقصد مکان کو تباہ کرنا نہیں بلکہ مکان کے اندر موجود لوگوں کے چیتھڑے اُڑانا ہی تھا۔ بے جان درو دیوار سے بھلا کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، کیا دُشمنی ہو سکتی ہے؟

یہاں مکانات خال خال ہی تھے لیکن دھماکے شدید تھے کہ ان مکانات میں رہنے والے تو کیا، دُور دُور کے لوگ بھی متوجہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے یہاں سے بھاگ لینا میرے حق میں اچھا تھا۔ علاقہ میرے لیے اجنبی تھا۔ میں فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ کس سمت میں دوڑنا میرے لیے بہتر رہے گا۔ بالآخر میں اسی طرف دوڑ پڑا جدھر سے میں نے وہ ہلاکت بردوش گاڑی آتے دیکھی تھی۔ تاہم میں سڑک پر نہیں بلکہ اس کے متوازی، نشیب میں ہی دوڑ رہا تھا۔ راستے میں جھاڑ جھنکاڑ بھی تھے اور اِکا دُکا درخت بھی... مجھے گھپ اندھیرے میں اُن سے بھی بچنا تھا اور یہ خیال بھی رکھنا تھا کہ اِکا دُکا مکانوں سے جو لوگ جائے وقوعہ کی طرف لپک رہے تھے، اُن کی نظر میں نہ آؤں۔ وہ مجھے اس دھماکے کا ذمّہ دار بھی سمجھ سکتے تھے۔ کسی خرگوش کی طرح لمبی لمبی چھلانگیں لگاتے ہوئے میں کافی دُور نکل آیا تو اچانک ہی عقب سے روشنی کا ریلا سا اپنی جانب میں بڑھتا محسوس ہُوا جس طرف میں دوڑ رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک کار تیز رفتاری سے چلی آ رہی تھی۔ ممکن ہے، یہ وہی کار ہو جس سے مکان پر بم پھینکے گئے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اِس میں کوئی عام مُسافر ہی چلے آ رہے ہوں لیکن اس وقت زیادہ سے زیادہ محتاط رہنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔

کار ڈبل ہیڈلائٹس والی تھی اور اس کی روشنی خاصی دُور دُور تک نہیں بلکہ دونوں طرف نشیب میں بھی پھیل رہی تھی۔ اگر میں اسی طرح ناک کی سیدھ میں دوڑتا رہتا تو روشنی کی زد میں آ سکتا تھا چنانچہ میں کچے میں ایک طرف مُڑ گیا۔ اس وقت تک کار مزید قریب آ چکی تھی۔ میں نے روشنی سے بچنے کے لیے ایک طرف لمبی جست لگا دی۔ گھپ اندھیرے میں اس طرف مجھے کچھ جھاڑ جھنکاڑ سا نظر آیا تھا... لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس جھاڑ جھنکاڑ کی آڑ میں ایک جوہڑ بھی ہے۔ خاصے زور دار چھپاکے سے میں اس جوہڑ میں اُترتا چلا گیا۔ جوہڑ کا پانی بے حد سرد تھا اور اس کی تہ میں زمین کچھ گہرائی تک دلدلی تھی۔ میرے پاؤں ٹخنوں سے ذرا اوپر تک دھنسنے کے بعد یوں جم گئے جیسے کسی نے نیچے سے انھیں مضبوطی سے تھام لیا ہو۔ غنیمت تھا کہ پانی میری کمر سے اُونچا نہیں تھا ورنہ شاید میں یہ چھلانگ لگا کر پچھتا رہا ہوتا۔

کار گزر چکی تھی لیکن میں یوں ساکت کھڑا تھا جیسے کسی شہتیر کو زمین میں گاڑ دیا گیا ہو۔ میں اندھیرے میں بھی محسوس کر سکتا تھا کہ جوہڑ کا پانی خاصا گندا ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ اتنی بھاگ دوڑ اور ہیجان خیزی کے بعد معاً ایسے یخ پانی میں آن کھڑے ہونا مجھے بے حد خوشگوار لگ رہا تھا۔ میرے سُلگتے اعصاب پر جیسے ٹھنڈی پھوار سی آن پڑی تھی اور میرے دہکتے وجود کو گویا خُنک بادلوں نے آغوش میں لے لیا تھا۔ یک لخت ہی مجھے قرار آ گیا۔ اپنی ساری گھبراہٹ اور افراتفری مجھے بے معنی سی لگنے لگی۔ میری سانس اعتدال پر آ چکی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ ساری بھاگ دوڑ، یہ ہنگامہ خیزی اور مار دھاڑ کس لیے ہے؟ کس کے لیے ہے؟ کیوں میری زندگی ایسے ہنگاموں میں گھر گئی ہے؟ آخر میں نے کیا کیا ہے؟... پھر اس خیال سے مجھے دل ہی دل میں ہنسی آ گئی کہ میں کس جگہ دھنسا اس قسم کی سوچ بچار کر رہا ہُوں؟ عجب مضحکہ خیز صُورتِ حال تھی کہ میں کوئی پُر اسرار چِلّہ کرنے والوں کی طرح کمر تک پانی میں ڈوبا کھڑا تھا اور زندگی کے نشیب و فراز پر غور کر رہا تھا۔ یکایک مجھے سبھی کچھ بے حد مضحکہ خیز لگنے لگا۔ میں نے اِتنا کچھ برداشت کیا تھا کہ مجھے اپنے مصائب بھی مضحکہ خیز محسوس ہونے لگے تھے۔ ذہن ایک عجیب ہی موڑ پر پہنچ گیا تھا۔

'واہ برخوردار نسیم جمال!' میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ 'اپنے گاؤں مانا نوالہ سے پرواز کر کے، اتنے طویل سفر کے بعد بالآخر تم اِس جوہڑ میں لینڈ کر گئے ہو۔ ابھی معلوم نہیں اور کس کس گھاٹ کا پانی پیو گے... لیکن دیکھو اس بے ہنگم سفر میں کہیں موت کے گھاٹ نہ اُتر جانا۔'

ایک طویل سانس لے کر میں خاصی دقّت کے بعد چھَپ چھَپ کرتا جوہڑ سے نکلا اور سڑک کی طرف بڑھا تاکہ اس کے متوازی اپنا سفر جاری رکھوں۔ کھُلے میدان میں تو اندھیرے کے باعث سمت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ ابھی میں سڑک کے قریب ہی پہنچا تھا کہ یک لخت روشنی میں نہا گیا۔ میں کسی وحشی درندے کی طرح بھڑک کر بھاگنے ہی والا تھا کہ وہ کھُردری اور بے رحم سی آواز میرے قدموں کی زنجیر بن گئی...

... "ٹھہر جا... اوئے!"

میں نے رُک جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ مجھ پر روشنی کسی طاقتور ٹارچ سے ڈالی گئی تھی اور کوئی بعید نہیں تھا کہ ٹارچ روشن کرنے والے کے دوسرے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا ہُوا ہو۔ ٹارچ کو اُوپر نیچے حرکت دے کر میرا جائزہ لیا گیا اور میں اس دَوران مجوب و شرمسار سا کھڑا رہا جیسے کسی کی جیب کاٹتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔ گھٹنوں تک میں کیچڑ میں لتھڑا ہُوا تھا۔ اس سے اوپر بھی میرے کپڑے گیلے ہی تھے۔ راستے میں کہیں کہیں کانٹوں سے بھی اُلجھا تھا۔ لباس پران کی یادگاریں ابھی باقی تھیں۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں میری آنکھیں چُندھیا رہی تھیں۔ میں نے ایک ہاتھ سے آنکھوں پر چھجا سا بنا کر دیکھا تو ٹارچ کے عقب میں مجھے دو لمبے تڑنگے ہیولے نظر آئے۔ ایک کے سر پر پگڑی بھی تھی۔ دُوسرے کے ہاتھ میں مجھے لاٹھی کی جھلک نظر آئی۔ ٹارچ اُسی نے روشن کر رکھی تھی۔ شاید وہ دیہاتی تھے۔ لیکن سیدھے سادے اور بے ضرر قسم کے دیہاتی نہیں تھے۔

"کون ہے اوئے تُو؟" مجھے للکار کر رُکنے والے نے ایک بار پھر للکارتے ہوئے پوچھا۔ "اور یہ کیا حُلیہ بنا رکھا ہے؟ لگتا ہے بڑی اچھل کُود مچائی ہے جھاڑیوں اور جوہڑوں میں؟"

میں خاموش رہا تو دوسرا ڈپٹ کر بولا۔ "ابے بولتا کیوں نہیں؟ چور ہے... ڈکیت ہے... اسمگلر ہے یا رسّہ گیر...؟ جلدی سے سچ سچ بتا دے تاکہ ہم اسی حساب سے تیرے ساتھ شایانِ شان سلوک کریں۔"

معلوم ہوتا تھا کہ اُن دونوں کو اپنے آپ پر خاصا گھمنڈ ہے۔ میں نے گہری سانس لے کر دھیمے لہجے میں کہا... "بھائیو! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ میں تو ایک مسافر ہوں۔ اس علاقے میں اجنبی ہُوں۔ راستہ بھُول گیا ہُوں اور اندھیرے میں ٹھوکریں

کھاتا پھر رہا ہوں۔"

"بڑا افسوس ہوا سُن کر۔" پوچھنے والے نے نہایت طنزیہ لہجے میں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تم چاند کی مخلوق ہو اس لیے زمین پر چلنے کا تمھیں بالکل تجربہ نہیں۔ تبھی پکی سڑک چھوڑ کر نشیب میں جھاڑیوں اور جوہڑوں میں بھٹکتے پھر رہے ہو۔"

میں سٹپٹا گیا۔ میرا حلیہ میری سرگزشت سُنا رہا تھا... پھر بھی میں کوئی نہ کوئی جواز گھڑ سکتا تھا مگر اس دیہاتی نے جو پوچھ گچھ میں پیش پیش نظر آ رہا تھا، مجھے اس کا موقع نہیں دیا اور یک لخت بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بولا —

"اِدھر آ... ہم تجھے راستہ دکھاتے ہیں۔" پھر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا — "چل تاجے! اسے چودھری کے پاس لے کر چلتے ہیں۔ یہ خود ہی اپنا شجرہ نسب بتائے گا۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ جو مکان دھماکے سے اُڑا ہے، اُس سے اِس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ آدمی مجھے اس علاقے کا نہیں لگتا۔"

اس دوران میں ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ تب میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا... اچھا ہی ہوا کہ میں نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے اپنے لہجے میں حتی الامکان مسکینی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "بڑے بھائی! میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں کہ اس مکان اور اس دھماکے دونوں ہی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں دھماکا سنتے ہی بوکھلا کر نشیب میں اتر گیا تھا اور اسی گھبراہٹ میں دوڑتا چلا گیا تھا کہ کہیں مجھ پر ہی کوئی الزام نہ آ جائے... اور یہ تو میں خود ہی بتا چکا ہوں کہ میں اس علاقے میں اجنبی ہوں... مسافر ہوں...؟"

میں دل ہی دل میں طے کر چکا تھا کہ ان کے ساتھ چودھری تو کیا، کسی بھی شخص کے پاس جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ معلوم نہیں کہاں کون سی مصیبت میری منتظر ہو۔ بہتر یہی ہے کہ جو مصیبت سامنے آئے اس سے نمٹ لیا جائے۔ میں گڑگڑا کر انھیں اپنے بزدل اور کمزور ہونے کا یقین دلانا چاہتا تھا تاکہ وہ مجھے قریب آتے دیکھ کر زیادہ چوکنے اور مستعد نہ ہوں۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا اور ان کے قریب تر پہنچ گیا۔ تب بھی ریوالور والے نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ریوالور اپنے ہاتھ میں لٹکائے رکھا کہ نال کا رُخ زمین کی طرف تھا۔ دوسرے نے لاٹھی لاپروائی سے زمین پر ٹکائے رکھی۔ وہ غالباً مجھے کسی قریب المرگ جھینگر جتنی اہمیت بھی نہیں دے رہے تھے اور یہی میں چاہتا بھی تھا۔ میری ٹانگ مشینی انداز میں حرکت میں آئی اور دوسرے ہی لمحے ریوالور والے کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر اندھیرے میں جانے کہاں جا گرا۔ میری ٹھوکر سے شاید اس کا ہاتھ بھی تقریباً ٹوٹ ہی گیا تھا کیونکہ وہ بُری طرح بلبلایا تھا۔ دوسرے دیہاتی نے فوراً سنبھل کر لاٹھی گھمائی لیکن ایک بار پھر اس کے ساتھی ہی کی شامت آئی کیونکہ میں جھکائی دے کر درمیان سے ہٹ گیا تھا اور لاٹھی اسی بے چارے کے پہلو پر پڑی جو پہلے ہی ہاتھ پر ٹھوکر کھا کر ریوالور گنوا چکا تھا۔ اس بار تو اس کے حلق سے کربناک چیخ نکلی اور وہ اوندھے منہ سڑک کے کنارے کچی زمین پر جا پڑا۔

اس صورت حال نے لاٹھی والے کو ایک لمحے کے لیے بوکھلا دیا اور یہ ایک لمحے کی مہلت میرے لیے کافی تھی۔ میں نے اس کی پسلیوں پر گھونسا رسید کیا اور جیسے ہی وہ ڈکراتا ہوا ذرا پیچھے کو ہٹا، اس کے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کر دی۔ اُس نے گرتے گرتے لاٹھی، تیر کی طرح پھینکی۔ میرا چہرہ اس کا نشانہ تھا۔ میں بروقت ذرا سا ایک طرف ہٹ گیا اور لاٹھی زن سے میرے کان کے قریب سے گزر گئی۔ اگر میں ذرا بھی چوکا ہوتا تو اس وزنی لاٹھی نے یقیناً میرے چہرے کے کسی نہ کسی ابھار کو نشیب میں تبدیل کر دیا ہوتا۔

اس دوران دوسرا دیہاتی سنبھل چکا تھا جبکہ میری توجہ اس کی طرف سے ایک لمحے کے لیے ہٹ چکی تھی۔ اس نے زمین سے اُٹھتے ہی مجھ پر چھلانگ لگائی لیکن میں نے کنپٹی پر گھونسا رسید کرتے ہوئے اُسے دوبارہ زمین پر پہنچا دیا۔ اس بار وہ گرا تو وہیں ساکت ہو گیا۔ دوسرا زمین سے اُٹھنے لگا تو میں نے مزید ہاتھا پائی کا خطرہ مول لینے کی بجائے اس کی کنپٹی پر ایک ٹھوکر رسید کی اور وہ دوبارہ زمین پر لمبا ہو گیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لے کر ہاتھ جھاڑے اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں روشنی میں نہایا ہوا ہوں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید ان دیہاتیوں کی ٹارچ اس زاویے سے کہیں پڑی ہوئی ہے کہ روشنی

اِدھر اُدھر پھیل رہی ہے لیکن فوراً ہی احساس ہوا کہ روشنی اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی کسی ٹارچ کی ہو سکتی ہے۔ میری چھٹی حس نے شاید پہلے بھی مجھے کسی خطرے سے خبردار کیا تھا لیکن اس وقت میری ساری توجہ ان دو آدمیوں سے نمٹنے پر لگی ہوئی تھی جو خواہ مخواہ ہی میرے گلے پڑ گئے تھے۔ میں نہایت آہستگی سے مڑا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر ایک کار کھڑی تھی جس کی ہیڈ لائٹس آن تھیں۔ جس کی وجہ سے سڑک اور اس کے آس پاس کا کافی حصہ منور تھا۔ کار کے ایک طرف کے دونوں دروازے کھلے تھے اور قریب ہی تین آدمی کھڑے تھے۔ دو کے ہاتھ میں ریوالور تھے اور وہ بڑے مستعد نظر آ رہے تھے۔ تیسرا لاپروائی سے کار کے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ ان دونوں کا باس معلوم ہوتا تھا۔

وہ شاید چند سیکنڈ قبل ہی وہاں پہنچے تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید وہ انہی دیہاتیوں کے ساتھی ہیں جنھیں میں بے ہوش کر چکا تھا لیکن پھر میں نے اپنا یہ خیال خود ہی غلط قرار دے دیا کیونکہ یہ کسی اور ہی قبیل کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ یہ خالصتاً شہری اور زیادہ خطرناک معلوم ہوتے تھے۔ ریوالور پکڑنے کا انداز بھی اناڑیوں والا نہیں تھا۔ ریوالور بدست دونوں آدمی پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہے تھے اور گویا مجھے گولیوں سے چھلنی کرنے کے لیے اپنے باس کے اشارے کے منتظر تھے جبکہ باس دلچسپی سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر میں نے خفیف سی مسکراہٹ کی جھلک بھی دیکھی۔ میں دل ہی دل میں اپنی قسمت کو کوسے بغیر نہ رہ سکا۔ ابھی ایک مصیبت سے نجات پا کر پلٹا تھا کہ دوسری مصیبت میری منتظر تھی اور یہ مصیبت پہلی سے کہیں زیادہ سنگین معلوم ہوتی تھی۔

"بھئی واہ...!" بالآخر وہ شخص جو میرے خیال میں ریوالور برداروں کا باس تھا، گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "حلیہ تمھارا فقیروں والا ہے لیکن آدمی تم میرا ... ہے۔ بڑی مدت بعد خالی ہاتھ لڑنے والا کوئی ایسا پھرتیلا جوان دیکھا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ اس کا لہجہ دوستانہ تھا اور اس بات سے میں اُلجھن میں پڑ گیا تھا۔

"تم ہمیں امدادِ غیبی کی طرح ملے ہو۔" وہ شاطرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہم راستے میں دُعا کرتے آ رہے تھے کہ اس وقت ہمیں ہمارے کام کا ایک آدمی مل جائے۔" پھر یک دم ہی اس نے گویا موضوع بدلتے ہوئے بے ہوش پڑے دیہاتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "انھیں مار دیا یا ابھی کچھ سانسیں باقی ہیں؟"

"یہ صرف بے ہوش ہوئے ہیں۔" میں نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔ "اور انھیں بے ہوش کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو اپنی دُھن میں چلا جا رہا تھا کہ یہ دونوں معلوم نہیں کیوں مجھے اغوا کرنے پر تل گئے تھے؟"

"خیر... اگر ان میں ذرا بھی عقل ہوئی تو آئندہ یہ کسی کو اغوا کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "بائی دی وے تم ہو کیا چیز؟"

"مسافر ہوں... غلطی سے اِدھر آ نکلا ہوں... بھٹکتا پھر رہا ہوں۔" میں نے اپنی کہانی دُہرائی۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔" وہ شخص طمانیت سے مسکرا دیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم ہمارے لیے اور بھی زیادہ کام کے آدمی ہو۔ بھٹکے ہوئے لوگوں کو تو ہم ضرور ساتھ لے لیتے ہیں تاکہ وہ کہیں بھٹکنے ہی میں ضائع نہ ہو جائیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اپنے لہجے سے حتی الامکان بے خوفی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"مطلب یہ کہ ہم چاہیں تو تمھیں چند منٹ کے اندر اندر پولیس کے حوالے بھی کر سکتے ہیں۔ تم نے ان دونوں آدمیوں کو جان سے تو نہیں مارا لیکن مارنے میں کوئی خاص کسر بھی نہیں چھوڑی ہے... اور پھر تم بہت ہی مشکوک حالت میں گھومتے پائے گئے ہو۔ تم خاصے لمبے عرصے کے لیے جیل جا سکتے ہو۔" پھر وہ ایک نظر اپنے ریوالور بدست گرگوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "اور ہم چاہیں تو چند چھٹانک سیسہ تمھارے اس مضبوط اور پھرتیلے جسم میں اُتار کر تمھیں یہیں ابدی نیند سوتے ہوئے چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف جا سکتے ہیں لیکن ہم تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم ہمارا ایک

نہایت معمولی سا کام کر دو۔ اس کے بعد تم جہاں کہو گے ہم تمہیں وہاں چھوڑ دیں گے۔ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا اور تم بھی اِدھر اُدھر بھٹکنے اور غلط سلط آدمیوں کے نرغے میں پھنسنے سے بچ جاؤ گے۔"

غلط سلط آدمیوں والی بات اُس نے کچھ اس انداز سے کی تھی جیسے اس کا اپنا تعلق شرفاء کے کسی نامی گرامی خاندان سے ہو۔ "اور اگر میں انکار کر دوں تو...؟" میں نے پوچھا۔

اُس کے چہرے پر یک لخت ہی سفاکی جھلک آئی اور اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے گرگوں کو اشارہ کیا۔ دُوسرے ہی لمحے دو گولیاں میرے کانوں کو تقریباً چھوتی ہوئی گزر گئیں۔ دونوں گولیاں اتنی مشاقی سے ایک ساتھ چلائی گئی تھیں کہ اُن کا دھماکا بھی تقریباً ایک ہی سُنائی دیا تھا اور ویرانے میں اس کی گونج بھی خاصی خوفناک محسوس ہوئی تھی۔ ان لوگوں کو شاید گولیوں کے دھماکے سُن لیے جانے کا بھی خوف نہیں تھا۔ میں اپنی تمام تر بے خوفی کے باوجود ایک لمحے کے لیے سناٹے میں رہ گیا۔

"یہ گولیاں ایک آدھ انچ اِدھر اُدھر بھی ہو سکتی تھیں۔" وہ شخص سفاکی سے مسکرایا۔ "انکار کرنے والوں سے ہم صرف اسی زبان میں بات کرتے ہیں۔ یہ صرف تمہید تھی...!"

مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ وہ نہایت منجھے ہوئے اور شاطر بدمعاش تھے۔ ہتھیاروں کی موجودگی میں ان سے اُلجھنے کی کوشش خطرے سے خالی نہیں تھی۔ "کام کی نوعیت کیا ہے؟" میں نے لمحاتی خاموشی کے بعد نیم رضامندی سے پوچھا۔

"فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس شخص کے چہرے پر قدرے ملائمت کے آثار نمودار ہوئے۔ "تم جیسے جوان کے لیے وہ کام بالکل معمولی ہے۔ آؤ، گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" اس نے اشارہ کیا۔

میں ہچکچایا لیکن بالآخر محسوس کیا کہ ان کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میں آگے بڑھا تو وہ لوگ گاڑی کے قریب سے ہٹ گئے۔ ریوالور والوں کی نظر تو ایک ثانیے کے لیے بھی مجھ سے نہیں ہٹ رہی تھی۔ یہ صورتِ حال قطعاً میرے حق میں نہیں تھی۔ اس شخص نے

مجھے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں جیسے ہی میں بیٹھا، دونوں ریوالور بردار میرے دائیں بائیں بیٹھ دونوں طرف سے ریوالور کی نال میری پسلیوں میں چبھنے لگی۔ ڈرائیونگ سیٹ اسی باس نما شخصیت نے سنبھالی۔ کار کے دروازے زوردار آوازوں کے ساتھ بند ہوئے اور دُوسرے ہی لمحے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ ہچکولے کھاتی ہوئی پختہ سڑک پر آئی اور کسی انجانی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں خاموش اور تن بہ تقدیر بیٹھا فی الحال میں نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ کچھ دیر خاموشی سے سفر جاری رہا۔ اس دَوران ایک بار میں نے یونہی ذرا پہلو بدلا تو فوراً دونوں طرف سے ریوالور کی نال کا دباؤ بڑھ گیا۔ ایسا ہی تھا جیسے وہ ذرا سا خطرہ محسوس کرکے باس کا اشارہ ملے بغیر ہی میرے جسم میں گولیاں اتار دیں گے... لیکن چند منٹ بعد بالآخر میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"اب میں تمہارے چنگل میں پھنسا ہوا ہوں۔ کہیں بھاگ تو نہیں سکتا۔ اگر بتا دیتے کہ تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو تو بہتر ہوتا... میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہوں"

"ہُوں...!" باس نے ہنکارا بھرا اور مُڑ کر دیکھے بغیر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "میرا خیال ہے بتا دینے میں کوئی حرج نہیں... بات یہ ہے نوجوان ایک حویلی میں داخل ہونا ہے۔ بہت بڑی حویلی ہے کی ضرورت نہیں۔ حویلی بالکل خالی پڑی ہے... تمہیں بس ایک کمرے کی بتی جلانا ہے۔ اس کے بعد تمہارا ختم۔ کمرے کا راستہ ہم تمہیں باہر سے سمجھا دیں گے۔"

"اگر یہ اتنا ہی آسان کام ہے تو تم خود کیوں نہیں لیتے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس میں کوئی مصلحت ہے جس سے تمہیں آگاہ کیا جا سکتا۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

"آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے طنزیہ میں کہا۔ "میں سمجھ گیا ہوں۔ تمہیں قربانی کا ایک چاہیے...!"

"یہ بات نہیں ہے۔" اس کا لہجہ بدستور پُرسکون "لیکن اگر تم یہی سمجھو تب بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہماری بات ماننے کے سوا تمہارے لیے چارہ ہی کیا ہے"

میں خاموش رہا۔ بھلا کہہ بھی کیا سکتا تھا؟

مزید چند منٹ بعد گاڑی ایک بار پھر کچے میں اُتری اور ایک ناہموار راستے پر دوڑنے لگی۔ دونوں طرف کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اس حصے میں سفر مختصر ہی رہا۔ جلد ہی گاڑی ایک جگہ کھلے میں جا رُکی۔ سامنے ہی ایک طویل و عریض حویلی کا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ حویلی کیا، ایک چھوٹا سا قلعہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چاردیواری کافی بلند اور سپاٹ تھی۔

اس نامعلوم شخص نے حویلی کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی کار کی بتیاں بجھا دی تھیں۔ تاہم بغور دیکھنے پر بہت سی چیزوں کا اندازہ ہو رہا تھا۔ حویلی کے مین گیٹ پر اتنا ایک بڑا سا تالا لٹکا ہوا تھا لیکن اس گیٹ کے اندر ہی ایک چھوٹا سا ذیلی دروازہ بھی تھا۔ اس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اندر سے بند ہے یا نہیں۔ حویلی میں مکمل تاریکی تھی۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کوئی ذی رُوح موجود نہیں ہے۔ ہم چاروں گاڑی سے اُتر چکے تھے۔ اُترتے وقت بھی میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کا انداز کچھ ایسا رہا تھا کہ ریوالور ایک لمحے کے لیے بھی میری پسلیوں سے نہیں ہٹے تھے۔

"تمہیں اس حویلی میں گھسنا ہے۔" باس ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "گیٹ کی سیدھ میں، برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر جو پہلا کمرہ پڑتا ہے، اس کی لائٹ آن کر دینا۔"

"ظاہر ہے میں گیٹ توڑ کر تو اندر نہیں جا سکتا...؟" میں نے کہا۔

"گیٹ توڑنے کے لیے کون کہہ رہا ہے؟" وہ شخص میرے تند لہجے کے جواب میں خاصی ملائمت سے بولا۔ "تمہیں وہ دائیں طرف والی دیوار پھلانگ کر اندر جانا ہے۔"

"لیکن دیوار اونچی اور شیشے کی طرح ہموار ہے۔ اس پر میں کیسے چڑھوں گا؟ کہاں پاؤں جماؤں گا؟" میں نے قدرے جھنجلا کر کہا۔

"تمہارا مشاہدہ کافی کمزور ہے۔" وہ شخص بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا دیا۔ "قصور دراصل تمہارا بھی نہیں... تمہاری لائن اس قسم کی نہیں ہے... تم واقعی شریف آدمی ہی معلوم ہوتے ہو ورنہ تمہاری نظر اس درخت پر ضرور جم جاتی جو اس دیوار سے بھی زیادہ بلند ہے اور جس کی شاخیں دیوار کے اوپر سے اندر جھکی ہوئی ہیں۔ درخت پر چڑھ کر انہی شاخوں سے اندر کودا جا سکتا ہے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چند قدم دائیں آؤ گے حتیٰ کہ تم... باغیچے کی درمیانی روش پر پہنچ جاؤ گے۔ جس پر سیدھے چلتے ہوئے تم برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچ سکتے ہو۔ جب تم ہمارے مطلوبہ کمرے کی لائٹ آن کر دو گے تو گیٹ کی درزوں سے ہلکی روشنی نظر آ جائے گی۔ ہمیں بس اسی سگنل کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد تم جس راستے سے چاہو حویلی سے باہر آ سکتے ہو۔"

میں نے ایک بار پھر صورتِ حال کا جائزہ لیا کہ اُن سے پیچھا چھوٹنے کا کوئی امکان ہے یا نہیں لیکن مجھے کوئی راہِ فرار نظر نہ آئی۔ دونوں ریوالور بردار کچھ فاصلے پر مجھے نشانے پر لیے مستعد کھڑے تھے۔ بالآخر میں نے ایک گہری سانس لی اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور ٹہلنے کے سے انداز میں اس درخت کی طرف چل دیا۔ دونوں ریوالور بردار میرے پیچھے آ رہے تھے۔ درخت پر چڑھنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں اپنے ربڑ سول کے جوتوں سمیت بھی چڑھ سکتا تھا۔ دیوار کے اُوپر سے درخت کی کئی شاخیں حویلی کے اندر جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے ان میں سے مضبوط ترین شاخ کا انتخاب کیا اور اس پر بندر کی طرح لٹکتے ہوئے کچھ آگے بڑھ کر پنجوں کے بل چھلانگ لگا دی۔ بلندی خاصی تھی لیکن ایک تو میں نے چھلانگ خاص تکنیک سے لگائی تھی، دُوسرے میرے پاؤں جہاں ٹکے، وہاں زمین نرم تھی اِس لیے نہ تو مجھے دھچکا لگا اور نہ ہی زیادہ دھمک پیدا ہوئی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی لیکن دوسرے ہی لمحے میری اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی کیونکہ میں نے بائیں ہاتھ پر، کہیں قریب سے ہی خوفناک غراہٹ سُن لی تھی۔

میں صحیح طور پر اِدھر اُدھر دیکھ بھی نہیں پایا کہ قریب ہی کہیں سے سرسراہٹ سنائی دی اور دُوسرے ہی لمحے ایک کتے نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ گھپ اندھیرے میں مجھے اس کے رنگ یا نسل کا اندازہ تو نہیں ہو سکا... اور ہو بھی جاتا تو میں کیا کر لیتا... خوفناک بات تو یہ تھی کہ وہ بدبخت جسامت میں تقریباً گدھے کے برابر تھا۔ وہ توپ کے گولے کی طرح مجھ سے ٹکرایا اور میں دُور جا گرا۔ دُوسرے ہی لمحے

میں نے دیکھا کہ وہ میرے سینے پر سوار ہے۔ میں اس کا کھلا ہُوا منہ اور لمبے لمبے دانت صاف دیکھ سکتا تھا۔ اگر میں نے اُسے سینے سے اُچھال پھینکنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کی ہوتی تو شاید وہ میرے نرخرے میں دانت گاڑ چکا ہوتا۔ اس عظیم الجثہ کتے کے لیے کسی انسان کی گردن اُدھیڑ ڈالنا شاید دو چار سیکنڈ کا کام تھا۔

میں نے اُسے دونوں ہاتھوں سے اُچھال تو پھینکا لیکن دُوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر دوبارہ مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اُس وقت تک میں اُٹھ بھی نہیں سکا تھا۔ تاہم قسمت کو شاید مجھ پر رحم آگیا تھا کہ اسی لمحے احاطے میں تیز روشنی پھیل گئی اور ایک بارعب آواز گونجی "ٹامی... اسٹاپ!"

اُس وقت تک کتا دوبارہ میرے سینے پر سوار ہو چکا تھا۔ میں اِضطراری انداز میں کپڑے جھاڑتا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا، حالانکہ اس وقت ان کپڑوں کو جھاڑنا کپڑوں کے ساتھ محض مذاق ہی معلوم ہو رہا تھا۔ کپڑوں کی حالت ایسی بُری تھی کہ انھیں جھاڑنے کی بجائے پھاڑنا ہی زیادہ مناسب رہتا۔ کتا میرے قریب ہی کھڑا تھا اور زور شور سے دُم ہلا رہا تھا۔ وہ گویا میری تِکّا بوٹی کرنے کے لیے مالک کے اشارے کا منتظر تھا۔ مالک سامنے ہی چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے اُس کا سرتاپا جائزہ لیا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔ ادھیڑ عمر تھا اور وضع قطع سے کوئی اُونچے درجے کا زمیندار نظر آتا تھا۔ گھنی مونچھیں اُوپر کو اُٹھی ہُوئی تھیں اور جبڑے کا گوشت ذرا لٹکا ہُوا تھا۔ وہ سفید بُراق شلوار اور سیاہ شیروانی میں تھا۔ سر پر جناح کیپ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی کہیں باہر سے آیا ہے یا پھر شاید باہر جانے کے لیے تیار ہُوا ہے مگر میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ تاریک احاطے میں کتے کو ساتھ لیے کھڑا کیا کر رہا تھا؟ اور اس سے بھی زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی جس کا رُخ میری طرف ہی تھا۔ میرا تو وہی معاملہ تھا، کہ آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا۔ ریوالوروں سے بچا تو رائفل سے سامنا ہو گیا۔ میری تو گویا شامت ہی آئی ہوئی تھی۔

"چوری کرنے آئے تھے؟" وہ گونج دار آواز میں بولا "کسی نے تمھیں بتایا نہیں تھا کہ یہ کس کی حویلی ہے؟"

"کیا میں حُلیے سے آپ کو چور نظر آتا ہُوں؟" میں نے دِھیمے لہجے میں بولا۔

"نہیں... حُلیے سے تو تم بہت معزز نظر آ... ہو" وہ طنزیہ لہجے میں بولا "بالکل یہی معلوم ہو رہا ... کسی ملک کا شہزادہ جشنِ تاج پوشی سے فارغ ہو کر ... اِدھر آگیا ہے" پھر وہ ڈپٹ کر بولا "سیدھی طرح ... کہ تم کون ہو۔ ورنہ ابھی گولی سینے میں اُتار کر لاش ... احاطے میں دفن کرا دُوں گا"

میں نے ایک لمحے سوچا اور بالآخر ایک فیصلے ... گیا۔ میرے خیال میں اس وقت میرے پاس صرف ... ہی ڈھال رہ گئی تھی اور وہ تھی سچائی... میں نے اس ... کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے نہایت شُستہ ... انگریزی میں کہا "جناب! میں ایک شریف اور ... لکھا آدمی ہُوں۔ حالات نے مجھے اس طرح گھیر لیا ... کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل رہا۔ میں قسم کھانے کو تیار ... کہ یہاں چوری کی نیت سے داخل نہیں ہُوا۔ بلکہ یہاں ... میں میری مرضی کو بھی دخل نہیں تھا۔ اگر آپ مجھے س... اور اطمینان سے بات کرنے کا موقع دیں اور اس خو... کتے کو میرے پاس سے ہٹا لیں تو میں آپ کو اپنی سا... داستان سُنا دُوں گا۔ آپ کو مجھ سے کوئی خطرہ مح... نہیں کرنا چاہیے۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ..." میں نے اپنی جیبیں اُلٹ کر اور کپڑے جھٹک کر اُس ... کو دکھا دیے۔

اس نے چند لمحے تک کوئی جواب نہ دیا۔ خامو... سے ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ گویا نظروں ہی نظر... مجھے تول رہا تھا، دل ہی دل میں میری باتوں کا تج... کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے میرے حق میں فیصلہ دے ... اُس کا اندازہ مجھے اس بات سے ہُوا کہ اس نے رائ... کی نال جھکالی۔ اِس مرتبہ وہ بولا تو اس کے لہجے میں نر... تھی "میں تمھاری بات کا یقین کر لیتا ہُوں، نوجوان ... لیکن یاد رکھنا جو لوگ مجھے مکّاری اور غلط بیانی ... ذریعے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، ان ... انجام عبرتناک ہوتا ہے"... پھر اُس نے کتے کو اپنے ... پاس بُلا لیا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ... "اِدھر چلو"

اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے میں حویلی کی ... عمارت کی طرف چل دیا اور بالآخر ایک کمرے ... داخل ہوا۔ یہ مشرقی طرز پر سجی ہُوئی ایک کُشادہ خوابگاہ ... جہاں رنگین پایوں والی بہت سی کُرسیاں بھی رکھی ... "بیٹھ جاؤ" اس نے ایک کُرسی کی طرف اشارہ کیا ... نے سعادت مندی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا ... خود بھی کچھ فاصلے پر ایک دُوسری کُرسی پر بیٹھ گیا ... اُس نے گود میں رکھ لی۔ کتا اس کے قدموں میں ... گیا تھا۔ "ہاں... اب کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" ... نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اُسے ابتدا سے تو نہیں لیکن چند دن پہلے ... لے کر اب تک پیش آنے والے تمام واقعات ... کا ... دکا ست سُنا دیے۔

"حیرت ہے..." میرے خاموش ہونے پر وہ بولا۔ ... ری زندگی تو واقعی ایک طویل، ایکشن فلم بن کر رہ گئی ... اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ پھر... ... قت ہی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ کچھ مضطرب ... لہجے میں بولا "اُن تین آدمیوں کے حُلیے تو ذرا تفصیل ... بتاؤ، جنھوں نے تمھیں یہاں گھسنے پر مجبور کیا تھا"

میں نے ان کے حُلیے بتائے تو وہ رائفل سنبھال کر ... اری سے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا، لیکن دُوسرے ... بیٹھ گیا اور بڑبڑانے لگا "اُن کی تلاش میں جانا ... ل ہے۔ اب تو باہر اُن کا سُراغ بھی نہیں رہا ہوگا" ... پھر وہ ایک گہری سانس لے کر مجھ سے مخاطب ہُوا۔ ... نے اُن لوگوں کے جو حُلیے بیان کیے ہیں، اس سے ... سمجھ گیا ہُوں کہ وہ کون لوگ تھے اور اسی لیے مجھے ... ری کہانی پر بھی یقین آگیا ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا ... وں نے تمھیں قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کیوں کی؟"

"آپ تو کوئی بات سمجھ بھی گئے ہیں، میں تو سرے ... سے بھی نہیں سمجھا" میں نے بے چارگی سے کہا۔

وہ ایک بار پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور ... کے بعد اسے گویا یاد ہی نہیں رہا کہ میں بھی کمرے میں موجود ... ۔ بالآخر سکوت سے اُکتا کر میں نے کھنکار کر گلا ... صاف کرتے ہُوئے کہا "میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟"

"تمھارے لیے...؟" اُس نے چونک کر میری طرف ... "ہاں... تم چاہو تو جا سکتے ہو۔ ظاہر ہے اِس معاملے میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔ تم تو حقیقتاً حالات کے ستائے ہوئے ہو"

میں اس کا شکریہ ادا کر کے اُٹھنے لگا تو وہ خود ہی بولا "لیکن رات کے اِس پہر... اس حُلیے... اور ان حالات میں تم کہاں جاؤ گے؟ میرا خیال ہے میں اتنی مدد تو کر سکتا ہُوں کہ تمھیں آج رات یہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دُوں۔ اس کمرے میں سو جاؤ۔ صبح چلے جانا"

"بہت شکریہ... یہ آپ واقعی مجھ پر احسان کر رہے ہیں" میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ علاقہ کون سا ہے؟ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں کہاں بھٹک رہا ہوں اور صبح اُٹھ کر لاہور پہنچنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"یہ قصور کا نواحی علاقہ ہے" وہ دوستانہ لہجے میں بولا "لاہور یہاں سے تقریباً چھبیس میل دُور ہے۔ جس سڑک سے تم کچے میں اُترے تھے، اسی پر لاہور جانے والی بسیں مل جاتی ہیں لیکن اگر تم چاہو تو صبح میں تمھیں اپنی گاڑی میں لاہور بھجوا دُوں گا"

"بہت بہت شکریہ چوہدری صاحب!" میں نے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ قسمت کی ستم ظریفی پر واقعی میرا ہنسنے کو جی چاہ رہا تھا اور رونے کو بھی... ابھی کچھ دیر پہلے اس شخص کا کتا میرا نرخرہ اُدھیڑنے لگا تھا اور وہ خود مجھ پر رائفل تانے کھڑا تھا مگر اب وہ اپنے گھر میں قیام کرنے کی اجازت دے رہا تھا۔ سچ بولنا بہرحال میرے لیے فائدہ مند ہی رہا تھا۔

وہ اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "میں تمھارے ساتھ کچھ دیر گپ شپ بھی کرتا لیکن میں خود اِس وقت ایک طویل سفر سے واپس آیا ہُوں اور جسمانی طور پر کم اور ذہنی طور پر زیادہ تھکا ہُوا ہُوں۔ اِس لیے آرام کرنے جا رہا ہُوں۔ تم بھی بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ اندر سے کُنڈی ضرور لگا لینا"

اُس کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کر کے کُنڈی لگائی اور جُوتے اُتار کر دھم سے بستر پر گر پڑا... میرے کپڑے اتنے گندے ہو چکے تھے کہ میرے لیٹتے ہی صاف ستھرے بستر کی حالت بھی متغیر ہونے لگی۔ لیکن میں نے اس تغیر پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ میں تھکن سے چُور

تھا۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ چند منٹ بعد ہی میں دُنیا وَمافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کافی بلندی پر واقع رَوشندان سے دُھوپ کمرے میں آ رہی تھی۔ میں نے اُٹھ کر ملحقہ غسل خانے میں جا کر اپنا حلیہ حتی الامکان دُرست کیا۔ غسل خانہ بھی پُرانی طرز کا تھا۔ وہاں کھونٹیوں پر بہت سے مَردانہ ملبُوسات لٹکے ہُوئے تھے۔ جو یقیناً دُھلائی کے منتظر تھے لیکن میرے لیے تو اس وقت نہایت صاف سُتھرے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک قدرے صاف سُتھرا جوڑا پہن لیا۔ مجھے اُمید تھی کہ مالکِ مکان نے جہاں اس حد تک مہربانی کی تھی کہ مجھ اجنبی کو گھر میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی تھی، وہاں وہ میری یہ "پیش قدمی" بھی برداشت کر لے گا۔ تیار ہو کر میں بڑے خوشگوار موڈ میں غسل خانے سے نکلا اور دروازے پر آیا۔ کُنڈی کھول کر جب میں نے دَروازہ کھولنے کی کوشش کی تو اندازہ ہُوا کہ اسے باہر سے بند کر دیا گیا ہے۔

میری ساری خوشی یک لخت کافور ہو گئی اور میں نے دَروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا مگر اس کا بھی کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہُوا۔ باہر بدستور سکوت طاری رہا۔ بالآخر میں چلّانے لگا "چودھری صاحب! دَروازہ کھولو... بھئی یہ کیا حرکت ہے؟"

میری اس چیخ پکار کا بھی کوئی جواب نہ آیا تب تو میرے جسم سے پسینہ پھُوٹنے لگا۔ عجیب ہی چکر تھا وہ شخص جو گزشتہ رات میرا اتنا ہمدرد بن گیا تھا، آخر مجھے کیوں اس طرح قید کر گیا تھا؟ کیا میں نے اس پر اعتماد کر کے غلطی کی تھی؟ انہی سوالوں سے اُلجھتے ہُوئے میں نے ایک بار پھر گویا آخری اُمید کے سہارے دَروازہ پُوری قوت سے دَھڑ دَھڑایا۔ اِس مرتبہ میری کوشش رنگ لے آئی۔ باہر برآمدے میں کوئی سُست سے انداز میں سلیپر گھسیٹتا ہُوا چلا آ رہا تھا۔ فرش پر رگڑ کھاتے ہُوئے سلیپروں کی گھس گھس سُنائی دے رہی تھی۔

یہ چال چودھری کی تو معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن پھر میں نے سوچا شاید نیند کے خمار کی وجہ سے اس طرح چل رہا ہو... اس وقت تک میری کھوپڑی تپ چکی تھی۔ اور میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ دَروازہ کھولنے والا خواہ چودھری ہو یا کوئی اور، اُسے فوراً شاندار قسم کے دو چار
ضرور رسید کر دُوں گا اور اُسے بتا دوں گا کہ میں ا
بھی نہیں ہوں کہ ہر کوئی مجھے گھر کی مرغی سمجھ کر جیسا
سلوک شروع کر دے۔

کھٹ کی آواز کے ساتھ دَروازے کا بولٹ
میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر خود ہی ایک جھٹکے
کھول کر کچھ اس طرح کمرے سے نکلا جیسے کمان
نکلتا ہے مگر دوسرے ہی لمحے ٹھٹک کر رہ گیا۔ میرا
کا اُٹھا رہ گیا اور مجھے اپنے غصّے پر ہنگامی بُنیاد
باندھنا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ جس شخص نے دَروازہ
وہ اِتنا کمزور اور معمّر تھا کہ اگر میں نے طیش
اُسے گھونسہ رسید کر دیا ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ د
سے گِرتا اور دم توڑ دیتا۔

وہ چُندھی آنکھوں سے مشکوک انداز میں
دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ جیسے سنبھل کر اپنے لہجے کو حتی
بارُعب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "
تم؟ اور اس کمرے میں کس طرح مقید ہو کر

"یہ تو میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔ اس چودھری کو بُلاؤ۔" میں نے گھونسہ تانا ہوا
ہُوئے کہا۔ "میں اس سے پُوچھوں گا کہ اُسے اس
کی کیا ضرورت تھی؟"

"کون چودھری؟ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟"
مزید حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "حویلی میں تو
میری بیوی کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ حویلی
کئی دنوں سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔"

اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ بول
نے بغور اس کی طرف دیکھا پھر نرم پڑتے ہوئے
وہ کون تھا، جو رات مجھے احاطے میں نظر آیا
لمبا تڑنگا اور بارُعب سا آدمی۔ جس کے ہاتھ
تھی... ایک بھاری بھرکم کتا بھی تھا۔ اس کے

"اس حویلی کے مالک چودھری حمید
ہیں تو لمبے تڑنگے ہی آدمی... لیکن میں نے بتا
تو اپنے پُورے کنبے کے ساتھ کئی دن سے لا
ہیں اور ابھی مزید کئی دن تک نہیں آئیں گے
کا کوئی خاندانی تنازعہ ہے جسے نمٹا

دری بات یہ کہ اُن کے پاس کوئی کتا نہیں ہے۔ جب
میں آیا ہوں، تب سے میں نے تو نہیں دیکھا... اور مجھے
وم ہے کہ وہ کتوں کو پسند نہیں کرتے۔" اس بُوڑھے
بتایا۔

میں چکرا کر رہ گیا۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا۔
ادل کہہ رہا تھا کہ بوڑھا سچ بول رہا ہے اور جو کچھ میں
رہا تھا، وہ بھی غلط نہیں تھا۔ لیکن حالات کی کوئی نہ
ی کڑی غائب تھی جسے ہم دونوں ہی جاننے سے
تھے۔ بُوڑھے کے محسوسات بھی غالباً مجھ سے مختلف نہیں
۔ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا "تمھارا چہرہ بتا رہا
کہ تم جھُوٹ نہیں بول رہے۔ لیکن کوئی نہ کوئی ایسی
ضرور ہے جسے ہم دونوں ہی سمجھ نہیں سکتے۔ اس لیے
ت کو چھوڑو اور جہاں سے آتے ہو، وہیں واپس
لے جاؤ۔"

"تم یہاں ملازم ہو بابا؟" میں نے ملائمت سے پُوچھا۔

"ملازم ہی سمجھ لو۔ ملازمت کیا ہے بس زندگی کے
پُورے کر رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی دَر
"ہم میاں بیوی مصیبت زدہ تھے۔ چودھری صاحب
رس کھا کر پناہ دے دی۔ سر چھُپانے کو ایک سرونٹ
رٹر دے دیا۔ اتنا بھروسہ کیا کہ پوری حویلی ہم دو
یفوں کے سر پر چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ ان کا احسان
... مہربانی ہے۔"

"بے شک۔" میں نے آہستگی سے کہا اور بُوڑھے کو
کر کے رخصت ہونے لگا۔ تب اُسے جیسے کچھ یاد آ
آواز دے کر مجھے روکتے ہوئے بولا "اگر تم رات سے
رے میں بند تھے تو اس کا مطلب ہے کہ تمھیں بھُوک
رہی ہو گی۔ آؤ، میرے ساتھ آؤ... میری بیوی
تا تیار کر رہی ہے۔ اب کچھ کھا کر ہی جانا۔ ہم غریب
ہیں۔ جو بھی رُوکھی سُوکھی ہے، حاضر ہے۔"

میرے پیٹ میں چوہے نہ صرف دوڑ رہے تھے بلکہ
پ اور لانگ جمپ کے مقابلوں میں بھی حصّہ لے
تھے۔ بھُوک سے واقعی میرے پیٹ میں بل سے پڑ
تھے۔ اس لیے میں نے تکلّف نہیں کیا اور اس کے
تھ ہو لیا۔ بوڑھے کا سرونٹ کوارٹر حویلی کی عقبی دیوار
لا ہُوا تھا۔ اس سے متصل دو اور کوارٹر بھی نظر آ رہے
تھے لیکن اُن پر تالے لگے ہُوئے تھے۔ میں بُوڑھے کی رہنمائی میں اُس کے کوارٹر میں داخل ہوا۔ چھوٹے سے صحن سے گزر کر ہم ایک کمرے کی طرف بڑھے۔ صحن کے اختتام پر کچن تھا۔ جس کا دَروازہ نہیں تھا۔ اس کچن سے ایک بڑھیا نے جھانک کر ہمیں دیکھا۔ وہ غالباً لکڑیوں والے چُولھے پر کچھ پکا رہی تھی۔ اس کی سوالیہ نظر مجھ پر جم کر رہ گئی۔ بُوڑھا کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ایک لمحے کے لیے رُک کر گویا وضاحت کرتے ہُوئے بولا "یہ چودھری صاحب کا مہمان ہے۔"

بڑھیا نے یہ سُن کر طمانیت سے سر ہلایا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ہم کمرے میں آ گئے۔ مختصر سا کمرہ تھا اور مختصر سا ہی اس میں سامان بھی تھا۔ دو چارپائیاں ایک ٹرنک، چند برتن، ایک کُرسی اور دو چار دوسری چھوٹی موٹی چیزیں۔

"تم یہاں بیٹھو... میں تمھارے لیے اچھا سا ناشتا تیار کراتا ہوں۔" بُوڑھے نے میرے لیے وہاں موجود اکلوتی کُرسی کو کپڑے سے جھاڑتے ہوئے کہا۔ مجھے بٹھا کر وہ خود اپنی بیوی کے پاس کچن میں چلا گیا۔

میں اطمینان سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا لیکن دُوسرے ہی لمحے مجھے ایک جھٹکے سے ٹانگیں سکیڑنی پڑیں۔ میری نظر اچانک ہی کارنس پر رکھی ہوئی ایک تصویر پر پڑی تھی اور مجھے گویا بجلی کا جھٹکا لگ گیا تھا۔ تصویر تو انہی بڑے میاں اور اُن کی بیگم کی تھی، جن کا میں اس وقت مہمان بنا بیٹھا تھا لیکن ان کے پیچھے ایک اور شخصیت بھی کھڑی تھی۔

وہ اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے اس بُوڑھے جوڑے سے الگ تھلگ ہی نظر آ رہی تھی۔ یہ چہرہ میرے ذہن پر نقش تھا۔ اُسے میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ اِس ہستی نے جہاں میرے دل میں معصوم اور بے عنوان سی مسرتوں کے پھُول کھلائے تھے، وہیں یہ دَرحقیقت میرے مصائب اور مسائل کا نقطۂ آغاز بھی رہی تھی۔

وہ نازو تھی... میں اس کو پہچاننے میں ہرگز غلطی نہیں کر رہا تھا۔ وہی لب و رخسار، وہی جھیل سی آنکھیں... اور وہی ملکوتی مسکراہٹ... بلاشبہ یہ وہی نازو تھی جو میری

زندگی میں نسیم سحری کے جھونکے کی طرح آئی تھی لیکن اس کے بعد سے میری زندگی ایک مسلسل ہنگامہ بن کر رہ گئی تھی وہ تو غائب ہو گئی تھی۔ لیکن میری زندگی کی ہلچل، افراتفری اور ہنگامہ خیزی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ ناقابلِ فہم واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ایک معمہ حل نہیں ہوتا تھا کہ دُوسرا سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔ معلوم نہیں زندگی مجھے کہاں لیے جا رہی تھی۔

نازو کو ڈھونڈنے کے لیے میں نے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے۔ کہاں کہاں زندگی کو داؤ پر نہیں لگایا تھا مگر کہیں اس کا سُراغ نہیں پایا تھا اور اب جبکہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس حویلی میں اس کا کوئی سُراغ پا سکوں گا تو یہاں مجھے اس کی تصویر نظر آ گئی تھی۔ حالانکہ میں یہاں محض حادثتاً ہی پہنچا تھا۔ وقت کچھ عجیب انداز میں میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ میں بے اختیار اٹھا اور خواب کے سے عالم میں چلتا ہوا اس فریم شدہ تصویر تک جا پہنچا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چھوٹی سی کوئی تصویر نہ ہو بلکہ خود نازو سامنے کھڑی، میری حالت پر مسکرا رہی ہو، بزبانِ خموشی پوچھ رہی ہو: "کہو دیوانے! کیا حال ہے؟ کچھ سمجھ میں آیا کہ زندگی کسے کہتے ہیں؟"

میں نے تصویر اٹھا لی اور سحر زدہ سا اسے قریب سے دیکھنے لگا۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر تک یونہی دیوانوں کی طرح اس تصویر کو تکتا رہتا کہ بوڑھے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کمرے میں واپس آ چکا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو بابو جی؟ ہم بڑے بوڑھوں کا دل رکھنے کو کبھی کبھی کوئی مہربان ہماری تصویر کھینچ دیتا ہے۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

"یہ... یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے تصویر اس کی طرف کر کے نازو کے چہرے پر انگلی رکھتے ہوئے سرسراتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

بوڑھے کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا جیسے اس کی کوئی سنگین چوری پکڑی گئی ہو۔ اُسے گویا یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اس تصویر میں ان میاں بیوی کے علاوہ بھی کوئی نظر آ رہا ہے۔

"یہ... یہ... میری بیٹی ہے... اور کون ہے۔" وہ ہکلایا۔ الفاظ اُس کی زبان سے ادا ضرور ہوئے مگر رُوح سے خالی تھے۔ "اس کا نام زرینہ ہے۔"

"جھوٹ مت بولو۔" میں نے سخت لہجے میں کسی بھی اعتبار سے تمہاری بیٹی نظر نہیں آ رہی۔"

"تم کون ہوتے ہو فتوے دینے والے کہ یہ بیٹی ہے یا نہیں؟ تمہیں اس سے کیا غرض؟" اس سنبھل چکا تھا اور اس کے لہجے میں تیزی آ چکی

"میں اس لیے صحیح بات جاننا چاہتا ہوں کہ کی تلاش میں ایک عرصے سے پریشان ہو رہا میں اسے زرینہ نہیں بلکہ نازو کے نام سے جانتا ایک بار مجھے مل کر پُراسرار حالات میں غائب تھی اور تبھی سے میں بھی پُراسرار حالات میں پھر رہا ہوں۔ میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے بتانا پڑے گا کہ یہ اس وقت کہاں ہے اور اس کا کیا تعلق ہے؟" میں نے ایک ایک لفظ پر ہوئے یہ سب کچھ کہہ دیا تھا۔

"تمہارا شاید دماغ خراب ہو گیا ہے بدستور سخت لہجے میں بولا۔ "یا پھر تمہیں شدید غلط رہی ہے۔ میری بیٹی تو کئی سال پہلے مر چکی ہے کہاں سے مل گئی تھی، وہ؟ اور ہاں اپنی بات کرنے اور شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ یہ مت سمجھنا کہ یہ حویلی میں ہے اور تم مجھ پر کوئی سختی کر کے اپنے اُوٹ سوالوں کے جوابات حاصل کرنے کی کوشش یہاں آس پاس بہت سے گھر ہیں۔ میں شور مچا کر کو بُلا لوں گا اور تمہیں چور کہہ کر پکڑوا دُوں تمہارے ساتھ نیکی کرنے اور تمہارے کام کی کوشش کر رہا تھا لیکن تم معلوم نہیں کس چکر میں ہو۔ بہتر یہی ہے کہ تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس پر سختی کرنے فائدہ نہ ہو گا۔ میں اس سے کچھ معلوم نہ کر سکوں گا ناشتے سے بھی محروم رہ جاؤں گا، جو وہ میرے تیار کر رہا تھا اور اس وقت میں ناشتے سے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے کچھ معلوم کر لیے کوئی اور تدبیر سوچنا ضروری تھا۔ چنانچہ میں

ک کر شکست خوردہ سے لہجے میں کہا۔ "شاید مجھے فہمی ہوئی ہے... عجیب اتفاق ہے، بابا... تمہاری کی شکل واقعی حیرت انگیز حد تک اس لڑکی سے ملتی جس کا میں تذکرہ کر رہا ہوں۔ خیر میرا خیال ہے مجھے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے اور ناشتہ کر کے اپنی لینی چاہیے۔"

بوڑھے کے چہرے پر کچھ طمانیت جھلک آئی، تاہم وہ قدرے توقف کے بعد بولا تو اس کے لہجے کھائی برقرار تھی۔ "بیٹھو... میں تمہارے لیے ناشتا ہوں۔"

میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ بوڑھا غیر ارادی طور پر فریم دہ تصویر الٹی کر کے رکھ گیا تھا۔ اِس کا مطلب تھا کے دل میں چور تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ناشتا لے آیا۔ گھی اور کئی انڈوں کے آملیٹ کے علاوہ ایک پلیٹ میں نکلا ہوا مکھن بھی موجود تھا۔ گھی، دُودھ کی شاید میں خوب فراوانی تھی۔ تبھی پراٹھوں کے ساتھ بھی رکھا ہوا تھا۔

میں نے ناشتا کیا اور اس دوران غور بھی کرتا میں جب لاہور میں نازو کو ڈھونڈتا ہوا کرشن نگر اس مکان تک پہنچا تھا جہاں وہ اس شخص کے ساتھ رہی تھی۔ جو اپنے آپ کو اس کا چچا کہتا رہا تھا، تو وہاں کوئی بھی نہیں ملا تھا۔ مکان پر تالا لگا ہوا تھا... ایک پڑوسی سے معلوم ہوا تھا کہ نازو جب اس میں رہنے آئی تھی تو وہ ایک مفلوک الحال سے بوڑھے کے ساتھ تھی۔ اِس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ ا جوڑا وہی تھا، جس کا اس شخص نے ذکر کیا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال میں لاہور واپس چلا ہوں اور کسی طرح اس پڑوسی کو آمادہ کر کے ساتھ لاتا جس نے اِن میاں بیوی کو اچھی طرح دیکھا ہوا تھا۔ کے سامنے تو انھیں اپنی اصلیت کا اقرار کرنا ہی پڑے اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں کافی حد تک پُرسکون تھا۔

ناشتا کر کے میں نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا۔ اس نیم سی سرد مہری سے مجھے خدا حافظ کہا اور میں حویلی نکل کر پگڈنڈی پر دو تین فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پختہ سڑک پر آ گیا۔ مجھے خاصی دیر انتظار کرنا پڑا۔ تب کہیں جا کر ایک کھٹارا سی بس آئی جو لاہور جا رہی تھی۔ میری جیب میں تھوڑی سی رقم موجود تھی۔ اِس لیے کرائے کے سلسلے میں پریشان نہیں ہونا پڑا۔

بادامی باغ اتر کر، میں تانگے میں بیٹھ کر راوی روڈ جا پہنچا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت گلنار اپنے راوی روڈ والے مکان میں ہو گی۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ وہ واقعی وہیں موجود تھی اور میری گمشدگی پر میری توقعات سے کہیں زیادہ پریشان تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔

"اگر تم دو چار گھنٹے اور نہ آتے تو شاید میں پریشانی اور وحشت سے پاگل ہو جاتی۔" وہ برآمدے میں پڑی ہوئی ایک آرام کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔ گھر میں اس وقت اس کے علاوہ صرف ایک ادھیڑ عمر کا نوکر اور اس کی بیوی موجود تھی۔ ملازم، صحن میں پودوں کو پانی دے رہا تھا اور ملازمہ، گلنار کے لیے ایک گلاس میں گلوکوز تیار کر رہی تھی۔ "تمہارے بارے میں سوچتے سوچتے میرا دل ڈوب جاتا تھا... کئی بار مجھے یوں لگا جیسے میری دھڑکن رُک جائے گی۔" وہ تھکے تھکے سے انداز میں بولی اور ملازمہ کے ہاتھ سے گلاس لے کر گلوکوز کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔

میں اس کے سامنے دُوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور کئی لمحے تک خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں جب بھی اس کی طرف غور سے دیکھتا تھا، مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکی کوٹھے پر بیٹھی ہو گی۔ وہ کوٹھے پر بیٹھنے کے باوجود اُس بازار کی مخلوق نہیں تھی۔ اس میں حیا بھی تھی اور وفا بھی... اس احساس سے مجھے ناقابلِ شکست حوصلہ ملتا تھا کہ دُنیا میں کوئی میرے لیے اتنا سوچتا تھا، اتنا فکرمند ہوتا تھا، اتنی تشویش محسوس کرتا تھا۔

"تم پر کیا گزری تھی؟" وہ گلاس خالی کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

میں چونک کر منتشر خیالوں کی دُنیا سے نکلا اور اُسے اپنی رام کہانی سنانے لگا۔ سب کچھ سن کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اُس کے کھلے بال کرسی سے نیچے جھول رہے تھے اور فرش کو تقریباً چھو رہے تھے۔

"خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے اُسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"میں خوف زدہ نہیں ہوں۔" وہ گویا میری سادگی سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرائی۔ "خوف زدہ تو میں صرف اس تصوّر سے تھی کہ تمھیں کچھ ہو نہ جائے۔ تم بخیر و عافیت واپس آگئے ہو تو میرے سارے خوف دُور ہو گئے ہیں... میں تو تقدیر کی مسلسل ستم ظریفیوں سے گھبرا گئی تھی۔ ایک معمّہ حل نہیں ہوتا کہ دُوسرا سامنے آجاتا ہے۔ ایک گتھی سلجھتی نہیں کہ ہم دُوسری میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ مار دھاڑ ہے کہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس چکّر میں پھنس گیا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "لیکن ایک چیز بہرحال سمجھ گیا ہوں کہ اُن نامعلوم لوگوں کو جب تک وہ ڈائری نہیں ملے گی، وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور مجھے جب تک نازو نہیں ملے گی تب تک پتہ نہیں چلے گا کہ وہ ڈائری کہاں ہے؟"

"تو پھر اب تم اس سلسلے میں کیا کرو گے؟" اس نے پُوچھا۔

میں نے بتایا کہ میں کرشن نگر سے اس شخص کو ساتھ لے کر واپس حویلی جانا چاہتا ہُوں۔ جس نے اس بوڑھے جوڑے کو اچھی طرح دیکھا ہوا تھا۔

"یہ کوئی اچھی تدبیر نہیں سوچی، تم نے..." وہ بلا تامل بولی۔

"حالات ایسے ہیں کہ میرا ذہن قابلِ رشک انداز میں کام نہیں کر رہا۔" میں نے تسلیم کیا۔

"ضروری نہیں کہ وہ شخص تمھارے ساتھ جانے پر آمادہ ہو جائے۔ آخر اسے ایسی کیا مصیبت پڑی ہے؟ لوگ اس قسم کے معاملات میں، لالچ کے تحت بھی ملوّث ہونا پسند نہیں کرتے جن کا کوئی سر پیر سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔" گلنار بولی۔ "بالفرضِ محال وہ تمھارے ساتھ چلا بھی گیا اور اس نے اُس بوڑھے اور اُس کی بیوی کو پہچان لیا، تب بھی ضروری نہیں ہے کہ بُوڑھا زبان کھول دے۔ وہ جب تمھیں جھٹلا سکتا ہے تو اس شخص کو جھٹلانے میں اُسے کیا تامل ہوگا؟"

اُس کی دلیل بڑی معقول تھی۔ "تو پھر اب کیا کرنا چاہیئے؟" میں نے پُوچھا۔

"میں تمھارے ساتھ چلوں گی۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "زمانے سے تم اتنا کچھ نہیں سیکھ پائے [illegible] نے سیکھا ہے۔ میں اُن میاں بیوی کو بہلا پھسلا کر [illegible] کرنے کی کوشش کروں گی۔ ہم کچھ رقم بھی ساتھ لے [illegible] شاید لالچ کا حربہ کام آجائے۔"

میں ایک ٹک گلنار کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ "تو [illegible] چلنا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آج تو مجھ میں سفر کی ہمت نہیں... کل چلیں [illegible]" وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔

"ٹھیک ہے... تو پھر میں چلتا ہوں۔" میں [illegible] ہوئے کہا۔

"کہاں؟" گلنار نے حیرت سے پُوچھا۔

"شاہی بازار والے کمرے کی طرف جا رہا [illegible]"

"پاگل ہوئے ہو؟" وہ تیزی سے بولی۔ "وہ [illegible] نامعلوم دشمنوں کی نظر میں آچکا ہے۔ اب اُدھر کا [illegible] اس کی بجائے بالاخانے کے پچھلے کمرے میں چلے جا[illegible] جہاں تم پہلی بار آکر ٹھہرے ہوئے تھے... پھر [illegible] ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "میں تمھیں یہاں بھی ٹھہرا [illegible] لیکن یہاں میرے ساتھ میری معذور خالہ رہتی [illegible] نے مجھے ماں کی طرح پالا ہے۔ میں ان کا بہت [illegible] کرتی ہوں۔ اُن کے سامنے میں کسی غیر مرد کو [illegible] ٹھہرا سکتی۔" پھر وہ مسکرائی۔ "میری نظر میں تم اب [illegible] رہے لیکن ان کی نظروں میں تو غیر ہو، نا...!"

اس کا اندازِ گفتگو، رہن سہن اور عاد[illegible] کسی بھی عام گھریلو لڑکی سے مختلف نہیں تھیں [illegible] کیوں مجھے اس بات پر حیرت ہوتی تھی۔ میں [illegible] نظر اُسے دیکھ کر رہ گیا۔ بالآخر میں نے ایک [illegible] لی اور اسے خدا حافظ کہہ کر باہر آگیا۔

وہ رات میں نے بالاخانے کے عقب[illegible] تنگ و تاریک اور سیلن زدہ کوٹھری میں گزار[illegible] روز میں نے بازار جا کر ناشتا کیا اور کوٹھری میں [illegible] گیا۔ کچھ ہی دیر بعد گلنار آ پہنچی اور ہم ٹیکسی میں [illegible] اڈے چل دیئے۔ قصور کی بس میں بیٹھ کر مطلو[illegible] پہنچنے میں ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔

بس سے اتر کر ہم اس پگڈنڈی پر چلے [illegible] حویلی تک جاتی تھی۔ دائیں بائیں کچھ بنجر [illegible]

[illegible]سے آگے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ کھیتوں میں اِکّا دُکّا [illegible] کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ ہم دونوں ہی خاموش تھے۔ حویلی کے گیٹ پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اب مین گیٹ [illegible] نہیں بلکہ بغلی دروازے پر بھی بڑا سا تالا لگا ہوا اور در و دیوار پر برستی ہوئی ویرانی بتا رہی تھی [illegible] اندر کوئی ذی رُوح موجود نہیں ہے۔ میں نے [illegible]ش نظروں سے گلنار کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی طرف [illegible] رہی تھی لیکن خاموش تھی۔ اُسے کچھ پُوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"غلطی ہو گئی۔" بالآخر وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "[illegible]نے اگر کل ہی کسی طریقے سے، اس بُوڑھے سے کچھ معلوم [illegible] کی کوشش کر ڈالی ہوتی تو اچھا رہتا۔ اُسے فرار ہونے [illegible] مل گیا۔ اس کا مطلب ہے، تم نے اس تصویر میں [illegible] ٹھیک ہی پہچانا تھا اور اس بوڑھے کو یقین تھا کہ [illegible] سے حقیقت اگلوانے کے لیے دوبارہ یہاں ضرور [illegible] گے۔"

"اور اگر وہ میاں بیوی محض اسی خوف سے یہ [illegible] بھلا ٹھکانا چھوڑ کر ہنگامی انداز میں فرار ہوئے ہیں [illegible] کا مطلب ہے، اس کہانی میں ان کا کردار خاصا [illegible] ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا پھر گویا مجھے ایک [illegible] سی امید نظر آئی۔ "ہو سکتا ہے، وہ یہیں آس پاس ہی [illegible] گئے ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "اپنے آپ کو طفل تسلیاں مت دو۔ [illegible] دونوں جانتے ہیں کہ وہ بوڑھا اور اس کی بیوی جا چکے اور اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ بہرحال، سوچنے کی [illegible] یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس مرحلے پر بھی وہی [illegible] کام آئی۔ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے، وہ [illegible] یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہوگا جسے بم سے اُڑا دیا [illegible] گیا ہے؟"

"تین چار فرلانگ کا فاصلہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں نہ چل کر ایک نظر اُسے بھی دیکھیں۔ شاید کوئی [illegible]ل جائے۔" اس نے تجویز پیش کی۔

"ہاں..." میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ "چلو چلیں۔" [illegible] واپسی کے لیے مُڑ گیا۔

بس ہمیں اُتارنے کے بعد جس سمت میں گئی تھی، پختہ سڑک پر آنے کے بعد ہم بھی اسی طرف چل دیے۔ ہمارے دائیں بائیں کہیں بنجر زمین تھی اور کہیں کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ پھر خال خال مکانات نظر آنے لگے اور یہ خاصے بہتر اور پختہ مکانات تھے۔ شاید ہم کسی قصبے کے نواح میں تھے۔ راستے میں اِکّا دُکّا آدمی اور مختلف قسم کی سواریاں اِدھر سے اُدھر آتی جاتی نظر آئیں۔ کسی شخص نے زیادہ متجسس یا مشکوک نظر سے ہماری طرف نہیں دیکھا۔

بالآخر مجھے سڑک کے ایک طرف قدرے نشیب میں وہ مکان نظر آگیا جس میں موت سے میری ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ یہ مکان دُوسرے مکانوں سے کچھ زیادہ ہی فاصلے پر تھا۔

اب دن کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ ان دو بموں نے اُسے مکمل طور پر تباہ نہیں کیا تھا۔ اس کے ایک کمرے کی چھت گری تھی اور سامنے کی دیوار اور اس کے ساتھ ہی گیٹ بھی زمین بوس ہو گیا تھا۔ میں اور گلنار اس کے قریب جا کر اس طرح اس کا جائزہ لینے لگے جیسے کوئی بھی راہگیر راستے میں کوئی خلافِ معمول چیز دیکھ کر رُک جاتا ہے۔ مکان سے کچھ فاصلے پر ایک ٹوٹی پھوٹی بیل گاڑی کھڑی تھی جس سے ٹیک لگائے ایک تگڑا سا... دیہاتی کھڑا گنا چوس رہا تھا۔ ہم متجسس انداز میں مکان کا جائزہ لے رہے تھے اور وہ متجسس انداز میں ہمارا جائزہ لے رہا تھا۔

میں نے اشارے سے اُسے قریب بُلایا تو محسوس کیا کہ وہ ہم سے بات کرنے کا خواہش مند ہے۔ چہرے مُہرے سے وہ سادہ لوح معلوم ہوتا تھا۔ اس قسم کے لوگوں کو اگر کسی واقعے کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اُن سے پوچھا جائے تاکہ انھیں اپنی معلومات کا اظہار کر کے اپنی اہمیت جتانے کا موقع مل سکے۔ وہ قریب آیا تو میں نے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا چکّر ہے، یار؟ کیا یہاں بمباری ہوئی ہے؟"

وہ شاید اتنا بھی سادہ لوح نہیں تھا جتنا میں اسے سمجھ رہا تھا۔ مشکوک نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "آپ کون ہیں؟ اس علاقے میں نئے

معلوم ہوتے ہیں:" اُس نے کچھ کہنے سے پہلے ہمارے بارے میں اطمینان کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"تمھارا خیال درست ہے بھائی! بڑے صورت شناس معلوم ہوتے ہو۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "بلاشبہ ہم اِس علاقے میں نئے ہیں۔ ہم دراصل چودھری حمید صاحب کے مہمان ہیں۔ ایسے ہی ذرا سیر کرنے اور علاقہ دیکھنے کی غرض سے ٹہلتے ٹہلتے اِدھر آ نکلے ہیں۔"

"اوہ... اچھا... آپ چودھری صاحب کے مہمان ہیں؟" اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اِن الفاظ نے گویا اُس پر جادو کا سا اثر کیا تھا۔ اس کے تاثرات سے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ ابھی ہمارے قدموں میں لوٹنے لگے گا۔ "بڑی خوشی ہوئی جی آپ کو دیکھ کر... چودھری صاحب کی کیا بات ہے... وہ اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار ہیں۔ میں کسی زمانے میں ان کے پاس نوکر رہ چکا ہوں..."

وہ شاید اپنے دَورِ ملازمت کی تفصیل میں بھی چلا جاتا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ملائمت سے کہا: "وہ... تم مکان کے بارے میں ہمیں کچھ بتانے لگے تھے۔"

"بتانا کیا جی... بس... بُرے کاموں کا بُرا نتیجہ۔" وہ مربیانہ انداز میں بولا۔ "مجھے بہت عرصے سے اندیشہ تھا کہ اس مکان میں یا تو کوئی بڑی واردات ہوگی، یا پھر اس کا حشر خراب ہوگا۔ پرسوں رات کسی نے اس مکان پر بم پھینک مارا۔"

"اچھا...!" میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے حیرت کی اداکاری کی۔ "کوئی بہت ہی خطرناک لوگ رہتے ہوں گے یہاں؟"

"یہی تو رونا ہے، جی... کہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔" دیہاتی یوں منہ بنا کر بولا جیسے اسے اس بات کا شدید صدمہ ہوا ہو۔

"پھر بھی... اس کا کوئی مالک وغیرہ تو ہوگا؟" میں نے اُسے کُریدا۔

"وہی تو مجھے سارے جھگڑوں کی جڑ دکھائی دیتا ہے، جی۔" دیہاتی اِدھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "اگر میری پولیس وغیرہ میں واقفیت ہوتی تو [illegible] کو کب کا اندر کرا چکا ہوتا۔ وہ مجھے کوئی بہت [illegible] بدمعاش لگتا ہے لیکن بظاہر شریف بنا ہوا ہے [illegible]

"تم تو بڑے کام کی باتیں بتا رہے ہو یار!" [illegible] تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "ہمارے ہاں مسئلہ تو یہی [illegible] کام کے آدمی سے کوئی مشورہ ہی نہیں لیتا۔ نام کیا [illegible] مکان کے مالک کا؟"

"نادر حسین۔" وہ بلا تامل بولا۔ کبھی کبھی وہ [illegible] سے گلنار کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا [illegible] زیادہ خوشی اس بات سے ہو رہی ہے کہ گلنار اس [illegible] ہمہ تن گوش ہو کر سُن رہی ہے۔

"تمھیں کیوں شبہ ہے کہ وہ کوئی بدمعاش قسم [illegible] ہے؟" میں نے اس انداز سے پوچھا گویا اس کے [illegible] کی وجہ سے مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہو [illegible] ہو۔ حالانکہ ظاہر ہے اس بے چارے کے اندازِ بیا[illegible] دلچسپی والی کوئی بات نہیں تھی۔

"ظاہر ہے صاحب...! اس قسم کا آدمی بد[illegible] ہو سکتا ہے جس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ [illegible] کاروبار یا پیشہ کیا ہے لیکن وہ ہمیشہ ایک لمبی [illegible] میں آتا ہے۔" دیہاتی مکان کی طرف دیکھتے ہوئے [illegible] اس کے ساتھ کچھ آدمی ضرور ہوتے ہیں جو بظاہر [illegible] آتے ہیں لیکن اندر سے وہ بھی مجھے اوّل درجے کے [illegible] لگتے ہیں... اور پھر نادر حسین یہاں کبھی نہیں ر[illegible] بھلی قیمت کا مکان لے کر یونہی چھوڑ رکھا ہے۔ [illegible] تھوڑی بہت دیر کے لیے دوسروں کے ساتھ آ[illegible] کبھی کبھار راتوں کو اس مکان میں ہنگامہ آرائی او[illegible] چلنے کی آوازیں بھی سنی گئیں۔ جب لوگ جمع ہوتے [illegible] نہ تو کوئی آدمی نظر آتا اور نہ کسی ہنگامے کے [illegible] دیتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بھوت پریت اس [illegible] شرارتیں کرتے ہیں اور نادر حسین کی ان سے [illegible] دوستی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے گلنا[illegible] دیکھا اور گلنار وقت کے تقاضے کو سمجھتے ہو[illegible] دی گویا اس نے کوئی بڑا پُر مزاح جملہ کہا تھا۔ [illegible] پر وہ کچھ اور پھول گیا۔ میں نے فوراً ہی ایک او[illegible]

[illegible]غ دیا۔ "اس شخص... نادر حسین... کا کہیں نہ کہیں تو [illegible] ٹھکانہ ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمھیں معلوم نہ ہو۔" کسی بات کا معلوم نہ ہونا اس کے لیے گویا توہین [illegible] باعث تھا۔ وہ فوراً اکڑا۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ [illegible] منتقل کرتے ہوئے بولا۔ "ٹھکانا تو اس کا لاہور میں ہے، [illegible] آباد میں دفتر بھی ہے... جائداد کی خرید و فروخت [illegible] کام ہے... کیا کہتے ہیں یہ کام کرنے والوں کو...؟" وہ [illegible] کھجاتے ہوئے غالباً ذہن پر زور دینے لگا۔

"پراپرٹی ڈیلر...؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں۔" اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ "پراپرٹی ڈیلر ہے [illegible] میں آپ کو اس لیے نہیں بتا رہا تھا کہ یہ کوئی پکّی بات [illegible] ہے... اور اگر وہ پراپرٹی ڈیلر ہوا بھی تو دکھاوے [illegible] ہوگا۔ اس کے اصل دھندے تو معلوم نہیں کیا ہوں [illegible] کے بارے میں اِتنا بھی مجھے اس طرح معلوم ہو گیا تھا کہ اس [illegible] یہ کچھ عرصے کے لیے انھوں نے ایک چوکیدار رکھا تھا [illegible] سے میری سلام دُعا ہو گئی تھی لیکن اس بے چارے کو [illegible] دنوں بعد ہی رُخصت کر دیا گیا۔"

"یہ جو مکان پر بم پھینکے جانے کا واقعہ ہوا ہے [illegible] کے بعد پولیس نے نادر حسین کو بھی تفتیش میں شامل [illegible]ر کیا ہوگا؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"پہلے تو مجھے یوں لگ رہا تھا جی جیسے اس کے سوا باقی [illegible] کو تفتیش میں شامل کر لیا جائے گا۔" دیہاتی فوراً بولا... [illegible]یا سارے گاؤں والوں سے ہی پوچھ گچھ کی تھی انھوں [illegible] پھر انھوں نے لاہور سے نادر حسین کو بھی بلوایا تھا۔ اسی [illegible] کے برآمدے میں بیٹھ کر اس سے پوچھ گچھ کی تھی۔ میں دُور [illegible] تماشا دیکھ رہا تھا۔"

"نادر حسین کافی گھبرایا ہوا ہوگا۔" میں نے خیال [illegible]ل کی۔

"نہیں جناب! مجھے تو لگ رہا تھا کہ اگر وہ تھوڑی دیر [illegible] یہاں رہا تو پولیس والے گھبرا جائیں گے۔" دیہاتی بولا۔ [illegible]نکہ وہ کوئی خاص بات نہیں کر رہا تھا لیکن محسوس [illegible] تھا کہ اس نے ایک دو مرتبہ بڑبڑانے کے سے انداز میں [illegible]کر گویا پولیس والوں پر کوئی منتر کر دیا تھا۔ اس کے [illegible] وہ بڑی لاپروائی سے ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ [illegible] وہ بڑی فرماں برداری سے وہ جواب کاغذوں پر لکھتے رہے۔"

"تم نے کچھ تو سنا ہوگا کہ پولیس والے اس سے کیا پوچھ رہے تھے اور وہ کیا جواب دے رہا تھا؟"

"ہاں جی... کچھ تھوڑی بہت باتیں میرے کانوں میں پڑی تو تھیں۔ پولیس والے اس کی رائے لے رہے تھے کہ اس کے مکان پر بم کس نے پھینکا ہے۔ اس نے اطمینان سے کہا کہ اُسے شبہ ہے، مکان کو خالی دیکھ کر شاید کچھ غلط سلط قسم کے لوگ کبھی کبھار اس میں آ گھستے ہیں اور بم کا دھماکہ بھی شاید اسی قسم کے لوگوں کی آپس کی چپقلش کا نتیجہ ہے۔ یہ بات وہ اتنے بھولپن سے کہہ رہا تھا جیسے خود بڑا پارسا اور نیک آدمی ہو۔"

"اس کا مطلب ہے، پولیس والوں نے بڑی آسانی سے اس کی جان چھوڑ دی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں... شاید اسی لیے اسے زیادہ دیر نہیں روکا گیا کہ وہ زخمی تھا۔"

"زخمی...؟" میں چونک پڑا۔

"ہاں... پولیس کو تو اس نے یہی بتایا ہے کہ اس کی گاڑی کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا جس میں اُسے چوٹیں آئی تھیں مگر میرا خیال ہے، وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کی خوب ٹھکائی کی ہو... اور وہ یقیناً کوئی جاندار ہی آدمی ہوگا جس نے نادر حسین کی خبر لی ہوگی کیونکہ وہ خود بھی کافی اچھے قد کاٹھ والا آدمی ہے۔"

"اچھا...؟ اس کی شکل و صورت کیسی ہے؟ تم نے تو اتنے دلچسپ انداز میں یہ سب کچھ بتایا ہے کہ خواہ مخواہ اِس سلسلے کی ہر بات جاننے کو جی چاہ رہا ہے۔" میں اس وقت اس شخص کی سی اداکاری کرنے کی کوشش کر رہا تھا جسے پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کا شوق ہوتا ہے۔ جبکہ وہ دیہاتی بھی مجھے اسی قبیل کا آدمی لگ رہا تھا۔ تاہم وہ تھا بے ضرر سا آدمی... اس نے تفصیل سے نادر حسین کا حلیہ [illegible] کر دیا اور میں ساری اداکاری بھول کر دم بخود سا اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہر لفظ کے ساتھ میری دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور جب وہ خاموش ہوا تو مجھے اپنی کنپٹیوں میں سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ

اس نے جو حلیہ بتایا تھا، وہ ہو بہو اس شخص کا تھا جو ایک پستہ قد آدمی کے ساتھ میرے مزنگ والے مکان پر آیا تھا اور کسی نامعلوم ڈائری کا مطالبہ کر رہا تھا۔ پھر دونوں یہ کہہ کر مجھے پچاس ہزار کی خطیر رقم دے کر نہایت اطمینان سے رخصت ہو گئے تھے کہ وہ شرافت سے ڈائری حاصل کرنے کے لیے اس کی قیمت پیشگی ادا کر کے جا رہے ہیں۔ پھر یہی شخص اپنے اسی پستہ قد ساتھی کے ہمراہ ریوالور کی زد پر مجھے شاہی بازار کے اس چوبارے سے اغوا کر کے لے گیا تھا جہاں گلنار نے مجھے پناہ دی تھی اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہاں میں بالکل محفوظ ہوں اور کوئی میرا سراغ نہیں پا سکتا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے مجھے اس مکان میں لا کر قید کر دیا تھا، جس پر بم پھینکے گئے تھے اور بم پھینکے جانے سے صرف چند منٹ قبل میں نے اس شخص کو قابو میں کر لیا تھا اور پھر مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا۔ میں مکان سے بھاگ نکلا تھا تو اس وقت محسوس یہی ہوا تھا کہ وہاں اس کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں ہے۔ میں مکان سے چند قدم ہی دور گیا تھا کہاں پر ایک کار سے کسی نے دو بم پھینک دیے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت وہ شخص جس کا نام یہ دیہاتی نادر حسین بتا رہا تھا، بے ہوشی کے عالم میں اسی مکان میں، بلکہ اسی کمرے میں موجود تھا۔ جس کی چھت اور ایک دیوار اس وقت مجھے منہدم نظر آ رہی تھی۔ کیا اس کے باوجود وہ زندہ بچ گیا تھا۔ یہ بات میرے لیے ناقابلِ یقین تھی۔

ممکن ہے، مکان میں اس وقت نادر حسین کے علاوہ بھی کوئی موجود رہا ہو جو مکان کی تباہی سے چند لمحے پہلے اسے اٹھا کر مکان سے باہر لے گیا ہو۔ تاہم میں نے سامنے کی طرف سے کسی کو نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ دیہاتی نے نادانستگی میں بے حد اہم باتیں بتا دی تھیں۔

"تمھیں یقین ہے کہ اس شخص کا نام نادر حسین ہی ہے ... ؟ اور وہ لاہور میں سمن آباد میں پراپرٹی ڈیلر کے طور پر کام کرتا ہے ؟" میں نے اپنے لہجے کے ارتعاش پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، جی ..." اب گویا اسے خیال آ گیا کہ انسان کو احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ "میں نے خود جا کر تو دیکھا نہیں ہے۔ میں نے گاؤں کے نمبردار کو اس کے متعلق باتیں کرتے سنا تھا، تب مجھے معلوم ہوا تھا [illegible]"

"اچھا بھائی ... ! تمھارا بہت بہت شکریہ۔ بڑی [illegible] گپ شپ رہی تمھارے ساتھ۔" میں نے گرمجوشی سے [illegible] مصافحہ کیا۔ "میں نے تمھارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

"کرم الٰہی، جی۔ میں نمبردار صاحب کا [illegible] ہوں۔ ان کے دو ٹریکٹر کرائے پہ چلتے ہیں۔ میں ان کا [illegible] ہوں۔ کبھی کبھار ٹریکٹر فارغ ہوتے ہیں تو میں بھی فا[رغ] ہوتا ہوں۔ وقت گزاری کے لیے ایسے ہی اِدھر اُدھر [illegible] رہتا ہوں۔"

"بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ پھر شاید کبھی ملاقا[ت] ہو۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"کبھی کوئی ضرورت ہو تو نمبردار صاحب کے گھر تش[ریف] لے آئیں، جی۔ میں اگر آپ کی کوئی خدمت کر سکا تو [illegible] خوشی ہوگی۔" وہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

ہم واپس چل دیے اور وہ ایک بار پھر زور شور [illegible] گنا چھیلنے لگا۔ ہم کچھ دور نکل آئے تو میں نے گہری [illegible] لے کر کہا۔ "یہاں آنا اتنا بے فائدہ نہیں رہا۔ اس [illegible] جوڑے کی رونمائی کے بعد تو گویا ہم اندھیرے میں ہی [illegible] ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ گئے تھے۔ اب ہمارے سامنے کم [illegible] ایک سراغ تو موجود ہے ... نادر حسین، بجائے اس کے کہ [illegible] تلاش کرتے ہوئے مجھ تک پہنچیں اب میں خود ان [illegible] پہنچوں گا۔"

"ہاں ... میرے خیال میں اب یہی مناسب [illegible] گا۔" گلنار کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "ورنہ کہیں یہ شہر [illegible] غائب نہ ہو جائے۔"

چند لمحے ہم خاموشی سے سڑک کے ساتھ سات[ھ] [illegible] میں چلتے رہے۔ پھر میں نے آہستگی سے کہا۔ "گلنار [illegible]"

اس نے نہ جانے کن خیالات کے بھنور [illegible] ابھارا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ [illegible] کی غزالی آنکھوں میں سوچوں کی پرچھائیاں لر[illegible]

"تمھیں اپنے شانہ بہ شانہ چلتے دیکھ کر جہاں [illegible] حوصلہ اور تقویت ملتی ہے، وہیں شرمندگی بھی [illegible] ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "پریشانیاں میر[ی] اور دھکے تم کھا رہی ہو۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

اس نے عجیب سے انداز میں میری طرف [illegible]

[illegible] کی آنکھوں میں ان گنت شکوے تھے، لیکن پھر وہ [ہ]نس پڑی۔ "ہو سکتا ہے، یہ محض تمھارا اپنا ہی خیال ہو کہ یہ پریشانیاں صرف تمھاری ہیں۔" وہ شوخ [illegible] میں بولی۔ "تمھیں علم ہی نہ ہو سکا ہو کہ کوئی تمھاری [پ]ریشانیوں کو اپنی پریشانیاں سمجھتا ہے۔"

اس کے لہجے کی اپنائیت محسوس کر کے میرے [د]ل کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ انجانے اندیشوں سے جیسے میرا [illegible]لاں رواں لرزنے لگتا تھا۔ "میں تمھارے لہجے میں انجانے [illegible]زلوں کی آہٹیں سن رہا ہوں، گلنار۔" میں نے مضطرب [illegible]ر کہا۔ "ہمارے دل جن راستوں پر بھٹکنے لگے ہیں، میں [نہ]یں سمجھتا کہ یہ راستے ہمیں کسی منزل پر لے جائیں گے۔"

"ضروری تو نہیں کہ انسان ہمیشہ صرف انھی راستوں [illegible] چلے جو کسی منزل کی طرف جاتے ہوں۔" وہ مسکرا کر [بو]لی۔ "کبھی کبھی آنکھیں بند کر کے یونہی ... خواہ مخواہ [illegible] بھی کچھ راستوں پر چلنے کو جی چاہتا ہے۔"

عجیب لڑکی تھی خود اپنی جگہ ایک فلسفہ اور خود [اپ]نی ذات میں ایک فلسفی ... میں جواباً کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ [ب]س خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کے [illegible]سارِوں پر حیا کے سائے تھے اور اس وقت اسے [illegible] کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس لڑکی نے بازار [illegible]ن کا راستہ بھی دیکھا ہوگا۔

دفعتاً عقب سے بس کی گھڑ گھڑ سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لاہور جانے والی ایک بس [illegible] آ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ دیا تو بس ہمارے قریب [illegible] کر رک گئی اور ہم سوار ہو گئے۔

لاہور واپس پہنچ کر میں نے گلنار کو اس کے [illegible]ری روڈ والے مکان پر چھوڑا اور خود بالاخانے [illegible] عقبی کوٹھری میں سو گیا۔ میں کچھ کسلمندی سی محسوس [illegible] رہا تھا۔ ذہن بوجھل تھا اور روح مضطرب تھی۔ دل [illegible] دروازے پر غمِ جاناں دستک دے رہا تھا اور ذہن میں [illegible] دوراں نے ہلچل مچائی ہوئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا [illegible] کہ کشمکشِ حیات مجھے کیا دکھانا چاہتی ہے؟

اچانک سازوں کی جھنکار سے میری آنکھ کھل گئی ... فوری طور پر مجھے یاد ہی نہ آ سکا کہ میں کہاں سویا تھا۔ [illegible] لیے کچھ حیرت زدہ سا رہ گیا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟

میں نہ تو کوئی نشاط پرست بادشاہ ہوں اور نہ ہی راجہ اندر قسم کی کوئی چیز ... پھر یہ کون مہربان ہیں جو طاؤس و رباب کی لے پر مجھ غریب کو نیند کی وادیوں سے واپس لانے کا اہتمام کر رہے ہیں ... پھر کسی خوش گلو کی آواز نے بھی کانوں میں رس گھولا۔ آواز مانوس تھی لیکن آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا تو نہ کہیں طاؤس و رباب نظر آیا اور نہ کہیں کسی خوش گلو کی صورت دکھائی دی ... وہی سیلن زدہ کوٹھری تھی۔ وہی عسرت زدہ سامان تھا اور وہی مصیبت زدہ میری ذات تھی۔ آواز دروازے کی دوسری جانب سے آ رہی تھی۔ بالاخانہ اسی طرف تھا۔ میں نے پھر پہلے دن کی طرح جھری سے جھانک کر دیکھا۔ گلنار بن سنور کر بالاخانے پر پہنچ چکی۔ وہی چاند چہرہ محفل سجائے بیٹھا تھا۔ وہی قاتل جنبشِ ابرو تھی۔ وہی دل میں اتر جانے والی آواز کا زیر و بم تھا۔ وہی آوارہ نظروں کا ہجوم تھا۔ اور وہی خاک کر دینے والی شمعِ محفل تھی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر میں پہلے دن بھی سحر زدہ سا ہو گیا تھا مگر آج کچھ دل بُرا سا ہو گیا۔ گلنار رقص نہیں کر رہی تھی اور نہ ہی اس کی محفل میں کوئی شائستگی کی سطح سے گرا ہوا تماشبین موجود تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ چند لوگوں کے درمیان بیٹھ کر غزل سرا ہو۔ انجانے خمار سے بوجھل نظریں کسی اور چہرے کا طواف کریں۔ اس کی ایک ایک جنبش اور اس کی آواز کے ہر پیچ و خم پر لوگ نوٹ لٹائیں۔ کیا مجھ میں کوئی تغیر آ چکا ہے ؟ یہ تغیر میرے حق میں اچھا ہے یا بُرا ؟ ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ملا تو میں نے اپنے ذہن سے سب کچھ جھٹک دیا اور صحن میں جا کر نل پر منہ ہاتھ دھویا اور تیار ہو کر بالاخانے سے نکل کھڑا ہوا۔ مجو پہلوان سے ملے کئی دن ہو گئے تھے۔ حالات نے مہلت ہی نہیں دی تھی۔

اس وقت شاہی بازار میں عروسِ شب پائل چھنکاتی داخل ہو چکی تھی۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ خوشبوؤں کے قافلے رواں تھے اور جا بجا قہقہے ہی نہیں، چہرے بھی روشنیاں بکھیر رہے تھے۔ میں اپنے سینے میں ایک نام سا اضطراب چھپائے اپنے دلِ وحشی کو پہلو میں دبائے کسی طرف توجہ دیے بغیر سرکلر روڈ پر آ گیا اور تیز تیز

کرتے تانگوں سے بچتا ہوا پیدل ہی مجو پہلوان کے اکھاڑے کی طرف چل دیا۔

اکھاڑے میں کئی بڑے بڑے بلوں کی بدکشتی میں پہلوان جسم کی ریاضت میں مصروف تھے۔ ان میں سے جو بے تکلف تھے انھوں نے مجھے دیکھ کر خوشی سے نعرے لگائے اور بغل گیر ہونے کی کوشش کرنے لگے لیکن میں نے بہ زورِ بازو انھیں روک دیا۔ "دیکھو بھئی... میں اس وقت دھوبی کے دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ اور مزید کچھ دیر اسی شریفانہ حلیے میں رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے باقاعدہ تقریر کرنے کے سے انداز میں کہا۔ "اس لیے تم لوگ مٹی میں لتھڑے ہوئے اور تیل میں چپڑے ہوئے اپنے جسموں کو مجھ سے دور ہی رکھو۔ معانقہ اُدھار رہا۔ ویسے بھی تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تم میں سے کوئی میری پسلیاں نہیں کڑکڑا سکتا۔ اس لیے خواہ مخواہ زیادہ پُرجوش ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"تم اتنے دن سے غائب ہو۔ کسرت کیے بغیر تمھیں چین کیسے پڑتا ہے؟" نذرو پہلوان نے پوچھا۔

"صبح شام تھوڑی بہت کسرت ضرور کرتا رہا ہوں ہر جگہ اور ہر قسم کے حالات میں..." میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اس لیے تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا جسم بدستور مشقت کا عادی ہے۔ ہٹو... مجھے اُستاد سے ملنا ہے۔"

وہ راستہ چھوڑ کر اپنی اپنی مصروفیت کی طرف لوٹ گئے اور میں مجو پہلوان کی طرف بڑھا، جو کچھ دور اپنے حجرہ نما کمرے کے سامنے چوبی تخت پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے اور مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے پھر مجھے اپنے برابر ہی بٹھا لیا اور سرتا پا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔ "تمھارے چہرے پر مصائب کے نقش و نگار کا اضافہ نظر آ رہا ہے۔ لگتا ہے کچھ اور آزمائشوں سے گزر کر آ رہے ہو؟"

"اپنی زندگی ایک آزمائشِ مسلسل بن گئی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب تو میں مشکلات کا عادی ہوتا جا رہا ہوں۔"

"کچھ ہمیں بھی سناؤ کہ شوقِ سفر میں دیوانے پر کیا گزری؟" وہ بولے اور ہم نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا

پہلوان جی بھی بڑے مزے کی شخصیت تھے۔ بچے اور نہ ورنہ ... جب چاہتے تھے بڑے سلیقے بولنا شروع کر دیتے تھے۔ شاعرانہ تعلّیوں اور سے بھی ہوئی، بڑی شستہ اور دلکش زبان... وقت انھیں بولتے سن کر یقین ہی نہیں آتا تھا بھاٹی گیٹ میں اکھاڑہ چلانے والا ایک ایسا جس کی زندگی جسموں کو فولاد میں ڈھالنے اور سے سر ٹکرانے کے شغل میں گزری ہے۔ میں نے ا کے وہ تمام واقعات قدرے اختصار سے انھیں جو اُن کے علم میں نہیں تھے۔ سب کچھ سن کر و انداز میں سر ہلانے لگے اور خود کلامی کے سے میں بولے۔ "معاملہ لمبا ہی ہوتا جا رہا ہے۔"

"مجھے تو اب صحیح طور پر یہ بھی یاد نہیں شروع کہاں سے ہوئی تھی اور نہ ہی یہ اندازہ ہو بات ختم کہاں ہوگی؟" میں نے بے بسی سے "کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ بات نہیں ہوگی، البتہ میں ضرور ختم ہو جاؤں گا۔"

"لگتا ہے، میں نے تمھیں جو تربیت دی میں ضرور کہیں کوئی خامی رہ گئی ہے، جو تم ایسی اور پست ہمتی کی باتیں کر رہے ہو؟" اُستاد بگڑتے ہوئے بولے۔

"میں...؟ نہیں تو..." میں گڑبڑا گیا۔ "اور پست ہمتی کی باتیں تو نہیں کر رہا۔ میں نے تو ہی ایک خیال ظاہر کیا تھا... میں موت سے خو نہیں ہوں... موت برحق ہے۔"

"اگر موت سے خوف زدہ نہیں ہو تو سے بھی خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" ایک طویل سانس لے کر بولے۔ وہ مزید کچھ کہ تھے کہ ایک شخص کو قریب آتے دیکھ کر چونک وہ پکی عمر کا ایک دبلا پتلا اور خوش شک تھا۔ اس وقت بے حد پریشان اور متوحش قریب آ کر اس نے سلام کیا، ہم سے ہاتھ ملایا میری طرف دیکھ کر اُستاد سے مخاطب ہوا کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرنے آیا تھا آپ اکیلے میں میری بات سن سکیں..."

اُستاد نہایت مشفقانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولے۔ "شاہ صاحب! اس بچے کے سامنے ہچکچانے کی ضرورت نہیں۔ اسے آپ میرا بیٹا سمجھیں۔ ہو سکتا ہے آپ کا مسئلہ اسی کے توسط سے حل ہو۔ کھل کر بات کریں۔ کیا آج اس بدمعاش نے کوئی نئی حرکت کی ہے؟"

"کیا بتاؤں پہلوان جی!" اس شخص کی آواز یک دم ہی گلوگیر ہو گئی۔ "اب تو اس کا حوصلہ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ باقاعدہ رقعہ بھیج کر اپنی آمد کا وقت بتانے لگا ہے۔"

"اوہ..." اُستاد نے سر ہلایا۔ "سلطانہ ڈاکو کی اولاد بننے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"سلطانہ ڈاکو تو پھر بھی اس لحاظ سے شریف آدمی تھا کہ وہ غریب اور کمزور لوگوں کو بالکل نہیں چھیڑتا تھا۔ جبکہ آج کل کے بدمعاشوں کا تو زور ہی غریبوں اور کمزوروں پر چلتا ہے۔" وہ شخص تلخ لہجے میں بولا۔

"ہوا کیا ہے؟ شاہ جی!" اُستاد پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

"آج بدرو نے رقعہ بھیجا ہے پہلوان جی!" شاہ صاحب گویا آنسو ضبط کرتے ہوئے بولے۔ "اس نے لکھا ہے کہ وہ آج رات نو بجے ثریا کے رشتے کی بات کرنے آ رہا ہے۔ اگر ہم نے شریفانہ طریقے سے ثریا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کی ہامی نہ بھری تو وہ ثریا کو... اٹھا کر لے جائے گا۔" آواز گویا ان کے حلق میں پھنسنے لگی تھی۔

"گھبرایئے نہیں شاہ جی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اُستاد نے انھیں تسلی دی۔

"گستاخی نہ سمجھیں تو میں پوچھوں کہ یہ قصہ کیا ہے؟" میں نے شاہ جی کی بجائے اُستاد سے سوال کیا۔

"قصہ کیا بتائیں برخوردار!" اُستاد طویل سانس لے کر بولے۔ "اب تو گلی کوچوں میں یہ بدمعاش اور جرائم پیشہ قسم کے لوگ حشرات الارض کی طرح پیدا ہونے لگے ہیں۔" پھر انھوں نے جیسے خود ہی اس کی وجہ تلاش کر لی... "بھئی ظاہر ہے جب معاشرے میں صحت مندانہ سرگرمیوں کی نمائش کم ہوتی جائے گی تو مجرمانہ سرگرمیاں بڑھیں گی۔ یہ ایک منطقی سی بات ہے۔ اکھاڑے، باغ، تفریح گاہیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں اور ان کی جگہ چپے چپے پر گھٹن زدہ عمارتیں سر اٹھا رہی ہیں۔ ظاہر ہے وہی گھٹن انسان کی فطرت میں آتی جا رہی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ شاہ صاحب اُستاد کے برابر ہی چوبی تخت پر بیٹھ گئے تھے اور مضطربانہ انداز میں انگلیاں چٹخا رہے تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اُستاد کو شاید خیال آیا کہ انھوں نے اصل قصہ تو مجھے سنایا ہی نہیں۔ چونکتے ہوئے شاہ جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "بھئی جمال! یہ ارشاد شاہ ہیں۔ چوبرجی کے پیچھے نرم نگر میں ان کی رہائش ہے... اور یہ پیدائشی مجرم ہیں۔" یہ کہہ کر اُستاد خاموش ہو گئے۔

میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ ارشاد شاہ پر تو کوئی مجرم ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُستاد گویا میری الجھن کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ "ان کا جرم یہ ہے کہ یہ پیدائشی طور پر شریف اور کمزور آدمی ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔" اس بار میں نے گہری سانس لی۔

اُستاد بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "ان کی کہانی بھی تقریباً وہی ہے جو آج کے معاشرے میں ہر تیسری چوتھی گلی میں دہرائی جا رہی ہے۔ شاہ جی کا ایک جرم دراصل یہ بھی ہے کہ یہ ایک نہایت خوبصورت اور جوان بیٹی کے باپ ہیں۔ بدرو نامی ایک بدقماش اور بدطینت نے اسے کہیں آتے جاتے دیکھ لیا اور اس کے پیچھے لگ گیا۔ بچی کا کالج جانا دوبھر ہو گیا۔ کسی نہ کسی طرح بے چاری نے بی اے کیا اور گھر ہی میں مقید ہو کر بیٹھ گئی۔ بدرو نے تب بھی پیچھا نہ چھوڑا اور رشتے کے پیغام بھیجنے لگا۔ ظاہر ہے شاہ جی نے وہی جواب دیا جو ایک شریف اور باعزت آدمی اپنی بچی کا رشتہ طلب کیے جانے پر کسی بدمعاش کو دے سکتا ہے۔ انھوں نے انکار کیا۔ مگر وہ کسی طرح ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ گھر کے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے۔"

"محلے والوں نے بھی کچھ نہیں کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"محلے والے...؟" شاہ جی تلخ لہجے میں بولے۔

"محلّے والے تو اس کے آنے کی خبر سُنتے ہی دروازوں کی کنڈیاں چڑھا لیتے ہیں۔ میری کوئی مدد کرنے کی بجائے وہ مجھے راہ چلتے دیکھ کر ایک دُوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ غالباً ایک دُوسرے کو یاد دلاتے ہیں کہ یہ ہے وہ شخص جس کی بیٹی کے پیچھے ایک بدمعاش ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ اگر محلّے والوں نے ہمّت کی ہوتی اور میرا ساتھ دیا ہوتا تو بدرُو کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔"

"آپ نے پولیس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے پُوچھا۔

شاہ جی ایک بار پھر تلخ سے انداز میں ہنس دیے۔

"پولیس سے بدمعاش اتنا نہیں ڈرتے جتنا شریف لوگ ڈرتے ہیں۔ پھر بھی میں ہمّت کر کے ایک بار تھانے گیا تھا۔ ایس ایچ او نے بدرُو کو بُلوا لیا اور اُسے خوب ڈانٹا ڈپٹا۔ اس وقت بدرُو بالکل مسکین بن کر کھڑا رہا۔ اور میرے ہر الزام سے مُنکر ہو گیا۔ چنانچہ باقاعدہ قانونی کارروائی کے لیے مُعاملے کا کوئی گواہ، کوئی ثبوت چاہیے۔ ... اور باقاعدہ کارروائی ہو جاتی تب بھی کیا فرق پڑتا؟ میری اُلجھنیں شاید کچھ اور بڑھ جاتیں۔ چنانچہ اب بدرُو کا رُقعہ ملنے کے بعد بھی میں پولیس کے پاس نہیں گیا۔ ظاہر ہے، وہ کبھی نہیں مانے گا کہ رُقعہ اس نے لکھا ہے۔"

وہ متاسّفانہ سے انداز میں سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔

اُستاد بولے "شاہ جی کو ہمارے ایک عقیدت مند نے ہمارے پاس بھیجا تھا کہ ہم ان کی مدد کریں۔ ہم دو تین مرتبہ اپنے کچھ آدمی ساتھ لے کر اُس بدبخت کا دماغ دُرست کرنے کے ارادے سے گئے مگر شاید اُسے ہماری آمد کی بھنک پڑ جاتی ہے کہ وہ شاہ صاحب کے مکان کے پاس پھٹکتا ہی نہیں اور اُس کے اپنے کسی خاص ٹھکانے کا ہمیں علم ہی نہیں ہو سکا۔ دو چار جگہیں ایسی تھیں جن کے بارے میں سُنا تھا کہ وہاں اس کی نشست و برخاست رہتی ہے مگر وہ اُن میں سے بھی کسی جگہ پر نہیں ملا۔ اس کا مطلب ہے، وہ ہم سے کچھ نہ کچھ ڈرتا ضرور ہے لیکن اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ ہم چوبیس گھنٹے تو شاہ صاحب کے ساتھ نہیں رہ سکتے، اِس لیے وہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا ہے۔"

"حیرت ہے۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"اِس شہر کے بڑے بڑے تمام بدمعاشوں کے نام تو معلوم ہیں۔ ان میں بدرُو تو کوئی نہیں ہے۔ اِس کا مط ہے، وہ کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش ہے۔ میری سمجھ میں نہ آ رہا کہ ایک چھوٹے موٹے بدمعاش کو یہ جرأت کی ہو سکتی ہے؟"

"شاہ صاحب کا خیال ہے کہ اُس کے پیچھے کچھ خطرناک آدمی بھی ہیں، جو اس کی پشت پناہی کرتے" اُستاد بولے۔ "عام بدمعاشوں کی طرح اُن کے سُننے میں نہیں آتے لیکن ہیں وہ بہرحال بدمعاشو زیادہ خطرناک۔"

"تو پھر اب کیا ارادے ہیں؟" میں نے سوالیہ نظ سے اُستاد کی طرف دیکھا۔

"ارادے کیا ہوں گے۔" اُستاد مسکرائے۔ " بڑے اچھے وقت پر آئے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آج ہی شاہ صاحب کی مدد کے لیے چلے جاؤ۔ مجھے معلوم تمھاری اپنی ہی اُلجھنیں اور مصیبتیں کم نہیں ہیں لیکن جوان انھی حالات سے گزر کر کندن بنتے ہیں۔ کسی بات سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں... تمھاری طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔"

"خوف کیسا اُستاد جی!" میں ہنس دیا۔

"میں خود اس لیے نہیں جانا چاہتا کہ کہیں اس بھی وہ میری آمد کی بھنک پا کر کھسک نہ جائے۔" اُ بولے۔ "میرا پھر بھی پہلوان کے طور پر شہر میں بہت نام ہے... پُرانا آدمی ہوں۔ تم اس کے اجنبی اور گمنام ہو۔ میں چاہتا ہوں آج کچھ عملی کار ہو جائے۔ اس کا پورا اتا پتا تو لگ ہی جائے۔"

"ٹھیک ہے... تو پھر میں چلتا ہوں۔" میں اُٹھ ہوا۔ شاہ صاحب بھی میرے ساتھ چلنے کے لیے اُ کھڑے ہوئے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کے چہر پر مایوسی کی پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں۔ ش وہ سوچ رہے تھے کہ آج اُستاد نے ان کا ساتھ د میں بے دلی کا مظاہرہ کیا ہے اور ایک ناتجربہ کار کو اُن کے ساتھ کر دیا ہے جو شکل سے ہی بے ضرر آتا ہے، مانا کہ جسمانی طور پر کچھ تگڑا ہے مگر اس قسم مُعاملات میں محض تگڑا ہونا ہی کافی نہیں ہوتا۔ میں ا

نکھوں میں اس قسم کے خیالات کا عکس دیکھ سکتا تھا لیکن نے انھیں تسلّی و تشفّی دینے کی قطعاً کوشش نہیں کی اور ن کے ساتھ اکھاڑے سے نکل آیا۔ رکشے میں بیٹھ کر ہم برجی کی طرف چل دیے۔ راستے میں میں نے پوچھا: "آپ بالکل اندازہ نہیں کہ بدرُو کے پیچھے کون خطرناک لوگ ہیں؟"

"نہیں... مجھے صحیح طور پر کچھ نہیں معلوم۔" شاہ صاحب مُردہ سے لہجے میں بولے۔ "یہ تو محض میرا اندازہ ہے کہ اس پشت پر کوئی ہے ورنہ وہ اتنی دیدہ دلیری کبھی نہ دکھاتا۔ بار میں نے اسے ایک شخص کے ساتھ اپنی گلی میں ٹہلتے کھا تھا۔ وہ شخص اپنے معززانہ حلیے کے باوجود مجھے حد خطرناک محسوس ہوا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سمن آباد کا کوئی پراپرٹی ڈیلر ہے لیکن پراپرٹی کا کام محض ایک کھاوا ہے۔ اس کا دھندا کچھ اور ہی ہے۔"

"سمن آباد کا پراپرٹی ڈیلر...؟" میں چونک پڑا۔ "نام نہیں معلوم ہو سکا، اس کا؟"

"صحیح تو معلوم نہیں... نادر خان یا نادر حسین، ... کچھ اسی قسم کا نام ہے۔" شاہ صاحب کچھ کھوئے کھوئے ے لہجے میں بولے۔ اس وقت ان کا ذہن شاید کہیں اور تھا۔

میری رگ رگ میں ایک لمحے کے لیے سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس شخص کی تلاش میں نکلنے کا تو میں ارادہ کیے بیٹھا تھا مگر قدرت نے اس سے میرا سامنا کرانے کا پہلے ہی انتظام کر دیا تھا۔ میں نے مزید کچھ نہ پوچھا۔ خاموشی سے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ نادر حسین سے سامنا ہونے پر میرا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے اور اس کا ردِ عمل کیا ہو گا؟

رام نگر کی ایک گلی میں شاہ صاحب نے رکشہ رکوایا اور اُتر کر ایک مکان کی طرف بڑھے۔ مکان چھوٹا مگر دو منزلہ تھا اور باہر سے ہی صاف ستھرا سا نظر آ رہا تھا... دروازے پر شاہ صاحب کے نام کی تختی بھی موجود تھی یہاں پہنچ کر مکانات کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ آگے ایک طویل و عریض میدان تھا۔ شاہ صاحب نے اندر جا کر پردہ کرایا پھر مجھے اندر لے گئے۔ ان کے ہاں کمرۂ نشست بھی تھا لیکن میری ہی فرمائش تھی کہ ہم کہیں کھلے میں بیٹھ کر بدرُو کا انتظار کریں گے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تنہا نہیں آئے گا اور یہ بھی طے تھا کہ ہاتھا پائی ضرور ہو گی۔ جھگڑا خطرناک

صورت بھی اختیار کر سکتا تھا۔ اسی لیے شاہ صاحب بہت پریشان اور متوحش تھے۔ کبھی بیٹھتے، کبھی اُٹھتے، کبھی اندر جاتے، کبھی باہر آتے اور کبھی دہشت زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے مضطربانہ انداز میں ہاتھ مَلنے لگتے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ نو بجنے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔

"شاہ صاحب! آپ پریشان نہ ہوں۔" بالآخر میں نے انھیں تسلّی دینے کی کوشش کی۔ "آپ اطمینان سے بیٹھ جائیں اور سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"اس جوان بچّی کا باپ اطمینان سے کیسے بیٹھ سکتا ہے جس کے پیچھے خطرناک غنڈے لگ گئے ہوں؟" شاہ صاحب پژمردہ لہجے میں بولے۔

"میری کوشش یہی ہو گی کہ آج کے بعد یہ غنڈے آپ کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ لیکن اس سلسلے میں آپ کو بھی تھوڑا سا حوصلے سے کام لینا ہو گا۔ اگر آپ ہی اتنے خوف زدہ نظر آئیں گے تو آپ کی بچّی تو خوف سے بالکل ہی بے حال ہو جائے گی۔ ویسے وہ اس وقت ہے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"پچھلے کمرے میں تالا لگا کر بیٹھی ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے...۔" میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "چاہیں تو آپ بھی اندر جا کر بیٹھ جائیں۔ آنے والوں سے میں خود ہی بات کر لوں گا۔"

دل تو غالباً شاہ صاحب کا یہی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اندر کسی کمرے میں تالا لگا کر بیٹھ جائیں لیکن انا اجازت نہیں دے رہی تھی۔ مضطربانہ انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے میرے برابر ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔ لیکن دُوسرے ہی لمحے یوں اُچھل پڑا جیسے کرنٹ لگا ہو کیونکہ دروازے پر بڑی زوردار دستک ہوئی تھی۔

انھوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے پُرسکون لہجے میں کہا... "گھبرائیے مت۔ جا کر دروازہ کھولیے۔"

وہ گویا بادلِ نخواستہ دروازے تک پہنچے اور بولٹ گرا کر ایک طرف ہٹ گئے۔ دو آدمی نہایت اطمینان سے آ گئے۔ میں نے گہری نظر سے ان کا جائزہ

لیا۔ قد کاٹھ اور حلیے کے اعتبار سے وہ بہت ملتے جلتے سے تھے۔ دونوں ہی میانہ قامت لیکن گٹھے ہوئے جسموں کے مالک تھے۔ دونوں شلوار قمیص میں تھے۔ گریبان کھلے ہوئے تھے اور شکل سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی رنگت میں البتہ نمایاں فرق تھا۔ ایک تو تقریباً کالا بھجنگ تھا جبکہ دُوسرے کی رنگت گندمی تھی۔ اندر آ کر اُنھوں نے شاہ صاحب کو یوں گھورا جیسے درحقیقت وہ گھر کے مالک ہوں اور شاہ جی اُن کی عدم موجودگی میں چوری کی نیت سے گھر میں گھس آئے ہوں۔ شاہ صاحب دروازے کے قریب ہی دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ کالے بھجنگ شخص نے بظاہر دوستانہ انداز میں لیکن میرے اندازے کے مطابق کافی سختی سے شاہ صاحب کا بازو پکڑ لیا اور انھیں تقریباً گھسیٹ کر وہیں برآمدے میں لے آیا، جہاں میں بیٹھا تھا۔

"میرا بازو چھوڑ دے بدرو!" شاہ صاحب نے منمناتے ہوئے اپنے بازو کو جھٹکا دیا مگر اس سخت جان بدمعاش سے بازو چھڑانا اس کمزور اور شریف آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اُن کے بولنے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ کالے بھجنگ آدمی کا نام بدرُو ہے۔

"بازو تو کیا شاہ جی...! ہم تو تمھارا شہر بھی چھوڑ جائیں گے بس صرف ہمیں اپنی فرزندی میں لے لیجیے۔ آپ کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔" وہ خالص لوفرانہ انداز میں بولا۔

شاہ جی کا چہرہ سُرخ ہو گیا لیکن وہ بے بسی سے اُسے گھورنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ دونوں بدمعاشوں نے وہاں میری موجودگی کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ اُنھوں نے صرف ایک نظر میری طرف دیکھا تھا۔ وہ بھی محض اس طرح جیسے میں انسان نہیں بلکہ برآمدے کا کوئی ستون یا آرائش کے لیے رکھا ہوا کوئی گملا وغیرہ ہوں۔ اس حد تک اپنے زعم میں مبتلا بدمعاش بھی میں نے کم ہی دیکھے تھے۔ میرے خیال میں اب شاہ جی میں مزید ذہنی اذیت برداشت کرنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کالے بھجنگ شخص کے کندھے پر دستک دینے کے سے انداز میں انگلیاں مار کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا: "اے مسٹر بدرُوح! مجھ سے بات کرو۔ میں د[illegible] ہوں تمھیں لڑکی کا رشتہ۔" میں نے ہموار سے لہجے میں کہا۔

"اچھا...!" بدرُوح بالکل فلمی سے انداز میں گردن ٹیڑھی کر کے میری طرف مڑا۔ "تم لڑکی کے بھائی ہو کیا؟" اس کا لہجہ بے ضرر سے بے ضرر انسان کو بھی طیش دلانے کے لیے کافی تھا۔

"ہاں... بھائی ہی سمجھ لو۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

بدرُو کے ساتھ ساتھ گندمی رنگت والے بدمعاش کے چہرے پر بھی تمسخر آمیز مسکراہٹ تھی۔ اُنھوں نے ایک دُوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا پھر بدرُو اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا: "بھئی یہ تمھاری ہونے والی بھابی کے بھائی ہیں... اُن کی کچھ خاطر مدارات کر... اور پھر انھوں نے ہمیں بدرُو کی بجائے بدرُوح کہا ہے۔ ان کے ساتھ تو کوئی خصوصی سلوک ہونا چاہیے۔"

دُوسرے بدمعاش نے باچھیں پھیلا کر میری طرف دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ابھی وہ صرف سوچ رہا ہو کہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے لیکن یہ دُوسرے کو دھوکے میں رکھنے کا ایک انداز تھا۔ اس کا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا لیکن میں اتنا اناڑی بھی نہیں تھا کہ اس کا ارادہ اس کی آنکھوں سے نہ پڑھ سکتا۔ میں بروقت پیچھے کو جھک گیا ورنہ اس کا گھونسا شاید میری ناک کو ہمیشہ کے لیے [illegible] چکا ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک طاقت ور لڑاکا تھا۔ اپنی ہی جھونک میں وہ مجھ پر گرنے لگا تو میں نے اس کے پہلو میں ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ وہ بھی ایک بار فرش پر گرا ضرور لیکن فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ پسلیوں پر دل کے قریب میرا گھونسا کھا کر اٹھ کھڑے ہونا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ تاہم اس کا مُنہ اس انداز میں کھل گیا جیسے اُسے سانس لینے میں دِقت پیش آ رہی ہو۔

بدرُو فوراً شاہ صاحب کو ایک طرف دھکیل کر مجھ پر جھپٹا لیکن ظاہر ہے میں اس کی طرف سے

غافل نہیں تھا۔ اس نے نہایت مہارت سے میری گردن دبوچنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اُس کی گردن پر ایک زوردار ہاتھ رسید کر کے اُسے اُس کے ساتھی کے پاس پہنچا دیا۔ اس کے بعد میں نے یہ انتظار نہیں کیا کہ ان میں سے کوئی مجھ پر حملہ آور ہو بلکہ میں انھیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ان پر ٹوٹ پڑا۔ ایک کا سر دیوار سے ٹکرا کر دُوسرے کو ٹھوکر رسید کر دی۔ اسی طرح میں نے ان دونوں کو گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ انھیں شاید مجھ سے اس طرح کی مار دھاڑ کی توقع نہیں تھی۔ اِس لیے وہ کچھ اور بھی آسانی سے مار کھا گئے تھے۔

مار کھانے کے دَوران بدرُو کو ایک ثانیے کی مُہلت میسر آئی تو میں نے اس کا ہاتھ قمیص کے نیچے جاتے دیکھا۔ وہ یقیناً کوئی ہتھیار نکالنے لگا تھا مگر میں نے اُسے اس کی مہلت نہیں دی۔ میری ٹھوکر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ اُس میں اب دم خم بالکل نہیں رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر برآمدے کے ستون سے ٹکرایا اور دھپ سے وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹ پھٹ چکے تھے اور چہرہ خون سے لتھڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھی کا حال اس سے جُدا تھا اور آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے کھلے صحن سے یوں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے تارے گن رہا ہو۔ اس وقت اگر دن ہوتا تب بھی تارے تو اُسے ضرور نظر آ رہے ہوتے۔ میں نے بدرُو کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے مُنہ پر ایک طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا: "تیرے نام میں 'ح' کی جو کمی ہے، وہ میں آج پوری کر کے چھوڑوں گا... اور شرفا میں تیرا رشتہ بھی اتنے عمدہ طریقے سے طے کراؤں گا کہ تیری آنے والی اور جانے والی سبھی نسلیں یاد رکھیں گی۔"

میں نے اُس کے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کی تو وہ بلبلا اٹھا اور بے بسی سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے رو دینے کے سے انداز میں بولا: "وہ مردُود شیر خان اور سکندر کہاں مر گئے...؟ ہمارا قیمہ بنوانے کے بعد آئیں گے کیا؟"

اِسی لمحے دروازے کی طرف سے ایک پُرسکون سی آواز سُنائی دی: "معاف کرنا بدرُو! ہم غلط فہمی میں رہے۔ ہم تو پہلے ہی موجود تھے۔ ہم سمجھے تم کسی کو سبق دے رہے ہو، ہمیں نہیں معلوم تھا کہ خود تم ہی تعلیم حاصل کر رہے ہو۔"

میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ دروازے پر جو کوئی بھی ہے اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہے جس کا رُخ ہماری طرف ہے۔ میں نے تیزی سے گھوم کر بدرُو کو اپنی ڈھال بنانے کی کوشش کی لیکن اس دَوران میں ایک لمحے کے لیے اس کے ساتھی کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ اُس نے لیٹے ہی لیٹے میری ٹانگ میں ٹانگ پھنسا دی۔ میں گرا تو نہیں لیکن لڑکھڑا ضرور گیا اور اسی دَوران میں نے برآمدے کے ایک ستون کی آڑ لینے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی وہ آواز ابھری: "خبردار... زیادہ ہوشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں۔ سیدھے کھڑے ہو جاؤ، ورنہ ٹانگوں سے محروم ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد سیدھے کھڑے ہونے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔"

میں تو لفظ 'خبردار' سنتے ہی اپنی جگہ سیدھا کھڑا ہو چکا تھا۔ زاویہ ایسا تھا کہ اب میں یہ حکم دینے والے کو دیکھ بھی سکتا تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا، طویل القامت اور سفاک صورت آدمی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چپٹا سا پستول تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ ایک میانہ قامت آدمی بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا لیکن وہ اُسے ڈھیلے ڈھالے انداز میں تھامے ہوئے تھا۔ وہ دونوں دروازے پر کھڑے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ نادر حسین اُن میں سے بھی کوئی نہیں تھا۔

"بدرُو... شفیق...!" لمبے آدمی نے دونوں زخمی بدمعاشوں کو مخاطب کیا: "تم دونوں اٹھ کر باہر آ جاؤ... ہمت کرو... شاباش... تم تو بہت ہی بودے نکلے یار۔ اس اکیلے لونڈے سے ایسی حجامت بنوالی۔"

ان دونوں نے کوئی جواب نہ دیا اور کراہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے قہر آلود نظروں سے گھور کر وہ دروازے کی طرف چل دیے۔ بدرُو اس لڑکی کو اب شاید بالکل بھول چکا تھا، جس کا وہ رشتہ لینے آیا تھا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے بدمعاشوں نے اس طرح انھیں گزرنے کا راستہ دیا کہ اُن کی نظر ایک لمحہ کے لیے بھی مجھ سے ہٹنے نہ پائی۔ بدرُو اور شفیق باہر چلے گئے تو دونوں نووارد بدمعاش کچھ آگے بڑھ آئے اور صحن میں ایک دُوسرے سے کافی دُور ہٹ کر کھڑے

ہو گئے۔

"چلو برخوردار! باہر چلو..." لمبے آدمی نے پستول کو جنبش دی۔ وہ بدرُو اور شفیق کی طرح زعم میں مبتلا نہیں تھا۔ اس نے اتنی احتیاط ضروری سمجھی کہ مجھے دروازے کی طرف چلنے کا حکم دینے سے پہلے اپنے ساتھی سے اتنی دُور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا کہ جب میں اُن کے درمیان میں سے گزروں تو وہ دونوں ہی میری دسترس سے دُور رہیں۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ دونوں جسمانی طور پر بدرُو اور شفیق سے کمزور لیکن عملی طور پر زیادہ خطرناک تھے۔

میں ان کے درمیان سے گزر کر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں میرے پیچھے آنے لگے۔ میں باہر آیا تو بدرُو اور شفیق منتظر کھڑے تھے۔ ان کے چہرے بُری طرح بگڑے ہوئے تھے۔ اِس لیے میں صحیح طور پر نہ دیکھ سکا کہ ان کے تاثرات کیا ہیں۔ بہرحال ان کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کے شعلے تھے اور میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اگر میں اسی طرح سعادتمندی کے ساتھ خیر و عافیت سے ان کے ٹھکانے تک پہنچ گیا تو وہ میرا کیا حشر کریں گے... مگر مجھے کوئی راہِ فرار بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے پیچھے جو دو آدمی پستول لیے چلے آ رہے تھے، میں اُن کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف پہلا قدم اٹھاتے ہی کئی گولیاں میرے جسم میں اتر جائیں گی۔ وہ اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے اور پستول استعمال کرنے کے معاملے میں مہا اُستاد معلوم ہوتے تھے۔ لمبے آدمی نے مجھے گلی میں دائیں طرف مڑنے کا حکم دیا۔ گلی میں ویرانی تھی اور بیشتر مکانوں کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ بیشتر مکانوں کی تاریک کھڑکیوں کے کسی نہ کسی روزن سے کوئی نہ کوئی سہمی ہوئی آنکھ گلی میں ضرور جھانک رہی ہے۔ میں دائیں طرف چند قدم چلا تو مکانات کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ہم میدان میں جا پہنچے۔ میدان میں بھی ملگجا سا ماحول تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک سیاہ جیپ کھڑی تھی۔ لمبے بدمعاش نے مجھے جیپ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔

میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے

دفعتاً سکوت و سناٹے کے تمام بت یک لخت ہی چھناکے سے بکھر گئے۔ کسی طرف سے ایک ساتھ دو فائر ہوئے اور میں اضطراری طور پر سینے کے بل کچی زمین پر لیٹ گیا۔ میرے عقب میں دو چیخیں گونجی تھیں۔ تڑپتے ہوئے میں نے دیکھا کہ دونوں پستول بردار بدمعاشوں کے ہاتھوں سے پستول غائب ہو چکے ہیں اور ان ہاتھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ گولیاں یقیناً ان کے ہاتھوں سے پار ہو گئی تھیں۔ بلاشبہ فائر کرنے والے کا نشانہ غضب تھا۔ تکلیف نے ان دونوں بدمعاشوں کو ساری مشاقی و مہارت بھلا دی تھی۔ وہ مزید متوقع فائر سے بچنے کی تدبیر کرنے کی بجائے اسی طرح کھڑے متوحش انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ فائر کرنے والے کا کہیں نام و نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بدرُو اور شفیق اپنی تمام تر شکستہ حالی کے باوجود حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے سینے کے بل لیٹ چکے تھے اور جیپ کی طرف کھسک رہے تھے۔ پیچھے بعد دیگرے دو فائر اور ہوئے۔ اس بار میرے اندازے کے مطابق گولیاں لمبے اور میانہ قامت بدمعاش کو چھوتی ہوئی گزری تھیں۔ گویا انھیں جان بچانے کا خیال آیا اور وہ زمین پر اوندھے گر گئے۔ پھر کہنیوں کے بل جیپ کی طرف کھسکنے لگے۔

مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ فائر ایک تاریک گلی کی طرف سے کیے گئے تھے اور فائر کرنے والا تنہا ہی تھا۔ اُس کا مقصد ان بدمعاشوں میں سے کسی کو ہلاک کرنا نہیں تھا۔ وہ شاید مجھے اغوا ہونے سے بچانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ مزید کوئی فائر نہیں کر رہا تھا اور ان چاروں بدمعاشوں کو موقع دے رہا تھا کہ وہ رینگتے ہوئے جیپ تک پہنچ جائیں۔ ان چاروں میں سے کسی کو بھی اب میرا خیال نہیں رہا تھا۔ صرف موت کا خوف اُن کے ذہن پر سوار تھا۔ تاریکی میں کسی نامعلوم سمت سے آنے والی اور زندگی سے محروم کر دینے والی گولی کے خوف نے انھیں ساری بدمعاشی اور تیزی و طراری بھلا دی تھی۔ کسی نہ کسی طرح وہ چاروں حتی الامکان پھرتی سے جیپ میں سوار ہو گئے۔ بدرُو نے ایک ثانیے کے لیے پلٹ کر میری طرف دیکھا تھا۔ اسی لمحے اندھیرے سے ایک

اور گولی آئی اور غالباً جیپ کے کسی فولادی حصے سے ٹکرائی۔ بے اختیار ان چاروں نے جیپ میں بھی اپنے سر نیچے کر لیے۔

اسٹیئرنگ وہیل لمبے نے سنبھالا تھا۔ اُس نے فوراً انجن اسٹارٹ کیا۔ اسی لمحے میدان کے دُوسری طرف سے سائرن سنائی دینے لگے۔ پھر میں نے دُور اسی سمت میں آگے پیچھے دو فلیشر بھی جھلملاتے دیکھے۔ غالباً یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ جن کی چھتوں پر فلیشر لگے ہوئے تھے۔ دونوں گاڑیاں اس طرف کی کشادہ سڑک سے میدان کی طرف آ رہی تھیں۔

لمبے نے ایک ہاتھ زخمی ہونے کے باوجود نہایت تیزی سے اسٹیئرنگ وہیل گھمایا۔ جیپ نے یو ٹرن لیا۔ اور کسی عفریت کی طرح غرّا کر تیزی سے میری طرف بڑھی۔ میں گولیوں سے بچنے کے لیے سینے کے بل جہاں گرا تھا، اب تک وہیں لیٹا ہوا تھا۔ لمبے نے اپنے ادھورے مشن کی تکمیل کے لیے اس موقعے کو غنیمت جانا تھا۔ اور جیپ مجھ پر چڑھا دی تھی۔ دفعتاً ایک اور فائر ہوا اور جیپ کی ونڈ اسکرین چکنا چُور ہو گئی۔ جیپ کو ایک جھٹکا لگا۔ شاید لمبے نے غیر ارادی طور پر بریک لگا دیے تھے۔ دُوسرے ہی لمحے جیپ ذرا سا لہرائی پھر اس نے ایک اور یو ٹرن لیا اور اسی سمت میں واپس چل دی جس طرف سے وہ مجھے رَوندنے کے لیے بڑھی تھی۔ وہ مجھ سے صرف دو بالشت کے فاصلے سے واپسی کے لیے گھومی تھی۔ گویا موت مجھ سے صرف دو بالشت کے فاصلے سے گزر گئی تھی۔

جیپ تیزی سے، دوسری طرف کی ایک گلی میں گھس گئی اور دوسرے ہی لمحے میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔ اس دوران پولیس کی گاڑیاں میدان کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ اُن کے سائرن بدستور آن تھے اور فلیشر بھی جھلملا رہے تھے۔ ایک گاڑی میدان کے ایک طرف آن رُکی اور دوسری گاڑی دوسری طرف... ایک بند جیپ تھی اور ایک فوکس ویگن... اس وقت تک میں اٹھ کھڑا ہوا تھا اور میرا ذہن جیسے کسی خلا میں معلق تھا۔ شاید لاشعوری طور پر مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میں بالکل بے گناہ اور ہر جرم سے لاتعلق ہوں لہٰذا پولیس بھلا مجھے کیا کہے گی؟... لیکن اسی لمحے مجھے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور ایک کھُردری سی سرگوشی سنائی دی "احمق! بھاگو... ورنہ دھر لیے جاؤ گے!"

میں نے آنکھیں بند کر کے اِس مشورے پر عمل کرنے کی بجائے مشورہ دینے والے کی طرف دیکھا حالانکہ یہ وقت جائزے، تجزیے اور مشاہدے کا نہیں تھا۔ اپنے دائیں طرف نظر ڈالتے ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، محض ایک ہیولے کی طرح مجھے دکھائی دیا تھا لیکن یہ ہیولا بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ ایک دراز قد شخص تھا جس کا چہرا مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کا حلیہ میرے لیے مانوس تھا... سیاہ سُوٹ اور سیاہ ہیٹ...

یہ یقیناً وہی شخص تھا جس سے کئی بار میرا سامنا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ سامنا ہونے کا تو اب بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ میں اس کی صورت دیکھنے سے قاصر تھا۔ پھر بھی اس کا میرے اس قدر نزدیک موجود ہونا ہی میرے لیے کچھ کم سنسنی خیز نہیں تھا۔

پولیس کی ایک گاڑی پر میگافون بھی نصب تھا۔ میگافون پر ایک تیز آواز ابھری "خبردار... کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے..."

... لیکن یہ جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس شناسا ہیولے نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک طرف کو کھینچ لیا تھا کیونکہ اسی لمحے پولیس کی فوکس ویگن اس طرح ہماری طرف مڑی تھی کہ اگر مجھے کھینچا نہ گیا ہوتا تو میں روشنی میں نہا جاتا۔ ہیولے نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک شاید پولیس کی کسی گاڑی سے کوئی پولیس والا اُتر چکا تھا۔ اس نے ایک فائر بھی کیا لیکن گولی نہ جانے کس سمت میں گئی۔ غالباً اس نے ہوائی فائر کیا تھا۔ مجھے اس وقت کچھ دیکھنے یا سوچنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی کیونکہ جس رفتار سے وہ ہیولا دوڑ رہا تھا، اس کا ساتھ دینے کے لیے مجھے گویا ہوا کے دوش پر اُڑنا پڑ رہا تھا کیونکہ میرا ہاتھ اس کی آہنی گرفت میں تھا۔

وہ مجھے لیے ایک ایسی تنگ و تاریک گلی میں داخل ہو چکا تھا جس میں کسی گاڑی کا داخل ہونا ممکن نہیں

تھا۔ یہ گلیاں شاید اس حد تک اس کی جانی پہچانی تھیں کہ وہ آنکھیں بند کر کے بھی ان میں دوڑ سکتا تھا... تبھی یوں اندھیرے میں مجھے ساتھ اڑائے لیے جا رہا تھا۔ کئی منٹ تک ہم ایسی ہی گلیوں میں چکراتے رہے پھر سامنے کچھ روشنی نظر آئی۔ میں ایک گندے نالے کی چھوٹی سی پلیا سے گزر کر آگے بڑھا تو اچانک ہی میں نے اپنے آپ کو چورنگی چوک میں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ کے درمیان پایا۔ سامنے مین روڈ پر ٹریفک رواں دواں تھا میرے دائیں بائیں متعدد ٹھیلے والے آوازیں لگا کر پھل وغیرہ فروخت کر رہے تھے۔

میں بھونچکا سا ہو کر رک گیا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ حالانکہ ہوا بالکل دھیمی چل رہی تھی مگر میرے کانوں میں نہ جانے کیوں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ حواس ذرا درست ہونے پر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو احساس ہوا کہ اس سیاہ سوٹ اور سیاہ ہیٹ والے کا تو کہیں دُور دُور تک پتہ نہیں۔ مجھے خیال آیا کہ گندے نالے کی پلیا پر پہنچنے سے ذرا پہلے ہی میرا ہاتھ اس فولادی گرفت سے نکل گیا تھا۔ اس کے بعد تو میں اپنی ہی جھونک میں دوڑتا ہوا آگے تک آ گیا تھا۔

میں نے کپڑے جھاڑے اور ان لوگوں میں شامل ہو کر ایک طرف کھڑا ہو گیا جو غالباً بسوں اور ویگنوں کا انتظار کر رہے تھے۔ اب میں بظاہر پُرسکون تھا لیکن میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ سیاہ سُوٹ والا وہ پُراسرار شخص جو اب تک میرے لیے ایک معمہ بنا ہوا تھا، اس کے بارے میں آج کم از کم ایک بات تو واضح ہو گئی تھی... کہ وہ میرا ہمدرد اور بہی خواہ ہے۔ آج اس نے میری مدد نہ کی ہوتی تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ دُوسرے ہی لمحے میرے ذہن نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ اگر وہ شخص واقعی میرا ہمدرد اور بہی خواہ ہوتا تو اسے اس قدر پُراسرار بننے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ سیدھی طرح بھی کٹھن مرحلوں پر میری مدد کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً دشمن ہی کے کیمپ کا آدمی تھا لیکن اس وقت اس نے مجھے پولیس کے ہتھے چڑھنے سے محض مصلحتاً بچایا تھا۔ ظاہر ہے اگر میں پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے پوری رام کہانی سُنانا پڑتی۔ اس میں ڈائری کا بھی ذکر آتا — اور وہ نامعلوم لوگ جو ڈائری کے سلسلے میں میرے پیچھے لگے ہوئے تھے، غالباً ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ کسی تیسری پارٹی کو ڈائری کی بھنک بھی پڑے۔ خصوصاً پولیس سے تو وہ نہ جانے دُوسری بھی کیا کیا چیزیں مخفی رکھنا چاہتے ہوں۔ بس یہی ایک وجہ سمجھ میں آتی تھی۔

سوچ بچار سے جب میرا ذہن کچھ صاف ہُوا تو میں نے ایک تانگہ روکا اور شاہی بازار چل دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت اکھاڑہ بند ہو چکا ہو گا اور اُستاد گھر جا چکے ہوں گے۔ انھیں رپورٹ دینے کے لیے اب میں ان کے گھر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں جسمانی طور پر اور ذہنی طور پر زیادہ تھک چکا تھا۔ میں اب آرام کرنا چاہتا تھا۔ آنکھیں بند کر کے دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانا چاہتا تھا۔

شاہی بازار پہنچ کر میں نے دیکھا کہ گلنار کے بالاخانے پر ساز و آواز کی انجمن سجی ہُوئی تھی۔ میں اس طرف نہیں گیا اور اپنی کمین گاہ میں آ گیا۔ وہ عقبی کوٹھڑی جس میں پہلے دن میرا دم گھٹنے لگا تھا، اب مانوس لگنے لگی تھی۔ خصوصاً اس وقت تو یہاں پہنچ کر مجھے عجیب فرحت آمیز سی خنکی، سکون اور تحفظ کا احساس ہوا۔ میں جوتے اُتار کر بستر پر گرا اور تھوڑی ہی دیر بعد نیند کی دلکش وادی میں اُتر گیا۔

آنکھ کھُلی تو یوں لگا جیسے بیدار ہونے پر بھی سنہرے خوابوں کی ایک آدھ کرچی آنکھوں میں پھنسی رہ گئی ہو، کیونکہ میرے سامنے گلنار کی دُھندلی دُھندلی صُورت تھی۔ پھر میں نے آنکھیں مَل کر دیکھا تو نظروں کے اُفق پر وہ چاند چہرہ اپنی تمام تر تابناکی کے ساتھ طلوع ہو گیا۔ تب مجھے یقین کرنا پڑا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا، وہ حقیقتاً میرے سامنے موجود ہے۔ وہ سامنے کی دیوار کے ساتھ لگی، لوہے کی ایک معمولی اور غیر آرام دہ کرسی پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ اسے احساس ہو گیا کہ میں بیدار ہو چکا ہوں۔ وہ اخبار سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھتے ہُوئے مسکرا دی۔

"میں رات بھر بالاخانے پر رہی ہوں۔" وہ شکوہ آمیز لہجے میں بولی۔ "میں پریشان تھی کہ شام سے تم کہاں غائب ہو۔ پھر رات گئے میں اپنی محفل ختم کر کے یہاں آئی تو دیکھا تم بے سُدھ پڑے سو رہے ہو۔ تمھارا حلیہ بتا رہا تھا کہ تم پھر کسی ہنگامے سے گزرے ہو۔ میں کچھ ایسی فکرمند رہی کہ نہ تو گھر جانے کو جی چاہا اور نہ ہی تمھیں جگانے پر دل آمادہ ہُوا۔"

"اس کا مطلب ہے، تم نے رات کا باقی حصّہ لوہے کی اس کرسی پر بیٹھے بیٹھے گزار دیا؟" میں یک دم اُٹھ بیٹھا۔

"تو اور کیا کرتی؟" وہ نہایت سادگی سے بولی۔ گویا اس کے لیے واقعی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"خدا کی پناہ۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "لڑکی! تم میرے لیے اِتنا پریشان ہونا چھوڑ دو۔ کہیں پریشانیاں تمھارا مقدّر نہ ہو جائیں۔"

"میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔ "یہ بتاؤ کہ تم پر کیا گزر رہی؟"

میں نے اُسے شب گزشتہ کی داستان سُنائی تو وہ کئی لمحے گم صُم سی میری طرف دیکھتی رہ گئی۔ بالآخر ایک گہری سانس لے کر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "قدرت کا دستِ مہرباں ہر بار تمھارے لیے ڈھال بن جاتا ہے۔ ورنہ زندگی کا چراغ بجھ جانے میں کوئی کسر تو نہیں رہتی۔ میرا جی چاہ رہا ہے، تمھارا صدقہ اتار دوں۔"

"کہاں تک اتارو گی، صدقہ؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں تو اب خود کو صدقے کا بکرا محسوس کرنے لگا ہوں۔ نہ جانے کب چھُری پھر جائے۔"

"بد فال مُنہ سے نہیں نکالتے۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "تمھیں تو مالک کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

"تمھیں کیا معلوم کہ میں اس کا کتنا شکر ادا کرتا ہوں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "بہرحال، اطمینان سے گھر چلی جاؤ۔ میں شاید آج نادر حسین کی تلاش میں جاؤں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو ہو گا... دیکھا جائے گا۔"

"تمھیں اپنے بارے میں اتنی بے نیازی اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمھاری زندگی اب کسی کی امانت ہے۔"

"اتنی بے وقعت زندگی کس کی امانت ہو سکتی ہے؟" میں مسکرا دیا۔

"شاید کسی بے وقعت سے انسان کی..." وہ مخمور سے انداز میں مسکرا دی۔

"اگر تمھارا اشارہ اپنی طرف ہے تو تم نے اپنے آپ کو بے وقعت کہہ کر بے حد کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔ اپنی قدر و قیمت مجھ سے پُوچھو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا واقعی تمھاری نظر میں میری کوئی قدر و قیمت ہے؟" دفعتاً اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی اور... آنکھوں میں سنجیدگی کی پرچھائیاں لرزا اٹھیں۔

"کیا تمھیں اب بھی یہ سوال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟" میں نے اُلٹا اس سے سوال کر دیا۔

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی جیسے اپنے آپ کو کنٹرول کر رہی ہو۔ پھر تفہیمی سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں احمق ہوں... مجھے تم سے ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہم ہر قسم کے سوالوں کی منزل سے گزر گئے ہیں۔ ہمیں تو بس ایک دوسرے کے لیے مجسّم جواب ہونا چاہیے۔"

وہ اٹھ کھڑی ہُوئی اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئی اور مجھے ایک بار پھر یک لخت ویرانی کا سا احساس ہونے لگا... کمرے میں بھی اور دل میں بھی... وہ آتی تھی تو در و دیوار جگمگا اُٹھتے تھے اور وہ چلی جاتی تھی تو گویا ساری خوب صُورتی اور چمک دمک اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ میں دیر تک اَن گِنت سوچوں میں اُلجھا رہا۔ اس لڑکی کو اب اپنی زندگی سے نکالنا شاید میرے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ اُدھر نازو کی یاد بھی دل میں پھانس کی طرح پیوست تھی۔ وہ کچھ اس طرح ملی اور اس طرح بچھڑی کہ ذہن پر خراشیں سی چھوڑ گئی تھی، ممکن ہے وہ مل جاتی تو اس کے لیے دل میں وہ پہلی سی بات نہ رہتی لیکن فی الحال تو اس کے نہ ملنے کی تشنگی ہی ایک طرح کا سرمایۂ حیات بنی ہُوئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں ان دو ستاروں کی کشش کے درمیان کب تک معلق رہوں گا۔ بالآخر میں تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

بازار میں آ کر میں نے ناشتہ کیا اور پھر بغلوں میں

ہاتھ دے کر خراماں خراماں مین روڈ کی طرف چل دیا۔ میرا ارادہ پہلے اُستاد مجو پہلوان کی طرف جانے کا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ میری طرف سے پریشان اور متفکر ہوں گے۔ ممکن تھا کہ وہ شاہ صاحب کی طرف بھی ہو آئے ہوں۔ ابھی میں شاہی بازار میں ہی تھا کہ نیلے رنگ کی ایک چمچماتی ہوئی مرسیڈیز عقب سے رینگتی ہوئی قریب آئی اور ذرا آگے جا کر ترچھی ہو کر یوں رُک گئی کہ مجھے بھی رُکنا پڑ گیا۔ میرے حواس پر اس وقت ناشتے کا سُرور چھایا ہوا تھا اور میں دھیمی ہوا کے خنک جھونکوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے آپ میں مگن چلا جا رہا تھا لیکن مرسیڈیز کے اِس طرح رُکنے سے یک بیک میرے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے اور میں اُس چیتے کی طرح چوکنا ہو گیا جسے شکار نظر آ گیا ہو۔

میں نے دیکھا مرسیڈیز کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک باوردی ڈرائیور موجود تھا مگر کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے نہیں تھے۔ اس لیے مجھے عقبی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو بھی صاف طور پر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا نہایت بارعب شخص تھا۔ اوپر کو اُٹھی ہوئی موٹی موٹی مونچھیں۔ چوڑا چکلا اور بھاری سا چہرہ... نہایت سلیقے سے جمے ہوئے چمکیلے بال اور چوڑی پیشانی پر نخوت کی ہلکی سی شکن... اس کے جبڑوں کا گوشت ڈھیلا پڑ چکا تھا مگر ابھی بدنمائی کی حدود میں داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ تاریک شیشوں کی عینک لگائے ہوئے تھا۔ جسم پر نفیس قسم کا سُوٹ تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دولت مند آدمی ہے۔ وہ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”آؤ جوان! ہم تمھیں چھوڑ دیں گے، جہاں کہو گے۔“

میں خاموشی سے اُسے گھورتا رہا تو وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”لوگوں نے بتایا تھا کہ تم بڑے شیر جوان ہو لیکن تم تو لفٹ قبول کرتے ہوئے بھی ڈر رہے ہو۔ حالانکہ نہ ہم کوئی نچلے درجے کے بدمعاش ہیں اور نہ تم کوئی نرم و نازک لڑکی...!“

میں نے اب بھی خاموشی سے اُسے گھورنے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ کار سے اُتر آیا اور دوستانہ لہجے میں بولا۔ ”بھئی اب آ بھی جاؤ۔ راستے میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں بلکہ اگر تمھارے پاس کچھ وقت ہو تو کسی اچھے سے ہوٹل میں بیٹھتے ہیں۔ بعد میں تم جہاں کہو گے، وہیں چھوڑ دیں گے۔“

”یہ سرِ راہ مجھے دیکھ کر تمھیں کونسی باتیں کرنے کا خیال آ گیا؟“ میں نے اس کی عمر اور دبدبے کی پروا کیے بغیر ترش لہجے میں کہا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی ایسا بھلا آدمی نہیں ہے، جیسا کہ نظر آ رہا ہے۔

وہ ٹائی کی گرہ درُست کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ایک معتبر شخص نے تمھاری صورت دکھا کر بتایا ہے کہ آج کل تم گلنار کے سب سے زیادہ قریب ہو۔ میں نے سوچا کہ تم سے بات کر لی جائے۔ تمھارا نام مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔“

اُس کے منہ سے گُلنار کا نام سُن کر میں چونک پڑا تاہم کوشش یہی کی کہ میرے چہرے سے کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہ ہونے پائے۔ میں نے بدستور اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تمھیں اتنی اہم بات معلوم ہو گئی ہے وہاں میرا نام بھی معلوم ہو جائے گا۔ لیکن پہلے اپنا تعارف تو کرا دو۔“

”ہمیں نواب خان کہتے ہیں۔ اور ہم صرف نام کے نواب نہیں بلکہ خاندانی نواب زادے ہیں۔“ وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

”حالانکہ تمھارے متعلق جو کچھ میں نے سُنا ہے اُس کی روشنی میں تم مجھے کسی اور ہی قسم کے 'زادے' لگتے ہو۔“ میں نے بلا جھجک کہا۔

وہ بُرا منائے بغیر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم پہلے ہی ہمارے بارے میں سُن چکے ہو ویسے بھی یہ بھلا کیونکر ممکن ہے کہ کوئی گلنار کے قریب رہے اور اُس نے ہمارا تذکرہ نہ سُنا ہو۔“ پھر اس نے کار کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرا خیال ہے، بیٹھ ہی جاؤ۔ اب تو تم سے بات کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے... تمھاری بھی سُن لیتے ہیں۔ آج کل ہر طرح کے جانور میرے سامنے اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑتے جا رہے ہیں۔ تمھاری بولی بھی سُن لیتے ہیں۔“ میں تاؤ دلانے والے انداز میں بولا اور اطمینان سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ نواب خان گویا اپنے آپ پر جبر کر رہا تھا اور کسی مصلحت کے تحت اس وقت میرے گستاخ

طرزِ تکلم کو برداشت کر رہا تھا۔ وہ میرے برابر آن بیٹھا اور ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ ”انٹرکان چلو۔“ نواب خان نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

مین روڈ پر آنے کے بعد گاڑی نے تمام تر بے ہنگم ٹریفک کے باوجود ایئر مال تک پہنچنے میں بہت وقت لیا۔ چند منٹ بعد ہی گاڑی انٹرکان کے ڈرائیو وے میں مُڑی اور پھر پارکنگ میں جا رُکی۔ اِس وقت تک میں بھی خاصی سوچ بچار کے بعد اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ مجھے نواب خان کے ساتھ زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ اُس سے دو ٹوک بات کر کے اور اس کی بات سن کے اپنا راستہ لینا چاہیے۔

ڈرائیور نے گاڑی رکتے ہی پھرتی سے اُتر کر ہمارے لیے دروازہ کھولا۔ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نواب خان! تمھیں جو کچھ بھی کہنا ہے مختصر ترین الفاظ میں یہیں کھڑے کھڑے کہہ دو۔ مجھے ایک کام یاد آ گیا ہے۔ میں تمھارے ساتھ زیادہ وقت ضائع کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“

”اب یہاں تک آ گئے ہو تو تھوڑی دیر بیٹھنے میں کیا حرج ہے؟“ وہ تاریک شیشوں کے چشمے کو ناک پر جماتے ہوئے بولا۔ ”کچھ کھاتے پیتے ہوئے گفتگو کی جائے تو ذرا خوشگوار رہتی ہے۔“

”میں نے کہا نا کہ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ جو کچھ کہنا ہے، جلدی کہہ ڈالو۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”اچھا...“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”تم کچھ زیادہ ہی لاٹ صاحب بنتے جا رہے ہو... خیر، بات یہ ہے کہ ہم ہر قیمت پر گلنار کو حاصل کرنا چاہتے ہیں...“

”تو پھر حاصل کر لیجیے۔ میں نے کب منع کیا ہے؟ میں نے ابھی تک اس پر کسی قسم کے حقِ ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کاش یہ کام اتنا ہی آسان ہوتا جتنی آسانی سے تم نے یہ بات کہہ دی ہے۔“ نواب خان ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”تمھیں شاید معلوم ہی ہو کہ گلنار کی خاطر ہم نے ہر جتن کر چھوڑا ہے۔ دولت کا لالچ دیا۔ محبت کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ بالآخر زبردستی کرنے کی بھی کوشش کر ڈالی۔ پیشہ ور بدمعاشوں سے اُٹھوانا چاہا۔ مگر اُس نے اس کا بھی جوابی بندوبست کر لیا! وہ وحشی ہرنی کسی طرح ہمارے قابو میں نہیں آئی۔ ہمارا کوئی داؤ اُس پر نہیں چلا۔ ناکامیاں جتنی بڑھتی جا رہی ہیں، آتشِ شوق بھی اتنی ہی تیز ہوتی جا رہی ہے۔ ہم بتا نہیں سکتے کہ اس کے لیے ہم کس طرح تڑپ رہے ہیں۔“

”اچھا... تو پھر...؟“ میں اُسے گھورنے لگا۔

”اب تم ہمیں اُمید کی کرن کی طرح نظر آتے ہو۔“ نواب خان بلا تامل بولا۔ ”ہمیں معلوم ہے، دُنیا میں ہر طوائف کے پاس کوئی نہ کوئی ہستی ایسی ضرور ہوتی ہے، جس کا وہ آنکھیں بند کر کے کہنا مانتی ہے۔ اطلاعات کی روشنی میں ہمیں یقین ہے کہ گلنار آج کل آنکھیں بند کر کے تمھارے پیچھے چل رہی ہے۔ خُدا کے لیے اُسے ہمارے حوالے کر دو اور اس کے بدلے ہم سے منہ مانگی دولت لے لو۔“

”ہُوں...“ میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے ایک طویل سانس لی۔ ”اب اندازہ ہوا کہ تم مجھے کس قبیل کا انسان سمجھ رہے ہو۔“ پھر میں نے نہایت ملائمت سے کہا۔ ”نواب خان! تم گلنار کے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

”کمال ہے! تم اب بھی پوچھ رہے ہو کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ یہ پوچھو، کہ میں نے کیا نہیں کیا۔“ وہ گویا بُرا مانتے ہوئے بولا۔

”نہیں... میرا مطلب ہے کہ اس کے لیے تھوڑی بہت تکلیف اُٹھا سکتے ہو؟“ میں نے ملائمت سے پوچھا۔

”ارے... تم تھوڑی بہت تکلیف کی بات کر رہے ہو۔ میں تو اس کے لیے جان پر بھی کھیل سکتا ہوں۔“ وہ بڑے جوش و خروش سے بولا۔

”بہت خوب...“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے منہ پر ایک زنّاٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ جسیم اور قد آور ہونے کے باوجود دُور جا گرا۔ وہ تھپڑ کچھ ایسا ہی تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو یقیناً اس کی نظر میں دُنیا اندھیر ہو گئی ہو گی اور شاید اُسے یہ بھی محسوس ہوا ہو کہ اس کے تمام دانت منہ سے نکل کر گر گئے ہیں۔ اس نے سر جھٹکا گویا آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا دُور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور تاریک شیشوں کی عینک دُور جا گری تھی۔ اُس کی آنکھیں

کچھ زیادہ ہی وحشت زدہ لگ رہی تھیں۔ خون تھوکتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

"تم نے خود تو کہا تھا کہ گلنار کے لیے تم ہر تکلیف اُٹھانے پر آمادہ ہو۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "میں نے تمھیں زیادہ تکلیف تو نہیں پہنچائی۔ گلنار کی خاطر تم ایک تھپڑ بھی برداشت نہیں کر سکتے...؟" یہ کہتے کہتے میں نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی پر ایک گھونسہ بھی رسید کر دیا۔ وہ ایک بار پھر کچھ دُور پیچھے جا گرا۔ پارکنگ میں ایک نئی دیوار تعمیر ہو رہی تھی۔ اس کا تعمیراتی سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ نواب خان کا سوٹ ریت میں اور چہرہ خون میں لتھڑ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ بدبخت...؟" غصے کی شدت سے اس کی آواز بیٹھ گئی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اُٹھ کر مجھ پر جھپٹا تو میں نے اس کے گھٹنے پر ایک ٹھوکر رسید کر دی۔ اس ٹھوکر نے اُسے ایک ٹانگ پر ناچنے پر مجبور کر دیا۔

"کمال ہے...؟" میں نے شکوہ کیا۔ "تم تو اتنی سی تکلیف میں ہی بلبلا اُٹھے۔ تم تو کہہ رہے تھے کہ گلنار کے لیے جان پر بھی کھیل سکتے ہو۔ میں تمھارے جذبے کی صداقت آزما رہا ہوں۔"

"خبردار... اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھا لو۔" دفعتاً کسی نے مجھے للکارا۔

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ نواب خان کا ڈرائیور تھا جس نے غالباً کافی دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بالآخر ریوالور نکال لیا تھا۔ لیکن اس نے حماقت یہ کی تھی کہ میرے کافی قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ظاہر یہ کیا جیسے میں ہاتھ اُٹھانے لگا ہوں لیکن درحقیقت میں نے اس کی کلائی پر کراٹے کا ہاتھ مارا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گرا۔ میں نے ڈرائیور کے جبڑے پر بھی ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ وہ نواب خان کے قدموں میں جا گرا۔

نواب خان گویا ایک عزم نو کے ساتھ مجھ پر جھپٹا لیکن میں نے جھکائی دے کر اس کی پسلیوں پر ہلکا سا گھونسہ رسید کر دیا۔ وہ تیسری بار اینٹوں کے قریب جا گرا اور اس مرتبہ اس سے اُٹھا نہیں گیا۔

ہم پارکنگ لاٹ میں ایسی جگہ پر تھے کہ ہوٹل کے دروازے پر کھڑے ہوئے باوردی دربان کی بھی اچانک ہی ہم پر نظر پڑ گئی۔ اس نے نواب خان کو گھونسا کھا کر گرتے دیکھ لیا۔ دوڑا دوڑا قریب آیا اور مجھے پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "اوئے خانہ خراب! یہ کیا کرتی اے... نواب صاحب کو مارتی اے؟"

میں نے جھکائی دے کر اپنے آپ کو بچاتے ہوئے کہا۔ "ارے نہیں خان صاحب! ہم تو نواب صاحب سے پیار محبت کرتی اے۔" پھر میں نے اس کے بازو کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اسے کچھ دُور دھکیل کر یک لخت انداز بدل کر خونخوار لہجے میں کہا۔ "تم جا کر اپنا کام کرو [...] خان! یا تمھیں بھی کوئی ہڈی پسلی تڑوانی ہے؟"

خان صاحب نے ایک لمحے کے لیے پُر تشویش نظر سے مجھے دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا تولا پھر خاموشی سے واپس چل دیے۔

میں نے نواب خان اور اس کے ڈرائیور کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔" میرا انداز ایسا ہی تھا گویا ہماری کوئی نہایت پُرسکون اور دوستانہ مجلس برخاست ہوئی ہو اور اب ہم ایک دوسرے سے اجازت طلب کرنے کے لیے اُٹھے ہوں۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وقت ملے تو مجھ سے دو [...] ملاقاتیں اور کرنا۔ اگر تم تکالیف برداشت کرنے میں ثابت قدم رہے تو شاید تمھارا کام بن جائے۔"

پھر میں نے کچھ فاصلے پر پڑا ہوا ریوالور اُٹھا کر اس کا چیمبر کھولا، گولیاں نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیں اور خالی ریوالور ڈرائیور کی طرف اُچھالتے ہوئے کہا۔ "اُداس نہ ہو میرے منّے، لے اس کھلونے سے کھیل..."

میں تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوٹل کی چار دیواری سے باہر آ گیا۔ فٹ پاتھ پر دو قدم چلتے ہی مجھے ایک خالی رکشا مل گیا اور میں اس میں بیٹھ کر اکھاڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اس وقت مجو پہلوان سے ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ اُدھر نواب خان سے ٹکراؤ کی وجہ سے بھی ذہنی ہلچل میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ آج گویا میں نے اُسے بھی اپنے خون کے پیاسوں میں شامل کر لیا تھا لیکن مجھے اس کا کوئی پچھتاوا نہیں تھا... گلنار نے میرے لیے اتنی تکلیفیں اُٹھائی تھیں۔ اتنے خطرات مول لیے تھے۔ کیا میں اس کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک ایسے شخص کو تھوڑا سا سبق دے دیتا جو خواہ مخواہ ہی پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

میں اکھاڑے پہنچا تو استاد بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ شاہ جی کے گھر بھی ہو آئے تھے اور بیشتر باتیں انھیں معلوم ہو چکی تھیں۔ جو کچھ انھیں معلوم نہیں تھا وہ میں نے بتا دیا۔ آخر میں میں نے کہا۔ "کل کا معرکہ تو درحقیقت اس پُراسرار سیاہ پوش کے نام ہے استاد! اگر وہ بروقت نہ پہنچتا تو اس وقت یا تو وہ بدمعاش میری کھال کھینچ کر اس میں بھس بھر رہے ہوتے۔ یا پھر پولیس مجھے اُلٹا لٹکا کر میری خبر لے رہی ہوتی۔"

"خیر... اب تم اپنے آپ کو اتنا لاوارث بھی نہ سمجھو۔" استاد مسکرا کر بولے۔ "ہم جو یہاں تمھاری خیر خبر رکھنے والے ہیں۔ تمھارا یہ حشر تو کبھی نہ ہونے دیتے۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "لیکن کہیں وہ معاملہ ہو جاتا کہ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک۔"

استاد نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ "خیر... چھوڑو ان باتوں کو۔ کل تمھارے عافیت سے نکل جانے کے بعد کی خبریں یہ ہیں کہ پولیس نے ان چاروں بدمعاشوں کو پکڑ لیا تھا۔ ان کی جیپ گلی میں پھنس گئی تھی۔ بہرحال انھوں نے پولیس کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ نہ تو شاہ صاحب والے معاملے کا کوئی ذکر کیا ہے اور نہ ہی تمھارے بارے میں کچھ کہا ہے۔ جس کی وجہ سے ابھی تک تو شاہ صاحب اور ان کے گھرانہ سکون سے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ بدمعاش ان کا اور تمھارا تذکرہ زبان پر لائیں گے بھی نہیں کیونکہ اس طرح وہ اور زیادہ پھنس جائیں گے۔"

"یہ تو درست ہے۔" میں نے ان سے اتفاق کیا۔ "بہرحال مجھے تو اب یہ سب مسائل غیر اہم اور معمولی محسوس ہونے لگے ہیں۔ وہ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں..."

اُستاد نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ "آج تو بات بات پر مصرعے پھینک رہے ہو۔ لگتا ہے طبیعت بڑی شاعرانہ ہو رہی ہے۔"

"ہاں... میں نے بتایا نا کہ ابھی ابھی نواب خان نامی ایک ہستی ناتحقیق کی شان میں پوری غزل عرض کر کے آ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ پھر میں سنجیدگی سے اصل موضوع پر آ گیا۔ "کل رات سے وہ پُراسرار سیاہ پوش میرے ذہن میں کھٹک رہا ہے۔ اس کے اقدامات تو دوستانہ ہیں لیکن میں فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ اسے دوستوں میں شمار کروں یا دشمن کیمپ کا آدمی سمجھوں۔"

"ارے چھوڑو برخوردار!" پہلوان لاپروائی سے بولے۔ "میرے خیال میں تو اس قسم کے کسی سیاہ پوش کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ تمھارے تخیّل کی پیداوار ہے۔ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن میں نے کہیں پڑھا ضرور ہے کہ حالات کی دشواریاں بعض اوقات کسی انسان کو کچلنے کی بجائے اس میں غیر معمولی صلاحیتیں پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے بحران سے نکل آتا ہے لیکن چونکہ اُسے خود بھی اپنے آپ پر یقین نہیں ہوتا کہ وہ ایسے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ اِس لیے وہ منطقی تسلی کی خاطر لاشعور میں ایسے پرچھائیں نما کردار تخلیق کر لیتا ہے اور ہر کٹھن مرحلے پر یہی سمجھتا ہے کہ اس پُراسرار اور نامعلوم کردار نے اس کی مدد کی ہے۔ میرے خیال میں تمھارے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا معاملہ ہے۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہے اُستاد!" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "میں بڑا عملی انسان ہوں۔ واہموں اور تخیل پرستی میں نہیں پھنستا... اور پھر اس کردار کو میں نے تو کل اندھیرے میں محض ایک ہیولے کی حد تک دیکھا ہے لیکن دُوسرے کئی لوگوں نے اُسے دن کی روشنی میں کار میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ وہ ایک بار شاہی بازار میں میرے بارے میں پوچھتا ہوا شیفے حلوائی کی دُکان پر پہنچا تھا۔ پھر اُسی دُکان پر وہ ایک نامکمل فلم کی تین ریلیں بھی دے گیا تھا جن کی ہمیں شدت سے تلاش تھی۔"

"خیر... چھوڑو اس بحث کو۔" اُستاد ہاتھ ہلا کر بولے۔ "کوئی اور بات کرو۔ یہ بتاؤ کہ اب ارادے کیا ہیں؟" انھیں گویا سیاہ پوش والے مسئلے سے کوئی

دلچسپی نہیں تھی۔

پھر ہم حالات کا تجزیہ کرنے لگے۔ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کوئی لائحہ عمل تیار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن حالات کا کوئی سر پیر ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اس لیے گاڑی کہیں نہ کہیں آ کر اٹک جاتی تھی۔

"ایک بات تو بہر حال طے ہے۔" بالآخر اُستاد بولے۔ "کہ تمھارے دشمنوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے ... اور کچھ دشمن پہلے تو شاید تمھیں قابو میں کر لینے کے باوجود کسی مصلحت کے تحت ہلاک نہیں کر رہے تھے لیکن اب شاید وہ مصلحتوں کو بھی بالائے طاق رکھ دیں ...۔" پھر جیسے اُستاد کو کچھ یاد آ گیا اور وہ چونک کر بولے۔ "وہ جو میں نے تمھیں ایک ریوالور دیا تھا، اُسے ساتھ رکھتے ہو؟"

"نہیں اُستاد!" میں نے مُرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ تو اُنھی ہنگامہ بازیوں میں مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔"

"خیر... کوئی بات نہیں۔" اُستاد بے پروائی سے بولے۔ "میں تمھیں اُس سے بہتر ریوالور دے دیتا ہوں۔"

میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔ "خیر تو ہے اُستاد! آپ نے اکھاڑہ کھولا ہوا ہے... گزر اوقات کے لیے پنساری کی دُکان کھولی ہوئی ہے ... اب اسلحے کی ایجنسی بھی لے لی ہے کیا؟"

"کیوں شرمندہ کرتے ہو۔" اُستاد اُٹھتے ہوئے بولے۔ "ایجنسی وغیرہ کیا... ذرا زیادہ بد دماغ قسم کے بدمعاشوں سے نمٹنے کے لیے دو چار طمنچے تو رکھنے ہی پڑتے ہیں۔"

وہ اُٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلے گئے۔ ایک لمحے کے توقف سے میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا... اُس وقت تک اُستاد ایک گوشے میں کھڑی ہوئی چوبی الماری کا تالا کھول چکے تھے۔ پھر اُنھوں نے ایک پٹ کھولا اور شیلف پر ہاتھ مار کر کچھ چیزوں کو ٹٹولنے لگے۔

اِسی دوران غالباً ہاتھ لگنے سے دُوسرے پٹ کی چٹخنی بھی ذرا ہل گئی اور وہ پٹ خود بخود ہی کھل گیا۔ الماری کے اس حصے میں شیلف نہیں تھا۔ ایک ہی لمبا سا خانہ تھا اور اس میں ہینگر پر ایک عمدہ سا سُوٹ [illegible] لٹکا ہوا تھا۔ سیاہ سُوٹ۔ یہی نہیں بلکہ اس کے [illegible] ہی کھونٹی پر سیاہ فلیٹ ہیٹ بھی ٹنگی ہوئی تھی [illegible] نیچے سیاہ فل بُوٹ بھی رکھے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ [illegible] کی کسی جیب میں سیاہ چشمہ بھی موجود ہو گا۔

میرے ذہن میں اُس پُر اسرار سیاہ پوش کا [illegible] تیزی سے گردش کرنے لگا۔ میں نے اُستاد کی طرف [illegible] اب وہ بھی پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہے [illegible]

ایک گہری سانس لے کر ایک [illegible]

ہاں

پیچھے ہٹ گیا۔

"پیروں تلے سے زمین نکلنے کا محاورہ [illegible] خوب آتا ہے اُستاد!" میں نے مسکراتے ہوئے [illegible] "اور ظاہر ہے تبھی ایک زمانہ آپ کو اُستاد کہ [illegible] ... مگر... کم از کم میرے سامنے تو آپ کو کسی [illegible] ناول کی ڈرامائی تشکیل پیش کرنے کی ضرورت [illegible] تھی۔ مجھے تو بتا دیتے کہ اس رُوپ میں آپ [illegible] کر رہے ہیں۔ میں کون سا آپ کا کالا کوٹ مانگ لیتا؟"

اُستاد مسکرا دیے اور میرا کندھا تھپک [illegible] بولے۔ "نتائج اخذ کرنے کے معاملے میں اتنی [illegible] چھلانگیں مت لگاؤ۔ میں سیاہ پوش ضرور [illegible] سیاہ رُو نہیں ہوں۔ تم جو سمجھ رہے ہو، میں وہ [illegible] نہیں ہوں۔ تم نے اپنی سرگزشت سنا [illegible] کئی بار ایک سیاہ پوش کا ذکر کیا ہے جو عام طو[illegible] مرسیڈیز میں، تمھاری تلاش میں سرگرداں دِ[illegible] وہ سیاہ پوش میں نہیں ہوں۔"

میں خاموشی سے اُستاد کی طرف دیکھتا [illegible] اُستاد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بو[illegible] پاس کوئی سیاہ مرسیڈیز نہیں ہے۔ تمھیں تو [illegible] ہے، میرے پاس تو بس انگریزوں کے زمانے [illegible] جیپ ہے جو زیادہ تر اپنے میکے میں ہی [illegible] مطلب ہے مکینک کے پاس ہی رہتی ہے [illegible] سڑک پر آتی ہے تو اس کی رفتار دیکھ کر [illegible] رفتار بھی ہنستا ہے اور گدھا گاڑیاں تک [illegible] پیچھے چھوڑتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ تانگوں [illegible] ہوئے گھوڑے اُسے دیکھ کر زیرِ لب مسکراتے ہیں اور پھر ہنہناتے ہیں۔ غرضیکہ سواری کیا ہے جگ ہنسائی کا سامان ہے۔ اک اُجڑا ہوا ارمان ہے۔"

"بس... بس اُستاد!" میں نے بے تحاشہ ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ تو اچھے خاصے مزاح گو ہیں۔" پھر میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ لوگ میری زندگی میں شرارے بھرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ایسے میں پھلجھڑیاں کیا لُطف دیں گی؟"

"مزاح کا کوئی وقت نہیں ہوتا برخوردار!" اُستاد نے [illegible]لے چوبی تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دکھوں [illegible]پریشانیوں اور تفکرات کی مثال، آسمان سے برستی ہوئی [illegible]ف کی سی ہوتی ہے۔ اگر تم افسردہ اور ساکت ہو کر کھڑے [illegible]ہو جاؤ گے تو رفتہ رفتہ اس برف میں دفن ہو جاؤ گے۔ [illegible]اپنے دل میں بھی شگفتگی کی چنگاری روشن رکھو اور اپنے [illegible]وجود کو بھی مزاح کے کمبل میں چھپائے رکھو، دفن ہونے [illegible]سے محفوظ رہو گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن... [illegible]فی الحال کام کی بات ننھی باتوں میں دفن ہوتی جا رہی ہے۔ [illegible]میں مطمئن ہونے لگا تھا کہ چلو اس سیاہ پوش والا معمہ [illegible]حل ہوا جو میرے ذہن سے کسی کنکھجورے کی طرح چپکا ہوا تھا۔ مگر آپ کی بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بات وہیں کی [illegible]وہیں ہے۔ وہ سیاہ پوش جو اس بساط کا کوئی اہم مہرہ [illegible]معلوم ہوتا ہے، وہ کوئی اور ہی ہے۔"

"بے شک۔" اُستاد نے تائید کی۔ "میں دو تین مرتبہ [illegible]تمھاری مدد کے لیے ضرور پہنچا تھا۔ ایک تو گزشتہ رات [illegible]کا قصہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ مرتبہ میں نے تمھیں [illegible]ایسے حملوں سے بھی بچایا ہے جن کا تمھیں علم ہی نہیں ہو [illegible]سکا۔ یہ ان موقعوں کا ذکر ہے جب میں تمھیں بتائے بغیر [illegible]محض احتیاطاً تمھاری نگرانی کر رہا تھا اور میری یہ احتیاط [illegible]نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔"

"اگر آپ غیر ہوتے تو میں آپ کی اس نوازش کا شکریہ ادا کرتا۔" میں نے کہا۔ "اصل پریشان کن بات یہ [illegible]ہے کہ آپ کی تمام تر نوازشات کے باوجود مسئلہ وہیں کا وہیں [illegible]ہے۔ میں ان لوگوں کا کوئی نہ کوئی سُراغ پانے کے لیے [illegible]سرگرداں ہوں جنھوں نے میرا سکون غارت کر رکھا ہے۔

لیکن ان کا ہر سُراغ میری نظر سے یوں نکل جاتا ہے جیسے عادی اور پیشہ ور مجرم موقع پاتے ہی جیل یا حوالات سے نکل بھاگتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

"جب انسان کی سمجھ میں کچھ نہ آئے تو اسے صرف ایک ہی کام کرنا چاہیئے۔"

"وہ کیا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"یہی کہ وہ کوئی کام نہ کرے۔" اُستاد نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "لہٰذا تم پر لازم ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ٹھہرے ہوئے ہو، وہاں جا کر آرام کرو۔ حالات خود ہی تمھارے دروازے پر دستک دیں گے۔"

"بات تو لاکھ روپے کی ہے اُستاد!" میں نے سر ہلایا۔ "اب تو مجھے بھی تجربہ ہو چکا ہے کہ جب میں اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہوں تو حالات کچھ سمجھ میں آنے بھی لگتے ہیں لیکن جب میں زیادہ بقراط بننے اور معمے حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو خود بھی ایک معمہ بن جاتا ہوں... ٹھیک ہے... میں چلتا ہوں۔" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ تو لیتے جاؤ۔" اُستاد نے الماری سے نکالا ہوا ریوالور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہے تو یہ محض ایک چھوٹا سا آہنی کھلونا مگر کبھی کبھی انسانی زندگی اس کے سامنے کھلونا بن جاتی ہے۔"

میں نے ریوالور لے کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ اُستاد سے مصافحہ کرتے وقت عقیدت سے ان کے ہاتھ کا بوسہ دیا اور اکھاڑے سے نکل آیا۔

راستے میں میں نے سوچا کہ گلنار کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کرتا چلوں تو بہتر ہو گا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آج صبح تراب خان سے میرا ٹکراؤ ہو چکا ہے اور میں معزز زینِ شہر کے اس ممتاز سماندے کی اچھی خاصی دُرگت بنا چکا ہوں۔ اُسے زمین کی خاک چٹوا چکا ہوں۔ گلنار کو اس واقعے سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ ہوشیار اور محتاط تو وہ رہتی ہی تھی لیکن اس واقعے کے بعد بہتر تھا کہ وہ اپنی احتیاطی تدابیر میں اضافہ کر دیتی۔

میرے اندازے کے مطابق گلنار کو راوی روڈ کے مکان میں ہونا چاہیے تھا۔ میں وہیں جا پہنچا۔ میں نے کال بیل بجائی تو گیٹ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے

کھولا۔ گلنار نے آج تک مجھے اپنی والدہ سے نہیں ملا یا تھا لیکن اس خاتون پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ گلنار کی والدہ ہیں۔

وہ گویا گلنار ہی کی تصویر تھی جس کے بالوں میں مصور نے غلطی سے چاندی کے کچھ تار شامل کر دیے تھے اور چہرے پر شاید غلطی سے ہی کچھ شکنیں سی اُبھار دی تھیں جو عمرِ رفتہ کے نقوشِ پا بن کر رہ گئی تھیں۔ میں تو انھیں پہلی بار دیکھ رہا تھا مگر وہ جانے کیونکر مجھے پہچانتی تھیں۔ دھیمے لہجے میں بولیں "اندر آ جاؤ جمال بیٹے!"

ان کے لہجے میں ایک عجیب افسردگی آمیز سنجیدگی تھی۔ انھوں نے مجھے گرم جوشی سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ لیکن اداس آنکھوں کی گہرائی میں میرے لیے ناپسندیدگی بھی نہیں تھی۔ میں اندر آ گیا تو گلنار کی امی نے شکی گیٹ بند کر دیا تاہم انھوں نے مجھے اندر چلنے کے لیے نہیں کہا۔ وہیں چھوٹے سے لان کے قریب رک کر ملائمت سے بولیں "کیا بات ہے؟"

میں غیر متوقع طور پر ان سے سامنا ہونے پر کچھ گڑبڑا سا گیا تھا۔ میں سنبھلتے ہوئے کہا "وہ... آنٹی... دراصل مجھے گلنار سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔"

"وہ سو رہی ہے بیٹا!" وہ بدستور ملائمت سے بولیں اور تب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ رات گئے تک گلنار نے بالا خانے پر محفل سجائی تھی اور باقی رات اس نے میرے سرہانے لوہے کی ایک نہایت غیر آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر میرے بیدار ہونے کے انتظار میں گزاری تھی۔ مجھے خود ہی اندازہ ہونا چاہیئے تھا کہ اس وقت وہ سو رہی ہو گی۔ ویسے بھی اس کی راتیں یا دن کون سا پُرسکون گزرتے تھے۔ "ٹھیک ہے آنٹی...! میں پھر کسی وقت مل لوں گا۔" میں شرمندہ سا ہو کر واپسی کے لیے مڑا لیکن اسی لمحے ایک آواز میرے قدموں کی زنجیر بن گئی۔

"سنو..." یہ گلنار کی آواز تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک کمرے کا، برآمدے کی طرف والا دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ زلفوں کی گھٹائیں اس کے کندھوں پر بکھری ہوئی تھیں اور آنکھوں میں کچی نیند کا خمار جھلک رہا تھا۔ لب و رخسار تمتمائے ہوئے سے تھے... اپنے آپ سے [illegible] بے پروا اپنے لباس کی آڑی ترچھی شکنوں سے بے نیاز [illegible] وہ گویا غیر مرئی شعلوں سے گزر کر آئی تھی اور خود [illegible] اپنی جگہ اک برقِ تپاں بن گئی تھی۔ میں اس کی رگ و پے [illegible] میں مقید تپش کو بہت دور سے محسوس کر سکتا تھا۔

آنٹی نے اُسے دروازے میں کھڑے دیکھا تو خاموشی [illegible] سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ گلنار [illegible] نے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر آنے [illegible] اشارہ کیا۔ میں مبہوت سا اُس کے مقابل ایک صوفے پر جا بیٹھا۔ جانے کیوں آج میں اپنے آپ کو اس کے سامنے کچھ نروس محسوس کر رہا تھا۔

"آنٹی بتا رہی تھیں کہ تم سو رہی ہو..." میں نے [illegible] تھوک نگل کر بات برائے بات کی۔ میں جیسے یکایک سب [illegible] کچھ بھول گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا بات کرنے آیا تھا۔ خرمنِ حواس کو اک شعلہ سا جو [illegible] کر گزر گیا تھا۔

"میں واقعی سو رہی تھی۔ امی کوئی جھوٹ تھوڑا [illegible] بول رہی تھیں۔" وہ مسکرائی۔ اس مسکراہٹ پر بھی نیند [illegible] کے خمار کا پرتو تھا... پھر یک لخت مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے معدوم ہو گئی اور وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے خوابناک سے لہجے میں بولی "سوتے سوتے مجھے یوں لگا جیسے تم میرے سرہانے کھڑے بول رہے ہو... حالانکہ میرا بیڈ [illegible] سب سے پیچھے ہے۔ گیٹ پر کھڑے ہو کر اگر کوئی زور سے بھی بولے تب بھی وہاں تک آواز پہنچنا مشکل [illegible] خصوصاً جب دروازے کھڑکیاں بند ہوں لیکن تمھاری آواز مجھے بالکل اپنے قریب سے سُنائی دی۔ میں جاگ گئی اور اٹھ کر برآمدے تک آئی تو یہاں واقعی تم موجود تھے... دیکھ لو... اب تمھاری آواز کی رسائی ہمارے خوابوں تک ہونے لگی ہے۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی [illegible] آنکھوں میں کچی نیند کے گلابی ڈورے اب معدوم ہونے لگے تھے۔

میں خاموش رہا۔ بیوقوفوں کی طرح اس کی [illegible] دیکھتا رہا۔

"یہ آج تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ بے وقوفوں [illegible] کی طرح کیا دیکھے جا رہے ہو؟" وہ محجوب سی ہو کر [illegible] کہنے لگی۔

"دراصل... وہ... آج تم کچھ اور ہی لگ رہی ہو۔" میں [illegible] نے ہکلاتے ہوئے کہا اور فوراً ہی سر جھٹک کر اصل [illegible] مقصد پر آنے کی کوشش کی "وہ... دراصل بات یہ [illegible] ہے کہ آج صبح میر نواب خان سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ [illegible] اُس کی ٹھوڑی بھی ٹھکائی کر ڈالی ہے..." میں [illegible] اُسے تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

میری بات ختم ہونے پر وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے [illegible] میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "جب اس نے مجھے حاصل [illegible] کرنے کے سلسلے میں تم سے مدد چاہی تو تمھیں واقعی اتنا [illegible] شدید غصہ آ گیا تھا؟"

"غصہ نہ آتا تو اور کیا آتا؟" میں نے تیزی سے [illegible] کہا "تمھارے خیال میں کیا مجھے اس کے حضور رقص [illegible] کر کے پیش کرنا چاہیئے تھا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرنا چاہیئے تھا۔ مائی باپ! بس چند لمحے انتظار فرمایئے! [illegible] ابھی گلنار کی مشکیں کس کے آپ کے قدموں میں [illegible] ڈال دیتا ہوں۔ کیا خیال ہے... یہ کہنا چاہیئے تھا مجھے...!"

وہ ہنستے ہنستے آگے کو جھک گئی۔ لہو کی لالی اس کے چہرے پر جھلک آئی اور میرا سنبھلا ہوا دل ایک بار پھر اتھل پتھل ہونے لگا۔ "تم تو اچھا خاصا آغا حشر کاشمیری والا ڈراما بھی بول لیتے ہو۔" بالآخر وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"میں یہاں تم سے اپنے اندازِ تکلم اور حسنِ بیان پر داد لینے نہیں آیا تھا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "بلکہ تمھیں خبردار کرنے آیا تھا کہ اب ذرا پہلے کی نسبت زیادہ ہشیار رہنا اور وہ اپنے اس ہونق قسم کے باڈی گارڈ کو بھی ہدایت کر دینا کہ چوکنا رہے۔"

"ہاں... یہ تو مجھے کرنا ہو گا۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر تشویش کی پرچھائیاں لرز اٹھیں۔ ایک لمحے کے لیے کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ وہ گویا کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

"دیکھا؟" میں نے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا "ہم نہ کہتے تھے کہ ہم بے سہاروں سے آشنائی نہ رکھو۔ مصیبتیں ہی مصیبتیں جھیلو گی۔"

"یہ نواب خان والی مصیبت تو تم سے کہیں پہلے کی ہے۔" وہ گویا اپنے اندیشوں کو پسِ پشت ڈال کر ایک بار پھر مسکرا دی "اور میں فکر مند اپنے بارے میں نہیں بلکہ تمھارے لیے ہوں۔ نواب خان خاصا بڑا بدمعاش ہے لیکن اس قسم کا بدمعاش جو معاشرے میں بظاہر بڑے معزز ہوتے ہیں۔ میں تو ہوشیار رہوں گی ہی لیکن تم بھی محتاط رہنا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں نے تمھیں ہوشیار رہنے کی تلقین کی۔ تم نے مجھے ہوشیار رہنے کی نصیحت کی حساب برابر ہو گیا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"بیٹھو نا... چائے وائے نہیں پیو گے؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"چائے نہیں، البتہ وائے ہوں گا اور وہ شاید بازار میں مل جائے۔" میں نے دروازے کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت تیز ہو گئے ہو۔ لاہور کی ہوا لگ گئی ہے تمھیں۔" وہ بھی اٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں... کل حکیم صاحب بھی کہہ رہے تھے کہ ہوا لگ گئی ہے۔ اسی وجہ سے زکام ہوا ہے۔" میں نے خواہ مخواہ شوں شوں کرتے ہوئے کہا۔

"وہم ہے تمھارا۔ کبھی مینڈکی کو بھی زکام ہوا ہے؟" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ میں نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ جس میں اس کا قہقہہ بھی ہم آہنگ ہو گیا۔

"فقرے کسنے میں تو تمھارا بھی جواب نہیں۔" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"ارے ابھی تمھیں ہمارے بارے میں معلوم ہی کیا ہے۔" وہ شاہانہ انداز میں بولی "وہ تو تمھاری شرافت نے ہمیں تمھارا اسیر بنا دیا، ورنہ تم جیسوں کو تو ہم چٹکیوں میں اڑا دیں۔"

میں اب برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ وہ کمرے کے دروازے پر ہی رک گئی تھی۔ جانے کو تو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہاں ٹھہرنا بھی قرینِ مصلحت معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے دل کو اپنی ہی مٹھی میں مسلا اور

گلنار کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آیا۔

وہاں سے شاہی بازار کا فاصلہ تو زیادہ نہیں تھا لیکن راستوں میں دھول اڑ رہی تھی۔ پیدل چلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا چنانچہ جیسے ہی ایک خالی تانگہ نظر آیا، میں اس میں بیٹھ گیا۔ شاہی بازار پہنچ کر میں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ یہاں کھانے پینے کی چیزوں کا اپنا ہی ایک الگ چٹخارہ تھا اور مجھے شاید انھی کی چاٹ پڑتی جا رہی تھی۔ کھانا کھا کر میں اطمینان سے اپنے حجرے میں جا سویا۔ فی الحال کوئی کام نہیں تھا۔ نادر حسین کی تلاش میں نکلنے کا ارادہ میں نے کل تک کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔

اس کوٹھری میں رہ کر دن اور رات کے درمیان فرق کا کچھ خاص پتہ نہیں چلتا تھا۔ آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو اندھیرے میں پایا۔ بیشتر معاملات میں قدرت نے ابھی مجھے اندھیرے میں ہی رکھا ہوا تھا۔

میں نے اطمینان سے اٹھ کر بتی جلائی اور نہایت سست روی سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد کپڑے بدل کر باہر نکل آیا۔ اس وقت تک دوسری طرف گلنار کے بالاخانے سے ساز و آواز کی لہریں پھوٹنے لگی تھیں۔ اس بلبلِ شب کا نغمۂ سحر آفریں دل کے تار چھیڑنے لگا تھا لیکن میں اپنے آپ کو اس نغمے میں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔

اب مجھ میں یہ تکلیف دہ تبدیلی آ چکی تھی کہ گلنار کو اس بالاخانے پر گاتے دیکھ کر دل کے کسی گوشے میں ایک بے عنوان سی ٹیس محسوس کرنے لگا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ہاتھ پکڑ کر اسے یہاں سے اٹھا لے جاؤں اور معاشرے میں کہیں کسی ایسی اونچی مسند پر بٹھا دوں... جہاں سب احترام سے اس کے سامنے جھک جائیں۔ طلب کی پیاس لیے کوئی آوارہ نظر اس کی طرف نہ اٹھے۔ وہ بالاخانوں میں رہنے والی ہستی نہیں تھی... لیکن پھر حالات قدموں کی زنجیر بن جاتے تھے۔ ابھی تو میں خود تقدیر کا قیدی تھا۔ اسے اس اسیری سے رہائی کیونکر دلا سکتا تھا؟ معاشرے میں ابھی میری اپنی کیا عزت اور توقیر تھی جو میں اسے مسندِ عزت و افتخار پر لے جا بٹھاتا؟ میں اپنے آپ کو سمجھانے لگتا کہ کم از کم اب تو مجھے اپنے اندر چھپے ہوئے شیخ چلی کو نکال باہر کرنا چاہیے۔ اتنی ٹھوکریں کھا چکا تھا اور حالات کے ا… تھپیڑے سہہ چکا تھا کہ اب مجھے بے حد حقیقت پسن… جانا چاہیے تھا۔

اپنے خیالات میں الجھا ہوا میں اس مکان سے… اور مین بازار کی طرف چل دیا۔ گلی کی نکڑ پر پہنچنے تک… شاید میں خیالات میں کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا تھا تبھی… علم نہیں ہو سکا کہ کب وہ دو لمبے تڑنگے آدمی… سے نکلے اور میرے دائیں بائیں چلنے لگے۔ میں نے اچا… ہی انھیں ہیولوں کی طرح اپنے ساتھ چلتے پایا… لیکن اس وقت تک دونوں طرف سے میری پسلیوں… دو ریوالوروں کی نالیں چبھنے لگی تھیں۔ "اسی طرح خامو… سے چلتے رہنا۔" ان میں سے ایک سانپ کی طرح… پھنکارا۔ "ورنہ تھوڑی دیر بعد تماش بین تمھاری لا… کو پھلانگتے ہوئے گزر رہے ہوں گے۔"

جس انداز سے انھوں نے میری پسلیوں میں ریو… گاڑ رکھے تھے اس سے ان کی مشاقی کا اور جس لہجے میں… ایک نے بات کی تھی، اس سے ان کی سفاکی کا اندا… کرنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ کم از کم اس وقت… شجاعت کا مظاہرہ مجھے مہنگا پڑ سکتا تھا۔ میں خاموشی… سے چلتا رہا لیکن میرا دماغ ایک لمحے کے لیے… جھنجھنا گیا تھا اور رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی تھی… مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

گلی سے نکلتے ہی وہ مین بازار میں بائیں طرف مڑ… گئے۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر ایک سفید ٹویوٹا کھڑی… تھی جس میں ڈرائیور بھی موجود تھا۔ ڈرائیور نے ہمیں… دیکھتے ہی پچھلا دروازہ کھول دیا۔ انھوں نے اس… مہارت سے مجھے بظاہر غیر محسوس انداز میں دھکیلتے… ہوئے پچھلی سیٹ پر بٹھایا کہ میں ان کے درمیان ہی… رہا اور ریوالور ایک لمحے کے لیے بھی میری پسلیوں… سے ہٹنے نہیں پائے۔ کار ایک ایسے بالاخانے کے سامنے… کھڑی تھی جو اس وقت بند تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی ڈرائیور… نے گاڑی اسٹارٹ کی اور فوراً ہی گیئر میں ڈال دی… بازار میں اس وقت چونکہ ادھر ادھر کافی قمقمے روشن… تھے اس لیے گاڑی کے اندر بھی کچھ روشنی پہنچ رہی تھی… میں نے کن انکھیوں سے ان دونوں کا جائزہ لیا جو اتنی…

آسانی اور اطمینان سے مجھے اغوا کر کے لے جا رہے تھے جتنی آسانی سے کوئی اپنے پڑوسی کی مرغی بھی نہیں چرا سکتا۔ معلوم نہیں ان کی اس کامیابی میں ان کی خوش قسمتی کو دخل تھا یا مہارت کو؟ یا پھر یہ میری ہی نالائقی کا نتیجہ تھا۔

شاہی بازار سے نکلتے ہی ان میں سے ایک نے الٹے ہاتھ سے میری جیبیں ٹٹولیں اور فوراً ہی میرے کوٹ کی اندرونی جیب سے وہ ریوالور نکال لیا جو استاد مجو پہلوان نے مجھے برائے "حفاظت" دیا تھا۔ کتنی اچھی حفاظت کی تھی اس سے میں نے اپنی۔ یہ بھی عجب بدنصیبی تھی کہ اس سے پہلے استاد نے مجھے جو ریوالور دیا تھا وہ بھی تھوڑی ہی دیر بعد مجھ سے چھین لیا گیا تھا اور اب یہ دوسرا ریوالور بھی میں نے اسی طرح گنوا دیا تھا جیسے کسی بدھو اور نالائق قسم کے بچے کی جیب سے اسکول کے بدمعاش قسم کے بچوں نے ٹافیاں نکال لی ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس نئے چکر سے میں زندہ سلامت بچ نکلا اور استاد مجو نے تیسری مرتبہ مجھے کوئی ریوالور دینے کی کوشش کی تو میں ہاتھ جوڑ کر ان سے معذرت کر لوں گا کہ میں بغیر ریوالور کے ہی ٹھیک ہوں۔ خواہ مخواہ ہتھیار اس ہاتھ لینے اور اس ہاتھ دینے کا کیا فائدہ؟

مجھے اغوا کرنے والے وہ دونوں آدمی پیشہ ور بدمعاش معلوم ہوتے تھے۔ وہ تنگڑے اور جسیم تھے۔ ان کے چہرے بتلاتے تھے کہ وہ شقی القلب ہیں اور بلا ضرورت بھی خونریزی کر سکتے ہیں۔ وہ گہرے رنگوں کی شلوار قمیصیں پہنے ہوئے تھے اور دونوں نے ہی ان کے اوپر سیاہ چمڑے کی ڈھیلی ڈھالی جیکٹیں پہن رکھی تھیں۔ وہ ریوالور انھی جیکٹوں کی جیبوں میں تھے جن کی نالیں اب بھی میری پسلیوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔

"تم نواب خان کے آدمی ہو؟" میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"نواب خان کے آدمی...؟" ان میں سے ایک میری طرف دیکھتے ہوئے خالص بدمعاشوں والے انداز میں مسکرایا۔ "جانِ من! ہم تو سرے سے کوئی آدمی ہی نہیں ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔" میں نے مصنوعی خوشی سے کہا۔ "پہلی بار ایسی مخلوق دیکھی ہے جو آدمیوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے ہے مگر آدمی نہیں ہے۔"

دونوں نے بیک وقت مجھے خونخوار نظروں سے گھورا، پھر ایک بولا۔ "بس اب اپنی چونچ بند کرنا۔ ہم زیادہ باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں۔"

"اگر تم نواب خان کے آدمی نہیں ہو تو چلو یہی بتا دو کہ مجھے کیوں اور کہاں لیے جا رہے ہو؟" میں نے اپنے لہجے سے سیکنی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں... یہ سوچنے کی بات ہے۔" وہ اپنی سرخ سرخ آنکھیں گھماتے ہوئے کچھ عجیب سی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔ "اس بازار سے تو لوگ زیادہ تر حسین طوائفوں کو اٹھا لے جانے کی کوشش کرتے ہیں... لیکن ہم، تمھیں لے جا رہے ہیں۔ دراصل ہمیں تم جیسے گریل جوانوں کا مجرا دیکھنے کا شوق ہے۔"

دونوں نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا جو کسی درندے کی غراہٹ سے مشابہ تھا۔ مجھے اپنے کانوں کی لوئیں تپتی محسوس ہونے لگیں۔ بڑی شدت سے دل چاہا کہ کچھ کر گزرنا چاہیے لیکن حالات قطعی ناموزوں تھے۔ کار کے دونوں طرف کے دروازے مقفل تھے۔ اسٹیئرنگ وہیل انھی کے ساتھی کے ہاتھ میں تھا۔ میرا حرکت میں آنا محض موت کو دعوت دینا ہی ثابت ہوتا۔

گاڑی نے جب راوی چوک سے موڑ کاٹا اور سامنے مجھے راوی کا پُل نظر آیا تو اندازہ ہوا کہ وہ لاہور سے باہر جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میری تشویش بڑھ گئی لیکن ظاہر ہے، محض تشویش بڑھ جانے سے کیا فرق پڑتا تھا؟... پھر گاڑی پُل پر سے ہوتے ہوئے ٹول ٹیکس گیٹ سے بھی گزرتی چلی گئی۔ ڈرائیور نے صرف ایک لمحے کے لیے رفتار کم کر کے ہاتھ کھڑکی سے نکال کر ٹول ٹیکس کا روپیہ لڑکے کو دیا اور لڑکے نے اسی ہاتھ میں ٹکٹ تھما دیا۔ اس نے پچھلی سیٹ پر نظر ڈالنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اگر وہ نظر ڈال لیتا تب بھی اسے شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ درمیان میں جو شخص بیٹھا ہے اسے اغوا کر کے لے جایا جا رہا ہے۔

شاہدرہ موڑ سے ذرا پہلے گاڑی اس سڑک پر مڑ گئی جو غالباً آگے جا کر ٹکسال اور شالامار باغ کی

طرف جانے والی سڑک سے ملتی تھی۔ میری دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔ اس سڑک پر دُور دُور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ تو پھر اُن کی منزل کیا تھی؟ سڑک پر ادھورے چاند کی ملگجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور دونوں طرف اونچے نیچے درخت اور جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا۔ اچانک ڈرائیور کو بریک لگانے پڑے۔ ایک ٹرک ہیڈ لائیٹس کی زد میں آیا تھا جو چھوٹی سی سڑک پر اس طرح آڑا کھڑا تھا کہ گاڑی گزرنے کا راستہ ہی نہیں رہا تھا۔

"ایک تو ان ٹرک والوں نے بڑی مصیبت کھڑی کر رکھی ہے... جدھر دیکھو، ٹرک پھنسا کر کھڑے ہو جاتے ہیں:" میں نے پہلی بار کار ڈرائیو کرنے والے کی آواز سنی۔ خاصی بھاری اور گونجیلی آواز تھی۔ پھر وہ زیرِ لب موٹے موٹے ناشائستہ حروف اگلتا ہوا دروازہ کھول کر کار سے اترا اور ٹرک کی طرف بڑھا مگر اسے تین چار قدم سے زیادہ آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا۔

ویرانے میں ٹامی گن کی تڑتڑاہٹ گونجی اور دوسرے ہی لمحے ڈرائیور ہوا میں اچھلا پھر پٹ سے سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ سڑک اس کے خون سے رنگین ہونے لگی... فائرنگ یقیناً ٹرک سے ہوئی تھی لیکن فائر کرنے والا نظر نہیں آیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے بدمعاشوں کے ریوالور میری پسلیوں سے ہٹ گئے اور انھوں نے اپنی اپنی طرف کے دروازے کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ شاید وہ دائیں بائیں پھیلے ہوئے جنگل میں گھسنا چاہتے تھے مگر انھیں بھی اپنی اس کوشش میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ بیک وقت گاڑی کے دونوں طرف گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور وہ دونوں قلابازیاں کھاتے ہوئے بالآخر ساکت ہو گئے۔ کچھ گولیاں گاڑی سے بھی ٹکرائی تھیں۔ شیشہ ٹوٹنے اور پھر باڈی میں گولیاں دھنسنے کی آواز آئی اور گاڑی کو ہلکا سا دھچکا بھی لگا۔ لیکن ونڈ اسکرین سلامت تھی ورنہ شاید کوئی گولی مجھ تک بھی پہنچ گئی ہوتی۔ شاید ہیڈ لائیٹس ٹوٹی تھیں۔ میں دم بخود بیٹھا تھا اور شاید یہی میرے حق میں بہتر تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سب کچھ یوں چند لمحوں میں ہو گیا تھا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایسے مشاق اور پیشہ ور قسم کے بدمعاش جو مجھے بازار سے گھیر لائے تھے اور چند لمحے [illegible] تک جن کی لن ترانی جاری تھی، انھیں ایک گولی [illegible] یا اپنی مدافعت میں کوئی اقدام کرنے کا بھی موقع نہیں [illegible] اور پلک جھپکتے ہی وہ خاک و خون میں نہا گئے تھے۔ پھر میں نے ٹرک کے پچھلے حصے سے دو آدمیوں کو اترتے دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں ٹامی گن [illegible] تھیں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کار [illegible] طرف آ رہے تھے۔ میں تب بھی ساکت ہی بیٹھا رہا۔ [illegible] گن والے قریب آ گئے۔ کار کے دروازے کھلنے کی وجہ [illegible] اندر کی بتی جل چکی تھی۔ انھوں نے دونوں طرف [illegible] کار میں جھانکا تو مجھے بیٹھا دیکھ کر غالباً انھیں حیرت کا جھٹکا لگا۔ ان میں سے ایک چھریرے جسم کا دراز [illegible] آدمی تھا جس کی ٹھوڑی پر مختصر سی داڑھی بھی [illegible] دوسرا درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا [illegible] کلین شیو تھا۔ دونوں جینز جیکٹ میں تھے اور [illegible] کیپ پہنے ہوئے تھے۔

"اوئے... تم کون ہو؟" داڑھی والے نے اکھڑے [illegible] اکھڑے لہجے میں پوچھا۔ اردو غالباً اس کی زبان نہیں تھی [illegible]

"وہ... جی... میں ایک شریف آدمی ہوں۔" میں نے [illegible] سادگی سے جواب دیا۔

"نیچے آؤ۔ تمھاری شرافت کا امتحان لیں۔" [illegible] نے ٹامی گن سے اشارہ کیا۔

میرے اندازے کے مطابق ان تینوں کو تو وہ دونوں [illegible] ہی پہچانتے تھے۔ جنھیں انھوں نے ہلاک کیا تھا لیکن [illegible] ظاہر ہے میں ان کے لیے اجنبی تھا۔ میں کار سے اترا تو دوسرا [illegible] شخص بھی قریب آ گیا۔ وہ میرا سرتاپا جائزہ لے رہے تھے۔ بالآخر داڑھی والا گہری سانس لے کر بولا۔ "تم اس گاڑی میں کہاں سے گھس آئے؟ ہماری اطلاع کے مطابق تو اس میں صرف ان تینوں ہی کو ہونا چاہیے تھا..." اس نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

"خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا، جناب!" میں نے بے حد مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ "میں شاہی بازار میں ایک کوٹھے پر مجرا دیکھ کر واپس آ رہا تھا، ایک اندھیری [illegible]

[illegible] سے گزر رہا تھا کہ ان دونوں نے میری پسلیوں پر [illegible] رکھ دیے اور گاڑی میں بٹھا کر نہ جانے کہاں لے [illegible] لگے۔ میں سمجھا لٹیرے ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرے [illegible] زیادہ رقم نہیں ہے۔ کوٹھے سے نکلنے والوں کے [illegible] ٹیکسی کا کرایہ ہی بچ جائے تو غنیمت ہوتا ہے۔ مگر [illegible] نے میری ایک نہیں سنی بلکہ میں زیادہ بولا تو انھوں [illegible] ایک تھپڑ بھی جڑ دیا۔ یہاں..." میں نے جیسے آگے [illegible] اسے ایک گال دکھانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے... سیدھے کھڑے رہو۔" [illegible] والا جلدی سے بولا۔ پھر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب [illegible] "گاڑی سے بریف کیس تو نکالو۔"

کلین شیو شخص گاڑی کی سیٹوں کے نیچے جھانکنے [illegible] پچھلی سیٹ کے نیچے سے ایک بریف کیس [illegible] لیا۔ بریف کیس کافی مضبوط اور قیمتی معلوم [illegible] تھا۔

"یہ تو مل گیا۔" اس نے داڑھی والے کو بریف کیس [illegible] دونوں کے چہروں پر چمک آ گئی۔

"لیکن اس کے ساتھ یہ خواہ مخواہ پولنس میں مل گیا ہے؟" [illegible] والے نے ٹامی گن سے میری طرف اشارہ کرتے [illegible] کہا۔ "سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کا کیا کریں؟"

"مم... میں بتاؤں جناب؟" میں نے ہکلا کر کہا۔

"ہاں بولو..." ایک مسکرا کر بولا۔

"مجھے جانے دیں حضور!" میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان [illegible] بنانے کی کوشش کی۔ "میرا خیال ہے یہ لوگ کسی [illegible] کے دھوکے میں مجھے پکڑ لائے تھے۔ میں ایک غیر متعلق [illegible] ہوں۔"

"خیال تو کچھ کچھ ہمارا بھی یہی ہے۔" داڑھی والا [illegible] کیپ ترچھی کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم غیر متعلق [illegible] کر بعد میں، اس قسم کے واقعات کے سلسلے میں...! [illegible] کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کا بڑا شوق [illegible] ہے۔ اس لیے ہم تمھیں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں [illegible] سکتے۔"

"ارے یار...! چھوڑو لمبی باتوں کو... اس پر بھی چند [illegible] ضائع کرو اور چلو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو [illegible]" کلین شیو شخص ایک ہاتھ سے ہی ٹامی گن سیدھی کرتے ہوئے بولا۔ بریف کیس مل جانے کے بعد وہ پہلے سے زیادہ مضطرب اور پرجوش نظر آنے لگا تھا۔

"تمھیں معلوم ہے کہ میں غیر ضروری خونریزی پسند نہیں کرتا۔" داڑھی والے نے اپنے ساتھی کو یاد دلایا۔ وہ کافی شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی نظر میں کچھ خونریزی 'ضروری' تھی اور کچھ 'غیر ضروری'... پھر وہ جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس کی نظر تو مجھ پر ہی تھی لیکن اس نے مخاطب اپنے ساتھی کو کیا۔ "اسے باس کے پاس لے چلتے ہیں۔ وہ جیسا کہے گا، ویسا کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" کلین شیو شخص بادلِ نخواستہ بولا۔

انھوں نے مجھے ٹرک کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ میں مُردہ دلی سے چل دیا۔ وہ مجھے ٹامی گنوں کی زد میں لیے میرے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ وہ چوکس تھے اور انھوں نے کوئی ایسی بے احتیاطی نہیں کی تھی کہ مجھے قسمت آزمائی کا موقع مل جاتا۔ میں اس بوڑھے گھوڑے کی طرح چل رہا تھا جیسے جوڑوں کے درد کا عارضہ لاحق ہو۔ کلین شیو شخص ڈپٹ کر بولا۔ "تیز چلو مُردار۔ کوئی... بھولی بھٹکی گاڑی نہ آ نکلے۔"

میں نے اپنے جذبۂ سعادت مندی کو کچھ مہمیز دی اور خود کو تسلی دیتے ہوئے ذرا تیز قدموں سے ٹرک کی طرف بڑھا۔ ٹرک کے قریب پہنچ کر کلین شیو شخص نے بریف کیس اگلے حصے میں رکھ دیا اور وہیں سے ایک موٹا سا رسا نکال کر میرے قریب آیا۔ اپنی ٹامی گن اس نے ٹرک کے پہیے کے سہارے کھڑی کر دی۔ اب صرف داڑھی والا مجھ پر گن تانے کھڑا تھا۔ کلین شیو شخص نے جلدی سے میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے تاہم اس کام سے اس کی عدم دلچسپی عیاں تھی۔ مجھے یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ اس نے میرے ہاتھ زیادہ مضبوطی سے نہیں باندھے تھے۔ دوسرے رسا بھی موٹا تھا۔ اس سے اچھی گرہ لگنا یوں بھی مشکل تھی۔ ہاتھ باندھنے کے بعد وہ مجھے کسی مویشی کی طرح کھینچتا ہوا ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف چلا۔ ٹرک کا پچھلا تختے دار تختہ کھول کر اس نے مجھے اوپر چڑھنے میں مدد دی اور پھر خود بھی اوپر آ گیا۔ داڑھی والا بدستور مستعدی سے ٹامی گن تانے ہمارے پیچھے تھا۔ اوپر پہنچ کر کلین شیو شخص نے میرے پاؤں بھی رسے سے

باندھ دیے۔

ٹرک میں تھوڑی سی بوریاں اُوپر نیچے رکھی تھیں۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھ چکے تو اس بدبخت، پھیلے ہوئے آلو جیسی شکل والے نے مجھے کسی بے جان چیز کی طرح بوریوں پر دھکا دے دیا۔ میں بھی کسی غیر معمولی لمبی بوری کی طرح ان بوریوں پر جا گرا۔ ان میں کوئی سخت چیز بھری ہوئی تھی۔ مجھے کہنیوں اور کمر پر چوٹ آئی۔

"کافی ذلیل اور منحوس آدمی ہو!" میں نے یوں ملائم لہجے میں کہا جیسے اس کی تعریف کی ہو۔

یہ بے وقت تبصرہ مجھے مہنگا پڑا کیونکہ چوٹ تو جو لگنا تھی، لگ چکی تھی، اس شخص نے مڑ کر میرے کولہے پر ایک ٹھوکر بھی رسید کر دی اور میں ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

"زندہ بچ گئے ہو اس لیے بکواس کر رہے ہو۔" وہ چلتے چلتے غرایا۔ "میری بات مان لی گئی ہوتی تو اس وقت تم وہاں پڑے ہوتے۔" اس نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر ٹرک سے نیچے کود گیا۔ تختہ اونچا کر کے انھوں نے اس کے ہک لگائے اور اگلے حصے کی طرف چلے گئے۔ چند لمحے بعد گھرگھراہٹ کے ساتھ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور سیدھا ہونے کے بعد اس طرف چل دیا، جدھر وہ کار جا رہی تھی جو اب اس ویرانے میں تین لاشوں کے درمیان کھڑی تھی۔

ٹرک کی رفتار ذرا تیز ہوئی تو میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کلائیوں کی بندش ڈھیلی کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ میں طاقت اور تدبیر دونوں ہی استعمال کرتا رہا اور بالآخر میرا ایک ہاتھ رسی کے حلقے سے نکل آیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا تھا۔ جب تک میں اپنے پیروں کو بھی بندشوں سے آزاد کرنے میں کامیاب ہوا تب تک ٹرک کافی فاصلہ طے کر چکا تھا۔ شالامار باغ کے سامنے سے بھی گزر چکا تھا اور گھرگھراتا ہوا تیز رفتاری سے سیدھا ہی چلا جا رہا تھا۔ اب تو دونوں طرف کھیتوں ہی کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ میں ٹرک کے عقبی تختے پر جھک گیا لیکن ٹرک کی رفتار ابھی تک اتنی تھی کہ چھلانگ لگانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں منتظر کھڑا تھا کہ کہیں رفتار ذرا کم ہو۔ کھیتوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب دونوں طرف غیر آباد زمین پھیلی ہوئی تھی۔

بالآخر ایک جگہ ٹرک کی رفتار کم ہو گئی ج تو سارے راستے ہی میں سڑک جا بجا اُدھڑی لیکن ٹرک والوں نے چھوٹے موٹے گڑھوں کی کوئی نہیں کی تھی اور غالباً بحرِ ظلمات میں بھی گھوڑے کا عزم لیے چلے جا رہے تھے اور ٹرک خوب اُ جا رہا تھا لیکن اب کچھ زیادہ ہی بڑے گڑھے آ جن کی وجہ سے انھیں رفتار کم کرنا پڑی۔ سڑک زمین بھی کچی اور نشیبی تھی۔ میں نے اللہ کا نام چھلانگ لگا دی تھی اور ڈھلوان میں نشیب کی لڑھکتا چلا گیا۔

سنبھل کر میں نے آنکھیں کھولیں لیکن ا سینے کے بل زمین سے ہی چپکا رہا کہ مبادا ٹرک آئینے میں میری جھلک نظر آ جائے۔ ذرا سر اُٹھا سڑک کی طرف دیکھا۔ ٹرک ہچکولے کھاتا ہوا تھا لیکن عقبی تختے پر لکھے ہوئے جلی الفاظ دھندلاہٹ کے ساتھ میں اب بھی دیکھ سکتا تھا: اچھا دوست، پھر ملیں گے۔ ٹرک کافی گیا تو میں اُٹھا، کپڑے جھاڑے اور ویرانے لگا۔ میری کوشش اصل میں یہ تھی کہ میں سڑک سے زیادہ دُور نکل جاؤں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کو جب میرے فرار کا علم ہو گا تو شاید وہ اس واپس آ جائیں۔ میں اگر سڑک پر چلتا رہتا تو کرنے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی لیکن اِردگرد ویرانے میں گم ہو جانے کے بعد میرا سراغ پانا ان ناممکن ہی ہوتا۔ میں ریس کے اس گھوڑے کی سے دوڑتا رہا جسے اتفاق سے عقلِ انسانی ع ہو اور وہ اس فکر میں گھلا جا رہا ہو کہ جن لوگ پر شرطیں لگا رکھی ہیں وہ کسی نہ کسی طرح جیت راستے میں کہیں چٹیل میدان آیا، کہیں

اور کہیں ایسی زرعی زمینیں جنھیں سیم و تھور کر دیا تھا۔ میں ان سب کو عبور کرتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس سے بُرا حال تھا۔ خ سخت تکلیف دہ تھی۔ میری زبان باہر نکل آ لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی... پھر ایک

ی پر بنا ہوا ایک چھوٹا سا کچا مکان دیکھ کر ٹھٹک گیا طویل و عریض ویرانے میں یہ اکیلا ہی مکان کھڑا شاید یہ اس وقت بنایا گیا تھا جب اس کے اردگرد زمینیں آباد تھیں مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی دیواروں میں ایک ایسی کھڑکی بھی نظر آ رہی تھی جس کا تو بند تھا مگر درزوں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ی شاید محض کسی حقیر سی لالٹین کی تھی مگر اس وقت را مکان ہی مجھے مینارۂ نور محسوس ہو رہا تھا۔ میں کر اس بے ہنگم مکان کے بدوضع دروازے پر پہنچا اور ستک دے ڈالی۔

میں دروازے پر کھڑا ہانپتا رہا اور اپنی سانس حال پر لانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس دوران میں دستک کا کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ دوسری بار تو نے دستک دینے کی بجائے بے تابی سے دروازہ دھڑدھڑا میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی شخص دروازے ب میں سانس روکے کھڑا ہے اور شاید کسی جھری سے جائزہ بھی لے چکا ہے لیکن وہ دروازہ نہیں کھول ہے۔ بالآخر میں نے ایک بار پھر دروازہ دھڑدھڑایا ارادہ تھا کہ اس بار بھی جواب نہ ملا تو ٹھوکر مار کر اس اد دروازے کو زمیں بوس کر دوں گا۔ غنیمت رہا کہ اس ے پر عمل درآمد کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

"کون ہو تم؟" دروازے کے عقب سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ یہ ایک ایسے خوف زدہ شخص کی تھی جو یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ خوفزدہ ہے۔

"بھائی! میں ایک پریشان حال مسافر ہوں۔" میں اپنے لہجے میں حتی الامکان مظلومیت سمونے کی کوشش ے ہوئے کہا۔ "ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا تھا انھوں ال پیسہ سب چھین کر ویرانے میں چھوڑ دیا۔ بھٹکتا اِدھر آ نکلا ہوں۔ بھوک پیاس سے بُرا حال ہے۔ صبح تک پناہ اور کچھ کھانے پینے کے لیے درکار ہے۔ نکلتے ہی چلا جاؤں گا۔"

دروازے کے عقب میں ایک بار پھر ویسا ہی سکوت ا۔ اس سکوت نے مجھے بے قرار کر دیا۔ میں نے بمشکل لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "بھائی! اب ایسی بھی کیا پردہ نشینی! اگر تم گھر میں اکیلے ہو تو تمھیں بالکل نہیں نہیں گھبرانا چاہیے اور اگر بیوی بچوں کے ساتھ رہ رہے ہو تب بھی تمھیں میری طرف سے کسی تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ خود بھی گھربار والا ہوں۔"

میری تقریر دل پذیر بالآخر اس پر اثر کر ہی گئی۔ کنڈی کھلنے کی آواز آئی اور پھر دروازہ یوں دھیرے دھیرے کھلا جیسے کسی فلم میں انتہائی ڈرامائی منظر سامنے آ رہا ہو۔ مگر درحقیقت میرے سامنے ایک نہایت ہی غیر ڈرامائی قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ وہ معمولی سی شلوار قمیص میں تھا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی کاٹھی اچھی تھی مگر آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ اس کی حالت بتاتی تھی کہ اس نے اچھا وقت دیکھا ہوا تھا مگر اب ناساعد حالات نے اسے کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں نہایت چمکیلے پھل کی کلہاڑی تھی جسے اس نے یوں تھوڑا سا بلند کر رکھا تھا جیسے ذرا بھی خلافِ توقع حرکت کرتے دیکھ کر فوراً حملہ کر دے گا۔ معلوم نہیں وہ کیوں اس قدر بھڑکا ہوا لگ رہا تھا۔ تاہم مجھے قریب سے دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ میں واقعی ایک مصیبت زدہ اور لٹا پٹا آدمی لگ رہا تھا۔ میرے جائزے سے مطمئن ہو کر اس نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت ہم چھوٹے سے صحن میں کھڑے تھے۔ سامنے ہی اس مکان کا اکلوتا کمرہ تھا۔ اس کا اشارہ پا کر میں اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں ایک لالٹین روشن تھی۔ دوسری لالٹین صحن میں تھی جسے وہ اپنے ساتھ ہی اٹھا لایا تھا۔ دو لالٹینوں کی بدولت کمرے میں خاصی روشنی ہو گئی۔ وہ ایک کشادہ کمرہ تھا لیکن فرش اور دیواریں کچی ہی تھیں۔ کمرے میں دو چارپائیاں، لوہے کا ایک ٹرنک اور کھانے پکانے کا کچھ سامان بکھرا ہوا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اسے یہاں رہائش اختیار کیے غالباً زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ برتن وغیرہ کچھ نئے ہی نظر آ رہے تھے۔

"بیٹھو۔" اس نے ایک چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھنے کی بجائے کونے میں رکھے ہوئے گھڑے

کی طرف بڑھا۔ گھڑے پر رکھا ہوا بڑا سا مٹی کا پیالا پانی سے بھر کر میں بے صبری سے پینے لگا۔ زندگی میں پہلے کبھی مجھے پانی اتنا لذیذ نہیں لگا تھا جتنا اس وقت لگا۔ پانی پی کر میں چارپائی پر آ بیٹھا۔ چند لمحوں تک میں گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ اب میں اپنے آپ کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ وہ شخص پُرتجسس نظروں سے مسلسل میرا جائزہ لے رہا تھا تاہم اب شاید وہ میری طرف سے کچھ مطمئن ہو چکا تھا کیونکہ اس نے کلہاڑی ایک طرف رکھ دی تھی۔

"کچھ کھانے کو ہے تو کھلاؤ یار!" میں نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔ "آج تو میں اپنے آپ کو خیرات کا فقیر محسوس کر رہا ہوں۔ اگر ارد گرد آبادی ہوتی تو شاید میں صدا لگانے سے بھی گریز نہ کرتا۔ بھوک انسان کو کیسا بے شرم بنا دیتی ہے۔" میں نے گویا خود ہی اپنے آپ پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں... بھوک واقعی آدمی کو بے شرم بنا دیتی ہے۔" وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ پھر وہ اُٹھا اور کونے میں رکھے ہوئے مٹی کے تیل کے چولہے تک پہنچا۔ چولہے کے پاس ہی ہنڈیا اور روٹیوں کی ٹوکری پڑی تھی۔ اس نے ہنڈیا سے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا سالن نکالا اور پھر کھانا لا کر چارپائی پر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تھوڑا سا آلو کا بھرتا بچا ہوا ہے... ایک ڈیڑھ روٹی ہے۔ فی الحال اسی پر قناعت کرو۔ کچھ دیر میں صبح ہونے والی ہے۔ پھر ہم مل کر ناشتہ تیار کریں گے۔" لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے مجھ پر اعتماد کر لیا ہے... میرے دوستانہ لہجے پر بھروسا کر لیا ہے اور اب وہ مجھ سے خوف زدہ نہیں ہے۔ میں اس بھرتے اور روکھی سوکھی روٹی پر ٹوٹ پڑا اور اس کا صفایا کر دیا۔ ایک مدت بعد کھانے میں اس قدر لطف آیا تھا۔

وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لگتا تو نہیں ہے کہ تم ڈاکوؤں کے چنگل سے نکل کر آ رہے ہو۔ بہت خوش باش اور بے فکرے آدمی معلوم ہوتے ہو؟"

"میں نے ہر حال میں خوش رہنا سیکھ لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب اگر میں غم زدہ رہوں اور ڈاکوؤں کا تذکرہ کر کے روتا رہوں تب بھی ڈاکوؤں کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "وا... کی بات ہے، مجھے ڈاکوؤں وغیرہ نے ہرگز نہیں گھ...

"کیا مطلب؟" وہ یک لخت چونکتا ہوا گ... اس نے کن انکھیوں سے اپنی کلہاڑی کی طرف دیکھا جو چارپائی کی پائنتی پر رکھی تھی۔

"مطلب یہ کہ میں ڈاکوؤں سے زیادہ خط... لوگوں میں پھنسا ہوا تھا۔" میں نے سادگی سے کہ... اس کے چہرے پر اطمینان جھلک آیا گویا یہ ا... لیے بڑی اچھی خبر تھی۔

"اگر تم مناسب سمجھو تو مجھے اپنی کہانی ... سکتے ہو۔" وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔

"میری صاف گوئی کا بُرا مت ما..." میں نے کہا۔ "تم مجھے زیادہ شریف آدمی تو دکھا... دیتے پھر بھی میں تمھیں اپنی کہانی سنانے میں ... نہیں سمجھتا۔ میری کہانی نہایت مختصر اور ... ہے۔ بہت سے لوگ بیک وقت میرے پیچھے ... ہیں کہ میرے پاس کوئی خاص ڈائری ہے جو ... طور پر ان کے حوالے کر دینا چاہیے جب کہ ... ہے کہ زندگی میں کبھی کوئی خاص تو کیا عام ڈائری ... پاس نہیں رکھی۔ لیکن ان لوگوں کو یقین ہی ... کبھی ایک پارٹی مجھے اٹھا کر لے جاتی ہے۔ ... پارٹی کے ہتھے چڑھ جاتا ہوں۔ کبھی کو... سے لوگ آکر میری دُرگت بنا جاتے ہیں۔ ... میں تو کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں اور کہاں جا... اتفاقاً راوی کے پل سے بھی گزر ہوا۔ قسم ... چاہ رہا تھا کہ پل سے چھلانگ لگا دوں ... اس وقت بھی دو آدمی دائیں بائیں میری ... ریوالور گھسیڑے بیٹھے تھے۔ عجیب لوگ ہیں ... مجھے ہلاک کرتے ہیں اور نہ ہی چین سے زند... دیتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو ایک ایسا فٹ... کرنے لگا ہوں جس سے بیک وقت ک... رہی ہوں۔"

وہ مسکرا دیا تاہم اس کی آنکھیں بتا...

...نے میری کہانی پر یقین کر لیا ہے۔ ظاہر ہے اس ... کوئی جھوٹ بھی نہیں تھا۔

"لہٰذا میں نے سوچا ہے کہ اپنی تمام تر بے سروسامانی ... بے وقعتی کے باوجود ان سے بھڑ جاؤں۔" ... مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "بس ان میں سے کسی کا ... سراغ مل جائے اور وہ میرے ہتھے چڑھ جائے ... اس کا سر پاش پاش کر دوں گا۔ مصیبت یہ ... کہ ہمیشہ یہ لوگ مجھے دھوکے سے اور ہتھیاروں ... زور پر آ دبوچتے ہیں اور مجھے ہر بار موقع پاتے ہی ... بچا کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ ... وقت تک ان کا سُراغ نہیں ملتا جب تک وہ خود ... نہیں آن پکڑتے۔"

"یہ تو واقعی بڑا عجیب چکر ہے۔" اس شخص ... ہمدردی سے کہا۔ "لیکن تمھاری باتوں اور رویّے سے ... بڑا حوصلہ ملا ہے ورنہ آگ تو میرے سینے میں بھی ... بھڑک رہی ہے لیکن اپنی بے بسی اور بے وقعتی کے ... اس سے میں چوہے کی طرح اس بل میں دُبکا بیٹھا ہوں۔"

میں منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا مگر ... اس سے آگے کچھ نہ بولا۔ تب میں نے ہمدردانہ لہجے میں ... معلوم ہوتا ہے، تمھارے دامن سے بھی کوئی کہانی ... ہوئی ہے۔ اس ویرانے میں تنہا رہ کر تو تمھارے ... بوجھ اور بھی بڑھ گیا ہوگا۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت ... میں ایک سیدھا سادا بے گھر اور بے در قسم کا ... ہوں۔ اپنی کہانی سنا دو۔ میں آج تک اپنی تو کوئی ... نہیں کر سکا لیکن شاید تمھاری کوئی مدد کر سکوں۔"

"تمھاری باتوں میں سچائی کی خوشبو ہے۔ اسی لیے ... بھروسا کر لینے کو جی چاہتا ہے۔" وہ دھیمے لہجے ... "تھوڑی سی دیر میں ہی تم اپنے اپنے سے لگنے ... میرا خیال ہے تمھیں بتا دینے میں کوئی حرج نہیں۔"

... پھر وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے اس کی سمجھ ... آ رہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ بالآخر وہ ... لہجے میں بولا۔ "کہانی میری بھی مختصر اور سیدھی سادی ... لیکن اس کے پیچ و خم کو وہی محسوس کر سکتا ہے ... واقعات سے گزرا ہو۔ یہ جو تم نے ارد گرد زمین ... اس میں سے تھوڑی سی ہماری بھی تھی... اور آباد تھی... اتنی فصل ہو جاتی تھی کہ عزت و آبرو سے گزارا ہو جاتا تھا۔ یہ مکان اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس وقت میرے والدین زندہ تھے۔" وہ ایک آہ بھر کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا جیسے والدین کے ذکر سے سینے میں کوئی خوابیدہ کسک جاگ اٹھی ہو... پھر اس نے سر جھٹک کر سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اِدھر والدین اس دنیا سے رخصت ہوئے اُدھر یہ زمین بھی گویا مجھ سے روٹھ گئی۔ اسے سیم اور تھور کھانے لگی۔ زمین سے میری دلچسپی پہلے ہی ختم ہوتی جا رہی تھی ورنہ میں چاہتا تو اس کا کوئی بندوبست کر سکتا تھا۔ محکمۂ زراعت والے اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے تھے مگر میں نے کوئی بھاگ دوڑ نہیں کی۔ میں دراصل کسی اور ہی قسم کی زندگی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ شہری جگمگاتی اور پُرتعیش زندگی کے خواب۔ فیشن ایبل رہن سہن کے خواب۔ میں نے اپنے سے کہیں بڑے کچھ زمینداروں کے لڑکوں کو شہر میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے دیکھا تھا۔ اسی طرح رہنے کی خواہش میرے دل میں بھی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ میں اپنے اور ان کے درمیان حائل فرق کو نہیں دیکھتا تھا۔"

اس نے ایک بار پھر گہری سانس لی اور خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرایا۔

"قصہ مختصر یہ کہ..." وہ سر جھٹک کر بولا۔ "کہ میں لاہور چلا گیا۔ وہیں قیام پذیر ہو گیا۔ وہاں کس طرح شب و روز گزرے... کس کس طرح میری آرزوؤں کا خون ہوا... چشمِ تحیّر نے کیا کیا تماشا دیکھا۔ یہ ایک الگ داستان ہے... پھر میں اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لیے بدقماشوں اور اسمگلروں کا آلۂ کار بن گیا۔ ان کے لیے ہیروئن اور دیگر منشیات لاہور سے کراچی پہنچانے لگا۔ مجھے خطیر معاوضہ ملنے لگا۔ تشنۂ تکمیل آرزوؤں کے صحرا سیراب ہونے لگے... لیکن مجھے انجام کا اندازہ نہیں تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسمگلروں کے خلاف جب سخت احکامات صادر ہوتے ہیں اور مختلف ادارے حرکت میں آتے ہیں تو ان سلسلے دھندوں کی پشت پناہی کرنے والے بچ جاتے ہیں اور ہم جیسے کارندے رگڑے جاتے ہیں۔ میں بھی رگڑا گیا۔ پٹائی بھی خوب

ہوئی اور کچھ عرصے کے لیے جیل بھی جانا پڑا۔ میں زیادہ کھاگ اور سخت جان نہیں تھا۔ پیشی کے دوران میں نے اُن سب کے نام بتا دیے، جن سے مجھے واسطہ پڑتا تھا۔ اُن میں سے کچھ تو روپوش ہو گئے۔ مجھ کے خلاف پولیس اور دیگر اداروں کو کوئی ثبوت نہیں ملا چنانچہ میری گوہرافشانیوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ نقصان ہی پہنچا اور وہ بھی صرف مجھے... وہ اس طرح کہ جن لوگوں کے میں نے نام لیے تھے وہ خود اور ان کی پشت پناہی کرنے والے جنھیں میں جانتا ہی نہیں تھا، میرے جانی دشمن ہو گئے۔ اصل اور قابلِ ذکر آدمیوں سے تو میں واقف ہی نہیں تھا صرف ایک ہی شخص ایسا تھا جو مجھے قدرے بہتر پوزیشن کا مالک نظر آتا تھا۔ اس کا بھی میں نے نام لیا تھا۔ وہ تو میرے خون کا پیاسا ہو گیا اور جب میں جیل سے رہا ہوا تو موت کے ہرکارے کچھ فاصلے پر ہی میرے منتظر تھے...!"

اُس نے خاموش ہو کر ایک جھرجھری سی لی جیسے اس وقت کے تصور سے اب بھی خوف زدہ ہو۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ سر اٹھا کر بولا... "بڑی مشکل سے میں جان بچا کر بھاگا اور پھر خاصے عرصے تک بھاگتا ہی رہا۔ بالآخر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اپنے آبائی مکان میں چلا جاؤں۔ میرا یہ فیصلہ درست ہی رہا۔ یہ زمین ویران سہی لیکن یہ میری شناسا ہے اور ماں کی طرح مہربان ہے۔ اس کی خفگی میں بھی شفقت شامل ہے۔ اس نے ایک بار پھر مجھے پناہ دے دی۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے کئی دن ہو چکے ہیں لیکن ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میرا سراغ لگاتے ہوئے یہاں تک بھی آ پہنچیں گے۔ یہاں رہ کر میں ان سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ محض اس کلہاڑی... اور دیوار پر لٹکی ہوئی اس پرانی سی بندوق کی موجودگی میں ہی میں اپنے آپ کو بے حد پُراعتماد اور نڈر محسوس کرتا ہوں لیکن خوف بس یہی رہتا ہے کہ کہیں کوئی بے خبری میں نہ آن دبوچے۔" وہ میری طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "بس... یہ ہے میری کُل کہانی۔ کچھ دیر پہلے جب تم نے دروازہ کھٹکھٹایا، تو میں سمجھا تھا... کہ موت مجھ سے معانقہ کرنے آن پہنچی ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا تو میں نے ایک گہری سا[نس لیتے] ہوئے کہا: "میرا دل کہتا ہے کہ میں تمھاری کوئی [...] مدد ضرور کر سکوں گا... وہ بدمعاش جو تمھارا زا[...] بنا ہوا ہے... اس کا حدود اربعہ کیا ہے؟"

"اُس کا نام نادر حسین ہے اور بظاہر وہ [...] ڈیلر بنا ہوا ہے۔ اس کا دفتر سمن آباد میں ہے [...] ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بتایا۔

"نادر حسین... سمن آباد... پراپرٹی ڈیلر..." [...] ہکلایا۔ ایک لمحے تک تو جیسے مجھے اپنے کانوں [...] ہی نہ آیا اور جب یقین آیا تو مجھے حیرت کا [...] لگا۔ میں نے غیر ارادی طور پر کچھ اس تیزی [...] اُٹھنے کی کوشش کی کہ چارپائی سے نیچے گر پڑا [...] میں اٹھ کر کپڑے جھاڑنے لگا لیکن یہ [...] آپ کو شرمندہ ہی کرنے والی حرکت تھی [...] کپڑے تو پہلے ہی اس قدر مٹی میں لتھڑے ہو[ئے ...] کہ انھیں جھاڑنا ریت کے کسی تودے کو جھا[ڑنے] کے مترادف تھا۔ میں نے کھسیا کر اس کی طرف [...]

وہ پُرتشویش نظروں سے میری طرف [...] تھا: "تمھیں نادر حسین کا نام سن کر اس قدر حیر[ت ...] ہوئی؟" وہ پلکیں جھپکائے بغیر بولا۔ "کیا [...] جانتے ہو؟"

"مجھے حیرت نادر حسین کا نام سُن کر [...]" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا: "میں تو قدرت کے [...] پر حیران ہو رہا ہوں۔ ذرا دیکھو تو سہی [...] کچھ یونہی ہونا تھا! کیا ضروری تھا کہ وہ بدمع[اش] اغوا کر کے اسی سمت میں آتے... اور پھر [...] ہوا اِس مکان تک پہنچتا... تمھاری داستا[ن] ... اور اس داستان میں ایک کردار نادر حسین [...]" مجھے اپنا لہجہ خود کلامی سے مشابہ محسوس ہو[ا] "یقین...! یہ سب کچھ ناقابلِ یقین لگتا ہے [...]"

"مقصد یہ ہے کہ تم نادر حسین کو جانتے ہو[؟" وہ] اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور د[...] پھر گر گیا۔

"ہاں دوست!" میں نے بوجھل لہجے میں [...]

[...]سین کو جانتا ہوں۔ اب تک جتنے بھی پُراسرار [...] میرے پیچھے پڑے رہے ہیں۔ ان میں یہ واحد آدمی [...]س کے نام و پتے کا مجھے سُراغ ملا تھا اور میں [...]کل میں، اس سے جا نکرانے کا ارادہ کر رہا تھا... [...]یں احمقوں کی طرح اس پر چڑھ دوڑنا نہیں [...]ا تھا۔"

"اچھا... تو یہ بات ہے؟" وہ شخص پُرجوش [...]یں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "پھر تو تمھیں اِن اتفاقات پر [...] نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ تو قدرت کی مصلحت ہے۔ [...] قدرت ایک دُوسرے کا سہارا بنانا چاہتی ہے [...] پُورا یقین ہے کہ ہماری رفاقت ایک دُوسرے [...] لیے نہایت فائدہ مند ثابت ہو گی۔"

وہ دونوں بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ مارے خوشی کے [...]سے بغل گیر ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے [...]لگا لیا۔ خوشی مجھے بھی ہوئی تھی۔ مصائب اور ابتلا میں [...]کمزور سا سہارا بھی میسر آ جائے تو خوشی ہوتی ہے [...]شی میں، میں نے غیر ارادی طور پر اسے کچھ اپنے پہلوانی [...]یں بھینچ ڈالا۔

"کیا کر رہے ہو یار؟" وہ بے اختیار چلّا اٹھا۔ "تم تو [...]پسلیاں ہی توڑے ڈال رہے ہو۔ دشمن کا کام آسان [...] رہے ہو۔"

وہ خاصا تگڑا جوان تھا مگر اتنا تگڑا بھی نہیں [...] میری گرفت کی سختی سہہ جاتا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔

"یار...!" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا: "معانقہ، [مع]انقہ، غم گساری، دلداری... سب کچھ ہو گیا لیکن ہمیں [...] دوسرے کا نام اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔"

وہ بے اختیار ہنس دیا، پھر بولا: "مجھے نورالدین [کہتے] ہیں۔"

"اور میں نسیم جمال ہوں۔" میں نے بتایا۔

"نور و نسیم یکجا ہوئے ہیں تو خدا کرے نتیجہ کچھ [...] نکلے۔" وہ مسکرایا۔

"یار تم زبان و بیان سے دیہاتی تو نہیں لگتے۔" میں نے [...] آمیز لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا کہ میں ذہنی طور پر دیہاتی تھا ہی [...] کچھ پڑھا لکھا بھی ہوں اور پھر شہر جا کر بہت کچھ سیکھ [...]

گیا۔" اس نے وضاحت کی۔

میں نے سر ہلایا اور چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔

اس نے اپنی چارپائی میرے قریب ہی کھینچ لی اور بڑھی ہوئی داڑھی میں چھپی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا: "تو پھر نادر حسین کا کیا کرنا ہے؟" پھر وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی بولا: "اگر کسی تدبیر سے اسے گھیر گھار کر تنہا یہاں لایا جا سکے تو ہم اس کے ٹکڑے کر کے اسی ویرانے میں دفن کر دیں۔"

دفعتاً میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک خیال تیر ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا تھا: "یار...!" میں نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا: "تم نے اسے گھیر گھار کر لانے کی بات کی ہے تو اچانک ہی ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے۔ دن نکلنے پر میں یہاں سے چلا جاؤں گا اور کل شام تک میں اسے ہر حال میں یہاں کھینچ لاؤں گا۔ تم تیار رہنا۔ اُس کے جوڑ ڈھیلے کرنے کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ مجھے صرف تمھارا یہ ٹھکانا استعمال کرنا ہے۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں اُس کی تکا بوٹی کرنے میں تمھارا ہاتھ نہ بٹاؤں؟" وہ گویا بُرا مانتے ہوئے بولا۔ "نہیں... نہیں... تم بھی حسبِ توفیق ہاتھ بٹانا۔ کارِ ثواب ہے۔" میں نے اسے بڑے خلوص سے تسلی دی۔ "معاشرے کے ایسے ناسُوروں کو جڑ سے کاٹ پھینکنا نیکی ہے۔"

"بے شک۔" اس نے سر ہلایا لیکن یک بیک پریشان سا ہوتے ہوئے بولا: "مگر تم اسے لاؤ گے کیسے؟ مجھے تو امید نظر نہیں آتی۔ تمھیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ وہ کیسا مکار اور سفاک آدمی ہے۔ میں اُسے جانتا ہوں۔"

"مجھے بھی تھوڑا بہت اندازہ ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میدانِ عمل میں کُود کر مجھ میں بھی تھوڑی بہت مکاری آ چلی ہے۔"

"ٹھیک ہے... اُسے لانا تمھارا مسئلہ ہے... لیکن دیکھو... اُسے گھیر کر لانے کے چکر میں قاتلوں اور اسمگلروں کی کوئی قطار پیچھے نہ لگا لانا۔ اس کے لیے میں بے شمار اندیشے تھے۔

"بے فکر رہو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اس وقت میرا حلیہ ایسا ہو رہا ہے کہ شاید میں تمھیں خاصا احمق اور بے وقوف لگ رہا ہوں مگر میں ایسا ہوں نہیں۔"

"اچھا میرا خیال ہے، اب کچھ آرام کر لیا جائے۔" نوردین گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" میں نے فوراً دراز ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے ایک میلا سا کمبل دیا جو اس وقت مجھے غنیمت محسوس ہوا اور میں اس میں دبک کر سو گیا۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی تو میں نے ہی نوردین کو جگایا۔ صحن میں ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پانی نکال کر غسل کیا۔ اس دوران میں نوردین نے پراٹھے اور انڈے تیار کر لیے تھے۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر جب میں نوردین کے گھر سے نکلا تو سورج سر پر آ رہا تھا۔ میری حالت اب بہت بہتر تھی۔ کپڑے بھی جھاڑ پونچھ کر کچھ باعزت نظر آنے لگے تھے۔ نوردین میرے ساتھ چند قدم چل کر رکتے ہوئے بولا: "بس یار، میں اس سے آگے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ مبادا کوئی میرا صورت آشنا مجھے دیکھ لے۔ سیدھے چلتے ہوئے تم سڑک پر پہنچ جاؤ گے۔ ادھر سے تمھیں کسی نہ کسی سواری پر لفٹ مل جائے گی۔ شالامار باغ پر اتر جانا۔ وہاں سے شہر جانے والی کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔ کل شام کو میں تمھارا انتظار کروں گا۔"

میں اسے خدا حافظ کہہ کر آگے چل دیا۔

اس کے اندازے کے مطابق مجھے سڑک پر پہنچ کر لفٹ تو واقعی مل گئی لیکن ایک گدھا گاڑی پر۔ بس وغیرہ کا تو شاید ادھر سے کوئی روٹ ہی نہیں تھا۔ دیگر جتنی بھی سواریاں گزریں، ان میں سے کوئی شریف آدمی مجھے بٹھانے پر آمادہ نظر نہ آیا۔ بالآخر ایک گدھا گاڑی والے کی کشادہ دلی نے میرا مسئلہ حل کیا۔ چخ چخ کرتی گدھا گاڑی بہت دیر بعد جا کر شالامار تک پہنچی۔ وہاں میں اتر گیا۔ ویگنیں انگوری باغ کی طرف سے شہر جا رہی تھیں۔ میں ایک ویگن میں بیٹھ کر شہر پہنچ گیا۔

شاہی بازار پہنچنے تک سہ پہر ہو چکی تھی۔ گلنار ابھی شاہی بازار نہیں پہنچی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کس طرح وقت گزاروں۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے منصوبے کے مطابق نادر… فون کرنا چاہیے۔ نادر حسین کا فون نمبر مجھے نو… مل گیا تھا کیونکہ جن دنوں نوردین اسمگلروں کا کا… ہوا تھا ان دنوں نادر حسین سے اس کا زیادہ تر… ہی رابطہ رہتا تھا۔ میں بازار کے ایک ریستوران… جس کے مالک نے اپنا فون پبلک کے استعمال… بھی رکھا ہوا تھا۔ پبلک بوتھ کی طرح یہاں… کر فون کیا جا سکتا تھا۔

میں نے نادر حسین کا نمبر ڈائل کیا تو… طرف سے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا گیا لیکن می… کے برعکس ایک نہایت شیریں اور مترنم نسو… سنائی دی۔ "اسٹار اسٹیٹ ڈیلرز… کس… کیجیے گا؟"

"نادر حسین صاحب سے۔" میں نے د… میں کہا۔

"کس سلسلے میں؟ آپ کا معاملہ زمی… خرید و فروخت سے ہے یا دیگر کسی قسم کی جا… آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ہم کھانے وال… میں ڈیل نہیں کرتے۔" وہ لڑکی کرارے لہجے… بولی۔ بڑی چٹاخ پٹاخ قسم کی کوئی چیز معلو… تھی وہ۔

میں تو یہی سمجھا تھا کہ نادر حسین نے د… کے لیے کوئی چھوٹا موٹا دکان نما آفس ک… ہوگا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس نے خاصا… آفس بنا رکھا ہے۔ میں نے سنبھلتے ہوئے کہا… سے ایک بہت ہی قیمتی جائداد فروخت کرنے… میں بات کرنی ہے۔"

"بہت بہتر… میں ابھی ملاتی ہوں۔" لڑ… مستعدی سے کہا۔ کلک کی آواز آئی اور ایک… توقف کے بعد دوسری طرف سے ایک بھ… مردانہ آواز آئی: "جی… فرمایئے؟"

"مسٹر نادر حسین!" میں نے دھیمے لیکن… میں کہا: "کیا تمھیں وہ ڈائری چاہیے، جس کی… تم اور نہ جانے کتنے لوگ پاگل کتوں کی ط… ادھر دوڑتے پھر رہے ہیں؟"

دوسری طرف نادر حسین کو جیسے سانپ سونگھ… کئی لمحوں کے سکوت کے بعد بالآخر میں نے گھٹی گھٹی… آواز میں کہا: "تمھاری زبان پر کیا فالج گر پڑا ہے؟"

اب وہ گویا سنبھلا اور کھنکار کر گلا صاف… تے ہوئے بولا: "کون ہو تم؟"

"وہی جس کے پیچھے تم ہاتھ بلکہ پاؤں بھی دھو کر پڑے ہو۔" میں نے کہا: "ویسے میرا نام نسیم حجال ہے۔"

"اوہ…" اس نے ایک طویل سانس لی۔ اب وہ گویا… پہچان گیا تھا۔

"یہ اوہ اور آہ چھوڑو۔" میں نے تیزی سے کہا: "میں… وقت ایک پبلک فون پر بات کر رہا ہوں۔ میرے… زیادہ لمبی چوڑی بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں… سے ڈائری کا سودا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اس سلسلے… دلچسپی رکھتے ہو تو تفصیلی بات چیت کے لیے آج شام… بجے پائلٹ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں آ جاؤ۔ بولو آ… ہو یا نہیں؟"

میں نے اسے گویا یک لخت ہی کسی خطرناک دوراہے… دیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے ہرگز تیار… تھا مگر اب بہرحال اسے کسی ایک راستے کا انتخاب… تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔" اس نے میری توقع کے… جواب دیا۔

"تنہا آنا۔ ورنہ سودا ہونا تو درکنار، سودے کی بات… شروع نہیں ہو سکے گی۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع…

فون رکھ کر میں ریستوران سے نکلا تو بے حد مطمئن تھا… ان نامعلوم لوگوں کے کھیل میں ایک کھلاڑی کی حیثیت… نے کی کوشش کر رہا تھا ورنہ اب تک تو محض فٹ بال… ہوا تھا۔

میں واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو دیکھا کہ بالاخانے… روازہ کھل چکا ہے اور سازندے بیٹھے اپنے ساز درست… یں لیکن گلنار وہاں نہیں تھی۔ میں اندر آیا تو دیکھا… یری کوٹھری میں جھانک کر اور مجھے وہاں نہ پا کر مایوس… اپس جانے والی تھی۔ وہ اس وقت پورے میک اپ… خوبصورت لباس میں تھی۔ اس حسن شعلہ بدوش پر نظر ٹھہرنا محال تھا مگر اس کے چہرے پر تفکرات کی دھند تھی، تشویش کے سائے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں طمانیت کی لہر ابھری مگر چہرے پر خفگی جھلک آئی۔ مصنوعی ناگواری سے بولی: "کہاں گئے تھے تم؟ رات بھر غائب رہے۔"

"غائب رہا نہیں۔ غائب کر دیا گیا تھا بلکہ یوں سمجھو کہ صفحۂ ہستی سے ہی غائب ہوتے ہوتے بچا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم جب بھی باہر جاتے ہو کسی نہ کسی قضیے میں الجھ جاتے ہو۔" وہ بھویں سکیڑتے ہوئے بولی: "جب بھی واپس آتے ہو کسی ہنگامے کی بازگشت کی طرح آتے ہو۔ میں کہتی ہوں کہ آخر تم بلاضرورت باہر جاتے ہی کیوں ہو؟"

"ان سب ہنگاموں اور حادثوں سے میرے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔"

"وہ کیا؟" وہ اپنی دلچسپی چھپا نہ سکی۔

"یہی کہ مجھے لوہے کے ایک مضبوط صندوق میں بند کر کے، ایک بڑا سا تالا لگا کر سمندر کی تہ میں پھینک دیا جائے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ مصنوعی خفگی سے مجھے گھور کر رہ گئی۔ لیکن بالآخر پوچھے بغیر نہ رہ سکی: "اس بار کیا ہوا تھا؟"

میں نے اسے شب گزراں کی کہانی سنائی تو اس کی آنکھوں میں دہشت کی پرچھائیاں رینگ آئیں۔ وہ مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی لیکن مجھ پر جو کچھ گزرتی تھی، اس سے خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ وہ خطرات سے نہیں گھبراتی تھی مگر مجھے گزند پہنچنے کا اندیشہ اسے لرزا دیتا تھا۔

"مسائل پھیلتے ہی جا رہے ہیں… خطرات بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔" وہ کوٹھری میں آ کر بے جان سے انداز میں لوہے کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی: "اور زیادہ الجھن کی بات یہ ہے کہ واقعات کا کوئی سر پیر سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کل تمھیں اغوا کرنے والے یا انھیں ہلاک کرنے والے نواب خان کے آدمی تو نہیں ہو سکتے… میں نہیں سمجھتی کہ وہ غنڈہ گردی کے راستے پر اتنا آگے بھی جا سکتا ہے۔"

"جس کی زہریلی انا کا پھن کچلنے کی کوشش کی جائے اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" میں نے اس کے مقابل چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آج شام تم نادر حسین سے مذاکرات کرنے جارہے ہو؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"یقیناً۔" میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"تنہا؟" اس نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ بارات لے کر تو نہیں جاسکتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک تو آج کل تم ہر بات کا الٹا جواب دیتے ہو۔ طنز گوئی کا بڑا شوق ہو رہا ہے تمھیں۔" وہ قدرے بگڑ کر بولی۔

"اب تم مذاق کو بھی طنز سمجھو تو میں کیا کرسکتا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"ان حالات میں بھی مذاق سوجھ رہا ہے تمھیں؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں... اب میں نے زیادہ فکر مند اور تشویش زدہ ہونا چھوڑ دیا ہے۔" میں نے لاپروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔ "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں فکروں میں گھلتا رہا تو کہیں وقت سے پہلے ہی اللہ میاں مجھے اپنے پاس بلانے کا فیصلہ نہ کرلیں۔"

گلنار اپنی مصنوعی خفگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے دراصل اس بات پر شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں اتنے خطرناک حالات میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر پا رہی۔"

"اس پر تم شرمندہ ہو رہی ہو؟ تم...؟" اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ "بہت عجیب بات کی تم نے۔ تم عورت ذات ہو اور اوپر سے خود تمھارے اپنے وجود سے نہ جانے کتنے مسائل چمٹے ہوئے ہیں۔ شرمندہ تو مجھے ہونا چاہیے کہ مجھے تمھارے مسائل کی طرف توجہ دینے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ تم تو پھر بھی حتی المقدور میری مدد کیے جارہی ہو۔"

"یہ تمھارا حسنِ ظن ہے...۔" وہ سر جھکا کر قدرے افسردہ سے لہجے میں بولی۔ "کہ تم مجھے عورت ذات بھی سمجھتے ہو اور تمھیں میرے مسائل کا بھی احساس ہے۔ ورنہ اس بازار میں بیٹھنے والی عورتوں کو عورت ہی کہاں ... جاتا ہے؟"

"خیر... یہ اداس کر دینے والی باتیں چھوڑو۔" ... نے کہا۔ "کچھ دیر بعد تمھیں محفلِ نشاط و طرب سج... ہے۔ ایسے چہروں سے تو محفل نہیں سجتی۔" میں نے ا... کی صورت کی طرف اشارہ کیا۔

"مطمئن رہو۔" وہ یک دم مسکرادی اور یک ... ہی جیسے بدلیاں چھٹ گئیں اور طلوعِ آفتاب ... منظر سامنے آگیا۔ میں مبہوت سا اسے دیکھنے لگا۔

"مجھے اس بازار میں رہ کر ہر لمحے اپنے تا... بدلنے کا ہنر آگیا ہے۔" وہ بدلے ہوئے لہجے میں بو... "جب بھی ضرورت محسوس کی فوراً جھلملاتے ہو... آنسوؤں پر مسکراہٹ کی نقاب ڈال لی۔" پھر وہ موضوع بدلنے کی غرض سے بولی۔ "نادر حسین ... کب مل رہے ہو؟"

"سات بجے۔" میں نے بتایا۔

"چھ تو بج چکے ہیں۔" وہ اپنی مرمریں کلائی پ... بندھی ننھی سی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب تمھیں یہ نصیحت کرنا تو بیکار سی بات ... ہوشیار رہنا اور اپنا خیال رکھنا۔"

"میں تمھاری ہدایت یاد رکھوں گا۔" میں نے ... سے کہا۔

"میں چلتی ہوں۔ شام کے سائے گہرے ہو... پہلے تھوڑا سا ریاض کرلوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بول... میں بادلِ نخواستہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا ... دیر بعد میں نے اپنا حلیہ مزید درست کیا اور سا... بجے کے قریب پیدل ہی شاہی بازار سے نکل کھڑا ... پائلٹ ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ میں سات ... چند منٹ پہلے وہاں پہنچ گیا اور ریستوران ... چائے منگوائی۔

ابھی میں نے چائے کی پہلی ہی چسکی لی تھی کہ ... ہال کے چھوٹے دروازے سے اندر آتا دکھائی ... نے اس وقت معزز نظر آنے کا پورا پورا اہت... تھا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ بال بھی سل... بنائے ہوئے تھے اور ایک بریف کیس بھی اٹھا...

...ر چہرے کی کرختگی اور خباثت کو چھپانے میں ناکام ...ا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اس کی جو ٹھکائی ...تھی۔ اس کے اثرات بھی اس کے چہرے پر باقی تھے شاید ...سی لیے وہ تاریک شیشوں کی عینک لگائے ہوئے تھا۔ میں ...نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے خود ہی ہال میں نظر دوڑا کر مجھے تلاش کرلیا اور ...تیز قدموں سے میری میز پر آگیا۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ تنہا آیا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے کوئی شخص ...یستوران میں داخل نہیں ہوا تھا۔ ریستوران کی بیرونی ...وار شیشے کی تھی۔ باہر کی بھیڑ بھاڑ صاف دکھائی دے ...تی تھی لیکن مجھے کوئی مشکوک شخص ریستوران کی طرف متوجہ نظر ...آیا۔

"بہت ڈھیٹ آدمی ہو تم!" نادر بریف کیس میز ... رکھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تعریف کا شکریہ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ محظوظ ہوئے بغیر بولا۔ "اگر تمھیں سودے بازی ...رنی ہی تھی تو شروع ہی میں کیوں نہ کرلی۔ جب ہم نے ...یں اچھی خاصی رقم بھی دی تھی۔ مزید مانگتے تو شاید ...بھی دے دیتے۔ مگر تم نے ... ساتھ آنکھ مچولی ...شروع کردی۔ ہمیں بھی ہلکان کیا۔ خود بھی ذلیل ہوتے ...ے... اور تمھاری وجہ سے ہمارا بے پناہ نقصان بھی ...ا... اور اب جب کہ ہم تمھارا کوئی اور ہی بندوبست ...نے کی سوچ رہے تھے تو تم سودے بازی پر اتر آئے۔"

"آدمی ٹھوکریں کھا کر ہی عقل آتی ہے۔" میں نے ...سفانہ انداز میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ہاں... تو اب تمھارا کیا مطالبہ ہے؟" وہ اپنی ...تابی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"چائے پیو۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" میں نے چائے ...ر کے کپ اس کی طرف کھسکایا۔

"چائے پیتے رہیں گے۔ تم بات بھی کرتے رہو۔" وہ ...گھونٹ بھرنے کے بعد بریف کیس کی طرف اشارہ کرتے ...نے بولا۔ "میں خاصی رقم لے کر آیا ہوں۔ تم چاہو تو ...سودا ابھی اور اسی وقت طے پاسکتا ہے۔ صرف یہ ...و کہ ڈائری کہاں ہے اور تمھارا مطالبہ کیا ہے؟ اگر ...ری ساتھ لائے ہو تو اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والا معاملہ ہوسکتا ہے۔"

"میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ ڈائری ساتھ لے آتا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "سردست تو میں تم سے مذاکرات کرنے آیا ہوں۔ مجھے ڈائری کے عوض دو لاکھ۔"

"دو لاکھ روپے؟" اس نے بھویں اچکائیں...

"پچاس ہزار ہم تمھیں پہلے بھی دے چکے ہیں۔"

"انھیں بھول جاؤ۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "تم لوگوں نے مجھے اتنا دوڑایا اور بھگایا ہے کہ وہ پچاس ہزار تو اسی میں ختم ہوگئے۔ درحقیقت اسی روز روز کی... بھاگ دوڑ اور لڑائی جھگڑے سے تنگ آکر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کچھ رقم کھری کروں اور آرام سے الگ تھلگ ہو کر کوئی شریفانہ کام کروں۔ سچ ہے بھی... کہ اس کھیل سے میں تنگ آگیا ہوں، تھک گیا ہوں۔"

"تم نے نہایت معقول فیصلہ کیا ہے۔" وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "رقم کچھ زیادہ مانگ رہے ہو... بہرحال... مجھے یہ سودا منظور ہے۔"

اس احساس سے میری دھڑکن کچھ تیز ہوگئی کہ وہ پراسرار ڈائری ان لوگوں کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ اندازہ تو خیر مجھے پہلے بھی تھا لیکن اب نادر حسین کے اتنی آسانی سے دو لاکھ کی ادائیگی پر رضامند ہو جانے سے اس بات کی مزید تصدیق ہوگئی تھی کہ اس ڈائری سے ان کا اور دوسرے بھی نہ جانے کتنے نامعلوم آدمیوں کا کوئی بہت بڑا مفاد وابستہ ہے۔

"ڈائری کب دوگے اور طریقِ کار کیا ہوگا؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"ڈائری ایک محفوظ مقام پر میرے ایک دوست کے مکان میں محفوظ ہے۔ کل شام ٹھیک چھ بجے تم رقم لے کر اسی ریستوران میں آجاؤ۔" میں نے ہدایات دینا شروع کیں۔ "رقم کی ایک جھلک دیکھ کر مجھے اطمینان ہوجائے گا۔ پھر ہم ریستوران سے نکل کر کسی ایسے ٹیکسی والے ... کریں گے جو منہ مانگے کرائے پر ہمیں اس ویران مقام تک چھوڑ آئے۔ ہم تمھاری گاڑی میں نہیں جائیں گے۔ خیال رہے کہ تمھیں غیر مسلح اور تنہا ہونا چاہیے۔"

اس نے ایک لمحے کچھ سوچا گویا دل ہی دل میں ان

شرائط کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہو۔ پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے مجھے... منظور ہے۔" پھر مزید کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر وہ کپ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تم نے تو اپنی شرائط بیان کردیں۔ اب میری طرف سے صرف اتنا سن لو کہ اگر تم نے کوئی چالبازی دکھائی... تو تمھاری آنے والی نسلوں کو بھی اس پر پچھتانے کا موقع نہیں مل سکے گا کیونکہ وہ نسلیں آنے میں... کامیاب ہی نہیں ہوسکیں گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہوگی کہ تم اس دُنیا سے جاچکے ہوگے۔"

"مطمئن رہو۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہم دونوں کی عافیت اسی میں ہے کہ ایک دوسرے سے کیے ہوئے معاہدے کی پابندی کریں۔" پھر میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "برخوردار! قسمت نے ساتھ دیا تو اس بار تمھارا پتہ صاف ہوجائے گا۔" پہلے تو اس نوردین کو صاف کرنا تھا۔ میری خواہش صرف یہ تھی کہ میں اس کے مارے جانے سے پہلے کچھ معلومات حاصل کرلوں تاکہ حالات کا کچھ تو سرا پیر میری سمجھ میں آسکے۔

اس کے جانے کے چند منٹ بعد میں بھی ریستوران سے نکل آیا۔ اب اگلے روز تک میرے پاس کوئی کام نہیں تھا چنانچہ میں واپس آکر لمبی تان کر سوگیا لیکن رات گئے گلنار نے آکر مجھے جگادیا۔ وہ اپنی محفلِ طرب برخاست کرکے آرہی تھی اور یہ جاننے کے لیے بے تاب تھی کہ نادر حسین سے میرے مذاکرات کا نتیجہ کیا رہا۔

"یہ جاننے کے لیے تم دن چڑھنے کا انتظار بھی کرسکتی تھیں۔" میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر کہا۔ "اس وقت میں ایک نہایت حسین خواب دیکھ رہا تھا۔"

"ٹھیک ہے... اگر تمھیں خواب، حقیقتوں سے زیادہ عزیز ہیں تو میں چلی جاتی ہوں۔" وہ واپسی کے لیے مڑتے ہوئے بولی۔

میں نے جلدی سے اُس کی کلائی تھام لی۔ "اس خواب کو میں حسین اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ تمھارے بارے میں تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ خواب کے دوران ہی تعبیر کوٹھری میں چلی آئے گی۔"

"اب تمھیں باتیں کرنا خوب آتی جارہی ہیں۔" وہ خفگی بھول کر مسکرائی۔

"درحقیقت اب مجھے دھیرے دھیرے گزارنا آتی جارہی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ کوٹھری میں پڑی ہوئی لوہے کی ا... پر بیٹھ گئی تو میں نے اُسے نادر حسین سے ... کی تفصیل بتائی۔ اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی ... دھیمی آواز میں بولی۔ "دراصل اسی لیے میں ... تھی اور صبح کا انتظار نہیں کرسکی تھی۔ مجھے ... تھا کہ تم ایسی ہی کوئی سودے بازی کرکے آ... میرا خیال ہے تم دہکتے ہوئے الاؤ ... رہے ہو۔"

"تم صرف ہاتھ کی بات کررہی ہو ... کا سارا ہی الاؤ میں پڑا ہوں۔" میں نے ... ہوئے کہا۔ "اور اس الاؤ میں میں خود نہیں ... مجھے دھکا دیا گیا ہے۔ تم نے احساس دلا... تاخیر کردی۔ اب تو میں کندن بننے کے قریب ہوں۔"

"مستقبل قریب کے کندن!" وہ اس... میں بولی۔ "کہیں زیادہ آنچ لگ جانے پر خا..." پھر یک لخت وہ گہری سنجیدگی اختیار کر... بولی۔ "میرے خیال میں بہتر یہی ہوگا کہ کل میں تمھارے پیچھے بھیج دوں۔ وہ تمھارے قریب ... بوقتِ ضرورت کام آئے گا۔"

بدرو، گلنار کے خاص باڈی گارڈ کا... سے میری پہلی ملاقات اس طرح ہوئی تھی ک... ٹھری میں اس نے مجھے نواب خان کا آدمی ... میری گردن پر پستول رکھ دیا تھا۔ اور بعد میں میں نے اُس سے چھین لیا تھا۔ میں نے نفی ... ہوئے کہا۔ "کوئی تیسرا شخص خواہ کتنی ہی ہو... سے ہمارے قریب رہنے کی کوشش کرے ... کام بگڑ جائے گا۔"

"جیسے تمھاری مرضی۔" وہ قدرے مایوس...

بولی۔ "تمھاری زندگی میری امانت تو نہیں لیکن ایک بار پھر التجا کروں گی کہ اس کی حفاظت کسی امانت ہی کی طرح کرنا۔"

"اگر تم نے اس پر حق جتایا ہوتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔" میں نے کہا۔

"شاید زندگی کبھی اتنی مہلت دے کہ تمھاری زندگی پر کوئی حق بھی جتا سکیں۔" اس نے طویل سانس لے کر افسردہ سے لہجے میں کہا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں، تمھیں گھر تک چھوڑ آؤں۔ رات ڈھل رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں، تم آرام کرو۔ بدرو میرے ساتھ ہوگا۔ روز آتے جاتے وہی میرے ساتھ ہوتا ہے۔" وہ بولی اور مجھ پر ایک الوداعی نظر ڈال کر رخصت ہوگئی۔

مجھے دوبارہ، بڑی دیر بعد نیند آئی۔

دوسرا دن بھی میں نے بیکاری ہی میں گزارا۔ میں اُستاد کی طرف بھی نہیں گیا۔ اندیشہ تھا کہ جب میں انھیں اپنی رام کہانی کا تازہ ترین باب سناؤں گا تو وہ بھی یہی اصرار کریں گے کہ مجھے اپنی حفاظت کے لیے خفیہ طور پر ضرور کسی کو پیچھے لگا کر لے چلنا چاہیے جبکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ نادر حسین کو کسی قسم کا شبہ ہو اور وہ بھڑک اٹھے۔ بڑی مشکل سے تو وہ میرے پھیلائے ہوئے جال کی طرف آنے پر آمادہ ہوا تھا۔

شام کو مقررہ وقت پر میں پھر اسی ریستوران کے ایک کیبن میں جا بیٹھا۔ چند منٹ بعد نادر حسین بھی آگیا۔ میں نے کیبن کا پردہ کھینچ دیا۔ چائے نوشی کے دوران نادر حسین نے مجھے بریف کیس کھول کر دکھایا۔ اُس میں سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ میری دھڑکن کچھ تیز ہوگئی اور ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ اس مہم میں میری پانچوں گھی میں ہوں گی۔ نادر حسین سے معلومات بھی اگلوالوں گا، نوردین کے ہاتھوں اس کا پتہ بھی صاف کرادوں گا، اور ایک موٹی رقم بھی ہاتھ آجائے گی۔ میں نے محسوس کیا کہ حالات نے مجھے خاصا شقی القلب بنادیا ہے۔

"اگر تم چاہو تو گن لو۔ پورے دو لاکھ ہیں..." نادر حسین بولا۔

"جب تمھاری چیز تمھارے حوالے کریں گے تو تم بھی گن لیں گے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔" نادر حسین بریف کیس بند کرتے ہوئے بولا۔

ہم باہر آئے تو قریب ہی ایک دو ٹیکسیاں نظر آرہی تھیں لیکن میں نے نادر حسین کو ان میں سے کوئی ٹیکسی روکنے سے منع کردیا۔ میں اس خیال سے احتیاط کررہا تھا کہ نادر حسین نے آس پاس اپنے ہی کسی آدمی کو ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں نہ چھوڑ دیا ہو۔ کافی آگے جاکر لوہاری گیٹ کے قریب میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے مذاکرات کیے۔ اسے کسی حد تک محلِ وقوع سمجھایا کہ ہم کہاں جانا چاہتے ہیں۔ اس نے تین سو روپے کا مطالبہ کیا جو نادر حسین نے بلا حیل و حجت قبول کرلیا، اور ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے... نادر حسین بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ڈائری حاصل کرنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ میرے اندازے کے مطابق راستے بھر اس نے پوری طرح نظر رکھی تھی کہ کوئی ہمارے تعاقب میں تو نہیں ہے؟ وہ شکار پر نکلے ہوئے کسی چیتے کی طرح چوکنا تھا۔ اعصاب تو میرے بھی کشیدہ تھے لیکن میں بظاہر پُرسکون تھا۔ ہم جب اس مقام کے قریب پہنچ گئے جہاں سے ہمیں بنجر زمینوں کی طرف مڑنا تھا تو میں نے ٹیکسی رکوالی۔ اس وقت شام کا اندھیرا گہرا ہوچکا تھا۔ رات نے اپنا دامن پھیلا لیا تھا۔ زیادہ فاصلے کی چیزیں محض ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ پندرہ بیس قدم چل کر نادر بولا۔ "معلوم ہوتا ہے ہم اصل جگہ سے کافی فاصلے پر ہی اتر گئے ہیں... بہت احتیاط برت رہے ہو؟" وہ میری طرف دیکھ کر شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔

"احتیاط علاج سے بہتر ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اس کے سلسلے میں تشویش میں مبتلا ہوچلا تھا۔ وہ جس اطمینان سے میرے ساتھ چلا جارہا تھا، اس سے میرا مضطرب ہونا بے جا نہیں تھا۔ گو کہ ٹیکسی میں ہم ایک دوسرے کو سرسری

سی تلاشی دے چکے تھے۔ ہم دونوں کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار موجود نہیں تھا۔ یہ بھی نادر حسین کو اچھی طرح معلوم تھا کہ خالی ہاتھ وہ مجھ پر قابو نہیں پا سکتا۔ اس کے باوجود اگر وہ خوش اور مطمئن تھا تو کیا اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ اس نے میری بات کا یقین کر لیا ہے؟ اور وہ نہایت سیدھے طریقے سے میری مطلوبہ رقم میرے حوالے کر کے ڈائری حاصل کرنے سے ہی دلچسپی رکھتا ہے؟ چند لمحے بعد میں نے یہ تمام سوچیں ذہن سے جھٹک دیں۔ اب تو جو کچھ بھی ہوتا۔ اس کا سامنا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

بالآخر ہم سڑک چھوڑ کر کچے میں آ گئے اور اجڑے ہوئے کھیتوں کو عبور کرنے لگے۔ نادر حسین ایک بار پھر راستے میں گویا مجھے خبردار کرتے ہوئے بولا۔ "اگر کوئی دھوکا کرنے کا ارادہ ہے تو اسے اب بھی دل سے نکال دو۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔"

"میں تمہیں دھوکا دینے کے لیے اتنی مشقت نہیں اٹھا رہا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "اگر صرف رقم ہتھیانا ہی مقصود ہوتا تو مزید آگے جانے کی زحمت کیوں کرتا۔ میں یہیں ویرانے میں تمہاری گردن مروڑ کر پھینک سکتا ہوں۔ کیا خیال ہے... کیا میں ایسا نہیں کر سکتا؟"

"کر سکتے ہو۔" اس نے بلا تامل اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بس تو پھر زیادہ ٹرٹر مت کرو اور چپ چاپ میرے ساتھ چلتے رہو۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد وہ تمام راستے خاموش ہی رہا حتیٰ کہ ہم اس کچے مکان تک پہنچ گئے۔ میں نے دستک دی تو دروازہ بلا تاخیر کھل گیا۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ نوردین بے تابی سے میرا انتظار کر رہا ہو گا لیکن دروازہ کھلتے ہی نوردین کی بجائے دو عدد ریوالوروں نے میرا استقبال کیا جو ایسے آدمیوں کے ہاتھوں میں تھے جن کی صورتوں ہی سے سفاکی عیاں تھی۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ فلاں ملک کے سربراہ کو فلاں جگہ پہنچنے پر اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔ تو میں چونکہ سربراہ وغیرہ نہیں تھا شاید اسی لیے مجھے صرف دو ریوالوروں کی سلامی دینے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تاہم غنیمت تھا کہ ابھی سلامی کے دھماکے شروع نہیں ہوئے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اس صورت کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا اور مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا اور اسی جھٹکے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نادر حسین پھرتی سے ایک طرف ہو گیا ورنہ شاید میں اس سے زیادہ پھرتی دکھاتے ہوئے اسے ڈھال بنانے کی کوشش کرتا۔

"بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔" ایک ریوالور والا بھاری آواز میں بولا۔ "ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔"

"اور اگر نہ بھاگا تو غالباً بکرے کی موت مارا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"اوہو... تم تو اب بھی چہک رہے ہو!" نادر حسین طنزیہ لہجے میں بولا۔ "شاید تمہیں یقین نہیں آیا کہ بازی اس طرح بھی پلٹ سکتی ہے۔"

"نہیں... اس میں یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے۔" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "بازیاں اس سے بھی زیادہ برے انداز میں پلٹ جاتی ہیں۔"

"بڑے بقراط بنے چلے آ رہے تھے تم۔" نادر حسین استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "تمہارا خیال تھا کہ تم بڑی ہوشیاری سے مجھے جال میں پھانس لو گے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ صیاد خود اپنے ہی دام میں آ رہا ہے۔"

"میں واقعی نہیں سمجھ سکا کہ یہ کیونکر ممکن ہوا؟" میں نے بظاہر سادگی سے لیکن حقیقتاً حیران ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے گویا مجھ پر احسان کرتے ہوئے فاتحانہ انداز میں وضاحت کی۔ "ہم کافی عرصے سے نوردین کی تلاش میں تھے۔ اتفاق سے میرے آدمی آج صبح ہی اس کا سراغ لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچے اور اسے قابو میں کر لیا۔ مجھے اطلاع ملی اور میں بھی آندھی طوفان کی طرح آ پہنچا۔ ہم نے پرانا حساب چکانے کے لیے اسے زدوکوب کرنا شروع کیا تو وہ بے چارہ سمجھا کہ ہم نے شاید تمہیں پکڑ لیا ہے اور تم سے ہی ہمیں اس کی اس کمین گاہ کے صحیح محل وقوع کا پتہ چلا ہے۔ تب وہ غریب چلانے لگا کہ سا

منصوبہ سیم جمال کا تھا۔ میں اس کے منہ سے تمہارا نام سن کر چونکا۔ جب ہم نے اس سے پوری بات اگلوائی تو اندازہ ہوا وہ ضرب المثل کس قدر صحیح ہے کہ اندھے کو اندھا سو کوس سے آ ٹکراتا ہے۔ میں نے بھی یہی سوچا کہ تمہیں اسی مقام پر لا کر مارنا چاہیے جو تم نے مجھے پھانسنے کے لیے چنا ہے۔ چلو، اب ذرا آگے چلو اور اپنے اس یار کی خبر لے لو، جس پر تم نے بڑا انحصار کیا تھا...۔"

ریوالور والوں نے خونخوار انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے ریوالوروں کی حرکت سے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں دھیرے دھیرے کمرے کی طرف بڑھا... میرے قدم بوجھل اور سست تھے لیکن میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تاہم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا... چاہیے۔ جدوجہد اور مزاحمت کے کئی طریقے ذہن میں آ رہے تھے لیکن ہر ایک میں جان سے ہاتھ دھونے کا خطرہ کچھ زیادہ ہی تھا اور میرے خیال میں بہادروں کی طرح جان دینے میں تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن احمقوں کی طرح جان گنوانا میرے نزدیک کارِ جہالت تھا۔ بادلِ نخواستہ مجھے کمرے میں قدم رکھنا پڑا۔ اور یہ عمل ذہنی اور جسمانی دونوں ہی اعتبار سے تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس وقت تک ریوالور والے میرے عقب میں آ چکے تھے اور جیسے ہی میں نے کمرے میں قدم رکھا ان میں سے ایک نے میری کمر پر زوردار لات رسید کر دی۔ یہ حرکت میرے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی میں کمرے کے وسط میں جا گرا۔

مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ کمرے میں ایک شخص اور بھی موجود ہو گا۔ اس سے پہلے کہ میں اٹھ سکتا۔ اس نے عقاب کی طرح جھپٹ کر زمین پر ہی مجھے دبوچا اور نہایت مشاقی سے میرے ہاتھ پشت پر لا کر کسی ڈوری سے باندھ دیے۔ پھر اس نے مجھے سیدھا کھڑا کیا اور تب میں نے اس کی شکل دیکھی۔ وہ کوئی جلاد ہی لگتا تھا۔ الٹے توے کی سی سیاہ رنگت لیکن ہونٹ گلابی... دانت سفید اور آبدار... آنکھوں میں گویا خون اترا ہوا تھا۔ جسمانی اعتبار سے بھی وہ قدیم یونانی جلادوں کی طرح گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے کینہ یا نفرت نہیں تھی لیکن وہ مجھے ریوالوروں سے زیادہ خطرناک لگا کیونکہ وہ مشینی انداز میں احکامات پر عمل درآمد کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا اور جذبات نام کی کوئی چیز شاید اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ نادر حسین ہی غالباً اس کا آقا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اپنے آقا کے حکم پر وہ ماتھے پر شکن لائے بغیر کسی بھی انسان کا... نہایت اطمینان سے قیمہ بنا سکتا ہے۔

ذہنی تکلیف مجھے نوردین کو دیکھ کر ہوئی جو ایک چارپائی پر بندھا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر لباس چیتھڑوں کی صورت میں باقی رہ گیا تھا اور جسم کے جو حصے کھلے نظر آ رہے تھے، ان پر کہیں نیل پڑے ہوئے تھے، کہیں سگریٹ سے داغے جانے کے نشانات تھے اور کہیں نوکِ خنجر سے خراشیں ڈالی گئی تھیں جن سے خون رس رس کر جم چکا تھا۔ اس نے منصوبے کے بارے میں زبان کھول دی تھی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ مجھے اس پر غصہ آنے کی بجائے ترس آنے لگا۔ بے جان سے انداز میں اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی اور وہ نیم وا آنکھوں سے کمرے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اسے دیکھ کر بھی اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ شاید وہ بے چارہ اب اتنی بھی سکت محسوس نہیں کر رہا تھا کہ آنکھوں سے ہی کوئی ردِعمل ظاہر کر سکتا۔

اس جلاد صورت شخص کو ملا کر اس کمرے میں میرے چار دشمن موجود تھے۔ جن میں سے دو مسلح نظر آ رہے تھے۔ جلاد صورت کے پاس بھی یقیناً کوئی نہ کوئی خطرناک ہتھیار موجود تھا۔ نادر حسین نے بریف کیس فرش پر رکھ دیا اور کھڑے کھڑے نہایت طمانیت بھرے انداز میں ایک سگریٹ سلگایا اور ایک طویل کش لے کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اگر تمہاری کھوپڑی میں رتی برابر بھی عقل موجود ہے تو تم نوردین والی حالت کو پہنچنے سے بچ سکتے ہو۔"

"بہت خوب۔" میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ "اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"تمہیں صرف ڈائری میرے حوالے کرنا ہو گی۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولا۔ "اور لاکھوں کے خواب

دیکھنے کی عادت چھوڑنا ہوگی۔ میں تم پر صرف اتنی مہربانی کروں گا کہ تمھیں کسی دوسرے شہر جانے کا کرایہ دے دوں۔ ڈائری میرے حوالے کرنے کے بعد اگر تم لاہور چھوڑ دو گے تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہوگا۔ اس طرح میں یہ بھول جاؤں گا کہ ہم نے تمھیں قابو میں کرنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے تھے اور کتنی تکلیف اٹھائی تھی حتیٰ کہ مجھ جیسے شخص نے تم سے مار بھی کھائی ہے۔ میں وہ شخص ہوں جس کی طرف انگلی اٹھانے والوں کا بالآخر یہ حال ہوا کرتا ہے۔" اس نے نور دین کی طرف اشارہ کیا۔

"اپنے لہجے کو سنبھالو۔" میں نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "اس سے فرعونیت کی بو آرہی ہے اور میں نے تم سے کہیں بڑے فرعونوں کو خاک چاٹتے دیکھا ہے۔"

"میں نے تم سے مشورہ نہیں، ڈائری مانگی ہے۔" اس کے لہجے میں سفاکی جھلک آئی۔ "مگر میرا خیال ہے تم آسانی سے نہیں مانو گے۔ مت بھولو کہ ادھر وہ دوسری چارپائی بھی پڑی ہے۔ نور دین کی طرح تمھیں بھی اس چارپائی سے باندھ کر جب میرے آدمی تمھارے جسم کی لوح پر نئے نئے نقش و نگار کندہ کریں گے تو پھر تم صرف ڈائری کے بارے میں ہی نہیں بلکہ وہ باتیں بھی بتانے لگو گے جو تم سے پوچھی نہیں جائیں گی۔"

"تم جو بات پوچھ رہے ہو پہلے میں اس کا جواب دے دوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "جب تم نور دین سے سب کچھ اگلوا ہی چکے ہو تو اس نے تمھیں یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ ڈائری درحقیقت میرے پاس موجود نہیں ہے۔ بلکہ مجھے اس ڈائری کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں جسے حاصل کرنے کے لیے تم سمیت نہ جانے کس کس نے میری جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ کاش میں نے بھی اس ڈائری کی ایک جھلک ہی دیکھی ہوتی۔"

نادر حسین نے ایک گہری سانس لی گویا اس نے کسی ضدی بچے سے ایک ہی سوال کا ہزارویں مرتبہ غلط جواب سن لیا ہو۔ "تم واقعی لاتوں کے بھوت ہو۔ میں خواہ مخواہ اب تک تمھیں باتوں سے منانے کی کوشش کرتا رہا ہوں بلکہ اُلٹا تمھاری ٹھوکریں کھاتا رہا ہوں۔۔۔" وہ اچانک ہی غضبناک نظر آنے لگا۔ لمحاتی سے توقف کے بعد وہ دانت پیس کر فیصلہ کُن لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے آج اس قضیئے کا کوئی فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔ آج یا تو تم ڈائری میرے حوالے کر دو گے یا [illegible] اس کمرے کے در و دیوار تمھاری حالت دیکھ کر [illegible] اٹھیں گے۔"

اس نے جلاد صورت شخص کو اشارہ کیا اور اس [illegible] نے مشینی انداز میں مجھے بازوؤں میں پکڑ کر چارپائی کی طرف دھکیلا۔ اس لمحے میں نے سوچا کہ باقاعدہ [illegible] مزاحمت نہ سہی لیکن تھوڑی بہت طاقت آزمائی تو کر [illegible] ہی چاہیئے۔

اپنی جگہ جم کر کھڑے ہونا بھی ایک خا[illegible] پہلوانی داؤ ہے۔ پیشہ ور اور تجربہ کار پہلوان ہی ا[illegible] جگہ اس طرح جم کر کھڑے ہو سکتے ہیں جس طرح کو[illegible] شہتیر خاصی گہرائی تک زمین میں گاڑ دیا گیا ہو۔ میں [illegible] اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔

جلاد صورت شخص نے مجھے آگے دھکیلنے کے [illegible] پوری قوت صرف کر دی لیکن وہ مجھے اپنی جگہ سے [illegible] اپنچ بھی نہ کھسکا سکا۔ نادر حسین نے غالباً اپنے [illegible] گرگے کو ایسے کاموں میں کبھی ناکام ہوتے نہیں دیک[ھا تھا] وہ حیرت سے چلایا۔ "رشیدے! یہ میں کیا [illegible] رہا ہوں؟"

رشیدے نے اب دونوں ہاتھ میری [illegible] رکھے اور مجھے یوں دھکیلنے کی کوشش کی جیسے کسی [illegible] پر زور آزمائی کر رہا ہو۔ تب میں یکدم ایک طر[ف] ہٹ گیا۔ شیدا اوندھے منہ کافی آگے جا گرا۔ [illegible] تو اس کا چہرہ غصے کی شدت سے گویا مسخ ہو [illegible] وہ پھنکارتے ہوئے مجھ پر جھپٹا لیکن میں اس [illegible] لیے تیار تھا۔ میں نے اس کے پیٹ میں پوری قو[ت] سے ٹھوکر رسید کی۔ وہ پہلے دُہرا ہوا اور پھر [illegible] منہ کے بل گر پڑا۔ اس بار وہ فوری طور پر نہیں اٹھ سکا۔ [illegible] نادر حسین کے ایک ریوالور بردار ساتھی کا پیما[نہ] غالباً لبریز ہو چکا تھا یا پھر اسے نادر نے ہی ا[شارہ] کیا تھا کہ اس نے فائر کر دیا۔ اس کا ارادہ مجھے [illegible] کرنے کا نہیں بلکہ میری ٹانگ پر گولی مار کر مجھے [illegible] سے باز رکھنا تھا۔ اس کا نشانہ محض آدھ انچ [illegible] سے چوک گیا۔ گولی میری پنڈلی کو تقریباً چھو[تی] [illegible]زر گئی۔ دوسرا فائر کرنے کی اسے مہلت نہ ملی، کیونکہ [illegible] لمحے ایک خوفناک دھماکہ ہوا جو اس ریوالور کے دھماکے [illegible]ے کہیں زیادہ بلند تھا۔

اس کچے مکان کے زمین بوس ہونے میں بس [illegible] تھوڑی ہی کسر رہ گئی تھی۔ چھت سے بہت سی مٹی جھڑ کر [illegible] پر گری تھی۔ ریوالور بردار گر گئے اور خود نادر حسین [illegible] گھٹنوں کے بل گر چکا تھا۔ میری بھی ٹانگیں لرز [رہی] تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صحن کی طرف [سے] گرد و غبار کا ایک بادل سا کمرے میں آگیا اور چند [illegible] کے لیے تو ہم صاف طور پر کچھ بھی دیکھنے کے قابل [نہیں ر]ہے۔ بارود کی بو اور دھول سے میرا دم گھٹنے لگا۔ دوسروں [کو] بھی میں نے کھانستے سنا۔ دراصل مکان کے صحن میں [گر]نیڈ پھینکا گیا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ گرینیڈ کسی ایسی جگہ [گرا] تھا جس سے زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا، ورنہ اب تک [یہ] مکان ہمارا مدفن بن چکا ہوتا۔

"بالے! جلدی سے کھڑکی پر جا۔۔۔" میں نے نادر حسین [کو چ]یختے سنا۔ پھر اسے زور کی کھانسی آگئی۔ گرد و غبار [کے] بادل میں مجھے ایک ریوالور بردار کھڑکی کی طرف لپکتا [نظر] آیا۔ بوکھلاہٹ میں اس نے نہایت ہی اناڑیوں [وا]لے انداز میں کھڑکی کھولی اور گردن نکال کر باہر جھانکا۔ [illegible]ان جیسے پیشہ ور اور گرگ باراں دیدہ قسم کے [illegible]لوں سے اس احمقانہ حرکت کی توقع نہیں تھی۔ جونہی [اس] نے سر کھڑکی سے نکالا ایک دھماکا اور ہوا لیکن [پہلے] دھماکے جیسا خوفناک نہیں تھا۔ غالباً رائفل سے [فائر ک]یا گیا تھا۔ بالا کسی مُردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے [فر]ش پر آگرا۔ اس کی کھوپڑی میں سوراخ ہو چکا تھا۔۔۔ [ریوالو]ر اس کے ہاتھ سے نکل کر نہ جانے کس گوشے میں [جا] گرا۔

شیدا تو میری ٹھوکر کھا کر ابھی تک اوندھا [پ]ڑا تھا۔ شاید اسے اندرونی طور پر شدید چوٹ آ[ئی] تھی۔ نادر حسین کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اب [illegible] نامعلوم اور ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کرنے [کے ل]یے گویا ایک ہی مسلح شخص باقی رہ گیا اور صرف وہی [illegible] بلکہ نادر حسین بھی بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ "شاکرا [کھ]ڑکی پر پہنچ۔۔۔ لیکن ہوشیاری سے۔۔۔ بالے کی طرح کھوپڑی میں سوراخ نہ کرا لینا۔" نادر حسین گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

ان دونوں کی توجہ میری طرف سے بالکل ہٹ چکی تھی۔ فرار ہونے کے لیے یہ ایک بہترین موقع تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے صورت حال پر غور کیا۔ صحن میں بم غالباً سامنے کی طرف سے پھینکا گیا تھا جبکہ کھڑکی مکان کی عقبی سمت میں تھی۔ ادھر سے ہی گولی بھی چلائی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نامعلوم حملہ آوروں نے مکان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہو۔ بہرحال جان کو خطرہ تو ہر طرح سے ہی تھا۔ اس لیے قسمت آزمائی کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔۔۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ یہی غنیمت تھا کہ پاؤں کھلے ہوئے تھے۔ میں دروازے کی طرف کھسکا اور باہر آگیا۔ نادر حسین نے میری طرف دیکھا تک نہیں شاید اسے گمان نہیں تھا کہ میں ان حالات میں بھی مکان سے نکلنے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔

میں صحن کی طرف جانے کی بجائے کمرے کے بغلی حصے کی طرف دوڑا۔ پچھلی مرتبہ اس مکان میں آیا تھا تو اس طرف میری نظر پڑی تھی اور میں نے یہاں لکڑی کی ایک نیم شکستہ سی گھڑونچی دیوار کے ساتھ کھڑی دیکھی تھی۔ لکڑی کا یہ بے ہنگم سا ڈھانچہ جس پر گھڑے رکھے جاتے ہیں، اس وقت میرے لیے بہت ہی کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ اس پر چڑھنے کے بعد مکان کی نیچی سی کچی دیوار کو، بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ بھی پھلانگنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مکان کے عقبی حصے سے مسلسل فائرنگ ہونے لگی تھی۔ یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ نادر حسین کا گرگا بھی جواباً فائرنگ کر رہا ہے یا نہیں۔ میں دوڑ کر گھڑونچی پر چڑھا۔۔۔ اور پھر دیوار کو پھلانگ کر دوسری طرف کودا نہیں بلکہ تقریباً گر پڑا۔ اس دوران میں، میری بھی کھوپڑی میں، سوراخ ہو سکتا تھا مگر خیریت ہی رہی۔ قدرت کو ابھی میری زندگی منظور تھی۔ میں اٹھ کر اندھا دھند دوڑ پڑا۔ میں نے ابھی چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک ایک اور خوفناک دھماکا ہوا۔ اس بار گرینیڈ شاید کمرے کی چھت پر پھینکا گیا تھا۔ میں نے دوڑتے دوڑتے مڑ کر

دیکھا تو مکان زمین بوس ہو چکا تھا اور گرد و غبار کا ایک مرغولا سا فضا میں بلند ہو رہا تھا جس میں کہیں کہیں شعلوں کی لپک بھی دکھائی دے رہی تھی۔

میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ چنے کے ساتھ خواہ مخواہ گھن بھی پس گیا تھا۔ ان بدمعاشوں کے ساتھ بے چارہ نور دین بھی بے موت مارا گیا تھا۔ مکان کے منہدم ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ سبھی ملبے تلے دب گئے ہوں گے تاہم ایک موہوم سی امید یہ نظر آ رہی تھی کہ مکان کچا تھا اور زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا۔ اس لیے اس کا ملبہ بھی زیادہ نہیں تھا، شاید کوئی بچ ہی گیا ہو۔

میں مکان سے اتنی دور نکل آیا تھا کہ اب مجھے جان بچنے کی امید ہو چلی تھی لیکن عین اس وقت جبکہ اس امید نے میرے دل میں کروٹ ہی لی تھی، میں اوندھے منہ گر پڑا اور خاصی دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ تاہم گھپ اندھیرے کے باوجود مجھے اپنے گرنے کی وجہ معلوم ہو گئی تھی۔ اس وقت میں ایک جھاڑی کے قریب سے گزر رہا تھا اور جھاڑی میں چھپے ہوئے کسی شخص نے اچانک ہی ٹانگ نکال کر میری ٹانگوں میں اڑا دی تھی۔ ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے میں سنبھل نہ سکا اور وہ شخص جھاڑیوں سے نکل کر میرے قریب آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں دور مار رائفل نظر آ رہی تھی۔

"کہاں بھاگے جا رہے ہو، عزیز من!" وہ مجھے زیر لیتے ہوئے بولا۔ "تمھارے لیے تو ہم نے بڑا ایمونیشن ضائع کیا ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکا تھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اور مضبوط آدمی تھا۔ شکاریوں کے سے لباس میں تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے بڑی بے نیازی جھلک رہی تھی جیسے وہ دنیا کے ہر کام کو بے حد آسان سمجھتا ہو اور اسے بے حد اطمینان سے کر گزرتا ہو۔ ابھی ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو تول رہے تھے کہ تقریباً ویسے ہی حلیے مگر اس سے خاصی زیادہ عمر کا ایک آدمی مکان کی طرف سے دوڑتا ہوا ہمارے قریب آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک رائفل تھی اور اس کی کمر پر چھوٹا سا ایک ویسا ہی کینوس بھی بندھا ہوا تھا جیسا عام طور پر کنگال قسم کے غیر... سیاح اٹھائے پھرتے ہیں۔ وہ میری طرف اشا... کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "میں نے... مکان سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ا... آدمی نکل گیا ہے تو باقی لوگوں کا پتہ صاف کر د... بہتر ہے۔"

"بہت اچھا کیا۔" جوان نے بے نیازی سے...

"ایک جگہ مجھے ان کی گاڑی بھی کھڑی نظر آ... میں نے اس کے چاروں ٹائر بھی برسٹ کر دیے ہیں..." عمر کے آدمی نے بتایا۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" جوان... سے بولا۔ "وہ دوسری دنیا میں پہنچ چکے ہوں... اب کیا ان کی روحیں گاڑی میں بیٹھ کر جائیں گی؟"

"احتیاط پھر بھی اچھی چیز ہے۔ اگر کوئی ز... گیا تو وہ ہمارا پیچھا نہیں کر سکے گا۔" بڑی عمر کے... نے جواب دیا۔ پھر اس نے مجھے آگے چلنے کا اشا... ہوئے کہا۔ "چلو بھئی... اب چلیں۔"

اس ستم ظریف کا انداز بھی ایسا ہی سرسری س... جیسے میرا ان کے ساتھ جانے کا پروگرام بہت پہ... طے رہا ہو۔

"کہاں چلیں؟" میں نے حتی الامکان پرس... لہجے میں پوچھا۔

انھوں نے یوں میری طرف دیکھا جیسے... سوال سے انھیں حیرت اور اجنبیت کی بو آ... اور اس بات سے انھیں صدمہ پہنچا ہو۔

"کوئی اتنی بے قراری سے تمھارا انتظار کر رہا... تم اتنی بے نیازی سے پوچھ رہے ہو کہ کہاں چ..." جوان العمر نے گویا میری حالت پر افسوس کرتے ہو...

"کاش مجھے بھی اس کے بارے میں کچھ م..." میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم... وہ مذکر ہے یا مؤنث۔"

"معلوم ہو جائے گا۔" جوان العمر سنجیدگی سے... "ہاں... سردست تمہیں اپنا دوست سمجھو۔ ہم ا... تک تم سے دوستوں کی طرح پیش آئیں گے جب...

...تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے۔ اپنے جذبۂ خیر سگالی کا ...لا ثبوت دینے کے لیے ہم تمھارے ہاتھوں کی بندش ...اٹ رہے ہیں... اور ہاں۔ ہم تمھیں کسی ایسی جگہ نہیں ...لے جا رہے جہاں بلاوجہ تمھارے ساتھ کوئی ظلم یا زیادتی ہو۔" اس کے لہجے میں یک لخت ہی شائستگی آ گئی۔

ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ جتنے ...دھیمے پن سے بات کر رہے تھے، اتنا ہی بڑا درندہ ان ...کے اندر چھپا ہوا تھا۔ جوان العمر نے جیب سے ایک چاقو نکالا اور میری بندش کاٹ دی۔ اس دوران میں دوسرا ...ہ پر رائفل تانے مستعد کھڑا رہا۔ بندش کٹنے سے مجھے ...سکون ملا۔ پھر ان کی ہدایت کے مطابق میں ان کے ...گے آگے چل پڑا۔ تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ایک ...جھاڑیوں کے عقب میں جدید ساخت کی ایک بند جیپ ...کھڑی تھی جس میں ڈرائیور موجود تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ...ہی دروازہ کھول دیا۔ جیپ کی پچھلی نشست کار کی طرح ...ن کار سے زیادہ آرام دہ تھی۔ ان دونوں نے مجھے درمیان ...ٹھایا اور جیپ چل پڑی۔ دو رائفلوں کی نالیں میرے ...لوں کو چھو رہی تھیں حالانکہ وہ انھیں سیٹوں پر ٹکائے ...بیٹھے تھے۔ جیپ کے شیشے رنگین تھے۔ باہر سے اندر کا ...ظر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی دیکھنے کے لیے رات ...کے اس پہر ان ویرانوں میں تھا ہی کون؟

ایک بار پھر انجانی منزلوں کا سفر شروع ہو گیا۔ ...پہلی بار مجھے اغوا کیا گیا تھا تو راستے میں ایک ٹرک ...سے کچھ لوگوں نے اتر کر مجھے اغوا کرنے والوں کو ہلاک ...کر دیا تھا مگر ہر بار تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ سفر ...بلا رکاوٹ جاری رہا حتیٰ کہ ہم لوگ ملتان روڈ پر پہنچ گئے۔ ...سٹوڈیوز سے کافی آگے نکل آنے کے بعد جیپ اچانک ...بائیں طرف مڑی اور کچے میں اترنے کے بعد درختوں ...کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھی۔ درختوں کے درمیان بل ...کھاتی ہوئی ایک پگڈنڈی نظر آ رہی تھی۔ اس پر ہچکولے ...کھاتی ہوئی جیپ کچھ آگے پہنچی تو مجھے ایک طویل و عریض ...ٹھی کی نیچی سی چار دیواری نظر آئی۔ درختوں کی وجہ ...سے یہ کوٹھی سڑک سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔

جیپ کا ہارن سن کر چوکیدار نما ایک شخصیت نے ...ٹ کھولا اور جیپ اندر [illegible] ڈرائیو وے میں جا رکی اور اردگرد پھیلے ہوئے لان سے دس بارہ عظیم الجثہ کتے اچھلتے کودتے آئے اور غراتے ہوئے جیپ کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ لمبی لمبی زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔ دو تین کتے تو اگلی دونوں ٹانگیں جیپ پر ٹکا کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر کھڑکیوں کے شیشوں سے جھانکنے کی بھی کوشش کرنے لگے۔

مجھے اپنے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑتی محسوس ہوئی۔ میں نے اتنے بہت سے جسیم اور خوفناک کتے پہلے کبھی اتنی تعداد میں یکجا نہیں دیکھے تھے۔ کوئی عجیب ہی آدمی تھا جس نے کتوں کا پورا ریوڑ پال رکھا تھا۔ چوکیدار نے عجیب انداز میں کتوں کو ڈانٹا اور وہ سب پیچھے ہٹ گئے تاہم ان کی غراہٹیں جاری رہیں۔ میرے ساتھ آنے والے مجھے نرغے میں لیے اترے اور ایک برآمدے کی طرف بڑھے۔ کتے متجسس نظروں سے صرف مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ برآمدے میں پہنچ کر ادھیڑ عمر کے شخص نے کال بیل بجائی تو ایک شخص نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر راستہ چھوڑ دیا۔ ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہ کمرۂ نشست ہی معلوم ہوتا تھا گو کہ اس میں کچھ فاضل فرنیچر بھی پڑا تھا جو عموماً کمرۂ نشست میں نہیں ہوتا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا تھا، اس نے فوراً ہی اسے مقفل کر کے چابی اپنی جیب میں ڈال لی اور پھر مجھے وہیں بٹھا کر وہ تینوں اندر چلے گئے۔ جس دروازے سے وہ اندر گئے تھے اسے بھی مقفل کر گئے تھے۔ کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں جو اس وقت بند تھیں اور ویسے بھی ان میں مضبوط گرل لگی نظر آ رہی تھی۔ گویا اگر یہاں سے میرے فرار کا موہوم ترین امکان بھی ہوتا تو وہ اتنی بے فکری سے مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاتے۔

مجھے وہاں اتنی دیر بیٹھنا پڑا کہ ایک بار تو مجھے شبہ ہوا شاید وہ مجھے بٹھا کر بھول گئے ہیں اور اس دوران کمرے میں ایسا سکوت طاری رہا کہ اپنے مستقبل کے بارے میں تشویش کے باوجود مجھے جمائیاں آنے لگیں۔ خدا خدا کر کے اندرونی دروازے کا قفل کھلنے کی آواز آئی اور وہی دونوں اندر آ گئے جو مجھے یہاں تک لائے تھے۔ اب ان کے ہاتھوں میں رائفلوں کے بجائے ریوالور نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے گئے۔ یہ صحیح معنوں میں ایک شاہانہ قسم کا کمرۂ نشست تھا۔ اس طویل و عریض کمرے کے ایک سرے پر ایک لمبی چوڑی مخملیں نشست

پر ایک نہایت ہی بارعب اور سخت عمر کا شخص براجمان تھا۔ اس کا قد کاٹھ اور وضع قطع روایت پرست اور بڑے خاندانی زمینداروں جیسی تھی۔ لمبا قد، چوڑا چہرہ، موٹی موٹی اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں۔ سفید براق شلوار، سیاہ شیروانی اور کلف لگی اونچے طرّے والی پگڑی، لیکن اس کی انگلیوں میں حقّے کی نَے کے بجائے ایک موٹا سا سگار دبا ہوا تھا جس کی مہک کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

میرے ساتھ آنے والوں نے مجھے آگے دھکیل دیا اور خود دروازے پر دربانوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ ریوالور بدستور ان کے ہاتھوں میں تھے۔ میں اس نامعلوم اور پُرجلال شخص کے سامنے اسی طرح کھڑا تھا جیسے کسی بادشاہ کے دربار میں کوئی معتوب قیدی... غنیمت یہ تھا کہ اس شخص کی آنکھوں میں میرے لیے غصّے کے آثار نہیں تھے۔

"آؤ... آؤ جوان!" اس نے بھاری آواز میں گویا مجھے خوش آمدید کہا۔ "تمھیں یہاں تک لانے کے لیے میرے آدمیوں کو کافی محنت کرنا پڑی ہے... ایک غیر متعلق آدمی اور دو تین حریفوں کا صفایا کرنا پڑا ہے ورنہ شاید تمھارا ہی صفایا ہو جاتا جو ہمیں ہرگز گوارا نہیں تھا!"

"بڑی عنایت اور محبت ہے آپ کی!" میں نے جلے بھنے سے لہجے میں کہا۔ "اس ذرہ نوازی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"وجہ کا تو تمھیں اندازہ ہو جانا چاہیے تھا!" وہ شخص سگار کا کش لے کر دھوئیں کا مرغولا چھوڑتے ہوئے بولا۔ "ہمیں وہ ڈائری چاہیے...!"

"او خدایا... پھر وہی ڈائری...!" میں نے محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً سر پیٹ لیا۔ "قسم سے میرا دل چاہ رہا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف جاؤں اور ہر چرند پرند بلکہ ایک ایک درخت کو پکڑ کر پوچھوں کہ اگر کسی کو اس ڈائری کے بارے میں کچھ علم ہو تو خدارا بتا دے جس کی تلاش میں پورا شہر دیوانہ ہو رہا ہے اور شامت میری آئی ہوئی ہے...!"

"بس... بس... تقریر بند...!" وہ شخص ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "میرے سامنے اداکاری سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے ہر حال میں ڈائری چاہیے۔ میں نے اس کے لیے بڑا وقت ضائع کیا ہے۔ بہت ڈھیل دی ہے تمھیں!"

"کاش کوئی ایسا طریقہ ہوتا جس سے میں آپ کو یقین دلا سکتا کہ وہ ڈائری جس کی آپ کو اور نہ جانے کس کس کو تلاش ہے، میرے پاس نہیں ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ علم ہے!"

"دیکھو برخوردار!" وہ شخص سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "اب تک ہم صرف تمھارے اعصاب کو کمزور کرنے کے لیے تمھارے ساتھ نفسیاتی آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ شاید ابھی کچھ دیر اور یہ کھیل جاری رہتا لیکن نادر حسین کے بیچ میں کود پڑنے کی وجہ سے ہمیں بساط جلد لپیٹنی پڑی حالانکہ نادر حسین جن کا کارندہ تھا، وہ ہمارے سامنے ... ہیں... ہم اگر کسی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیں تو پھر...!" ... نے اپنا سگار دو انگلیوں اور انگوٹھے کے درمیان دبا ... دیا اور حقارت سے شیشے کی بڑی سی ایش ٹرے میں ... "بس اتنی وقعت اور طاقت ہے، ہمارے سامنے ... بھی اچھلے بھلے طرم خان کی!" وہ تپائی پر رکھے ہوئے بکس سے دوسرا سگار نکالتے ہوئے بولا۔ "تمھارے ... میں بھی میں بہت صبر کر چکا ہوں۔ بہت وقت ... کیا ہے ہم نے۔ قدم قدم پر تمھاری خبر رکھی ہے ... رہے ہو، کس سے مل رہے ہو... میں خود بار ... کی طرح تمھارے ساتھ لگا رہا ہوں۔ اتنا تردد ... کسی بڑے سے بڑے آدمی کے لیے بھی نہیں کیا..."

میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ایک ...
میں نے اپنا غصّہ بھول کر ہکلاتے ہوئے کہا: "تو ... کیا وہ کالی مرسیڈیز والے سیاہ پوش تم ہی..."

"ہاں... وہ میں ہی تھا!" وہ میری بات کاٹ ...

"کیوں اتنی جان ہلکان کر رہے تھے تم؟" ... 'آپ' سے 'تم' پر آ گیا۔

"میں نے کہا نا کہ ہم تمھیں نفسیاتی طور ... رہے تھے۔ دہشت زدہ کر رہے تھے تاکہ جب ت ... سامنے آؤ تو تمھاری قوتِ برداشت بالکل جواب ... چکی ہو اور جیسے ہی ہم کہیں تم بلا چون و چرا ... ہمارے حوالے کر دو!" اس نے ایک ٹھنڈی سا ... "لیکن معلوم ہوتا ہے ہمیں اپنے مقصد میں کامیا ... ہوئی۔ تمھارا حوصلہ تو اب بھی بلند ہی معلوم ہوتا ... حقیقت سے واقف نہ ہونے کے باعث تم تو ... لہجے میں بھی گفتگو کر رہے ہو جس کی آج تک کسی ...

نہیں ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں واقعی نڈر اور باحوصلہ سمجھوں یا احمق اور عاقبت نااندیش...!"

"آپ کا جو بھی جی چاہے سمجھیے۔ میں اسے اپنی عزت افزائی ہی سمجھوں گا، لیکن خدا کے لیے یہ بات سمجھیے کہ ڈائری میرے پاس نہیں ہے!" میں نے لجاجت سے کہا۔ "میں اس کے چکر سے اتنا تنگ آ چکا ہوں کہ اگر وہ میرے پاس ہوتی تو قسم سے آپ کے پہلی بار کہنے پر ہی آپ کے منہ پر دے... معاف کیجیے... میرا مطلب ہے کہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا!"

"میں کیسے یقین کر لوں؟" اس کے لہجے میں پہلی بار ہلکی سی سختی جھلک آئی۔ "اس لیے کہ جس ہستی نے مجھے بتایا ہے وہ جھوٹ نہیں بول سکتی!"

"آپ کو کس نے بتایا ہے کہ ڈائری میرے پاس ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نازو نے...!" وہ اطمینان سے بولا۔

"نازو نے؟" میرے سر پر گویا کسی نے ہتھوڑا مار دیا۔ "کہاں ہے وہ؟ میں تو اس کی وجہ سے پہلے ہی نہ جانے کن چکروں میں پھنس چکا ہوں۔ یہ اس نے میری گردن مزید پھنسوانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ وہ ہے کہاں؟ میں اسے تلاش کرتے کرتے پاگل پن کی حدود کو چھونے لگا ہوں!"

"صرف چھونے لگے ہو؟" وہ شخص استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "میرے خیال میں تو تم پاگل پن کی حدود میں کافی آگے تک جا چکے ہو...!"

میں نے محسوس کیا کہ وہ اصل بات گول کر رہا ہے۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "مجھے ایک بار نازو سے ملوا دو۔ میں تمھارے سامنے ہی اس سے پوچھوں گا کہ اس نے کب اور کہاں مجھے کونسی ڈائری دی تھی!"

اس نے اس بار بھی میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور برہمی سے بولا: "میری سمجھ میں نہیں آتا تم کس برتے پر میری بات ٹالے جا رہے ہو؟ کس کے بل بوتے پر تم اس قدر بے خوف نظر آنے کی کوشش کر رہے ہو؟ تمھارے پیچھے کوئی ایسی قابلِ ذکر ہستی بھی نہیں ہے۔ ایک وہ مجّو پہلوان ہے... لیکن اس کی یا اس کے شاگردوں کی کیا اہمیت ہے؟ وہ صرف جسمانی طور پر طاقت ور ہیں۔ کشتیاں لڑنا جانتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے، رائفلوں کی گولیوں سے کشتی نہیں لڑی جا سکتی۔ دوسری وہ گلنار ہے جس نے تمھیں پناہ دے رکھی ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو نہ جانے کس طرح بچائے پھر رہی ہے۔ تمھاری بھلا کیا مدد کرے گی؟ اس کے باوجود تمھاری یہ اکڑ میری سمجھ میں نہیں آتی!"

"یہ تو تمھارا خیال ہے نا کہ میری پشت پر کوئی قابلِ ذکر ہستی نہیں ہے!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میری پشت پر تو ایک بہت ہی قابلِ ذکر ہستی ہے جس کا ذکر صبح شام پوری کائنات میں ہوتا ہے!"

"کون ہے وہ؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

میں نے سادگی سے جواب دیا۔ "ربِّ عظیم ترین...!"

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا لیکن جب بولا تو اس کے لہجے میں رعونت باقی تھی۔ "تم یوں نہیں مانو گے!" اس نے دانت پیسے پھر وہ ریوالور برداروں سے بولا: "اسے وہیں بند کر دو جہاں اس کی وہ ہمدرد بند ہے!"

اس سے پہلے کہ میں اس ہمدرد کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا، دونوں ریوالور بردار حیران کن مستعدی سے میرے قریب آ گئے اور انھوں نے ریوالور میری پسلیوں پر ٹکاتے ہوئے مجھے دروازے کی طرف گھما دیا۔ میں خاموشی سے اس طرف چلنے لگا جدھر وہ مجھے دھکیل رہے تھے۔

ایک طویل راہداری کے اختتام پر سیڑھیاں نظر آئیں جو نشیب کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کی ہدایت کے مطابق میں تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ تہ خانے میں انھوں نے نازو کو قید کر رکھا ہو گا۔ اس پر شاید تشدد بھی کیا گیا ہو اور اس نے جان بچانے کے لیے کہہ دیا ہو گا کہ ڈائری میرے پاس ہے۔

خنک تہ خانے میں قدم رکھتے ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ یہ کوئی عام سا تہ خانہ نہیں تھا بلکہ خاص مقصد کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس میں دونوں طرف چھ چھ کوٹھریوں کی قطاریں تھیں جن میں سلاخ دار دروازے لگے ہوئے تھے۔ اندر گھاس پھوس کے بستر لگے ہوئے تھے اور ایک ایک کمبل پڑا تھا۔ بالکل ویسا ہی منظر تھا جیسا عموماً کسی حوالات میں ہوتا ہے۔ گویا یہ ایک نجی نوعیت کی حوالات تھی۔ نہ جانے کتنے بدنصیبوں نے یہاں زندگی کے کتنے دن گزارے ہوں گے۔

کوٹھڑیوں کے درمیان سیمنٹ کی روش خاصی چوڑی تھی لیکن اس کے وسط میں صرف ایک ہی بلب چھت میں لٹکا ہوا تھا۔ روشنی ناکافی تھی لیکن میں بآسانی دیکھ سکتا تھا کہ ایک کے سوا باقی سب کوٹھڑیاں خالی تھیں۔ اور اس کوٹھڑی میں ایک بدنصیب عورت قید تھی جو سلاخیں تھامے کھڑی تھی۔ وہ گلنار تھی۔

وہ یوں تصویرِ بیکسی بنی کھڑی تھی کہ میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں ہر احتیاط اور دور اندیشی... بھول گیا۔ مجھے انجام کی بھی پروا نہ رہی۔ میں گلنار کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ بجلی کی طرح حرکت میں آئے اور جبڑوں سے لگے ہوئے ریوالور ہوا میں اچھلتے دکھائی دیے۔ ان کے ساتھ ہی میں نے دونوں آدمیوں کی پسلیوں میں اتنی قوت سے کہنیاں رسید کیں کہ وہ دونوں طرف واقع کوٹھڑیوں کے سلاخ دار دروازوں سے جا ٹکرائے۔ میں نے کسی درندے کی طرح ایک پر جھپٹ کر اسے سر سے اوپر اٹھایا اور پختہ فرش پر دے مارا۔

وہ وہیں ساکت ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں دوسرے کی طرف پلٹتا، میری کھوپڑی پر کسی نے گویا ہتھوڑے سے ضرب لگائی اور میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے ناچ گئے جو جلد ہی تاریک سی دلدل میں ڈوب گئے اور ساتھ ہی مجھے بھی لے ڈوبے۔

میری آنکھ کھلی تو مجھے دور کہیں ایک زرد اور دھندلا سا نقطہ چمکتا دکھائی دیا۔ چند لمحے بعد پتہ چلا کہ وہ بلب تھا جو کشادہ راہداری میں روشن تھا اور میں اس نجی حوالات کی ایک کوٹھڑی میں پڑا تھا۔ میرے سر کے عقبی حصے میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور جب میں نے وہاں ہاتھ پھیرنے کے لیے ہاتھ کو حرکت دینا چاہی تو احساس ہوا کہ ان میں آہنی ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے گلنار کے سامنے والی کوٹھڑی میں بند کیا گیا تھا۔ گلنار اسی طرح سلاخیں تھامے بت بنی کھڑی تھی لیکن اب اس کے چہرے پر جو کرب، بے بسی اور اذیت منجمد تھی، اس کی عکاسی دنیا کا کوئی مصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بس ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا تو اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک واپس آتی دکھائی دی۔ پھر اس کی آواز مجھے سرگوشی کی طرح سنائی دی: "تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں... میں ٹھیک ہوں۔" میں نے حتی الامکان شگفتگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بڑی سخت ہڈی ہے میری۔ اتنی آسانی سے کچھ نہیں ہوتا۔"

تب گویا اس کے جسم میں زندگی کی ساری توانائی لوٹ آئی۔ وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ اور چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔

"تم ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس... بدقسمتی نے آواز دی تھی۔" وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "ویسے بھی ان لوگوں کے لیے یہ کون سا مشکل کام ہے۔"

"پھر بھی... آخر ہوا کیا تھا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"محفلِ شب برخاست ہونے کے بعد میں بالاخانے سے نکل ہی رہی تھی کہ دو شریف صورت والے آدمی گاڑی میں پہنچے۔ ایک کاغذ ان کے پاس تھا جس پر میرا نام اور بالاخانے کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ کاغذ پر خون کا دھبہ بھی تھا۔" گلنار نے بتایا۔ "وہ بتانے لگے کہ ایک آدمی جبیل روڈ پر بہت زیادہ زخمی حالت میں پڑا ملا تھا۔ جسے کچھ لوگوں نے اٹھا کر گنگا رام اسپتال پہنچایا تھا۔ اس کی جیب میں کوئی ایسی چیز نہیں ملی تھی جس سے اس کی شناخت میں مدد مل سکتی۔ بس یہ ایک کاغذ نکلا ہے۔ آدمی کا جو حلیہ انھوں نے بتایا وہ ظاہر ہے تمھارا ہی تھا۔ یہ جال چونکہ تمھارے نام سے بُنا گیا تھا۔ اس لیے میں اس سے بچ نہ سکی۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ بازار میں اس وقت آس پاس کوئی ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ان آدمیوں نے اپنی گاڑی میں اسپتال تک لفٹ کی پیش کش کی۔ آدمی شریف نظر آتے تھے اور پھر میرے ساتھ بدرو بھی تھا۔ اس لیے میں کار میں بیٹھ گئی... مزنگ اڈے کے قریب سڑک کچھ سنسان تھی۔ وہیں گاڑی بھی گھر گھر کر کے بند ہو گئی۔ ڈرائیور نے انجن سے کچھ دیر چھیڑ چھاڑ کے بعد بدرو سے کہا۔ 'بھائی! ذرا اتر کر گاڑی کو دھکا لگوا دو۔' وہ دھکا لگوانے اترا تو خود دھکا اسٹارٹ ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے اس کے سر پر پانا مارا اور وہ وہیں سڑک پر گر پڑا۔ وہ لوگ اسے وہیں چھوڑ کر مجھے قابو میں کر کے یہاں لے آئے۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔"

"یہ تو کہانی کا صرف ایک حصہ ہے۔ اصل کہانی تو نہ جانے کب ختم ہوگی۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔ اسی لمحے مجھے پیٹ میں اینٹھن کا احساس ہوا اور میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ "ایک یہ پیٹ کم بخت کسی وقت اپنا کام نہیں بھولتا۔ ان حالات میں بھی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"تمھارا کوئی قصور نہیں۔" گلنار گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ "دن کے نو بجنے کو ہیں۔ اس تہ خانے میں دن اور رات میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے تم نے گزشتہ رات سے کچھ نہیں کھایا؟"

"نہیں... کھایا تو بہت کچھ ہے... بہت سی مار، بہت سے دھکے کھائے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"شکر ہے تم بہ قائمیِ ہوش و حواس بات کر رہے ہو۔" گلنار مسکرا کر بولی۔ "خواہ تم بھی میری ہی طرح سلاخوں کے پیچھے مقید ہو لیکن تمھیں دیکھ کر ساری پریشانیاں ختم ہو گئی ہیں۔ اب مجھے موت کا بھی خوف نہیں۔"

"بڑا تکیہ کرتی ہو مجھ پر؟" میں نے کہا۔

"تم پر نہیں تو اور کس پر کروں تکیہ؟"

اس کے لہجے میں جب اتنی اپنائیت در آتی تھی تو میرے دل کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "موت کا خوف تو نہیں لیکن کچھ چیزیں موت سے بھی بدتر ہوتی ہیں۔"

"ہاں... یہ تو ہے۔" وہ پُرخیال سے لہجے میں بولی۔

اسی لمحے تہ خانے کا دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر آتے دکھائی دیے۔ یہ وہ نہیں تھے جن سے مجھے گزشتہ رات سابقہ پڑا تھا اور جن میں سے ایک کو میں نے فرش پہ مارا تھا۔ یہ دونوں شلوار قمیص میں تھے لیکن کم خطرناک معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول اور دوسرے کے ہاتھ میں ریوالور تھا... قریب آ کر انھوں نے خاموشی سے ہم دونوں کی کوٹھڑیوں کا تالا کھولا اور باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ "باس نے تم دونوں کو بلایا ہے۔" ان میں سے ایک ایسی آواز میں بولا جیسے اس کے حلق میں چھوٹا سا آلو پھنسا ہوا ہو۔

میں سعادت مندی سے آگے آگے چل دیا۔ گلنار نے بھی تقلید کی۔ ہمیں اسی کمرے میں لایا گیا جہاں گزشتہ رات اس نامعلوم جاگیردار ٹائپ آدمی سے مکالمے بازی رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنی مخصوص مخملیں نشست پر براجمان تھا مگر اب اس کے جسم پر تھری پیس سوٹ اور سر پہ انگریزی ہیٹ تھا۔ سگار اب بھی اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ میں اور گلنار خاندانی مزارعوں کی طرح اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

"مجھے اس وقت تم سے بہت ناراض ہونا چاہیے تھا۔" وہ گونجیلی آواز میں بولا۔ "کیونکہ کل میرے ایک آدمی کے کولہے کی ہڈی کو خاصا نقصان پہنچا ہے۔ تمھیں معلوم تھا کہ اس قسم کی حرکت کا کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن خیر... میں پھر بھی تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میں بہت خوش ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟"

"شاید تمھیں تمھارے والد بزرگوار نے دعا دی ہو گی کہ بیٹا جہاں بھی رہو اور جس حال میں بھی رہو خوش رہو۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے کی سرخی ایک لمحے کے لیے گہری ہو گئی۔ شاید وہ اس اندازِ تکلم کا عادی نہیں تھا مگر اس نے خود پر ضبط کیا اور حتی الامکان ہموار لہجے میں بولا۔ "میں اس لیے خوش ہوں کہ وہ ڈائری مل گئی ہے۔"

"یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" میں نے ہتھکڑی لگے ہاتھ تشکر آمیز انداز میں اٹھاتے ہوئے کہا پھر میں اس شخص سے مخاطب ہوا۔ "یقین کرو کہ مجھے اس ڈائری کے ملنے کی تم سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ اب تو میری جان جنجال سے چھوٹ جائے گی نا؟"

"تم نے یہ تو پوچھا نہیں کہ ڈائری ملی کہاں سے؟" اس نے الٹا سوال کر دیا۔

"چلو تمھارا دل رکھنے کو پوچھ لیتا ہوں کہ کہاں سے ملی؟" میں نے کہا۔

"تمھارے ہی گھر سے۔" اس نے جواب دیا۔

"میرے گھر سے؟" میں اچھل پڑا۔ "میرے گھر میں تو کوئی عام ڈائری بھی نہیں تھی۔ وہ خاص ڈائری تمھیں کہاں سے مل گئی؟"

"اداکار تم بہت اچھے ہو۔" وہ آدمی اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ "بہرحال... رسماً بتا دیتا ہوں جس کے چولہے کے نیچے جو ایک سیاہ ٹرے لگی ہوتی ہے، ڈائری ایک لفافے میں ڈال کر گیلے آٹے کی مدد سے اس ٹرے

کے نیچے چھپا دی گئی تھی۔"

"میرے گھر سے سہی لیکن ڈائری تو تمھیں مل گئی نا۔ اب ہم جا سکتے ہیں؟" میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔

"جانا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔" اس کی آواز کچھ گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔ "اس ڈائری کو دیکھ کر ہمیں پتہ چلا ہے کہ اس کی معلومات دراصل دو ڈائریوں میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔ جو ڈائری ہمیں ملی ہے، اس میں صرف مقامات کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ افراد کے نام ویسی ہی ایک دوسری ڈائری میں ہیں۔ اسے تم نانڈو کی چالاکی سمجھ سکتے ہو۔ ہمارے لیے وہ معلومات تبھی کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں جب دونوں ڈائریاں ہمارے پاس موجود ہوں۔"

میں دم بخود سا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ بالآخر کئی لمحے کے سکوت کے بعد میں نے پوچھا۔ "لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"بھولے بادشاہ! تم تو سب کچھ کر سکتے ہو۔" وہ بڑے ذوق سے بولا۔ "ظاہر ہے ایک ڈائری تمھارے گھر سے برآمد ہوئی ہے تو دوسری بھی جہاں کہیں ہوگی، تم نے ہی رکھی ہوگی۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں۔" میں بے اختیار چلا اٹھا۔ "مجھے نہ تو اس ڈائری کے بارے میں کچھ معلوم تھا جو تمھیں ملی ہے اور نہ ہی کسی دوسری ڈائری کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔"

"اب ہم باتوں میں زیادہ وقت ضائع نہیں کریں گے۔" اس شخص کے لہجے میں یک لخت برہمی در آئی۔ "ہمیں معلوم ہے کہ تمھارا کمزور پہلو کون سا ہے اور ہماری حکمت عملی ہے کہ انسان کے کمزور پہلو پر وار کرو۔ وہ خود ہی سب کچھ اگل دے گا۔" یہ کہہ کر اس نے آواز دی۔ "عبدل... شیرو... مہیشن..."

فوراً ہی بڑی بڑی مونچھوں والے تین لمبے تڑنگے آدمی کمرے میں آ گئے۔ ان کے چہروں سے درندگی عیاں تھی۔ ان کے باس نے گلنار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان تینوں کو حکم دیا۔ "اس لڑکی کو خاص کمرے میں لے جاؤ اور..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا مگر اس کے گھناؤنے مفہوم کو سمجھنے کے لیے لفظوں کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ تینوں یوں گلنار پر جھپٹے گویا بیک وقت تین بھوکے شکرے ایک فاختہ پر جھپٹ پڑے ہوں۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ گلنار کی پگھلا ہوا سیسہ بن کر میرے کانوں میں اترتی چلی گئیں

ان چیخوں کو سن کر گویا میرے اندر سویا ہوا زخمی درندہ جاگ اٹھا۔ میں سب کچھ بھول گیا۔ یہ یاد رہا کہ اس لڑکی کی کل کائنات میری ہی خاطر پر لگی ہوئی ہے ورنہ اسے کیا پڑی تھی کہ میرے ہونے کی اطلاع سنتی اور اپنا دلِ مجروح ہاتھوں تھامے دوڑی چلی آتی۔ جس کا نتیجہ وہ اب بھگت

وقت پڑنے پر جاہل لوگ جہالت کو بھی ڈھال بنا لیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اس وقت ہتھکڑیاں میرے لیے ہتھیار بن گئیں جو انھوں مجھے قابو میں رکھنے کے لیے پہنائی تھیں۔ میر دائیں بائیں گھومے۔ ہتھکڑیاں پہلے ایک شخص پہ پڑیں، پھر دوسرے کے منہ پر... وہ الٹ کر گرے۔ ساتھ ہی میری لات ہوا میں گھومی۔ دوا ڈھیر ہو گئے... پھر تو گویا مجھ پر دیوانگی سی طاری ہو بھی اٹھنے کی کوشش کرتا اسے یا تو میری ٹھوکر پڑ ہتھکڑیاں اس کے چہرے سے ٹکرائیں۔ کمرے میں اور کراہیں گونجنے لگیں۔ دو آدمیوں کی تو صورت ہی ہو کر رہ گئی... ایک کے ہونٹ مکمل طور پر کٹ گئے... کہ اس کے دانت عریاں ہو گئے اس کی شکل غیر انسانی سی لگ رہی تھی۔ ایک ساکت ہو گیا تھا۔ شاید وہ اپنے گناہوں کا پشتارہ پر لادے، اگر تا پڑتا اس دنیا سے رخصت ہو گیا کمرہ اب کمرہ نہیں رہا تھا۔ ایک ایسا فری اسٹائل بن گیا تھا جس میں گنجائش سے زیادہ فائٹر ٹھونس گئے ہوں۔ میرے ذہن میں تو بس ایک ہی خیال کہ گلنار ہی لٹ گئی تو پھر اپنی اس بکھری بکھری سی کا کیا فائدہ؟ کیا مصرف؟

اٹھا پٹخ اور چیخ پکار کی آوازیں شاید اس کمرے تک بھی پہنچ گئی تھیں جہاں گلنار کو لے جایا گیا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والے وہ تینوں تنومند آدمی جو کو کھینچتے ہوئے لے گئے تھے، خود ادھر کھنچے چلے آئے بے مہار اونٹوں کی طرح منہ اٹھائے کمرے میں آ تھے۔ جو سب سے آگے تھا، اس کا استقبال میں

پیٹ میں ٹھوکر مار کر کیا۔ وہ دہرا ہوا تو میں نے ہتھکڑیوں والا ہاتھ گھمایا۔ آتے وقت وہ بدبخت نہ جانے کہاں سے ایک ڈیڑھ فٹ کا موٹا سا ڈنڈا اٹھا لایا تھا۔ اس نے ڈنڈا میرے سر پہ رسید کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں وہ خود ہی منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ میں نے تیسرے کے منہ پہ ہتھکڑیاں رسید کیں لیکن اس سارے ہنگامے کے دوران میں نے ان کے سرخیل کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا اور یہ میری بہت بڑی غلطی تھی، لیکن میں بھی آخر انسان تھا۔ فنِ حرب سے بخوبی آشنا سہی... لیکن ہر چیز کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ دو چشمی آنکھیں کس کس پہ نظر رکھ سکتی تھیں اور دو بندھے ہوئے ہاتھ کس کس حملے کو روک سکتے تھے؟

میں دیکھ تو نہیں سکا تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے سر پہ کوئی وزنی چیز اسی سوٹڈ بوٹڈ ادھیڑ عمر کے آدمی نے ماری تھی جس کے سامنے کچھ دیر پہلے مجھے پیش کیا گیا تھا۔ شاید اس نے ریوالور کا دستہ آزمایا تھا۔ ضرب ہتھوڑے کی سی محسوس ہوئی تھی اور آخری احساس بس یہی ہو رہا تھا کہ میری کھوپڑی کسی اخروٹ کی طرح ٹوٹ گئی ہے۔ اس کے بعد میرے لیے دنیا اندھیر ہو گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو سب سے پہلے مجھے اس احساس سے خوشی ہوئی کہ میں زندہ ہوں۔ میری کھوپڑی اخروٹ کی طرح نہیں ٹوٹی تھی۔ البتہ کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھی۔ دوسری خوشی مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے کھوپڑی سہلانے کے لیے ایک ہاتھ سر کی طرف لے جانا چاہا اور وہ آسانی سے حرکت کرتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری ہتھکڑیاں کھول دی گئی ہیں۔ شاید وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ میں ہتھکڑی لگنے کے بعد نسبتاً زیادہ خطرناک ہو گیا ہوں۔

میں خوشی کے احساس سے زیادہ دیر محظوظ نہ ہو سکا کیونکہ میری ایک بار پھر اس جاگیردار ٹائپ شخص پر پڑ گئی جو انگریزوں والے حلیے میں میرے قریب ہی تنہا کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا۔ ریوالور سے زیادہ اس کے تاثرات خوفناک نظر آ رہے تھے۔ اس کا چہرہ کسی جھیل کی طرح پرسکون تھا اور ایسے لوگوں کا حد سے زیادہ پرسکون ہونا ہی طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں موت کی سی سرد مہری جاگزیں تھی۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر بھی وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے کراہ کر سر ذرا ادھر ادھر گھمایا تو پتہ چلا کہ میں اب اس کمرے میں نہیں ہوں جہاں ان لوگوں سے معرکہ رہا تھا بلکہ حویلی کے طویل و عریض برآمدے میں کسی شہتیر کی طرح ڈھیر ہوں۔ میرے دائیں بائیں دو آدمی رائفلیں لیے مستعد کھڑے تھے اور یہ ان میں سے نہیں تھے جنھوں نے میرے ہاتھوں مار کھائی تھی۔ یہ تازہ کمک معلوم ہوتی تھی۔

حویلی کے ڈرائیو وے میں ایک ویگن کھڑی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے موضوع پر بنائی جانے والی انگریزی فلموں میں اس قسم کی گاڑیاں میں نے ایمبولنس کے طور پر استعمال ہوتے دیکھی تھیں۔ اس گاڑی کے پچھلے دروازے پر اسی طرح ریڈ کراس بھی بنا ہوا تھا۔

"اچھا ہوا کہ تم ہوش میں آ گئے۔" دراز قامت بھاری بھرکم شخص بولا۔ "میرے آدمی تمھیں اٹھانے کی زحمت سے بچ گئے۔ ویسے بھی تم ہمارے لیے سراپا زحمت ہی ہو۔ اگر کچھ مجبوریاں نہ ہوتیں تو اس وقت میں تمھارا قیمہ بنوا کر اپنے کتوں کو کھلا چکا ہوتا۔"

"تم دیکھتے کہ یہ خوراک کھانے کے بعد ان میں بھی سرکشی کا عنصر پیدا ہو جاتا۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "اور ان کی دم ہلانے کی عادت بہت کم ہو جاتی۔"

بولنے سے بھی میرے سر میں ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں شل ہوتے جا رہے ہیں۔ معلوم نہیں یہ سر کی مسلسل چوٹوں کا اثر تھا یا میری بے ہوشی کے دوران انھوں نے میرا کچھ اور بندوبست بھی کر ڈالا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ انھوں نے مجھے کوئی انجکشن وغیرہ ہی لگا دیا ہو۔ بازو پہ ایک جگہ کچھ چبھن سی ہو رہی تھی۔

"اٹھو۔" اس شخص نے ریوالور کو حرکت دی۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ میرا اٹھنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں ایک طویل عرصے کے بعد بسترِ علالت سے اٹھ رہا ہوں۔ مجھے دل ہی دل میں خود اپنے آپ سے اعتراف کرنا پڑا کہ کم از کم اس وقت میں کسی قسم کی مزاحمت کے قابل نہیں ہوں۔

"اس گاڑی کی طرف چلو۔" اس شخص نے حکم دیا۔

میں غیر متوازن قدموں سے ڈرائیو وے کی طرف چل دیا۔ رائفل بردار میرے دائیں بائیں چلے آ رہے تھے۔ جاگیردار ٹائپ شخص میرے عقب میں تھا۔ میں گاڑی کے قریب پہنچا تو اس کا دروازہ کھل گیا اور تب میں نے دیکھا، اندر ایک لمبی سی سیٹ پر گلنار مضمحل اور افسردہ بیٹھی تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو آدمی ریوالور لیے بیٹھے تھے۔ دوسری طرف بھی ویسی ہی لمبی سی سیٹ تھی اور درمیان میں کافی جگہ خالی تھی۔ گویا اندر سے بھی گاڑی کی ساخت ایمبولینس جیسی ہی تھی۔ "بیٹھ جاؤ۔" ایک رائفل بردار نے دوسری سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

مجھے اس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارا نظر نہ آیا۔ دونوں رائفل بردار میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور گاڑی کا دروازہ بند ہو گیا۔ جاگیردار ٹائپ شخص وہیں رہ گیا تھا۔ گاڑی کے اس حصے میں روشنی کم تھی پھر بھی میں نے یہ دیکھ لیا کہ مجھ پر نظر پڑنے کے بعد گلنار کا اضمحلال اور مُردنی دُور ہو چکی تھی۔

"تمھیں ان لوگوں نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی تمھارے ساتھ؟" میں نے دبی دبی سی آواز میں پوچھا۔

"نہیں۔" گلنار نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے جو مار دھاڑ شروع کر دی تھی۔ سب کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی تھی۔ اپنی سناؤ... لگتا ہے تمھیں مار دھاڑ کافی مہنگی پڑی ہے۔"

"وقت وقت کی بات ہے۔" میں نے کندھے اچکائے۔ "لیکن انھیں یہ بات معلوم نہیں ہے کہ زندگی کے اس کٹھن دَور میں جو کوئی بھی مجھے بھنبھوڑ رہا ہے یا میلی آنکھ سے تمھاری طرف دیکھ رہا ہے، وہ درحقیقت اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر رہا ہے۔ میں ان سب کو تو معاف کر دُوں گا جنھوں نے میری درگت بنائی ہو گی لیکن ان لوگوں کا میں زندگی بھر تعاقب کروں گا جنھوں نے تمھیں خراش بھی لگائی ہو گی۔ میں ان لوگوں کو کتے کی موت مار ڈالوں گا۔"

"زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں۔" بالآخر میرے برابر بیٹھا ہُوا ایک رائفل بردار بول اٹھا۔ اس نے رائفل کی نال سے میری پسلیوں میں ٹہوکا بھی دیا تھا۔

وہ چاروں ہی گویا خود پر ضبط کیے بیٹھے تھے۔ ورنہ شاید وہ گاڑی ہی میں میری ہڈی پسلی ایک کرنا شروع کر دیتے۔ ادھر میرا جسم اور ذہن گو ابھی تک بے سہارا تھا مگر دل چاہ رہا تھا کہ ان پر ٹوٹ پڑوں، گاڑی ہی میں ہنگامہ شروع کر دُوں خواہ نتیجہ کچھ بھی کیوں نہ نکلے، مگر میرے ہاتھ پاؤں میری اس خواہش کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی اور کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہی تھی۔ ہمیں تو خیر راستہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا، منزل کے بارے میں کیا اندازہ لگاتے!

سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہُوا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد گاڑی رک گئی اور انجن خاموش ہو گیا۔ چند لمحے بعد کسی نے باہر سے دروازہ کھولا۔ میں نے دیکھا کہ اس شخص کے جسم پر ڈھیلی ڈھالی سفید وردی تھی، سر پر سفید ٹوپی بھی تھی یعنی انھوں نے اس گاڑی کو باقاعدہ ایمبولینس ہی بنا رکھا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ شہر کے پُر رونق راستوں سے گزرتے آئے ہوں اور کسی کو گمان تک نہ گزرا ہو کہ اس گاڑی میں ایک اسیرِ محبت لڑکی اور ایک خانماں برباد نوجوان کو اغوا کر کے لے جایا جا رہا ہے۔

"اُترو..." رائفل بردار نے مجھے دھکیلا۔ اس بار اس کے انداز میں درشتی تھی ورنہ جس وقت انھوں نے مجھے گاڑی میں بٹھایا تھا، اس وقت وہ اتنے برہم نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں اور گلنار ان چاروں کے نرغے میں گاڑی سے اُتر آئے تب میں نے دیکھا کہ گاڑی ایک پختہ مکان کے احاطے میں کھڑی ہے۔ مکان مختصر ہی معلوم ہوتا تھا مگر اس کی اصل عمارت کے گرد خاصا طویل و عریض رقبہ خالی پڑا تھا۔ اس احاطے کے گرد اونچی چار دیواری تھی۔ یہ مکان بھی ویرانے ہی میں واقع معلوم ہوتا تھا کیونکہ چاروں طرف بَلا کا سکوت تھا۔ کم بختوں نے نہ جانے کہاں کہاں ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ ہمیں اندر چلنے کا حکم دیا گیا۔ ہم نے تعمیل کی۔ اس قسم کے لوگوں کے احکام بجا لانا ہی اب گویا میری زندگی کا مقصد بن کر رہ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ زندگی تو میری اپنی ہے، لیکن اسے بسر دوسرے کر رہے ہیں۔ ہمیں ساتھ لانے والے بہت مستعد و محتاط تھے۔ انھوں نے خاصا فاصلہ رکھ کر ہمیں گھیرے میں لے رکھا تھا۔ کوئی میرے قریب آنے کی جرأت بلکہ حماقت نہیں کر رہا تھا۔

ہم جس کمرے میں پہنچے، اس کی دیواریں اور فرش سیلن زدہ تھا۔ ایک طرف پرانا سا نیم شکستہ صوفہ اور دوسری طرف ایک ایسا ہی سالخوردہ سا پلنگ نظر آ رہا تھا جو شاید مشکل سے ہی اپنے پایوں پر کھڑا تھا۔ ہر چیز پر جمی ہوئی گرد کی ہلکی سی تہ اور در و دیوار سے برستی ہوئی ویرانی بتاتی تھی کہ مکان کافی عرصے سے کسی کے استعمال میں نہیں رہا۔ جیسے ہی میں اور گلنار کمرے میں داخل ہوئے، ایک شخص نے یوں پھرتی سے باہر سے دروازہ بند کر دیا جیسے ہم مشکل سے ہاتھ آنے والے پرندے ہوں اور اسے اندیشہ ہو کہ ذرا سا موقع ملتے ہی پھُر سے اُڑ جائیں گے۔

باہر سے دروازے کو تالا لگا دیا گیا پھر ان کے قدموں کی آوازیں بھی معدوم ہو گئیں اور وہی مہیب سناٹا چھا گیا جو اُجڑے ہوئے مکانوں کا مقدر ہوتا ہے۔ یا پھر شاید ایسے مکان ان کے حصے میں آتے ہیں جن کے مقدر اُجڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔ گلنار تو اب پُرسکون اور پُراعتماد نظر آ رہی تھی مگر میں شاید اوّل درجے کا احمق لگ رہا تھا۔ شکر ہے میرے سامنے گلنار تھی، آئینہ نہیں تھا۔ وہ اطمینان سے جا کر پلنگ پر نیم دراز ہو گئی اور ایک طویل سانس لے کر بولی: "میں تو بہت تھک گئی ہوں۔"

"تم تو اس طرح کہہ رہی ہو جیسے کسی تقریب سے واپس آئی ہو۔" میں نے کہا۔ "تھکن کی نہیں، حالات کی فکر کرو۔"

"سرِدست تو حالات ہمارے قابو میں نہیں، ہم حالات کے قابو میں ہیں۔ اس لیے فکر کرنا فضول ہے۔"... وہ اطمینان سے بولی: "ویسے بھی جب خراب حالات سے واسطہ پڑتا ہے تو میں یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتی ہوں کہ حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہو سکتے تھے۔"

"ہاں۔ مثلاً انسان کو گولی مار کر ہلاک کیا جا رہا ہو تو وہ سوچ سکتا ہے کہ حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہو سکتے تھے، اسے کند چھُری سے ذبح کیا جا سکتا تھا۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ میری اعصابی خوابیدگی اب دھیرے دھیرے دُور ہو رہی تھی اور بے بسی کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سمجھنے سے تو خیر میں قاصر تھا کہ وہ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں، لیکن یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے۔

کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی اور اس میں بھی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کافی اونچائی پر ایک روشندان تھا مگر وہ اتنا چھوٹا تھا کہ کوئی صحت مند بلّی بھی اس سے گزر نہیں سکتی تھی۔ دروازہ ٹھوس لکڑی کا تھا۔ اس پر زور آزمائی بے کار تھی اور اگر ہم معجزاتی طور پر کمرے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تب بھی ضروری تو نہیں تھا کہ مکان سے بھی نکل جاتے۔ کچھ دیر ہم دونوں ہی خاموش رہے۔ اپنی اپنی جگہ سوچوں کے گنجلک تار سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ دفعتاً باہر بھاری قدموں کی آواز اُبھری پھر تالا کھولا گیا۔

دروازہ کھلنے پر میں نے دیکھا کہ ایک شخص کھانے کی ٹرے اٹھائے سامنے کھڑا تھا اور اس کے عقب میں وہی دو رائفل بردار مستعد کھڑے تھے۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر کھانا تپائی پر رکھ دیا اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ دروازہ ایک بار پھر مقفل ہو گیا۔

گلنار اُٹھ بیٹھی اور قدرے مسرور لہجے میں بولی: "چلو ایک بات تو ظاہر ہو گئی کہ یہ لوگ ہمیں جان سے نہیں مارنا چاہتے... اور اگر ہلاک کریں گے بھی تو بھوکا رکھ کر نہیں... یہ پھر بھی باعزت قسم کی موت ہو گی۔"

"تمھارا مسئلہ بس یہی ہے کہ موت بے شک آ جائے لیکن ذرا عزت سے آئے۔" میں نے اپنا لہجہ جلا بھُنا سا بنانے کی کوشش کی حالانکہ مجھے بالکل غصہ نہیں آ رہا تھا۔

"بھئی... زندگی تو عزت کی نصیب نہیں ہوئی، میں سوچتی ہوں کہ موت ہی عزت کی نصیب ہو جائے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ وہ بڑی ستم ظریف تھی۔ ہنستے ہنستے ایسی بات کہہ جاتی تھی جو گھونسے کی طرح دل پر لگتی تھی۔

میں ایک لمحے چُپ سا ہو گیا تو وہ فوراً شگفتہ لہجے میں بولی: "چلو کھانا کھا لیں۔ پیٹ خالی ہو تو ذہن میں خیالات بھی بڑے مُردار قسم کے آتے ہیں۔"

یہ تو مجھے معلوم تھا کہ وہ فطرتاً ایک بہادر عورت ہے، لیکن اس وقت شاید وہ میرا حوصلہ بلند رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے تپائی، پلنگ کے قریب کھسکائی اور ہم کھانا کھانے لگے۔ کھانا خاصا اچھا تھا۔ کھانے کے دوران میں نے کہا: "میرا خیال ہے جب وہ شخص برتن اُٹھانے آئے تو اسے قابو میں کر کے ڈھال بنا لوں اور

کچھ ہنگامہ شروع کردوں۔ شاید اس طرح ہم نکلنے میں کامیاب ہوجائیں۔"

"میں 'شاید' والے کسی بھی معاملے میں تمھیں جان کی بازی لگانے کی اجازت نہیں دوں گی۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

میں ابھی اس موضوع پر مزید کچھ نہیں کہہ پایا تھا کہ دُور کہیں سے گاڑیوں کے انجنوں کی گھرگھراہٹ سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی گئی۔ اس کے بعد ۔ ۔ ۔ اچانک ہی فائرنگ بھی ہونے لگی۔ گلنار کی رنگت متغیر ہوگئی۔ میں سلاخوں والی کھڑکی کی طرف لپکا لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔

"چاروں طرف سے گولیاں چل رہی ہیں۔" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔ "خواہ مخواہ اپنا دیدار کرانے کھڑکی میں مت جاؤ۔ شاید کوئی اچٹتی ہوئی گولی ہی آن لگے۔"

بات معقول تھی۔ میں رُک گیا۔ اسی دوران ایک عجیب بات ہوئی کہ کسی نے دروازہ چوپٹ کھول دیا اور ہم اس کی صورت بھی نہ دیکھ سکے۔ وہ بس دروازہ کھولتے ہی ایک طرف کو بھاگ گیا۔ اب ہم دیکھ سکتے تھے کہ برآمدے میں کس طرح گولیوں کی بوچھاڑ سے دیواروں کا پلاسٹر اُدھڑ رہا تھا۔ حملہ آور جو کوئی بھی تھے، مکان والے غالباً ان کے مقابلے میں پسپائی اور راہِ فرار اختیار کر رہے تھے اور انھوں نے ہم پر کرم یہ کیا تھا کہ دروازہ کھول کر ہمیں بھی بھاگنے کا موقع فراہم کردیا تھا۔ شاید ہمیں ساتھ لے جانا ممکن نہیں رہا ہوگا لیکن ہم ان کی اس نوازش سے استفادہ نہیں کرسکتے تھے کیونکہ باہر اب بھی فائرنگ جاری تھی۔

رفتہ رفتہ فائرنگ رک گئی اور مکان میں بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا، ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ برآمدے میں باوردی پولیس والے رائفلیں اٹھائے اپنے ہی کمرے کی طرف آتے دکھائی دیے۔ ایک بھاری بھرکم اور بارعب قسم کی شخصیت کا مالک انسپکٹر سب سے آگے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ پولیس کو دیکھ کر میری جان میں جان آئی لیکن وہ لوگ چوکھٹ سے چند قدم دُور ہی رک گئے۔ انسپکٹر مجھے نشانے پر لیتے ہوئے گرجدار آواز میں بولا۔ "اوئے اچکے! ہتھیار پھینک دے۔"

"ہتھیار ۔ ۔ ۔؟" میں نے حیرت سے اپنے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ "میرے پاس تو کوئی ہتھیار نہیں۔" مجھے اس کے درشت لہجے پر حیرت ہوئی تھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ قدرت نے ہمارے لیے مدد بھیج دی ہے۔ قانون کے محافظ دو امن پسند شہریوں کو بچانے کے لیے آپہنچے ہیں لیکن ان کے تیور کچھ اچھے معلوم نہیں ہوتے تھے۔

"یہ تمھارے حق میں اچھا ہی ہے کہ تمھارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ورنہ تمھارا جلوس ہی نکال دیتا کاکا۔" انسپکٹر یہ کہتے ہوئے کمرے میں در آیا اور اس کے پیچھے سپاہی بھی رائفلیں سنبھالے آگئے۔ انھوں نے مجھے اور گلنار کو نرغے میں لے لیا۔ "چلو کاکا! اب شرافت سے باہر چلو۔" انسپکٹر نے حکم دیا۔

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"سسرال۔ جہاں جانے سے تم آج تک بچتے آئے ہو۔" انسپکٹر خشونت آمیز انداز میں مسکرایا۔ "لیکن آج تم انسپکٹر محمد شاہ کے اَڑیکے چڑھ گئے ہو بچو! آج تمھاری بڑی خاطر تواضع ہوگی۔"

"تمھاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔" میں نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"باتیں تمھاری سمجھ میں کہاں آئیں گی کاکا! اچھا سمجھ میں تو لاتیں آئیں گی، لاتیں! چھتروں سے تمھاری عقل ٹھکانے آئے گی۔" وہ خونخوار لہجے میں بولا۔

"دیکھیں ۔ ۔ ۔ آپ کو ہم سے ہمدردی سے پیش آنا چاہیے۔ آپ قانون کے محافظ ہیں۔" میں اب بھی تحمل سے کام لے رہا تھا۔

"ہاں میرے جگر کے ٹکڑے! تم ہی تو رہ گئے ہو ہماری ہمدردیوں کے مستحق۔ اسی لیے تو ہم قانون کے محافظ بنے ہوئے ہیں کہ تم ہیروئن، چرس اور شراب کے دھندے کرکے مال کماتے رہو ۔ ۔ ۔ عیش کرتے رہو ۔ ۔ ۔ اور آکر تم سے ہمدردیاں کریں ۔ ۔ ۔ اور پوچھیں کہ کاکا کوئی تکلیف تو نہیں ۔ ۔ ۔ یہی مطلب ہے نا تمھارا؟" وہ مونچھوں کو بل دیتے ہوئے طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

اب میں سمجھا کہ وہ درحقیقت ہمارے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ میں نے مسکرانے کی کوشش

کی۔ "شاہ جی! آپ کا غصہ بجا ہے۔ آپ شاید ہمیں منشیات کا دھندہ کرنے والے سمجھ رہے ہیں لیکن ہم نے تو آج تک ان دھندوں کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

"ہاں ۔ ۔ ۔ پُتر تم تو ابھی فیڈر سے دودھ پیتے ہو۔ تمھیں کیا پتہ دُنیا کی باتوں کا۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا، پھر ایک تخت دہاڑا۔ "چلو اب بک بک بند کرو اور تھانے چلو۔ باقی سب تو بھاگ گئے، تمھیں ان سب کا اتا پتہ بتانا ہے۔ چلو۔"

میں نے ایک نظر گلنار کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ اس کا خوف بجا تھا۔ ہمیں لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ وہ قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے بولی۔ "انسپکٹر صاحب! آپ ہماری بات تو سنیں۔ آپ شاید ہمیں ان لوگوں کا ساتھی سمجھ رہے ہیں جن سے آپ کا مقابلہ ہوا ہے اور جو ہمیں یہاں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ان لوگوں نے قید کر رکھا تھا ۔ ۔ ۔ ہم پر پہلے ہی بڑا ظلم ہوچکا ہے ۔ ۔ ۔ ہم تو آپ لوگوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ ہمارے لیے مدد آن پہنچی۔"

"صدقے جاؤں۔" انسپکٹر گلنار کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "بڑی دیر میں بولی ہو مگر ٹھیک ٹھاک بولی ہو، پھلکھناں! لیکن تمھیں شاید پتہ نہیں کہ اس قسم کی کہانیاں میں زندگی میں بہت سن چکا ہوں۔ جب ہم چھاپہ مارتے ہیں تو ہمارے ہتھے چڑھنے والے لوگ اسی قسم کی کہانیاں سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، میں تو یہاں قید تھا۔ کوئی کہتا ہے جی، میں تو پرچون والا ہوں۔ دال پہنچانے آیا تھا۔ کوئی کہتا ہے، میں سبزی فروش ہوں، پرانا اُدھار لینے آیا تھا۔ تھانے پہنچ کر سب کو اپنا ٹھیک ٹھیک شجرۂ نسب یاد آجاتا ہے۔"

"دیکھیں ۔ ۔ ۔" گلنار روہانسی ہوگئی۔

"جو کچھ بھی دیکھنا ہے تھانے چل کر دیکھیں گے۔ تمھیں بھی، تمھارے اس پچھلگتے کو بھی۔" اس نے ریوالور سے میری طرف اشارہ کیا۔

اس کے الفاظ اتنے بےہودہ نہیں تھے جتنا اس کا لہجہ بےہودہ تھا۔ میری کنپٹیاں تپنے لگیں۔ ایک بار تو سوچا کہ رائفلوں وغیرہ کی پروا کیے بغیر ان لوگوں کو دو چار ہاتھ دکھا ہی دوں لیکن وردی کا احترام غالب آگیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کس طرح آپ لوگوں کی غلط فہمی دُور کروں ۔ ۔ ۔" میں نے ایک بار پھر ملائم لہجے میں کہا۔

"یہ غلط فہمی کا مروڑ کب تک تمھارے پیٹ میں اٹھتا رہے گا۔" محمد شاہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے غرایا۔ "تھانے تو چلو۔ ساری غلط فہمیاں دُور ہوجائیں گی۔ ہماری نہیں تمھاری۔" پھر وہ بایاں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔ "اوئے محمد شاہ نے آج تک کسی غلط آدمی پر ہاتھ نہیں ڈالا اور نہ ہی اپنا مخبر کبھی غلط اطلاع دیتا ہے۔ ہم نے تو جب بھی دریا میں ہاتھ ڈالا، وہی مچھلی ہاتھ آئی جس کی ہمیں تلاش تھی۔"

"گویا ہماری بھی مخبری ہوئی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل ہوئی ہے۔ صدفی صد ہوئی ہے۔" وہ جھٹکے دار لہجے میں بولا۔ "تم دونوں کے ٹھیک ٹھیک حلیے ہمیں بتلائے گئے اور یہ بھی بتایا گیا کہ تم انہی خبیثوں کے ساتھی ہو جو بھاگ جانے میں کامیاب ہوگئے ہیں، لیکن خیر جائیں گے کہاں ۔ ۔ ۔" اس نے مونچھ کو بل دیا۔ "اور کیس بھی تم لوگوں پر ٹھیک ٹھاک ہی بنے گا۔ اتنا مال برآمد ہوا ہے یہاں سے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "اور تمھارے علاوہ بھی ایک آدمی پکڑا گیا ہے جو ایک ہی تھپڑ کھا کر سب کچھ بتانے پر راضی ہوگیا ہے۔"

اسی اثنا میں چار اور پولیس والے رائفلیں اٹھائے دھب دھب کرتے اندر آگئے اور تھکے تھکے سے لہجے میں محمد شاہ کو رپورٹ دیتے ہوئے بولے۔ "سر! وہ پہاڑیوں کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہوگئے۔ اُدھر ان کا تعاقب بےکار تھا اس لیے ہم واپس آگئے۔"

"اچھا کیا۔" محمد شاہ بولا۔ "گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ ترپ کے پتے ہمارے ہاتھ لگ گئے ہیں۔" اس نے میری اور گلنار کی طرف اشارہ کیا۔ "کھیل تو اب بھی چوکھا ہی ہوگا۔" پھر وہ ہماری طرف دیکھتے ہوئے ڈپٹ کر بولا۔ "چلو اوئے! بٹر بٹر میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ بڑا ٹیم خراب کر لیا ہے ہمارا۔"

آٹھ رائفلیں اور ایک ریوالور ہماری طرف اٹھا ہوا تھا۔ چلنے کے سوا کوئی چارا نہیں تھا۔ محمد شاہ تو ہماری کسی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ میں نے بےبسی سے کندھے اچکائے اور ہم، ان کے نرغے

میں مکان کے احاطے میں آگئے۔ احاطے میں آگے پیچھے پولیس کی دو جیپیں کھڑی تھیں۔ ایک جیپ میں ہمیں بٹھا کر... ہمارے ساتھ محمد شاہ کے علاوہ تین پولیس والے بیٹھ گئے۔ چوتھا ڈرائیور تھا۔ باقی سپاہی دوسری جیپ میں سوار ہو گئے۔ چند لمحے بعد جیپیں احاطے سے نکلیں اور ایک طرف دوڑنے لگیں۔

خاصی دیر تک ہم نے ویران علاقے ہی میں سفر کیا پھر ایک جگہ گاؤں جیسی مختصر سی آبادی دکھائی دی لیکن ہم دور ہی دور سے گزرتے چلے گئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس علاقے میں سفر کر رہے ہیں۔ شاید لاہور کا نواحی علاقہ تھا۔ بالآخر، ہرے بھرے کھیتوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک بار پھر اجاڑ سے مقام پر پہنچے اور پھر جیپیں ایک نیم شکستہ حویلی نما مکان کے سامنے رک گئیں جس کا گیٹ لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں کا تھا درودیوار پہ جا بجا سیاہ کائی سی جم چکی تھی۔ کسی زمانے میں شاید اس پر زرد رنگ کیا گیا تھا۔ اس قسم کے طویل و عریض اُجاڑ سے مکان عام طور پہ دور افتادہ دیہاتی علاقوں میں سرکاری مقاصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں یا تو اسکول کھول دیا جاتا ہے یا پھر کسی محکمے کے نچلے درجے کے ملازمین کو رہائش کے لیے الاٹ کر دیا جاتا ہے۔ تاہم وہ تھانہ ہرگز نہیں تھا۔

محمد شاہ نے ہمیں جیپ سے اُترنے کا حکم دیا تو میں نے پوچھا: "تم ہمیں کہاں لے آئے ہو؟ یہ تھانہ تو معلوم نہیں ہوتا۔"

"دل چھوٹا نہ کر دکاکا!" محمد شاہ نے طنزیہ انداز میں چمکارا۔ "جہاں چار پولیس والے جمع ہو جائیں، وہی جگہ تھانہ بن جاتی ہے جس طرح تم لوگوں نے جگہ جگہ اپنے اڈے بنائے ہوئے ہیں، اسی طرح ہم بھی تم جیسے بدمعاشوں سے نمٹنے کے لیے ٹھکانے بنا لیتے ہیں۔ ان ٹھکانوں پر آ کر بڑے بڑے سورما، بھیڑ ہو جاتے ہیں اور سب کچھ اُگل دیتے ہیں۔ حرام کا جو مال کھایا ہوتا ہے، وہ بھی... اور دل میں جو کچھ چھپایا ہوتا ہے، وہ بھی۔"

سپاہیوں نے زنگ آلود، سلاخ دار گیٹ کھولا اور ہمیں نرغے میں لیے اندر پہنچے۔ اس حویلی نما مکان میں بھی دہشت و ویرانی کا راج تھا۔ احاطے میں جا بجا خزاں رسیدہ پتے بکھرے ہوئے تھے اور درودیوار نہ جانے کیوں جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ رہی تھی لگتا تھا جیسے یہاں کی ہر اینٹ غیر مرئی آنکھوں سے گھور رہی ہو... اور یہ آنکھیں جانے کیسے کیسے تماشے دیکھ چکی تھیں۔

یہاں مجھے چند اور آدمی بھی اِدھر اُدھر آتے جاتے دیے لیکن وہ وردیوں میں نہیں تھے بلکہ ان میں سے تو کچھ عجیب مجہول اور مخبوط الحواس سا شخص تھا جسے نے لڑکھڑاتے ہوئے ایک طرف کو جاتے دیکھا۔ ا اپنے گرد و پیش سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ ہمیں ا طویل و عریض کمرے میں لے جایا گیا جس کے وسط میں ایک دقیانوسی سی میز اور چند بھاری اور بے ہنگم رکھی تھیں۔ دو سپاہی اس کمرے میں بھی ہمارے آئے اور انھوں نے رائفلیں ہاتھوں ہی میں رکھیں البتہ اپنا ریوالور ہولسٹر میں رکھ چکا تھا۔ اس نے ہمیں کا حکم دیا اور خود میز کے دوسری طرف ہمارے مقابل کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

میں نے ایک نظر گلنار کی طرف دیکھا۔ اس پنکھڑی سے لب خشک تھے اور وہ بار بار ان پر پھیر رہی تھی۔ اس وقت شاید وہ اپنا فلسفہ بالکل چکی تھی کہ ہر حال میں خوش رہنا چاہیے کیونکہ حالا اس سے بھی بدتر ہو سکتے ہیں۔ مجھے درحقیقت اپنی بلکہ اس کی فکر تھی۔ اگر میرے ہوتے ہوئے اس سے کوئی اونچ نیچ ہوتی تو میں اپنے آپ کو منہ دکھانے بھی قابل نہ رہتا۔

"مجھے صرف اتنا بتا دو..." محمد شاہ بیدے میں کھٹ کھٹاتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈا بولا۔ "کہ تم شرافت سے سب کچھ بتاؤ گے یا مجھے ٹیڑھی سے گھی نکالنا پڑے گا؟ اس مکان میں بڑے بڑے کے کس بل نکل چکے ہیں۔ تم تو چیز ہی کچھ نہیں، پتر!" چھڑی زور سے میز پر مار کر بولا۔ "پہلے میں ذرا اس کی رام کہانی سن لوں جو تمھارے ساتھ اس مکان پکڑا گیا ہے۔" اس نے دروازے کی طرف منہ کر زور سے پکارا۔ "غلام رسول!"

دروازے پر کھڑا ہوا سپاہی اندر آ گیا۔ محمد

ذرا اُس پروہنے کو لے کر آؤ جس کا منہ صدقے کی جیسا ہے۔"

غلام رسول نے ایڑیاں بجا کر سیلوٹ کیا اور کمرے باہر چلا گیا۔ محمد شاہ کبھی میری طرف اور کبھی گلنار کی طرف رہا تھا اور ساتھ ہی مونچھوں کو تاؤ دیے جا رہا تھا۔ لمحے بعد غلام رسول ایک مجہول سے آدمی کو بازو سے اندر داخل ہوا۔ بظاہر وہ ڈھیلا ڈھالا سا لگ رہا لیکن اس کی آنکھوں میں مکاری کی چمک تھی۔ مجھے یاد ں نے اس مکان میں اس شخص کی جھلک دیکھی تھی ں سے ہمیں گرفتار کیا گیا تھا۔

"ہاں بھئی نورِ چشم! کیا نام ہے تمھارا؟" محمد شاہ نے سے میز بجاتے ہوئے پوچھا۔

"فضل دین، سرکار!" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

"یونہی سب کچھ بتاؤ گے یا مہمان خانے میں تمھاری خاطر تواضع کرنا پڑے گی؟"

"سرکار میں کمزور سا آدمی ہوں... دل کا مریض ہوں۔" ل دین ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں تو ایک تھپڑ بھی نہیں سہہ لتا، یونہی سب کچھ بتا دوں گا۔" وہ ایک لمحے کے لیے موش ہوا تو محمد شاہ بید میز پر مارتے ہوئے دہاڑا۔ "پھر بولتا کیوں نہیں؟ تیرے سیل ختم گئے ہیں کیا؟ جو بھی تجھے معلوم ہے جلدی سے بک دے۔ میں بار بار نہیں دیا کرتا۔"

"بتاتا ہوں سرکار..." وہ سہم کر ہاتھ جوڑتے ہوئے لا۔ "وہ مکان جس پر آپ نے چھاپہ مارا ہے، سلطان خان ہے اور میں اس کے گروہ کا ایک معمولی کارندہ ہوں... رکار کو تو علم ہی ہے کہ سلطان خان کا گروہ کتنا مضبوط ہے آج کل ہماری کچھ شامت آئی ہوئی ہے سرکار! جس میں ہاتھ ڈالتے ہیں، وہ اُلٹا ہو جاتا ہے... جان ان کے ہر افسر نے آنکھیں پھیر لی ہیں... اُوپر سے سودا کرتے ہیں، وہ غلط ہو جاتا ہے..."

"لگتا ہے کسی نے تم لوگوں پر تعویذ کر دیا ہے..." شاہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"یہی سمجھ لیں سرکار!" فضل دین بولا۔ "بات دراصل ہے کہ سلطان خان کی ایک بہت ہی قیمتی ڈائری گم ہو گئی ہے۔ نہ جانے کن کن لوگوں کے نام اور خفیہ پتے، نقشے اور معلوم نہیں کیا کیا خفیہ معلومات اس ڈائری میں درج تھی۔ یوں سمجھیں کہ وہ ڈائری ہی سلطان خان کی زندگی کا نچوڑ تھی۔ بہت پاپڑ بیلنے کے بعد ہمیں وہ ڈائری ملی تو پتہ چلا کہ اس کے دو حصے کر دیے گئے ہیں اور پہلے حصے میں صرف ایسی معلومات رہ گئی ہیں جو دوسرے حصے کے بغیر بالکل بیکار ہیں۔ کسی نے نہایت چالاکی سے یہ کام کیا تھا۔ ڈائری کا پہلا حصہ تو ہمیں بڑے خون خرابے کے بعد اس شخص کے گھر سے مل گیا تھا۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "لیکن دوسرا حصہ اس نے معلوم نہیں کہاں چھپا دیا ہے۔ اس کے لیے یہ سلطان خان سے سودے بازی کر رہا تھا۔ دس لاکھ روپے مانگ رہا تھا۔ آپ خود سوچیں کہ سلطان خان سے اس کی اپنی ہی چیز کے دس لاکھ روپے مانگنا کوئی شرافت کی بات تو نہیں ہے نا..."

میں خاموش بیٹھا اس شخص کی باتیں سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ کس صفائی سے جھوٹ بولتے ہیں۔

فضل دین بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ شخص اسی سلسلے میں سودے بازی کے لیے آیا ہوا تھا کہ مکان پر چھاپہ پڑ گیا۔ بس مجھے اتنا ہی معلوم ہے۔ میں چونکہ ایک کمزور سا آدمی ہوں اس لیے گروہ کے عملی معاملات میں مجھے کم ہی شریک کیا جاتا تھا۔ میرے ذمے آسان سے کام تھے بہرحال، سلطان خان مجھ پر اعتماد کرتا تھا اس لیے اس قسم کی باتیں میرے علم میں رہتی تھیں۔"

محمد شاہ نے فاتحانہ نظروں سے دیکھا جیسے کوئی قلعہ سر کر لیا ہو پھر وہ مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ "ہاں تو پتّو! اب کیا خیال ہے؟"

"مجھے جو کچھ کہنا تھا، میں کہہ چکا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "ان لوگوں نے معلوم نہیں کس ڈائری کے چکر میں میری زندگی حرام کر رکھی ہے۔ اس مکان میں بھی انھوں نے اسی مقصد سے ہمیں قید کر رکھا تھا، میں کسی طرح تسلیم کر لوں کہ ڈائری میرے پاس ہے۔"

"صدقے جاؤں!" محمد شاہ انتہائی طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اس طریقے سے تو مجھے بھی مہینے دو مہینے کے لیے قید کرا دو کہ قریب ہی دلبر جانی بھی موجود ہو، دروازہ بھی کھلا ہوا اور میز پر کھانا بھی سجا ہوا ہو۔ اگر اسے قید میں رہنا کہتے ہیں

تو پھر پتہ نہیں آزاد رہنا کیسے کہتے ہوں گے۔"

میں خاموش رہا۔ اس شخص کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرنا فضول تھا۔ وہ کوئی بات تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں تھا۔

"تمھاری خوش قسمتی ہے کہ ابھی تک میری پھرکی نہیں گھومی۔" محمد شاہ نے انگلی سے اپنی کنپٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن اگر تم اسی طرح اپنی کہانی پر اڑے رہے تو پھرکی گھوم جائے گی۔ فی الحال میں تمھیں سوچنے کی مہلت دیتا ہوں۔" اس نے ایک بار پھر پکارا۔ "غلام رسول!"

"جی صاحب!" غلام رسول مستعدی سے اندر آیا تو محمد شاہ بولا۔ "ان دونوں کو چار جوانوں کی نگرانی میں، مہمان خانے میں پہنچاؤ۔ زبردست احتیاط رکھنا۔ آدمی خطرناک ہے۔"

غلام رسول نے ہانک لگائی اور چار باوردی سپاہی رائفلیں سنبھالے اندر آ گئے۔ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا۔ عقل کچھ خبط سی ہو گئی تھی۔ اگر گلنار ساتھ نہ ہوتی تو شاید میں حرکت میں آ جاتا لیکن اس کی موجودگی نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ اس عالم میں جب کہ چار رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں، اگر میں ہنگامہ شروع کر دیتا تو وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پانچوں سپاہیوں کے نرغے میں ہم ایک راہداری میں پہنچے جہاں دونوں طرف چند ایسی ہی کوٹھریاں نظر آ رہی تھیں جیسی حوالات کی ہوتی ہیں۔ حوالات ہی کی طرح ان میں فرش پر، خشک گھاس پھونس بچھا ہوا تھا اور ہر کوٹھری میں ایک ایک کمبل بھی پڑا تھا۔

انھوں نے ہمیں دو الگ الگ کوٹھریوں میں دھکیل دیا اور دروازوں پر بھاری تالے لگا دیے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ انھوں نے ہمیں آمنے سامنے کی کوٹھریوں میں بند کیا تھا۔ کم از کم ایک دوسرے کے حال سے تو باخبر رہ سکتے تھے۔

راہداری اب سنسان پڑی تھی۔ چند لمحے تک ہم سلاخیں تھامے خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر گلنار ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "اب کیا ہوگا جمال؟"

"فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا۔ "حالات اس سے بھی بدتر ہو سکتے تھے۔ وہ ہمیں کوٹھریوں کی بجائے صندوقوں میں بھی بند کر سکتے تھے۔ ہے نا؟"

"مذاق مت اڑاؤ۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ لگ[illegible] وہ اپنے سارے مقولے وغیرہ بھول چکی تھی اور تھک بھی چکی تھی کیونکہ وہ گھاس پھونس پر آلتی[illegible] کر بیٹھ گئی تھی۔ "معلوم ہوتا ہے اس دفعہ تو لمبے ہو گئے ہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "نہ جانے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ کوئی پُرسانِ حال نہ[illegible] ... کسی سے رابطہ قائم کرنے کا بھی ذریعہ نہیں ہے۔"

"اعصاب جواب دے گئے ہیں کیا؟" میں نے [illegible] کر پوچھا۔

"نہیں۔ اپنی بے بسی پر غصہ آ رہا ہے۔" وہ منہ[illegible] بھینچتے ہوئے بولی۔

اس دوران راہداری میں جوتوں کی ٹھک ٹھک[illegible] سنائی دی پھر محمد شاہ بید گھماتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ [illegible] کوٹھریوں کے سامنے پہنچ کر وہ فرعونیت بھرے [illegible] میں تن کر کھڑا ہو گیا اور بید آہستگی سے اپنی ہی [illegible] پر مارتے ہوئے بولا۔ "دو تین دن بھوک پیاس سے بن[illegible] گے تو آدھا دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔ اس کے بعد تم[illegible] اُلٹا لٹکا کر تھوڑی سی چیر پھاڑ کریں گے تو باقی آد[illegible] دماغ بھی ٹھکانے آ جائے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر تم چاہتے کیا ہو[illegible]" نے اب بھی تحمل سے کام لینے کی کوشش کی حالانکہ [illegible] کھوپڑی میں الاؤ سا دہک رہا تھا۔

"بھولے بادشاہ! میں تمھیں سلیس اُردو میں سمجھ[illegible] ہوں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔" وہ ایک طویل سانس [illegible] بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم وہ ڈائری میرے حوالے کر[illegible] تاکہ میں اس کی مدد سے اس گروہ کا قلع قمع کر سکوں۔ [illegible] بڑا گروہ ہے... اگر میں اس کا خاتمہ کرنے میں کامیا[illegible] گیا تو پورے ملک میں دھوم مچ جائے گی میری۔ [illegible] ملیں گے، اخباروں میں تصویریں چھپیں گی۔ تم اندا[illegible] کر سکتے کہ یہ معاملہ میرے لیے کتنا اہم ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میرا ذہن اب کسی اور ہی [illegible] چل نکلا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "فضل دین کی [illegible] سے تمھاری پوزیشن کم از کم اس حد تک تو صاف [illegible] ہے کہ سلطان خان کے گروہ سے تمھارا کوئی تعلق نہیں۔ تمھیں اسی پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے ورنہ پہلے تو میں گروہ کے آدمیوں کا پتہ پوچھتے پوچھتے تمھاری چمڑی اتار دیتا۔" ... پھر اس نے گویا اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔ "اب تمھارے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ڈائری کا وہ جو دوسرا حصہ تمھارے پاس ہے، وہ میرے حوالے کر کے اپنی جان چھڑاؤ۔ تم نے اپنے ساتھ خواہ مخواہ اس بے چاری خاتون کو بھی مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔"

"اگر تمھیں ڈائری کا وہ دوسرا حصہ مل جائے تو وہ تمھارے لیے بے کار ہی ہوگا۔" میں نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بات اب میری سمجھ میں آ گئی ہے اور میں ہتھیار ڈالنے پر بتدریج آمادہ ہو رہا ہوں۔

"بے کار کیوں، برخوردار؟" اس نے پوچھا۔

"پہلے حصے کے بغیر وہ تمھارے کس کام کا؟ وہ دونوں حصے ایک دوسرے کے بغیر بے کار ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور پہلا حصہ غالباً سلطان یا اس کے آدمیوں کے قبضے میں ہے۔"

"وہ تو میرے ہاتھ آ ہی جائے گا۔" اس نے وثوق سے کہا۔ "یہ چور، اُچکے، بدمعاش اور اسمگلر وغیرہ پولیس سے کتنا ہی بھاگیں لیکن ایک نہ ایک روز ہمارے شکنجے میں آ ہی جاتے ہیں اور پھر ان کا وہی حشر ہوتا ہے جو بیلنے میں گنے کا ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے حصے کی فکر نہ کرو۔ اسے حاصل کرنا میرا کام ہے۔ دوسرے حصے کی بات کرو جو تمھارے قبضے میں ہے۔"

"اور اگر میں وہ حصہ تمھارے حوالے کرنے سے انکار کر دوں؟" میں نے گویا سودے بازی کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر کاکا جی اپنی طرف سے صبر ہی کر لو۔" وہ بید گویا کسی غیر مرئی چیز کو رسید کرتے ہوئے بولا۔ "اس ویرانے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بھوکے پیاسے مر جاؤ گے اور تمھاری اس جل پری کا اس سے بھی زیادہ برا حشر ہوگا جو کٹی پتنگ کا ہوتا ہے۔ کوئی تمھارا حال دیکھنے نہیں آئے گا۔ کسی کو تمھارے انجام کا پتہ ہی نہیں چلے گا... اِدھر تو ہمارے افسر بھی برسوں معائنے کے لیے نہیں آتے۔"

میں نے کچھ اس قسم کی اداکاری کی جیسے کشمکش میں مبتلا ہوں۔ بالآخر میں نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے... ہمیں رہا کر دو، میں ڈائری تمھارے حوالے کر دوں گا۔"

"ایسے نہیں کاکا!" وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔ "میں نے اتنی عمر کوئی گلی ڈنڈا کھیلنے میں نہیں گنوائی ہے۔ تم سے کم از کم دس سال بڑا ہوں... اور پولیس والا ہوں۔ میں نے طوطے نہیں پڑھائے... بندے پڑھائے ہیں... کیا سمجھے؟"

"تو پھر کیا طریقہ ہوگا؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"طریقہ یہ ہوگا، تم مجھے بتاؤ گے کہ ڈائری کہاں چھپائی ہے۔ میرے آدمی جائیں گے اور ڈائری نکال لائیں گے۔ ڈائری کا جائزہ لینے کے بعد میں تمھیں رہا کر دوں گا۔" وہ بولا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو گے؟" میں نے کہا۔

"او ئے ہوئے..." وہ سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولا۔ "یہ اچھی رہی کہ تم ہم سے ضمانت مانگ رہے ہو... کاکا! ضمانتیں طلب کرنا ہمارا کام ہے۔ ہم ملزموں کو ضمانت پر رہا کرتے ہیں۔ ہماری ضمانت تو یہ وردی ہے۔" اس نے چٹکی سے اپنی قمیص پکڑ کر ذرا سی کھینچی۔

"ٹھیک ہے۔" بالآخر میں نے مُردہ سی آواز میں کہا۔ "میں بتاتا ہوں۔ ڈائری میں نے اپنے مزنگ والے مکان میں، دو چھتی پر پڑے ہوئے ایک ٹوٹے پھوٹے ناکارہ ہیٹر میں چھپائی ہوئی ہے۔"

"صحیح طرح ایڈریس وغیرہ لکھواؤ۔" محمد شاہ نے فوراً جیب سے نوٹ بک اور پنسل نکال لی۔ میں نے اطمینان سے اسے مزنگ والے مکان کا پتہ لکھوا دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں میرا قبضہ اب بھی برقرار ہے یا مالکِ مکان نے میری پُراسرار گمشدگی سے تنگ آ کر میرا سامان نکال پھینکا ہوگا۔

"مکان پر تالا لگا ہوا ہے اور چابی مجھ سے کھو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر تم لوگوں کے لیے تو ظاہر ہے یہ کوئی بات نہیں، وارنٹ لے کر بھی تالا توڑ سکتے ہیں... بلکہ اس تکلف کی بھی کیا ضرورت ہے۔"

وہ ڈائری کے بارے میں انتہائی پُراشتیاق معلوم ہوتا تھا۔ میری بات کا جواب دیے بغیر کھٹ کھٹ کرتا ہوا

تیزی سے واپس چلا گیا اور راہداری میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔

"یہ تم نے کیا کہا؟" گلنار بولی "کیا واقعی تمہارے پاس ڈائری ہے؟"

"ڈائری؟ میرے پاس ایک ورق بھی نہیں ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا "میں تو اس بدبخت سے جان چھڑانا چاہتا تھا تاکہ سکون سے کچھ سوچ سکوں۔"

"کاش سوچنے سے یہ موٹے موٹے تالے کھل سکتے۔" گلنار ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

"سوچنے سے کوٹھریوں کے نہ سہی، دماغ کے تالے تو کھل ہی جاتے ہیں۔" میں نے کہا اور کوٹھری میں ٹہلنے لگا، بشرطیکہ اسے ٹہلنا کہا جا سکتا کیونکہ میں دو قدم دائیں طرف چلا تو کوٹھری ختم ہو گئی، دو قدم بائیں طرف چلا تو دوسری دیوار سامنے آ گئی۔ کوٹھری میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ دیواریں سال خوردہ تھیں مگر ایسی بھی نہیں کہ کوئی انھیں خالی ہاتھوں توڑ کر ہی نکل جاتا۔ گویا ہم قطعی طور پر صیاد کے قابو میں تھے۔

چاروں طرف سناٹا چھا چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ مکان میں کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ شاید وہاں موجود تمام پولیس والے میرے گھر سے ڈائری برآمد کرنے چل دیے تھے جس کا وہاں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب مجھے کم از کم رات گئے تک تو ان سے نجات مل گئی ہے اور اب میں اطمینان سے سوچ سکتا ہوں۔

چند لمحے بعد کچھ فاصلے سے ایک عجیب لیکن دردناک سی آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بکرا غذائی قلت کا شکار ہو کر آسمان کی طرف منہ اٹھائے فریاد کر رہا ہے۔ لیکن غور سے سننے پر میری سمجھ میں آیا کہ کوئی گانے کی کوشش کر رہا ہے "نظر ملا کے کوئی لے گیا قرار مرا..."

پھر وہ شخص جھومتا اور لڑکھڑاتا ہوا راہداری میں آتا دکھائی دیا جس کا قرار کوئی نظر ملا کے لے گیا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے اس وقت بھی دیکھا تھا جب میں پولیس کے نرغے میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات بتا رہی تھیں کہ وہ کوئی نشے باز ہے۔ نیم وا آنکھیں، بکھرے بال، بڑھی ہوئی شیو، میلے کچیلے کپڑے اور لڑکھڑاتے قدم ظاہر کر رہے تھے کہ اس وقت بھی وہ زمین اور آسمان کے درمیان کہیں معلق ہے۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے [illegible] رہے تھے مگر بہرحال گانے کا شغل جاری رہا۔

ہماری کوٹھریوں کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نغمہ سرائی یا یوں کہیے کہ ہما[illegible] سمع خراشی بھی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ پہلے اس [illegible] آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھا پھر گردن موڑ کر گلنار کو [illegible] لیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر یکلخت وہ بھونڈے انداز میں ہنسنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اس طویل و عریض مکان [illegible] اس کے سوا کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ میں نے اشار[illegible] سے اسے قریب بلایا۔ وہ قریب تو نہیں آیا البتہ اس [illegible] ہنسی کو بریک لگ گیا اور وہ بڑی دانشورانہ سنجیدگی [illegible] مجھے گھورنے لگا۔

"بھائی جان... آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے [illegible] مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"اسلم۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ تاہم آواز اب [illegible] خمار سے لڑکھڑا رہی تھی اور زبان میں شاید نشے ہی [illegible] سے ہلکی سی تتلاہٹ بھی تھی۔

"اسلم بھائی! کیا اس وقت اس مکان میں آپ کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے؟" میں نے بدستور مؤدبانہ [illegible] اپنائے رکھا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ان تالوں کی چابیاں کس کے پاس ہوتی ہیں؟" [illegible] نے اپنی اور گلنار کی کوٹھریوں کے تالوں کی طرف اشا[illegible] کرتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی کے پاس۔" وہ نشیلی آواز میں بولا "لیکن [illegible] کبھی یہاں بھی موجود ہوتا ہے۔"

"اگر تم وہ چابیاں لے آؤ تو میں تمھیں یہ سونے [illegible] انگوٹھی دے سکتا ہوں۔" میں نے اسے اپنی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی دکھائی۔

"اور میں تمھیں یہ سونے کے کنگن دے دوں گی... [illegible] قیمتی ہیں... عیش ہو جائیں گے تمھارے... خدا کے [illegible] ہمیں وہ کنجیاں لا دو۔" گلنار نے باقاعدہ گڑگڑانا شروع کر[illegible]

نشے باز نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا اور [illegible] توقف کے بعد پھر ہنسی کرنے لگا۔ جب اس کی یہ خا[illegible]

سی ہنسی تھمی تو وہ مخمور لہجے میں بولا "تم دونوں مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہو... مگر میں بے وقوف نہیں ہوں۔ تم چاہتے ہو کہ میں چابی تمھیں لا دوں اور شاہ جی واپس آ کر میری آنتیں نکال دیں۔ تم نہیں جانتے کہ وہ آدمی کو ایک منٹ میں یوں چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں جیسے قصائی بکرے کو۔ تم نے مجھے قربانی کا بکرا سمجھا ہے؟" ایک بار پھر اس کی وہی بے آواز سی ہنسی شروع ہو گئی۔

بدبخت تھا تو نشے میں لیکن اس نے بات ہوشمندوں والی ہی کی تھی۔ ذہن میں بیٹھی ہوئی زبردست قسم کی دہشت شاید انسان کو نشے میں بھی اس حد تک باہوش ضرور رکھتی ہے کہ وہ جان بچانے کی فکر کر سکے۔ اس نے محمد شاہ کے متعلق جو بات کی تھی، اس نے مجھے تھوڑا سا چونکا دیا۔ کیا وہ واقعی انسانوں کو اس طرح چیر پھاڑ دیتا تھا جیسے بکرے کو قصائی؟ کیا کوئی پولیس افسر اتنا ظالم ہو سکتا ہے اور اگر وہ تشدد اور بربریت میں اتنا آگے جا سکتا ہے تو اپنے افعال پر پردہ کیسے ڈالتا ہوگا؟ "ایک پولیس افسر کو اتنا ظالم تو نہیں ہونا چاہیے۔" آخر میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"پولیس افسر...؟" نشے باز نے دہرایا، پھر اس کی ہنسی بھی کچھ تیز ہو گئی۔ ہنسی رکی تو وہ قدرے جھومتے ہوئے بولا "تو تم بھی بے وقوف بن گئے؟ تمھارا کوئی قصور نہیں۔ پولیس کی وردی پہن کر وہ پولیس کی ایکٹنگ اتنی شاندار کرتا ہے کہ اگر فلموں میں کرتا تو اسے ایوارڈ ملتا۔"

"کیا مطلب...؟" مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میں نے دیکھا کہ گلنار کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ "تو وہ پولیس انسپکٹر نہیں ہے؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اس کی تو سات پشتوں میں بھی کوئی پولیس انسپکٹر نہیں گزرا۔" اسلم بازو لہراتے ہوئے بولا۔

"اور وہ باقی پولیس افسر بھی..."

"نشہ میں نے کیا ہے، عقل تمھاری خبط ہو گئی ہے۔ بھلے مانس! ذرا سوچو کیا اصلی پولیس والے کسی نقلی آفیسر کے ماتحت ہو سکتے ہیں؟"

ایک لمحے کے لیے تو میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ اس انکشاف نے واقعی میری پشیمانی بڑھا دی تھی۔ میں جو اتنی آسانی سے ان کے قابو میں آ گیا تھا، اس میں جہاں دیگر کئی عوامل کارفرما تھے، وہاں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں انھیں قانون کے محافظ سمجھتے ہوئے ان سے بے دھڑک الجھ جانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا رہا تھا۔

اس منحوس ڈائری کے لیے ان نامعلوم لوگوں کی یہ تگ و دو ناقابلِ یقین تھی۔ میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ محمد شاہ، سلطان خان ہی کا آدمی ہے یا اس کے مخالف گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا پھر وہ بذاتِ خود ایک تیسری پارٹی ہے۔ اس کی حیثیت خواہ کچھ ہی رہی ہو لیکن جس طرح اس نے پولیس آفیسر کا روپ دھارا تھا اور جس طرح اس مکان پر چھاپے کا ڈھونگ رچایا تھا، وہ حیرت انگیز تھا۔ غالباً ان لوگوں نے سوچا ہوگا کہ مجھ سے اور تو کسی طریقے سے ڈائری حاصل کر نہیں سکے لہٰذا شاید میں اپنے آپ کو قانون کی گرفت میں پا کر یا جذبۂ فرض شناسی سے مغلوب ہو جاؤں گا۔ ان سب نامعلوم ناہنجاروں کو ابھی تک یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ میں صرف ایک وجہ کی بنا پر ڈائری ان کے حوالے نہیں کر پا رہا تھا اور وجہ یہ تھی کہ ڈائری میرے پاس موجود ہی نہیں تھی۔ ... مگر معلوم نہیں کیوں، کوئی بھی شخص کسی بھی مرحلے پر میری یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اگر میں شروع ہی میں غور کرتا تو شاید مجھے محمد شاہ کی حیثیت اور اس کی کارروائی پر شبہ ہو جاتا، کیونکہ اس نے مکان سے ڈھیروں منشیات ہاتھ آنے کا ذکر کیا تھا جب کہ میں نے ان کے قبضے میں ایسی کوئی شے نہیں دیکھی تھی۔ دوسرے اس مکان پر چھاپے کے دوران فائرنگ کے انداز سے یہ ظاہر ہوا تھا جیسے بڑے منظم طریقے سے مکان کو گھیرا گیا ہو مگر عجیب بات تھی کہ ایک آدمی کے سوا سبھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے اور کوئی زخمی بھی نہیں ہوا تھا۔ بہرحال... اب میں جو چاہے سوچتا لیکن محمد شاہ کا بہروپ اور کارروائی اچھے بھلوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کافی تھی۔ اپنی حالت پر افسوس کرنا ویسے تو ان دنوں میرا مشغلہ تھا لیکن اس وقت تو یہ تاسف کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ میں بھی گلنار کی طرح تھکے تھکے سے انداز میں گھاس پھونس پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

نشے باز نے بھی گویا ہماری تقلید کی اور راہداری

میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ اور ایک پڑیا نکالی۔ اس کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش تھی مگر پڑیا اس نے پوری احتیاط سے کھولی گویا یہی اس کی متاعِ حیات ہو۔ اس میں چٹکی بھر سفید سا پاؤڈر تھا۔ اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبائی اور اس کا دوسرا سرا پاؤڈر کے قریب لا کر زور سے سانس کھینچی۔ وہ چٹکی بھر پاؤڈر سگریٹ میں جذب ہو گیا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور ایک طویل کش لے کر مسرور انداز میں ہماری طرف دیکھا اور ایک بار پھر تان بلند کی "! نظر ملا کے کوئی لے گیا قرار مرا۔۔۔"

دو تین کش لینے۔۔۔ اور دو تین دفعہ اس مصرعے سے کشتی لڑنے کے بعد وہ اُٹھا اور جھومتا ہوا آگے چل دیا۔ وہ نظر سے اوجھل ہو گیا تو میں نے گلنار کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر کندھے اچکا دیے۔

"مجھے تو شبہ ہو رہا ہے کہ یہ نشے باز بھی جعلی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟" گلنار نے پوچھا۔

"بظاہر تو یہ ہیروئن پی رہا تھا اور غالباً پہلے بھی پی رکھی تھی لیکن اس کا انداز شرابیوں جیسا تھا۔" میں نے کہا۔ "میری معلومات کے مطابق تو ہیروئن کا عادی شخص نشہ کرنے کے بعد زیادہ پُرسکون اور ہوشمند نظر آنے لگتا ہے۔ صرف آنکھیں چڑھی چڑھی سی ہوتی ہیں اور چہرے پر ایک غیر فطری چمک آجاتی ہے۔ ایسا شخص نشہ نہ ملنے پر زیادہ الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے اور تکلیف میں مبتلا نظر آتا ہے۔"

"بس رہنے دو اپنی معلومات۔" وہ مسکرائی۔ "تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے بہت بڑے ماہرِ منشیات ہو۔ لیکن مخصوص شخص پر کسی مخصوص دور میں نشے کے اثرات مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ میں واقعی اس سلسلے میں حتمی انداز سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ نشے باز کی اس بات کا بہرحال مجھے یقین آچکا تھا کہ محمد شاہ اور اس کے ساتھی نقلی پولیس والے ہیں۔ گلنار سے مزید آدھ پون گھنٹہ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بے مقصد، بے فائدہ باتیں۔۔۔ یہ محض اپنے آپ کو الجھائے رکھنے کا بہانہ تھا۔ اس

اثنا میں خاصے فاصلے پر کہیں گاڑی رُکنے کی آواز سُ[نائی] دی۔ پھر کچھ ملی جلی سی آوازیں سُنائی دینے لگیں[،] تمام لوگ واپس آگئے ہوں۔

چند لمحے بعد راہداری میں بھاری قدموں کی آ[واز] سُنائی دینے لگیں۔ پھر میں نے شاہ محمد کو آتے د[یکھا]۔ پانچ چھ سپاہی اس کے پیچھے تھے۔ محمد شاہ اس وقت اسپین کے کسی اکھاڑے کا وہ سانڈ معلوم ہو [رہا] تھا جس نے سُرخ کپڑا دیکھ لیا ہو۔ اس کا چہرہ سُر[خ] اور وہ گویا پھنکارتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ میں [...] ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ محمد شاہ کے تاثرات بتا رہے [تھے] کہ وہ لوگ مکان کی تلاشی لے کر آئے ہیں اور ڈا[...] انھیں نہیں ملی۔ ظاہر ہے، وہ وہاں ہوتی تو انھیں [...]

محمد شاہ میری کوٹھری کے سامنے پہنچ کر [...] جھٹکے سے رُکا اور زہریلے لہجے میں بولا۔ "ان حالا[ت] میں بھی تم نے جھوٹ بولنے کی جرأت کر لی۔۔۔ میری س[مجھ میں] نہیں آرہا کہ تمھیں اپنے بارے میں حد سے زیاد[ہ ...] ہے یا پھر تم حد سے زیادہ بے وقوف ہو۔"

"کیا ہوا؟" میں نے انجان بننے کی کوشش [کی]۔

"اس گھر میں ڈائری یا بجلی کا ناکارہ ہیٹر تو کیا [...] سے کوئی دوچھتی ہی نہیں ہے۔" وہ چیخا۔ "اور تم بڑے معصوم بن کر مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ کیا ہوا [...] اپنی دانست میں شاید مذاق کیا ہو۔ لیکن میں تمھ[یں بتاؤں] گا کہ ایسے مذاق کتنے مہنگے پڑتے ہیں۔"

اس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا اور وہ چ[...] چابیوں کا گچھا نکال کر میری کوٹھری کا تالا کھو[لنے لگا]۔ درحقیقت مجھے امید نہیں تھی کہ یہ لوگ میرے [بتائے] ہوئے ایڈریس پر پہنچ کر، تلاشی لینے کے بعد [اتنی جلدی] واپس آجائیں گے، ورنہ میں اس قسم کی حماقت نہ کرتا۔ میں نے تو اپنی دانست میں ایک آدھ [دن کی] مہلت حاصل کر لی تھی۔ مگر اب یقیناً اس کوش[ش کے] نتیجے میں میری شامت ہی آنے والی تھی۔

دروازہ کھُلا تو محمد شاہ بید ہوا میں لہرا[تے ہوئے] بولا۔ "باہر آؤ۔"

"تم اندر آجاؤ تو بہتر ہے۔" میں اپنی جگہ [...] محمد شاہ نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا [...]

پہلا تا مل فائر کر دیا۔ گولی میرے سر سے بمشکل دو انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔

"دوسری گولی ذرا نیچی آئے گی۔" محمد شاہ بولا۔ "اور کھیل ختم ہو جائے گا۔"

میں نے ایک جھُرجھُری سی لی اور باہر آگیا۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی طرح میں محمد شاہ کو ڈھال بنانے کی کوشش کروں۔ میرے باہر آتے ہی اس نے بید گھمایا اور میرے کندھے پر رسید کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بید ہوا ہی میں پکڑ لیا اور اسے زوردار جھٹکا دیا لیکن محمد شاہ ان معاملات میں اناڑی نہیں تھا۔ اس نے فوراً ہی بید چھوڑ دیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ اس نے مجھے ٹھوکر رسید کرنے کے لیے لات چلائی لیکن میں نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ دوسرے ہی لمحے وہ کمر کے بل گرا اور میں نے اسے اپنی طرف کھینچ کر ایک ٹھوکر ماری۔ وہ ڈکرایا اور اُٹھنے کے لیے مچلا لیکن اُٹھ نہ سکا۔ اس دوران میں ایک سپاہی نے اپنی رائفل لٹھ کی طرح استعمال کرتے ہوئے مجھے اس کا کندا مارنے کی کوشش کی لیکن میں شاہ محمد کی ٹانگ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور کندا قریب کھڑے ہوئے دوسرے سپاہی کے منہ پر پڑا جو چیخ مار کر گرا تو رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

میں رائفل اُٹھانے کے لیے جھپٹا لیکن کسی کی ٹھوکر میری پسلیوں پر پڑی۔ میں اس چوٹ کو تو خاطر میں نہیں لایا لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ میرا ہاتھ رائفل پر نہ پڑ سکا اور کسی نے ٹھوکر مار کر اسے آگے کھسکا دیا۔ اس دوران محمد شاہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا بھاری تن و توش کے باوجود وہ کافی پھُرتیلا تھا۔ وہ کسی ریچھ مانس کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ مجھے اُٹھا کر فرش پر پٹخ دینے کی فکر میں تھا لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کی کھوپڑی پر پوری قوت سے کہنی آزما ڈالی۔ اس طرح میں اس کی گرفت سے تو آزاد ہو گیا لیکن اس دوران کوئی میری کھوپڑی پر رائفل کا کُندا مارنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری آنکھوں میں پھر ایک بار پھر تاروں بھری رات اتر آئی۔ آخری چیز جو میں نے سُنی وہ گلنار کی چیخ تھی۔ میں نے یہ الفاظ بھی سُنے۔ "لڑنا ہے تو مردوں کی طرح لڑو۔۔۔" اس کے بعد میں کچھ نہ سُن سکا اور نہ کچھ دیکھ سکا۔

اس بار میری آنکھ کھُلی تو میری حالت پہلے کی بہ نسبت کہیں خستہ تھی۔ سر پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا اور رگ رگ میں ٹیسیں بھری ہوئی تھیں۔ شاید ان لوگوں نے میرے بے ہوش ہونے کے بعد بھی مجھ پر غصہ نکالا تھا اور خوب ٹھوکریں رسید کی تھیں۔ بمشکل میں نے اپنی توانائی مجتمع کی اور اُٹھ بیٹھا۔ تب مجھے احساس ہُوا کہ میں ایک بار پھر اسی کوٹھری میں مقید ہوں۔ میں نے اضطراری طور پر سامنے دیکھا۔ گلنار اپنی کوٹھری میں نہیں تھی۔ اس کی کوٹھری کا سلاخ دار دروازہ کھُلا ہوا تھا۔ کوٹھری کے قریب ہی وہ نشے باز دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا جس سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ لوگ گلنار کو کہاں لے گئے ہیں؟ یہ سوال ذہن میں آتے ہی میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر اندھیرا سا چھانے لگا۔ مکان پر پھر وہی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جیسے وہاں میرے اور اس نشے باز کے علاوہ کوئی اور موجود ہی نہ ہو۔

"بھائی اسلم۔۔۔ میری بات سنو۔" میں نے اپنے لہجے میں دُنیا بھر کی التجائیں ہوتے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"کیا بات ہے؟" وہ وہیں بیٹھے بیٹھے بے نیازی سے بولا۔

"کیا اس وقت مکان میں کوئی اور نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے مخمور لہجے میں جواب دیا۔

"کہاں گئے سب لوگ؟" میں نے پوچھا۔

"بُلاوا آگیا تھا۔" اس نے مبہم سا جواب دیا۔

"کس کا بُلاوا؟ کہاں سے آیا تھا بُلاوا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"کیا وہ اس لڑکی کو بھی ساتھ لے گئے۔۔۔ جو۔۔۔ جو اس کوٹھری میں بند تھی؟" سامنے والی کوٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ گیا اور زبان لڑکھڑا

گئی۔ میں منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
"ہاں وہ اسے بھی لے گئے۔" اس نے یوں ہاتھ ہلا کر کہا جیسے کان کے قریب سے مکھی اُڑا رہا ہو۔
"اسلم میرے بھائی!۔۔!" میں نے انتہائی محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم بتا رہے تھے کہ ان کوٹھڑیوں کی چابیاں اس مکان میں بھی کہیں رکھی ہیں۔ اگر تم وہ چابیاں لے آؤ اور میری کوٹھڑی کا تالا کھول دو تو میں، تمھیں بہت سی دولت دوں گا۔"
"دولت۔۔۔" وہ ہنس پڑا جیسے میں نے کوئی بہت ہی ناسمجھی کی بات کہہ دی ہو۔ "دولت میرے کس کام کی۔ میں نے تالا کھولا تو محمد شاہ آکر میرا پیٹ چاک کر دے گا۔ وہ کئی آدمیوں کا پیٹ پھاڑ چکا ہے۔"
"وہ اب نہیں آئے گا۔ وہ واپس نہیں آئے گا۔۔" میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔
"وہ ضرور آئے گا۔ وہ نہیں آئے گا تو مجھے پُڑیا کون دے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔" اس کی آواز بڑبڑاہٹ میں ڈھل گئی اور پھر یکدم ہی وہ اُٹھا اور ایک طرف چل دیا۔ میں اسے آوازیں دیتا رہا مگر اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ نظر سے اوجھل ہو گیا تب بھی میں اسے پکارتا ہی رہا۔ چند لمحے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں اس سناٹے میں بلاوجہ پاگلوں کی طرح اپنا گلا پھاڑ رہا ہوں۔ بالآخر میں چپ ہو کر بیٹھ رہا۔
جانے کتنی دیر تک میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تقدیر کے ہاتھوں کھلونا تو ہر شخص ہوتا ہے لیکن میں اس قدر حقیر قسم کا کھلونا کیوں بنا ہوا ہوں۔ اور یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا؟ کیا یونہی ایک الجھن سے دوسری الجھن اور ایک مصیبت سے دوسری مصیبت کی طرف سفر کرتے کرتے زندگی تمام ہو جائے گی۔
میں دیر تک اپنی جگہ ملول و افسردہ بیٹھا رہا، پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس طرح کوئی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ میں نے دل ہی دل ربِ ذوالجلال کو یاد کیا اور بزبانِ خموشی لیکن نہایت ہی خشوع و خضوع سے دُعا مانگی۔ تب میرے دل کو جیسے قرار سا آگیا۔ سب چیزیں بے معنی اور سب مصائب حقیر لگنے لگے۔
میں اسی طرح بیٹھا تھا کہ وہی نشے باز آتا دکھائی دیا مگر اس بار جیسے وہ ٹھوکریں کھاتا ہوا چل رہا تھا! اس کا یہ انداز شرابیوں کی طرح جھومنے سے بہت مخ
تھا۔ میری کوٹھڑی کے قریب پہنچ کر تو وہ گر ہی پڑا
کے ہاتھ پاؤں تشنجی سے انداز میں مُڑے جا رہے
اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ مجھے گمان ہوا کہ شاید
نے کوئی زہریلی چیز کھالی ہے۔ مجھے اس پہ رحم آنے
"اسلم۔۔۔ اسلم۔۔۔! کیا ہوا تمھیں؟" میں نے پوچ
اس نے کوئی جواب نہ دیا بس فرش پہ پڑا بل
رہا۔ پھر میں نے اس کی بڑبڑاہٹ سُنی۔ "محمد شاہ کب
آئے گا۔۔۔؟ پُڑیا کب لائے گا۔۔۔؟"
تب مجھے احساس ہوا کہ نشہ میسر نہ ہونے پر
یہ کیفیت ہو رہی ہے اور اس کے اعصاب کسی نا
شکنجے میں کھنچے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک
خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپ
کوٹھڑی میں دو چار کاغذ کے پُرزے بھی بکھ
ہوئے تھے۔ میں نے ایک چھوٹا سا کاغذ اُٹھا کر اس
کی ایک پُڑیا بنائی اور ایک بار پھر اسلم کو پکارا۔ "اسلم
یہ لو۔۔۔ میں تمھیں پُڑیا دیتا ہوں۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔"
پُڑیا کا نام سُنتے ہی وہ میری طرف متوجہ ہو گیا
نے سلاخوں سے ہاتھ نکال کر پُڑیا اُسے دکھائی تو وہ
نہ کسی طرح اُٹھ کھڑا ہوا اور گرتا پڑتا میری طرف لپکا
جب وہ قریب پہنچا تو میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔
"یہ پُڑیا میں تمھیں ایسے ہی نہیں دُوں گا۔"
نے چیخ کر کہا تا کہ وہ میری بات سمجھ سکے۔ "تم نے ک
نا کہ چابیوں کا ایک گچھا اس مکان میں بھی موجود ر
ہے؟ وہ لے آؤ تو میں یہ پُڑیا تمھیں دے دُوں گا۔۔
جلدی سے لے آؤ، شاباش۔۔۔"
چند لمحے تک وہ للچائی ہوئی نظروں سے پُڑ
دیکھتا رہا، پھر گرتا پڑتا ایک طرف چل دیا۔ وہ منہ
کچھ نہیں بولا۔ میرا دل اُمید اور نااُمیدی کے درمیا
معلق تھا۔ معلوم نہیں اس نے میری بات سمجھی بھی
یا نہیں؟ چابیوں کا گچھا واقعی مکان میں موجود ہے
نہیں؟ اگر ہے تو کیا اسلم اسے ڈھونڈ بھی سکتا ہے
نہیں؟
کئی منٹ تک میرے اعصاب تنے رہے۔۔
پھر اسلم لڑکھڑاتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ وہ مجھے اس وق

ایک شکستہ حال اور کراہیت انگیز نشے باز کی بجائے دُنیا کا دلکش ترین انسان معلوم ہوا، جو اپنے ہاتھوں پہ اُمید کا سورج سجائے میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کوٹھڑی کے دروازے پر نہیں، میرے مقدر کے دروازے پر لگے ہوئے قفل کی چابی لیے آ رہا ہو۔۔۔ وہ قریب آیا تو میں نے پُڑیا ایک قدم پیچھے کوٹھڑی میں پھیلے ہوئے گھاس پھونس پہ پھینکتے ہوئے کہا۔ "اندر آ کر یہ پُڑیا اُٹھا لو۔۔۔ اور یہ چابیاں مجھے دے دو۔"
اس کے ہاتھ جس طرح کانپ رہے تھے، اس سے مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ چابیاں تالے میں لگا کر یہ بھی نہیں دیکھ سکے گا کہ صحیح چابی کون سی ہے۔ غنیمت یہ رہا کہ اس نے گچھا بے چون و چرا میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں نے دوسرا ہاتھ بھی سلاخوں سے نکالا اور بے تابی سے پہلی چابی تالے میں لگائی۔ گچھے میں کُل چھ چابیاں تھیں۔ پانچ چابیاں آزمانے کے بعد میرا دل ڈوب گیا۔ سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور خوش خیالی کے روشن اُفق سے میرا دل مایوسی کی دلدل میں اتر گیا۔ مگر جب بے دلی سے چھٹی چابی آزمائی تو تالا کھل گیا۔ اور ایک لمحے کے لیے میرا پورا جسم ہلکا پھلکا ہو گیا۔
دروازہ کھول کر میں اس درندے کی سی تیزی سے باہر آیا جسے کسی نے دھوکے سے خود اسی کے کچھار میں بند کر دیا ہو۔ میری جگہ اسلم کوٹھڑی میں گھس گیا اور میری پھینکی ہوئی پُڑیا پر جھپٹ پڑا۔
میں اس کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے وہاں نہیں رُکا۔ بلکہ اس راہداری سے نکل کر مکان کے دوسرے حصوں میں جھانکنے لگا۔ تمام کمرے خالی پڑے تھے۔ برآمدہ ویران تھا۔ طویل و عریض احاطے میں بھی کسی ذی رُوح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس مکان پر برسوں سے اسی ویرانی کا راج ہو۔ میں نے چپّہ چپّہ دیکھ ڈالا مگر کہیں کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہ دیے۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ میرا اس مکان سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قدرت نے مجھے جو سُنہرا موقع مہیا کیا ہے، وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ اگر میں آزاد رہتا تو گلنا ل بازیابی کے لیے جدّوجہد تو کر سکتا تھا۔ کسی پر کٹے پنچھی کی طرح مقید ہونے کی صورت میں تو میں اس کے لیے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا تھا، چاہے وہ میری آنکھوں کے سامنے ہی ہوتی۔
میں جب برآمدے سے نکل رہا تھا تو اسلم کو برآمدے میں پڑے ہوئے دیکھا۔ اس کے جسم کو تشنجی جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ گھٹنے پیٹ سے لگائے گٹھری سا بنا پڑا تھا اور بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو روتے روتے عجیب فریادی انداز میں گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "تم نے مذاق کیا۔۔۔ خالی پُڑیا۔۔۔ تم نے اچھا نہیں کیا۔۔۔"
مجھے اس پر ترس تو آیا مگر میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُسے اس کے حال پر چھوڑا اور گیٹ کی طرف دوڑ پڑا۔ اس حویلی نما مکان سے نکل کر میری سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر جاؤں۔ تاحدِ نظر ویرانہ ہی ویرانہ تھا البتہ دُور ایک طرف درختوں کا جھنڈ نظر آ رہا تھا۔ میں تن بہ تقدیر ہو کر ناک کی سیدھ میں دوڑ پڑا۔ میری حالت اگر درست ہوتی تو میں کئی میل تک بلا تکان دوڑ سکتا تھا لیکن جو صعوبتیں مجھ پر گزر چکی تھیں، انھوں نے کافی توانائی نگل لی تھی اور اعصاب کو کچلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ تو اپنی سخت جانی اور جسمانی ریاضت تھی جو اس وقت بھی ساتھ دے رہی تھی۔
میل ڈیڑھ میل دوڑنے کے بعد مجھ پر تھکن کا غلبہ ہونے لگا۔ اس وقت میں ایک تنگ سی پگڈنڈی پر پہنچ چکا تھا جو بَل کھاتی ہوئی ایک طرف جا رہی تھی اور اُدھر کچھ فاصلے پر کھیتوں کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ میں اسی طرف جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اُدھر سے ایک سائیکل سوار آتا دکھائی دیا۔ وہ کچھ اس طرح نمودار ہوا تھا جیسے سمندر کا نظارا کرتے وقت بہت دُور سے کوئی جہاز رفتہ رفتہ نمودار ہوتا دکھائی دیتا ہے۔
میں رُک گیا۔ بہتر تھا کہ اندھا دھند دوڑنے کی بجائے اس شخص سے کچھ راہنمائی حاصل کرنے
کرتا لیکن اس شخص کا انتظار کرنا شروع کیا تو سوں
ہوا کہ کہیں میری عمر اسی کے انتظار میں نہ گزر جائے۔ اگر وہ سائیکل پہ آنے کی بجائے پیدل اس طرف آ رہا ہوتا تو شاید جلدی مجھ تک پہنچ جاتا۔ اور جب وہ میرے قریب آیا تو اس سست رفتاری کی وجہ بھی میری سمجھ میں آگئی۔

بے چاری سائیکل کے سامنے ہی انجر پنجر ڈھیلے تھے۔ ایک فرلانگ دُور ہی سے اس کی کھڑکھڑاہٹ سُنائی دینے لگی تھی اور منحنی سائیکل سوار اس انداز سے اسے چلا رہا تھا جیسے پگڈنڈی پر نہیں، کسی رستے پر چلا رہا ہو۔ میرے قریب پہنچ کر وہ رُکنے کی کوشش میں سائیکل سے تقریباً گر ہی پڑا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اُٹھایا اور ملائمت سے کہا: "بھائی صاحب! مجھے شہر جانا ہے۔"

"کیہڑے شہر؟" اس نے پوچھا۔ وہ معمولی قدکاٹھ کا ایک پختہ العمر دیہاتی تھا۔ پُرانے سے کُرتے اور شلوار میں تھا، سر پر پگڑی تھی۔ اس کے سوال نے مجھے چکرا دیا۔

مجھے ٹھیک سے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں لاہور کے نواح میں ہوں یا کہیں اور پہنچ چکا ہوں تاہم بے ساختہ ہی میرے مُنہ سے نکل گیا: "لاہور۔" پھر میں نے فوراً ہی وضاحت کی: "میں کسی کے ساتھ ایک کام سے ادھر آیا تھا۔ وہ شخص مجھے چھوڑ کر اپنے پنڈ چلا گیا تو میں راستہ بھول گیا۔"

میری یہ لنگڑی سی کہانی شاید اس دیہاتی کو مطمئن کر جاتی مگر میرا حُلیہ اطمینان بخش نہیں تھا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے پے در پے حادثات اور مار دھاڑ نے میرا حُلیہ شریفانہ نہیں رہنے دیا تھا۔ دیہاتی نے شک زدہ نظروں سے میرا جائزہ لیا لیکن کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد وہ بولا: "اس کے لیے تمھیں ملتان روڈ جانا چاہیے۔ وہاں سے کوئی سواری مل جائے گی۔" پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا: "اس طرف ناک کی سیدھ میں چلتے چلے جاؤ، ملتان روڈ پہنچ جاؤ گے۔ میں دوسرے پنڈ جا رہا ہوں، ورنہ تمھیں اپنی سائیکل پر لے جاتا۔"

"نہیں نہیں... مجھے جلدی ہے۔ میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔" میں نے گھبرا کر کہا اور تیزی سے اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل دیا۔ کافی دُور پہنچ کر میں نے پیچھے دیکھا تو وہ سائیکل پر بیٹھ کر روانہ ہو چکا تھا لیکن مُڑ مُڑ کر میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔

سڑک پر پہنچنے کی آس نے مجھ میں نئی توانائی بھر دی تھی لیکن جب میں دوڑتے دوڑتے ہانپ گیا اور سڑک دکھائی نہ دی تو ایک بار پھر میری ٹانگیں گویا پتھر کی ہونے لگیں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ اندیشہ بھی ہوا کہ کہیں [illegible] دیہاتی نے مجھے چکر تو نہیں دے دیا؟ تاہم میں ایک موہوم [illegible] سی اُمید کے سہارے چلتا رہا اور بالآخر سڑک پر پہنچ [illegible] میں سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ چند ہی سیکنڈ [illegible] ایک طرف سے بس آتی دکھائی دی جس کے سامنے [illegible] شیشے کے عقب میں "لاہور، ملتان" کی تختی تو لگی ہوئی [illegible] لیکن میں سمجھ نہ سکا کہ وہ لاہور سے آ رہی ہے یا لاہور [illegible] رہی ہے۔ لیکن میرے قریب پہنچ کر بس کی رفتار کم ہو [illegible] اور کنڈیکٹر نے آواز لگا کر میری مشکل حل کر دی: "لاہور [illegible] لاہور..." وہ چلا رہا تھا۔ میں لپک کر بس میں سوار ہو [illegible]

لاہور پہنچنے تک دامنِ شب پھیل چکا تھا اور [illegible] گلی کوچوں میں قمقمے، تاریکی سے برسرِ پیکار تھے۔ میں [illegible] سیدھا مجو پہلوان کے اکھاڑے پہنچا۔ اس کے سوا میرے [illegible] خیال میں فی الحال کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ اکھاڑے [illegible] میں پہلوان نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا لیکن میری [illegible] شکستہ حالی کو سبھی نے محسوس کیا۔ رشید پہلوان میرے [illegible] کندھے پر ہاتھ مار کر بولا: "یار تم کیا لاس اینجلز کے کسی [illegible] رِنگ میں ریسلنگ چیمپئن کی لڑائی کے لیے لڑ کر آ [illegible] ہو...؟ اور کیا کپڑوں سمیت ہی لڑ پڑے تھے؟"

سب پہلوانوں نے قہقہہ لگایا۔ واحد پہلوان [illegible] "بھئی گورے پہلوانوں نے ہمارے پہلوان کو لنگوٹ [illegible] کسنے کا موقع ہی نہیں دیا ہوگا۔ تم نے ٹی وی پر دیکھا [illegible] نہیں، وہ دھوکے سے اچانک ہی حملہ کر دیتے ہیں [illegible]"

قہقہے ذرا تھمے تو نذیر پہلوان سنجیدگی سے بولا [illegible] "نہیں یار! ٹھیک طرح بتاؤ۔ کہاں سے آ رہے ہو ا[illegible] کیا کر کے آ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں یار! بس کچھ لوگوں سے جھگڑا ہو گیا تھا [illegible]" میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"کمال ہے... اب مجو پہلوان کے اکھاڑے والو [illegible] سے بھی کچھ لوگ اُلجھنے کی کوشش کر رہے ہیں؟" نذ[illegible] پہلوان حیرت سے بولا: "تم نے انھیں بتایا نہیں ہو [illegible] کہ تم کون ہو؟"

اب میں اُن سادہ لوح پہلوانوں کو کیا بتاتا [illegible] گولیوں اور خنجروں کے کھیل میں رگوں اور پٹھوں [illegible] کیا حیثیت ہوتی ہے۔

نذیر پہلوان نے مجھے خاموش دیکھ کر بولا: "چلو... چل کر [illegible] بتاؤ کہ وہ کون لوگ تھے۔ ان کا جلوس نہ نکال دوں [illegible] میرا نام نذیر نہیں۔" وہ سچ مچ جوش میں آ گیا۔

میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا: "اللہ تم [illegible] کو سلامت رکھے، یار! ان کے لیے میں اکیلا ہی [illegible] ہوں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ مجھے صحیح طور پر ان [illegible] کانا معلوم نہیں۔ وہ دھوکے سے مجھ پر حملہ آور [illegible] تے ہیں اور کوئی سُراغ چھوڑے بغیر ہی غائب ہو [illegible] تے ہیں۔"

"پھر تو کوئی لمبا ہی چکر لگتا ہے۔" رشید پہلوان بولا۔ [illegible] حال ہم ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ جب [illegible] ضرورت پڑے، ہمیں حکم دینے میں تکلف نہ کرنا۔"

باتوں کی آواز سُن کر اُستاد مجو بھی اپنے عقبی کمرے [illegible] نکل آئے اور مجھے دیکھ کر چونک اُٹھے۔ میرا ہاتھ پکڑ [illegible] وہ اپنے کمرے میں لے گئے اور سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے [illegible] لے: "لگتا ہے پھر نئے مصائب سے گزر رہے ہو۔"

"ہاں اُستاد! مصائب تو ہر قدم پر نئے نئے ملتے [illegible] لیکن قضیہ وہی پُرانا ہے۔" میں نے چوبی تخت پر [illegible] ھتے ہوئے کہا: "اب میں تھک گیا ہوں۔ عام آدمی [illegible] کنے کے بعد بیٹھ جاتا ہے، ہتھیار پھینک دیتا ہے۔ [illegible] آپ نے جو تربیت دی ہے، اس کا اصول ہے کہ [illegible] ہم تھک جائیں تو اپنی تمام تر توانائیاں مجتمع کر کے [illegible] غلطیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے آخری، بھرپور [illegible] فیصلہ کن حملہ کریں۔ چنانچہ اب میں یہی کرنے جا رہا [illegible] میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب میں اس قضیے کو نمٹا کر [illegible] رہوں گا۔ پہلے وہ لوگ مجھے تلاش کرتے رہے ہیں [illegible] میں چوہے کی طرح اُن سے چھپتا پھرا ہوں۔ اب میں [illegible] کا شکار کرنے نکلوں گا اور وہ چھپنے کے لیے بِل تلاش [illegible] تے پھریں گے۔"

"بہت غضب ناک ہو رہے ہو۔ لگتا ہے بہت [illegible] پڑی ہے۔" اُستاد مسکرا کر بولے۔

"مار تو پہلے بھی پڑتی رہی ہے، اُستاد!" میں نے [illegible] ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "لیکن اس دفعہ میری [illegible] نفس پر بھی چوٹ پڑی ہے۔ وہ میری اس محسنہ [illegible] اغوا کر کے غائب ہو گئے جس نے مجھے اس وقت پناہ دی تھی، محبت دی تھی جب اس شہر میں میرے لیے کوئی دروازہ کھلا نہیں تھا اور کوئی مجھ سے محبت کرنا تو درکنار، شناسائی کا بھی روادار نہیں تھا۔"

"ہاں... ایسی عورت کے لیے تو سارے زمانے سے بھی لڑا جا سکتا ہے۔ وہ تو پھر چند بے ضمیر بدمعاش ہیں۔" استاد نے گہری سنجیدگی سے سر ہلایا: "لیکن تم کرو گے کیا؟"

"ابھی تو خود میرے ذہن میں بھی کچھ واضح نہیں۔" میں نے جواب دیا: "تاہم ایک بات طے ہے کہ طریق کار خواہ کچھ بھی اختیار کروں، لیکن ان درندوں کو بہرحال ان کے کچھار سے نکالنا میرا مقصد ہوگا۔ بجائے اس کے کہ وہ میری بُو سونگھتے ہوئے آئیں، میں خود ہی انھیں متوجہ کروں گا، للکاروں گا۔ پہلے بھی میں نے اسی قسم کی ایک کوشش کی تھی لیکن اس وقت میرے انداز میں اناڑی پن تھا۔ اب حالات نے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ان کا کمزور پہلو کیا ہے اور مجھے کس طرح اس سے فائدہ اُٹھانا ہے۔"

"پھر بھی کچھ تو پتہ چلے کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو...؟" اُستاد بولے: "تاکہ ہم بھی سوچیں کہ تمھارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ ہم بھی تو تم سے دوستی کے دعوے دار بنے پھرتے ہیں۔ اس لیے جب تم تن تنہا کسی آزمائش سے گزر کر شکستہ حالی کی تصویر بنے واپس آتے ہو تو ہمیں بڑی شرم آتی ہے۔"

"ایسا نہ کہیں اُستاد! آپ نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔ کندھے سے کندھا جوڑ کر لڑنے ہی سے تو مدد نہیں ہوتی۔ مدد کے ہزاروں انداز ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ آپ کی وجہ سے میرے دل کو کتنا سہارا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ میں یونہی شیر بنا پھر رہا ہوں؟" میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر..." استاد نے بے بسی سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں، جس مدد کو آپ عملی مدد سمجھتے ہیں، اس کا موقع بھی ضرور آئے گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنے اس بیش قیمت اثاثے کو کسی خاص اور فیصلہ کن موقعے پر

استعمال کروں۔"

"ہوں" اُستاد نے پُرخیال انداز میں ہنکارا ابھرتے ہوئے سر ہلایا۔ "وقت نے واقعی تمھیں بہت کچھ سکھا دیا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "اچھا.. فی الحال تو آپ میرے لیے کپڑوں کا بندوبست کر دیں۔ میں ہاتھ مُنہ دھو کر آتا ہوں۔"

"یہ بھی کوئی کام ہے؟" وہ گہری سانس لے کر بولے اور اُٹھ کر میرے ساتھ ہی باہر آ گئے۔ وہ عزیز پہلوان کو بُلا کر اس سے کچھ بات کرنے لگے اور میں اکھاڑے کے پچھلے حصّے کی طرف چل دیا۔ جدھر پہلوانوں کے لیے دو باتھ روم بنے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد واپس آیا تو میرے لیے نفیس قسم کا ایک نیا شلوار سوٹ رکھا ہُوا تھا۔ کپڑے بدل کر، کنگھی کر کے جب میں ذرا سکون سے بیٹھا تو احساس ہُوا کہ میں خاصی طویل مدّت کے بعد انسانیت کے جامے میں آیا ہُوں ورنہ اب تک میں اپنے آپ کو ایسا ریچھ محسوس کر رہا تھا جو اپنی کھوہ کا راستہ بھول گیا ہو۔ چند منٹ بعد میں نے اُٹھتے ہُوئے کہا: "اُستاد! وہ رقم مجھے دے دیں جو میں نے آپ کے پاس رکھوائی تھی۔"

وہ اُٹھ کر اپنی چوبی الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولے: "تمھارے عزائم کچھ خطرناک ہی لگتے ہیں۔"

"خطرناک لوگوں کے مقابلے میں اسی طرح کام چلے گا۔" میں نے مُسکراتے ہُوئے آہستگی سے ہاتھ پھیرا جہاں اب بھی چھُونے سے ٹیسیں اُٹھتی تھیں۔

اُستاد نے الماری کا تالا کھولا اور ایک بریف کیس نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ اس میں پچاس ہزار روپے کی رقم موجود تھی۔ میں اُستاد سے اجازت لے کر رخصت ہونے لگا تو وہ بولے: "تمھیں کسی ہتھیار کی ضرورت تو نہیں.... ؟"

"نہیں... نہیں..." میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "میں آپ سے کوئی ہتھیار نہیں لوں گا۔ آپ نے دو مرتبہ مجھے ریوالور دیے لیکن میں انھیں اچھی طرح دیکھ بھی نہیں پایا کہ وہ مجھ سے چھین لیے گئے۔ اب میں نہتا ہی ٹھیک ہوں۔

ویسے بھی اپنا کام تو غیبی امداد کے سہارے ہی ہے، ورنہ کب کی اس دُنیا سے چھٹی ہو گئی ہوتی۔"

"اچھا مجھے تھوڑا بہت اشارہ تو دیتے جا ... جا رہے ہو... کیا ارادہ ہے؟" اُستاد ہچکچاتے ہو...

"دیکھیں اُستاد! اشارے بازی کوئی اچھی ... نہیں ہے نا۔" میں نے مسکراتے ہُوئے کہا: "بہر ... بتا دیتا ہوں کہ فی الحال میرا ارادہ لکشمی چوک کے ... ہوٹل میں قیام کرنے کا ہے۔ آج رات صرف او... آرام کروں گا۔ کل دیکھوں گا کہ کیا کرنا ہے۔"

حالاں کہ میں اسی وقت طے کر چکا تھا کہ ... کرنا ہے لیکن فی الوقت میں اُستاد کو بتانا نہیں ... تھا۔ ممکن تھا کہ وہ مجھے میرے ارادے سے باز ... کی کوشش کرتے اور مشورے دینے لگتے۔ جب ... اس وقت نہ باز رہنے کے موڈ میں تھا اور نہ ... قبول کرنا چاہتا تھا۔

اُستاد کو خدا حافظ کہہ کر میں انار کلی پہنچ ... چوک جانے سے پہلے میں نے دُکان سے ایک ... صورت سی ڈائری اور اسٹیشنری کا تھوڑا سا ... سامان خریدا۔ ملبوسات کی ایک دُکان سے ... مزید کپڑوں کے دو جوڑے خریدے، پھر رکشہ ... لکشمی چوک پہنچا اور لاہور ہوٹل میں ایک ... اس میں آرام سے لیٹ گیا۔ اس وقت مجھے ... اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور میں آ... کر کے دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا چاہ... جیسے ہی آنکھیں بند کیں تو تخیّل کے افق پر ... چہرہ طلوع ہو گیا۔

وہ نہ جانے کہاں تھی، کس حال میں تھی ... یہاں اطمینان سے ہوٹل کے کمرے میں آرا... پر لیٹا ہُوا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر شرم آ... کانٹوں کی سیج محسوس ہونے لگا اور میں ... کروٹیں بدلنے لگا۔ کسی پہلو چین نہیں آ رہا ... کر ٹہلنے لگا۔ اس وقت شاید میں اندازہ نہ کر ... چڑیا گھر کے پنجروں میں مقید درندے کیا محس... ہوں گے۔ میرے گرد کوئی آہنی جنگلہ نہیں ... ہی میرے کمرے کا دروازہ مقفل تھا پھر بھی ...

...رح مجبور اور بے بس تھا کیونکہ کہیں جانے کے لیے ...ے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ بالآخر میں لکھنے کی ...ر جا بیٹھا۔ راستہ تلاش کرنے کا جو غیر یقینی سا ...میں نے سوچا تھا، میرا ارادہ تھا کہ میں صبح اس ...ل کروں گا لیکن اضطراب کی جو آگ سینے میں دہک ...ی تھی، اس نے مجبور کر دیا کہ میں ابھی اور اسی وقت ...ل پر عمل شروع کر دوں۔ تھکن اور شکستہ حالی کا ...اس بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میں نے ڈائری اور لکھنے کا سامان اپنے سامنے رکھا ...پنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں ڈائری کو مختلف ...ں پتوں، نقشوں، مبہم لفظوں اور اُلٹے سیدھے، ...ے ترچھے بے مقصد قسم کے نشانات سے بھرتا جا رہا ...اس مقصد کے لیے میں مختلف رنگوں کی روشنائی ...ومیٹری کا سامان وغیرہ استعمال کر رہا تھا۔

بالآخر ڈائری کے بیشتر صفحات بھر گئے میں نے ...نقیدی نظروں سے دیکھا تو وہ واقعی کوئی پُراسرار ...ی ڈائری معلوم ہونے لگی۔ میں نے حفاظت سے ...بریف کیس میں رکھا اور بریف کیس سے مزید ...رقم نکال کر جیب میں رکھ لی... پھر میں ہوٹل سے ...کھڑا ہُوا۔

لکشمی چوک سے چند قدم کے فاصلے پر ایک مشہور ...کا دفتر تھا۔ میں وہاں پہنچا تو کسی کی رہنمائی کی ...ت نہیں پڑی اور "شعبۂ اشتہارات" کی ایک ...کے نیچے بنے ہوئے تیر کے نشان کو دیکھ کر میں ...اشتہارات میں پہنچ گیا۔

میں نے کاغذ کا ایک پُرزہ شعبۂ اشتہارات کے ...ے سامنے رکھتے ہوئے کہا: "میں یہ اشتہار آپ ...ہار کے پہلے صفحے پر دینا چاہتا ہُوں، جلی الفاظ ...ں جائے گا۔"

مینجر نے کاغذ کے پُرزے پر نظر ڈالی۔ اس پر ...ایک جملہ لکھا ہُوا تھا: "ڈائری سے دلچسپی رکھنے ...اسی اخبار میں اشتہار کے ذریعے رابطہ قائم کریں۔"

مینجر نے عینک درست کی اور شک زدہ سی ...سے میری طرف دیکھا: "اس میں کوئی ایڈریس ...نہیں۔" وہ ملائمت سے بولا۔

"اسی لیے تو یہ اشتہار دینے کی ضرورت پیش آئی، ہے کہ نہ میرا کوئی مستقل ایڈریس ہے اور نہ ہی ان لوگوں کا جن سے میں رابطہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوں۔" اس نے پُرخیال انداز میں ہنکارا بھرا، تاہم اس موضوع پر زیادہ جرح نہیں کی اور کاغذ کے پرزے کا ایک بار پھر جائزہ لیتے ہوئے بولا: "اشتہار کا مضمون بے حد مختصر ہے جب کہ ہم پہلے صفحے کے لیے اتنے چھوٹے اشتہارات قبول نہیں کرتے۔"

"آپ کے لیے کم سے کم جتنا بڑا اشتہار قابلِ قبول ہوتا ہے اتنی جگہ میں اسی مضمون کو زیادہ سے زیادہ جلی الفاظ میں دے دیجیے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" مینجر نے کچھ حساب کیا اور رقم مجھے بتائی جو میں نے فوراً نکال کر سامنے رکھ دی۔

اکاؤنٹنٹ نے مجھے رسید کاٹ دی اور میں دفتر سے نکل آیا۔ واپس ہوٹل پہنچ کر میں نے کھانا کھایا اور ایک بار پھر کمرے میں جا لیٹا۔ اب میرا اضطراب کچھ کم ہو چکا تھا۔ کسی نہ کسی حد تک عمل کا آغاز ہو چکا تھا، شاید اس لیے۔ بالآخر کچھ دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔

صبح دن چڑھے میری آنکھ کھلی۔ میں نے روم سروس کو ناشتے کا آرڈر دینے سے پہلے ہدایت کی کہ میرے کمرے میں اخبار بھجوا دیں۔ اخبار آیا تو میں نے دیکھا صفحۂ اوّل پر وہ اشتہار نمایاں انداز میں چھپا ہُوا تھا۔ اب میرا کام صرف انتظار کرنا تھا سو وہ میں نے شروع کر دیا۔

پورے چار دن گزر گئے اور کوئی ردِّ عمل ظاہر نہ ہُوا۔ میں روزانہ اخبار کا کونا کھدرا تک کھنگال ڈالتا کہ شاید انھوں نے کوئی غیر نمایاں سا اشتہار دے دیا ہو مگر مجھے کہیں کوئی جوابی اشتہار نظر نہ آیا۔ ہر دن میرے لیے گزرے ہوئے دن سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ بارہا میں نے اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے سوچا کہ کہیں میں وقت تو ضائع نہیں کر رہا؟ کہیں میرے یوں بے عمل ہو کر بیٹھنے سے گلنار کی بازیابی مشکل سے مشکل تر اور پھر ناممکن تو نہیں ہو جائے گی؟ مجھے اپنے گرد اس قدر سکوت محسوس ہوتا جیسے کائنات کی ہر چیز پتھر ہو گئی ہے۔ وقت اپنی جگہ تھم گیا ہے۔ بس ایک میرا دل ہے جو وحشت سے دھڑک رہا ہے، ایک میرا جسم ہے جو نفرت

اور غیظ و غضب سے سُلگ رہا ہے۔

کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا کہ ان لوگوں نے کہیں کھیل ختم تو نہیں کر دیا۔ شاید انھوں نے ڈائری کا پیچھا ہی چھوڑ دیا ہے یا انھیں اس کا متبادل مل گیا ہو؟ اور کیا بعید ادھر میں نقلی ڈائری تیار کر کے ان کے انتظار میں بیٹھا ہوں اور ادھر انھیں اصل ڈائری ہی مل گئی ہو؟ ورنہ وہ ایسے بے پروا کیونکر ہو سکتے تھے۔ وہ تو ڈائری کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے اور میں اپنے طور پر کتنے ہی خفیہ ٹھکانے پر جا کر پناہ لے لیتا تھا لیکن کوئی نہ کوئی مجھے ڈھونڈ نکالتا تھا۔ شکاری کتوں کی طرح کوئی نہ کوئی میری بو سونگھتا ہوا ہر اس جگہ پہنچ جاتا تھا... جہاں میں اپنے آپ کو بے حد محفوظ سمجھا کرتا تھا۔ اور اب جب کہ یہ عالم تھا کہ میں شہر کے بیچوں بیچ ایک ہوٹل میں مقیم تھا اور صبح و شام باہر سڑکوں پر گھومتا تھا، کوئی میرے تعاقب میں نہیں آ رہا تھا۔ کوئی مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال رہا تھا۔ کوئی حملہ آور نہیں ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ اب میں نے اتنے مشہور اخبار میں اشتہار دے دیا تھا، اس کا بھی جواب نہیں آ رہا تھا، کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

پانچویں دن جب میں نے صبح اُٹھ کر دروازے کے نیچے سے پھینکا گیا اخبار اٹھایا تو گویا میرے دل کی دھڑکن رُکی جا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر آج بھی کسی قسم کا جوابی اشتہار نظر نہ آیا تو شاید میرے اعصاب جواب دے جائیں لیکن قدرت کو شاید میری حالت پر ترس آ گیا کیونکہ جب میں نے اخبار سیدھا کیا تو صفحۂ اوّل پر عین اسی جگہ جہاں میرا اشتہار چھپا تھا، ایک اشتہار نظر آ گیا۔

"ڈائری کے سلسلے میں فون نمبر... پر رابطہ قائم کریں"

چند لمحے تک تو میں ایک ٹک اس اشتہار کو دیکھتا رہا، پھر میں نے بیتابی سے ریسیور اُٹھایا اور آپریٹر سے وہ نمبر ملانے کے لیے کہا۔ چند لمحے بعد سلسلہ ملا تو دوسری طرف سے آواز آئی "پلازا ہوٹل"

"دیکھیے" میں نے ملائمت سے کہا "آج کے اخبار میں ڈائری کے سلسلے میں ایک اشتہار چھپا ہے۔ اس میں آپ کا نمبر دیا گیا ہے"

"میں استقبالیہ کلرک سے آپ کی بات کراتا ہوں" پلازا ہوٹل کے آپریٹر نے کہا اور کلک کی آواز کے دوسری طرف سے کسی نے پوچھا "جی فرمایئے"

میں نے مدعا دُہرایا تو کلرک بولا "جی ہاں... ہمارے کسی مہمان نے دیا تھا مگر اب وہ کمرہ چھوڑ کر ہیں البتہ انھوں نے کہا تھا کہ اگر آپ معاملات میں کوئی دلچسپی رکھتے ہوں تو ملنے کی کوئی جگہ اور و دیں۔ وہ بعد میں فون کر کے مجھ سے معلوم کر لیں"

"کیا وہ آپ کے کوئی بہت ہی خاص مہمان آپ ان کے لیے یہ زحمت اٹھائیں گے کہ ان کے کے بعد بھی ان کے پیغامات وغیرہ نوٹ کر کے رکھ میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"ہمارے لیے تو ہر آدمی خاص مہمان ہوتا ہے وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا "ہماری کوشش ہوتی ہے مہمان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں تاکہ وہ آئ ہمارے ہاں قیام کرنے"

اس کا لہجہ خالص پیشہ ورانہ تھا۔ عین ممکن وہ مجھے ایک ریسپشنسٹ کے پیشہ ورانہ فرائض دینا شروع کر دیتا، اس لیے میں نے اس کی کاٹتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے آپ ان صاحب پیغام نوٹ کر لیں۔ اگر ہم شہر سے نکل کر راوی پر جائیں تو بائیں طرف سے نیچے جھانک کر دیک ایک کیبن نظر آتا ہے۔ یہ ایک قسم کا غریبانہ سا ر ہے۔ اس کے اردگرد ریت پر میز کرسیاں بھی رکھ ہیں۔ ان میں سے کسی میز پر میں آج ہی ایک سے کے درمیان ان صاحب کا انتظار کروں گا۔ اُمید تو وہ صاحب مجھے دُور ہی سے پہچان لیں گے لیکن نوٹ کر لیجیے کہ میں آسمانی رنگ کی شلوار قمیض ملبوس ہوں گا اور میری میز پر سفید رومال پڑا ہ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے، سر" استقبالیہ کلرک نے مؤ میں کہا "اگر ان صاحب نے فون کیا تو آپ کا پیغا مل جائے گا"

میں نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا اور بعد ناشتے کا آرڈر دیا۔ ناشتے کے بعد میں نے ڈا

ایک خالی لفافے میں احتیاط سے پیک کیا اور نیچے ہوٹل کے کاؤنٹر پر جا کر اپنا بریف کیس لاکر میں رکھوا دیا۔ مزید کچھ وقت میں نے اِدھر اُدھر گھوم کر گزارا اور بارہ بجے راوی کی طرف روانہ ہو گیا۔ پُل کے قریب پہنچ کر میں نے رکشہ چھوڑ دیا اور پیدل کچے راستے سے ٹہلتا ہوا اُس کیبن کی طرف چل دیا۔

موسم خنک ہونے کے باوجود زیادہ دیر دھوپ میں بیٹھنا مشکل تھا۔ اس لیے 'اوپن ائر' ریستوران کی بیشتر میزیں خالی ہی تھیں۔ میں ایک ایسی میز پر جا بیٹھا جہاں کسی بھی سمت سے آنے والا شخص مجھے آسانی سے دیکھ سکتا تھا لیکن ہوا یہی کہ میں وہاں بیٹھا لوگوں کی طرف دیکھتا رہا اور کسی نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ حتیٰ کہ وہاں کے بیرے نے بھی کئی مرتبہ بُلانے کے بعد نگاہِ کرم کی۔

میں ایک گھنٹے کی بجائے دو گھنٹے وہاں دھوپ میں بیٹھا رہا حتیٰ کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اگر میں کچھ دیر اور وہاں بیٹھا رہا تو روسٹ ہو جاؤں گا۔ اس دوران کئی ایک آدمیوں پر مجھے شبہ ہوا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہو سکتے ہیں جنھیں ڈائری کی تلاش ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی میری طرف متوجہ نہ ہوا۔ کوئی اس طرف چلا گیا جہاں لوگ مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے، کوئی بوٹنگ کرنے چلا گیا اور کوئی ریستوران سے پھل یا اسنیکس وغیرہ کھا کر رخصت ہو گیا۔

بالآخر میں وہاں سے مایوس و نامراد واپس آ گیا۔ مجھے اتنا تاؤ آ رہا تھا کہ ہوٹل پہنچ کر فون کرنے کی بجائے راستے ہی میں ایک جگہ پبلک فون دیکھ کر اسی ہوٹل کے ریسپشن سے رابطہ قائم کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں دو گھنٹے انتظار کر کے آ رہا ہوں۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں سر!" کلرک بے بسی سے بولا۔ "ان صاحب کا فون آیا تھا اور میں نے آپ کا پیغام پوری تفصیل کے ساتھ انھیں دے دیا تھا۔ اب اگر وہ نہیں پہنچے تو اس کی وجہ بہتر طور پر وہی بتا سکتے ہیں"

"وجہ تو وہی بتا سکتے ہیں لیکن آپ کم از کم ان کا نام و پتہ تو بتا سکتے ہیں" میں نے قدرے تیزی سے کہا۔

"سر، ان کا نام ملک شہریار ہے اور وہ گوجرانوالہ سے آتے ہیں۔ اکثر ہمارے ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ غالباً وہاں کے کوئی تاجر ہیں" کلرک نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہ نام وغیرہ فرضی تھا۔

میں جب دوبارہ رکشے میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوا تو میرا خون کھول رہا تھا، کنپٹیاں سُلگ رہی تھیں لیکن ایک بار پھر میرے راستے مسدود تھے اور المیہ یہ تھا کہ سامنے کوئی دیوار بھی نہیں تھی جس سے میں سر ہی ٹکرا دیتا۔

یونہی اندر ہی اندر کھولتا ہوا میں واپس ہوٹل پہنچا۔ اپنے کمرے پر پہنچ کر اسی طیش کے عالم میں میں نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ چابی تالے میں صحیح طرح نہیں گھومی اور دروازہ ویسے ہی کھل گیا ہے۔ اندر پہنچ کر میں نے دروازہ ایک جھٹکے سے بند کیا اور مڑ کر دیکھا تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

میرے بیڈ کے قریب ایک آرام کرسی پر محمد شاہ نیم دراز تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کا رُخ ظاہر ہے میری طرف تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے نیم دراز تھا جیسے اپنے گھر کے لان پر دھوپ سینک رہا ہو۔ اس وقت وہ پولیس کی وردی میں نہیں تھا بلکہ عام لباس میں تھا۔

میں یک دم مڑا تو وہ کرخت لہجے میں بولا "بھاگنے کی کوشش مت کرنا!"

میں نے تالے میں چابی ڈال کر گھماتے ہوئے کہا۔ "میں بھاگ نہیں رہا، دروازہ مقفل کر رہا ہوں کہ کہیں تم نہ بھاگ جاؤ"

"اوہ" اس نے ایک طویل سانس لی "بہت خوب، گویا چوہا بلّی سے کہہ رہا ہے کہ بھاگ نہ جانا"

"تم جو ہے بلّی کی مثالیں دے رہے ہو..." میں نے حقارت سے کہا "مجھے تو وہ لوگ مرد نہیں لگتے جو ہتھیار پکڑ کر نہتوں سے لڑتے ہیں"

"میں ان احمقوں میں سے نہیں ہوں جو اس قسم کے جملے سن کر اشتعال میں آ جاتے ہیں اور ہتھیار پھینک دیتے ہیں" وہ مسکراتے ہوئے بولا "میں ایک پیشہ ور قاتل ہوں اور میرا کام اپنے شکار کو ہر حال میں قتل کرنا ہوتا ہے اور تمھارے بارے میں چونکہ مجھے پورا یقین نہیں ہے

کر تمھیں خالی ہاتھوں قتل کر سکتا ہوں یا نہیں، اس لیے ریوالور ضرور اپنے ہاتھوں میں رکھوں گا۔ اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اس ریوالور پر سائیلنسر لگا ہوا ہے۔"

"لیکن تم مجھے قتل کیوں کرنا چاہتے ہو۔ میں تو ڈائری دینے کے لیے تمھیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔" میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا خاکی لفافہ اونچا کر کے اسے دکھایا۔

اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ جب میں نے اسے پولیس کی وردی میں دیکھا تھا اس وقت اس کا ہنسنے اور بات کرنے کا انداز واقعی گھاگ قسم کے پولیس والوں کا سا تھا لیکن اب وہ بالکل مختلف انداز میں بول رہا تھا اور قطعی مختلف آدمی لگ رہا تھا گویا پیشہ ور قاتل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ زبردست اداکار بھی تھا۔

"معلوم نہیں اس لفافے میں تم کون سی ڈائری لیے گھوم رہے ہو۔" وہ گویا میری حماقت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "ہمیں یقینی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ تمھارے پاس ڈائری نہیں ہے۔"

"اس صورت میں بھی کیا مجھے ہلاک کرنا ضروری ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"ہاں۔ کیونکہ ایک تو تم ہمارے صورت آشنا ہو چکے ہو۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "دوسرے میں نے تمھارے متعلق جو اندازہ لگایا ہے اس کے مطابق مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے تمھیں زندہ چھوڑ دیا تو تم قیامت تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑو گے۔ خصوصاً اس لڑکی گلنار کی وجہ سے۔"

"گلنار کہاں ہے؟" میں نے اپنے لہجے کی بے تابی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ یہ سوال میں اس سے بہت پہلے کرنا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے دوسری باتوں میں اُلجھا لیا تھا۔

"ہمارے ہی قبضے میں ہے اور خیریت سے ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"تم نے اُسے کوئی گزند تو نہیں پہنچائی؟" میں نے اپنے اعصاب پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں... کم از کم اس انداز میں ہم نے اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جس انداز سے تمھیں اندیشہ ہے۔" وہ گویا میری حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم کوئی بہت ہی شریف لوگ ہیں بلکہ وجہ

محض اتنی سی ہے کہ ہمیں اس طرف توجہ دینے کا وقت نہیں مل سکا۔ ہم اتنے مصروف رہے ہیں اور پے در پے اتنی الجھنوں سے پالا پڑا ہے کہ اس حسین بچی کو ہم ٹھیک طور پر دیکھ بھی نہیں سکے۔"

میں نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ اس کے بارے میں ہمارے عزائم کیا ہیں تو تمھاری معلومات کے لیے بتاتا چلوں کہ اس کی وجہ سے ہماری ساری بھاگ دوڑ اور مالی نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔ تمھارے چکر میں ہمیں بہت نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔"

"تلافی... وہ کس طرح؟" میں نے اُلجھ کر پوچھا۔

"اس کا سودا ہم مشرقِ وسطیٰ کی کسی دولت مند شیخ سے کر لیں گے۔" وہ شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "مجھے یقین ہے، اس کے عوض ہمیں اتنی رقم مل جائے گی کہ ہم اپنے تمام نقصانات بھول جائیں گے..."

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، وہ ان الفاظ کا ردِ عمل تھا یا موقع ہی مجھے بے حد مناسب معلوم ہوا تھا کہ میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا وہ خاکی پیکیٹ جس میں خاصی ضخیم اور مجلد ڈائری موجود تھی، اس پر پھینک مارا۔ پیکیٹ تقریباً گولی کی رفتار سے اس کے منہ پر پڑا اور اسی لمحے میں بجلی کی سی تیزی سے، اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ جواباً وہ ایک فائر کرنے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن گولی دروازے کے قریب دیوار سے ٹکرائی۔ اسے دوسری بار ٹریگر دبانے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ میں نے چیتے کی طرح اس پر زقند لگائی تھی اور اسے کرسی سمیت نیچے گرا لیا تھا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن گرفت میں لینے کی کوشش کی اور دوسرے سے وہ ہاتھ جس میں ریوالور تھا پھر بڑی بے رحمی سے پہلوانوں والی مہارت کے ساتھ اس کی کلائی مروڑی۔ اس کے باوجود وہ دوسری مرتبہ ٹرائیگر دبانے میں کامیاب ہو گیا مگر خوش قسمتی سے گولی نہ چلی شاید ٹرائیگر پوری طرح نہیں دب سکا تھا۔ بہرحال، اس کے بعد ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا... لیکن وہ آسانی سے قابو میں آنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ کسی سانڈ کی طرح مضبوط تھا۔ اس میں صرف پھرتی کی کمی تھی۔ ایک بار تو اس نے چیخنے کے لیے بھی منہ کھولا لیکن میں بروقت اس

کے منہ پر ہاتھ رکھنے میں کامیاب ہو گیا اور اس کی کنپٹی پر ایک خاص انداز میں گھونسہ رسید کیا جو ہتھوڑے سے زیادہ کارگر تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ یوں ساکت ہو گیا جیسے چابی سے چلنے والے کھلونے کی چابی ختم ہو گئی ہو۔

میں اسے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چاروں شانے چت فرش پر پڑا تھا اور اس کی ناک سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ رہی تھی۔ غنیمت تھا کہ زیادہ دھینگا مشتی نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ کوئی نہ کوئی متوجہ ہو جاتا یا برابر والے کمروں ہی سے کوئی باہر آجاتا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ میری ساری تگ و دو اور انتظار کے نتیجے میں گلنار کا جو سُراغ سامنے آیا تھا، وہ یہی محمد شاہ تھا۔ مجھے صرف اسی سے معلومات ہو سکتی تھیں۔ اسے میں یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا اور اس کا اپنے پیروں پر چل کر میرے ساتھ جانا ممکن نہیں تھا۔ اگر ریوالور کی نال پر اپنے ساتھ لے جاتا تو راستے میں گڑبڑ کر سکتا تھا۔ اور میرے لیے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے اسے گولی مارنا ممکن نہ ہوتا کیونکہ میں کسی قانونی اُلجھن کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ محمد شاہ کو کندھے پر اُٹھا کر ہوٹل سے باہر لے جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ میرا کمرہ ہوٹل کی پہلی منزل پر تھا۔ نیچے جانے کے لیے مجھے بہت سے کمروں کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ اس سے آگے ٹیلیفون ایکسچینج تھا، لاؤنج تھا، بک اسٹال وغیرہ تھا، جہاں پر رات گئے تک کچھ نہ کچھ افراد موجود رہتے تھے۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا، پھر اُٹھ کر عقبی کھڑکی پر پہنچا۔ کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ یہ کھڑکی عقبی گلی میں کھلتی تھی جو کچی تھی۔ ادھر سے لوگوں کا گزر غالباً کم ہی تھا کیونکہ جا بجا کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا۔ اب ایک ہی طریقہ ممکن تھا کہ محمد شاہ کو رسی سے باندھ کر اس کھڑکی کے راستے گلی میں اتارا جاتا اور وہاں سے کسی گاڑی میں ڈال کر کسی اور ٹھکانے پر لے جاتا۔ لیکن اس طریقے پر رات ہی کے کسی حصے میں عمل ہو سکتا تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ گاڑی اپنی یا کسی دوست کی ہوتی۔ کوئی ٹیکسی والا تو اس طرح کسی بے ہوش آدمی کو لے جانے پر ہرگز رضامند نہ ہوتا۔

استاد مجو کے اکھاڑے کے ایک پہلوان رشید کے پاس گاڑی تھی۔ پیشے کے لحاظ سے وہ تاجر تھا۔ پہلوانی شوقیہ کرتا تھا۔ استاد مجو حکم دیتے تو وہ میرے لیے رات کے وقت گاڑی لے کر اس گلی میں آ سکتا تھا اور میں محمد شاہ کو اکھاڑے ہی پر لے جا سکتا تھا۔ وہاں اس کے فرشتے بھی وہ سب کچھ اگل دیتے جو اسے معلوم تھا۔

میں قدرے مطمئن ہو گیا۔ ایک ڈسٹر کا کچھ حصہ پھاڑ کر میں نے محمد شاہ کے مُنہ میں ٹھسیڑا اور باقی کپڑا سختی سے مُنہ پر باندھ دیا۔ بستر پر ایک فالتو چادر پڑی تھی۔ اس سے رسّے کا کام لیتے ہوئے میں نے ایک سرے سے اس کا ہاتھ اور دوسرے سے پاؤں باندھے، پھر اسے بیڈ کے نیچے دھکیل دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ شام کو استاد مجو سے ملنے جاؤں گا۔ اس وقت رشید پہلوان بھی آ چکا ہو گا۔ اس وقت تک محمد شاہ کو بیڈ کے نیچے ہی رہنا تھا خواہ وہ ہوش میں ہی آ جاتا۔

مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی لیکن ویٹر کو کمرے میں بلانا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں اپنا حلیہ درست کر کے کھانا کھانے نیچے ڈائننگ ہال کی طرف چل دیا۔

کھانا میں نے نہایت اطمینان سے اور محظوظ ہوتے ہوئے کھایا۔ ایک شکار میرے ہاتھ آ چکا تھا اور وہ بھی نہایت اہم شکار... مجھے یقین تھا کہ اب گاڑی کچھ آگے بڑھے گی۔ میں کھانے کے بعد کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ میں دن ڈھلے استاد کے اکھاڑے میں پہنچنا چاہتا تھا۔ اور ابھی چار ہی بجے تھے۔ بک شاپ پر کھڑے ہو کر میں نے کچھ اور وقت رسالے وغیرہ دیکھنے میں گزارا، پھر مجھے خیال آیا کہ ہوٹل کے لاکر سے مجھے اپنا بریف کیس بھی نکلوا لینا چاہیے۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر میں نے بریف کیس لیا۔ اس میں بھی کچھ وقت لگ گیا۔ تقریباً پانچ بجے میں نے استاد کے اکھاڑے کی طرف جانے کا ارادہ کیا اور سوچا کہ جانے سے پہلے کمرے پر ایک نظر ڈال آؤں۔ اگر محمد شاہ ہوش میں آ گیا ہو اور کسی طرح بیڈ کے نیچے سے کھسک آیا ہو تو اسے دوبارہ وہیں ٹھونس دیا جائے۔

کمرے میں پہنچ کر میرا ماتھا ٹھنکا کیونکہ عقبی کھڑکی دوبارہ کھلی نظر آ رہی تھی جبکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں جاتے

وقت اسے بند کر کے گیا تھا... پھر میری نظر فرش پر پڑی ہوئی اس چادر پر پڑی جسے رسے کی جگہ استعمال کرتے ہوئے میں نے محمد شاہ کے ہاتھ پاؤں باندھے تھے۔ چادر میں گرہیں اسی طرح لگی ہوئی تھیں، لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ چادر صحیح طور پر رسی کا کام نہیں دے سکی تھی۔ میں نے بیڈ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہاں خون کے چند دھبوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے احمقوں کی طرح باتھ روم میں بھی جھانکا مگر ظاہر ہے کہ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ آیا تو دروازے کے راستے تھا، مگر بھاگا کھڑکی کے راستے تھا۔ شاید اسے اندیشہ رہا ہو کہ کہیں مجھ سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ اس کا سائیلنسر والا پستول میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں ڈالا تھا۔ وہ البتہ وہیں موجود تھا۔

میں تھکے تھکے سے انداز میں ایک کرسی پر گر پڑا۔ ایک سراغ، ایک شکار ہاتھ آیا بھی تھا تو میری حماقت یا بھول پھر ان معاملات میں میرے اناڑی پن کی وجہ سے نکل گیا تھا۔ دفعتاً میری کسی نامعلوم حس نے میرے جسم میں خفیف سا ارتعاش پیدا کر دیا۔ ایک انجانے خطرے کے احساس سے میرے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑ رہی تھی۔ خطرہ شاید ابھی کہیں دور تھا لیکن میرے ذہن کی فریکوئنسی پر جیسے اس کا کوئی سگنل موصول ہوا تھا۔ میں نے بریف کیس اٹھایا۔ اپنے کپڑے بھی اس میں ٹھونسے اور تیزی سے کمرے سے نکل آیا۔ میرے احساس نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ اب اس ہوٹل میں اور خصوصاً اسی کمرے میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ نیچے، میں نے کاؤنٹر پر یہ بتانے کے لیے بھی رکنا مناسب نہ سمجھا کہ میں کمرہ چھوڑ رہا ہوں۔ اس کارروائی میں کئی منٹ لگ جاتے۔ چابی خاموشی سے کاؤنٹر پر دے کر میں نکلتا چلا گیا۔

ہوٹل سے نکل کر میں فٹ پاتھ پر دو قدم ہی چلا تھا اور رکشے ٹیکسی کی تلاش میں نظر دوڑا رہا تھا کہ لکشمی چوک کی طرف سے پولیس کی جیپ آتے دیکھی۔ میں احتیاطاً اسٹیشن کی سمت میں چند قدم اور آگے بڑھ گیا۔ پھر میں نے کن انکھیوں سے دیکھا جیپ ہوٹل کے سامنے آکر رک گئی تھی اور دو باوردی پولیس والے اتر کر تیزی سے ہوٹل میں جا رہے تھے۔ میری دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔ کوئی رکشہ یا ٹیکسی خالی نظر نہیں آ رہی تھی اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ... دوڑنے لگوں یا میرے چلنے کے انداز سے گھبراہٹ کا اظہار ہو۔ میں بظاہر [illegible] سے چلتا رہا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے ایک غیر محسوس سے انداز میں مڑ کر دیکھا۔

پولیس والے واپس آ کر جیپ میں بیٹھ چکے [illegible] جیپ آگے بڑھنے لگی تھی۔ ٹریفک زیادہ ہونے [illegible] سے اس کی رفتار سست تھی۔ میرے اعصاب میں [illegible] سی ہونے لگی۔ میں اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں [illegible] دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ میں سیدھا اسٹیشن کی [illegible] طرف جانے والے راستے کی بجائے نکلسن روڈ پر [illegible] سڑک پر ٹریفک کا ہجوم کچھ کم تھا لیکن خالی رکشہ ٹیکسی [illegible] یہاں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ تجربہ مجھے زندگی میں پہلے [illegible] چکا تھا کہ جب کسی چیز کی اشد ضرورت ہو اس [illegible] وہ نہیں ملا کرتی۔ پھر میں نے دیکھا کہ جیپ کا رخ [illegible] روڈ کی طرف ہی تھا۔ میرے جسم سے پسینہ پھوٹنے لگا [illegible] نے دہشت زدہ انداز میں دائیں طرف پھنسی ہوئی گا[illegible] کی طرف دیکھا۔ ایک ٹیکسی ٹریفک میں پھنسی ہونے [illegible] باعث تقریباً میرے ساتھ ساتھ ہی چل رہی تھی۔ [illegible] پچھلی سیٹ پر صرف ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ قدرے گوری چٹی، خوش شکل اور ادھیڑ عمر کی تھی۔ صاف سفید ریشمی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی سے میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میری نظر اس پر پڑی تو وہ بیٹھے بیٹھے [illegible] میں مسکرا دی... اور میں دوسرے ہی لمحے نتائج کی [illegible] کیے بغیر دروازہ کھول کر رینگتی ہوئی ٹیکسی میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔

وہ خود بھی مجھے جگہ دینے کے لیے دوسری طرف [illegible] گئی... اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے میرے بیٹھنے پر [illegible] اعتراض نہیں۔ مجھے عورتوں کی آنکھوں کی زبان سمجھنے [illegible] نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا کہ جب اس عورت نے میری [illegible] دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں کوئی خاص تاثر تھا یا نہیں [illegible] میں نے تو محض جوا کھیلا تھا اور اتفاق سے داؤ چل ہی گیا [illegible] ڈرائیور بھی کچھ نہ بولا اور نہ ہی اس نے مڑ کر دیکھا۔ گویا اس کے [illegible] لیے کوئی غیر متوقع بات نہ رہی ہو۔ عورت نے ایک نظر [illegible] بریف کیس کی طرف دیکھا، پھر سرگوشی کے سے انداز میں [illegible]

"پولیس پیچھے لگی ہوئی ہے؟"

"نہیں تو..." میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہو [illegible]

[illegible] تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہو۔ میرے پیچھے کیوں لگے گی، [illegible]ہیں، میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

وہ مسکرا دی پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر مصنوعی [illegible]ی سے بولی: "واقعی یہ شرافت کا زمانہ نہیں۔ ایک [illegible] اسے وقت میں کسی کے کام آؤ۔ اوپر سے بدمعاش [illegible]ہلاؤ!"

"نہیں، نہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" میں نے [illegible]دری سے کہا۔ "میں تو صرف اپنے شریف ہونے کا تذکرہ [illegible] رہا تھا۔ میں نے تمہارے متعلق تو کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے مڑ کر شیشے [illegible] پیچھے دیکھا پھر ڈرائیور سے مخاطب ہوئی: "شیدے! گاڑی [illegible]ری نکال نا اس جنجال سے۔ آج تیری مہارت کو کیا ہوا! [illegible]ہے، آج لفٹ نہیں مل رہی تجھے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ چند سیکنڈ [illegible] وہ واقعی بڑی مشاقی سے گاڑی کو بھیڑ بھاڑ سے نکال لے [illegible]، ایمپریس روڈ والا چوراہا کراس کرنے کے بعد ٹریفک [illegible] کم ہو گیا اور ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی سیدھی چلتی رہی۔ [illegible] نے مڑ کر دیکھنے کی بجائے عقب نما آئینوں میں دیکھا۔ [illegible]یس جیپ کا دور دور نام و نشان تک نہیں تھا۔ ٹیکسی [illegible] شاہو کی طرف مڑ گئی اور بہت سے گلی کوچوں میں چکر [illegible]نے کے بعد بالآخر پرانی طرز کے ایک دو منزلہ مکان کے [illegible] سامنے رک گئی۔ عورت نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا اور [illegible]ے ساتھ خود بھی اتر آئی۔ ٹیکسی ڈرائیور اب بھی ایک لفظ [illegible]ے نکالے بغیر ٹیکسی لے کر آگے چل دیا۔ عورت نے [illegible] کرایہ ادا کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اور نہ ہی اس [illegible] طلب کیا تھا۔

"اچھا... میں چلتا ہوں... تمہارا بہت بہت شکریہ۔" [illegible] نے اس عورت کو مکان کی طرف بڑھتے دیکھ کر کہا۔

"جاؤ گے کہاں؟" وہ رک کر مڑتے ہوئے بولی: "ہو [illegible]سکتا ہے اگلے موڑ پر پولیس کی جیپ کھڑی ہو۔ تمہیں اس [illegible] وقت ایک پناہ گاہ کی ضرورت ہے۔ آ جاؤ۔" اس نے [illegible] مکان کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم تم سے کرایہ تھوڑا ہی مانگیں گے [illegible] نہ ہی ہم اس قسم کے لوگ ہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اس کے ساتھ ہو لیا۔ میں جہاں بھی جاتا میرے لیے خطرات یکساں ہی تھے۔ ایک تاریک سی ڈیوڑھی سے گزر کر ہم کشادہ صحن میں پہنچے جہاں چاروں طرف کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ صحن کے وسط میں ایک بے ڈھنگی سی ڈائننگ ٹیبل تھی جس پر دو ہٹے کٹے مونچھوں والے نوجوان موجود تھے۔ ان کے سامنے چائے کے برتن رکھے ہوئے تھے اور وہ کپ ہاتھوں میں لیے چسکیاں لے رہے تھے۔ شاید ان کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی مگر ہمیں دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئے اور آنکھیں سکیڑ کر میرا جائزہ لینے لگے۔ عورت کے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھا جو اس نے آگے بڑھ کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا اور نوجوانوں کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتانے لگی: "یہ دونوں میرے بیٹے ہیں۔" پھر میری طرف اشارہ کر کے بولی: "اور یہ ہمارے مہمان ہیں۔"

اس نے مجھ سے میرا نام تک نہیں پوچھا تھا اور مہمان بنا لیا تھا۔ طبیعت کی بہت ہی مہربان معلوم ہوتی تھی۔ ان نوجوانوں نے بھی کچھ نہ پوچھا۔ بس مجھے گھورتے ہی رہے۔ نہ جانے کیوں مجھے وہ اس عورت کے بیٹے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ایک تو وہ کچھ ایسے نوعمر بھی نہیں تھے اچھے خاصے پختہ کار معلوم ہوتے تھے جبکہ عورت بھی زیادہ عمر کی نہیں تھی۔ ویسے بھی ماں بیٹوں پہ نظر ڈال کر ہی احساس ہو جاتا ہے کہ ان کے درمیان واقعی یہ رشتہ ہے۔ جب کہ یہاں وہ احساس مفقود تھا۔ عورت کا اشارہ پا کر میں بیٹھ گیا۔ وہ خود بھی تھکے تھکے انداز میں بیٹھ چکی تھی۔ پھر اس نے آواز دی: "ریشماں! چائے اور لے آ۔ میں آ گئی ہوں... اور ایک مہمان بھی آیا ہے۔"

"اچھا... ماں جی! ابھی لائی۔" ایک طرف سے مترنم سی آواز سنائی دی۔ اس طرف شاید کچن تھا۔

چند منٹ بعد ایک کامنی سی لڑکی چائے کی ٹرے اٹھائے کچن سے نکلی اور سر جھکائے میز تک آ گئی۔ وہ ٹرے میز پر رکھنے لگی تو ایک لمحے کے لیے میری اس سے نظر ملی۔ اس کی آنکھوں میں اداسیاں جاگزیں تھیں۔ وہ دبلی پتلی اور بے حد حسین تھی... نقوش گویا دست قدرت نے بڑی ہی نفاست و نزاکت سے تراشے تھے۔ رنگت چاندنی کی طرح سپید تھی مگر اس کے سراپا میں تمام تر خوبصورتی کے باوجود کشش کی کمی تھی۔ وہ عجیب پھیکی پھیکی سی شخصیت

تھی جیسے اس کے وجود سے زندگی کی ملاحت نچوڑ لی گئی ہو۔
"یہ میری بیٹی ریشماں ہے۔" عورت نے بتایا۔
ایک بار پھر مجھے اس کے الفاظ بے رُوح لگے۔ میرا دل، میرا احساس کہہ رہا تھا کہ یہاں موجود افراد کے درمیان کوئی رشتہ نہیں، کوئی ناتا نہیں۔ بس کسی نامعلوم مصلحت کے تحت انھوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ لڑکی واپس چلی گئی اور میں نے اپنے خیالات ذہن سے جھٹک دیے۔ اس قسم کے تفکرات میں گھلنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔
چائے کے بعد عورت نے سرسری سے انداز میں باتیں شروع کر دیں۔ کون ہو، کیا کرتے ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کپڑے کا ایک تاجر ہوں۔ شاہ عالمی میں میری دُکان ہے اور آج کل میری کچھ لوگوں سے دشمنی چل رہی ہے جس کی وجہ سے میں کچھ پریشان ہوں۔ عورت نے ہمدردانہ انداز میں سر ہلایا گویا وہ میرے حالات کو بخوبی سمجھ رہی تھی۔ پھر وہ اپنے بارے میں بتانے لگی کہ اس کا شوہر ملک سے باہر ہے۔ بیٹے سبزی منڈی میں کمیشن ایجنٹ ہیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کمیشن ایجنٹ ضرور ہیں مگر سبزی کے نہیں... پھر عورت نے اپنی بیٹی ریشماں کا ذکر چھیڑ دیا کہ بڑی سگھڑ اور سلیقہ شعار لڑکی ہے اور ہر شریف اور سفید پوش گھرانے کی طرح انھیں بھی اپنی لڑکی کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ہے۔ وہ عورت پوری طرح میرے سامنے ایک ایسے گھرانے کی تصویر کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی جس میں کوئی نہایت شریف جوان لڑکی موجود ہوتی ہے اور بے چارے والدین اس کی فکر میں گھلتے ہوئے ہر اس نوجوان کی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں جو ذرا بھی معقول نظر آتا ہے... لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس عورت کی یہ ساری باتیں مصنوعی لگ رہی تھیں۔ سب رٹے رٹائے مکالمے لگ رہے تھے جو عرصے سے لگے ہوئے ایک ہی اسٹیج پر دُہرائے جا رہے تھے۔ دونوں نوجوان بدستور خاموش تھے اور انھیں گویا بس مجھے گھورتے رہنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔
رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ لڑکی نے مکان کی بتیاں روشن کر دی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے میز پر کھانا لگا دیا۔ مجھے بھوک تو نہیں تھی پھر بھی کچھ نہ کچھ کھا لیا۔ پھر عورت گویا مجلس برخاست کر کے اُٹھتے ہوئے بولی: "لاؤ تمھارا بریف کیس

حفاظت سے رکھوا دُوں... اور تمھیں تمھارا کمرہ د[کھا دوں]
تم جب تک چاہو قیام کر سکتے ہو۔"
"میں صرف آج رات ٹھہروں گا۔" میں نے ملا[ئمت]
سے کہا: "اس میں کچھ ضروری کاغذات ہیں جن کا مجھ[ے]
کو مطالعہ کرنا ہے۔ آپ کی شفقت کا شکریہ۔ آپ میر[ا]
خیال رکھ رہی ہیں۔ بالکل اپنوں کی طرح۔"
"اپنے آج کل کہاں، اپنوں کا خیال رکھتے ہیں"
ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی: "اسی لیے تو ہر ا[یک کو]
غیروں میں محبت اور مروّت تلاش کرنا پڑتی ہے"
نے بریف کیس لینے پر اصرار نہیں کیا اور ڈیوڑھی [...]
ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی: "تم اس [...]
سکتے ہو۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے [...]
غسل خانہ ہے۔ ہم زیادہ تر اوپر کی منزل پر رہتے ہیں [...]
کسی چیز کی ضرورت پڑے تو شکور سے کو آواز [دے]
لینا۔ وہ میرا چھوٹا بیٹا ہے۔"
میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور [...]
میں داخل ہو کر دروازے کی کنڈی چڑھا لی۔ پلنگ [...]
کر میں دیر تک سوچتا رہا کہ حالات کا دھارا مجھے کس [...]
میں لے جا رہا ہے؟ اور کس طرح میں وقت کے [...]
گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھ سکتا ہوں [...]
ہر طرف گہرا سکوت چھا چکا تھا... بتیاں بجھ [...]
اور میں نے بھی اپنے کمرے کی بتی بجھا دی تھی لیک[ن]
آنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ رات کے بارہ بجے [...]
مجھے دروازے پر خفیف سے کھٹکے کا احساس ہوا۔ میں [...]
میں درندے کی طرح چوکنا اور تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے [...]
تھا کہ اندر آنے والا اگر مسلح ہوا تب بھی اس کا [...]
عمدگی سے کر سکوں گا۔ اگلی منٹ گزر گئے اور کوئی اند[ر...]
میں نے بے آواز طریقے سے دروازے کی [...]
کنڈی کھولی اور جب آہستگی سے دروازہ کھولنا چاہا تو [...]
ہوا کہ باہر سے کنڈی لگا دی گئی ہے۔ میرے اعصاب [...]
گئے اور میں خاصی دیر تک وہیں دیوار سے ٹیک لگ[ائے]
کھڑا رہا۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا تھا؟ ان لوگوں کے [...]
کیا تھے؟ یہ جو بے بلی کا کھیل مجھے اتنا ڈرا نہیں رہا تھ[ا...]
تھکا رہا تھا۔ میں اعصابی کشیدگی دُور کرنے کے لیے [...]
پھر آ لیٹا اور سوچا کر خود کو حالات کے دھارے پر چھو[ڑ دیا]

[...]ہے۔ میں تن بہ تقدیر ہو گیا کہ اب جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔
تقریباً ایک گھنٹے بعد پھر ہلکی سی سرسراہٹ سن کر [م]یں اُٹھا اور دروازے پر پہنچا۔ اس مرتبہ میں نے دروازے [کو] ذرا سا کھینچا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ [کچھ] دیر پہلے کسی نے دروازے کو کنڈی لگا دی تھی اور [ا]ب کوئی اسے کھول گیا تھا۔ یہ بھی عجیب ہی تماشا تھا۔ [ب]ہر حال، میں نے آنِ واحد میں فیصلہ کر لیا کہ یہاں سے [نک]ل لینا ہی بہتر ہے۔ باہر کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا [م]یں نے بریف کیس اُٹھایا اور بلی کی طرح دبے قدموں [ص]حن میں نکل آیا۔ صحن میں تقریباً تاریکی ہی تھی میں ڈیوڑھی [کی] طرف مڑ گیا۔ ڈیوڑھی میں زیرو کا بلب روشن تھا۔ اور اس وقت اس کی روشنی بھی کافی معلوم ہو رہی تھی۔
اس روشنی میں وہ دروازے کے قریب دیوار [سے] ٹیک لگائے تھکے تھکے سے انداز میں کھڑی تھی۔ وہی لڑکی جس کا نام اس گھر کی مالکن نے ریشماں بتایا تھا اور جس کی ماں ہونے کی وہ دعوے دار تھی۔ اس وقت [وہ] اور بھی زیادہ سپید نظر آ رہی تھی جیسے اس کے جسم سے [خ]ون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا گیا ہو۔ اس کی ہوتی ہوئی آنکھیں [وح]شت سے پھیلی ہوئی تھیں۔
میں نے اس کی وحشت سے پھیلی ہوئی موٹی موٹی [آن]کھوں میں دیکھا اور سب کچھ جاننے کے باوجود خواہ مخواہ تصدیق چاہتی: "کنڈی تم نے کھولی تھی؟"
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور میٹھی میٹھی سی آواز [می]ں بولی: "فوراً یہاں سے نکل جاؤ ورنہ کچھ دیر بعد وہ تینوں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے نکل آئیں گے۔"
"کیسا منصوبہ؟" میں نے پوچھا۔
"لوگوں کو اسی طرح گھیر گھار کر لوٹ لینا ان کا پیشہ ہے اور جو زیادہ اڑنے کی کوشش کرے اسے یہ لمبے [ع]رصے کے لیے پولیس کے چکر میں پھنسا دیتے ہیں... اور [ا]س سارے کھیل میں سب سے اہم رول مجھے ادا کرنا [پڑ]تا ہے۔" اس کی آواز جیسے بالکل ہی بیٹھ گئی۔
"میں اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں ہوں [لی]کن اس وقت میں کسی ہنگامے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ [ا]س لیے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا: "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر تم اتنی ہی نیک دل ہو تو ان کا ساتھ دینے کے بجائے بغاوت کیوں نہیں کر دیتیں؟"
"میں کچھ ایسی نیک دل بھی نہیں ہوں۔" وہ خود استہزائیہ سے انداز میں مسکرائی: "میں نے اس سے پہلے کسی کی مدد نہیں کی۔ بس تمھیں دیکھ کر نہ جانے کیوں دل نے کہا کہ تم یقیناً پہلے ہی الجھنوں میں گرفتار ہو، تمھارے ساتھ مزید کوئی زیادتی نہیں ہونا چاہیے۔"
"تم اسی عورت کی بیٹی ہو؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں... مگر مجھے پالا اسی نے ہے... لیکن یہ لمبی کہانی ہے... تم ان باتوں میں پڑ کر وقت ضائع مت کرو۔" وہ بے تابی سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی: "جاؤ۔"
"تم نے میری جو مدد کی ہے، اس احسان کا بدلہ شاید میں کبھی نہ دے سکوں... لیکن اگر زندگی نے مہلت دی تو تمھاری مدد کو ضرور آؤں گا۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
"مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" یہ کہہ کر وہ مجھے نہیں بلکہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی تھی کیونکہ اسی لمحے میں نے اس کی آنکھوں میں نمی جھلملاتے دیکھی مگر اس نے فوراً ہی چادر کے پلّو سے آنکھیں پونچھ لیں اور سنبھلی ہوئی آواز میں بولی: "اگر تمھیں رات کو ٹھہرنے کا مسئلہ درپیش ہو تو پچھلی گلی میں چلے جاؤ۔ ہمارے مکان کی سیدھ میں ایک چھوٹا سا مکان ہوگا۔ اس کے سامنے ٹیکسی کھڑی ہو گی۔ دستک دو گے تو ایک گورا چٹا جوان باہر آئے گا... باؤ اسلم اس کا نام ہے۔ ٹیکسی چلاتا ہے۔ ٹیکسی اس کی اپنی ہے... اس سے کہنا کہ مجھے ریشماں نے بھیجا ہے۔ اس کے بعد تم اس سے جان بھی مانگو گے تو پیش کر دے گا۔"
میری آنکھوں میں سوال پڑھ کر وہ بولی: "ہماری دو ٹیکسیاں بھی چلتی ہیں نا... کسی زمانے میں وہ ہماری ہی ٹیکسی چلاتا تھا مگر جب ماں کو پتہ چلا کہ وہ مجھ سے... محبت کرنے لگا ہے تو اسے نکال دیا... لیکن خیر... یہ پُرانی باتیں ہیں... اب تو اس نے اپنی ٹیکسی لے لی ہے... اب تم جاؤ۔" وہ مڑی اور وحشت زدہ سی نظروں سے صحن کی طرف دیکھنے لگی۔ میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ عقب میں دروازے کی کنڈی چڑھانے

کی خفیف سی آواز سنائی دی۔ گلی میں مڑتے ہی پول پر ایک مریل سا بلب لٹکا ہوا دکھائی دیا جس کی بیمار روشنی میں سیلن زدہ گلی ایک لمبی سی سرنگ دکھائی دے رہی تھی۔ میں اندازاً گھوم کر دوسری گلی میں، اس مکان کے عقب میں پہنچا۔ ٹیکسی والی نشانی کی مدد سے مجھے مطلوبہ مکان فوراً ہی مل گیا اور میں نے بے دھڑک دستک دے ڈالی۔

پہلی ہی دستک پر ایک نوجوان نے دروازہ کھول دیا۔ وہ صرف گورا چٹا ہی نہیں بے پناہ وجیہہ بھی تھا۔ کشمیری معلوم ہوتا تھا۔ صاف ستھری شلوار قمیص میں تھا اور ابھی شاید سونے کے لیے نہیں لیٹا تھا... کیونکہ آنکھوں میں غنودگی نہیں تھی۔ البتہ مجھے دیکھ کر ان آنکھوں میں اُلجھن ضرور اُبھر آئی تھی۔

"مجھے ریشماں نے بھیجا ہے۔" میں نے جھجکتے ہوئے اُسے بتایا۔

اس کی آنکھوں سے اُلجھن کے آثار یک لخت غائب ہوگئے۔ چہرے پر رونق آگئی... اور میں یک لخت ہی اس کے لیے ایک نہایت معزز و محترم ہستی کا درجہ اختیار کر گیا۔ وہ گویا میرے قدموں میں لوٹنے کو بے قرار نظر آنے لگا۔ "اندر آجائیے ناجی... آپ کھڑے کیوں ہیں... تشریف لائیے... اسے اپنا ہی گھر سمجھیے۔" وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے جاتے ہوئے بولا۔

یہ ایک ہی بڑے سے کمرے اور خاصے کشادہ صحن پر مشتمل مکان تھا۔ وہی کمرہ ڈرائنگ روم بھی تھا اور بیڈ روم بھی۔ فرنیچر کے علاوہ بھی ضرورت کی سبھی چیزیں وہیں موجود تھیں۔ اس نے ایک بیڈ سے میلے کپڑوں کا انبار ہٹایا اور محبّت و احترام سے مجھے بٹھایا۔ "فرمائیں... میں آپ کی کیا سیوا کروں؟ پہلے چائے لاؤں یا کھانے کے بعد چائے پینا پسند کریں گے؟" اس کا لہجہ خاصا شستہ تھا۔

"نہیں۔ میں کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں۔ بس میں تمھیں آج رات قیام کی زحمت دوں گا۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ اس گھر کو آپ اپنا گھر سمجھیں۔ میں نے یہ صرف رسماً نہیں کہا بلکہ سچے دل سے کہا ہے۔ آپ یہاں مہینوں، برسوں، جب تک آپ کا جی چاہے رہیں۔

میں آپ کا خادم، یہاں آپ کی ہر خدمت کے ہوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں کون ہو کن حالات میں تمھارے پاس آیا ہوں؟" میں نے سے کہا۔

"جب آپ نے کہہ دیا کہ آپ کو ریشماں نے ... تو بس، اس کے بعد کسی سوال کی گنجائش ہی نہ جاتی۔" وہ بے پروائی سے سر جھٹک کر بولا۔ "اگر نے کوئی سوال کیا... تو میرے خیال میں یہ ریشما توہین ہوگی۔"

کمال بات کی تھی اس نے... اور عجیب لہجے کہی تھی۔ میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ سینے میں ایک عجیب سے خلا کا احساس ہونے لگا۔ شاید پر اتنا مان نہیں تھا اور کسی کو مجھ پر اتنا مان نہیں شاید میں نے کسی کو آج تک اس طرح نہیں چاہا تھا شاید کسی نے اس طرح مجھ سے پیار نہیں کیا تھا کمی تھی میری زندگی میں۔ زندگی نے کچھ سوچنے، پر ذرا سستانے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ دم چُپ سا ہوگیا تو وہ معذرت خواہانہ انداز میں "آپ شاید کافی تھکے ہوئے ہیں۔ لیٹ جائیے... کی حالت پر نہ جائیے۔ میں تھوڑی دیر پہلے باہر سے ہوں۔ چیزیں سمیٹ کر نہیں رکھ سکا۔ آپ کو نیند جائے گی نا؟"

"میں نے اس سے کہیں بُری جگہوں پر آرام کراتیں گزاری ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا اور بریف تپائی پر رکھ کر بیڈ پر دراز ہوگیا۔ وہ بھی بتّی بجھا گیا۔ یہاں میں نے کچھ ایسا اطمینان اور بے فکری کی کہ چند منٹ بعد ہی مجھے نیند آگئی۔

صبح دن چڑھے میری آنکھ کھلی تو وہ مجھ سے پہ تھا بلکہ غسل بھی کر چکا تھا اور دیوار پر ٹنگے ہو کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔ مجھے اُٹھتے دیکھ کر "آپ بھی غسل وغیرہ سے فارغ ہو لیجیے۔ میں آپ لیے ناشتہ تیار کرتا ہوں۔"

میں فارغ ہوا تو وہ کچن میں تھا، وہیں سے دے کر بولا: "اخبار میز پر موجود ہے۔ آپ تھوڑی

ان سچی خبریں پڑھ کر دل بہلائیے۔ میں ابھی ناشتہ کر حاضر ہوتا ہوں... دراصل میں کبھی کبھار ہی گھر پر شتہ بناتا ہوں... اس لیے کچھ زیادہ مہارت نہیں ہے۔"

"تم نے ناحق تکلیف کی۔ باہر چل کر کسی ہوٹل میں شتہ کر لیتے۔" میں نے کہا۔

"بس... میں نے سوچا کہ آپ کی کچھ خدمت تو نی چاہیے۔" وہ ہنس کر بولا۔

میں بیڈ پر بیٹھ کر اخبار اُلٹنے پلٹنے لگا۔ دفعتاً ایک سویر پر میری نظر پڑی اور میں بیڈ سے گرتے گرتے بچا۔ آنکھیں مل کر میں نے دوبارہ تصویر کو دیکھا اور مجھے یقین ہوگیا کہ میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے رہیں۔ وہ نازو کی تصویر تھی اور ایک اشتہار میں چھپی ہوئی تھی۔ اشتہار تلاشِ گمشدہ کا تھا۔ تلاشِ گمشدہ کی سُرخی کے نیچے لکھا تھا: نازو! تم کہاں ہو۔

اشتہار کا مضمون کچھ یوں تھا۔

نازو! ایک سال سے ہم تمھاری تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ تمھیں اغوا کیا گیا ہے یا تم اپنی مرضی سے کہیں روپوش ہو۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ تمھاری جُدائی میں متعلقین کی کیا حالت ہے۔ اگر تم کسی کی تحویل میں ہو تو ... ہم اعلان کرتے ہیں کہ وہ تمھیں ہم تک پہنچا دیں، ہم منہ مانگی رقم ان کی خدمت میں پیش کریں گے اور اپنی مرضی سے روپوش ہو تو خدا کے لیے لوٹ آؤ۔ ہم سب سے خوشیاں رُوٹھ گئی ہیں۔

عابد حسین...

نام کے آگے گل برگ کا ایک پتہ تھا۔ میں بار بار اس اشتہار کو پڑھے جا رہا تھا اور نازو کی تصویر کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس دوران نہ جانے کب اسلم نے ناشتہ لا کر میرے سامنے رکھ دیا لیکن میں اس کی تشویش زدہ آواز سُن کر چونکا۔

"باؤ جی کیا ہوگیا آپ کو؟ یہ ٹکٹکی باندھے اخبار کی طرف کیوں گھورے جا رہے ہیں؟ کوئی بہت بُری خبر پڑھ لی ہے کیا؟" پھر وہ بھی میرے قریب آکر اخبار پر

جُھک گیا اور میری نظر کے تعاقب میں اس نے بھی فوراً ہی وہ اشتہار دیکھ لیا۔ ویسے بھی اشتہار خاصا نمایاں تھا۔ اس نے اشتہار پڑھا، تصویر کو غور سے دیکھا پھر سنجیدگی سے بولا: "باؤ جی! لگتا ہے آپ کسی لمبی ہی کہانی میں اُلجھے ہوئے ہیں... اور یہ بھی اس کہانی کا ایک حصّہ ہے۔" اس نے اشتہار کی طرف اشارہ کیا... پھر وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے اور ہاتھ ملتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں بولا: "میں کوئی کام کا آدمی تو نہیں ہوں باؤ جی! لیکن اگر مجھے سب کچھ بتا دیں تو شاید یہ نکما آدمی آپ کے کچھ کام آسکے۔ جو حکم دیں میں حاضر ہوں، کیونکہ آپ کو ریشماں نے بھیجا ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ اس سیدھے سچّے سے نوجوان کو اپنی کہانی سُنا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ میں نے مختصراً اُسے نازو والا قصّہ سُنا دیا۔ سب کچھ سُن کر کافی دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، پھر چونک کر سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ "آپ تو واقعی پریشان کن حالات میں پھنسے ہوئے ہیں... اخباروں، کتابوں کے قصّے کہانیوں جیسے واقعات سے گزر رہے ہیں آپ تو... آپ بتائیں میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تمھیں کوئی تکلیف دینے کا میرا حق نہیں بنتا..." میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر تم چاہو تو میری چھوٹی سی مدد کر سکتے ہو۔ فی الحال میرا اوّلین مسئلہ اس پتے پر پہنچنا ہے۔" میں نے اخبار میں چھپے ہوئے پتے پر اُنگلی رکھی۔

"ناشتہ کر لیں۔ ابھی چلے چلتے ہیں۔ گاڑی باہر کھڑی ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

میں نے جُوں تُوں اس کے ساتھ ناشتہ کیا... اور بریف کیس وہیں اس کی الماری میں رکھوا کر باہر آگیا۔ ایڈریس ہم دونوں نے ہی ذہن نشین کر لیا تھا۔

مطلوبہ کوٹھی پر پہنچ کر میں باہر سے ہی اس کی شان و شکوہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ نہایت عظیم الشان کوٹھی تھی۔ اُونچا سا گیٹ بند تھا۔

"تم یہیں رُک جاؤ۔" میں نے اسلم سے کہا۔ "اگر کوئی گڑبڑ نہ ہوئی تو میں بعد میں تمھیں اندر بُلوا لوں گا۔"

میں نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ چند لمحے بعد چوکیدار ٹائپ ایک شخص نے شکی گیٹ کھول کر باہر جھانکا۔ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "آج صبح عابد صاحب کی طرف سے جو اشتہار شائع ہوا ہے، میں اس کے سلسلے میں آیا ہوں۔"

"آؤ، آؤ، اندر آجاؤ...!" چوکیدار اشتیاق سے بولا۔ میرے اندر پہنچتے ہی اس نے گیٹ پر تالا لگا دیا۔ مجھے قدرے تشویش ہوئی لیکن چوکیدار سرسری سے لہجے میں بولا۔ "آپ کو ذرا زحمت تو ہوگی لیکن ایک منٹ یہیں رکیے، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوڑتا ہوا اندر چلا گیا اور میں وہیں کھڑا رہ گیا۔

دفعتاً مجھے اپنے قریب ہی ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔

میں چونک کر پلٹا تو میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

چند قدم دور ایک قد آور کتا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

اس کے نکیلے دانت وحشیانہ انداز میں چمک رہے تھے اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے گھورنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اپنی وحشیانہ جبلت کے باعث اس نے تو فوراً ہی پہچان لیا جب کہ مجھے کچھ دیر ہوگئی۔ یہ بلاشبہ وہی خونخوار کتا تھا جو قصور کے قریب رحمت علی نامی زمیندار کی حویلی میں مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔

کتے کو دیکھ کر پہلے تو مجھے ایک جھرجھری سی آگئی ... پھر میرا جسم ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گیا۔ اس کتے پر کسی ایسے بھیڑیے کا گمان ہوتا تھا جو انسان کو پل بھر میں چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ مجھے دیکھ بھی کچھ ایسی ہی نگاہوں سے رہا تھا۔ ممکن تھا کہ اس کے نیزوں جیسے تیز دانت میرے گوشت سے لذت آشنا ہو جاتے لیکن نہ جانے اس نے مجھ پر حملہ کیوں نہیں کیا... پھر ایک احساس، ایک یاد، ایک تصور نے میرے ذہن پر غلبہ پالیا اور خوف کا احساس نہ جانے کہاں جا کر رک گیا۔ اب اس خوفناک کتے کو دیکھ کر، نازو سے متعلق جاننے کے اشتیاق پر بیک وقت کئی الجھنیں غالب آگئیں۔ کتے کی موجودگی مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ مجھے وہ رات یاد آگئی، جب نامعلوم مسلح افراد نے مجھے چودھری رحمت علی کی حویلی میں کودنے پر مجبور کیا تھا۔ پھر اس حوالے سے نہ جانے کیا کیا یاد آگیا۔ نازو کا خیال پس منظر میں چلا گیا۔

میرا بنیادی مسئلہ شاید یہی تھا کہ میں ارتکاز آدمی تھا، آہستگی سے... یکسوئی کے ساتھ قدم اٹھانے کا عادی تھا جبکہ مجھے پیش آنے والے واقعات کی رفتار بہت تیز تھی۔ میں خود کو مرتکز کرنے کی کوشش کرتا رہ جاتا اور واقعات بپھری ہوئی موجوں کی طرح مجھے کہیں کا کہیں لے جا کر پٹخ دیتے تھے۔

کتے کی ہلکی ہلکی غراہٹیں میرے ارتکاز کی پرسکون جھیل کے لیے کنکر ثابت ہوئیں۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھ پر جھپٹنے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں چوکنے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت کسی نے کتے کو پکارا۔ "ٹامی... ٹامی، ادھر آؤ۔"

کتا سر جھکائے، دم ہلاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اب میں اس طرف متوجہ ہوا، جدھر سے وہ آواز آئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ درحقیقت کتے کو دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب اس سے بھی سامنا ہوگا۔ یہ وہی شخص تھا، جس سے حویلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بظاہر مجھے پناہ دی تھی لیکن درحقیقت مجھے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ دوسری طرف وہ بھی مجھے دیکھ کر کم حیران نہیں تھا۔ وہ اس وقت ایک نفیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا اور روشنی میں وہ بے حد وجیہ لگ رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا، میرے قریب آگیا۔ "لگتا ہے، میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

"ممکن ہے، آپ نے دیکھا ہو۔" میں نے لاپروایانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن مجھے تو ایسا محسوس نہیں ہوتا۔" اس کے انداز سے یہ احساس ہوتا تھا جیسے وہ تجاہل سے کام لے رہا ہے۔ اس صورت میں مجھے کیا پڑی تھی کہ میں اعتراف شناسائی کرتا، جبکہ اس سے ملاقات میرے لیے کچھ خوش گوار بھی نہیں تھی۔

"جھوٹ مت بولو۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ ٹامی نے تمہیں پہچان کر میری مشکل آسان کر دی۔ تم وہی ہو جو ایک رات دیوار پھلانگ کر میری حویلی میں داخل ہوئے تھے۔ خیر، آؤ، اندر آؤ۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے پلٹ کر مقفل گیٹ کی طرف دیکھا اور پھر اس کے پیچھے چل دیا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا۔

چند لمحے بعد میں ایک آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس نے ایک کرسی سنبھال لی۔ اگرچہ اس نے مجھے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا لیکن میں نہایت اطمینان سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہاں تو برخوردار، اب بتاؤ، تم کون ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں وہی شخص ہوں، جس سے آپ حویلی میں ملے تھے۔ لیکن میں نے ابھی تک اپنا نام نہیں بدلا ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ "تو کیا میں نے نام بدل لیا ہے؟"

"میرا تو یہی خیال ہے۔ وہاں تم چودھری رحمت علی تھے اور اب عابد حسین کے روپ میں سامنے آئے ہو۔" میں نے بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے، میں نے اب تک خود کو عابد حسین کی حیثیت سے تو متعارف نہیں کرایا۔"

"درست ہے۔ لیکن میں جس اشتہار کے جواب میں یہاں آیا ہوں، وہ عابد حسین کی طرف سے ہی شائع ہوا ہے۔"

"خیر، فضول باتیں چھوڑو۔ میں تمہارے سامنے صفائی کیوں پیش کروں۔ ویسے بھی غیر ضروری باتیں جاننا بچوں کی صحت کے لیے مضر ثابت ہو سکتا ہے۔" اس کا لہجہ یکایک سرد ہو گیا۔

میرے سینے میں تو آگ بھڑک رہی تھی۔ میں نے آپ جناب کے صیغے کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ "تم شاید چالیس سال سے زیادہ عمر کے بچوں کی بات کر رہے ہو۔"

اس نے گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

سچ تو یہ ہے کہ اب میں پچھتا رہا تھا۔ آنکھ بند کر کے کنویں میں کودنا کوئی خوش گوار کام نہیں ہوتا۔ لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے گویا کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے نازو کے متعلق کوئی اطلاع دینے آئے ہو نا؟ بس، شروع ہو جاؤ۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میں کھری باتوں کا قائل ہوں۔ جھوٹ سے سخت نفرت ہے مجھے۔ بتاؤ، نازو کہاں ہے؟"

"میں تو خود نازو کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"تم پاگل ہو یا مجھے بے وقوف بنانے آئے ہو۔" وہ یک لخت برہم ہو گیا۔

میں اسے کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی آوازوں نے مجھے روک دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک شخص اسلم کو دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ اسلم جان دار آدمی تھا لیکن نووارد کے سامنے کھلونا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں نووارد کا تفصیلی جائزہ لے لیا۔ وہ آدھی آستین کی قمیص اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔ وہ ایک دیوقامت جوان تھا۔ اس کا سینہ بہت کشادہ اور مضبوط تھا اور آستینوں کے اوپر مچلتی ہوئی بازوؤں کی مچھلیاں توانائی کا اعلان کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

اسلم لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور چودھری کے سامنے رک گیا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔

"کیا بات ہے دارا، کیا ہنگامہ ہے؟" چودھری نے نووارد سے دریافت کیا۔

"یہ جی ٹیکسی لیے باہر کھڑا تھا۔" دارا نے اسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ اس کے ساتھ ہی آیا ہے۔" اس بار اشارہ میری طرف تھا۔

"اسے کیوں پکڑ لائے ہو؟" میں نے دارا سے پوچھا۔ "اسے میں نے ہی رکنے کے لیے کہا تھا، یہ بے چارہ ٹیکسی ڈرائیور..." میں نے جملہ ادھورا ہی

چھوڑ دیا کیونکہ اسلم کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

دارا نے چودھری رحمت کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "پھر چودھری صاحب، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"اسے چھوڑ دو۔ لیکن اس سے پہلے اس کا ٹھکانا دیکھ لو کہیں بعد میں کوئی گڑبڑ نہ کرے۔" چودھری نے جواب دیا۔

"یہ کیا چکر ہے صاب۔" اسلم نے دبے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔ "میں تو پسنجر لے کر آیا تھا جی۔ میرا کیا قصور ہے؟"

"ارے... کوئی چکر نہیں۔ یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے۔" چودھری نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ "دارا اسے دونوں طرف کا کرایہ ادا کر دینا۔" پھر وہ اسلم کی طرف متوجہ ہُوا۔ "ٹھیک ہے جوان، تم جاؤ۔ میں اپنے بھتیجے کو کھانا کھلائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔"

"ہاں بھئی، تم جاؤ۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ چچا جان اتنی آسانی سے مجھے معاف کر دیں گے۔ اب تو میں یہاں کچھ دیر ضرور رکوں گا۔"

ایک ثانیے کے لیے چودھری رحمت علی کی آنکھوں سے حیرت جھلکی لیکن فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ "میری ہدایت پر پوری طرح عمل کرنا۔" اُس نے دارا سے کہا۔ "بس، اب اسے لے جاؤ یہاں سے۔"

وہ کمرے سے چلے گئے تو وہاں چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر چودھری نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہاں... تو تم کچھ کہہ رہے تھے؟"

"میں کچھ پوچھ رہا تھا۔ میں نازو کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"اشتہار میں نے چھپوایا تھا۔" اُس نے سرد لہجے میں یاد دلایا۔ "نازو کے متعلق بتانے کا کام تمھیں کرنا ہے۔ اچھا۔ چلو یہی بتا دو کہ تم اُسے کیسے جانتے ہو؟"

ایک لمحے کے لیے تو میں اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ، جو کوئی بھی تھا، نازو میں دلچسپی لے رہا تھا۔ یقیناً وہ نازو کے متعلق بہت کچھ جانتا ہوگا۔ ک... میرا اور نازو کا مختصر سا تعلق بھی اس پر پوری ط... عیاں ہوگا۔ میرے لیے تعاون کرنے کا ... یہ ایک اچھا موقع تھا۔ اس صورت میں یہ ام... تھا کہ نازو کی پہیلی کچھ نہ کچھ تو کھل ہی جاتی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے ایک طویل سا... لے کر کہا۔ "مجھے نازو کے بارے میں جو کچھ معل... ہے، وہ میں بتا دیتا ہوں۔" پھر میں نے نازو ... پہلی ملاقات اور اُس کے بعد پیش آنے وا... تمام واقعات اُسے سُنا دیے۔ میں نے اُس... کی ڈائری اور اس کی وجہ سے اپنے پیچھے پڑنے ... لوگوں کے متعلق بھی بتا دیا۔ "بس جناب، یہ... میری کہانی۔" میں نے کہانی ختم کرتے ہو... "اب مجھے نازو سے صرف اتنی دلچسپی ہے کہ ... اس سے اپنی خطا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ محض ا... کی وجہ سے میری زندگی عذاب بن کر رہ گئی ... اشتہار دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں یہ... دوڑا چلا آیا۔"

"تمھاری کہانی تو ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن جس چکر میں پھنسے ہوئے ہو، اس میں اگر آدمی ... جائے تو اس کی دو معقول وجوہ ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کچھ نہیں جانتا، دوسرے یہ کہ وہ بہ... زیادہ جانتا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"میرا خیال ہے، میں بیچ میں معلق ہوں۔ اسی لیے زندہ ہوں۔" میں نے اُس کے دھمکی آ... لہجے کو یکسر نظرانداز کر دیا۔

"یہ تمھاری خوش فہمی ہے۔" اُس نے سرد... میں کہا۔

میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں اُن لوگوں میں ... ہوں، جو تنہائی کو شدت سے ناپسند کرتے ہیں۔ ... مرتے وقت بھی تنہا نہیں ہوں گا۔ ویسے تم آخری وقت کے لیے ایک اچھے رفیق معلوم ہو... ہو۔" میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ... بیٹھ جاؤ۔ یہ الحمرا کا اسٹیج نہ...

...ہے۔" اُس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر اُس نے زور سے دارا کو پکارا۔ اس کی آواز سنتے ہی دارا دائیں ہاتھ سے اپنے بائیں بازو کی مچھلیاں سہلاتا اندر آگیا۔ وہ کینہ توز نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ٹیکسی والے کا کیا ہُوا؟" چودھری نے پوچھا۔

میں پُرسکون انداز میں پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"رب نواز اس کے پیچھے گیا ہے۔ اس کا ٹھکانا دیکھ ...ے گا۔ آپ بے فکر رہیں۔"

"اچھا... اب تم یہیں کھڑے رہو۔ ذرا خیال ...کھنا اس وقت ہم فلموں کے کسی ہیرو سے تو نہیں ...ہ ایک سائڈ ہیرو سے بات کر رہے ہیں۔" چودھری ...ے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اور تمھیں کامیڈین کا رول کرنا ہوگا۔" میں نے ...لگایا۔

"ہاں... یہ تو حقیقت ہے کہ تم اس معاملے ...ے پوری طرح واقف نہیں ہو۔" چودھری رحمت ... مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "نازو کون ہے... اُس ...ائری کی کیا اہمیت ہے... یہ سب باتیں ...یں معلوم نہیں۔ لیکن میں ان کی اہمیت سے ... ہوں۔ مجھے بھی اسی ڈائری کی تلاش ہے۔"

"اور مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" ...نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا۔ "میں تو بس پُرسکون ...دگی گزارنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے نازو سے مل ... اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میری ...ت پر کسی کو یقین ہی نہیں آتا اور میں ہر روز ان ...ل فہم معاملات میں پہلے سے زیادہ ملوث ...تا جاتا ہوں۔"

"تمھاری جان یوں چھوٹ بھی نہیں سکتی۔" چودھری ...کراتے ہوئے بولا۔ "ننھے بچے... تم خطرناک حد ... اس معاملے میں اُلجھ چکے ہو۔ میں جانتا ہوں ...نازو کتنے کم عرصے میں تم سے کتنی قریب ہو گئی ...۔ وہ ڈائری صرف تمھارے ہی پاس ہو سکتی ہے۔"

میں کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ اندر کی جانب ... والے دروازے سے کوئی کمرے میں داخل ہُوا۔

پھر جب میں نے اُسے دیکھا تو مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ وہی عورت تھی، جس سے چودھری کی حویلی کے سرونٹ کوارٹر میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بوڑھے چوکیدار کی بیوی تھی، جس کے کوارٹر میں، میں نے نازو کی تصویر دیکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر بڑھیا کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔

"کیوں یہی ہے نا، وہ نوجوان؟" چودھری نے عورت سے پوچھا۔

"ہاں... یہی ہے۔" عورت نے جواب دیا۔ پھر اچانک وہ جیسے پھٹ پڑی۔ "لیکن اب تم مجھے یقین نہیں دلا سکتے کہ یہ اس معصوم لڑکی کا دشمن ہے۔ یہ اس روز بھی جب نازو کے متعلق پوچھ رہا تھا تو اس کے انداز میں محبت تھی۔ نازو کو خطرہ تمھاری طرف سے تھا۔ اگر یہ اُس کا دشمن ہوتا تو یہاں کیوں آتا۔"

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے، بڑھیا۔ تجھے اندازہ نہیں کہ اب میں تیرا کیا حشر کروں گا۔" چودھری دھاڑا۔

بُڑھیا دونوں ہاتھوں میں مُنہ چھپا کر بُری طرح سسکنے لگی۔

یہ اندازہ تو مجھے اسی دن ہو گیا تھا، جب میں نے بُڑھیا کے کوارٹر میں نازو کی تصویر دیکھی تھی کہ چوکیدار اور اُس کی بیوی، نازو کے بہی خواہ ہیں۔ بُڑھیا کو روتے دیکھ کر میرا خون کھول اُٹھا۔

"بس... چُپ ہو جا۔ یہاں سے دفع ہو جا اور اپنے انجام کا انتظار کر۔" چودھری پھنکارا۔

اُس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ میرا پیمانۂ صبر چھلک گیا۔ میں نے اُس پر چھلانگ لگائی اور اسے رگید ڈالا۔ اُس کی کرسی اُلٹ گئی۔ اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ بلند ہوئی لیکن میں نے تیزی سے اس کا گلا دباتے ہوئے اُس چیخ کو گلے ہی میں گھونٹ دیا۔ وہ بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن وہ گرفت مجھ پہلوان کے اکھاڑے کی مٹی چومنے والے کی گرفت تھی۔

اُس کی گردن پر میرا دباؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اچانک کسی نے میرا کالر تھام کر جھٹکا دیا۔ میں

کسی حقیر سے تنکے کی طرح اُڑتا ہوا پیچھے جا گرا۔ لیکن میں نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ دارا دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، لبوں پر حقارت بھری مسکراہٹ سجائے مجھے دیکھ رہا تھا۔ لیکن مجھے چودھری رحمت علی کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ یقیناً بے حد ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا کیونکہ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

اس ہنگامے کی آواز سُن کر ایک اور ملازم کمرے میں آگیا تھا۔ "اس بُڑھیا کو لے جاؤ، یہاں سے۔" چودھری رحمت علی نے ملازم سے کہا۔

ملازم بڑھیا کو گھسیٹ کر لے جانے لگا۔ وہ خاموش تھی لیکن اُس کی آنکھیں بہت کچھ کہتی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ آنکھیں مجھ سے مخاطب تھیں۔ بُڑھیا کے جاتے ہی دارا نے آگے بڑھ کر گری ہوئی کُرسی سیدھی کر دی۔

"کمال ہے۔ بہت پھرتیلا آدمی ہے۔" چودھری نے پُرستائش لہجے میں کہا۔ مخاطب دارا تھا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اچانک اس طرح مجھ پر چھلانگ لگائے گا۔"

"میں تو خود حیران رہ گیا تھا۔" دارا نے جواب دیا۔ "ویسے آدمی جی دار معلوم ہوتا ہے۔"

"یقیناً... تبھی تو اتنی پریشانیاں جھیل کر بھی زندہ ہے۔" چودھری رحمت علی سگار سلگاتے ہوئے بولا۔ "کیا خیال ہے... دو دو ہاتھ کرو گے؟"

"آپ جانتے ہیں کہ اس معاملے میں مجھے کبھی انکار نہیں ہوتا۔"

مجھے غصّہ تو بہت آیا۔ وہ دونوں میرے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور انھوں نے مجھے یوں نظر انداز کر رکھا تھا، جیسے میں وہاں سرے سے موجود ہی نہیں ہوں لیکن میں نے اپنے غصّے پر قابو پالیا۔ میں جانتا تھا کہ ٹھنڈے مزاج کے لوگ کس قدر خطرناک ہوتے ہیں۔ اُن کے مقابلے پر خود کو ٹھنڈا رکھنا بہت ضروری تھا۔ میں استہزائی نگاہوں سے انھیں دیکھتا رہا لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولا۔

"ٹھیک ہے، تو پھر یوں ہی سہی۔" چودھری رحمت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہت دنوں سے کوئی تفریح نہیں ہوئی ہے۔"

"لیکن گیٹ منی کا پچاس فیصد میرا ہوگا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زندہ دل بھی ہے۔" چودھری نے دارا سے کہا۔ "دیکھنا یہ ہے کہ یہ زندہ دلی کب تک برقرار رہتی ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوگیا۔ "دیکھو جوان، اگر تم نے دارا کو شکست دے دی تو ممکن ہے، میں تمھارے بارے میں کسی اور انداز سے سوچنا شروع کر دوں۔ میں بہادروں کا قدرداں ہوں۔"

"جو بڈھوں اور کمزوروں پر ظلم کر سکتے ہوں، وہ بہادر نہیں ہوتے... اور جو بہادر نہیں ہوتے، وہ بہادروں کی قدر نہیں کرتے۔" میں نے بے حد حقارت سے کہا۔ "میں اس بڑھیا کے ساتھ تمھارا سلوک دیکھ چکا ہوں۔"

"یہ لہجہ مجھ پر اثر نہیں کرے گا جوان۔" اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "بڑھیا والا معاملہ تو تمھیں معلوم ہی نہیں ہے۔ اس لیے اس پر تمھارا تبصرہ بھی لاعلمی پر مبنی ہے۔ بہرکیف، میں ایسی باتوں کا بُرا نہیں کرتا۔"

"فضول باتیں چھوڑو۔" اچانک دارا نے کہا۔ "مقابلے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

"تم سے کیا مقابلہ کروں۔" میں نے اپنے لہجے میں جہان بھر کی حقارت سموتے ہوئے کہا۔ "تمھاری حیثیت ہی کیا ہے۔ تم یقیناً ایک جاندار آدمی ہو لیکن کسی کے احکامات پر دُم ہلانے والوں کو میں کبھی اس قابل نہیں سمجھتا کہ اُن سے مقابلہ کروں۔ تمھاری اپنی کوئی حیثیت نہیں... کوئی مرضی نہیں۔ تم تو بس حکم کے غلام ہو۔ البتہ میں تم سے ہمدردی کا اظہار ضرور کر سکتا ہوں۔"

دارا کا ردِعمل میری توقع کے عین مطابق تھا۔ پہلی مرتبہ اس کی سرد مہری کا شیشہ چٹخا۔ اس سے تو وہ محض ایک روبوٹ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا سُرخ ہوگیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسے میں جسمانی توانائی کا رابطہ، ذہن سے پوری طرح منقطع ہو جاتا ہے۔ ابھی میرا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ میں نے دیکھ لیا

طاقت کے اعتبار سے میں اُس کا ہم پلّہ نہیں ہوں۔ اُسے صرف اپنے ذہن کی مدد سے شکست دے سکتا تھا لہٰذا اُسے حد سے زیادہ مشتعل کر دینا بہت ضروری تھا۔

"اگر میں نے دارا کو شکست دے دی، تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟" میں نے چودھری سے پوچھا۔

"آزادی کے سوا تم کچھ بھی طلب کر سکتے ہو۔"

"اس صورت میں، میں دارا کی دُم طلب کروں گا جو وقتاً فوقتاً تمھارے اشارے پر ہلنے لگتی ہے۔" میں نے دارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دراصل مجھے دُمیں جمع کرنے کا شوق ہے۔"

توقع کے مطابق وہ بپھر کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اچانک ایک جانب ہٹتے ہوئے اس کی گردن پر ایک ہتھوڑا سا ہاتھ جما دیا۔ وہ تیزی سے پلٹا لیکن مجھ تک نہ پہنچ سکا۔

"نہیں دارا... یہ فاؤل ہے۔" چودھری نے اسے ٹوک دیا۔ "میں نے ابھی اجازت نہیں دی ہے۔"

وہ خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔

"رُک کیوں گئے؟" میں نے اُسے پھر چھیڑا۔ "تم آدمی ہو یا دُم۔ دیکھا... ثابت ہوگئی میری بات۔"

"بچ لو... اس کے بعد یہ موقع کبھی نہیں ملے گا۔" اس کا لہجہ بھی اس کے ذہن کی طرح بکھرا بکھرا سا تھا۔

"میرا خیال ہے، اب تمھیں سیٹی بجا دینا چاہیے۔ تمھارا پالتو جانور بہت بے تاب ہو رہا ہے۔" میں نے چودھری سے فرمائش کی۔

چودھری نے سخت نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "تو تم تیار ہو؟" اس نے پوچھا۔

میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے، دارا کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"ٹھیک ہے دارا، شروع ہو جاؤ۔" چودھری نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ وہ تیزی سے مجھ پر ٹوٹ پڑے لیکن جو تیزی سامنے آئی، وہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا اور وہ مجھے دُور تک رگیدتا چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ بے پناہ جاندار ہونے کے علاوہ وہ ایک ماہر لڑاکا بھی ہے۔ طاقت کے معاملے میں تو اسے ویسے ہی مجھ پر فوقیت حاصل تھی۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ مجھے کوئی ہاتھ رسید کیے بغیر ہی بے ہوش کر دے۔ لیکن میں نے اپنے حواس بیدار رکھے تھے۔ اگرچہ مجھے بے اختیار دھکیلا جا رہا تھا لیکن جیسے ہی اندازہ ہوا کہ میں عقبی دیوار کے قریب پہنچ چکا ہوں، میں نے جسم کی تمام تر قوت یکجا کر کے قدم مضبوطی سے زمین پر جما دیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قدرتی طور پر اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں نے تیزی سے اپنے گھٹنے کو اوپر کی طرف حرکت دی۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ میرا ارادہ بھانپ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ مجھے گھٹنے کی حرکت کو روکنے میں ایک لمحہ لگا مگر اس ایک لمحے میں میرے پیٹ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میری توجہ گھٹنے کی طرف مبذول ہوتے ہی اُس نے میرے پیٹ پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی تھی۔ ٹھوکر کیا... مجھے تو ایسا لگا، جیسے میرے پیٹ پر گرز مارا گیا ہو۔ اُس نے میرے سینے پر گھونسہ مارنا چاہا، جسے میں نے اپنی بائیں کلائی پر روک لیا۔ ساتھ ہی میں نے جوابی حملہ کیا۔ میری ٹھوکر اس پر خاطر خواہ اثر نہ چھوڑ سکی البتہ مجھے لمحاتی مہلت ضرور مل گئی۔ اب دیوار کے نزدیک ٹھہرنا میرے لیے مخدوش تھا۔ چنانچہ میں آگے بڑھ گیا۔ پیٹ میں شدید تکلیف کی وجہ سے میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اسی وقت میں نے چودھری کے ہنسنے کی آواز سُنی۔ لیکن میں پوری طرح دارا کی طرف متوجہ تھا۔

اُس نے مجھے آگے بڑھتے دیکھا تو تیزی سے میری طرف جھپٹا لیکن میں نے جھکائی دے کر اس کی کمر تھام لی۔ یہ خالص پہلوانی داؤ تھا۔ میں اُس کی کمر اور پیٹ کے عضلات پر مخصوص انداز میں دباؤ ڈال رہا تھا۔ اُس نے تڑپ کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ گرفت ایسی نہیں تھی۔ میں نے اس کے جسم کو اپنے جسم کے ساتھ ملا کر پوری قوت سے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں بھینچ ڈالا۔ کوئی اور ہوتا تو اتنی دیر میں نڈھال ہو چکا ہوتا۔ وہ بھی وقتی طور

بھیڑیے بن نظر آیا۔ پھر نہ جانے کیسے اُس نے اپنا ایک گھٹنا اٹھا کر میرے پیٹ میں دے مارا۔

یہ ضرب چوٹ بھی ٹھیک اُسی جگہ لگی تھی، میں گرفت برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ میں پیٹ میں شدید تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ ابھی میں سنبھل بھی نہیں سکا تھا کہ اُس نے یکے بعد دیگرے دو گھونسے میرے مُنہ پر رسید کر دیے۔ اس بار میں خود کو گرنے سے نہ روک سکا۔ اسی لمحے چودھری رحمت کا قہقہہ میری سماعت میں زہر انڈیل گیا۔

دارا مجھے ٹھوکر مارنے کے لیے بڑھا لیکن میں نے تکلیف کی طرف سے اپنا ذہن ہٹاتے ہوئے تیزی سے کروٹ بدل لی۔ اس کا پاؤں فرش سے ٹکرایا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھا۔ میں نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا پاؤں پکڑ کر کھینچ لیا اور مزید ایک کروٹ لے کر اس سے دور ہو گیا۔ وہ مُنہ کے بل فرش پر گرا اور میں نے تیزی سے اس کی کمر میں قینچی ڈال دی۔ میں اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ہر ممکن دباؤ ڈال رہا تھا۔ پہلی مرتبہ اس کی قوت زائل ہوتی محسوس ہوئی۔ اس کے باوجود وہ اپنا ذہن استعمال کر رہا تھا۔ وہ مسلسل میرے پیٹ پر لاتیں مار رہا تھا۔ اُس نے میرے پیٹ کا وہی حصہ تاک لیا تھا، جس پر اس کی پہلی ٹھوکر لگی تھی۔ زائل ہوتی ہوئی قوت کے باوجود اُس کی ہر لات ہتھوڑے کی طرح میرے پیٹ سے ٹکرا رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے ناچ رہے تھے۔ میں نے اس کی کمر پر دباؤ اور بڑھا دیا۔ میں جانتا تھا کہ اب یہ قوتِ برداشت اور قوتِ ارادی کا کھیل ہے۔ چند لمحے اسی عالم میں گزر گئے۔ اب میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہُوا کہ میرے پیٹ پر تسلسل سے پڑنے والی ٹھوکریں رک گئی ہیں۔ میں نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے دارا کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ مجھے محض ساکت ہیولیٰ سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے قینچی کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ میری اپنی حالت بہت زیادہ ابتر تھی۔ خاصی کوشش کے بعد میں اپنی پیروں پر کھڑا ہو سکا۔ میرا ذہن بھی جواب دے رہا تھا [illegible] ہوش و حواس ساتھ چھوڑتے محسوس ہو رہے تھے [illegible] میں لڑکھڑاتے قدموں سے چودھری کی طرف بڑھا، جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی مجھے اور کبھی دارا کو دیکھے جا رہا تھا۔ اب میں یقیناً اُسے ایک اچھا سبق دے سکتا تھا۔

"کیا خیال ہے چودھری صاحب؟" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ پیٹ کی تکلیف کے باعث بولنا اور سانس لینا دوبھر معلوم ہو رہا تھا۔ "[illegible] جیت گیا یا پھر..." میں جملہ پورا کیے بغیر ہی ڈھیر ہو گیا۔ ناقابلِ شکست قوتِ ارادی ڈوبتے ذہن کے ہاتھوں شکست کھا گئی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ میری بے ہوشی کا عرصہ کتنا طویل تھا۔ ہوش آیا تو میں ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ میرے پیٹ میں اب بھی تکلیف ہو رہی تھی، بہر حال جیسے تیسے میں اُٹھ ہی بیٹھا۔ پھر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہاں دروازے کے علاوہ صرف ایک کھڑکی تھی لیکن وہ اتنی بلندی پر تھی کہ وہاں تک میری رسائی ناممکن تھی۔ دروازے کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ مقفل ہو گا لیکن کبھی کبھی آدمی حقائق کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ جب تک میں نے خود اٹھ کر اس حقیقت کی تصدیق نہ کر لی، اسے تسلیم نہیں کیا۔

اب میں سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ فرش پر بیٹھ کر سوچتا رہوں اور صورتِ حال کا تجزیہ کروں، لیکن جب سے ڈائری کا چکر چلا تھا، میں [illegible] مرتبہ اس صورتِ حال سے گزر چکا تھا کہ اب میرے لیے اس طرح کی قید کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ یہ سب کچھ ایک ہی سلسلے کی بہت سی کڑیوں [illegible] سے ایک تھا۔ میری سوالیہ سوچوں کا ہر راستہ ایک ہی منزل پر پہنچتا تھا... وہ سجیلی، ملیح چہرے والی، سنجیدہ اور باوقار نازو... وہ نازو، جس کی شخصیت کے گرد حالات نے ایسا ہالہ بنا دیا تھا، جس کی اوٹ میں خود اس طرح چھپ کر رہ گئی تھی کہ اب وہ کوئی اجنبی ہستی معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ وقت جو [illegible]

[illegible] کے ساتھ گزرا تھا، محض ایک خواب سا لگتا تھا... [illegible] اب بھی ایک بھولا بسرا خواب! وہ ایک پہیلی تھی [illegible] بوجھنے کی فکر میں، میں خود اپنے لیے ایک معمہ بن کر رہ گیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ بھی [illegible] زندانوں میں سے ایک تھا، جو اس چکر میں مجھے [illegible] ہوتے رہے تھے۔ البتہ ایک فرق تھا... [illegible] کا فرق... میں اتنا پژمردہ پہلے کبھی نہیں ہُوا تھا، جتنا کہ آج محسوس کر رہا تھا۔ میری حاضر جوابی اور شگفتہ مزاجی نے اب تک، کسی بھی حال میں میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا، لیکن آج تو ذہن شل ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہُوا۔ [illegible] آنکھوں کے سامنے گلنار کا سراپا چھب دکھا کر نہ [illegible] کہاں اوجھل ہو گیا۔ ہاں... فرق یہ تھا کہ وہ [illegible] سے بچھڑ گئی تھی۔ وہ ساتھ تھی تو ہنسنے ہنسانے [illegible] جی چاہتا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان ایک معاشرتی جانور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنہائی ڈپریشن [illegible] جنم دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر انسان کے دماغ [illegible] ایک مخصوص فریکوئنسی ہوتی ہے اور جب ایک جیسی فریکوئنسی رکھنے والے دو افراد مل جائیں تو بیشتر اوقات صورتِ احوال کی ناخوش گواری بے معنی ہو کر [illegible] جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت مجھے گلنار ٹوٹ کر یاد آئی اور محض اس کی یاد نے صورتِ حال کی ناخوش گواری ختم کر دی۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ وہ مجھ سے [illegible] طرح چھینی گئی ہے۔ وہ خود تو کسی طرح اس [illegible] میں ملوث نہیں تھی بلکہ میرے حوالے سے اس مصیبت میں پھنسی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، تو [illegible] یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اذیت کے کن مراحل سے گزر رہی ہو گی۔

یہ خیال آتے ہی میری رگوں میں دوڑتا ہُوا لہو [illegible] کھولتے ہُوئے لاوے میں تبدیل ہو گیا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے گلنار کی بازیابی کو [illegible] دل سے پسِ پشت ڈال دیا تھا، جب کہ اس نے میری خاطر خود کو اندھے کنویں میں پھینکنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ اب مجھے یہاں سے نکلنے کے لیے ہر جتن کرنا تھا۔

معاً مجھے اسلم کا خیال آ گیا۔ اسلم جو محض ایک لڑکی کے حوالے سے میرے لیے سراپا خلوص بن گیا تھا۔ میں نے عشق کی ایسی مثالیں کم ہی دیکھی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت وہ میرے لیے پریشان ہو گا۔ یہ اندازہ تو اسے ہو ہی گیا ہو گا کہ یہاں کے حالات میرے لیے سازگار نہیں... اس بات کا امکان تھا کہ وہ میری رہائی کے لیے کسی قسم کی کارروائی کرے... لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ غور تھی کہ اس کے وسائل محدود بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جن لوگوں سے پالا پڑا ہے، اُن کے ہاتھ یقیناً بہت لمبے ہوں گے۔

مجھے اندازہ تھا کہ نہ تو شور مچانے کا کوئی فائدہ ہو گا اور نہ ہی دروازے کو کھولنے کی کوشش بار آور ثابت ہو گی، لہٰذا میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور ٹانگیں پھیلا لیں۔ پیٹ کی تکلیف قدرے کم ہو گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس قید خانے سے نکلتے وقت میں جسمانی طور پر بہتر حالت میں ہوں۔ ابھی مجھے اس طرح بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ کھلی کھڑکی سے ایک چھوٹا سا پتھر اندر آ کے گرا۔

میں چونک اُٹھا۔

پتھر کے ساتھ ایک کاغذ لپٹا ہُوا تھا۔ کسی نے مجھ تک کوئی پیغام پہنچانے کے لیے پیغام رسانی کا یہ قدیم طریقہ اختیار کیا تھا۔

میں نے کاغذ اٹھا کر اُسے کھولا۔

پیغام میرے لیے ہی تھا، لکھا تھا... کمرے کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ کمرے سے نکل کر دائیں طرف راہداری میں چلو۔ آگے زینے نظر آئیں گے۔ زینے اترنے کے بعد تمھیں ایک آدمی ملے گا، اس کی ہدایات پر عمل کرنا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ جہاں تک میرا خیال تھا، یہاں میرا کوئی ہمدرد نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر وہ پیغام کس نے بھیجا تھا؟ کیا یہ میرے لیے کوئی جال ہے۔ لیکن ایک پہلو اور بھی تھا، جسے میں نظر انداز کر رہا تھا۔ میں پہلے ہی سے اس کمرے میں قید تھا، گویا اپنے صیاد کے قابو میں تھا۔ اس صورت میں انھیں کیا پڑی

تھی کہ وہ میرے لیے مزید کوئی جال پھیلانے کی زحمت کرتے۔ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پرچے پر درج ہدایات پر عمل کرنے میں فائدے کا امکان تو ہے... نقصان کا کوئی احتمال نہیں۔

میں دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے قریب کھڑا پہلے تو میں کچھ سن گن لیتا رہا، پھر میں نے دروازے کو اندر کی طرف کھینچا... دروازہ واقعی کھلا ہوا تھا۔

دروازے کھلتے ہی تازگی کے احساس نے مجھے چاق و چوبند کر دیا۔ میں نے دروازے سے باہر جھانکا۔ راہداری بالکل سنسان تھی۔

چند لمحے میں محتاط انداز میں راہداری کا جائزہ لیتا رہا، پھر خدا کا نام لے کر باہر نکل آیا۔ ہدایت کے مطابق میں نے دائیں جانب چلنا شروع کر دیا۔ میں پنجوں کے بل، بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے چل رہا تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ سرپٹ بھاگ لوں لیکن میرے نامعلوم ہمدرد نے احتیاط کی ہدایت کی تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ تاکید بلاوجہ نہیں ہوگی۔ راہداری میں بلب روشن تھے، رات ہو چکی تھی اور اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میں بہت دیر تک بے ہوش رہا تھا۔

میں آگے بڑھتا رہا، حتیٰ کہ مجھے وہ زینے نظر آ گئے، جن کا تذکرہ اس مختصر سے ہدایت نامے میں کیا گیا تھا۔ میں نے اوپر سیڑھی پر کھڑے ہو کر نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ کوشش یوں کہ زینے بالکل تاریک تھے اور روشن راہداری سے گزر کر آنے کے بعد، مجھے وہ تاریکی کچھ زیادہ ہی دبیز معلوم ہو رہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ نیچے کیا ہے تاہم مجھے بہتری کی توقع ضرور تھی، چنانچہ میں سیڑھیاں اترنے لگا لیکن درحقیقت میں پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔

نیچے اترنے کے بعد، میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا لیکن مجھے وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ چند لمحے بعد میری نظریں کسی حد تک تاریکی سے مانوس ہو گئیں اور میں گرد و پیش کا جائزہ لینے کے قابل ہو گیا۔ سامنے مجھے کوٹھی کا احاطہ نظر آ رہا تھا۔ ایک جانب بے ترتیب جھاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ میں

کچھ دیر اس آدمی کا انتظار کرتا رہا، جس سے ملاقات کی نوید، نادیدہ ہمدرد کے پیغام میں دی گئی تھی۔

کچھ دیر تک کوئی مجھ تک نہ پہنچا تو میں نے اپنے طور پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ میں احاطے میں نکل آیا اور دبے پاؤں گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ عین اسی لمحے ایک جھاڑی کی اوٹ سے وہ آدمی اچانک ہی نکل آیا اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میں تمہارا دوست ہوں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ شاید اسے میری اعصابی کشیدگی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ایسے حالات میں آدمی کس قدر خطرناک ہو جاتا ہے۔

"آؤ، میرے ساتھ۔" اس نے مزید کہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اگرچہ وہاں روشنی نہیں تھی لیکن تاروں کی ضو میں، میں اس کا جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ شخص میرے لیے اجنبی تھا۔ میں محض ایک لمحے کے لیے ہچکچایا، پھر یہ سوچ کر اس کے ساتھ ہو لیا کہ ہدایات پر عمل کرنے سے اب تک مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ اس کے برعکس میں جزوی طور پر تو آزاد ہو ہی گیا ہوں۔

وہ شخص میرا ہاتھ تھامے چلتا رہا۔

ہمارا رُخ لان کی طرف تھا۔ لان کی دوسری جانب چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ وہ مجھے لے کر ایک کوارٹر کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس نے کوارٹر کا دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی جس شخص پر میری نظر پڑی، اسے دیکھتے ہی میری ساری کوفت دُور ہو گئی۔

اسلم ایک چارپائی پر بیٹھا، نہایت اطمینان اور انہماک سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہو۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بڑی بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ... آپ خیریت سے تو ہیں نا؟" اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں تمہارے سامنے ہوں، خود دیکھ لو۔" میرے لہجے میں شوخی آ گئی۔ "لیکن تم یہاں کیسے؟"

"پہلے آرام سے بیٹھ تو جائیں... اور ہاں، میرے اس یار کا شکریہ ادا کریں۔" اس نے اجنبی شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رب نواز ہے، اس کوٹھی میں ملازم ہے..."

میں نے گرم جوشی سے رب نواز کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں تمہارا شکرگزار ہوں دوست۔ یہ محض رسمی بات نہیں ہے۔" میں نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

وہ بے چارہ نہ جانے کیوں شرمندہ نظر آنے لگا۔ ویسے میں نے بے حد مخلص لوگوں کو ایسے مواقع پر شرمسار ہی دیکھا ہے۔ "وہ جی... میں ابھی ڈیوٹی پر ہوں۔" وہ اٹک اٹک کر بولا۔ "آپ لوگ اپنا کام شروع کر دیں۔ میں ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔ ذرا احتیاط سے کام کیجیے گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ اسلم اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے دروازے کی کنڈی لگائی اور واپس آ گیا۔

میری سمجھ میں تو اس معاملے کا سر پیر ہی نہیں آ رہا تھا اس لیے مجھے حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن رہنا پڑا۔ اسلم یہاں کیسے پہنچا؟ مجھے رہائی کس طرح دلائی گئی۔ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے سوالات اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ رب نواز کس کام کی بات کر رہا تھا، جو ہمیں کرنا تھا؟

"آئیں جی... اب کام شروع کریں۔" اسلم نے واپس آتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

میں سمجھا تو کچھ نہیں لیکن اس کے اشارے پر اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ کمرہ نسبتاً چھوٹا تھا اور کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں بہت تیز روشنی تھی۔ کمرے کی مناسبت سے وہاں بہت زیادہ پاور کا بلب لگا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایسے اوزار رکھے ہوئے تھے، جو عموماً راج مزدور استعمال کرتے ہیں۔ چھینی، ہتھوڑے اور کرنی کے علاوہ وہاں سیمنٹ اور اینٹیں بھی تھیں اور ایک بالٹی بھی رکھی تھی۔ اسلم نے بالٹی سے چلّو بھر بھر کر پانی نکالنا اور دیوار پر ڈالنا شروع کر دیا۔

"یہ چکر کیا ہے یار، کیا کر رہے ہو تم؟" بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ نے کبھی نقب نہیں لگائی۔" اسلم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "فرق صرف اتنا ہے کہ عام طور پر سینده باہر سے لگائی جاتی ہے جب کہ ہم اندر سے لگا رہے ہیں۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "باہر کوئی خزانہ ہے کیا؟"

"آپ کی آزادی خزانے سے کم تو نہیں۔" اس نے بے حد خلوص سے کہا۔

میں سناٹے میں آ گیا۔ گویا وہ سب کچھ میرے ہی لیے ہو رہا تھا۔ "لیکن یار، میری آزادی کے لیے اتنے لمبے چکر کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے پوچھا۔ "جیسے تم اندر آ گئے ہو، میں باہر بھی نکل سکتا ہوں۔"

"یہ سب باتیں باہر نکل کر سمجھ میں آئیں گی۔ ذرا چھینی تو بڑھائیے۔"

میں نے چھینی اس کی طرف بڑھا دی اور اس کے قریب ہی اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے چھینی کو اینٹ کے کونے پر لگے مسالے پر رکھا اور ہتھوڑے سے ہلکی ہلکی ضربیں لگانے لگا۔ کوشش یہی تھی کہ زیادہ آواز نہ ہو۔ اب میری سمجھ میں کم از کم رب نواز کی بات پوری طرح آ گئی تھی۔

اسلم کا انداز بڑا ماہرانہ تھا، وہ جس اعتماد کا کام کر رہا تھا، اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کی ساری زندگی اسی کام میں گزری ہے۔

"یار... تم تو مجھے پیشہ ور نقب زن لگتے ہو۔" میں نے اسے چھیڑا لیکن اب مجھے اپنے نکمے پن کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ "لاؤ... چھینی مجھے دو۔ اپنی آزادی کے لیے تھوڑی سی محنت تو مجھے بھی کرنا چاہیے۔"

"ہم تو آل راؤنڈر ہیں جی۔" وہ بولا۔ "یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔ ذرا اناڑی پن سے ہتھوڑا مارا تو پھر مصیبت ہی آ جائے گی۔ رب نواز مارا جائے گا بے چارہ۔"

میں شرمندہ ہو گیا۔

اسلم بڑی جاں فشانی سے کام میں لگا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک اینٹ اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد کا مرحلہ حیرت انگیز طور پر بہت آسان ثابت ہوا۔ کچھ ہی دیر میں کئی اینٹیں باہر آ گئیں۔ اب سوراخ اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ اس میں سے کوئی بھی

آدمی بآسانی باہر نکل سکتا تھا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔

"آپ یہیں ٹھہریں، میں دیکھتا ہوں۔" اسلم نے کہا اور باہر نکل گیا۔

چند لمحے بعد وہ واپس آیا تو رب نواز اس کے ساتھ تھا۔

رب نواز نے سینڈھ کا جائزہ لیا اور سر ہلا کر اطمینان کا اظہار کیا۔ "ٹھیک ہے، اب آپ لوگ نکل جائیں۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔" وہ طمانیت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے اور اسلم نے بڑی گرمجوشی سے اس سے مصافحہ کیا اور سوراخ میں سے باری باری باہر نکل آئے۔ سامنے ہی سڑک تھی لیکن اس وقت بالکل سنسان تھی۔ وہاں اسٹریٹ لائٹس بھی نہیں تھیں، جس کی وجہ سے سیاہ روشنائی جیسا اندھیرا ہر طرف موجزن تھا... اسلم نے میرا ہاتھ تھاما اور گیٹ کی مخالف سمت میں چل دیا۔ ہم کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ ایک گاڑی پیچھے میں کھڑی نظر آئی۔ اسلم اس گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

جیسے ہی ہم گاڑی کے قریب پہنچے، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے عقبی دروازہ کھول دیا۔

"چلیں... جلدی سے بیٹھ جائیں۔" اسلم بولا۔

میں پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اسلم بھی میرے برابر آگیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی، لیکن جب میں نے گاڑی چلانے والے پر نظر ڈالی تو میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں اٹک گیا۔ وہ دارا تھا۔ اسے اس قدر اچانک اور اس صورتِ حال میں اپنے قریب دیکھ کر میری بوکھلاہٹ فطری تھی۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسلم کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرا دیا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں جی۔"

اس نے مجھے دلاسہ تو دے دیا لیکن میری پریشانی دور نہ ہوئی۔ میرا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا۔ میں نے دارا کی طرف دیکھا، وہ بڑی بے نیازی سے ڈرائیونگ میں منہمک تھا۔ ہم مختلف سڑکوں سے گزرے۔ پھر دارا نے گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے روک دی... ہوٹل کا نام میزبان تھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" دارا گاڑی سے اترتے ہوئے بولا اور ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے سڑک پر بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اسلم پہلے ہی گاڑی سے اتر چکا تھا۔ میں بھی اتر آیا۔ ہم دونوں دارا کے پیچھے پیچھے ہوٹل میں داخل ہوئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے ہاتھ اٹھا کر دارا کو سلام کیا۔ دارا جواب میں ہاتھ ہلاتا ہوا اوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ اوپری منزل کے ایک کمرے کے سامنے رک کر اس نے جیب سے چابی نکالی، دروازہ کھولا اور ہمیں آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

"آؤ بیٹھو..." اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا چکر ہے؟"

"یہ سارا چکر آپ کو وہاں سے نکالنے کے لیے چلایا گیا ہے۔" دارا کی بجائے اسلم نے جواب دیا۔ "منصوبہ دارا صاحب ہی نے بنایا تھا۔"

"یہ پہیلی در پہیلی کا سا اندازِ بیان چھوڑو اور صاف صاف بتاؤ۔ دارا صاحب تو بطور دشمن سامنے آئے تھے۔ ان کی ہمدردی میرے حلق سے اتنی آسانی سے نہیں اُترے گی۔"

"ظاہر ہے۔" دارا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تفصیل تمہیں میں بتاتا ہوں۔ دراصل تم اشتہار کے جواب میں آئے تھے۔ رحمت علی کی طرح میرا بھی یہی خیال تھا کہ نازو تمہارے قبضے میں ہے اور تم اس کی رہائی کے بدلے رقم اینٹھنے آئے ہو۔ یہی وجہ تھی کہ میں تم سے بڑی طبیعت سے لڑا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مزا آگیا۔ ایسا مدِ مقابل پہلے نہیں ملا تھا۔" اس کے لہجے میں ستائش جھلکنے لگی۔

"آدمی تو تم بھی جاندار ہو۔" میں نے خلوص سے کہا۔ "بس دماغ گرم ہونے کی وجہ سے مار کھا گئے۔"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بڑھیا سے پوچھ گچھ پر پتہ چلا کہ تم تو خود نازو کی تلاش میں ہو۔"

"نازو سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک طویل داستان ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "بات یہ ہے کہ میں رحمت علی کے ساتھ بہت طویل عرصے سے ہوں۔ یہ لوگ بہت طاقت ور ہیں۔ یہ ایک سنڈیکیٹ ہے جس کا سربراہ اندھیرے میں ہے۔ مجھے اس گروہ میں لانے والا عابد حسین تھا... وہی عابد حسین جس کے نام سے شائع ہونے والا اشتہار تمہیں چودھری رحمت علی تک لے گیا تھا۔ پہلے وہی سربراہ تھا۔ جرائم پیشہ ہونے کے باوجود وہ ایک مختلف آدمی تھا۔ اس کی شخصیت کے دو رُخ تھے۔ ایک طرف وہ جرائم پیشہ تھا تو دوسری طرف ایک درد مند انسان بھی تھا۔ مجھ پر تو اس کے بہت احسانات ہیں۔ جب میں اس کے پاس آیا تو بہت چھوٹا سا تھا۔ اس نے مجھے تعلیم بھی دلوائی اور لڑائی بھڑائی کی تربیت بھی دی... پھر اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، اسی کی بدولت ہوں۔ چودھری رحمت علی اس زمانے میں اس کا دستِ راست ہوا کرتا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ چودھری رحمت نے اس پر قابو پالیا۔ اُسے تشدد کے ذریعے مفلوج کروا دیا اور خود چودھری سنڈیکیٹ کا سربراہ بن بیٹھا۔ لیکن یہ پوزیشن دوسرے نمبر کی ہے۔ ایک اَن دیکھا سربراہ کہیں موجود ہے۔

"چودھری رحمت نے میرا منصب برقرار رکھا... اس کا خیال تھا کہ میری وابستگی کسی فردِ واحد سے نہیں بلکہ تنظیم کے ساتھ ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں عابد حسین کے سلسلے میں کتنا مخلص ہوں۔ چودھری نے عابد حسین کو ٹھکانے لگانے کا کام میرے سپرد کیا۔ میں نے عابد حسین کو ختم کرنے کی بجائے اسے ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔ جہاں وہ اب بھی مقیم ہے۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ اُن کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں، لیکن یہ بات میری سمجھ میں اب بھی نہیں آئی تھی کہ میرا اس ڈرامے میں کیا کردار ہے۔ "نازو کا ان معاملات سے کیا تعلق ہے؟" کچھ سوچنے کے بعد میں نے پوچھا۔

"وہ عابد حسین کی بیٹی ہے۔"

مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں پہلے ہی سے یہ خدشہ جاگزین تھا۔ مجھے یاد تھا کہ نازو نے درپردہ ایک فلم کے لیے سرمایہ فراہم کیا تھا... یعنی وہ ایک اچھی خاصی سرمایہ دار تھی، لیکن میں نے یہ تو تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کسی ایسے گروہ سے تعلق رکھتی ہوگی، جو بڑے پیمانے پر مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث رہا ہے۔ اس روز میرے سینے میں یہ سب کچھ سن کر کچھ ٹوٹ سا گیا۔ حالانکہ میرا نازو سے تعلق بے حد موہوم سا تھا لیکن اپنی اُس اذیت سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ بعض موہوم سے تعلقات بھی کس قدر اہم ہوتے ہیں۔

"نازو کی گمشدگی عابد حسین کے لیے تو تکلیف دہ ہے ہی... لیکن تنظیم والے بھی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔" کچھ توقف کے بعد دارا نے پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اس کے پاس کچھ ایسی چیزیں ہیں جو گروہ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ تنظیم بڑی سرگرمی سے اُس کی تلاش میں ہے۔ میں اپنے طور پر ان لوگوں پر بھی نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔ عابد حسین کے حوالے سے نازو میرے لیے جذباتی اہمیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے تم سے مقابلہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تمہارے قبضے میں ہے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا کہ تمہاری یہ غلط فہمی دور کیسے ہوئی؟" میں نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ تو بڑھیا کی باتوں نے مجھے دہلا دیا تھا۔" دارا مسکراتے ہوئے بولا۔ "باقی دھند تمہارے اس دوست نے صاف کر دی۔ میں نے رب نواز کو اس کا ٹھکانا دیکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ دونوں پہلے ہی سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اسلم نے رب نواز کو پوری کہانی سنا دی... رب نواز نے مجھے سارا احوال سنا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تمہارے علم میں ہے۔"

"تم مجھے دن میں بھی نکال سکتے تھے؟" میں نے اعتراض کیا۔ "مجھے تو اس کوٹھی میں کہیں کوئی آدمی دکھائی نہیں دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے اتنی لاپروائی سے کیوں قید کیا گیا تھا۔"

"دراصل تم چودھری رحمت کے کتوں سے واقف نہیں ہو۔ اس کے پاس درجنوں ایسے خونخوار کتے ہیں۔"

جو ایک لمحے میں آدمیوں کو چیر کر پھینک سکتے ہیں۔ اُن کتوں کے ہوتے ہوئے پہریداروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ خوش قسمتی سے کتوں کی نگرانی رب نواز کے ذمّے ہے البتہ کوٹھی کے باہر پہرہ رہتا ہے۔ اسی لیے دیوار میں سینده لگانے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔"

اب میری ہر اُلجھن دُور ہو گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں قدم قدم پر عجیب و غریب واقعات کا شکار ہوتا رہا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خدا آزمائش سے پہلے انسان کے ظرف کو بقدرِ غم وسعت دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر انسان محض دُکھ کی وجہ سے جاں سے گزر جایا کرتا۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ جہاں مجھے بے شمار دشمن ملے تھے، وہیں قدم قدم پر مخلص دوست اور ہمدردوں نے میرے دُکھ بٹائے تھے۔۔۔ میرے پیروں کے تلووں سے دُکھ کے کانٹے نکالے تھے۔ تازہ ترین مثال یہ لوگ تھے، جن سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن اُنھوں نے اپنے انجام کی پروا کیے بغیر میری مدد کی تھی۔ اس لمحے مجھے اسلم، دارا اور رب نواز پر بہت پیار آیا اور میرا دل خُدائے مسبّب الاسباب کی شکر گزاری کے احساس سے لبریز ہو گیا۔

"میں تم لوگوں کا شکریہ کس طرح ادا کروں؟" میں ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

"میرا خیال ہے، زندگی کے برتتے ہوئے لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ رسمی باتیں کس قدر کھوکھلی ہوتی ہیں۔" دارا نے جواب دیا۔ میں واقعی کٹ کر رہ گیا، لیکن میں کم از کم معذرت کی فضول رسم سے تو بچ ہی سکتا تھا چنانچہ خاموش رہا۔

"دیکھو دوست، میں نے پہلی ہی نظر میں تمھارے چہرے پر بہادری کی تحریر پڑھ لی تھی۔ میں بہت بُرا آدمی ہوں لیکن بہادروں کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ پھر ایک اعتبار سے ہماری منزل ایک ہے۔ کسی گناہگار کے لیے یہ سعادت بھی کم نہیں ہوتی کہ وہ کسی اچھے مقصد کے لیے تھوڑی دُور ہی سہی، کسی اچھے آدمی کے ساتھ چل لے۔" وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ "خیر اب مناسب سمجھو تو بتاؤ۔ تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"کیا کہہ سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "میں تو بہت اُلجھا ہوا ہوں۔ مجھے کچھ سوچ کر قدم اُٹھانے کا موقع نہیں ملتا۔ میری حیثیت تو وقت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی سی ہے۔ اس کے علاوہ اب تک میں نے ایک بات اور سیکھی ہے۔ میں جس قدم ہوں جن سے میرا تعلق قائم ہوتا ہے۔۔۔ جو میرا ساتھ دیتے ہیں وہ بھی میری ہی طرح وقت اور حالات کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ گلنار کی۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ اُس کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ تمھارے راستے میں جو ایک سیاہ پوش بار بار آتا ہے نا۔۔۔ وہ اُسی کے جنگل میں ہے۔ اُس کا نام جلال ہے۔ بظاہر تو وہ چودھری رحمت کا آدمی ہے لیکن درحقیقت بگ باس کے احکام پر عمل کرتا ہے۔"

گلنار کے متعلق معلوم ہوتے ہی میں بے چین ہو گیا۔

"تو گلنار کو چھڑانے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتی ہے لیکن فی الوقت نہیں۔" دارا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فی الحال تم آرام کرو۔ میں جلد ہی کوئی صورت نکالوں گا۔"

میرے تصور میں گلنار کا سراپا لہرا گیا۔ وہ شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ نگاہیں لفظوں سے کہیں زیادہ نشتر آگیں تھیں۔ "کیسی باتیں کرتے ہو؟" میرے لہجے میں خفیف سی جھنجلاہٹ اُتر آئی۔ "اس پر میری وجہ سے نہ جانے کیا گزر رہی ہوگی۔۔۔ اور میں آرام کروں۔ میں کس حد تک بے ضمیر ہو سکتا ہوں۔"

دارا نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"دیکھو دوست، جو کچھ کہہ رہا ہوں، غور سے سُنو۔ کام آئے گا۔ میں چھ سات سال کی عمر سے وقت کے تھپیڑے سہتا رہا ہوں۔ میرا تجربہ میری عمر سے بڑا ہے۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور ایک طویل سانس لے کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "زندگی کا سفر ہے پیارے۔ وقت مزاج کے اعتبار سے ہی ہوتا ہے۔ ناموافق ہو تو ہاتھ پاؤں مارنے سے آگے نہیں بڑھا جا سکتا البتہ اس طرح ہاتھ پاؤں مار کر توانائی کا زیاں کیا جا سکتا ہے۔ ناموافق وقت میں خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا سب سے بڑی دانش مندی ہے۔ یاد رکھو، وقت ناموافق ہے تو موافق بھی ہوگا۔۔۔ اور اگر تم نے توانائی ضائع نہیں کی تو موافق وقت آنے پر اپنی تیزی سے آگے بڑھ سکو گے کہ کمی کی تلافی ہو جائے گی۔ وقت تو میرے بھائی اللہ کی عنایت ہے، مشیت کا اشارہ ہے، جو تمھیں سمجھاتا ہے کہ کب کیا طرزِ عمل اختیار کرنا تمھارے حق میں بہتر ہوگا۔ اگر تم اس اشارے سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے تو یہ تمھاری بدقسمتی ہے۔ میری بات مانو، آرام کرو، ذہن کو پُرسکون رکھو، حالات کا تجزیہ کرو، پھر اللہ سے رہنمائی طلب کرو اور اُس سے ہمیشہ اچھی اُمید رکھو۔"

وہ خاموش ہو گیا لیکن میں حیرت سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اُس نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ سوچوں کے وہ دریچے، جو پہلے کبھی نہیں کھلے تھے، اس لمحے اُس کی باتوں نے کھول دیے تھے۔ مجھے اپنے وجود میں تازگی کا احساس ہو رہا تھا اور اُس نے خود کہا تھا کہ وہ بُرا آدمی ہے۔ لیکن کیا وہ واقعی بُرا آدمی تھا۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ اگر آدمی کی فکر بے سمت نہ ہو تو بُرائی کا احساس نہ صرف مثبت بلکہ بے حد ضروری چیز ہے۔ ایسا آدمی کبھی بھی وقت کسی آزمائش کے زم زم میں اُتر کر ایک لمحے میں دُھل سکتا ہے، پاک ہو سکتا ہے۔

"کس سوچ میں پڑ گئے تم؟" اُس نے نرم لہجے میں ٹوکا۔

"نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔" میں نے چونک کر جواب دیا۔ "میں اسلم کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہوگا۔" اُس نے بے خیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھ پر بھروسہ ہو تو یہیں ٹھہرو۔ یہاں تمھارے لیے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ دراصل تمھارے فرار کی اطلاع سُن کر چودھری کو سب سے پہلے اسلم ہی کا خیال آئے گا۔"

"ہاں۔۔۔ یہ بات ٹھیک ہے۔" اسلم نے تائید کی۔

"لیکن اسلم تو کسی مصیبت میں نہیں پھنس جائے گا؟"

دارا کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ اسلم بول پڑا۔

"نہیں بابو۔۔۔ ایک بے ضرر سائیکسی ڈرائیور کسی مصیبت میں نہیں پھنس سکتا۔"

دارا بھی سر کو تائیدی جنبش دے کر رہ گیا۔

"اب میں چلتا ہوں۔" اسلم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "صبح آؤں گا۔"

"چلو۔۔۔ میں تمھیں گھر چھوڑتا ہوا نکل جاؤں گا۔" دارا نے کہا۔

اُن دونوں کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ جب سے اس ابتلا کا آغاز ہوا تھا، میں نے اتنے ٹھکانے بدلے تھے کہ بے چھت اور بے گھر ہونے کا احساس میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ گھر کوئی چار دیواری سے مشروط نہیں ہوتا اور نہ ہی آسمان سے محفوظ رکھنے والی ہر چیز کو چھت کہا جا سکتا ہے۔ گھر کے ساتھ اسباب بھی ہوتا ہے اور وہ اسباب جیتے جاگتے، چلتے پھرتے آدمیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ مسلسل بھاگ دوڑ مجھے ایک گھر کی ضرورت کا احساس دلانے لگی تھی۔۔۔ گھر، جہاں تھکا ہارا آدمی پہنچتا ہے تو کھنکتی چوڑیاں، روشن چہرہ اور ہاتھوں کا محبت بھرا لمس تھکن کے ہر احساس کو زائل کر دیتا ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے گلنار کا سراپا یوں لہرایا، جیسے ذہن میں اُمڈتے ہوئے سوالوں کا وہی ایک جواب ہو، پھر میں نے اُس کے نرم و گداز ہاتھ کا لمس اپنی تپتی پیشانی پر محسوس کیا اور میری آنکھیں مندتی چلی گئیں۔

میری آنکھ کھلی تو دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ مشرق کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے اچھی خاصی دھوپ کمرے میں اُتر آئی تھی۔ میں اُٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا، لیکن میں نے فوراً ہی دروازہ کھولنا مناسب نہ سمجھا۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں ہوں جی ویٹر۔۔۔ آپ اُٹھ گئے ہیں نا۔۔۔؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ہاں۔۔۔ میں اُٹھ گیا ہوں۔"

"ناشتہ کتنی دیر میں لاؤں صاحب؟"

"آدھے گھنٹے میں لے آنا۔" میں نے جواب دیا اور باتھ رُوم کا رُخ کیا۔ باتھ رُوم کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ دارا وقتاً فوقتاً وہ کمرہ استعمال کرتا رہا ہے۔ باتھ رُوم میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ایک طرف ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ برش رکھا تھا۔ ظاہر ہے، میں وہ برش

استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ برابر ہی منجن کی ایک شیشی رکھی تھی۔ میں نے دانت مانجھے۔ غسل کر کے مجھے تازگی کا احساس ہوا لیکن میرے پاس بدلنے کے لیے کپڑے نہیں تھے۔ مجھے وہی کپڑے پہننا پڑے، جو میں پہلے پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے باوجود نہانے کی وجہ سے میری کسلمندی کسی حد تک دُور ہو گئی تھی۔

مجھے نہا کر نکلے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اس بار میں نے بے دھڑک دروازہ کھول دیا۔ ویٹر ناشتے کی ٹرے لیے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے اندر آ کر ٹرے میز پر رکھ دی۔ "سر جی ... اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے طلب کر لیجیے گا۔" اس نے بے حد احترام سے کہا۔ "میرا نام نصیر ہے جی۔ میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔"

"لیکن تمھیں میری موجودگی کا پتہ کیسے چلا؟" میں نے پوچھا اور پھر دل ہی دل میں خود کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ میرا سوال احتیاط کے منافی تھا۔

"دارا صاحب جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ آپ کا خیال رکھا جائے۔" نصیر نے جواب دیا۔ "اب میں جاؤں سر جی۔ تھوڑی دیر بعد برتن لے جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" میں نے کہا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نصیر کمرے سے چلا گیا۔ ناشتے کو دیکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میں نے گزشتہ روز ناشتے کے علاوہ کچھ نہیں کھایا تھا۔ دونوں وقت کا کھانا چودھری رحمت علی کی نذر ہو گیا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ گزشتہ رات مجھے بھوک کا احساس کیوں نہیں ہوا۔ شاید اُس وقت میں خلافِ توقع قید سے آزاد ہوا تھا۔ اُس وقت آزادی ہی میرے لیے سب سے بڑی نعمت ہو گی۔ آدمی نامساعد حالات میں بہت دیکھ بھال کر پاؤں پھیلاتا ہے۔ ایسے میں ضروریات بھی تعیشات کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔

ناشتہ بہت ٹھیک ٹھاک اور عرفِ عام میں تگڑا تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "آ جاؤ۔" میں نے پکارا۔ دروازہ کھلا اور دارا اندر آ گیا۔ وہ قمیص شلوار میں ملبوس تھا۔

"ہوں ... تو یہ عیاشی ہو رہی ہے۔ دس بجے ناشتہ اور وہ بھی اکیلے اکیلے۔" اُس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"ہاں بھائی ... اور یہ عیاشی بھی تمھارے زور ہو رہی ہے۔" میں نے بجھے بجھے سے لہجے میں جواب نہ جانے کیوں بے گھری کا احساس شدت سے عود کر آ

"ارے یار، یہ کیا؟ تم تو ایک دم سنجیدہ ہو گئے اگر میری بات بُری لگی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔" وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"نہیں ... ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں شرمند گیا۔ "دراصل اندر کی گھٹن بڑھ جائے تو وہ نکاسی راستہ تلاش کرتی ہی ہے۔ میں تو تمھارا ش گزار ہوں۔"

"اب تم صحیح معنوں میں مجھے ذلیل کر رہے خیر ... چھوڑو ان باتوں کو، نیند کیسی آئی؟"

دروازے پر پھر دستک ہوئی اور نصیر نامی اندر آیا۔ دارا کو دیکھتے ہی اُس نے ایک زوردار سے نوازا۔ "صاحب، کچھ لاؤں آپ کے لیے؟" اُس نے پوچھا۔

دارا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں ناشتہ کر کے ہوں۔ البتہ جب تک جمال صاحب یہاں ہیں ان کا خیال رکھنا ہو گا۔" وہ بولا۔

"آپ جانتے ہیں صاحب۔ اس معاملے میں جواب نہیں ہے۔" نصیر نے مسکراتے ہوئے کہا ا سمیٹنے لگا۔ برتن سمیٹ کر اُس نے ٹرے پر رکھے خاموشی سے باہر چلا گیا۔

"اور سناؤ، تمھاری طرف کیا رہا؟" میں نے پو

"خوب ہنگامہ رہا۔" دارا نے مسکراتے ہوئے دیا۔ "جب رات کو چودھری رحمت علی میرے سا کمرے میں پہنچا، جہاں تمھیں قید کیا گیا تھا تو اُس پر گزر گئی۔ اُس کی صورت دیکھنے والی تھی اُس وقت۔ پوری کوٹھی میں تمھیں تلاش کیا گیا۔ آخر میں تو خود یہی لگنے لگا، جیسے تمھیں خواب میں قید کیا گیا ہو۔ ملازموں کی شامت آ گئی۔"

"رب نواز پر تو کوئی آنچ نہیں آئی؟"

"کیسے آ سکتی تھی! رات بھر کتے کھلے رہے تھ رحمت علی کے تو ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ اُس

میں نہیں آ رہا کہ تم فرار کیسے ہوئے ہو؟ راستہ کون سا اختیار کیا تھا؟ وہ پاگل ہوا جا رہا ہے۔"

"اور اگر کسی نے وہ دیوار دیکھ لی؟" میں رب نواز کے سلسلے میں بُری طرح تشویش کا شکار ہو رہا تھا۔

"ارے ... تم رب نواز کو نہیں جانتے۔ وہ بہت ہنرمند آدمی ہے۔ وہ کبھی کچا کام نہیں کرتا۔ اب تو تم خود بھی وہ جگہ تلاش نہیں کر سکتے، جہاں دیوار میں سیندھ لگائی گئی تھی۔"

"وہ خیریت سے ہے نا؟"

"ہاں ... وہ تو خیریت سے ہے۔ البتہ اب تمھیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہو گا۔ چودھری رحمت علی چوٹ کھائے ہوئے ناگ کی طرح تمھاری فکر میں رہے گا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ کم از کم تین دن تم اسی ہوٹل میں گزارو ... خاموشی سے ... سامنے آئے بغیر۔ معاملات سرد پڑنے کے بعد کوئی خطرہ مول لیا جا سکتا ہے۔ اس دوران میں گلنار کی رہائی کی ترکیب سوچتا رہوں گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ لیکن گلنار کو آزاد کرائے بغیر مجھے چین نہیں آئے گا۔ تم اس سلسلے میں جلدی نہیں کر سکتے؟"

"ابھی سب سے پہلے تو مجھے اپنے اندازے کی تصدیق کرنی ہے کہ گلنار جلال کے قبضے میں ہے۔ پھر اُس کے بعد میں اُس کی رہائی کی تدبیر سوچوں گا۔" اس نے جواب دیا۔

میں خاموش رہا۔ شکریہ ادا کر کے اُس کے خلوص کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اچھا ... اب میں چلتا ہوں۔ کل پھر آؤں گا۔ شاید کل میں تمھیں ایک صاحب کے پاس لے چلوں۔ ہوٹل میں پڑے پڑے تو تم بور ہو جاؤ گے، لیکن یقین کرو، اس میں نہ صرف تمھاری بلکہ ہم سب کی بھلائی ہے۔" کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ ویسے بھی میں جوش پر ہوش کو اوّلیت دینے والوں میں سے ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ میری حالت اُس وقت کچھ عجیب تھی۔ سینے میں الاؤ دہک رہے تھے لیکن مصلحتوں نے دماغ کو یکسر سرد کر دیا تھا۔ میں اس وقت ایک ایسے پرندے کی مانند تھا، جس سے آزادی چھین کر اُسے ایسے پنجرے میں مقید کر دیا گیا ہو، جس کا دروازہ کھلا ہوا ہو ... جسے معلوم ہو کہ وہ کسی بھی وقت پنجرے سے نکل سکتا ہے ... اور یہ بھی معلوم ہو کہ پنجرے کے باہر شکاری گھات لگائے بیٹھا ہے ... جسے مجبور کر دیا گیا ہو کہ کھلی فضاؤں کی ... مست ہواؤں کی پکار کو نظر انداز کر کے، زندگی کے بہت سے لمحے اُسے اُسی پنجرے میں گزارنے ہوں گے۔

زندگی میرے نزدیک اہم تھی ... اہم رہی ہے، لیکن میں نے اسے غیر ضروری اہمیت کبھی نہیں دی۔ خصوصاً زندگی سے موت کی معاملت میں، میں آدمی کو بے بس اور لاتعلق سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین تھا اور ہے کہ زندگی کی ایک حد اور موت کا ایک وقت مقرر و متعین ہے۔ ایسے میں موت کا خوف فطری ہونے کے باوجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن بعض اوقات کوئی وابستگی ... کوئی تعلقِ خاطر، بڑے سے بڑے یقین کی بنیادیں ہلا دیتا ہے۔ موت کو اپنی طرف یقینی انداز میں بڑھتے ہوئے دیکھ کر بھی آدمی کو کوئی اُدھورا کام، جسے وہ بے حد ضروری سمجھتا ہو، یاد آ جائے تو وہ زندگی سے بُری طرح چمٹ جانا چاہتا ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ میں گلنار کا مقروض تھا۔ مجھے موت کا کوئی خوف نہیں تھا، لیکن میں اسے رہائی دلائے بغیر یقینی موت کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیوں، ایسے میں آدمی یہ بھول جاتا ہے کہ اُس کا اختیار محض ایک واہمہ ہے اور صرف اُس کے سوچ لینے سے تقدیرِ معیّن میں کبھی کوئی فرق نہیں آتا۔

مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میری بے لگام سوچوں کا دھارا گلنار کی طرف مڑ گیا ہے۔ وہ تھی بھی تو ایسی ہی ... خواہ مخواہ از خود رفتہ کر دینے والی ... اشارت کیا، عبارت کیا، ادا کیا۔ اس کا چہکتا، چٹکتا سراپا تصوّر میں لہرا گیا۔ وہ محض خوبصورت نہیں تھی۔ وہ ذہین تھی، شستہ مزاج تھی، حاضر جواب تھی۔ اس کے سینکڑوں وصف عیاں تھے تو سینکڑوں وصف نہاں بھی ہوں گے۔ آدمی کہاں کسی پر پوری طرح عیاں ہوتا ہے۔ وہ تو کسی حد تک خود سے بھی اوجھل رہ جاتا ہے۔ اوروں کا تو ذکر ہی کیا، گلنار

کی عمر کم تھی لیکن اُس کی شخصیت کا رچاؤ... اُس کی گہرائی ... اُس میں وہ سحر تھا، جو آدمی کو اک عمر گزار کر ... دُکھ سُکھ کا گیان حاصل کرنے کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ آدمی کی عمر اس کے گزرے ہوئے مہ و سال کی تعداد سے مشروط تھوڑا ہی ہے۔ گلنار نے کم عمری ہی میں زمانے کے سرد و گرم دیکھ لیے تھے۔ یوں بھی عورتوں کو اور خصوصاً بے سہارا عورتوں کو تجربات زیادہ ہی پیش آتے ہیں۔ گلنار بازار میں بیٹھی تھی۔ دُنیا کی مشکل ترین پبلک ڈیلنگ سے بازار میں بیٹھنے والی عورتوں کو ہی سابقہ پڑتا ہے۔ گلنار نے بازار میں بیٹھنے کے باوجود اپنے شیشے کو نہ صرف محفوظ رکھا تھا بلکہ اسے اور جلا بھی دی تھی۔ اُس کے اچھوتے گلابوں کی مہک اور فزوں ہو گئی تھی۔ اس پہ ستم یہ کہ اسے کتابوں سے بھی شغف تھا۔ کتابیں بھی آدمی کی عمر بڑھا دیتی ہیں۔ لفظ بھی زندگی ہوتے ہیں ... زندگی کا ایک رُوپ ہوتے ہیں۔ ہر شخص جو لفظ لکھتا ہے وہ مفہوم کے اعتبار سے دوسرے شخص کے لکھے ہوئے لفظ سے جُدا اور مختلف ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر ... کسی مختلف انداز میں تجربات کی بھٹی سے گزرتا ہے اور اس کے لفظ میں اس کے اپنے تجربات کی تاثیر ہوتی ہے۔ پڑھنے والے کی اپنی ایک اپروچ ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ کسی ایک لفظ کے حوالے سے اُن تجربوں سے ایک لمحے میں گزر جاتا ہے، جن سے گزرنے میں لکھنے والے کو اک عمر لگی ہوتی ہے۔ گلنار مطالعے کی عادی تھی اور میں خود دیکھ چکا تھا کہ اس کا ذوق انتہائی اعلیٰ ہے۔ ویسے بھی وی سی آر کے اس دَور میں کسی گھر میں لائبریری کی موجودگی اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اُس میں بسنے والا کسی اور طرح کا آدمی ہے۔ گلنار نے نہ صرف مطالعے کے ذریعے تجربے محسوس کیے تھے بلکہ دوسری طرف اُس نے عملی دُنیا کی تجربہ گاہ میں اُن کی تصدیق کی تھی۔ یہی تو وہ مرحلہ ہوتا ہے، جہاں پہنچ کر فن علم کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے کہ عُلماء نے علم کی یہی تعریف کی ہے۔

گلنار نے مَردوں کی دُنیا میں عمر گزاری تھی اور اپنا دامن بھی بچائے رکھا تھا۔ ایسی لڑکیوں کے ذہن میں کسی سے متاثر ہونے والا کوئی خانہ نہیں ہوتا، لیکن میرے سلسلے میں گلنار کا کردار حیران کن تھا۔ وہ اظہار کی قائل نہیں تھی لیکن اظہار کا ایک پہلو اور بھی ہوتا ہے۔ پتہ بھی نہیں چلتا ہو گا کہ وہ کس کس طرح اپنے جذبے مجھ پر ظاہر کر چکی ہے۔ میرے زخمی ہونے کی خبر سُن کر وہ بُری طرح بے تاب ہو گئی تھی۔ اُسی بے تابی نے اُسے اس مصیبت میں پھنسا دیا تھا اور اب میں یہاں آرام دہ بستر پر بیٹھا اس کے متعلق سوچنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ جانے، وہ کس حال سے گزر رہی ہو گی۔ ہاں، اُس کی وہ بے تابی، جو اُسے اور مجھے دونوں کو بہت مہنگی پڑی تھی، اُس کی طرف سے محبت کا عملی اظہار تھا... میرے لیے ایک اعزاز تھا لیکن حالات کی ناخوش گوار کروٹ نے اُسے میرے لیے ایک چیلنج بنا دیا تھا۔

پھر مجھے نازو کا خیال آ گیا۔ نازو کا خیال آتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔ نہ جانے یہ کیا راز تھا۔ کیا میں بیک وقت دو لڑکیوں سے راہِ دل استوار کر رہا تھا۔ یہ ایک اُلجھن تھی۔ میں غور کرتا، نازو کا اور میرا ساتھ بے حد مختصر تھا۔ وہ کوئی بہت حسین لڑکی نہیں تھی، لیکن اس میں ایک عجیب طرح کا وقار تھا... سادگی تھی... دل موہ لینے والی سادگی۔ جب وہ پُراسرار حالات میں غائب ہو گئی اور اُس کے حوالے سے خود میں بھی ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا تو وہ میرے لیے ناگزیر ہو گئی۔ میرے بہت سے معاملات کی وضاحت دبی تھی۔ اس کی ہستی کے گرد پہیلیاں ہی پہیلیاں تھیں۔ انسان فطری طور پر تجسس پسند ہوتا ہے۔ اُس کی شخصیت میں میرے لیے یہی چیز باعثِ کشش تھی۔ میں اس کے متعلق کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔ گزشتہ روز پتہ چلا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے مجرم کی ... ہے تو میں منقسم ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے وجود کا ایک ... اب بھی اس کی معصومیت پہ مُصر تھا...

دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا، ورنہ خُدا جانے میری سوچوں کا سلسلہ کہاں تک دراز ہوتا۔ "اندر آ جاؤ۔" میں نے بے حد تھکے تھکے لہجے میں ...

دروازہ کھلا تو اسلم کا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔ اُس نے دروازہ بند کیا اور میری طرف چلا آیا۔

"بیٹھو۔" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ...

"ضرور بیٹھوں گا۔" وہ بے تکلفی سے بولا اور ...

"اور سُنائیں، کیا حال ہے؟ کیسی گزر رہی ہے؟"

"بس گزر رہی ہے۔" میں نے اُداس لہجے میں ... جواب دیا۔

"ٹیکسی لایا ہوں۔ چلیں، کہیں گھما لاؤں آپ کو۔" اُس نے پیشکش کی۔

"نہیں... میرا باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔ دارا کا کہنا ہے کہ فی الحال میں اسی کمرے تک محدود رہوں۔"

"بات تو معقول ہے۔" وہ سر ہلا کر بولا۔ "یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔"

"ایسی باتوں کا مجھے خود کبھی خیال نہیں رہتا تھا لیکن اب خیال رکھنا پڑ رہا ہے۔"

"ایسا لگتا ہے کہ آپ بور ہو رہے ہیں بُری طرح۔" اُس نے کہا۔

"مینا سنچہ تم میرا دل بہلانے کے لیے کہانی سُناؤ گے۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ اُس کے لہجے کی طرح اُس کی ہنسی بھی بے حد تیکھی تھی۔ بے اختیار مجھے ریشماں کا خیال آ گیا۔ وہ بے حد حسین لیکن بچی بچی لڑکی اس شخص سے کس قدر مختلف تھی۔ اُس نے کتنی صفائی سے بتا دیا تھا کہ اسلم اُس سے محبت کرتا ہے۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اسلم مجھے پہچانتا بھی نہیں تھا لیکن ریشماں کے حوالے پر تو وہ میرے راستے میں گویا بچھ سا گیا تھا۔ مجھے اچانک بہت زیادہ تجسس محسوس ہونے لگا۔ ابھی میں اُس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور نصیر نازل ہو گیا۔

"صاحب... کھانا لاؤں؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بج چکے تھے۔

"وہ جی... میں نے سوچا، آپ نے ناشتہ دیر سے کیا ہے، اس لیے..." نصیر نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں بھئی... میں نے گھڑی اس لیے نہیں دیکھی تھی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "سچ پوچھو تو مجھے بھوک اب بھی نہیں ہے، لیکن تم ایسا کرو کہ ہم دونوں کے لیے کھانا لے آؤ۔"

اسلم نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ یہ اُس کی ایک اور بڑائی تھی۔ وہ فضول تکلف کرنے کا عادی نہیں تھا۔ ایسے لوگوں سے بے تکلف ہُوا بھی جا سکتا ہے کیونکہ تعلق دو طرفہ چیز ہوتی ہے۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو میں نے تولیا اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ہاتھ پونچھ کر تولیا کرسی کی پشت پر لٹکا دیا۔

میں ہاتھ دھو کر باہر آیا ہی تھا کہ نصیر کھانا لے آیا۔ وہ ٹرے میز پر رکھ کر جانے لگا تو میں نے اُسے ٹوک دیا۔ "کھانے کے بعد چائے بھی مل سکے گی؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں جناب۔ ضرور ملے گی۔" اُس نے جواب دیا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ اسلم نے اس بار بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔

ہم دونوں خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گئے۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے زیادہ بھوک نہیں تھی۔ میں محض اسلم کا ساتھ دینے کی غرض سے بیٹھا بے دلی سے نقمے حلق سے اُتارتا رہا۔ اسلم البتہ کھانے کی طرف پوری طرح متوجہ تھا اور اُس سے پورا پورا انصاف کر رہا تھا۔ مجھے اُس وقت اس پر بے تحاشا پیار آ رہا تھا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک کھرا آدمی تھا۔ ایسے کھرے آدمی عام طور پر کھُردرے بھی ہوتے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم دونوں نے ہاتھ دھوئے اور واپس آ بیٹھے۔ کچھ ہی دیر بعد نصیر آ کر برتن لے گیا۔ پھر وہ چائے لے آیا۔ میں نے اُسے روک لیا تاکہ وہ برتن بھی ساتھ ہی لے جائے۔

"میاں نصیر... مجھے کچھ چیزیں درکار ہیں۔" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے بتائیں سر جی، میں لا دوں گا۔"

"دو ایک کتابیں... چند ایک رسالے منگوانا ہیں۔" میں نے فرمائش کی۔

"نام بتا دیں جی... میں ابھی لا دوں گا۔"

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہاں سو سو والے صرف تین نوٹ تھے۔ ویسے مجھے پیسوں کی طرف سے بے فکری تھی۔ پچاس ہزار روپے تو میری دسترس میں موجود ہی تھے۔ میں نے سو کا نوٹ اُس کی طرف بڑھایا اور اسے کتابوں اور چند رسالوں کے نام بتا دیے۔

"یہ فائدہ ہے تعلیم کا؟" نعیم کے جانے کے بعد اسلم نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "فرصت میں کتنی اچھی معروفیت ڈھونڈی ہے آپ نے۔"

"ہاں درست... لیکن تم تو پڑھے بغیر بھی وہ کچھ جانتے ہو، جو میری سمجھ میں نہیں آتا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ خاموش رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے بارے میں گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔

"مجھے اپنے اور ریشماں کے بارے میں بتاؤ۔" میں نے فرمائش کی۔

اُس کی آنکھوں میں یکلخت گہری اُداسی اُتر آئی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ خوش مزاج شخص اپنے باطن میں اداسیوں کا کس قدر بیکراں سمندر سمیٹے ہوئے ہے۔ مجھے دُکھ ہوا کہ میں نے [illegible] آزار میں مبتلا کر دیا۔

"کیا بتاؤں اپنے بارے میں... اُس کے بارے میں۔" اُس کے لہجے میں بھی عجیب سی حسرت در آئی۔ "اُس کے بارے میں تو میں ... جانتا بھی نہیں ہوں۔ کبھی ضرورت ہی ... محسوس ہوئی جاننے کی۔ بس یہ کافی ہے کہ میرے دل نے مجھ سے کچھ پوچھے بغیر اسے ایک مقام دے دیا ہے۔ ویسے بھی میں کبھی جاننے کے چکر میں نہیں پڑا۔ جو کچھ خود بخود جان لیتا ہوں، مجھ سے وہ بھی نہیں سہارا جاتا۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا ہے۔ سب کچھ جان لوں تو وہ دل کی برداشت سے زیادہ ہو جائے گا... پھٹ جائے گا دل۔ دُنیا میں دُکھوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ ہر خوشی کی تہ میں دُکھ... خوشی سے پہلے دُکھ... خوشی کے بعد دُکھ۔ بس میں تو اتنا جانتا ہوں کہ دُکھ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں... اچھے دُکھ اور بُرے دُکھ۔ جب میں اوروں کے دُکھ محسوس کرتا ہوں، اپنے دُکھ کی طرح تو... تو..." وہ بُری طرح اٹک گیا۔ "کیسے سمجھاؤں... جاہل ہوں نا... الفاظ ہی نہیں ملتے۔ یوں سمجھ لیں کہ جب میں اوروں کے دُکھ اپنے دُکھ کی طرح محسوس کرتا ہوں... ان کی اذیت میرا دل کاٹنے لگتی ہے تو مجھے عجیب سا احساس ہوتا ہے... جیسے میں پھیل رہا ہوں، بڑھ رہا ہوں... جیسے... جیسے میں سیراب ہو رہا ہوں... سینہ ایک دم ٹھنڈا سا ہو جاتا ہے۔ مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اچھا دُکھ ہے... اور ذاتی دُکھ... میرا دُکھ، وہ مجھے کمزور کر دیتا ہے... میں سمٹنے لگتا ہوں ... ہر بار تھوڑا سا مر جاتا ہوں میں۔" اب وہ بُری طرح ... رہا تھا۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا، سانسیں بے تر... ہو گئی تھیں، جیسے وہ میلوں کے فاصلے سے بھاگ ... تک آیا ہو۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بہت جذ... نوجوان ہے، لیکن وہ منہ زور جذبات کو قابو میں ... ہنر خوب جانتا ہے۔

چند لمحے بعد اُس نے سر اُٹھا کر میری آنکھوں ... جھانکا... جھانکتا رہا۔ شاید اسے میری آنکھوں ... کوئی سوال مچلتا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"میں ریشماں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" ... نے اُسے یاد دلایا۔

"میں بھی تو ریشماں ہی کے بارے میں بتا رہا..." وہ مچل کر بولا۔ "وہ بھی تو اس دُکھ بھری دُنیا ہی کا ا... حصہ ہے۔ کیا ہوا جو وہ حصہ میرے لیے زیادہ اہم ... سو میں اسے محدود کیوں کروں۔ اسے وسعت کیوں ... دوں۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو جُدا کر کے خود کو نقصا... میں کیوں مبتلا کروں۔ میں جانتا ہوں کہ غمِ جاناں ... ہی لذت ہے اور غمِ دوراں اذیت ہی اذیت۔ ... تو میں غمِ دوراں کو غمِ جاناں کیوں نہ بنا لوں۔ ریشما... بظاہر دھان پان سی، بہت چھوٹی سی ہے لیکن کتنی بڑی ہے، آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ آپ ... دیکھا، وہ کس قدر حسین ہے لیکن آپ نے یہ ... دیکھا کہ وہ کشش سے کس طرح محروم ہے۔ اسے ... ہے... کہ فروخت ہونے والے مال سے اُس کی ... کوئی نہیں پوچھا کرتا۔ پھر نہ جانے کیسے کشش کا بھ... اُس پر کھل گیا۔ اسے اپنے وجود میں کوئی ایسا سوئچ ... گیا، جسے آن کر کے وہ کشش سے محروم ہو جاتی ہے ... زندگی سے محروم ایک بے حد حسین لاش معلوم ہو... لگتی ہے... وہ جانتی ہے کہ لاش کی قربت کوئی ... نہیں کرتا کیونکہ لاش آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ اس ... مستقبل... اس کے مستقبل... حال اور ماضی کا ... یہی کچھ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فروخت نہیں ہو سکی...

... آپ دیکھ لینا، وہ کبھی فروخت نہیں ہوگی۔" اُس نے ... پھر میری آنکھوں میں جھانکا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ "... میں جانتا ہوں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ ہاں... ... اُس نے ایک مرتبہ کشش سے محرومی والا سوئچ آف ... کیا تھا۔ اب تک کی زندگی میں پہلی اور آخری بار... ... یہ بات یقینی ہے کہ میں اس لیے زندہ ہوں۔ ویسے ... میں نے اس کے انگ انگ میں... پور پور میں ... زندگی کو رقص کرتے دیکھا ہے۔ یہ اعزاز صرف مجھے ... نصیب ہوا ہے۔ اُس نے کبھی منہ سے کچھ نہیں کہا ... لیکن میں جانتا ہوں کہ اُس نے مجھے قبول کر لیا ہے۔"

میں گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کی باتیں... ... اُس کا لہجہ... وہ مکمل سحر تھا۔ دیر تک میرے لبوں ... تالے پڑے رہے۔ میں انجانی فضاؤں میں اُڑ رہا ... انجانے مناظر دیکھ رہا تھا۔ پھر یکلخت مجھے ... کا سا لگا۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ کون ... کیا چیز تھا؟ میں چکرا کر رہ گیا۔

"تم... تم یقیناً پڑھے لکھے آدمی ہو۔" میں نے بمشکل ... "تم خود کو جاہل کیوں کہتے رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں جاہل ہوں۔" اس نے زور دے کر ... "میں پڑھا لکھا جاہل ہوں۔ میں نے اپنے طور پر ... حاصل کیا، تب یہ پتہ چلا کہ مجھے تو کچھ علم نہیں۔ ... فلسفی عالم کی کیفیت کا اندازہ لگاؤ، جس نے کہا ... تھا... میں اتنی ریاضت کرنے کے بعد جو کچھ جان ... ہوں، وہ صرف اتنا ہے کہ میں درحقیقت کچھ نہیں ... وہ شعر سُنا ہے۔ علم کیا علم کی بساط ہی کیا۔ جیسی جس ... گمان میں آئی۔ سو میرے بھائی، میں جاہل ہوں۔"

"مجھے سنجیدگی سے بتاؤ، تم نے تعلیم کہاں تک حاصل ... ہے؟" میں نے پوچھا۔

"... جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ویسے بھی آج نہ جانے ... کھل جانے کو جی چاہ رہا ہے۔ تم سے کچھ عجیب سی ... محسوس ہونے لگی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "... نے معاشیات میں ایم اے کیا ہے لیکن دوست، ... اپنی جہالت پہ مُصر ہوں۔"

"اب تو میں بھی تم سے متفق ہوں۔" میں نے ... سنجیدگی سے کہا۔ "ویسے تمہارے اور ریشماں کے راستے میں رُکاوٹ کیا ہے؟"

"حرص و ہوس... اس بڑھیا نے ریشماں کو سہارا کیا دیا... خرید لیا۔ اب وہ اس کی قیمت وصول کرنا چاہتی ہے۔ ریشماں بڑھیا کا احسان مانتی ہے، اُسے بکنا بھی گوارا نہیں اور انکار کا بھی یارا نہیں۔ بس... اس نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ انکار کیے بغیر بھی اپنے کو بکنے نہیں دے گی۔ اسی لیے اس نے ایک چلتی پھرتی لاش کا روپ دھار لیا ہے۔"

ریشماں کا سراپا میری نگاہوں میں پھر گیا۔ واقعی وہ بے حد شاداب لڑکی تھی لیکن میرا پہلا تاثر بھی یہی تھا کہ وہ زندگی سے محروم ہے۔ "تو بڑھیا کتنی رقم کی توقع کر رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، اس کی توقعات کا گراف نیچے آتا جا رہا ہے۔ شروع میں تو وہ لاکھوں کی باتیں کرتی تھی۔ اب معاملہ ہزاروں تک رہ گیا ہے۔"

"مجھے یہ کہنا اچھا تو نہیں لگتا۔" میں نے بے حد خلوص سے کہا۔ "لیکن میرے پاس پچاس ہزار روپے موجود ہیں۔"

اس نے بے ساختہ ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میں احمقوں کی طرح اُسے ہنستے ہوئے دیکھتا رہا۔ چند لمحے بعد وہ خود پر قابو پا کر بولا۔ "میں نے یہ تو نہیں کہا کہ یہ کوئی مالی مسئلہ ہے۔ میں تو لاکھوں بھی دے سکتا ہوں، ریشماں کے لیے۔"

"کیا مطلب؟" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

"سعید اینڈ سنز کا نام سُنا ہے تم نے؟ میں اس کا مالک ہوں، اسلم سعید۔" اس نے ایک اور دھماکہ کیا۔

چند لمحے تو مجھے اپنی سماعت پر ہی اعتبار نہ آیا۔ وہ عجیب تہ در تہ آدمی تھا۔ میرے منہ سے تو کچھ نہیں نکلا لیکن میری آنکھوں میں یقیناً کئی سوال مچل رہے تھے۔

"میں نے پہلی دفعہ ریشماں کو انارکلی میں دیکھا۔" اسلم نے دیوار پر نظریں جماتے ہوئے خوابناک لہجے میں کہا۔ انداز ایسا تھا، جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی فلم چل رہی ہو۔ "میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس قدر حسین لڑکی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن وہ زندگی سے خالی تھی... یکسر خالی۔ پھر میری اس کی نگاہیں ملیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب

سی چمک اُبھرتی دیکھی... جیسے وہ مجھے جانتی ہو، پہچانتی ہو۔ یکلخت جیسے اس کا وجود زندگی سے معمور ہو گیا۔ پہلے اس کی رنگت کو چاندنی سے تشبیہہ دی جاسکتی تھی لیکن اس لمحے چاندنی میں گلابی رنگت گھل مل گئی تھی۔ پھر اس نے نظریں چرا لیں لیکن اس ایک لمحے میں میں اس کا ہو چکا تھا۔ بڑھیا بھی اس کے ساتھ تھی۔ میں نے ان کا پیچھا کر کے گھر کا پتہ لگایا۔ مزید کرید کی تو افسوسناک باتیں سامنے آئیں۔ میں کوشش کر کرا کے بڑھیا تک پہنچ گیا اور بالآخر اس کی ٹیکسی چلانے لگا۔ بڑھیا کا انداز تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اب تک تم جیسے نہ جانے کتنے لوگ وہاں آ چکے ہیں لیکن میں نے کہا نا کہ لاش کی قربت کوئی پسند نہیں کرتا۔ پھر بڑھیا کو محسوس ہوا کہ میری قربت میں ریشماں زندہ ہو جاتی ہے۔ اسے میرا وجود کھلنے لگا۔ میں نے ایک دن ریشماں کو اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں اس کو آزاد کرانے کے لیے لاکھوں خرچ کر سکتا ہوں لیکن اس نے منع کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے اپنی قیمت مل چکی ہے... میری ایک نظر... میری محبت کی صورت میں۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اسے اب بھی بکنا ہی ہے تو وہ یہ کبھی قبول نہیں کرے گی کہ اسے میں خریدوں۔ وہ مجھے اپنے بیوپاری کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ اسے خود پر اعتماد ہے کہ اسے کوئی نہیں خرید سکے گا۔ تب ایک دن بڑھیا اسے بیکار چیز سمجھ کر پھینک دے گی اور وہ میری ہو جائے گی۔ اسے دولت کی کوئی طلب نہیں مجھے بھی اب اس کے سوا کسی چیز سے غرض نہیں رہی بڑھیا نے مجھے جواب دیا تو میں نے وہیں مکان کرائے پر لیا، قسطوں پر ٹیکسی خریدی اور اسے چلانے لگا۔ اب وہ ٹیکسی میری اپنی ہے۔ اس زندگی میں... اس انتظار میں بڑا مزہ ہے۔"

"لیکن اس طرح وقت بھی تو ضائع ہو رہا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ..."

"میں جانتا ہوں۔" اس نے تیزی سے میری بات کاٹ دی۔ "لیکن اس کا استدلال معقول ہے۔ کم از کم میں اس کی بولی لگا کر اس کی توہین نہیں کر سکتا۔"

"لیکن سب کچھ چھوڑ کر ٹیکسی چلانے... جاہل بننے کا کیا جواز ہے؟"

"یہ اعترافِ عجز ہے، اس کی عظمت کے ... یہ ترک کی منزل میں انا کو کچلنے کا پہلا قدم ہے ... تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس میں کس قدر لذت ... میرے لیے زندگی بے معنی ہے... اس کی رضا ... کا منشا... اس کے احکامات کی بجاآوری... ہے اس زندگی میں۔"

اس کا رویہ تو میں اپنے معاملے میں دیکھ ... تھا۔ اس وقت اس کے لہجے میں جانے کیا ... کہ میں پوری جان سے لرز گیا۔ "اتنی محبت انسا... خدا سے کرے تو اس کا درجہ کیا ہو؟" میں نے کہا...

"یہ سعادت کم نصیبوں کو کہاں ملتی ..." نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "لیکن یہ جذبہ بھی تو ... عطا ہے۔ عام بندوں کے لیے اس نے یہی ... ہے کہ مجھ سے محبت کرنا ہے تو میرے بندو... محبت کرو۔ ریشماں سے ملنے سے پہلے میں ... نہیں تھا کہ اپنے سوا کسی سے محبت کی جاس... اس سے ملنے کے بعد میں سراپا محبت ہو گیا... انسان میرا دوست ہے اور ہر دکھ میرا دکھ... بھی اسی کریم کی عطا ہے دوست۔ وہ ظرف ... نوازتا ہے۔ ہر دل... کوئی عام دل براہِ راس... کی محبت کا متحمل کہاں ہو سکتا ہے اس راہ میں ... بڑے عالی ظرف ڈگمگا جاتے ہیں۔"

میں خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ ا... سے مجھے جو روحانی بالیدگی میسر آئی تھی، اس ... کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس وقت میں ... نہیں سکتا تھا۔ لگتا تھا کہ میں الفاظ سے محروم ہو... چند لمحے وہ مجھے دیکھتا رہا، پھر اٹھ ک...

"اچھا... اب میں چلتا ہوں۔" اس نے ہاتھ... بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دھندے کا ٹائم ہو رہا ..." اس کے الفاظ مجھے بے حد اجنبی اور ... لگے۔ میں نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ... "کب ملو گے؟" میں نے پوچھا۔

"کل پھر آؤں گا۔" اس نے خوش د... "اب اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑو...

اچانک مجھے خیال آ گیا کہ اگلے روز کے متعلق دارا ...ئی پروگرام بنا کے گیا ہے۔ "کل آنا تو شام کے بعد آنا۔ ...ح میں دارا کے ساتھ کہیں جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔ اللہ آپ کو کامیابی عطا ...رمائے۔" اس نے پُرخلوص لہجے میں کہا اور دروازے کی ...رف بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک ...یب سی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ رہ رہ کر مجھے اس کی باتیں ...آ رہی تھیں اور زندگی کی معنویت دھیرے دھیرے مجھ ...اپنے دروازے کھول رہی تھی۔ مجھے اندھیرا ہونے کا ...ساس بھی نہ ہوا۔ دیر تک میں اسی کیفیت میں بیٹھا ...ا۔ نصیر کھانے کو پوچھنے آیا تو مجھے ہوش آیا۔ میں نے ...س سے بتی جلانے کو کہا۔ پھر کھانے کے لیے منع کر دیا۔ ...کے جانے کے بعد میں نے ایک رسالہ اٹھایا اور ...ھنے کی کوشش کی۔ لیکن صفحات کے عقب سے چہرے ...مناظر طلوع ہونے لگے۔ گلنار... نازو اور ریشماں ...چہرے... جگو پہلوان، دارا، اسلم اور رب نواز کے ...ربان چہرے... اس رات گویا میں کسی طلسم کا اسیر ہو ...تھا۔ تنگ آ کر میں نے رسالہ رکھ دیا۔ پھر میں لیٹ ...اور میں نے اپنے تصور اور خیالات کو کھلی چھوٹ دے دی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ ...لائٹ بھی آف نہیں کر سکا تھا۔ خواب میں بھی وہی ...لسم کارفرما تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں زندگی ...دوبارہ گزر رہا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس بار ...فہم و ادراک کے سائے میں ہو رہا تھا۔

صبح میری آنکھ گزشتہ روز کی بہ نسبت جلدی ...ل گئی۔ میں نہا دھو کر فارغ ہوا اور دروازہ کھول ...ہر آ گیا۔ راہداری میں تھوڑی ہی دور چلا ہوں گا ...آتا نظر آیا۔

"...سلام علیکم سر جی۔" اس نے دانت نکالتے ...ے کہا۔ "آج آپ جلدی اٹھ گئے۔ کہاں جا رہے ہیں؟"

"...تمہیں ہی تلاش کرنے نکلا تھا۔" میں نے جواب ...ناشتہ کرا دو جلدی سے۔"

"...ابھی لیں سر جی۔" اس نے کہا اور پلٹ گیا۔

میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ تھوڑی دیر بعد ...ناشتہ لے آیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد انتظار کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ اب اس ہوٹل کے کمرے میں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ دیواریں کاٹ کھانے کو آ رہی تھیں۔ تقریباً ہر پانچ منٹ بعد میں دروازہ کھول کر جھانک لیتا تھا۔ ایک ایک پل کاٹنا دوبھر ہو رہا تھا۔ اسی عالم میں دس بج گئے۔ اس بار جو میں نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا تو مجھے دارا نظر آیا۔ ہاتھوں میں ایک بنڈل اٹھائے وہ میری ہی طرف آ رہا تھا۔

"یہ کیا تاک جھانک ہو رہی ہے؟ کیا چکر ہے؟" اس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"تمہارا ہی انتظار تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"زہے نصیب... لیکن ہم بھی یوں ہی تو یاد نہیں آئے ہوں گے۔ کسی حوالے کی مجبوری بھی ہو گی، ویسے؟" اس نے چوٹ کی۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں برا مان جاتا لیکن اس وقت تو میں انتہائی بے چینی سے اسی کا منتظر تھا۔ میں دروازہ کھلا چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

"لو، یہ سنبھالو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بنڈل کو بیڈ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"کپڑے ہیں۔ بس فٹافٹ تبدیل کر لو۔ پھر چلنا ہے۔"

میں نے بنڈل کھول کر دیکھا۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ تھا۔ اب تو مجھ میں ممنون ہونے کا بھی یارا نہیں رہا تھا۔ میں نے خاموشی سے کپڑے اٹھائے اور باتھ روم کا رخ کیا۔ پانچ منٹ بعد میں تیار ہو کر باہر آیا تو وہ پاؤں پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔

"ہاں... تو کیا رہی؟" میں نے دوسری کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"اچھی خبر ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ گلنار جلال ہی کے قبضے میں۔"

"صرف تصدیق ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟" لہجہ تلخ ہو گیا۔

"فرق پڑتا ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "میں نے گلنار کو چھڑانے کی ترکیب سوچ لی ہے۔"

میں سوالیہ نگاہوں سے اسے تکتا رہا۔ وہ کچھ دیر

خاموش رہا۔ اس کے انداز میں کچھ ہچکچاہٹ تھی۔ ”کیا بات ہے؟ تم چپ کیوں ہو گئے؟“ میں نے اُسے ٹوکا ”مجھے بتاؤ... کیا ترکیب سوچی ہے؟“

وہ چند لمحے بغور دیکھتا رہا۔ ”بس یہی ایک صورت نظر آتی ہے... لیکن بہت بے رحمانہ ترکیب ہے۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”میں گلنار کے لیے کبھی کچھ کر سکتا ہوں۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ، کرنا کیا ہے؟“

”ابھی نہیں۔ وقت آنے پر تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا۔ بس، تم میرے ساتھ چلو۔“ اس نے جیب سے سیاہ شیشے کا چشمہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا، میں نے چشمہ لگایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دارا اُسی گاڑی میں آیا تھا، جس میں اس رات مجھے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اگلی نشست کی جانب والا دروازہ کھول دیا۔ میں خاموشی سے کار میں جا بیٹھا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

کار کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ دارا بے مقصد گاڑی اِدھر اُدھر دوڑا رہا تھا۔ شاید وہ یہ اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں لیکن یہ بات کچھ زیادہ اہم نہیں تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ دارا کی رفاقت میں اٹھنے والا میرا ہر قدم میری الجھنوں اور مسائل کے حل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

پھر کار سمن آباد کی طرف بڑھ گئی۔ پکی ٹھٹھی کے علاقے میں اِدھر اُدھر چکر لگانے کے بعد بالآخر دارا نے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ اس مکان کی حالت بہت خستہ تھی۔ دیواروں پر رنگ و روغن نہیں تھا البتہ ایسے آثار جا بجا موجود تھے، جن سے پتہ چلتا تھا کہ سو ڈیڑھ سو برس پہلے کبھی اُن دیواروں پر رنگ و روغن ہوا ہوگا۔ اب اس رنگ کے آثار چھوٹے بڑے پھوڑوں کی صورت نظر آ رہے تھے۔ اس سے مکان کی وحشت ناکی میں اور اضافہ ہوا تھا۔

دارا نے کھڑکیوں کے شیشے لاک کیے اور کار کا دروازہ مقفل کرتے ہوئے نیچے اُتر آیا۔ میں پہلے سے اتر چکا تھا۔ دارا مکان کے دروازے کی طر[illegible] اور اُس نے مسلسل تین بار ایک مخصوص انداز [illegible] دی۔ چند ہی لمحے بعد دروازہ کھل گیا۔ ہم دونوں داخل ہو گئے۔ دروازہ کھولنے والا ایک پستہ قد [illegible] ہوئے جسم اور گنجے سر والا آدمی تھا۔ عمر تیس [illegible] لگ بھگ رہی ہوگی۔ ہمارے داخل ہونے کے [illegible] نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ پلٹ کر دارا [illegible] مُڑا اور دانت نکال دیے۔ شاید وہ اس کا [illegible] کا انداز تھا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں [illegible] اس کی آنکھوں میں شدید حیرت دیکھی۔ شاید [illegible] سے پہلے دارا وہاں ہمیشہ اکیلا ہی جاتا رہا ہوگا۔

دارا [illegible] سے اشاروں میں کچھ پو[illegible] شخص نے غوں غاں کر کے ان اشاروں کا جوا[illegible] تب مجھے اندازہ [illegible] کہ وہ شخص گونگا ہے۔ [illegible] نے کمرے کے د[illegible] کی طرف اشارہ کر[illegible] مزید غوں غاں کی [illegible] اپنے کمرے کے د[illegible] پر دو بار ہلکی سی دستک دی۔ پھر وہ مجھے [illegible] کا اشارہ کرتے ہوئے [illegible] داخل ہو گیا۔ کمرے میں [illegible] تھا، جس پر ایک شخص دراز تھا۔ بستر کے سا[illegible] کرسیاں پڑی تھیں۔ بستر پر دراز شخص کے [illegible] نیچے کئی تکیے رکھے تھے۔ جن کی وجہ سے وہ [illegible] ہوا محسوس ہوتا تھا۔ دارا کو دیکھتے ہی اس کے [illegible] پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آؤ... آؤ دارا بیٹے۔“ اس نے کہا۔ اس [illegible] پاٹ دار اور گونجیلی تھی۔ ”میں تو سمجھ رہا تھا ک[illegible] باہر گئے ہوئے ہو۔“

دارا اُس کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے [illegible] تپاک سے بستر پر دراز شخص کا ہاتھ تھام لیا۔ [illegible] بات نہیں۔ بس چند بکھیڑوں میں الجھا ہوا [illegible] ملتے ہی سیدھا آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔ ان[illegible] یہ ہیں نسیم جمال۔“ اس نے میری طرف اشارہ ک[illegible]

اس شخص نے لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ آگے [illegible] میں نے اس سے مصافحہ کیا اور ایک قدم پیچھے [illegible] دارا دھیمی آواز میں اس سے باتیں کرنے لگا۔

میں اس شخص کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی آواز اور لہجے سے عجیب سا دبدبہ مترشح تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ حکم دینے والوں میں سے ہے۔ اس کا چہرہ بہت بارعب تھا... مجھے اس خستہ حال مکان میں اسے معذور حالت میں دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتا تو یقیناً کہیں سینکڑوں، ہزاروں پر حکمران ہوتا۔ میں نے اتنے باوقار چہرے کم ہی دیکھے تھے۔

چند لمحے بعد دارا میری طرف متوجہ ہوا۔ ”تم نے شاید اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ کون ہیں۔“ وہ بولا ”یہ عابد حسین صاحب ہیں۔ تنظیم کے پرانے باس اور نازو کے والد۔“

میں سناٹے میں آ گیا۔ جس انداز میں عابد حسین کی شخصیت میرے سامنے آئی تھی، اس نے مجھے سُن کر دیا تھا۔ کچھ سبب نازو سے میری وابستگی بھی رہی ہوگی۔ ویسے بھی وہ ایک ایسا شخص تھا، جسے دیکھنا باعث عبرت تھا۔ یہ وہ شخص تھا، جس کے پاس کبھی غیر محدود وسائل تھے۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ اس کے گرد کس طرح لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہوگا۔ اس کے ایک اشارہ ابرو پر کیا کچھ نہ ہو جاتا ہوگا۔ لیکن آج وہ کس قدر بے یار و مددگار تھا۔

عابد حسین نے چند لمحے میری طرف دیکھا، پھر مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں آگے بڑھا تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی گرفت مخلصانہ تھی اور گرمجوشی کی مظہر بھی تھی۔ ایسا لگتا تھا، جیسے وہ مجھ سے سہارے کی توقع کر رہا ہو۔ نہ جانے کیوں میں بے حد اداس ہو گیا۔ شاید اسی لیے کہ وہ نازو کا باپ تھا اور نازو وہ لڑکی تھی جسے دیکھ کر، جس سے مل کر میرے سینے میں گداز کا پہلا بیج پھوٹا تھا۔

”دارا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ عابد حسین کا لہجہ چھلک رہا تھا۔ ”تم نے اس کی خاطر بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے وہ؟“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ انشاء اللہ وہ مل جائے گی۔ ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔“

”مجھے ڈر ہے کہ وہ دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔“

”اس کی فکر نہ کریں۔“ دارا جلدی سے بولا۔ ”میں وہاں کس لیے بیٹھا ہوں... چوہدری رحمت جیسے مکروہ آدمی کو کس لیے برداشت کر رہا ہوں۔“

”ہاں... ایک یہی آس تو رہ گئی ہے۔“ عابد حسین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

کچھ دیر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، پھر اُسے خدا حافظ کہہ کر نکل آئے۔ گونگا صحن میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا تھا۔ دارا نے اُسے اشارے سے خدا حافظ کہا اور ہم مکان سے باہر آ گئے۔

”یہ شخص سوچ کی رفتار سے زیادہ تیزی سے ریوالور نکال کر گولی چلا سکتا ہے۔“ دارا نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے گونگے کے بارے میں بتایا۔ ”اس کا نام فخرو ہے اور وہ کتے سے زیادہ وفادار ہے۔“

”مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور میں نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ تم کس قدر مخلص انسان ہو۔“

دارا نے کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحے بعد خاموشی رہی، پھر میں نے پوچھا۔ ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”گلنار کو رہا کرانے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ گاڑی اب سمن آباد کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد گاڑی ایک اسکول کی عمارت کے سامنے رک گئی۔ احاطے میں بچے اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ شاید اسکول کی چھٹی ہو چکی تھی۔ گیٹ پر خوفناک شکل والا چوکیدار کھڑا تھا۔ دارا نے چوکیدار کو اشارہ کیا جواب میں چوکیدار نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

دارا نے اشارہ پاتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ گاڑی کو اسکول کی عمارت کے عقبی حصے میں لے آیا۔ اس طرف بالکل سناٹا تھا۔ البتہ وہاں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس کے قدموں میں ایک بوری پڑی تھی۔ مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے دارا گاڑی سے اُترا اور اس شخص کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے جیب سے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر اس شخص کے حوالے کی اور بوری اُٹھا کر کار کی طرف لے آیا۔ بوری اس نے عقبی نشست پر ڈال دی اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ چند ہی لمحے بعد ہم اسکول کی عمارت سے نکل آئے۔ اس بار گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔

"تم پچھلی نشست پر چلے جاؤ اور بوری کا مُنہ کھول دو۔" دارا نے مجھے ہدایت کی۔

میں پچھلی نشست پر چلا گیا۔ پھر میں نے اس کی ہدایت کے مطابق بوری کا مُنہ کھول دیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں ٹھٹھر کر رہ گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بوری میں چھ سات سال کا ایک بچہ تھا، جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ وہ زندہ ہے یا مُردہ۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ بُری طرح لرز رہے ہیں...

مجھے اپنے اعصاب پر قابو پانے میں صرف چند لمحے لگے۔ ویسے پے در پے واقعات نے میرے اعصاب کی کچھ اتنی کڑی تربیت کر دی تھی کہ حیرت کا لفظ اب میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پا کر میں نے بچّے کے سینے کو ٹٹولا تو اس کی دھڑکنیں مجھے اس وقت دُنیا کی خوبصورت ترین آواز محسوس ہوئیں۔ میں نے سکون کی ایک طویل سانس لی اور اسے بوری سے نکالنے کے لیے حرکت میں آ گیا۔

دارا میری کیفیت سے بےخبر گاڑی چلانے میں مگن تھا۔ اس دوران ہمارے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا۔ میں نے بچّے کو سیٹ پر لٹا کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور بوری کار کے فرش پر ڈال دی... پھر میں نے غور سے بچّے کا چہرہ دیکھا۔ یہ کہنا مجھے غیر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ بچّہ انتہائی معصوم صورت تھا اور اس کے نقش و نگار بے حد دلکش تھے۔

"یہ کون ہے، دارا؟" بالآخر میں نے دارا سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

دارا نے عقب نما آئینے کا رُخ اس طرح تبدیل کیا کہ وہ مجھے آئینے میں دیکھ سکتا تھا اور میں اُسے۔ اس کی نگاہوں میں جو پہلی جھلک میں نے دیکھی وہ ستائش کے تاثر سے بھرپور تھی۔ "خُوب... جسم کے ساتھ ساتھ تمہارے اعصاب بھی جاندار ہیں۔" اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"شکریہ، لیکن یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے۔" میں نے سرد لہجے میں اسے یاد دلایا۔

"معاف کرنا یار... لیکن کبھی کبھی تم مجھے حیران کر دیتے ہو۔" اس نے اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بچّہ، گلنار کی آزادی کی ضمانت ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور صورت میرے ذہن میں نہیں آ سکی تھی۔"

"لیکن یہ ہے کون اور گلنار کی آزادی سے اس کا کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بہت قیمتی بچّہ ہے، دوست، کیونکہ یہ جلال کا اکلوتا بیٹا ہے۔" دارا نے دھماکا کیا۔

"اوہ، تو یہ بات ہے... تم نے جلال کو گلنار کی رہائی پر مجبور کرنے کے لیے اسے اغوا کر لیا ہے۔ تم نے کمال کر دیا۔"

دارا میرے لہجے میں چھُپا ہوا طنز محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے عقب نما آئینے میں میری طرف دیکھا۔ اس کی زخمی نگاہوں میں شکایت سی تھی۔ "طنز کر رہے ہو، دوست!" اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم ابھی تک حقیقت پسند نہیں بن سکے ہو۔ جلال جیسے لوگ صرف یہی زبان سمجھتے ہیں کیونکہ وہ خود بھی یہی زبان بولتے ہیں۔ اب دیکھنا اس کی ساری اکڑفوں رخصت ہو جائے گی۔ اس بچّے کے بدلے ہم گلنار کو آزاد کرا لیں گے۔ گلنار کے ساتھ ہم لاکھوں روپے بھی طلب کریں تو یہ سودا جلال کے نزدیک، کوئی مہنگا سودا نہیں ہوگا۔"

"لیکن یہ بچّہ معصوم اور بے قصور ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ مجھے شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔ مجھے اس پر طنز نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ وہ یہ سب کچھ میرے ہی لیے کر رہا تھا۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے گلنار معصوم اور بے قصور نہیں ہے۔" اس بار دارا کا لہجہ سرد ہو گیا۔

اس کا یہ جملہ میرے دل کو چھید گیا۔ میں نے بچّے کی طرف دیکھا۔ شاید میں اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن معصوم صورت پر نگاہ پڑتے ہی میری ساری نفرت ڈھل گئی ہوگی۔ اس کا اندازہ اپنی باطنی کیفیت سے ہو گیا۔ گلنار کو یاد کرنے اور اس کے مصائب پر کھول اٹھنے کے باوجود میں اس بے گناہ بچّے سے نفرت نہیں کر سکتا تھا۔

"لیکن دارا، یہ مردانگی نہیں۔ ہماری جنگ اس کے باپ سے ہے، اس معصوم بچّے سے نہیں۔" میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"معصومیت کا لفظ اتنی کثرت سے استعمال نہ کرو ورنہ معصومیت پر اعتبار سے محروم ہو جاؤ گے..." دارا سخت لہجے میں بولا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ جلال خلیجی ریاست میں گلنار کا سودا کر چکا ہے۔ کیا یہ مردانگی ہے؟ اگر نہیں تو پھر ہم بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس دنیا میں کبھی کبھی اصولوں کا تحفظ بے اصولی سے اور آبرو کا تحفظ دوسروں کی بےآبروئی سے بھی کرنا پڑتا ہے۔ کیا تم یہ قبول کر لو گے کہ گلنار خلیجی ریاست میں کسی درندے کا لقمہ بن جائے؟"

میرا خون کھول گیا۔ لیکن میں اس غصّے کا شکار خود اپنے علاوہ کسی کو نہیں بنا سکتا تھا۔ میں نے پھر بچّے پر نظر ڈالی لیکن اس بار بھی معصومیت کے تحفظ پر میرا یقین متزلزل نہ ہو سکا۔ وہ بچّہ جلال کا بیٹا سہی لیکن معصوم اور بے قصور تھا۔ "تمہاری بات درست ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ ہمیں بچّے کو اغوا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

ایک لمحے کے لیے کار کی رفتار ایک جھٹکے سے بڑھی لیکن فوراً ہی کم ہو گئی۔ شاید دارا جھلّا گیا تھا۔ "تم شاید مکافاتِ عمل کا مفہوم نہیں سمجھتے۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "قوانینِ قدرت سے سچّا اور اٹل قانون کوئی نہیں ہے۔ میرے سامنے ایسی ہزاروں مثالیں ہیں کہ قدرت کی طرف سے والدین کے گناہوں کی سزا بچّوں کو ملی ہے۔ کیا وہ بچّے تمہارے خیال میں معصوم اور بے قصور نہیں ہوں گے، کیا تم اسے قدرت کی سفاکی نہیں کہو گے؟ نہیں دوست، جرم اور گناہ خون کے ساتھ شامل ہو کر رگوں ہی کے ذریعے تمام جسم میں دوڑتے ہیں۔ وہی مجرم خون اولاد کی رگوں میں بھی دوڑتا ہے... اور مجرم خون سزا سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جسم کو

ایم۔اے راحت کے قلم سے ایک نیا دھماکہ خیز ناول

عصرِ حاضر کی عکاسی

سرفروش

سزا اسی دُنیا میں ملتی ہے اور رُوح کا حساب محشر میں ہوگا۔ میں ایک ایسے ارب پتی اسمگلر کو جانتا ہوں جو آج بھی اولادِ نرینہ سے محروم ہے... جس کے ہاں آٹھ بیٹیاں پیدا ہوئیں اور وہ سب پیدائشی طور پر اپاہج تھیں... وہ آج بھی زندہ ہیں۔ اسمگلر کروڑوں روپے خرچ کر کے بھی ان کا علاج نہ کرا سکا۔ اب بتاؤ ان بچیوں کا کیا قصور تھا؟ کیا وہ معصوم نہیں تھیں؟ یہی قانونِ قدرت ہے، دوست۔"

"وہ قانونِ قدرت ہے، دارا۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "ہمیں اس قانون کے حوالے سے لوگوں کا احتساب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ تو قدرت کے قوانین کو ہاتھ میں لینے کے مترادف ہے۔ نہیں دارا، میرا ذہن یہ بات قبول نہیں کرتا۔"

"مکافاتِ عمل براہِ راست قدرت کے ہاتھوں انجام نہیں پاتا، میرے بھائی! قدرت کبھی بیماری کو حیلہ بناتی ہے اور کبھی تم جیسے ستائے ہوئے لوگوں کو..."

"خدانخواستہ میں کبھی کسی جذباتی لہر میں بہہ گیا اور مجھ پر درندگی سوار ہو گئی تو تمہارا یہ استدلال قبول کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں جلال کے حصّے کی نفرت اس بچّے کا مقدر نہیں بنا سکتا۔"

"مجھے تمہارے خیالات سُن کر خوشی ہوئی۔" اس نے اسٹیرنگ کاٹتے ہُوئے کہا۔ "لیکن ہم اس بچّے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ہم تو صرف جلال سے اُس زبان میں بات کر رہے ہیں جس کا وہ عادی ہے۔ اوّل تو وہ ہمارا مطالبہ تسلیم کر لے گا لیکن اگر اس نے ہٹ دھرمی دکھائی تو ہم اس بچّے کو اس کے گھر پہنچا

دیں گے، تب گلنار کے لیے کوئی اور صورت نکالی جائے گی۔" وہ خاموش ہوگیا۔

"اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا؟" میں نے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں جمال... یہ میرا وعدہ ہے۔ کیا تم مجھے انسان نہیں سمجھتے؟" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

"معاف کرنا یار... میں ذرا جذباتی ہوگیا تھا۔" مزید کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ وہ تو بڑی بے غرضی سے میرے مسائل حل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا اور میں اُسے اخلاق پڑھا رہا تھا۔ "ہم اسے رکھیں گے کہاں؟" کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

"میں نے ایک مکان کا بندوبست کرلیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ گیا۔ شاید جو بھی ہو رہا تھا، بہتر ہو رہا تھا۔ میں پھر بچے کی طرف متوجہ ہوگیا، جس کے چہرے پر اب سُرخی لہرانے لگی تھی۔ شاید وہ ہوش میں آ رہا تھا۔

بچے کو رکھنے کے لیے جس مکان کا بندوبست کیا گیا، وہ لاہور کے ایک دُور دراز علاقے میں، بالکل الگ واقع تھا۔ علاقہ بے حد پُرسکون تھا۔ وہ ایک ایسی بستی تھی جہاں کا ہر شخص اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ کسی کو کسی کے بارے میں کوئی تجسس نہیں ہوتا تھا۔ مکان میں تھوڑا بہت فرنیچر بھی موجود تھا۔ دارا نے بہت سوچ سمجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ بچے کو ایک بستر پر لٹا دیا گیا۔ اب وہ کسم... [illegible] ...ب۔ دارا نے ایک طرف رکھے ہوئے بیگ میں سے دوا اور سرنج نکالی، پھر وہ سرنج میں دوا بھرنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے اُسے ٹوک دیا۔

"میں نہیں چاہتا کہ یہ یہاں قیام کے دوران ہوش میں رہے۔"

"کیوں؟" بوکھلاہٹ میں مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"یار کبھی کبھی تم بالکل بچے بن جاتے ہو۔ بھائی، ہماری شکلیں دیکھنا نہ صرف اس کے لیے بلکہ ہمارے لیے بھی مُضر ثابت ہوسکتا ہے۔"

میں نے ایک طویل سانس لی اور خاموش ہو... اب قدم قدم پر احساس ہو رہا تھا کہ قدرت جب... پر مجھے زبردستی چلا رہی ہے۔ وہ ایک بالکل ... اجنبی راستہ ہے۔ میں اس راستے کا مسافر نہیں ... لیکن میں گلنار کو بھی حالات کے رحم و کرم پر نہیں ... سکتا تھا۔ اب مجھے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ ... جیسے لوگوں کے لیے مطابقت کا عمل کس قدر سس... اور دُشوار ہوتا ہے۔

دارا نے بچے کو انجکشن لگایا اور مجھے ساتھ ... کر باہر نکل آیا۔ "یار جمال، اب تو میں بھی خود کو مج... محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے بجھے بجھے لہجے میں ... "اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اس بچے کی مع... مجھے کمزور کر رہی ہے۔ اب جو کچھ بھی کرنا ہے ... ہی کرلیا جائے۔ میں بچے کو زیادہ دیر قید نہیں ر... سکوں گا۔"

"میرا تو خیال ہے کہ بچے کو آزاد کر دیا جائے..." ... نے کچھ سوچ کر کہا۔ "گلنار کو اگر ملنا ہوگا تو یونہی مل... جائے گی۔ میں اس کی خاطر یہ ذہنی عذاب مو... نہیں لے سکتا۔" میں نے یہ بات کہنے کو تو کہہ دی ... میرا دل بے چین ہوگیا۔ کیا گلنار اتنی ہی بے وقعت ... تھی؟ جس عذاب میں وہ گرفتار تھی، وہ اس کا نہیں ... میرے ہی حصے کا عذاب تھا۔ وہ بے چاری تو ... صلیب اپنے کندھے پر اُٹھائے پھر رہی تھی۔

دارا نے میرے تاثرات بھانپ لیے۔ "نہیں ... جمال، اگر ضرورت پڑی تو اس کے تحفظ کے لیے ... اس بچے کے ٹکڑے بھی کرسکتا ہوں۔" اس نے سنج... لہجے میں کہا۔ "تم نے کس دل سے یہ بات کی ہے و... بھی یہ عذاب تمہارا نہیں بلکہ میرا ہے۔ کیونکہ ا... بچے کو میں نے اغوا کیا ہے۔"

میں خاموش ہوگیا۔ اُدھر گلنار میرے مصائب... سہہ رہی تھی اور اِدھر دارا جیسا آدمی وہ کرب نا... کام کر رہا تھا، جو درحقیقت مجھے انجام دینا چاہیے ... تھا۔ "ٹھیک ہے، اب بتاؤ کیا کیا جائے؟" میں ... اس سے پوچھا۔

"میں تمھیں جلال کا فون نمبر دیتا ہوں۔ اس ...

...ات کرو اور بچے کے عوض گلنار کو طلب کرو۔ مقام اور ...قت کا تعین ابھی مت کرنا... اور ہاں، اس سے ...لنا کہ تم شیر خان کے آدمی ہو۔"

"یہ شیر خان کون ہے؟"

"یہ میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔ بہرحال، یہ حوالہ ...ینا اس لیے ضروری ہے کہ گلنار آزادی کے بعد پُرسکون ...اور باعزت زندگی گزار سکے، ورنہ جلال بہت کینہ پرور ...آدمی ہے۔ بچہ ملتے ہی وہ گلنار کو اغوا کرنے کے چکر میں ...پڑ جائے گا۔" اس نے ایک کاغذ پر فون نمبر لکھ کر میرے ...حوالے کر دیا۔ "جاؤ اب فون کر آؤ۔ میں یہاں بچے کے ...پاس موجود ہوں۔"

وہ واپس مکان میں چلا گیا اور میں فون کی ...تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ لاہور میں پبلک کال آفس ...تو بہت ہیں لیکن فون بوتھ نہیں پائے جاتے۔ میرا ...مسئلہ یہ تھا کہ مجھے رازداری سے بات کرنی تھی... ...نا ہے، کسی کے سامنے تو میں فون پر جلال سے یہ ...کہنے سے رہا کہ اس کا بچہ میرے قبضے میں ہے... اور ...وہ اسے گلنار کے عوض حاصل کرسکتا ہے۔ میں کچھ دیر ...اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ مجھے یاد آگیا کہ میکلوڈ روڈ پر ...ل اینڈ ٹی آفس بلڈنگ میں فون بوتھ موجود ہے... ...پھر مجھے مجّو پہلوان کا بھی خیال آیا۔ دارا نے میری خاطر ...بہت سنگین قدم اُٹھایا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا ...کہ وہ اس دلدلی چکر میں مزید دھنس جائے۔ مجھے یہ ...معاملہ اپنے طور پر نمٹانا تھا۔ دوسری طرف اُستاد ...ہمیشہ سے میرے کام آنے کے خواہش مند تھے۔ ...بہرحال وہ ایک جہاں دیدہ آدمی تھے۔ مناسب یہی ...تھا کہ میں یہ پوری صورتِ حال ان کے سامنے رکھ ...دوں۔ یہ سوچ کر میں نے طے کیا کہ جلال کو فون کرنے ...سے پہلے، استاد مجّو سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔

وہ جو کہتے ہیں نا کہ بِن مانگے مل جائے موتی، مانگے ملے نہ بھیک، تو لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ...میں نے ہاتھ لہرا کر ایک ٹیکسی کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ ...ٹیکسی نہ صرف رُک گئی بلکہ اگلی سیٹ کا دروازہ کھلا ...اور اسلم اُتر کر مجھ سے لپٹ گیا۔ "کہاں ہو جمال بابو، ...میں تم سے ملنے ہوٹل گیا تو تمھارے کمرے کا دروازہ

لاک تھا۔" اس نے شکایت کی۔

"بس اچانک ہی تیزی سے بہت کچھ ہوگیا۔" میں نے کہا۔

"کہاں جانا ہے؟" اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اُسے مجّو کے اکھاڑے کا پتہ بتا دیا۔ راستے میں، میں نے اسے دن بھر کی کارگزاری بھی سُنا ڈالی۔ وہ خاموش سُنتا رہا۔ "حیرت ہے، تم نے اس سفاکانہ طرزِ عمل پر مجھے بُرا بھلا نہیں کہا۔" پوری کہانی سنانے کے بعد میں نے کہا۔

"بُرا بھلا کہنے کی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔ "بزرگوں کا کہنا ہے کہ سانپ کے ہاں ہمیشہ سنپولیے ہی پیدا ہوتے ہیں۔"

"کبھی کبھار مجرموں کے گھر بہت بڑے لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

اس نے سر جھٹکتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "لیکن گلنار جیسی لڑکیوں پر ایسے ہزاروں بچے قربان کیے جاسکتے ہیں۔"

"شاید تم بھول رہے ہو کہ گلنار کا تعلق بازارِ حسن سے ہے۔" نہ جانے کیسے یہ بات میری زبان سے پھسل پڑی تھی۔

"نہیں... مجھے یاد ہے۔ میری ریشماں بھی تو بردئہ فروخت ہے۔ اسی لیے میں گلنار کی عظمت سمجھ سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

میں کٹ کر رہ گیا۔ میرا احساسِ جرم اتنا شدید تھا کہ اس کی وجہ سے گلنار حقیر اہم ہو کر رہ گئی تھی، ورنہ ایسی گھٹیا بات میرے مُنہ سے کیسے نکل سکتی تھی۔ جب کہ میں جانتا تھا کہ فرشتے بھی گلنار کی معصومیت کی قسم کھا سکتے ہیں۔ یک بیک مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہوگئی۔ اگر اس وقت جلال میرے سامنے آجاتا تو شاید میں اس کے ٹکڑے بھی کر ڈالتا۔ یہ سب کچھ اُسی کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

مجّو پہلوان کے اکھاڑے کے سامنے ٹیکسی کھڑی کرکے اسلم اُترا تو میں اس سے پہلے ہی ٹیکسی سے نکل چکا تھا۔ میں نے اچھی ہوئی نگاہوں سے اس

کی طرف دیکھا۔ "تم کیوں آگئے؟" میں نے پوچھا۔

"ان حالات میں تمھارے ساتھ رہنا بہتر ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "ایک مرتبہ جُدا ہونے کے بعد تمھیں تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس وقت بھی قسمت ہی سے ملے ہو۔"

"لیکن اب صورتِ حال بہت سنگین ہے... میں تمھیں ان معاملات میں ملوث کرنا نہیں چاہتا۔ میں اور مجّو پہلوان مل کر اس معاملے کو نمٹا لیں، پھر میں خود آ کر تم سے ملوں گا۔"

"نہیں جمال بابو... میں تمھیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" اس کا لہجہ قطعی تھا۔

"یار اسلم، نہ تو میں اکیلا ہوں اور نہ ہی دُودھ پیتا بچہ ہوں۔" میں نے جھلّا کر کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔" وہ مُسکرا کر بولا۔ "تم یہ بھول رہے ہو جمال بابو کہ تمھیں ریشماں نے میرے پاس بھیجا تھا۔ میں ریشماں کی نگاہوں میں سُبک ہونا نہیں چاہتا... سُرخ رُو ہونا چاہتا ہوں۔ اس کی خوشنودی کا حصول ہی میرا گوہرِ مقصود ہے۔"

میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ "آؤ میرے ساتھ۔" میں نے سر جھٹکتے ہُوئے کہا اور اکھاڑے کی طرف بڑھ گیا۔

مجّو پہلوان اکھاڑے میں موجود نہیں تھے وہاں دو پہلوان زور کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور انھوں نے بڑے پُرتپاک انداز میں مجھے سلام کیا۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ استاد عقبی کمرے میں موجود ہیں میں عقبی کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اسلم میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

دروازہ کھُلا ہُوا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اُستاد بیٹھے کلامِ پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ انھوں نے نظریں اٹھا کر ہمیں دیکھا، سر کے اشارے سے ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ اور پھر تلاوت میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے کلامِ پاک بند کر کے بوسہ دیا اور پھر اُسے الماری میں رکھ کر بولے "آؤ بھئی آؤ۔ کہاں ہو... کیا ہو رہا ہے۔ تم تو عید کا چاند ہو گئے۔" انھوں نے پُرتپاک لہجے میں کہا۔

میں نے اسلم کا تعارف کرایا اور پھر تفصیل سے واقعات انھیں سُنا ڈالے۔ "اب صورتِ حال یہ ہے اُستاد کہ گلنار جس کے قبضے میں ہے، اس کا بچہ ہمارے پاس موجود ہے اور میں بجائے خوش ہونے کے خود کو مجرم محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

اُستاد کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال تھا اور آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ "ایک بات ہے برخوردار۔" کچھ دیر بعد انھوں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "دوستوں کے بارے میں تم بہت خوش نصیب ہو... یہ اسلم اور پھر دارا... ایسے لوگ اس زمانے میں کہاں ملتے ہیں؟"

"اس بات پر تو مجھے تم سے ملاقات کے بعد یقین آ گیا تھا۔" میں نے برجستہ کہا۔

"ارے نہیں بھائی۔" استاد کچھ خفیف سے ہو گئے۔ یہ ان کے کردار کی عظمت کا ایک پہلو تھا۔ ان کا انکسار تعریف کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ بہت اچھے لوگوں کو کم از کم اچھے دوست تو مل ہی جاتے ہیں۔" اسلم کے لہجے میں احترام تھا۔ وہ استاد کی شخصیت سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔

اس مرتبہ خفیف ہونے کی باری میری تھی۔ پھر میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہُوئے بات کا رُخ بدل دیا۔ "میرا خیال ہے، اب کام کی بات ہو جائے۔ میں اس وقت ایک سنگین مسئلے سے دوچار ہُوں۔"

اُستاد نے شاکی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "تمھیں 'ہم' کہنا چاہیے برخوردار، بہر حال تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"سب سے پہلے تو میں اس اقدام کے سلسلے میں تمھاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں تمھارا مطلب سمجھ گیا۔" استاد سر ہلاتے ہُوئے بولے۔ "مجرموں سے نمٹنے کے لیے مجرمانہ طریقے اختیار کیے بغیر انھیں زیر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر کسی اور کا معاملہ ہوتو اور بات ہے لیکن یہاں بات ایک بچے کی

پیاری لڑکی کی ہے۔ اسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"

میں مجّو پہلوان کو دیکھتا رہ گیا۔ انھوں نے یہ بات بڑے غیر جذباتی لہجے میں کہی تھی، لیکن اُن کی آنکھیں کچھ اور ہی کہانی سُنا رہی تھیں۔ اس لمحے میں استاد کے ظرف کا قائل ہو گیا۔ اُن کی آنکھوں میں شعلے مچل رہے تھے لیکن لہجہ شبنمی تھا۔

"اور کچھ؟" قدرے توقف کے بعد اُنھوں نے ہنستے ہُوئے پوچھا۔ "ایک بات کان کھول کر سُن لو، اب میں عملاً تمھارے کچھ کام آنا چاہتا ہُوں۔"

"منصوبہ میرا بنایا ہُوا نہیں ہے۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "دارا نے بچّے کے اغوا سے پہلے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب میں اسے اس معاملے میں مزید ملوث کرنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ اسی گروہ کا آدمی ہے اور نسبتاً زیادہ اہم موقعوں پر ہمارے کام آ سکتا ہے۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" استاد سوچ میں پڑ گئے۔ "وہ شخص... کیا نام ہے اس کا؟ ارے وہی، جس کے قبضے میں گلنار ہے..."

"جلال۔" میں نے لقمہ دیا۔

"ہاں... جلال، تو اب تم فون پر اس سے رابطہ قائم کرو گے؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"تبادلے کے وقت اور تبادلے کے متعلق کچھ طے کیا ہے؟"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اسی سلسلے میں تو تمھاری راہنمائی درکار ہے۔"

"ہُوں۔" استاد پھر کسی سوچ میں پڑ گئے۔ "ٹھیک ہے۔ تم ایسا کرو کہ جلال کو فون کر آؤ۔ فی الحال تبادلے کے سلسلے میں کوئی بات نہ کرنا۔ اس دوران میں کچھ سوچتا ہوں۔ کچھ حفاظتی انتظامات بھی کرنا ہوں گے۔ بہرحال، خُدا کا کرم ہے، آدمیوں کی تو کمی نہیں ہے، اپنے پاس۔"

میں نے ممنونیت آمیز نگاہوں سے اُستاد کی طرف دیکھا۔ "اچھا، استاد، میں چلتا ہوں۔ اس وقت دو بجے ہیں۔ آدھے گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔ اب تو میں نے اپنے معاملات تمھیں سونپ دیے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" استاد کا لہجہ محبت آمیز تھا۔ "ذرا خیال رکھنا اپنا۔"

میں اور اسلم انھیں سلام کر کے باہر نکل آئے۔ "اب کہاں چلنا ہے؟" اسلم نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میکلوڈ روڈ چلیں گے۔ وہاں ٹی اینڈ ٹی آفس میں پرائیویٹ بوتھ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

سفر کے دوران خاموشی رہی۔ ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے ہُوئے تھے۔ اسلم کے دل کا حال خُدا جانے... البتہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ وقت اور حالات کتنی بڑی قوّت ہوتے ہیں۔ میں تعلیم یافتہ سہی لیکن ایک سادہ لوح دیہاتی نوجوان تھا۔ میں خواب میں بھی تصوّر نہیں کر سکتا تھا کہ ایک دن مجھے ان حالات کا بھی سامنا کرنا پڑے گا کہ میں کسی بچّے کے اغوا میں ملوّث ہوں گا۔ خیالات کی رو اس وقت منقطع ہُوئی جب اسلم نے ٹیکسی ٹی اینڈ ٹی کی عمارت کے سامنے روک دی۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ "تم یہیں رُکو گے نا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ خوش قسمتی سے ایک بوتھ خالی تھا۔ میں نے جیب سے جلال کا فون نمبر نکالا۔ اس کا نمبر ملاتے ہوئے نہ جانے کیوں میری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ دو کوششوں کے بعد آخر رابطہ مل گیا... دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بات کس انداز سے شروع کی جائے۔ ٹیلی فون پر اس قسم کی بات کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ فلموں اور ناولوں کی بات البتہ دوسری تھی۔

چند لمحے بعد دوسری طرف سے مردانہ آواز سُنائی دی۔ "کس سے بات کرنی ہے؟" لہجہ کرخت تھا۔

"جلال صاحب سے بات کراؤ۔" میں نے آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہُوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"وہ اس وقت بہت مصروف ہیں۔ کوئی پیغام ہو تو نوٹ کرا دو۔"

"ان سے کہو کہ معاملہ اُن کے بچّے کی زندگی کا

ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ فی امان اللہ۔"

میں نے انھیں خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر آگیا۔

ٹیکسی میں نے اسلم کے مکان سے کچھ دور رکوائی اور پیدل ہی چل دیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گلی میں سناٹا تھا۔ غالباً علاقے کے مرد اپنے اپنے کام پر اور پڑھنے والے بچے اسکول گئے ہوئے تھے اسلم کے مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے قدم رک گئے۔ دروازہ مقفل تھا۔ اسلم ہی اسے مقفل کر کے گیا ہوگا۔ میں ایک انجانی سی کیفیت میں دروازے کی طرف بڑھ گیا اور قریب جا کر تالے کو چھوا۔ میرے ذہن میں اسلم سے تعارف کا وہ پہلا منظر گھوم گیا، جب آدھی رات کو میں نے اس کے دروازے پر پہلی دستک دی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے دروازہ کھل گیا۔ سامنے وہ کشادہ سا صحن تھا اور اس سے پرے وہ بڑا سا کمرہ... اسلم جیسے میرے روبرو تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں پہلے الجھن... پھر اپنائیت اور تپاک جھلکنے لگا... اور یہ سب کچھ ایک نام کی بدولت ہوا... ریشماں کے نام کی بدولت!

"جب آپ نے کہہ دیا کہ آپ کو ریشماں نے بھیجا ہے تو بس... اس کے بعد کسی سوال کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ اگر میں نے کوئی سوال کیا تو میرے خیال میں یہ ریشماں کی توہین ہوگی۔" اس کی آواز میری سماعت میں گونجی اور میرا جسم سنسنا کر رہ گیا۔

اچانک ہی منظر بدل گیا۔ وہ میری زندگی کے سب سے کٹھن مرحلے میں میرے ساتھ تھا۔ میں ٹیکسی کے قریب کھڑا تھا جلال گلنار کو لے کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ "میری مانو تو بچہ ابھی اس کے حوالے نہ کرو۔" میری سماعت سے اس کی بازگشت ٹکرائی۔ "کہہ دینا کہ بچہ کل تمہارے گھر پہنچا دیا جائے گا۔"

منظر پھر بدل گیا۔ اسلم ٹیکسی چلا رہا تھا۔ میں عقبی نشست پر گلنار سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے دلاسہ دے رہا تھا۔ ٹیکسی چوراہے پر پہنچ رہی تھی۔ پھر اچانک گولیوں کی شکل میں، موت برسنے لگی۔ ایکسیلیٹر پر اسلم کے پیر کا دباؤ بڑھ گیا۔ ٹیکسی... زخمی ٹیکسی مجھے اور گلنار کو، موت کی سرحد سے نکال کر عافیت کی شہری میں لے آئی تھی۔ "تم ٹھیک تو ہو اسلم؟" میں نے جھک کر پوچھا تھا۔

"ہاں... میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب دیا تھا لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے لہجے سے جھلکنے والی اذیت نہ چھپا سکا تھا۔

... پھر مجھے اس کے سینے پر کھلنے والے سرخ پھولوں کی بہار دوبارہ یاد آگئی... وہ مسکرا رہا تھا... وہ ٹیکسی کا رخ اسپتال کی طرف کرنے پر تیار نہیں تھا۔ گلنار کی بحفاظت واپسی اس کے نزدیک زیادہ مقدم تھی۔

اچانک ہی طلسم ٹوٹ گیا۔ میری نظریں دروازے کے تالے پر جم گئیں۔ اس کی چابی نہ جانے کہاں ہوگی، کہیں بھی ہو، اب وہ مجھے... بلکہ کسی کو بھی نہیں ملے گی۔ زندگی کے دروازے پر جب موت کا تالا لگتا ہے تو اس کی چابی ہمیشہ کے لیے کہیں کھو جاتی ہے، کیونکہ اس تالے کو کبھی کھلنا نہیں ہوتا۔

میں نے حسرت سے اس تالے کو چھوا... یوں جیسے اُس دو دن کے آشنا کے سینے پر کھلنے والے سرخ پھولوں کو چھو رہا ہوں، جس نے ان دو ہی دنوں میں برسوں کے تعلقات کی حدیں پھلانگ لی تھیں اور جزوِ جاں ہو گیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہوا۔ میں نے ہاتھ پھیرا۔ وہ آنسو تھے۔ میں نے انھیں بڑی نرمی اور احترام سے پونچھا اور پھر ہاتھ اپنے سامنے پھیلا کر دیکھے۔ اس شفاف سیال میں ہلکی سی سرخی تھی... خون کی سرخی... لیکن نہیں، میرا وہم تھا۔ میں آنکھوں کے راستے خون بہانے کا قائل ہی نہیں تھا۔ البتہ اسلم جیسے دوست کے لیے میں اس کے قاتلوں کی... اور اگر وہ نہ مل سکے تو اپنی شریانوں کا منہ ضرور کھول سکتا تھا۔ یک لخت میری آنکھیں جلنے لگیں۔ رگوں میں چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔ اضطراب کچھ اور بڑھ گیا۔ میں نے الوداعی نظروں سے اس مقفل مکان کے درودیوار کو دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

اس دفعہ میرے قدم اس دومنزلہ مکان کے سامنے

رکے جہاں میں ایک بار پہلے بھی آ چکا تھا، البتہ پچھلی بار حالات قدرے مختلف تھے۔ اس وقت میں رات کے اندھیرے میں یہاں آیا تھا اور رات کے اندھیرے ہی میں رخصت بھی ہو گیا تھا۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ریشماں نے کھولا تھا۔ اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور بغیر کچھ کہے پلٹ گئی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر ہم صحن میں پہنچے۔ ریشماں نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ "آیئے، اندر آ جایئے۔" اس نے مترنم لہجے میں کہا۔

وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور اس میں زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک بستر، دو کرسیاں، ایک بوسیدہ سی سنگھار میز اور کپڑوں کی ایک الماری۔ بس، کل یہی اثاثات تھی وہاں۔ ریشماں نے اپنا آنچل درست کیا اور کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "تشریف رکھیے۔" اس کے لہجے میں شائستگی تھی۔

میں بیٹھ گیا۔ میں وہاں چلا تو آیا تھا لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ میرا کام کس قدر مشکل ہے۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھر ریشماں ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ "پریشان نہ ہوں۔ دل چھوٹا نہ کریں۔ ہر زندگی کا اختتام موت ہی ہوتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔" اس نے بے حد گمبھیر لہجے میں کہا۔

میں نے چونک کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس پر موت کی سی خاموشی تھی۔ البتہ آنکھوں کی گہرائیوں میں شدید کرب مچل رہا تھا، لیکن وہ کرب صحرا کا کرب تھا... سمندر کا نہیں۔ "تت... تمہیں کیسے پتہ چلا؟" میری زبان لڑکھڑا گئی۔

"جو لوگ تفہیم پر، تسلیم کو فوقیت دیتے ہیں، اُن کے لیے تفہیم کے مرحلے خود بخود آسان ہو جاتے ہیں۔" اس کے لہجے میں اداسی اتر آئی۔

میں اس کی بات نہیں سمجھ سکا لیکن مجھ میں وضاحت طلب کرنے کی جرأت بھی نہ تھی۔ "میں تمہارے لیے اس کا آخری پیغام لایا ہوں۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"اس کا پیغام میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے... کیا کہا تھا اُس نے؟"

میں نے اسلم کا پیغام اس تک منتقل کر دیا۔ اس کا ضبط بھی میرے لیے ایک سبق کی حیثیت رکھتا تھا۔

"ہاں، اب ٹھیک ہے۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "اب وہ میرے دام چکائے یا نہ چکائے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"کیوں؟" میں نے بلا ارادہ پوچھ لیا۔

اس نے نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ واقعی... اسلم نے سچ کہا تھا۔ وہ لڑکی اپنی کشش کے سوئچ سے واقف تھی... اسے آن آف کرنا اس کے اختیار میں تھا۔ اس وقت ایک لمحے کے لیے اس نے سوئچ آن کر دیا تھا۔ اس ایک لمحے... میں قسم کھا سکتا ہوں کہ اس پل میں وہ دُنیا کی سب سے زیادہ پرکشش لڑکی تھی۔ وہ نسوانی حسن کا شاہکار تھی... وہ مکمل تھی... سراپا حسن... اور اس حسن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے سراپا پر جیسے تقدس کی بارش ہو گئی تھی۔ میں احتراماً نظریں جھکا کر رہ گیا۔

"کسی غلام کو اپنے لیے خرید لینا اور بات ہے۔ غلام کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آقا بدل گیا۔" وہ مترنم لہجے میں گویا ہوئی۔ "لیکن غلام کو خرید کر آزاد کر دینا ایسا احسان ہے جس سے کوئی غلام انکار کر ہی نہیں سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ آزاد ہو کر اپنی خوشی سے اپنے محسن کا دائمی غلام بن جائے۔"

اس کے الفاظ، اس کی آواز اور اس کا لہجہ میری روح میں اُتر گیا۔ مفاہیم کے نئے نئے در کھلنے لگے جن کے پیچھے ایک عجیب، بے حد حسین اور وسیع کائنات تھی، جس کا ذرہ ذرہ محبت... محبت پکار رہا تھا۔ پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آیا کہ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد درحقیقت خدا سے محبت کرنا ہے۔ یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ خدا سے محبت کرنا کتنا مشکل کام ہے... اور اس مشکل کام کو اس نے کتنا آسان بنا دیا ہے کہ خدا سے محبت کرنا ہے تو اس کے بندوں سے محبت

ہے۔ اس کے باوجود وہ بات کرنا نہ چاہیں تو پھر اُن کی مرضی۔"

"ٹھہرو... ٹھہرو ایک منٹ... تم پرویز کی بات کر رہے ہو نا؟" وہ بوکھلا گیا۔ "میں جلال صاحب کو ابھی بُلاتا ہُوں۔"

میں ریسیور کانوں سے لگائے کھڑا اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ چند لمحے بعد ایک تشویش آمیز آواز سُنائی دی: "ہیلو... میں جلال بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟ پرویز کہاں ہے؟"

"صبر سے کام لو میرے دوست۔ ایک ساتھ اتنے سوالات!" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "پرویز ہمارے قبضے میں ہے اور خیریت سے ہے۔"

"میں پوچھتا ہُوں تم کون ہو؟" وہ دہاڑا۔ "اسے کوئی گزند پہنچی تو میں..."

"خودکشی کر لوں گا۔" میں نے اس کی بات مکمل کر دی۔ "ہاں... اب یہ توسُن لو کہ میں کون ہُوں۔ میں وہی ہوں، جس کی زندگی تم نے محض ایک ڈائری کی خاطر حرام کر رکھی ہے۔"

"تت... تم... تم نے پرویز کو۔"

"ہاں، تم ٹھیک سمجھے ہو۔ اب ذرا سکون سے میری بات سُنو۔ میری ایک قیمتی امانت تمہارے پاس موجود ہے۔ تم چاہو تو سودے کی بات کر سکتے ہو۔"

"تم جانتے ہو تم نے کس پر ہاتھ ڈالا ہے۔" وہ دہاڑا۔ "تمھیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ میں تمھاری زندگی حرام کر دوں گا۔"

"میں تم لوگوں کے وسائل سے بے خبر نہیں ہُوں۔ لہٰذا چیخ پُکار میں اپنی توانائی ضائع نہ کرو۔" میں نے بے حد سکون سے کہا۔ "اب میری پُشت پر شیر خان جیسی ہستی موجود ہے اور میں سمجھتا ہُوں کہ تم اپنے بچّے کو بالاقساط وصول کرنا پسند نہیں کرو گے۔"

"جھوٹ مت بولو۔ شیر خان کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔" وہ غرّایا، لیکن اب اس کے لہجے میں پہلے جیسا اعتماد نہیں تھا۔

"تمھارا جو جی چاہے، سمجھتے رہو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں نے حقیقت تمھیں بتا دی ہے۔ کسی غلط فہمی میں رہو گے تو پچھتاؤ گے بھی خود ہی۔ صرف اتنا بتا دو کہ تبادلے کے بارے میں کیا خ[illegible] ہے تمھارا؟"

"پہلے پرویز سے میری بات کراؤ۔" اس نے [illegible] لہجے میں مطالبہ کیا۔

میں کچھ پریشان ہو گیا۔ فلموں میں دیکھا [illegible] اغوا کرنے والے ہمیشہ یرغمالوں کی آواز بھی ا[illegible] لواحقین کو سُنواتے ہیں۔ اب میں پچھتا رہا تھا [illegible] اب تک ہماری منصوبہ بندی بہت بچکانہ تھی [illegible] حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اب معاملات مجھ پہلے [illegible] سنبھال لیے تھے۔ فی الحال تو جیسے تیسے مجھے ج[illegible] یہ یقین دلانا تھا کہ اس کا بیٹا پرویز میرے قبضے [illegible] ہے اور محفوظ ہے۔

"یہ تو ممکن نہیں ہے۔" کچھ توقف کے بعد [illegible] نے جواب دیا۔

"تو پھر مجھے پتہ کیسے چلے گا کہ تم سچ بول رہ[illegible] وہ پریشان ہو گیا۔

میں نے سفّاک لہجے میں کہا: "اگر تم مُصر ہو [illegible] تمھیں یقین دلانے کے لیے بچّے کے دائیں ہاتھ [illegible] پانچوں انگلیاں بھیج سکتا ہُوں۔" میں نے کہنے [illegible] کہہ دیا لیکن خود بھی کانپ کر رہ گیا۔

"نن... نہیں... خ... خُدا کے لیے۔" وہ [illegible] طرح گھگھیانے لگا۔ "میں بالکل تیار ہُوں۔ گلنار [illegible] خیریت سے اور محفوظ ہے۔"

"تمھارے بچّے کے حق میں یہی بہتر ہے۔" [illegible] نے لہجہ بدستور سخت رکھا۔ "مجھے گلنار جس حال [illegible] ملے گی، اسی حال میں تمھارا بچّہ تمھیں واپس [illegible] یہ بات ذہن میں رکھنا۔"

"تو پھر کب اور کہاں؟" اس کے لہجے میں [illegible] نمایاں تھی۔

"میں تم سے دوبارہ رابطہ قائم کروں گا۔ اور [illegible] یہ یاد دلانے کی تو ضرورت نہیں کہ اگر تم نے کوئی چ[illegible] دکھانے کی کوشش کی تو بچّے کا انجام کیا ہو گا۔ [illegible] اسی لائن کے آدمی ہو۔ یہ سب باتیں اچھی طرح [illegible] ہو۔" میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"تمھیں... تمھیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو [illegible]ی۔" وہ تو اب موم کا آدمی معلوم ہونے لگا تھا۔ "لیکن [illegible]م فون کب..."

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر میں مسکراتا ہُوا بوتھ سے نکل آیا۔ گفتگو کچھ زیادہ دُشوار ثابت نہیں ہوئی تھی۔ دوسری طرف جلال کی پریشانی اور ذہنی اذیت میرے لیے باعثِ مسرت تھی۔ اب شاید اسے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اپنے پیاروں کا بچھڑنا کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔ آج تک وہ صرف دوسروں کو اذیت دیتا آیا تھا۔ اب وہ خود اس اذیت کا ذائقہ چکھ چُکا ہو گا۔

میں باہر نکلا اور ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔ اسلم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا کسی سوچ میں گم تھا۔ میں دروازہ کھول کر ٹیکسی میں بیٹھا تو وہ چونکا اور اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"سب ٹھیک ہے۔" میں نے اُسے اطمینان دلایا۔ "واپس چلو، استاد کے پاس۔"

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہُوئے گاڑی کو اسٹارٹ کر دیا۔ اس بار بھی سفر کے دوران خاموشی ہی رہی۔ مجھے گلنار کی ماں کا خیال آ گیا۔ وہ خوبصورت بارُعب شخصیت کی مالک پُروقار خاتون، جنھیں میں نے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ جن کے چہرے سے گلنار ہی کے خدوخال جھانکتے تھے۔ اُن پر کیا گزر رہی ہو گی؟ میں سوچتا رہا۔ میں کس قدر غیر ذمّے دار تھا کہ میں نے گلنار کے اغوا کے بعد سے ان کی خبر نہیں لی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ میں اب تک کتنے بہت سے احساسِ جرم اٹھائے پھر رہا تھا اور بے خبر تھا۔ حالات کی سنگینی کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان بالکل ہی بے حس ہو جائے... بے غرض ہو جائے... اور پھر مجھے تو جو لوگ ملے تھے، وہ انتہائی بے غرضی سے میرے کام آ رہے تھے۔ اگر ان کا طرزِ فکر بھی میرے جیسا ہوتا تو وہ میری آگ بجھانے کے لیے خود کو شعلوں میں نہ جھونکتے۔ خود احتسابی اور خود ملامتی کا یہ سلسلہ اس وقت منقطع ہُوا، جب ٹیکسی اکھاڑے کے آگے رُک گئی۔ میں نے سیدھا استاد کے کمرے کا رُخ کیا۔ اسلم میرے پیچھے ہی تھا۔ استاد نیاز سے گفتگو میں مصروف تھا۔ گفتگو سے اندازہ ہُوا کہ وہ تبادلے کی مہم کے سلسلے میں ہدایات دے رہے تھے۔

نیاز کو رخصت کر کے استاد مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "کیا رہا؟"

"وہ رضامند ہو گیا ہے۔ بہت بے تاب معلوم ہو رہا تھا لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ دوبارہ فون کروں گا۔"

"بہت خوب۔" استاد سر ہلا کر بولے۔ "میں نے تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔ اس بار فون پر اسے بتا دینا کہ رات آٹھ بجے گلنار کو لے کر سمن آباد پارک میں پہنچ جائے۔"

میں چند لمحے سوچتا رہا پھر کہا۔ "اب تو میں نے یہ تمام معاملات آپ کو سونپ دیے ہیں لہٰذا میں دارا کی خیر خبر بھی لے آؤں۔ کیوں نہ بچّے کو یہیں لے آؤں۔ میں دارا کو اس معاملے میں مزید ملوث نہیں کرنا چاہتا۔"

"ٹھیک ہے۔ بچّے کو یہاں لے آؤ۔ پھر جا کر دارا کو فون کر دینا۔" استاد نے کہا۔

میں اٹھا تو اسلم بھی میرے ساتھ ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے اسلم کو اس مکان کا پتہ بتایا، جہاں دارا نے بچّے کو چُھپا رکھا تھا۔

دارا ہمیں اس مکان میں ٹہلتا ہُوا ملا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے تابانہ میری طرف لپکا۔ "بڑی دیر لگا دی۔ فون کیا یا نہیں؟ کیا بات ہُوئی جلال سے؟" اس نے مجھے دیکھتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"اندر تو چلو۔" میں نے کمرے کی طرف بڑھتے ہُوئے جواب دیا۔

بچّہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے دارا کی طرف دیکھا۔

"ایک انجکشن اور لگا چکا ہُوں۔" اس نے وضاحت کی۔

میں نے اسلم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کُرسی پر بیٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ دارا کو اس مہم سے الگ رہنے پر قائل کرنا آسان نہ ہو گا۔ بہرحال میں نے وضاحت سے اپنا زاویۂ نظر اس کے سامنے رکھ دیا۔

اور یہ بھی بتا دیا کہ اب میں نے یہ معاملات مجّو پہلوان کو سونپ دیے ہیں۔

"لیکن یہ منصوبہ میرا ہے۔ تم مجھے اس طرح الگ نہیں رکھ سکتے" وہ سراپا احتجاج بن گیا۔

میں نے نرم لہجے میں کہا: "میں تمھیں اس مہم سے اپنے مفاد اور خود غرضی کے پیشِ نظر دُور رکھنا چاہتا ہوں۔ تم جذباتی ہو کر بہت سی اہم باتیں نظر انداز کر رہے ہو۔"

"مثال کے طور پر..." اس نے پوچھا۔ وہ اب بھی غیر مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"مثلاً یہ کہ کیا تم چودھری رحمت علی کا ساتھ چھوڑ دو گے؟ آخر جلال بھی اسی گروہ کا آدمی ہے۔ اگر تم اس مہم کے دوران بے نقاب ہو گئے تو یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ نہیں دوست، میں یہ خطرہ ہرگز مول نہیں لے سکتا۔"

"تو کیا میں رحمت علی کا زرخرید ہوں" وہ برہم ہو گیا۔

"تم بھول رہے ہو کہ عابد علی کی زندگی اور نازو کی بازیابی کا انحصار تم پر ہے۔"

وہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "ہاں، یہ بات تو ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"تم رحمت علی سے صرف اس لیے وابستہ ہو تاکہ اس کے ذریعے نازو کا پتہ چلنے کا امکان ہے۔ اگر نازو رحمت علی کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ بلا توقف اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ تم وہاں اس لیے ہو کہ ایسا موقع آنے پر اس کا تحفظ کر سکو۔"

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"اور گلنار کی رہائی کے بعد میں نازو کی گمشدگی کی طرف توجہ دوں گا۔" میں نے مزید کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تمھاری بات دل کو لگتی ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں اس مہم سے علیحدہ رہوں گا، اگرچہ میرا دل نہیں مانتا۔ تاہم گلنار کے سلسلے میں میری ایک تجویز ہے جو تمھیں ماننا ہوگی۔"

"ضرور۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ بات طے ہے کہ گلنار کو آزاد کرنے کے بعد جلال چوٹ کھائے سانپ کی طرح خطرناک ہو جائے گا۔ اس کی کوشش ہوگی کہ وہ گلنار پر دوبارہ قابو پا لے۔ [illegible] لیے بہتر ہوگا کہ گلنار کو آزاد کراتے ہی کراچی بھیج [illegible] جائے۔ میں رات کو فلائٹ پر سیٹ ریزرو کرا [illegible] ٹکٹ وغیرہ مجّو پہلوان کے اکھاڑے پہنچا دوں [illegible] کراچی میں میرا ایک بے حد عزیز دوست رہتا ہے۔ گلنار جب تک ضرورت ہو وہاں قیام کر سکتی [illegible] میرے دوست کی والدہ اور بہنیں اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گی بلکہ مجھے یقین ہے کہ گلنار وہاں رہتے ہوئے اجنبیت بھی محسوس نہیں کرے گی۔"

میں چند لمحے اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ اس کی یہ بات بہرحال وزن رکھتی تھی۔ مجھے فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ "ٹھیک ہے دارا۔ مجھے تمھاری تجویز منظور ہے۔ ہم اس پر عمل کریں گے۔" میں نے کہا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی۔ "تم ٹکٹ اور کراچی کا پتہ مجّو پہلوان کے اکھاڑے پہنچا دینا۔ اب میں اس بچے کو مجّو پہلوان کے سپرد کر کے جلال کو فون کر دوں گا تاکہ تبادلے کے وقت اور جگہ کا تعین ہو سکے۔"

"ٹھیک ہے جمال... خدا تمھیں کامیاب کرے۔" اس نے پُرخلوص لہجے میں کہا اور بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ بچے کو ٹیکسی کی عقبی نشست پر لٹا دیا گیا۔ [illegible] بار میں بھی عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ ہم نے دارا کو خدا حافظ کہا۔ پھر اسلم نے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

بچے کو مجّو پہلوان کے پاس چھوڑ کر ہم پھر [illegible] ٹی بلڈنگ تک پہنچے۔ اس مرتبہ ریسیور فوراً اٹھا لیا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جلال بے چینی سے میرا منتظر تھا۔ جواب بھی اسی نے دیا تھا۔

"رات آٹھ بجے... سمن آباد پارک... اور تنہا آنا۔ دوسری صورت میں تم جانتے ہی ہو..." میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اُستاد مجّو پہلوان اپنے کمرے میں میرا منتظر تھا۔ بچے کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اُسے ہوش آ چکا تھا۔ اُستاد نے ہمیں باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم اُن کے پیچھے پیچھے اکھاڑے میں چلے آئے۔ استاد نے

تخت کی طرف اشارہ کر کے ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ استاد کے بیٹھنے کے بعد ہم دونوں بھی بیٹھ گئے۔ "کیا رہا؟" اُستاد نے پوچھا۔

"میں نے فون پر اسے آپ کا طے کردہ وقت اور پتہ بتا دیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ پھر میں نے انھیں دارا سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ وہ میری بات سنتے ہوئے سر ہلاتے رہے۔

"بہت خوب۔" میرے خاموش ہونے پر وہ بولے۔ "تجویز بہت اچھی ہے۔ میں یہاں موجود آدمی کو اس سلسلے میں ہدایات دے دوں گا۔"

"اب مجھے بتاؤ کہ تمھارا منصوبہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم اور اسلم بچے کو ٹیکسی میں لے کر وہاں پہنچو گے۔ میں چھ آدمیوں کے ساتھ مقررہ مقامات پر چھپا رہوں گا تاکہ گرد و پیش کی مشکوک نقل و حرکت پر نگاہ رکھی جا سکے۔ تم گلنار کو ٹیکسی میں منتقل کر کے بچہ، جلال کے سپرد کر دو گے۔ تمھیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو بچہ اس کے حوالے نہ کرنا... اور اسلم ٹیکسی کی نمبر پلیٹ ہو سکے تو بدل لو، ورنہ یہ نمبر پلیٹ بہرحال اتار لینا۔"

بات چیت بے حد مختصر تھی۔ استاد نے بھانپ لیا کہ میں مطمئن نہیں ہوں۔ انھوں نے تفصیل سے مجھے ان مقامات کے بارے میں سمجھایا جہاں انھیں اپنے چھ ساتھیوں سمیت موجود رہنا تھا۔ "ہم سات بجے وہاں پہنچ جائیں گے۔ سات بجے خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔" انھوں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے استاد۔ اب میں مطمئن ہوں۔" میں نے کہا۔

اسلم نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس وقت چار بجے تھے۔ پھر استاد ہی کو خیال آیا اور انھوں نے پوچھا کہ ہم نے کھانا کھایا ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ جواب ہمارے چہروں پر لکھا ہوا تھا۔ استاد نے نذیر پہلوان کو کھانا لانے کے لیے کہا۔ کھانا ہم نے وہیں تخت پر بیٹھ کر زہر مار کیا۔ کم از کم مجھے تو بھوک کا احساس ہی نہیں تھا۔ عجیب ہیجانی سی کیفیت ہو رہی تھی میری۔ میں زندگی کے سب سے بڑے امتحان سے گزرنے والا تھا۔

چھ بجے کے قریب اُستاد اپنے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ جاتے وقت انھوں نے سختی سے اپنی ہدایات دُہرائیں۔ پھر میں نے جلال کو آخری مرتبہ فون کر کے معاملات طے کیے۔ اب ہم انتظار کے مرحلے سے دوچار تھے۔ کبھی کبھی ہم میں سے کوئی جا کر استاد کے کمرے میں موجود یرغمالی بچے کو دیکھ آتا۔ اب اس کے مُنہ پر بھی پٹی باندھ دی گئی تھی۔

خدا خدا کر کے آٹھ بجے۔ ہم نے منصوبے کے مطابق ٹیکسی کی نمبر پلیٹ اتاری۔ پھر بچے کو ٹیکسی میں ڈالا اور سمن آباد پارک کی طرف چل دیے۔ وہاں صرف ہیڈ لیمپس کی روشنی تھی ورنہ گرد و پیش لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ استاد نے بہت سوچ سمجھ کر وقت اور جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

ہم پارک کے قریب پہنچے تو ہدایت کے عین مطابق سائڈ میں ایک گاڑی کھڑی دکھائی دی۔ اس کی عقبی بتیاں روشن تھیں۔ اسلم نے تین مرتبہ لائٹ چمکا کر سگنل دیا تو اس کار کی عقبی بتیاں بجھ گئیں۔ اسلم نے ٹیکسی اس کار کے برابر جا کر روک دی۔ اس نے گاڑی بند نہیں کی تھی۔ میں عقبی دروازہ کھول کر تیزی سے اتر آیا۔ حسبِ ہدایت، کار کی عقبی نشست پر جلال موجود تھا۔ گلنار اس کے برابر بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کو میں نے اس کے ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور خود پر جبر کرتے ہوئے جلدی سے نظر ہٹا لی۔ وہ عمل کا وقت تھا اور کسی بھی قسم کی جذباتیت مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ "یہ بات بھول مت جانا۔" میں نے تنبیہی لہجے میں جلال کو مخاطب کیا۔ "غلطی کی کوئی گنجائش نہیں... کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرو گے تو تمھارا بچہ مار دیا جائے گا۔ گلنار کو نیچے اتار دو۔"

اس نے زہریلی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"گلنار ایسے تو نہیں جائے گی۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "پہلے پرویز کو میرے حوالے کرو۔"

"تمھاری مرضی۔" میں نے خشک لہجے میں کہا اور

واپسی کے لیے پلٹ گیا۔
"ٹھہرو... ٹھہرو" وہ بے چین ہو گیا۔
میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں گلنار کو تمھاری طرف بھیج رہا ہوں" وہ بولا۔ "لیکن یاد رکھنا، تم نے دھوکے بازی کی تو میں تمھیں پاتال میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔"
میں نے سکون کا سانس لیا۔ دھوکے بازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں تو جلد از جلد اس منحوس چکر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ پھر میں نے گلنار کو کار سے اتر کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ وہ کسی سہمے ہوئے ننھے بچے کی طرح میرے پہلو سے چپک گئی۔ اس کے منہ سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔ اپنے نام کے سوا میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ میں اسے سہارا دے کر ٹیکسی کی طرف لے گیا۔ بچے کو باہر نکال کر میں نے گلنار کو عقبی نشست پر بٹھا دیا۔ پھر میں نے جلال کو پکارا کہ وہ آ کر بچے کو لے جائے۔
"جمال، بچہ ابھی واپس نہ کرو۔ اس سے کہو کہ کل صبح بچے کو اس کے گھر پہنچا دیا جائے گا" اسلم نے کہا۔
میں ایک ثانیے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ "نہیں دوست!" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "میں اپنے اور تمھارے گناہوں کا بوجھ بڑھانا نہیں چاہتا۔"
"تمھاری مرضی۔ مجھے اپنی نہیں تمھاری اور گلنار کی فکر ہے۔ یہ بچہ تم لوگوں کے تحفظ کی ضمانت ہو سکتا تھا" اسلم نے دردمندانہ لہجے میں کہا۔
اس دوران میں جلال کار سے اتر کر ٹیکسی کی طرف آیا اور بے تابی سے بچے کی طرف لپک پڑا۔
وہ حیرت سے میری طرف سر اٹھا کر دیکھنے لگا، لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔
"میں تنہا نہیں ہوں" میں نے مزید کہا۔ "اس علاقے میں میرے دو جنوں ساتھی یعنی شیر خان کے آدمی موجود ہیں۔ تم میرے جانے کے بعد سو تک گنتی گنو گے، پھر یہاں سے ہلو گے، اس کے برعکس ہوا تو اپنی اور اپنے بچے کی موت کے ذمے دار خود ہو گے
یہ خالی خولی دھمکی نہیں ہے۔ تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ میری ہدایات پر عمل کرو۔"
اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ "ٹھیک ہے جوان! اس وقت ترپ کے تمام پتے تمھارے ہاتھ میں ہیں" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "لیکن اگلی بازی میں تمھارے پاس کچھ بھی نہیں ہو گا۔"
"خواب دیکھتے رہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں" میں نے استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگایا اور عقبی نشست کا دروازہ کھول کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اسلم نے تیزی سے یو ٹرن لیا اور ٹیکسی واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ جلال بچے کے ساتھ وہیں کھڑا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سو تک گنے بغیر وہ کار کی طرف نہیں بڑھیں گے۔ گلنار کی بازیابی کا مشن کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا۔
اب میں گلنار کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "کیسی ہو؟" میرا لہجہ محبت بوجھ سے چٹخ چٹخ گیا۔
وہ میری طرف دیکھتی رہ گئی تاہم اس نے حیرت انگیز حد تک خود پر قابو پا لیا تھا۔ "تم نے... تم نے میرے لیے بہت تکلیف اٹھائی ہے جمال، اپنے مزاج کے خلاف کام کیا ہے۔ جلال نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ بہت برہم تھا" اس نے محبت پاش لہجے میں کہا۔ پھر اچانک وہ جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ "وہ بہت خطرناک لوگ ہیں جمال! تمھیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔"
"اسی لیے تو میں تمھیں آج رات کی فلائٹ سے کراچی بھیج رہا ہوں" میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے تمام تفصیل بتا دی۔
"تم بھی ساتھ چلو گے، نا؟"
"نہیں... ابھی یہاں کچھ کام نمٹانے ہیں۔ میں بعد میں آؤں گا۔"
"تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گی۔ میں تمھیں یوں خطرات میں گھرا نہیں چھوڑ سکتی۔"
"ضد نہ کرو۔ اس طرح تم میرے مصائب میں اضافہ کرو گی" میں نے اسے سمجھایا۔

اس نے شاکی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "اور تمھیں یہاں کون سا ضروری کام ہے؟" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "وہی نازو کا چکر ہے نا؟"
جواباً میں نے شاکی نظروں سے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ کہنے کو تھا بھی کیا؟
"میں... میں معافی چاہتی ہوں" اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "بعض اوقات انسان زبردستی کسی پر استحقاق جمانے لگتا ہے۔ اور یہ بھی بھول جاتا ہے کہ وہ خود کتنا بے مایہ ہے۔ میں تو تمھاری خوشی میں خوش ہوں اور بس۔"
"کیسی باتیں کر رہی ہو گلنار" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "بہت سی باتیں کہے بغیر بھی تو سمجھ لی جاتی ہیں۔ میں نہیں مانتا کہ تم اپنے بارے میں میرے جذبات سے بے خبر ہو۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں تمام قرض اتار کر تمھارے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک تمھاری حیثیت کا تعلق ہے تو وہ تم بھی جانتی ہو۔ زندگی کے پل صراط سے تم گزری ہو... اذیتیں تم نے اٹھائی ہیں۔ لیکن بے خبر میں بھی نہیں ہوں۔ دوسری طرف تم یہ بھی جانتی ہو کہ میری ہم سفری در بدری کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"
اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ میرے ہاتھ پر اس کی گرفت گداز تر ہو گئی۔ "پلیز جمال... مجھے معاف کر دو، ہم جیسے لوگ کبھی کبھی بری طرح احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں خود سمیت ہر چیز سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ میں تمھیں دکھ نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔"
میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور مسکرا دیا۔ میں اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ وہ بہت اذیت کے شب و روز گزار کر آئی تھی۔ ایسے لمحے آدمی کو عموماً کمزور کر دیتے ہیں۔ ورنہ عام حالات میں وہ بڑی پُراعتماد، شگفتہ طبع اور رکھ رکھاؤ والی لڑکی تھی۔ "تو پھر کراچی جانا منظور ہے؟" میں نے پوچھا۔
"لیکن امی..."
"میں کل ہی ان سے ملوں گا اور جلد ہی انھیں بھی کراچی بھیج دوں گا۔"

"اور تم..." وہ کہتے کہتے رک گئی۔
"میں بھی جلد ہی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ مطمئن رہو۔"
وہ مطمئن ہو گئی۔ کچھ ایسی ہی لڑکی تھی۔ اعتماد کرتی تھی تو اندھا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ کراچی میں وہ کہاں قیام کرے گی۔
اب ٹیکسی ایک چوراہے پر پہنچ رہی تھی۔ اچانک ہی سناٹے کی چادر تار تار ہو گئی۔ ہر طرف شعلے رقص کرنے لگے۔ دو اطراف سے آنے والی سیاہ کاروں سے اچانک ہم پر فائر کھول دیا گیا تھا۔ ٹیکسی کے تقریباً تمام شیشے چکنا چور ہو گئے تھے۔ میں نے گلنار کو ایک طرف دھکیلا اور خود اس پر ڈھال بن گیا۔ ہماری ٹیکسی چند لمحوں کے لیے ڈگمگائی، پھر اس کی رفتار یکلخت بہت تیز ہو گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسلم نے اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے تھے۔ گولیوں کی بارش اب بھی جاری تھی۔ سر اٹھانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔
"تم خیریت سے ہو اسلم؟" میں نے جھکے جھکے پوچھا۔
"ہاں... بالکل ٹھیک ہوں" وہ چہکا لیکن میں اس کے لہجے میں اذیت محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا... ٹیکسی بدستور اڑی چلی جا رہی تھی۔
"تم زخمی ہو؟" میرے لہجے میں تشویش تھی۔
"معمولی زخم ہے۔ شاید شیشے کی کوئی کرچ لگ گئی ہے" اس نے اطمینان دلایا۔
فائرنگ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ کچھ دیر بعد فضا پر سناٹا چھا گیا۔
"اب آپ اٹھ سکتے ہیں" اسلم نے کہا۔ "میں بھری پری سڑکوں کی طرف نکل آیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ لوگ کھسک گئے ہیں" اس کے لہجے میں نقاہت تھی۔
میں اور گلنار اٹھ بیٹھے۔ گلنار کا چہرہ سپید ہو رہا تھا لیکن وہ دہشت زدہ نہیں تھی۔ میں جھپٹ کر اگلی نشست کی طرف لپکا تاکہ اسلم کو دیکھ سکوں نہ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا تھا۔ پھر اسے دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا۔ سینے سے پیٹ تک اس کی قمیص میں کئی سوراخ تھے، جن سے خون بہہ رہا تھا۔

سیٹ تک خون میں تر بتر ہو گئی تھی۔ یقیناً یہ اس کی قوتِ ارادی کا کمال تھا کہ وہ اس عالم میں بھی ڈرائیو کرتا رہا تھا۔ اب دُشواری یہ تھی کہ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔

"اسلم فوراً اسپتال چلو" میں نے چیخ کر کہا۔

"گھبرا گئے" اس کے لبوں پر کمزور سی مسکراہٹ لرزنے لگی "خاتون کو حفاظت سے استاد مجو کے ٹھکانے پر پہنچا دیں، پھر چلیں گے۔"

"نہیں... پہلے اسپتال چلو" میری آواز اور بلند ہو گئی۔

"اس وقت اس مہم کا انچارج میں ہوں" اس نے خوش دلی سے کہا لیکن اس کی آواز بہت دھیمی ہو گئی تھی "بس چند منٹ کی تو بات ہے۔"

مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے کبھی زندگی میں خود کو اس قدر بے بس محسوس کیا ہو جتنا کہ اس وقت کر رہا تھا۔ اسلم کے جسم سے خون تیزی سے خارج ہو رہا تھا۔ میں اس سے اسپتال چلنے کی التجائیں کرتا رہا اور وہ ٹالتا رہا۔ ونڈ شیلڈ چور چور ہو چکی تھی اور سرد ہوا کے تھپیڑے میرے چہرے کو سُن کیے دے رہے تھے۔ مجو پہلوان کے اکھاڑے پر مجید ہمارا منتظر تھا۔ میں نے گلنار کو اتارا اور مجید سے کہا کہ وہ ٹکٹ اور کراچی والا پتہ گلنار کو دے کر اسے بحفاظت، ائر پورٹ چھوڑ آئے۔ گلنار کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی لیکن اسلم کی تشویش ناک حالت کے پیشِ نظر وہ بحث نہ کر سکی۔ میں نے اسے خدا حافظ کہا اور اس کی چھلکتی ہوئی آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹیکسی میں جا بیٹھا۔

اسپتال پہنچتے پہنچتے اسلم کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ اس پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ اسپتال کے کمپاؤنڈ میں مجھے نذیر ٹہلتا نظر آ گیا۔ اس کے چہرے کا ہیجانی تاثر دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ تیزی سے ٹیکسی کی طرف لپکا۔

"کیا ہوا جمال بابو؟"

میں نے کچھ کہنے کی بجائے اسلم کی طرف اشارہ کیا۔ نذیر اسپتال کی طرف دوڑ پڑا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو وارڈ بوائے تھے انھوں نے اسٹریچر اٹھا رکھا تھا۔ اسلم کو اسٹریچر پر ڈالا وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں اور نذیر اسٹریچر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

ایمرجنسی وارڈ میں ڈاکٹر نے خاصی ردو کد کے بعد اسلم کا معائنہ کیا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "مشکل ہے۔ خون بہت ضائع ہو چکا ہے"

اتنے میں ایک باوردی پولیس انسپکٹر آ گیا۔ اس نے پہلے اسلم کو اور بعد میں مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں لیکن نذیر نے میری مشکل آسان کر دی "یہ بھی ہمارے ساتھ تھے داروغہ جی" اس نے انسپکٹر سے کہا۔

انسپکٹر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اسلم کو آپریشن تھیٹر لے جایا گیا اور ہم باہر کھڑے رہ گئے۔ میں نے نذیر کا ہاتھ تھاما اور اسے باہر لے آیا۔ ذہن میں طرح طرح کے وسوسے جنم لے رہے تھے۔ نذیر کی وہاں موجودگی خالی از علت نہیں تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسے استاد مجو پہلوان کے ساتھ سمن آباد پارک چھوڑ کر آیا تھا۔

"ہاں نذیر... تم یہاں کیسے؟" بالآخر میں نے اس سے پوچھا۔ لیکن میں اس جواب کے متعلق سوچ کر لرز رہا تھا، جو وہ دینے والا تھا۔

"اس خبیث کے کار میں بیٹھتے ہی ہم پر اندھا دُھند فائرنگ شروع ہو گئی" نذیر نے بھڑکتے لہجے میں جواب دیا "ہم بھی مسلح تھے۔ جواباً ہم نے بھی فائرنگ کی تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے لیکن استاد اور شیدا زخمی ہو گئے۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔

"اوہ استاد!" میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ "کہاں ہیں استاد! مجھے ان کے پاس لے چلو" میرے لہجے میں بے تابی تھی۔

وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے اسپتال کے ایک کمرے میں لے گیا جہاں استاد اور شیدا لیٹے ہوئے تھے۔ استاد مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے "خدا کا شکر ہے" انھوں نے بے ساختہ کہا۔ شیدا بھی مسکرا رہا تھا لیکن وہ اُٹھا نہیں تھا۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ استاد کی حالت تسلی بخش معلوم ہو رہی تھی۔ البتہ شیدے کا چہرہ زرد تھا۔ لگتا تھا، اس کا زخم کچھ خطرناک ہے۔

"کہو برخوردار... اسپتال میں ہم سے ملنے کے لیے آئے ہو اور پھول تک نہیں لائے" استاد نے ہنس کر کہا۔

میں مسکرا دیا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ میری مسکراہٹ کس قدر بے جان ہے۔

استاد کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے لگے "خیریت تو ہے برخوردار۔ لڑکی کو حفاظت سے مجید تک پہنچا دیا تھا نا؟"

"جی ہاں استاد۔ گلنار اب محفوظ ہے۔ مجید اسے ائر پورٹ چھوڑ آئے گا" میں نے لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا بات ہے۔ کیا گڑبڑ ہے۔ بتلاتے کیوں نہیں" استاد بے تاب ہو گئے۔

"راستے میں ہماری ٹیکسی پر بھی فائرنگ ہوئی تھی استاد" میں نہ چاہتے ہوئے بھی زبان کھولنے پر مجبور ہو گیا "اسلم بڑی طرح زخمی ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے مایوسی ظاہر کی ہے۔ کہتا ہے خون بہت نکل گیا ہے"

استاد نڈھال ہو گئے "اللہ بہتر کرے گا" انھوں نے دھیرے سے کہا۔

ان سے اس حال میں سنگین مسائل پر بات چیت کرنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن حالات اتنی تیزی سے پیش آئے تھے کہ ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا جب کہ بہت سے سنگین مسائل اب بھی میرے سامنے منہ کھولے کھڑے تھے، جن کا حل فوری طور پر درکار تھا۔ یہ بات کچھ کم تو نہیں تھی کہ اسلم، استاد اور شیدا زخمی ہوئے تھے۔ سنگین سوال یہ تھا کہ پولیس، جو وضاحت کے لیے بے چین ہو گی، اسے کس طرح مطمئن کیا جائے۔ میں تو اس وقت خود کو کال کوٹھری میں محسوس کر رہا تھا اور مجھے اپنے گرد دیواریں بلند ہوتی محسوس ہو رہی تھیں میرا دم گھٹنے لگا۔

میں چند لمحے استاد کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اسلم کے متعلق سننے کے بعد وہ نڈھال سے نظر آ رہے تھے۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ استاد کس قدر حساس اور دردمند دل کے آدمی ہیں۔ بظاہر مضبوط اور ناقابلِ تسخیر نظر آنے والے اس شخص کا دل دوسروں کے لیے کس قدر گداز ہے... کس قدر نازک ہے اندر سے! میں سوچتا رہ گیا، لیکن جواب دینے کی گھڑی قریب آ رہی تھی۔ راہنمائی کے لیے میرے سامنے استاد کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔

"استاد، ایک مسئلہ ہے" میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ وہ فوراً میری طرف متوجہ ہو گئے "ابھی باہر ایک انسپکٹر ملا تھا۔ اسے کیا بیان دیا جائے؟"

استاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی "اس کی تم فکر نہ کرو۔ یہاں کا ایس پی اپنا ہی آدمی ہے۔ میں نے اسے مطلع کر دیا ہے۔ انسپکٹر کو سب کچھ سمجھا دیا گیا ہے۔ میں اسے بیان دے چکا ہوں۔ وہ خود ہی ملتا جلتا بیان لکھ کر سب سے دستخط کرا لے گا!"

میں قدرے مطمئن ہو گیا لیکن ایک اُلجھن ابھی موجود تھی "انسپکٹر، اسلم سے بھی بیان لینا چاہے گا۔ اسلم کی حالت ایسی نہیں کہ ہم اسے پہلے سے آگاہ کر سکیں۔ اگر اس کا بیان متضاد ثابت ہوا تو کیا ہو گا؟"

"میں نے کہا نا کہ کوئی فکر نہ کرو" استاد پھر مسکرائے "تم ایسا کرو، انسپکٹر کو میرے پاس بھیجتے جاؤ۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ اب تم جا کر اسلم کی خبر لو اور کچھ آرام کر لو" انھوں نے چمکارتے ہوئے کہا۔

نہ جانے کیوں میرا دل بھر آیا۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ مزید کچھ کہے بغیر میں کمرے سے نکل آیا۔ نذیر میرے ساتھ تھا۔ ہم ایمرجنسی وارڈ کی طرف بڑھ گئے۔ انسپکٹر ایمرجنسی وارڈ کے دروازے پر موجود تھا۔ میں نے اسے استاد کا پیغام دیا۔ وہ اتنی تیزی سے استاد کے کمرے کی طرف لپکا، جیسے میں نے اُسے اس کے افسرِ اعلیٰ کی طلبی کا پیغام سنایا ہو...

پھر مجھے وہ ڈاکٹر نظر آ گیا، جس نے اسلم کا پہلی بار معائنہ کیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک

لیا۔"اب اس کا کیا حال ہے ڈاکٹر؟" میں نے پوچھا۔
"آپریشن کر کے چھ گولیاں نکالی گئی ہیں..." ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "اب ہم اُسے خون دے رہے ہیں۔"
"وہ... وہ بچ تو جائے گا نا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اندیشوں کے بوجھ تلے میری روح لرز رہی تھی۔
ڈاکٹر نے ایک لمحہ بغور مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے ہمدردی نظر آئی۔ "کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ باقی اللہ کی مرضی۔ خون بہت بہہ گیا ہے۔"
اس نے اگرچہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے الفاظ کا کھوکھلا پن محسوس کر لیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک بے نام سی اُداسی اُترتی چلی گئی۔ سینہ جیسے تاریک ہو گیا۔ "میں اس سے مل سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔
"سوری... البتہ دو گھنٹے بعد مل سکیں گے۔ اس وقت وہ بے ہوش ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر آگے بڑھ گیا۔
میں نے دوبارہ مجّو پہلوان کے کمرے کا رُخ کیا۔ اسی وقت انسپکٹر کمرے سے نکل آیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو ایک ڈاکٹر بھی کمرے میں چلا آیا...
"سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا برخوردار۔ میں نے بات کر لی ہے۔" استاد نے مجھے دلاسہ دیا۔
ڈاکٹر نے استاد اور شیدے کی نبض اور ٹمپریچر وغیرہ چیک کیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "انھیں آرام کی ضرورت ہے۔" اس نے نرم لہجے میں کہا... "پلیز... صبح مل لیجیے گا۔"
میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "بے فکر رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جاؤ، آرام کرو۔" انھوں نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ "اکھاڑے ہی چلے جاؤ۔"
"لیکن استاد، اسلم..." مجھ سے جملہ پورا نہ کیا گیا۔ آواز بھرا گئی تھی۔
"دُعا کرو، اس کے لیے۔ اللہ بہتر کرے گا۔" اُن کے لہجے میں بے پناہ یقین تھا۔
"اچھا استاد، خدا حافظ۔" میں نے بمشکل کہا

اور کمرے سے نکل آیا۔ نذیر اس بار بھی میرے سا[تھ] تھا۔ شاید استاد نے اسے اشارہ کر دیا تھا کہ وہ [مجھے] تنہا نہ چھوڑے۔ حالانکہ اس وقت میں شدت [سے] تنہائی کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔
ہم کمپاؤنڈ میں نکل آئے۔ اسلم سے ملاقا[ت] دو گھنٹے بعد ہونا تھی۔ یہ دو گھنٹے گزارنا میرے [لیے] بہت کٹھن ہو رہا تھا۔ بہت زیادہ بے قراری محس[وس] ہو رہی تھی۔ کچھ دیر ہم کمپاؤنڈ میں ٹہلتے رہے۔ [پھر] مجھے گلنار کا خیال آ گیا، جو کچھ ہی دیر بعد کراچی [کے] لیے روانہ ہونے والی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی [مجھے] اندازہ ہوا کہ اس افراتفری میں ایک بات کا تو خیا[ل] ہی نہیں رہا تھا۔ گلنار پہلی دفعہ کراچی جا رہی تھی۔ اس کے پاس صرف ایک پتہ تھا۔ خدا جانے وہاں [اس] پر کیا گزرے گی... کہیں وہ بھٹکتی نہ پھرے۔ میر[ا] دل وسوسوں سے بھر گیا۔ شاید وہ دن ہی کچھ ایس[ا] تھا۔ اس نے مجھے پریشانیوں، خدشوں اور وسوس[وں] کے سوا کچھ بھی نہیں دیا۔ گلنار کے ملنے کی خوشی [بھی] در پے پیش آنے والے واقعات تلے دب کر ر[ہ] گئی تھی۔
میں دارا کو فون کرنے کے ارادے سے اسپتال کی عمارت کی طرف پلٹ رہا تھا کہ مجھے دارا دروازے سے داخل ہوتا دکھائی دیا۔ وہ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس نے کالر اُٹھائے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف لپکا۔
"تم یہاں کیسے؟" میں نے پوچھا۔
"مجھے معلوم تھا کہ تبادلہ کہاں طے پایا ہے" اس نے مجھے یاد دلایا۔ "سمن آباد پارک کے سامنے فائر[نگ] کی خبر سُن کر مجھے تشویش ہوئی۔ پولیس کے محکمے میں بھی کچھ علیک سلیک ہے۔ وہاں سے پتہ چلا کہ [یہ] میں سیدھا یہاں آیا ہوں۔ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟"
"اسلم کی حالت تشویش ناک ہے۔ شیدا شدید زخمی ہوا ہے۔ البتہ استاد کی حالت زیادہ خراب نہیں" میں نے کہا۔

وہ بھی پریشان ہو گیا۔ "اوہ اسلم... وہ تو بہت پیارا آدمی ہے۔ اللہ میرے حصے کی زندگی بھی اُسے [د]ے دے۔ اس نے ایک ہی ملاقات میں میرا دل [جی]ت لیا تھا۔" اس کے لہجے میں خلوص جھلک رہا تھا۔ "[گل]نار تو خیریت سے ہے؟"
"ہاں، وہ اب کراچی کے لیے روانہ ہونے والی [ہے]۔ میں اسی سلسلے میں تمھیں فون کرنے والا تھا۔ [و]ہاں کہاں بھٹکتی پھرے گی..."
"یار... کیا تم مجھے غیر ذمے دار سمجھتے ہو؟" اس [نے شکایت]ی لہجے میں کہا۔ "ٹکٹ بنواتے وقت میں نے [کرا]چی اپنے دوست کو فون کر دیا تھا۔ وہ لوگ ائیر پورٹ [پر گل]نار کو ریسیو کرنے کے لیے موجود ہوں گے۔"
میرے دل میں تشکر کی ایک لہر سی اُٹھی۔ خلوص [کے م]عاملے میں میں واقعی خوش قسمت واقع ہوا تھا۔ [شک]ریہ ادا کرنا اس کے خلوص کی توہین ہوتی لہٰذا میں [نے] اپنے الفاظ کا گلا گھونٹ لیا۔ "تم نے میرے دل [کا بو]جھ ہلکا کر دیا دارا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم یہاں [کیو]ں چلے آئے؟"
"یہ خبر سُن کر رہا نہ گیا۔" اس نے جواب دیا۔
"تم سے ہمارا کوئی تعلق ثابت نہیں ہونا چاہیے [میر]ا خیال ہے فوراً واپس چلے جاؤ۔"
وہ واپس جانے پر آمادہ تو ہو گیا لیکن خاصا [کبی]دہ خاطر دکھائی دے رہا تھا۔ "میرے پاس تمھارا [موبائ]ل فون نمبر موجود ہے۔" میں نے اسے دلاسہ دیا۔ "میں [تمھ]یں حالات سے باخبر رکھوں گا۔"
وہ چلا گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی پونے دو [گھ]نٹے کا پہاڑ جیسا وقت کاٹنا تھا۔ انتظار کا ہر لمحہ [کس]ی اذیت ناک سال کی طرح طویل ہوتا ہے۔ مجھے [چا]ئے کی طلب محسوس ہونے لگی۔ بھوک کا سوال ہی [نہ]یں پیدا ہوتا تھا۔ ایسے حالات میں بھوک کہاں [لگت]ی ہے۔ یوں بھی ہم نے کھانا دیر ہی سے کھایا تھا۔
"میں چائے پینے جا رہا ہوں۔" میں نے گیٹ کی [طر]ف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔
"میں بھی چل رہا ہوں۔" نذیر جلدی سے بولا۔
"تم یہیں ٹھہرو۔"

"لیکن استاد نے کہا تھا..."
"کہ مجھے تنہا نہ چھوڑنا۔" میں نے تلخ لہجے میں جملہ مکمل کر دیا۔ "لیکن مجھے اس وقت تنہائی کی ضرورت ہے۔ میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔"
"میں استاد کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔" اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔
"میں جانتا ہوں، تمھیں بھی چائے کی طلب ہو رہی ہے۔" میں نے رُخ بدل کر حملہ کیا۔ وہ شدت سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور بات جاری رکھی۔ "یہاں صرف ہم دونوں ہیں۔ ہم استاد کو اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتے ایسا کرو، پہلے تم چائے پی آؤ۔ میں بعد میں چلا جاؤں گا۔"
"مجھے چائے کی طلب تو نہیں ہو رہی۔" اس نے احتجاج کیا۔
"تو پھر میں چائے پی آتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے، جناب۔" اس نے مرے مرے لہجے میں شکست تسلیم کر لی۔
میں اسپتال سے نکل آیا اور بغیر سوچے سمجھے ایک طرف چل پڑا۔ ذہن پر خیالات کی یلغار اس قدر شدید تھی کہ کچھ سوچنا ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔ میں عجیب سی کیفیت میں آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ کوئی دس منٹ چلنے کے بعد مجھے ایک چھوٹا سا ریستوران نظر آ گیا۔ میں نے اندر جاتے ہی چائے طلب کی۔ بھاپ اُڑاتی چائے کی خوشبو بے حد خوشگوار محسوس ہوئی۔ اس وقت وہ مجھے دُنیا کی سب سے بڑی نعمت معلوم ہو رہی تھی۔ چائے کے دو گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد ہی میں یکسوئی سے کچھ سوچنے کے قابل ہو سکا۔
چائے کی خالی پیالی نہ جانے کب تک میرے سامنے دھری رہی... اور نہ جانے کب بیرا پیالی اُٹھا کر لے گیا۔ میں اپنی ہی سوچوں میں ڈوبا رہا۔
اسلم کے معاملے میں قصوروار میں ہی تھا۔ وہ جس آگ میں جلا تھا وہ میری آگ تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک ایسی آگ تھی جس کے متعلق مجھے پوری طرح اندازہ بھی نہیں تھا۔ میں ان معاملات کی سنگینی سے پوری طرح باخبر نہیں تھا، جن میں میرے ساتھ اوڈل

نے بھی خود کو جھونک دیا تھا۔ مجھے اسلم کی آخری بات یاد تھی۔ اس نے مشورہ دیا تھا کہ ابھی میں بچے کو واپس نہ کروں بلکہ جلال سے کہہ دوں کہ کل کسی وقت بچہ اس کے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ اگر میں اس وقت اس کی بات مان لیتا تو جلال کے آدمی ٹیکسی پر اس طرح فائرنگ ہرگز نہ کرتے۔ وہ بچے کی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے اور یوں اسلم بھی زخمی ہونے سے بچ سکتا تھا، لیکن میں خود غرض ثابت ہوا تھا۔ میں نے اسلم کا مشورہ انسانیت کی سربلندی کے لیے مسترد نہیں کیا تھا بلکہ اپنے ضمیر سے بوجھ ہٹانے کے لیے کیا تھا، لیکن میری خود غرضی کا نتیجہ کیا نکلا۔ ضمیر پر بوجھ بڑھ گیا تھا۔ اب اسلم زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھا اور میں اس کے لیے صرف دعا ہی کر سکتا تھا۔ اگر خدانخواستہ زندگی ہار گیا تو پھر میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔ وہ بہت پیارا آدمی تھا۔ اس کا دل اس گداز سے آشنا تھا جو انسان کو عظمتیں عطا کرتا ہے۔ وہ اس دور میں بے لوث اور سچی محبت کی علامت تھا۔

دوسری طرف گلنار تھی جس نے اپنا گھر ہوتے ہوئے بھی دربدری قبول کر لی تھی۔ اس نے کراچی جانا قبول کر لیا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ وہاں کے اجنبی ماحول میں کس شدت سے میرا انتظار کرے گی۔ ساتھ ہی مجھے اس کی والدہ کا خیال آ گیا۔ اُن پر کیا گزر رہی ہو گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگلے روز اُن کے ہاں ضرور جاؤں گا۔ پھر مجھے وہ دشمنِ جاں نازو یاد آئی، جس کی وجہ سے یہ سب ہو رہا تھا۔ گلنار، مجو پہلوان، دارا، اسلم ... یہ تمام لوگ اسی کے سلسلے کی چند کڑیاں تھے۔ میں اس سے نہ ملا ہوتا تو آج چین سے ہوتا۔ مجھے بچوں کو پڑھانے کی معقول ملازمت مل گئی تھی۔ خود کفیل ہونے کے ساتھ ساتھ میں اپنے گھر پیسے بھی بھیجتا رہتا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا گھر... اپنی ماں یاد آ گئی۔ بے اختیار جی چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، گھر واپس چلا جاؤں، لیکن پیروں کی زنجیریں تھیں کہ بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔

میں نے چونک کر گھڑی پر نگاہ ڈالی تو حیران رہ گیا۔ جہاں انتظار کا ایک ایک پل برسوں کی طر گزرتا ہے وہاں اگر آدمی اپنی پسندیدہ ہستیو بارے میں سوچ رہا ہو... انھیں یاد کر رہا ہو تو و گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ یہ بات خاص یقین تھی کہ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔ میں اُٹھا اور بل ادا کر نکل آیا۔

باہر تاریکی بے حد سنگین اور دبیز معلوم ہو تھی۔ روشنی چھوڑ کر اندھیروں میں آیا جائے تو م ہوتا ہے۔ میں واپس چل دیا۔ چند لمحے بعد مجھے ا ہوا کہ اسٹریٹ لائٹس بجھی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ کہ تاریکی کا احساس چند لمحے بعد بھی دور نہیں ہو تھا۔ بہرحال میں اسپتال کی سمت بڑھتا رہا۔ میں سوچوں میں اس طرح ڈوبا ہوا تھا کہ مجھے پتہ چلا۔ حملے کے اچانک پن اور اپنی بے خبری کے مجھے سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ وہ تو غیر ارادی طو میں ذرا سا ترچھا ہو گیا تھا ورنہ جو چاقو میرے بازو کو چھید گیا تھا، میرے دل میں اتر گیا ہو میرے بازو میں جیسے آگ سی اُتر گئی۔ حملہ آو تھے اور سب کے ہاتھوں میں چاقو دبے ہوئے دوسرے حملہ آور نے وار کیا تو میں نے جھکائی د اس کے باوجود چاقو میرے پہلو سے چھلتا ہوا میں بری طرح گھر گیا تھا، لیکن میں نے فیصلہ کر لیا لوگوں کے لیے لقمۂ تر ثابت نہیں ہوں گا۔ وار ثابت نہ ہونے کے باعث حملہ آور لڑکھڑا گیا۔ میں پھرتی سے ٹانگ استعمال کی اور وہ ڈکراتا ہوا ہو گیا۔ ٹھوکر اس کی پسلی پر لگی تھی اور مجھے یقین وہ کافی دیر تک نہیں اُٹھ سکے گا۔ ساتھ ہی چھٹی نے مجھے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ عقب سے حملہ ہونے والا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور میرے سے لڑھکتا ہوا آگے جا گرا۔ میں اس کی خبر لینے کا کر ہی رہا تھا کہ عقب سے ایک کراہ سنائی دی ساتھ ہی نذیر کی آواز بھی گونجی "جمال بابو... تم خیریت سے ہو نا؟"

میں حیران رہ گیا نذیر کی مداخلت میری سمجھ

ہر تھی۔ میں تو اسے اسپتال میں چھوڑ کر آیا تھا، بہرحال س کی آمد سے یہ فائدہ ہوا کہ حملہ آور بھاگ کھڑے ہوئے۔ ذیر بھاگنے والوں کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے میری ف لپکا۔ "تم ٹھیک تو ہو جمال بابو؟" اس کے لہجے ں تشویش تھی۔

میرے بازو کا زخم خاصا سنگین تھا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ پہلو میں تو شاید خراش ہی آئی تھی۔ "اں... میں ٹھیک ہوں،" میں نے کہا۔ "بس بازو ہلکا سا زخم آیا ہے۔"

"چلو... فوراً ہسپتال چلو،" اُس نے کہا۔

"ضرور چلیں گے... لیکن ایک بوجھ اٹھانا پڑے گا۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے انداز یں اُلجھن تھی۔

"اسے اُٹھا کر چل سکو گے؟" میں نے بے ہوش دمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اُٹھا لوں گا، لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

وہ سادہ لوح آدمی تھا، اس بے ہوش آدمی کی ہمیت اس کی سمجھ میں کیسے آتی۔ "اسے انسپکٹر کے سپرد کریں گے،" میں نے اُسے سمجھایا۔ "یہی تو مجھ پر حملے کا ثبوت ہے اور یہی نشاندہی کرے گا کہ یہ حملہ کس نے کرایا ہے۔"

مجھے معلوم نہیں، بات اس کی سمجھ میں آئی یا نہیں، بہرحال اس نے بے ہوش آدمی کو کندھے پر لاد لیا... "عجیب مذاق ہے،" وہ بڑبڑایا۔ "اس خبیث کو دفن کرنے کی بجائے اُٹھانا پڑ رہا ہے۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ "کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے،" میں نے اسے دلاسہ دیا۔ "اب کھسک لو یہاں سے... اگر اس کے ساتھی آ گئے تو یہ بے چارہ تمھاری سواری سے محروم ہو جائے گا۔"

ہم دونوں اسپتال کی طرف چل دیے۔ میں نے دائیں ہاتھ سے بایاں بازو دبا رکھا تھا لیکن خون جاری تھا۔ اسپتال کے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے میں خاصی کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔

انسپکٹر کمپاؤنڈ ہی میں موجود تھا۔ شاید کمپاؤنڈ کی روشنی میں اسے میرا خون آلود بازو نظر آ گیا۔ وہ میری طرف جھپٹا۔ "کیا ہوا، کیا ہوا تمھیں؟"

نذیر نے اپنا بوجھ زمین پر دے پٹخا۔ "وہ اگر ہوش میں آنے والا ہو گا بھی تو مزید ایک گھنٹے کے لیے ہوش سے گیا۔" "ان خبیثوں نے جمال بابو پر حملہ کیا تھا، چاقو تھے سب کے پاس،" اس نے انسپکٹر کو بتایا۔ "باقی سب لوگ تو بھاگ گئے، یہی ایک ہاتھ لگا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔ تم جمال کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ،" انسپکٹر کے لہجے میں ہمدردی کا تاثر تھا۔

نذیر نے مجھے سہارا دینا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ "میں خود چل سکتا ہوں۔ فی الحال میرا بے ہوش ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو اس نے مجھے دیکھتے ہی بُرا سا منہ بنایا۔ بنانا بھی چاہیے تھا۔ اس کے لیے وہ کچھ کم منحوس رات نہیں تھی۔ اسپتال میں زخمیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے میرے زخموں کا معائنہ کیا اور سکون کا سانس لیا۔ "خدا کا شکر ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں،" اس نے کہا۔

زخموں کی ڈریسنگ کے بعد مجھے انجکشن دیا جانے لگا تو میں نے احتجاج کیا۔ "میں نیند کا انجکشن نہیں لوں گا۔ مجھے اسلم سے ملنا ہے۔"

ڈاکٹر شفقت آمیز انداز میں مسکرایا۔ "ضرور مل لینا... اور یہ نیند کا نہیں بلکہ طاقت کا انجکشن ہے۔ خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے نا،" اس نے وضاحت کی۔

میں مطمئن ہو گیا لیکن انجکشن لگتے ہی میری پلکیں بوجھل ہوتی چلی گئیں۔ میں نے اٹھنا چاہا۔ میں ہر قیمت پر اسلم سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھ سے اُٹھا نہیں گیا۔ میں ایک جھٹکے سے بستر پر گرا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

وہ یقیناً بے ہوشی کی ہی ساعتیں تھیں۔ ایسی بے خواب اور بے کیف نیند کو بے ہوشی ہی کہنا چاہیے جس سے بیدار ہوا تو میں نے خود کو ایمرجنسی وارڈ کے ایک بیڈ پر دراز پایا۔ صبح ہو چکی تھی اور نذیر میرے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔

"اسلم کا کیا حال ہے؟" میں نے بے تابی سے

دریافت کیا۔

اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔"اب تو ہوش میں ہے، وہ" اس نے کہا۔"اس نے رات اپنے وکیل کو بلوا لیا تھا۔ تمھیں بھی بہت یاد کرتا تھا۔ تمھارے زخمی ہونے کی خبر سن کر پریشان ہو گیا تھا۔"

میں نے بستر سے اٹھنا چاہا تو اس نے زبردستی مجھے لٹا دیا۔"لیکن اس وقت وہ سو رہا ہے۔" اس نے کہا۔"تھوڑی دیر بعد مل لینا۔"

"استاد اور شیدے کا کیا حال ہے؟"

"استاد تو ٹھیک ٹھاک ہے..."، وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ وہ مجھ سے نظریں چرا رہا تھا۔

"پوری بات کیوں نہیں بتاتے؟" میں برہم ہو گیا۔

"وہ... وہ جمال بابو... شیدا تو چلا گیا۔" کہتے کہتے اس کی آواز بھرّا گئی۔

میرا دماغ سُن ہو کر رہ گیا۔ میری آگ نے بالآخر پہلی بھینٹ لے لی تھی۔ ایک کڑیل جوان کا تندرست توانا بدن چاٹ لیا تھا۔ اسلم الگ زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھا۔"استاد کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر نے بہت منع کیا لیکن انھوں نے بستر چھوڑ دیا۔ وہ شیدے کی لاش کے ساتھ گئے ہیں۔"

"اور میں یہاں آرام سے سوتا رہا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس مرتبہ وہ مجھے لٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اُٹھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں اسپتال کے لباس میں ہوں۔ میں سلیپر تلاش کر ہی رہا تھا کہ رات والا ڈاکٹر آ گیا۔ شب بیداری کی وجہ سے اس کی آنکھیں متورم تھیں۔ چہرے سے تھکن عیاں تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔"کیا حال ہے، جمال؟"

"ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب۔ میں اسلم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔"میں اسی سلسلے میں آیا ہوں۔" اس نے کہا۔"اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اب کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا ہے۔ وہ کل رات اپنے وکیل سے بات کر چکا ہے اور اب تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

میرا دل جیسے ڈوب گیا۔ صبح ہی صبح کیسی د... خبریں سننے کو ملی تھیں۔ پھر میں نے سنبھالا لیا اور... بہکتے ہوئے ڈاکٹر کے پیچھے چلنے لگا تو میرے ق... میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ کچھ تو خون ضائع ہونے کی... سے اور کچھ پے در پے دو منحوس خبریں سننے کی... سے... میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔

اسلم کو دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا۔ اس کا... زندگی کی سرخی سے محروم تھا اور آنکھیں بجھی بجھی... تھیں، لیکن مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں... سے روشن ہو گئے۔ میں اس کے بیڈ کے قریب... کھڑا رہ گیا۔ اس نے اشارے سے مجھے قریب... میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈاکٹر جا چکا تھا اور کمر... ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ میں نے اس... لرزتا ہاتھ تھاما اور قریب بیٹھ گیا۔

"جمیل... میں جا رہا ہوں۔" اس کی آواز... مدھم تھی کہ اس قدر نزدیک ہونے کے باوجود... مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

"ایسی باتیں نہ کرو اسلم۔" میں نے دل شکس... کر کہا۔

وہ مسکرا دیا۔ اُف... اس کی وہ مسکراہٹ... کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ مسکراہٹ میرے د... اتر گئی۔ ہمہ رنگ جذبوں سے بھری ہوئی ایسی مع... مسکراہٹ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ "... وقت بہت کم ہے اور مجھے بہت بولنے کا شوق..." اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ لیکن اس وقت وہ ... لہجہ دل چیر دینے والا تھا۔"پلیز تم کچھ نہ بولنا۔ مجھے... دو۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" یکا یک... اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ وہ بے بسی سے گہری... سانسیں لیتے ہوئے مجھے دیکھنے لگا۔

میں خاموش رہا۔

"پہلی بات تو یہ... کہ میرے مرنے کے بعد... وکیل نجم انصاری سے مل لینا۔" اس نے اٹک ا... کر کہا۔"اس کا دفتر الفلاح بلڈنگ میں ہے۔... عدم موجودگی میں میرا منیجر ثاقب میرا کاروبار سنبھا... وہ بہت وفادار اور مخلص آدمی ہے۔ اور یار...

...ذاتی کام ہے۔ کرو گے نا؟" وہ بولتے بولتے جھجک... گیا۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

میرا جی چاہا، اس سے کہوں کہ ایسی باتیں نہ کرے۔ ...ابھی تو اسے بہت جینا ہے... بڑے کام کرنے ہیں۔ لیکن میں اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس ...نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وقت بہت کم ہے... اور ...اس قیمتی وقت کو رسمی باتوں میں ضائع نہیں کیا جانا ...چاہیے۔

"اسلم... یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو!" میں نے ...شکایت آمیز لہجے میں کہا۔"میں تمھارے لیے سب ...کچھ کر سکتا ہوں۔"

"لیکن یار... بات ہی ایسی ہے کہ زبان نہیں ...کھلتی... خیر... میرے بعد تم ریشماں کو جلد از جلد آزاد ...کرا لینا۔ اس سے کہنا، میں زندگی میں اسے اپنے لیے ...نہیں خرید سکتا تھا لیکن مرنے کے بعد تو خرید سکتا ہوں۔ ...اس کے بعد وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکتی ...ہے۔ میں نے اپنی وصیت میں اس کا انتظام کر دیا ...ہے۔ اس کو آزادی دلانے کے لیے بڑھیا کو منہ مانگی ...رقم دے دینا... اور ریشماں کو بتا دینا کہ وہ آخری ...لمحوں میں بھی میرے ساتھ تھی... میرے پاس تھی... ...اسے بتا دینا کہ میں نے تمھارا ہر ممکن خیال رکھنے کی ...کوشش کی تھی... اور ہاں جمال... اگر مجھ سے کوئی ...کوتاہی ہوئی ہو تو معاف کر دینا... ورنہ میں اس کے ...سامنے شرمندہ رہوں گا۔"

میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ میں ...نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی برستی آنکھوں پر رکھ ...لیا۔"کیسی باتیں کرتے ہو اسلم!" میں نے ہچکیوں کے ...درمیان کہا۔"معافی تو مجھے مانگنی ہے، تم سے... تم تو ...تم تو..." اس سے آگے مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔ زندگی ...میں پہلی بار ضبط کا ہر بندھن ٹوٹ گیا۔ یونہی نہ جانے ...کتنی دیر میں اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا رہا۔ پھر اچانک ...مجھے احساس ہوا کہ اس کا ہاتھ لکڑی کی طرح سخت ...ہو گیا ہے۔ میں نے چونک کر اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ...وہ مجھے ہی تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی ...چمک تھی، لیکن وہ چمک منجمد ہو چکی تھی۔ میں نے اس

کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور پھر باہر کی طرف دوڑا۔ ڈاکٹر مجھے راہداری میں مل گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اسلم کے کمرے میں گھسیٹ لیا۔

ڈاکٹر نے نبض دیکھی، دھڑکنیں چیک کیں۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔"مجھے افسوس ہے۔"

مجھے ایسا لگا، جیسے اسپتال کی عمارت میرے سر پر آ گری ہو۔ میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

ہوش آیا تو میں بستر پر دراز تھا۔ ایک نرس میرے قریب کھڑی تھی۔ لیکن یہ وہ بیڈ نہیں تھا جس پر میں نے رات گزاری تھی۔ یہ ایک علیحدہ کمرہ تھا، جس میں وہی ایک بیڈ تھا جس پر میں دراز تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ یاد ہی نہیں آیا، پھر میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

"لیٹے رہیے۔" نرس تیزی سے میری طرف لپکی۔

اٹھنے کی کوشش میں مجھے چکر آ گیا تھا۔ میں شدید نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ نرس مجھے آرام سے لیٹے رہنے کی تلقین کر کے باہر نکل گئی۔ چند لمحے بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھا... لیکن وہ رات والا ڈاکٹر نہیں تھا۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟" ڈاکٹر نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

"ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"انسپکٹر اشرف تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ انھیں بلوا دوں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر کمرے سے باہر چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہی انسپکٹر کمرے میں داخل ہوا جسے میں نے رات دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور پولیس افسر بھی تھا۔ وہ بے حد وجیہہ اور پُر وقار شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے کندھوں پر سجے ہوئے اسٹار سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایس پی ہے۔

"یہ ہمارے ایس پی صاحب ہیں۔" انسپکٹر نے اس کا تعارف کرایا۔

ایس پی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر جانے کے لیے کہا اور انسپکٹر چلا گیا تو وہ میری طرف

متوجہ ہُوا۔"میں تمھارے دُشمنوں کے متعلق تفصیل سے جاننا چاہتا ہوں۔" اس نے نرم لہجے میں کہا... "مجّو پہلوان پر ہاتھ ڈالنے والے کون ہیں؟" استاد کا نام لیتے ہُوئے اس کے لہجے سے عقیدت جھلکنے لگی۔

میں نے تفصیل سے اُسے سب کچھ سُنا دیا۔ دارا، اور پھر چودھری رحمت علی کے متعلق سُن کر وہ قدرے پریشان نظر آنے لگا۔

"اوہ... یہ اس سنڈیکیٹ کا معاملہ ہے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں انھیں جانتا ہُوں۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ بہت بارسوخ لوگ ہیں... خیر، دیکھا جائے گا۔ تمھیں ابھی کچھ دن یہیں اسپتال ہی میں [illegible] گا۔"

"لیکن [illegible] ٹھیک ہُوں۔" میں نے احتجاج کیا۔

"میں جانتا ہُوں۔ اُستاد سے اس سلسلے میں بات ہُوئی تھی۔ یہ اُنھی کی خواہش ہے۔ میں بھی اس سے متفق ہُوں۔ ابھی تمھارا باہر نکلنا مناسب نہیں۔"

"لیکن مجھے اسلم اور رشیدے کی تدفین میں شریک ہونا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے کام ہیں۔"

"اوہ... اسلم اور رشیدے کی تدفین۔" اس نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "لڑکے تم دو دن بے ہوش رہے۔ اُن دونوں کی تدفین تو پرسوں ہو بھی چُکی۔ جہاں تک دوسرے کاموں کا تعلق ہے تو وہ بعد میں نمٹائے جا سکتے ہیں۔"

اس کی بات سُن کر میں چکرا گیا۔ "لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ میں دو دن بے ہوش رہا ہُوں کیوں کیسے"

"کمزوری کی وجہ سے۔" اس نے جواب دیا لیکن وہ مجھ سے نظریں چُرا رہا تھا۔ اس کے انداز سے میں کچھ کچھ سمجھ گیا کہ کیا ہُوا ہے۔ استاد نہیں چاہتے تھے کہ میں باہر نکلوں۔ ڈاکٹروں نے مجھے جان بوجھ کر بے ہوش رکھا ہو گا۔ میرا خون کھول کر رہ گیا لیکن اس سے اُلجھنا حماقت تھی۔ بہرحال، میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب اسپتال میں نہیں ٹھہروں گا۔

ایس پی بغور مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ بھانپ گیا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہُوں۔ "ہم سب تمھاری بہتری کے لیے سوچ رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں سختی آ گئی بھی سُن لو کہ تم مجّو پہلوان کے حوالے سے میرے اہمیت رکھتے ہو۔ ورنہ اس وقت تم پولیس ک میں ہوتے۔ مجّو پہلوان میرے لیے باپ کی جگہ میرا رُواں رُواں اُن کے احسانوں میں جکڑا ہُوا ہے لیکن یہاں سے نکلنے کے بعد تمھاری زندگی کی نہیں دے سکوں گا۔"

میں خاموش رہا۔ مجّو پہلوان کے احسانات پر بھی بہت تھے۔

"بہتر ہو گا کہ تم یہیں رہو۔ اور ہمیں اپنے پر کچھ کام کرنے دو۔" اس نے مزید کہا اور جانے ارادے سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔

وہ چلا گیا تو میرے پاس فرصت ہی فرصت مجھے آیندہ کا لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ بہت سے کرنا تھے اور بہت سے ادھورے کام پورے تھے۔ ریشماں کا مسئلہ سب سے پہلے حل کرنا کے وکیل سے ملاقات کرنی تھی۔ اور سب سے اسلم اور رشیدے کے خون کا حساب لینا تھا۔ بنیا پر میں امن پسند تھا، کم از کم قانون شکن تو ہرگز تھا۔ لیکن اسلم سے ان چند دنوں میں ایسا تعلق ہُوا تھا جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ بھی میں خود کو اس کی موت کا ذمے دار سمجھتا اس کے بارے میں سوچ کر میرا بدن پھُنکنے لگ اور رگوں میں دوڑتا لہو جیسے لاوے میں تبد جاتا تھا۔ اگر استاد کا لحاظ نہ ہوتا تو میں اسپتال مزید ایک لمحے کے لیے بھی نہ ٹھہرتا۔ کافی سوچ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے استاد کا ا کرنا چاہیے۔

میں استاد کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ گئے۔ اُن کے چہرے سے بے آرامی اور تھکن ظا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس رات کے بعد سو نہ سکے ہوں۔ لیکن مجھے دیکھ کر اُن کے چہر بشاشت کی لہر دوڑ گئی۔ "کیسے ہو، برخوردار؟" نے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

"اُستاد..." میں نے احتجاج کرنے کے

استاد نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا ارہ کیا۔ "میں جانتا ہُوں، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" بولے۔ "تم مجھے اُستاد کہتے ہو اور میری عاید کی ئی ایک پابندی بھی قبول نہیں کرتے۔ گراں گزر ہے تم پر وہ پابندی، تم چاہتے ہو کہ میں اس سلسلے میں تمھارے سامنے وضاحتیں پیش کروں۔ گویا ھیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا۔" اُن کے لہجے میں شکایت آئی۔

میں کٹ کر رہ گیا۔ اُستاد کی بات درست تھی... ری بے تابی کی وجوہ اپنی جگہ... لیکن انھوں نے بڑے ن سے میرے متعلق فیصلہ کیا تھا۔ لہٰذا میرا رویّہ اُن کی شکنی کا باعث بن گیا تھا۔ میں شرمندگی کے زیرِ اثر پانی پانی ہو گیا۔ "میں... میں شرمندہ ہُوں استاد۔"

"بس... اب اس کی بھی ضرورت نہیں۔" انھوں شفقت آمیز لہجے میں ڈانٹ دیا۔

"یہ بھی نہیں پوچھیں گے کہ میں باہر نکلنے کے لیے بے تاب کیوں ہو رہا ہُوں؟"

"میں جانتا ہُوں۔" انھوں نے جواب دیا۔ "تم جن لات سے گزرے ہو، اس کے بعد کوئی شخص کتنا متحمل مزاج کیوں نہ ہو، انتقام پسند بن جاتا ہے۔ ھے اندازہ ہے کہ تمھارے سینے میں کیسی آگ بھڑک ی ہے۔"

"نہیں استاد... اس آگ کو تو میں تمھارے حکم دبا سکتا ہُوں، لیکن اسلم نے جاتے جاتے مجھے جو م سونپے ہیں، انھیں میں جلد از جلد پورا کرنا چاہتا ں، ورنہ تمھاری کہی ہوئی ہر بات میرے لیے حکم رجہ رکھتی ہے۔"

"اچھا... یہ بات میرے علم میں بھی نہیں تھی۔ میں ر شیدے کی تدفین وغیرہ میں اُلجھا رہا۔ یہاں کا ھ پتہ ہی نہیں چلا۔ اسلم نے آخر وقت میں کیا ا تھا؟"

میں نے اُنھیں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ "میں اسلم وکیل سے مل کر ریشماں والا معاملہ نمٹانا چاہتا ں۔ اس کے بعد میں تمھارے حکم پر اپنی پوری گی اسپتال میں گزار سکتا ہُوں۔"

استاد کے چہرے سے کرب جھلکنے لگا۔ "اس معاملے میں تو میں تمھیں نہیں روک سکتا، برخوردار..." انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ حامد تمھارے دُشمنوں کا صفایا کر ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ بہت پہلے سے اس گروہ کے چکر میں تھا۔ اب بات یہاں تک پہنچ گئی تو وہ بھی ان کی بیخ کنی کرنے پر تُل گیا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ لوگ کتنے خطرناک ہیں... اور ہم تمھیں کھونا نہیں چاہتے، برخوردار۔"

"یہ تو تمھاری محبت ہے، استاد!... لیکن میں اپنے فرائض سے مُنہ موڑ کر بل میں چھپ کر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ انصاف سے کہیں، اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"

استاد کی آنکھوں میں کش مکش کے آثار نظر آئے۔ پھر کچھ توقف کے بعد انھوں نے کہا۔ "میں تمھیں نہیں روکوں گا، لیکن اس سلسلے میں تم میری تجویز پر عمل کر لو تو بہتر ہو گا۔"

"حکم کریں استاد!"

"ایسا ہے کہ میں جا کر اس وکیل سے ملتا ہُوں۔ اس کے بعد اگر ضرورت پڑی تو اسے یہاں لے آؤں گا۔ البتہ دوسرا کام تمھیں خود کرنا ہو گا۔ اس کے لیے تم یہاں سے نکل سکو گے۔ ہم تمھاری حفاظت کا بندوبست کر دیں گے۔ لیکن وہ معاملہ نمٹاتے ہی تمھیں واپس آنا ہو گا۔"

میں چند لمحے سوچتا رہا۔ استاد کی تجویز بہت معقول تھی۔ اس پر عمل کرنے کی صورت میں اُن کا مان بھی رہ جاتا اور میرے ضمیر کا بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا۔ "ٹھیک ہے استاد۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ پھر اچانک ہی خیال آیا کہ استاد بھی زخمی ہو گئے تھے۔ اس ذہنی انتشار میں یہ خیال ہی نہیں رہا کہ مجھے ان کی خیریت دریافت کرنا چاہیے تھی۔ "اور استاد... آپ کے زخم کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

استاد نے شاید میرے لہجے میں تشویش محسوس کر لی۔ وہ مسکرائے۔ "زخم تو مجھے لگا ہی نہیں تھا۔" انھوں نے کہا۔ "خراش تھی معمولی سی... لیکن یہ ڈاکٹر لوگ نخرے بہت کرتے ہیں۔ پھر وہ حامد بھی بس بات بات پر پریشان ہو جانے والا آدمی ہے۔ اس کا

دل رکھنے کے لیے میں یہاں رُک گیا تھا... ورنہ ہم جیسے لوگ گھر اور قبر کے علاوہ کہیں آرام نہیں کرتے۔"

"پھر بھی استاد گولی کہاں لگی تھی؟" میری تشویش ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔

"ارے گولی کو یہ لگنا تھا میرا بازو گولی کو لگا تھا۔ اب تو پتہ بھی نہیں چلتا۔" استاد نے بایاں بازو ہلاتے ہوئے پُرمزاح لہجے میں کہا۔

اب مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ استاد کئی بار کسی حامد کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ "اور یہ حامد کون ہے استاد؟" میں نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"بچّہ ہے اپنا... بڑی عزت کرتا ہے۔" استاد نے مربیانہ لہجے میں جواب دیا۔ "وہ ایس پی، جو ابھی تمھارے پاس سے گیا ہے۔" انھوں نے مزید کہا۔

تو اس ایس پی کا نام حامد تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس پر استاد کے بڑے احسانات ہیں۔ تاہم میں دیکھ چکا تھا کہ اس کی وجہ سے ہم بہت سے تکلیفی مصائب اور پریشانیوں سے بچ گئے تھے۔

"میں اب چلتا ہوں۔ اور ہاں، مجھے اس وکیل کا نام اور پتہ دے دو۔ میں یہاں سے سیدھا اسی کے پاس جاؤں گا۔ جو کام کرنا ہے کر ہی لیا جائے۔ کل کا کیا پتہ کیسے حالات ہوں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں استاد۔" میں نے احتجاج کیا۔

"ٹھیک ہی تو کہتا ہوں۔ خیر، تم وکیل کے متعلق بتاؤ۔ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے انھیں وکیل کا نام اور پتہ دے دیا۔ وہ چلے گئے۔ اس بار میں بستر پر دراز ہوا تو قدرے پُرسکون تھا۔ دل و دماغ پر چھایا ہوا بوجھ ہٹ چکا تھا اور میں نسبتاً بہتر انداز میں سوچ سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد نرس آگئی۔ میں نے اس کے بارے میں ایک عجیب سی بات محسوس کی تھی۔ لیکن ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اس پر غور نہیں کر سکا تھا۔ وہ مجھ میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھی۔ "تمھاری ڈیوٹی کس وقت آف ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو اس وقت بھی چھٹی پر ہوں۔" اس نے مجھے ایک دلنواز مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کمرے سے مجھے ایک خصوصی وابستگی [...] یہ بات بھی نہیں کہ یہاں آنے والے ہر مریض کے [...] میرا رویہ یہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یوں ہوتا ہے [...] کسی مریض کی خاص طور پر خدمت کرنے کو جی چا[...] ہے۔" اب بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری [...]

"کوئی جذباتی وابستگی؟" میں بھی مسکرائے [...] نہ رہ سکا۔

"ہاں... یہی سمجھ لو۔" اس نے ایک ٹھنڈی [...] لے کر کہا۔ "میری ایک سہیلی بہت دنوں تک اس [...] کمرے میں رہی ہے۔"

"تو کیا تمھاری سہیلی..."

"نہیں... وہ زندہ ہے۔" وہ جلدی سے [...] "لیکن اس سے ملاقات ہوئے مدتیں گزر گئیں [...] نہ جانے کیوں تم سے بھی ویسی ہی اُنسیت محسو[...] ہوتی ہے۔"

"لیکن میں بیمار نہیں ہوں۔"

"اتنا تو میں بھی سمجھتی ہوں۔ میرا خیال ہے [...] کوئی اہم آدمی ہو اور تمھیں کسی مصلحت کے تحت [...] یہاں رکھا گیا ہے۔ لیکن میری اُنسیت کی وجہ [...] ہے۔" اس نے کہا۔

"میں تمھارے خلوص پر شک تو نہیں کر رہا [...]" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "کیا تمھاری وہ سہیلی [...] شہر سے چلی گئی ہے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"پتہ نہیں..." وہ اداس ہوگئی۔ "خیر... آرام کرو۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے پکار لینا [...] نام عابدہ ہے۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے آنکھیں مُو[...] اور اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ وہاں سوائے [...] کے اور کام بھی کیا تھا۔ میرے تصوّر میں اسلم او[ر] ریشماں کا چہرہ لہرا گیا۔ کس قدر عجیب تھے، وہ [...] ...انھوں نے محبت کو ایک نیا رنگ... نیا [...] دیا تھا۔ اسلم اُن لوگوں میں سے تھا جو اپنے [...] میں نئی نئی دُنیائیں تلاش کرتے ہیں۔ اس نے [...] کا مفہوم پا لیا تھا... بلکہ مجھے بھی سمجھا دیا تھا [...] طرف وہ ریشماں تھی جس نے مجھ سے ہمدردی [...]

[...] پھر بڑے اعتماد کے ساتھ اسلم کے پاس بھیج دیا تھا جیسے وہ [جا]نتی تھی کہ اسلم کس طرح میری پذیرائی کرے گا... اور [اس]لم نے ریشماں کا حوالہ سُننے کے بعد، بغیر کسی تجسس [کے] اس طرح میری پذیرائی کی کہ بالآخر اپنی جان بھی [مج]ھ پر نچھاور کر دی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے نہ جانے کیسے [پھ]ر وہی احساسِ جرم مجھ پر حاوی ہو گیا، جس نے [گل]نار کی بازیابی کی رات میرا وجود، خود میری نظروں [م]یں ہلکا کر دیا تھا۔ اسلم کی وہ بات اس طرح میرے دل پر نقش تھی کہ میں اُسے بھلا نہیں سکتا تھا۔ اس نے جلال کے بچے کے سلسلے میں کوئی مداخلت نہیں [ک]ی تھی لیکن گلنار کے ملنے کے بعد اس نے مشورہ دیا تھا کہ بچے کو ابھی واپس نہ کیا جائے۔ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا لیکن اس نے مدتوں ٹیکسی بھی چلائی تھی، اس لیے دُنیا دیکھی تھی۔ اس پیشے میں یوں بھی آدمی جلال جیسے لوگوں کے بارے میں، خوب جاننے لگتا ہے۔ لیکن میں نے اس کا مشورہ نظرانداز کر دیا تھا، محض اس لیے کہ میں اپنے ضمیر سے بوجھ ہٹانا چاہتا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں اسلم زندگی سے محروم ہو گیا تھا۔ اس کی صورت یاد آتی تو دل لرزنے لگتا۔ کیسا گڑیل جوان تھا... اگر جلال کے آدمیوں کی چلائی ہوئی گولیوں کی زد میں نہ آتا تو نہ جانے کب تک جیتا... کیسے کیسے ہنگامے جگاتا... کیسی کیسی دھومیں مچاتا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کڑیل جوان ہونا اس بات کی ضمانت کب ہوتا ہے کہ آدمی جلدی نہ جائے گا۔ موت بھی بڑی عجیب اور اٹل حقیقت ہے۔ عجیب تماشے دکھاتی ہے۔ شاید زندگی سے بھرپور لوگوں کو لے جانے میں اسے کچھ زیادہ ہی مزا آتا ہے۔

اگر وہ مہربان نرس مجھے نہ چونکا دیتی تو میں نہ جانے کب تک ایسی سوچوں میں گھرا رہتا۔ وہ میرے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔ اس کی آمد نے مجھے احساس دلایا کہ دوپہر ہوگئی ہے۔

کھانا بہت اچھا تھا۔ اگرچہ میں نے بے رغبتی سے ابتدا کی لیکن چند ہی لمحے بعد میں کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ شاید میں دو دن کا بھوکا ہوں۔ شاید اس لیے کہ میں اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور یقین کی کمی اس وجہ سے تھی کہ دو چار لقمے لینے کے بعد مجھے بھوک کا احساس ہوا تھا۔ اس سے پہلے مجھے بھوک محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔

کھانے کے بعد مسئلہ پھر وقت گزاری کا تھا۔ یہ پہلا دن تھا اور اسپتال مجھے قیدخانہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اب تو مجھے یہ سوچ کر ہول آرہا تھا کہ اسپتال میں نہ جانے کتنے دن گزارنے ہوں گے۔ ساتھ ہی مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ جیسے تیسے استاد کے حکم کی تعمیل ہی کر رہا ہوں۔ پھر مجھے ہوٹل کے اس کمرے کا خیال آگیا، جہاں دارا نے مجھے ٹھہرایا تھا۔ تھا تو وہ بھی قیدخانہ لیکن نسبتاً بہتر تھا۔

شام کے وقت استاد آئے تو اُن کے ساتھ ایک خوش پوش اور باوقار اجنبی بھی تھا۔ اجنبی نے خود ہی مجھ سے اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے نجم انصاری کہتے ہیں۔ میں اسلم سعید صاحب کا وکیل ہوں۔" اس نے کہا اور اپنا بریف کیس کھول کر کچھ کاغذات نکال لیے۔

"جی ہاں... آپ سے غائبانہ تعارف ہو چکا ہے۔" میں نے اداس لہجے میں کہا۔ "اسلم نے مجھے ہدایت کی تھی کہ آپ سے مل لوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو زحمت کرنا پڑی۔"

"کوئی بات نہیں! انھوں نے مجھے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔"

"اسلم نے مجھے آپ سے ملنے کے لیے کیوں کہا تھا؟"

"جس رات وہ زخمی ہوئے تھے، انھوں نے ہوش میں آتے ہی مجھے بلوایا تھا اور وصیت لکھوا دی تھی۔ اس وصیت کی رُو سے آپ اُن کے واحد وارث ہیں۔" اس نے دھماکا کیا۔

میں سُن ہو کر رہ گیا۔ اسلم جاتے جاتے مجھ پر اتنے احسان کر گیا تھا کہ میں اُن کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھ پر ذمّے داریوں کا بوجھ بھی بڑھ گیا تھا۔

"وصیت سے ہٹ کر انھوں نے آپ سے ایک مطالبہ بھی کیا ہے۔" وکیل نے مزید کہا۔ "انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ آپ مس ریشماں کو اپنے یا گلنار

صاحبہ کے ساتھ رکھیں اور انھیں گزر اوقات کے لیے ہر ماہ تین ہزار روپے دیا کریں۔"

"میرا ارادہ اُن کی خواہش سے سوا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ویسے انھوں نے مجھ پر میری بساط سے زیادہ ذمّے داری ڈال دی ہے۔ میں صرف دُعا ہی کرسکتا ہوں کہ اللّٰہ تعالیٰ مجھے ہمت اور استقامت دے تاکہ میں ان ذمّے داریوں کو پورا کرسکوں۔"

اس نے کچھ کاغذات میری طرف بڑھا دیے۔ "ان پر دستخط کر دیجیے تاکہ قانونی کارروائی مکمل ہو سکے۔"

میں نے خلافِ اصول اُن کاغذات کو پڑھے بغیر اُن پر دستخط کر دیے۔ اسلم نے اسے قابلِ اعتماد قرار دیا تھا اور میں اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا... دستخط کر کے میں نے کاغذات اس کی طرف بڑھا دیے۔

"بہت بہت شکریہ۔" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میں سمجھ سکتا ہوں کہ اسلم صاحب نے آپ کو کیوں منتخب کیا ہے۔"

"اسلم کی جائداد اور کیش میری تحویل میں کب آئے گا؟" میں نے اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ میرے بارے میں کوئی غلط تاثر بھی لے سکتا ہے، پوچھا۔ اس وقت مجھے صرف ایک ہی بات یاد تھی کہ مجھے پہلی فرصت میں ریشماں کی آزادی کا بندوبست کرنا ہے۔

"بینک بیلنس کے سلسلے میں تو کارروائی مکمل سمجھیے۔ آپ کو جتنی رقم کی ضرورت ہو کل مل سکتی ہے۔ البتہ فیکٹری اور زمینوں کا کام ایک ہفتے میں مکمل ہو سکے گا۔"

"اس صورت میں، میں آپ کو ایک زحمت دُوں گا۔ مجھے کل ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہوگی۔"

اس نے چیک بُک نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ "چیک لکھ دیجیے۔ میں کیش کرالوں گا۔" اس نے کہا۔

میں نے بلا جھجک چیک لکھا اور اس پر دستخط کر دیے۔ "یہ رقم استاد کل آپ کے دفتر سے وصول کر لیں گے۔" میں نے استاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ کل گیارہ بجے رقم آپ کو تیار ملے گی۔" وکیل نے جواب دیا۔

"اور ہاں۔" میں نے مزید کہا۔ "وہ... کیا نام [illegible] کا، جو اس وقت اسلم کے کاروبار کا منتظم ہے، [illegible] پرسوں میرے پاس بھیج دیجیے گا۔"

"آپ کا اشارہ شاید جمیل کی طرف ہے۔" [illegible] نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اُسے بتا دیجیے گا کہ غیر معمولی حالا[illegible] وجہ سے اُسے یہ زحمت کرنا پڑ رہی ہے، ور[illegible] خود آتا۔"

"بہت بہتر۔ میرے لائق اور کوئی خدمت [illegible]"

"بس جناب، بہت بہت شکریہ۔" میں [illegible] پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "اسلم نے آپ کا اور جمیل [illegible] جس انداز میں کیا تھا، اس سے مجھے پتہ چلتا [illegible] کہ وہ جاتے جاتے اپنے بدلے مجھے دو دوست [illegible] گیا ہے۔ بے حد مخلص دوست۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "آپ کی یہ [illegible] یک طرفہ نہیں ہے۔ مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا [illegible]" اس نے جواب دیا۔

وکیل کے جانے کے بعد میں اور استاد دیر [illegible] اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ہمیں احساس [illegible] ہم دانستہ ایک تکلیف دہ تذکرے سے بچ رہے [illegible] پھر باتوں ہی باتوں میں ریشماں کا تذکرہ چھڑ گیا [illegible] میں استاد کو اس کے اور اسلم کے تعلق کی کہانی [illegible] رہا۔ استاد حیرت سے مُنہ کھولے میری باتیں سُنتے [illegible] اگر میں خود ریشماں سے نہ ملا ہوتا تو میں خود اسے [illegible] الف لیلوی کہانی ہی قرار دیتا۔

... پھر استاد اگلے روز رقم لے کر آنے کا [illegible] اُٹھ گئے۔ تاہم جانے سے پہلے انھوں نے مجھے [illegible] سی ہدایات دیں، جن میں سے بیشتر مجھے پہلے [illegible] ازبر ہو چُکی تھیں۔ اُن کے جانے کے بعد نرس م[illegible] لیے کھانا لے کر آئی۔ کھانے کے بعد وہ چھوٹی [illegible] میڈیکل ٹرے میں انجکشن، سرنج اور رُوئی وغیرہ [illegible] اہتمام سے سجا کر لائی، جیسے وہ کھانے کا دو[illegible] کورس رہا ہو۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے اسے انجکشن [illegible] کرتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"انجکشن لگے گا۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"لیکن میں مریض تو نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

"آہستہ بولیے۔" اس نے تنبیہہ کی۔ "اسپتال [illegible] میں رہنے کے لیے آدمی کو کسی حد تک مریض بننا [illegible] ہی پڑتا ہے۔ یوں بھی آپ کے اعصاب منتشر ہو [illegible]ہے ہیں۔ یہ انجکشن آپ کو سکون بخشے گا۔"

میں خاموش ہو گیا بلکہ تن بہ تقدیر ہو گیا۔ مجھے [illegible] نہیں کہ انجکشن لگنے کے کتنی دیر بعد مجھے نیند آئی [illegible] تھی۔ البتہ یہ یاد ہے کہ صبح جب آنکھ کھلی تو میرا کمرہ [illegible]دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ نرس ایک طرف بیٹھی تھی اور بہت ترو تازہ دکھائی دے رہی تھی۔ شاید وہ بھی [illegible]ات بھر پُرسکون نیند سوئی تھی۔ اس سے ہرگز [illegible]ری یہ مراد نہیں کہ میں بھی پُرسکون نیند سویا تھا... [illegible] کیونکہ خواب سے محروم نیند کو میں غشی یا بے ہوشی ہی [illegible] کہہ سکتا ہوں۔ مسکّن ادویات کے زیرِ اثر ہمیشہ بڑی [illegible] سپاٹ اور بے تاثر نیند آتی ہے اور سو کر اٹھنے کے [illegible] بعد آدمی اعصابی طور پر خود کو شل سا محسوس کرتا [illegible]ہے۔ اس وقت میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

نرس مُنہ ہاتھ دھونے کے سلسلے میرے ساتھ [illegible] غالباً تیمار دارانہ برتاؤ کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ میں نے [illegible] بہ ہزار دقت اسے سمجھا بجھا کر اسپتال کے اسٹاف [illegible] روم کا رُخ کیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں اپنے [illegible] کمرے میں آیا تو ناشتہ موجود ملا۔ مجھے ناشتہ کرا کے نرس [illegible] واپس چلی گئی۔

میں کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا اور کڑھتا رہا۔ ذرا سی [illegible] فراغت میسر آتی تھی تو قید کا احساس ستانے لگتا [illegible] تھا۔ دوسری طرف استاد مجوّ کا فرمان میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا تھا۔ کچھ دیر یونہی کمرے کے چکر [illegible] لگانے کے بعد میں بستر پر دراز ہو گیا۔ اور میں بھلا [illegible] کر بھی کیا سکتا تھا۔

ساڑھے بارہ بجے کے قریب اُستاد بریف کیس [illegible] اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں انھیں دیکھ [illegible] کر اٹھ بیٹھا۔ انھوں نے اپنے لیے کرسی گھسیٹی اور [illegible] بریف کیس مجھے تھما کر بیٹھ گئے۔ "کیا حال ہے برخوردار؟" انھوں نے پوچھا۔

"آپ پوچھ رہے ہیں مجھ سے؟" میں نے شکایتاً کہا۔ "ان دیواروں میں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔"

"دم کو کبھی کبھی گھُٹنے کی مشق بھی کرنی چاہیے۔" انھوں نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔ "اسی کو حبسِ دم کہا جاتا ہے... یوگی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس کے بڑے فوائد ہیں۔ اندر کی مشینری پر زنگ نہیں لگتا۔ جسم اور روح سے وقت کے ڈالے ہوئے تمام نشانات مٹ جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں اُستاد۔ کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ آپ نے پہلوانی کو نظر انداز کر کے مزاح نگاری شروع کر دی ہوتی تو بڑے بڑوں کے چراغ گُل ہو گئے ہوتے۔"

"اسی لیے تو میں نے ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ میں چراغ جلانے والا ہوں، بجھانے والا نہیں۔" انھوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں نے بریف کیس کھول کر اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر مطمئن ہو کر اسے بند کر دیا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"ریشماں کی طرف جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں یہیں رُک کر تمھارا انتظار کروں گا۔"

میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ میرے ساتھ نہ سہی، کچھ فاصلے سے میرے پیچھے چلنے کی ضد کریں گے۔ یہی وجہ تھی کہ میں انھیں قائل کرنے کی دلیلیں گھڑ رہا تھا۔ نہ جانے ان کے ذہن میں کیا تھا۔ میں کچھ مشکوک سا ہو گیا۔ وہ اتنی آسانی سے ماننے والے تو نہیں تھے۔

"تو میں جاؤں!" میں نے اس بچّے کی طرح کہا، جس نے چھٹی سے پہلے چھٹی مل جانے کی خوشخبری سُن لی ہو اور اسے اس خوشخبری پر یقین نہ آ رہا ہو۔

انھوں نے اثبات میں سر ہلایا اور میں نے تیزی سے بستر چھوڑ دیا۔ وہ کرسی سے اٹھے اور بستر پر لیٹ گئے۔ "بہت تھک گیا ہوں برخوردار!" وہ پاؤں پھیلاتے ہوئے بولے۔ "تم نے تو خوب آرام کر لیا۔ اب میری باری ہے۔ اور ہاں... اپنا خیال رکھنا سب

ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ فی امان اللہ۔"

میں نے انھیں خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر آگیا۔

ٹیکسی میں نے اسلم کے مکان سے کچھ دُور رکوائی اور پیدل ہی چل دیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گلی میں سناٹا تھا۔ غالباً علاقے کے مرد اپنے اپنے کام پر اور پڑھنے والے بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ اسلم کے مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے قدم رُک گئے۔ دروازہ مقفل تھا۔ اسلم ہی اسے مقفل کر کے گیا ہوگا۔ میں ایک انجانی سی کیفیت میں دروازے کی طرف بڑھ گیا اور قریب جا کر تالے کو چھُوا۔ میرے ذہن میں اسلم سے تعارف کا وہ پہلا منظر گھوم گیا، جب آدھی رات کو میں نے اس کے دروازے پر پہلی دستک دی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے دروازہ کھُل گیا۔ سامنے وہ کشادہ سا صحن تھا اور اس سے پرے وہ بڑا سا کمرہ... اسلم جیسے میرے روبرو تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں پہلے اُلجھن... پھر اپنائیت اور تپاک جھلکنے لگا... اور یہ سب کچھ ایک نام کی بدولت ہوا... ریشماں کے نام کی بدولت!

"جب آپ نے کہہ دیا کہ آپ کو ریشماں نے بھیجا ہے تو بس... اس کے بعد کسی سوال کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ اگر میں نے کوئی سوال کیا تو میرے خیال میں یہ ریشماں کی توہین ہوگی۔" اس کی آواز میری سماعت میں گونجی اور میرا جسم سنسنا کر رہ گیا۔

اچانک ہی منظر بدل گیا۔ وہ میری زندگی کے سب سے کٹھن مرحلے میں میرے ساتھ تھا۔ میں ٹیکسی کے قریب کھڑا تھا۔ جلال گلنار کو لے کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ "میری مانو تو بچہ ابھی اس کے حوالے نہ کرو۔" میری سماعت سے اس کی بازگشت ٹکرائی۔ "کہہ دینا کہ بچہ کل تمھارے گھر پہنچا دیا جائے گا۔"

منظر پھر بدل گیا۔ اسلم ٹیکسی چلا رہا تھا۔ میں عقبی نشست پر گلنار سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے دلاسہ دے رہا تھا۔ ٹیکسی چوراہے پر پہنچ رہی تھی۔ پھر اچانک گولیوں کی شکل میں، موت برسنے لگی۔ ایکسیلیٹر پر اسلم کے پیر کا دباؤ بڑھ گیا۔ ٹیکسی... زخمی ٹیکسی مجھے اور گلنار کو، موت کی سرحد سے نکال کر عافیت کی شہر میں لے آئی تھی۔ "تم ٹھیک تو ہو اسلم؟" میں نے کر پوچھا تھا۔

"ہاں... میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب تھا، لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے لہجے سے والی اذیت نہ چھپا سکا تھا۔

... پھر مجھے اس کے سینے پر کھلنے والے پھولوں کی بہار دوبارہ یاد آگئی... وہ مسکرا رہا ... وہ ٹیکسی کا رُخ اسپتال کی طرف کرنے پر تیار تھا۔ گلنار کی بحفاظت واپسی اس کے نزدیک مقدم تھی۔

اچانک ہی طلسم ٹوٹ گیا۔ میری نظریں در کے تالے پر جم گئیں۔ اس کی چابی نہ جانے کہاں کہیں بھی ہو، اب وہ مجھے ... بلکہ کسی کو بھی نہیں گی۔ زندگی کے دروازے پر جب موت کا تالا لگتا تو اس کی چابی ہمیشہ کے لیے کہیں کھو جاتی ہے، کیو اس تالے کو کبھی کھلنا نہیں ہوتا۔

میں نے حسرت سے اس تالے کو چھُوا... یوں اُس دو دن کے آشنا کے سینے پر کھلنے والے پھولوں کو چھو رہا ہوں، جس نے ان دو ہی دنوں برسوں کے تعلقات کی حدیں پھلانگ لی تھیں جزوِ جاں ہو گیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے چہرے پر کا احساس ہوا۔ میں نے ہاتھ پھیرا۔ وہ آنسو تھے۔ نے انھیں بڑی نرمی اور احترام سے پونچھا اور پھر اپنے سامنے پھیلا کر دیکھے۔ اس شفاف سیّال ہلکی سی سُرخی تھی... خون کی سرخی... لیکن نہیں، میرا وہم تھا۔ میں آنکھوں کے راستے خون بہانے قائل ہی نہیں تھا۔ البتہ اسلم جیسے دوست کے میں اس کے قاتلوں کی... اور اگر وہ نہ مل سکے تو شریانوں کا مُنہ ضرور کھول سکتا تھا۔ یک لخت میر آنکھیں جلنے لگیں۔ رگوں میں چنگاریاں سی اُڑ لگیں۔ اضطراب کچھ اور بڑھ گیا۔ میں نے الوداعی نظر سے اس مقفل مکان کے در و دیوار کو دیکھا اور آ بڑھ گیا۔

اس دفعہ میرے قدم اس دومنزلہ مکان کے سا

کے، جہاں میں ایک بار پہلے بھی آچکا تھا، البتہ پچھلی حالات قدرے مختلف تھے۔ اس وقت میں رات اندھیرے میں یہاں آیا تھا اور رات کے اندھیرے میں رخصت بھی ہو گیا تھا۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ریشماں نے کھولا تھا۔ اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور بغیر کہے پلٹ گئی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی سے کر ہم صحن میں پہنچے۔ ریشماں نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ "آئیے، آجائیے۔" اس نے مترنم لہجے میں کہا۔

وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور اس میں زیادہ سامان یں تھا۔ ایک بستر، دو کرسیاں، ایک بوسیدہ سی ھار میز اور کپڑوں کی ایک الماری۔ بس، کُل یہی ثات تھی وہاں۔ ریشماں نے اپنا آنچل درست کیا ر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "تشریف رکھیے۔" اس کے جے میں شائستگی تھی۔

میں بیٹھ گیا۔ میں وہاں چلا تو آیا تھا لیکن اب اس ہو رہا تھا کہ میرا کام کس قدر مشکل ہے۔

کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھر ریشماں نے اس خاموشی کو توڑا۔ "پریشان نہ ہوں۔ دل چھوٹا کریں۔ ہر زندگی کا اختتام موت ہی ہوتا ہے۔ یہ ئی نئی بات نہیں ہے۔" اس نے بے حد گمبھیر لہجے ں کہا۔

میں نے چونک کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اں موت کی سی خاموشی تھی۔ البتہ آنکھوں کی گہرائیوں ں شدید کرب مچل رہا تھا، لیکن وہ کرب صحرا کا کرب ا... سمندر کا نہیں۔ "تت... تمھیں کیسے پتہ چلا؟" ری زبان لڑکھڑا گئی۔

"جو لوگ تفہیم پر، تسلیم کو فوقیت دیتے ہیں، اُن لیے تفہیم کے مرحلے خود بخود آسان ہو جاتے ہیں۔" اس لہجے میں اداسی اُتر آئی۔

میں اس کی بات نہیں سمجھ سکا لیکن مجھ میں ضاحت طلب کرنے کی جرأت بھی نہ تھی۔ "میں ھارے لیے اس کا آخری پیغام لایا ہوں۔" میں نے تہ لہجے میں کہا۔

"اس کا پیغام میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے... کیا کہا تھا اُس نے؟"

میں نے اسلم کا پیغام اس تک منتقل کر دیا۔ اس کا ضبط بھی میرے لیے ایک سبق کی حیثیت رکھتا تھا۔

"ہاں، اب ٹھیک ہے۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "اب وہ میرے دام چُکا لے یا تم چکاؤ، کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"کیوں؟" میں نے بلا ارادہ پوچھ لیا۔

اس نے نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ واقعی... اسلم نے سچ کہا تھا۔ وہ لڑکی اپنی کشش کے سوئچ سے واقف تھی... اسے آن آف کرنا اس کے اختیار میں تھا۔ اس وقت ایک لمحے کے لیے اس نے سوئچ آن کر دیا تھا۔ اس ایک لمحے... میں قسم کھا سکتا ہوں کہ اس پل میں وہ دُنیا کی سب سے زیادہ پُرکشش لڑکی تھی۔ وہ نسوانی حُسن کا شاہکار تھی... وہ مکمل تھی... سراپا حُسن... اور اس حُسن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے سراپا پر جیسے تقدس کی بارش ہو گئی تھی۔ میں احتراماً نظریں جھکا کر رہ گیا۔

"کسی غلام کو اپنے لیے خرید لینا اور بات ہے۔ غلام کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آقا بدل گیا۔" وہ مترنم لہجے میں گویا ہوئی۔ "لیکن غلام کو خرید کر آزاد کر دینا ایسا احسان ہے جس سے کوئی غلام انکار کر ہی نہیں سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ آزاد ہو کر اپنی خوشی سے اپنے محسن کا دائمی غلام بن جائے۔"

اس کے الفاظ، اس کی آواز اور اس کا لہجہ میری روح میں اُتر گیا۔ مفاہیم کے نئے نئے در کھلنے لگے، جن کے پیچھے ایک عجیب، بے حد حسین اور وسیع کائنات تھی، جس کا ذرہ ذرہ محبت... محبت پکار رہا تھا۔ پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آیا کہ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد درحقیقت خُدا سے محبت کرنا ہے۔ یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ خُدا سے محبت کرنا کتنا مشکل کام ہے... اور اس مشکل کام کو اس نے کتنا آسان بنا دیا ہے کہ خُدا سے محبت کرنا ہے تو اس کے بندوں سے محبت

کرد۔ یہ بھی سمجھ میں آیا کہ یہ آسانی بھی کس قدر دُشوار ہے۔ محبت اور محبت کے گمان میں کتنا فاصلہ ہے۔

"ٹھیک ہے، میں ساتھ چلوں گی۔" اس نے مجھے خاموش پاکر کہا۔ "اچھا اب مجھے اس کے متعلق بتاؤ۔ کیسے گیا وہ؟ سرخرو ہوکر نا؟ اس نے اپنی زندگی سُرخرو ہوکر ہی گزاری تھی۔"

"وہ... وہ تمہارے کہنے پر... میری خاطر میرے بدلے..." مجھ سے کچھ کہا نہیں جارہا تھا، میرا گلا رندھ گیا تھا۔

"بس ٹھیک ہے۔ کافی ہے۔" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ان میں بے پناہ چمک تھی... چاندنی جیسی ٹھنڈی ٹھنڈی چمک۔ جیسے چاند بادلوں کا گھونگٹ ہٹاکر چپکے سے سامنے آجائے۔ "بادُا اسلم! تم نے مجھے میری قیمت سے زیادہ ادا کرکے خرید لیا۔" اس نے سرگوشی میں کہا، لیکن اس لمحے میری سماعت حیرت انگیز حد تک حساس ہوگئی تھی۔

"چائے لاؤں آپ کے لیے۔" وہ جانے کے لیے پلٹی۔

"نہیں ریشماں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ چونک کر پلٹی تو اس کی آنکھوں میں حیرت کے علاوہ بھی کچھ تھا جسے میں سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

"تو کیا میرا آقا بدل رہا ہے۔ میں زندگی بھر غلام ہی رہوں گی۔" اس نے بڑے یاس انگیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں، میری بہن... میری ریشماں۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا۔ "میرے جیتے جی تو کبھی دھوپ میں نہیں رہے گی۔ میں تیرا سائبان ہُوں پگلی۔ حبس بڑھتا ہے اور بارش نہ ہو تو قیامت کا طوفان آجاتا ہے۔ آ میری بہنا، اپنے بھیّا کے سینے کو بھگو دے۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے مشکوک نگاہوں سے میری آنکھوں میں جھانکا، پھر میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ کچھ لمحے بعد... میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے بھیگتے سینے نے مجھے احساس دلایا یا اس کے بدن کی پیہم لرزش نے... بہرحال مجھے پتہ چل گیا کہ وہ رو رہی ہے... بے آواز! آپ نے کبھی بے آواز رونے کا کرب محسوس کیا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ اگر ایسے آنسو... چٹان پر ڈال دیے جائیں تو چٹانیں بھی ٹوٹ جائیں۔ وہ بڑے ضبط کے... بڑے صبر کے آنسو ہوتے وہ تو خونِ جگر ہوتا ہے۔

نہ جانے کتنی دیر تک وہ روتی رہی اور مے سینے میں دراڑیں پڑتی رہیں۔ مجھے احساس نہ میں بھی رو رہا ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی ڈور سے بندھے، ایک ہی تنکے کا سہارا لیے، ایک ہی سے گزر رہے تھے۔ معلوم نہیں کتنی دیر بعد طو تھما اور ریشماں نے اپنی دُھلی دھلی آنکھوں سے دیکھا۔ "تم... تم سچ مچ میرے بھیّا ہو نا؟" اس لہجے میں عجیب سا خوف تھا۔

"تم... تم شک کرنے والی تو نہیں لگتیں" میں نے شکایت کی۔

"بِن مانگے دولتیں ملنے لگیں تو ایسا ہی ہو"

"تم میری اکلوتی بہن ہو۔ تم سے پہلے میں نعمت سے محروم تھا۔" میں نے جسم و جاں کی تما سچائیوں سے جواب دیا۔

وہ مسکرادی۔ میں نے زندگی میں اتنی خلوص مسکراہٹ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"میں چائے لاتی ہوں بھیّا۔" اس نے کہا پلٹ کر چل دی۔

اس بار میں نے اسے روکنا مناسب نہیں اس کے جانے کے بعد میں نے رومال نکال کر بھیگا ہُوا چہرہ پونچھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ چن لمحے بعد آہٹیں سُنائی دیں اور اور وہ عورت دو کے ساتھ کمرے میں داخل ہُوئی جس نے پہلی با ریشماں سے متعارف کرایا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر سی گئی۔ "اوہ بابو... تم یہاں کیسے؟ اس دن تو نکل بھاگے تھے جیسے ہم تمہارے چالیسویں کا پلا بنا رہے ہوں۔" اس نے میرے بریف کیس کو للچا نظروں سے دیکھتے ہُوئے کہا۔

"میں ریشماں کو لینے آیا ہُوں۔" میں دو بات کرنے کا فیصلہ کرکے اٹھ کھڑا ہُوا۔

"وہ کس خوشی میں؟" عورت ہاتھ نچا کر بو

"لگتا ہے یارانہ گانٹھ لیا ہے میرے ہیرو

ک نوجوان نے تبصرہ کیا۔

اسی لمحے میرا اُلٹا ہاتھ اس کے مُنہ پر پڑا۔ دوسرا تیزی سے میری طرف بڑھا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ریشماں کے بارے میں ایک ناپاک لفظ مُنہ سے نکلا تو تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔" میں نے اسے تنبیہہ کی۔ "اور اب مجھے اپنی ماں سے بات کرنے دو۔" یہ کہہ کر میں عورت کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "میں سودا کرنے آیا ہوں۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "میں تمھیں طلب سے بھی زیادہ دے رہا ہُوں، لیکن میں تم جیسے لوگوں کی فطرت جانتا ہوں۔ اس بنیاد پر تم مطالبہ بڑھا بھی سکتے ہو۔ یہ بات یاد رکھنا، میری یہ پیش کش آخری ہوگی۔ میں تمہارے سامنے دو صورتیں رکھ رہا ہوں۔ اس بریف کیس میں ایک لاکھ روپے ہیں۔ یہ لے لو اور ریشماں میری ہوگی۔"

جوانوں کے منہ کھُل گئے اور عورت کی آنکھوں سے حرص جھانکنے لگی۔ "لیکن یہ تو..." اس نے احتجاج کرنے کی کوشش کی۔

"ابھی تم نے دوسری صورت نہیں سُنی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "دوسری صورت میں میں ایس پی حامد مرزا کے توسط سے اسے بلا قیمت حاصل کرلوں گا۔"

"کیسے حاصل کرلوگے؟" تھپڑ کھانے والا مُنہ بگاڑ کر بولا۔ "اور یہ ایک لاکھ روپے لے کر تو تم یہاں سے جا بھی نہیں سکتے۔ بریف کیس یہیں چھوڑ دو اور زندگی کی خیر مناتے واپس چلے جاؤ۔ پتہ نہیں کتنے ایس پی ہماری جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔"

"اگر تم دونوں مل کر مجھے ہاتھ بھی لگا دو تو یہ ایک لاکھ روپے تمہارا انعام۔" میں نے مسکراتے ہوئے انھیں چیلنج کیا۔

اسی لمحے ریشماں چائے لے کر کمرے میں داخل ہُوئی۔ ان سب کو دیکھ کر وہ کچھ پریشان سی نظر آئی لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ مجھے چائے کی پیالی دے کر وہیں کھڑی ہوگئی۔

"ریشماں... تم باہر جاؤ۔" عورت نے اس سے کہا۔

ریشماں نے میری طرف دیکھا اور میری نظر کا اشارہ پاکر باہر چلی گئی۔

دونوں جوان مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔

"بولو، کیا کہتی ہو؟" میں نے عورت سے پوچھا۔

"سوچ کر بتاؤں گی۔"

"نہیں... فیصلہ ابھی ہوگا۔"

"یہ اتنا اکڑ کیوں رہا ہے؟" دوسرے جوان نے کہا۔

میں سمجھ گیا، ان پر یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ میں ان کی پسندیدہ زبان بھی بول سکتا ہوں، چنانچہ میں تیزی سے اس کی طرف جھپٹا۔ وہ دونوں دائیں بائیں ہٹے۔ میں نے دائیں جانب والے کے گردے کو لات کا نشانہ بنایا اور ساتھ ہی میرا گھونسہ دوسرے کے مُنہ پر پڑا۔ ٹھوکر کھانے والے کے متعلق میرا اندازہ تھا کہ کم از کم ایک گھنٹے کے لیے ناکارہ ہوگیا ہے۔ گھونسہ کھانے والا لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"میری پیش کش اب بھی قائم ہے۔ مجھے ہاتھ لگا دو تو ایک لاکھ تمہارے۔" میں نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

گھونسہ کھانے والے کی آنکھوں سے خوف ظاہر ہو رہا تھا۔ ان کے بارے میں میرا اندازہ درست تھا۔ وہ جس قماش کے لوگ تھے، ان میں بہادری نام کی شے مفقود ہوتی ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔

"بریف کیس مجھے دے دو۔" معاً عورت نے کہا۔ "اور ریشماں کو لے جاؤ۔"

میں نے بریف کیس غیر مقفّل کرتے ہُوئے اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بریف کیس کھول کر نوٹوں کا جائزہ لیا۔ گھونسہ کھانے والا بھی اس کے قریب آگیا۔ میں چائے پینے میں مصروف ہوگیا۔

رقم کی طرف سے مطمئن ہوکر عورت نے ریشماں کو پُکارا۔ وہ فوراً ہی آگئی۔ شاید دروازے ہی سے لگی کھڑی تھی۔ "ان کے ساتھ جاؤ، اب تم آزاد ہو۔" اس نے کہا۔ "اپنا سامان باندھ لو۔"

"سامان کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم جارہے ہیں۔"

چند لمحے بعد ہم دونوں باہر نکل آئے۔ ٹیکسی حاصل کرنے کے لیے ہمیں کچھ دُور چلنا پڑا۔ ٹیکسی والے کو میں نے انار کلی چلنے کو کہا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد مجھے اندازہ ہُوا کہ آتے ہوئے مجھ سے بے پروائی سرزد ہوئی تھی... آتے وقت بھی نیلے رنگ کی ایک کار نے میری ٹیکسی کا تعاقب کیا تھا۔ لیکن اس دفعہ ٹیکسی کے پیچھے اس گاڑی کو دیکھ کر میں چوکنا ہو گیا کیونکہ اس وقت ریشماں بھی میرے ساتھ تھی۔

انار کلی پہنچ کر میں نے ٹیکسی والے کو ادائیگی کی۔ نیلی کار کچھ فاصلے پر پارک کر دی گئی تھی۔ اس میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نیچے اُتر آیا۔ اس کا چہرہ جانا پہچانا تھا۔ ذہن پر زور دینے سے یاد آیا کہ وہ انسپکٹر تھا، جس سے اسپتال میں ملاقات ہوئی تھی۔ ایک تو ملاقات عجیب حالات میں ہوئی تھی، اس پر ستم یہ کہ اس وقت وہ وردی میں بھی نہیں تھا۔ کسی ایسے شخص کو وردی کے بغیر پہچاننا یوں بھی آسان نہیں ہوتا جب کہ آپ نے اسے صرف ایک مرتبہ وردی میں دیکھا ہو۔ بہرحال اسے پہچان کر ذہن کی تمام گرہیں کھل گئیں۔ استاد مجّو کا سکون و اطمینان بھی میری سمجھ میں آ گیا۔

میں نے ریشماں کا ہاتھ تھاما اور اسے ریڈی میڈ ملبوسات کی دکان پر لے گیا۔ اس کے لیے ایک سادہ سا جوڑا خود میں نے منتخب کیا۔ وہ حیران نظر آ رہی تھی۔ پھر میں نے اسے چپلیں دلائیں اور ایک ٹیکسی کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیور کو اسپتال کا پتہ بتایا۔ نیلی کار بھی اسٹارٹ ہو گئی تھی۔

"ان کی کیا ضرورت تھی بھیّا!.." ریشماں نے کپڑوں کے لفافوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ضرورت تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں کی ہر ناخوشگوار یاد سے پیچھا چھڑا لو۔" میں نے جواب دیا، "ویسے... کیا یہ کپڑے پسند نہیں؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اس نے مجھے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ "آپ کی دی ہُوئی ہر چیز میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔" اس نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

ہم اسپتال کے دروازے پر ٹیکسی سے اُترے۔ نیلی کار گزرتی چلی گئی۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔ پھر میں [ریشماں] کا ہاتھ تھام کر اسپتال میں داخل ہو گیا۔

استاد اب بھی بستر پر دراز تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ہماری آہٹ سنتے ہی انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ریشماں کو دیکھتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھے۔ "ارے... یہ تو بڑی کومل سی گڑیا ہے... آ... ادھر آ میری بٹیا!" انھوں نے بڑی محبّت سے [کہا]۔

میں نے ریشماں کی طرف دیکھا۔ وہ جھجک رہی [تھی]۔

"ریشم... پگلی... یہ میرے استاد ہیں... اور باپ کی [جگہ] رکھتے ہیں میرے لیے۔" میں نے کہا، پھر میں استاد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "استاد۔ آپ ذرا اپنی بیٹی کو سنبھالیں۔ میں ایک فون کر کے آیا۔"

استقبالیہ سے میں نے دارا کو فون کیا اور اسے بتایا کہ میں ریشماں کو لے آیا ہوں اور اسے بھی [گلنار] کے پاس کراچی بھیجنا چاہتا ہُوں، لیکن اس کے دوست کو زیادہ زیرِ بار کرنا بھی نہیں چاہتا۔

دارا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو یار۔ میرا دوست بھی یاروں کا یار ہے۔ کوئی [فکر] نہ کرو۔ میں تمام بندوبست کر دوں گا۔ مجّو پہلوان [کے] ہاں سے میں اسے لے لوں گا اور خود جا کر ایئرپورٹ چھوڑ آؤں گا۔ اور ہاں... کراچی سے ٹیلی گرام آ گیا [ہے]۔ گلنار وہاں پہنچ گئی ہے۔ اب کیا پروگرام ہے؟"

"پروگرام ریشماں کے جانے کے بعد شروع ہو[گا]۔ تم بے فکر رہو۔ اب تم ہر پروگرام میں شریک ہو گے۔" میں نے اسے تسلّی دی۔

"تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی ٹیلی گرام دے رہا ہوں۔ ٹکٹ وغیرہ لے کر دس بجے تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"او کے۔" میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

میں کمرے میں پہنچا تو ریشماں استاد کے ساتھ گھُل مل چکی تھی اور بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ [میں] نے جا کر استاد کو تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ ریشماں [اداس] سی ہو گئی۔ "کیا میرا جانا ضروری ہے؟" اس نے [پوچھا]۔

"ضروری نہ ہوتا تو ہم تمھیں خود سے کیوں جدا [کرتے]۔" میرے بجائے استاد نے جواب دیا۔

"تو بھیّا... تم بھی چلو نا، ساتھ۔" ریشماں نے ضد کی۔

"ہاں... ٹھیک ہے برخوردار۔ تم بھی چلے جاؤ۔" استاد نے مشورہ دیا۔

میں نے شاکی نگاہوں سے انھیں دیکھا تو انھوں نے نظریں جھکا لیں۔ میں ریشماں سے مخاطب ہُوا... "ریشم، تیرا بھیّا مقروض رہنے کا عادی نہیں ہے... اور اس وقت اس پر بہت قرض لدا ہُوا ہے۔"

وہ سہم سی گئی۔ "دیکھو بھیّا... اب تک میں نے دکھ ہی پایا ہے جو پایا نہیں تھا۔ اب جو پا لیا ہے، وہ چھن گیا تو میں مر جاؤں گی۔"

"ارے پگلی... کچھ نہیں چھنے گا تم سے، بس دعاؤں میں یاد رکھنا۔" میں نے اسے دلاسہ دیا۔ پھر میں استاد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "استاد، اب آپ اسے لے جائیں۔ دارا دس بجے آئے گا۔"

ریشماں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے قائل کر ہی لیا۔ ویسے اسے خود سے جدا کرتے ہوئے خود میرا دل بھی دُکھ رہا تھا۔ وہ چند ہی لمحوں میں بہت دُور تک اتر گئی تھی، میرے دل میں۔ شاید اس لیے کہ میری کوئی بہن نہیں تھی۔

وہ چلے گئے تو میں بستر پر دراز ہو گیا۔

چار بج رہے تھے۔

اچانک نرس کمرے میں چلی آئی۔ "کہاں تھے آپ؟ ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا آپ نے؟" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کھانا لاؤں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں... اس وقت تو بھوک نہیں ہے۔" اس سے پہلے بہت مجھے کھل گئی تھی۔ "تم اتنی مہربان کیوں ہو مجھ پر؟"

"بس تمھیں دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے اپنی سہیلی یاد آ جاتی ہے۔ وہ بھی بہت پریشان رہا کرتی تھی۔"

"بہت پیار تھا تمھیں اپنی سہیلی سے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تھی ہی ایسی... بہت مہربان، بہت حساس اور درد مند۔ چھوٹی سی عمر میں اس بے چاری نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔" نرس نے عجیب لہجے میں کہا۔ "پھر اسے وسائل میسّر آ گئے تو اس نے اپنی زندگی پر فلم بنانے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے کہا تھا کہ فلم کی چار ریلیں مکمّل ہو چکی ہیں۔ پھر اچانک ہی وہ کہیں غائب ہو گئی۔"

"کیا؟" میں یوں اٹھ بیٹھا کہ جیسے بستر میں بجلی دوڑ گئی ہو۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ کیا نام تھا تمھاری سہیلی کا؟" میں نے ہذیانی لہجے میں پوچھا۔

نرس گھبرا گئی۔ "یہ... یہ آپ کو کیا ہُوا۔ آپ تو ایک دم زرد ہو گئے ہیں؟"

"میں کہتا ہُوں، مجھے نام بتاؤ اس کا۔" میرا لہجہ درشت ہو گیا۔

"نازو تھا اس کا نام... اس کی ایک ڈائری بھی میرے پاس..." نرس نے کہا اور ہونٹ سختی سے بھینچ لیے، جیسے لب کھول کر پچھتا رہی ہو۔

میں سنّاٹے کے عالم میں بیٹھا تھا۔ ایک بے نام سی امید تھی جو خون کے ساتھ میری رگوں میں گردش کر رہی تھی اور پھر جیسے رگوں میں دوڑنے والے خون کی یک لخت بڑھ گئی۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔

میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ امید اور ناامیدی کی کش مکش نے میرے اعصاب شل کر دیے تھے۔ نازو کی گمشدگی کے بعد اس کا نام ہمیشہ عجیب انداز میں میرے سامنے آیا تھا۔ نازو کا سراغ ملتا تھا لیکن جب بھی میں ناامیدی کے سامنے سپر ڈالنے لگتا تھا، ایک موہوم سا امکان پیدا ہو جاتا تھا۔ ایسا اتنی کثرت سے ہُوا تھا کہ اب مجھے یہ سب کچھ تقدیر کا کھیل محسوس ہوتا تھا۔ دل میں یہ احساس جڑ پکڑ چکا تھا کہ نازو اب مجھے کبھی نہیں ملے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت خلافِ توقع نظر آنے والی اُمید کی کرن نے میرا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ مجھے اپنے گرد و پیش کا احساس نہیں رہا تھا۔

نرس نے آگے بڑھ کر میری کلائی تھام لی۔ "کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا تمھیں؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں سنبھل گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو دیکھا جس پر تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔

چند لمحے بعد ہم دونوں باہر نکل آئے۔ ٹیکسی حاصل کرنے کے لیے ہمیں کچھ دُور چلنا پڑا۔ ٹیکسی والے کو میں نے انار کلی چلنے کو کہا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد مجھے اندازہ ہُوا کہ آتے ہوئے مجھ سے بے پروائی سرزد ہوئی تھی... آتے وقت بھی نیلے رنگ کی ایک کار نے میری ٹیکسی کا تعاقب کیا تھا۔ لیکن اس دفعہ ٹیکسی کے پیچھے اس گاڑی کو دیکھ کر میں چوکنا ہو گیا کیونکہ اس وقت ریشماں بھی میرے ساتھ تھی۔

انار کلی پہنچ کر میں نے ٹیکسی والے کو ادائیگی کی۔ نیلی کار کچھ فاصلے پر پارک کر دی گئی تھی۔ اس میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نیچے اتر آیا، اس کا چہرہ جانا پہچانا تھا۔ ذہن پر زور دینے سے یاد آیا کہ وہ انسپکٹر تھا، جس سے اسپتال میں ملاقات ہوئی تھی۔ ایک تو ملاقات عجیب حالات میں ہوئی تھی، اس پر ستم یہ کہ اس وقت وہ وردی میں بھی نہیں تھا۔ کسی ایسے شخص کو وردی کے بغیر پہچاننا یوں بھی آسان نہیں ہوتا جب کہ آپ نے اسے صرف ایک مرتبہ وردی میں دیکھا ہو بہر حال، اسے پہچان کر ذہن کی تمام گرہیں کھل گئیں۔ استاد مجو کا سکون و اطمینان بھی میری سمجھ میں آ گیا۔

میں نے ریشماں کا ہاتھ تھاما اور اسے ریڈی میڈ ملبوسات کی دکان پر لے گیا۔ اس کے لیے ایک سادہ سا جوڑا خود میں نے منتخب کیا۔ وہ حیران نظر آ رہی تھی۔ پھر میں نے اسے چپلیں دلائیں اور ایک ٹیکسی کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیور کو اسپتال کا پتہ بتایا۔ نیلی کار بھی اسٹارٹ ہو گئی تھی۔

"ان کی کیا ضرورت تھی بھیّا!" ریشماں نے کپڑوں کے لفافوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ضرورت تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں کی ہر ناخوشگوار یاد سے پیچھا چھڑا لو۔" میں نے جواب دیا، "ویسے.. کیا یہ کپڑے پسند نہیں؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اس نے مجھے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ "آپ کی دی ہوئی ہر چیز میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔" اس نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

ہم اسپتال کے دروازے پر ٹیکسی سے ... نیلی کار گزرتی چلی گئی۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔ پھر ... کا ہاتھ تھام کر اسپتال میں داخل ہو گیا۔

استاد اب بھی بستر پر دراز تھے۔ ان کی ... بند تھیں۔ ہماری آہٹ سنتے ہی انھوں نے ... کھول دیں۔ ریشماں کو دیکھتے ہی وہ ایک جھ... اُٹھ بیٹھے۔ "ارے... یہ تو بڑی کومل سی گڑیا ... آ... ادھر آ میری بٹیا۔" انھوں نے بڑی محبت ...

میں نے ریشماں کی طرف دیکھا۔ وہ جھجک ...

"ریشم... پگلی... یہ میرے استاد ہیں... اور ... رکھتے ہیں میرے لیے۔" میں نے کہا، پھر میں اس ... طرف متوجہ ہو گیا۔ "استاد۔ آپ ذرا اپنی بیٹی کو ... میں ایک فون کر کے آیا۔"

استقبالیہ سے میں نے دارا کو فون کیا اور ... بتایا کہ میں ریشماں کو لے آیا ہوں اور اسے بھی ... کے پاس کراچی بھیجنا چاہتا ہوں، لیکن اس کے ... کو زیادہ زیر بار کرنا بھی نہیں چاہتا۔

دارا نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ "کیسی ... کرتے ہو یار۔ میرا دوست بھی یاروں کا یار ہے۔ ... نہ کرو۔ میں تمام بندوبست کر دوں گا۔ مجو پہلو... ہال سے میں اسے لے لوں گا اور خود جا کر ایئر... چھوڑ آؤں گا۔ اور ہاں... کراچی سے ٹیلی گرام آ گ... گلنار وہاں پہنچ گئی ہے۔ اب کیا پروگرام ہے..."

"پروگرام ریشماں کے جانے کے بعد ... تم بے فکر رہو۔ اب تم ہر پروگرام میں شریک ہ... میں نے اسے تسلی دی۔

"تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی ٹیلی گرام دے ... ٹکٹ وغیرہ لے کر دس بجے تک وہاں پہنچ جا..."

"او کے۔" میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر د...

میں کمرے میں پہنچا تو ریشماں استاد کے ... گھل مل چکی تھی اور بہت خوش نظر آ رہی تھی ... نے جا کر استاد کو تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ ریشماں ... سی ہو گئی۔ "کیا میرا جانا ضروری ہے؟" اس ...

"ضروری نہ ہوتا تو ہم تمھیں خود سے کیوں ... میرے بجائے استاد نے جواب دیا۔

"تو بھیّا... تم بھی چلو نا، ساتھ۔" ریشماں نے ضد ... کی۔

"ہاں... ٹھیک ہے، برخوردار۔ تم بھی چلے جاؤ۔" استاد نے مشورہ دیا۔

میں نے شاکی نگاہوں سے انھیں دیکھا تو انھوں نے نظریں جھکا لیں۔ میں ریشماں سے مخاطب ہُوا... "ریشم، تیرا بھیّا مقروض رہنے کا عادی نہیں ہے... اور اس وقت اس پر بہت قرض لدا ہُوا ہے۔"

وہ سہم سی گئی۔ "دیکھو بھیّا... اب تک میں نے ... وہ کھویا ہے جو پایا نہیں تھا۔ اب جو پا لیا ہے، وہ چھن ... گیا تو میں مر جاؤں گی۔"

"ارے پگلی... کچھ نہیں چھنے گا تم سے۔ بس دعاؤں میں یاد رکھنا۔" میں نے اسے دلاسہ دیا۔ پھر میں استاد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "استاد، اب آپ اسے لے جائیں۔ دارا دس بجے آئے گا۔"

ریشماں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے قائل کر ہی لیا۔ ویسے اسے خود سے جُدا کرتے ہوئے خود میرا دل بھی دُکھ رہا تھا۔ وہ چند ہی لمحوں میں بہت دُور تک اتر گئی تھی، میرے دل میں۔ شاید اس لیے کہ میری کوئی بہن نہیں تھی۔

وہ چلے گئے تو میں بستر پر دراز ہو گیا۔

چار بج رہے تھے۔

اچانک نرس کمرے میں چلی آئی۔ "کہاں تھے آپ؟ ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا آپ نے؟" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کھانا لاؤں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں... اس وقت تو بھوک نہیں ہے۔" اس کی اپنائیت مجھے کھل گئی تھی۔ "تم اتنی مہربان کیوں ہو مجھ پر؟"

"بس تمھیں دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے اپنی سہیلی یاد آ جاتی ہے۔ وہ بھی بہت پریشان رہا کرتی تھی۔"

"بہت پیار تھا تمھیں اپنی سہیلی سے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تھی ہی ایسی... بہت مہربان، بہت حساس اور درد مند۔ چھوٹی سی عمر میں اس بے چاری نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔" نرس نے عجیب لہجے میں کہا۔ "پھر اسے وسائل میسر آ گئے تو اس نے اپنی زندگی پر فلم بنانے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے کہا تھا کہ فلم کی چار ریلیں مکمل ہو چکی ہیں۔ پھر اچانک ہی وہ کہیں غائب ہو گئی۔"

"کیا؟" میں یوں اٹھ بیٹھا کہ جیسے بستر میں بجلی دوڑ گئی ہو۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ کیا نام تھا تمھاری سہیلی کا؟" میں نے ہذیانی لہجے میں پوچھا۔

نرس گھبرا گئی۔ "یہ... یہ آپ کو کیا ہُوا۔ آپ تو ایک دم زرد ہو گئے ہیں؟"

"میں کہتا ہوں، مجھے نام بتاؤ اس کا!" میرا لہجہ درشت ہو گیا۔

"نازو تھا اس کا نام... اس کی ایک ڈائری بھی میرے پاس..." نرس نے کہا اور ہونٹ سختی سے بھینچ لیے، جیسے لب کھول کر پچھتا رہی ہو۔

میں سناٹے کے عالم میں بیٹھا تھا۔ ایک بے نام سی امید تھی جو خون کے ساتھ میری رگوں میں گردش کر رہی تھی اور پھر جیسے رگوں میں دوڑنے والے خون کی ... یک لخت بڑھ گئی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہُوا۔

میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ امید اور ناامیدی کی کش مکش نے میرے اعصاب شل کر دیے تھے۔ نازو کی گمشدگی کے بعد اس کا نام ہمیشہ عجیب انداز میں میرے سامنے آیا تھا۔ نازو کا سراغ ملتا تھا لیکن جب بھی میں ناامیدی کے سامنے ہتھیار ڈالنے لگتا تھا، ایک موہوم سا امکان پیدا ہو جاتا تھا۔ ایسا اتنی کثرت سے ہُوا تھا کہ اب مجھے یہ سب کچھ تقدیر کا کھیل محسوس ہوتا تھا۔ دل میں یہ احساس جڑ پکڑ چکا تھا کہ نازو اب مجھے کبھی نہیں ملے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت خلاف توقع نظر آنے والی امید کی کرن نے میرا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ مجھے اپنے گرد و پیش کا احساس نہیں رہا تھا۔

نرس نے آگے بڑھ کر میری کلائی تھام لی۔ "کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا تھیں؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں سنبھل گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو دیکھا جس پر تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔

"مر . . . مجھے . . . نازو ہی کی تلاش ہے . . ."
مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ذہن میں الفاظ اور خیالات گڈمڈ سے ہونے جا رہے تھے "میری ہر مصیبت کے پس منظر میں نازو ہی کا وجود ہے . . . اور میں اُس کی جستجو میں ہوں!"

"کیوں . . . اس سے تمھارا کیا تعلق تھا؟" نرس نے پوچھا۔ اس کے لہجے اور آنکھوں سے شک جھانک رہا تھا۔

"میں یہ تمام باتیں بتا کر تمھیں کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتا!" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا "اگر مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو تو کرلو اور نازو کے بارے میں جو کچھ جانتی ہو، بتا دو!"

چند لمحے وہ مجھے گھورتی رہی، پھر اُس کی نگاہوں میں شک کی دھند زائل ہوگئی "اعتبار کی بھی خوب رہی!" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی "مجھے تو تم سے اُنسیت ہی نازو کے حوالے سے محسوس ہو رہی تھی حالانکہ بظاہر تم دونوں کے درمیان کوئی بھی چیز مشترک نظر نہیں آتی۔ بہرحال، میں اس سلسلے میں تم سے تعاون کروں گی!"

"کیا میں، تمھارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"جمیلہ!" اس نے جواب دیا۔

"میرا اور نازو کا تعلق بہت عجیب ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے . . . گویا ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ تم مجھے اُس کے بارے میں کیا بتا سکتی ہو؟"

"نازو میری سہیلی ہے۔ ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے تھے، لیکن وہ شروع ہی سے پُراسرار رہی ہے۔ میں اس کا خاندانی پس منظر نہیں جانتی۔ بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس کا تعلق کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ اس کا اپنا بینک اکاؤنٹ تھا اور وہ دل کھول کر خرچ کیا کرتی تھی۔ میں تمھیں اس کی عادات و اطوار کے بارے میں بتا سکتی ہوں اور بس . . . البتہ ایک چیز ہے۔ میں ابھی آئی!" یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔

میں دل ہی میں خود کو کوسنے لگا۔ نازو کا نام سُن کر میں ایسی ہیجانی کیفیت میں مُبتلا ہُوا تھا کہ میرے ذہن نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ نرس نے نازو کی ڈائری کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ ڈائری بہت [illegible] سکتی تھی۔ اس کے نقوش میرے دل پر نقش [illegible] لیکن اس کی شخصیت دھند میں پوشیدہ ہونے [illegible] سے وہ چہرہ میرے لیے ایک بے رنگ اور بے [illegible] سا خاکہ بن کر رہ گیا تھا۔

ابھی میں اپنے اعصاب کی شکستگی پر کُڑھ رہا [illegible] تھا کہ جمیلہ واپس آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھ [illegible] پر باندھے ہوئے تھے۔ کمرے میں آکر اُس نے [illegible] انداز میں اپنے ہاتھ میری طرف بڑھائے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری دبی ہُوئی تھی۔ میرا دل اُچھل کر [illegible] میں اٹک گیا۔ وہ یقیناً نازو ہی کی ڈائری تھی۔

اُس نے ڈائری مجھے دے دی۔

"میں تمھیں معلومات تو فراہم نہیں کر سکتی البتہ [illegible] ضرور دے سکتی ہُوں!" اُس نے کہا "میں نے یہ [illegible] امانت سمجھ کر رکھی ہوئی تھی . . . اس لیے اسے پڑھا [illegible] نہیں سکی . . . لیکن یہ تمھیں دے رہی ہُوں۔ اُس [illegible] یہاں قیام کے دوران اپنی زندگی میں آنے والے [illegible] نوجوان کا تذکرہ کیا تھا، جو اس کی خاطر غنڈوں تک سے [illegible] گیا تھا۔ وہ زخمی ہُوا تھا اور وہ اُس کی تیمارداری کرتی [illegible] اسی دوران اسے غائب ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ مجھے [illegible] ہے کہ تم وہی نوجوان ہو۔ اس نے تمھارے متعلق بہت [illegible] باتیں کی تھیں۔ تمھارا تذکرہ کرتے ہوئے اس [illegible] میں عجیب سی لپک آجاتی تھی۔ میں یہ ڈائری نازو کے [illegible] سوا کسی کو نہ دیتی لیکن میرے خیال میں تم ڈائری [illegible] حق دار ہو!"

"تم ٹھیک سمجھی ہو۔ میں وہی ہُوں!" میں نے [illegible] سے کہا اور ڈائری تکیے کے نیچے رکھ لی۔

ڈائری ملنے کے بعد مجھ میں عجیب سا ٹھہراؤ [illegible] مجھے اطمینان تھا کہ ڈائری میں کسی بھی وقت پڑھ [illegible] ہوں، لیکن فی الوقت ذہن میں ایسے بہت سے [illegible] مچل رہے تھے، جن کا جواب صرف نرس جمیلہ [illegible] سکتی تھی۔ مجھے تجربہ تھا کہ بعض اوقات ایک [illegible] مجھے آگہی سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسا میرے ساتھ [illegible] ہو چکا تھا۔

"یہ ڈائری نازو نے تمھارے پاس خود رکھوائی [illegible] [illegible] نے پوچھا۔

"نہیں . . . جاتے وقت وہ اسے اپنے ساتھ نہیں [illegible] جا سکی تھی!"

"کیا مطلب؟" میں چونک پڑا۔

"اُسے کچھ لوگ یہاں سے اغوا کر کے لے گئے تھے!"

"اغوا؟ یہاں سے؟" میں اُلجھ کر رہ گیا۔ عجیب گورکھ [illegible] دھندا تھا "پہلے یہ بتاؤ کہ وہ اسپتال میں داخل کیوں ہوئی [illegible] . . ؟"

نرس کی آنکھوں میں دُکھ کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ [illegible] اس کے چہرے پر تیزاب پھینکا گیا تھا۔ وہ اسی سلسلے [illegible] یہاں زیرِ علاج تھی!" اُس نے لرزتی ہوئی آواز [illegible] میں بتایا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اب [illegible] مجھے نازو سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ میری [illegible] ت میں اس نے اپنی صلیب میرے کاندھے پر رکھ [illegible] تھی اور میں بلاوجہ اُس کے حصے کے عذاب سہہ رہا [illegible] لیکن اب اندازہ ہُوا کہ عذاب میں نے نہیں بلکہ نازو [illegible] سہے تھے۔ مجھ پر تو شاید ٹھیک سے عذاب کا مفہوم بھی [illegible] آشکار نہیں ہُوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہُوا [illegible] جن بے تاثر خدوخال کے لیے تا حال تلاش کرتا پھر رہا [illegible] . . . وہ خدوخال ہی مٹا دیے گئے ہیں۔ چہرے [illegible] انسانوں کی پہچان ہوتے ہیں اور نازو اس چہرے سے [illegible] محروم ہوگئی تھی، جسے میں پہچانتا تھا۔ گویا اب مجھے ایک [illegible] خدوخال چہرہ تلاش کرنا تھا، جس پر انجانے خدوخال [illegible] نقاب ڈال دی گئی ہو . . . اور کون جانے . . . اس [illegible] آگے سوچنا بے حد اذیت ناک تھا۔ میں لرز کر رہ گیا۔

"وہ . . . اُس کا چہرہ . . . اُس کی آنکھیں . . . [illegible] حال تھا، اس کا؟" مجھے خود اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔

"خُدا کا شکر ہے، اس کی آنکھیں محفوظ رہی تھیں!" [illegible] نے کہا "البتہ ایک رُخ سے چہرہ مسخ ہو گیا تھا!"

میں مزید وضاحت کے لیے سوالیہ نظروں سے [illegible] اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"میں نے اس کے لیے دن رات ایک کر دیے تھے!" [illegible] نے اُداس لہجے میں بتایا "میں اسے تنہا چھوڑ کر نہیں [illegible] تی تھی کہ کوئی اور نرس اُس کا میری طرح خیال نہیں رکھ سکے گی۔ میں دو دن اور دو راتیں اسی کمرے میں رہی تھی، اس دوران میں نے ایک لمحے کے لیے بھی پلک نہیں جھپکائی۔ اس عرصے میں اُس کی حالت خاصی بہتر ہوگئی۔ پھر انسانی کمزوری اور ضرورت . . . یعنی نیند مجھ پر غالب آگئی۔ میں یہاں سے جا کر بے سُدھ سو گئی۔ اگلی صبح اسپتال آئی تو پتہ چلا کہ وہ غائب ہے۔ کمرے میں کسی قسم کی جدوجہد کے آثار نہیں تھے۔ اسی لیے پولیس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی کہیں چلی گئی ہے۔ عورتوں کے لیے چہرہ بگڑ جانا بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ وہ ڈپریشن کے باعث یہاں سے چلی گئی ہوگی۔ عام طور پر ایسی عورتیں جان پہچان والوں کا سامنا کرنا پسند نہیں کرتیں، لیکن میں جانتی ہُوں کہ ایسا نہیں ہے۔ وہ بڑے حوصلے والی تھی . . . ہمیشہ اوپر والے سے اچھی اُمید رکھتی تھی۔ بہرحال، پولیس نے اس بہانے سے کیس فائل کر دیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ وہ کچھ بھی ساتھ لے کر نہیں گئی۔ اس کے کپڑے، اس کی ڈائری میں نے اپنے پاس محفوظ کر لی کہ کبھی ملاقات ہوگی تو دے دوں گی!" یہ کہہ کر وہ اس طرح خاموش ہوگئی، جیسے اُس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہ بچا ہو۔

میں نڈھال ہو کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اب مزید کچھ سُننے کا حوصلہ بھی تو نہیں رہا تھا۔

دیر تک خاموشی رہی۔ نہ تو میں نے کچھ پوچھا اور نہ ہی جمیلہ نے کچھ کہا . . . پھر شاید اُس نے اندازہ لگا لیا کہ مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔ وہ دبے قدموں کمرے سے چلی گئی۔ میں ٹوٹتا ہُوا جسم اور دُکھتا ہُوا دماغ لیے بستر پر بکھرا رہا۔

وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہُوا۔

جمیلہ نے آکر کمرے میں روشنی کی تو رات کھُلی ہوئی کھڑکیوں سے کمرے میں اُتر آئی تھی۔

"کھانا کھائیں گے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

میں چند لمحے خالی خالی نگاہوں سے اسے تکتا رہا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"آپ . . . آپ مرد ہیں۔ آپ میں تو نازو سے زیادہ حوصلہ ہونا چاہیے۔ اگر یونہی ڈھیر ہو گئے تو اسے کس طرح تلاش کریں گے۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ اُسے آپ کی ضرورت ہوگی!" جمیلہ کے الفاظ سخت تھے لیکن لہجے میں

"مم . . . مجھے . . . نازو ہی کی تلاش ہے . . ."

مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ذہن میں الفاظ اور خیالات گڈمڈ سے ہونے جا رہے تھے۔ "میری ہر مصیبت کے پس منظر میں نازو ہی کا وجود ہے . . . اور میں اُس کی جستجو میں ہوں۔"

"کیوں . . . اس سے تمھارا کیا تعلق تھا؟" نرس نے پوچھا۔ اس کے لہجے اور آنکھوں سے شک جھانک رہا تھا۔

"میں یہ تمام باتیں بتا کر تمھیں کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "اگر مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو تو کر لو اور نازو کے بارے میں جو کچھ جانتی ہو، بتا دو۔"

چند لمحے وہ مجھے گھورتی رہی، پھر اُس کی نگاہوں میں شک کی دھند زائل ہو گئی۔ "اعتبار کی بھی خوب رہی۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "مجھے تو تم سے اُنسیت ہی نازو کے حوالے سے محسوس ہو رہی تھی حالانکہ بظاہر تم دونوں کے درمیان کوئی بھی چیز مشترک نظر نہیں آتی۔ بہرحال، میں اس سلسلے میں تم سے تعاون کروں گی۔"

"کیا میں، تمھارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"جمیلہ۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا اور نازو کا تعلق بہت عجیب ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے . . . گویا ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ تم مجھے اُس کے بارے میں کیا بتا سکتی ہو؟"

"نازو میری سہیلی ہے۔ ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے تھے، لیکن وہ شروع ہی سے پُراسرار رہی ہے۔ میں اس کا خاندانی پس منظر نہیں جانتی۔ بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس کا تعلق کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ اس کا اپنا بینک اکاؤنٹ تھا اور وہ دل کھول کر خرچ کیا کرتی تھی۔ میں تمھیں اس کی عادات و اطوار کے بارے میں بتا سکتی ہوں اور بس . . . البتہ ایک چیز ہے۔ میں ابھی آئی۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔

میں دل ہی میں خود کو کوسنے لگا۔ نازو کا نام سُن کر میں ایسی ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہوا تھا کہ میرے ذہن نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ نرس نے نازو کی ڈائری کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ ڈائری بہت ا سکتی تھی۔ اس کے نقوش میرے دل پر نقش لیکن اس کی شخصیت دھند میں پوشیدہ ہونے کی سے وہ چہرہ میرے لیے ایک بے رنگ اور بے تا ساخاکہ بن کر رہ گیا تھا۔

ابھی میں اپنے اعصاب کی شکستگی پر کڑھ رہا تھا کہ جمیلہ واپس آ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی پر باندھے ہوئے تھے۔ کمرے میں آ کر اُس نے ڈرا انداز میں اپنے ہاتھ میری طرف بڑھائے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری دبی ہوئی تھی۔ میرا دل اُچھل کر میں اٹک گیا۔ وہ یقیناً نازو ہی کی ڈائری تھی۔

اُس نے ڈائری مجھے دے دی۔

"میں تمھیں معلومات تو فراہم نہیں کر سکتی البتہ ضرور دے سکتی ہوں۔" اُس نے کہا۔ "میں نے یہ ڈ امانت سمجھ کر رکھی ہوئی تھی . . . اس لیے اسے پڑھ نہیں سکی . . . لیکن یہ تمھیں دے رہی ہوں۔ اُس یہاں قیام کے دوران اپنی زندگی میں آنے والے نوجوان کا تذکرہ کیا تھا، جو اس کی خاطر غنڈوں سے ٹکر گیا تھا۔ وہ زخمی ہوا تھا اور وہ اُس کی تیمارداری کرتی ر اسی دوران اسے غائب ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ مجھے ہے کہ تم وہی نوجوان ہو۔ اس نے تمھارے متعلق بہت باتیں کی تھیں۔ تمھارا تذکرہ کرتے ہوئے اس میں عجیب سی لپک آ جاتی تھی۔ میں یہ ڈائری نازو سوا کسی کو نہ دیتی لیکن میرے خیال میں تم ڈائری حق دار ہو۔"

"تم ٹھیک سمجھی ہو۔ میں وہی ہوں۔" میں نے سے کہا اور ڈائری تکیے کے نیچے رکھ لی۔

ڈائری ملنے کے بعد مجھ میں عجیب سا ٹھہرا مجھے اطمینان تھا کہ ڈائری میں کسی بھی وقت پڑ ہوں، لیکن فی الوقت ذہن میں ایسے بہت سے مچل رہے تھے، جن کا جواب صرف نرس جمیلہ سکتی تھی۔ مجھے تجربہ تھا کہ بعض اوقات ایک لمحے مجھے آگہی سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسا میرے ساتھ ہو چکا تھا۔

"یہ ڈائری نازو نے تمھارے پاس خود رکھوا

ں نے پوچھا۔

"نہیں . . . جاتے وقت وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکی تھی۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک پڑا۔

"اُسے کچھ لوگ یہاں سے اغوا کر کے لے گئے تھے۔"

"اغوا؟ یہاں سے؟" میں اُلجھ کر رہ گیا۔ عجیب گورکھ دھندا تھا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ وہ اسپتال میں داخل کیوں ہوئی تھی . . ."

نرس کی آنکھوں میں دُکھ کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ "اُس کے چہرے پر تیزاب پھینکا گیا تھا۔ وہ اسی سلسلے میں یہاں زیرِ علاج تھی۔" اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں بتایا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اب تک مجھے نازو سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ میری دانست میں اس نے اپنی صلیب میرے کاندھے پر رکھ دی تھی اور میں بلاوجہ اُس کے حصے کے عذاب سہہ رہا تھا، لیکن اب اندازہ ہوا کہ عذاب میں نے نہیں بلکہ نازو نے سہے تھے۔ مجھ پر تو شاید ٹھیک سے عذاب کا مفہوم بھی آشکار نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میں جن بے تاثر خدوخال کے لیے تازہ تلاش کرتا پھر رہا ہوں . . . وہ خدوخال ہی مٹا دیے گئے ہیں۔ چہرے انسانوں کی پہچان ہوتے ہیں اور نازو اس چہرے سے معدوم ہو گئی تھی، جسے میں پہچانتا تھا۔ گویا اب مجھے ایک بے خدوخال چہرہ تلاش کرنا تھا، جس پر انجانے خدوخال کی نقاب ڈال دی گئی ہو . . . اور کون جانے . . . اس سے آگے سوچنا بے حد اذیت ناک تھا۔ میں لرز کر رہ گیا۔

"وہ . . . اُس کا چہرہ . . . اُس کی آنکھیں . . . کیا حال تھا، اس کا؟" مجھے خود اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔

"خدا کا شکر ہے، اس کی آنکھیں محفوظ رہی تھیں۔" جمیلہ نے کہا۔ "البتہ ایک رُخ سے چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔"

میں مزید وضاحت کے لیے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"میں نے اس کے لیے دن رات ایک کر دیے تھے۔" جمیلہ نے اُداس لہجے میں بتایا۔ "میں اسے تنہا چھوڑ کر نہیں جاتی تھی کہ کوئی اور نرس اُس کا میری طرح خیال نہیں رکھ سکے گی۔ میں دو دن اور دو راتیں اسی کمرے میں رہی تھی۔ اس دوران میں نے ایک لمحے کے لیے بھی پلک نہیں جھپکائی۔ اس عرصے میں اُس کی حالت خاصی بہتر ہو گئی۔ پھر انسانی کمزوری اور ضرورت . . . یعنی نیند مجھ پر غالب آ گئی۔ میں یہاں سے جا کر بے سُدھ سو گئی۔ اگلی صبح اسپتال آئی تو پتہ چلا کہ وہ غائب ہے۔ کمرے میں کسی قسم کی جدوجہد کے آثار نہیں تھے۔ اسی لیے پولیس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی کہیں چلی گئی ہے۔ عورتوں کے لیے چہرہ بگڑ جانا بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ وہ ڈپریشن کے باعث یہاں سے چلی گئی ہو گی۔ عام طور پر ایسی عورتیں جان پہچان والوں کا سامنا کرنا پسند نہیں کرتیں، لیکن میں جانتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ وہ بڑے حوصلے والی تھی . . . ہمیشہ اوپر والے سے اچھی اُمید رکھتی تھی۔ بہرحال، پولیس نے اس بہانے سے کیس فائل کر دیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ وہ کچھ بھی ساتھ لے کر نہیں گئی۔ اس کے کپڑے، اس کی ڈائری میں نے اپنے پاس محفوظ کر لی کہ کبھی ملاقات ہوئی تو دے دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اس طرح خاموش ہو گئی، جیسے اُس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہ بچا ہو۔

میں نڈھال ہو کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اب مزید کچھ سننے کا حوصلہ بھی تو نہیں رہا تھا۔

دیر تک خاموشی رہی۔ نہ تو میں نے کچھ پوچھا اور نہ ہی جمیلہ نے کچھ کہا . . . پھر شاید اُس نے اندازہ لگا لیا کہ مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔ وہ دبے قدموں کمرے سے چلی گئی۔ میں ٹوٹتا ہوا جسم اور دُکھتا ہوا دماغ لیے بستر پر بکھرا رہا۔

وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

جمیلہ نے آ کر کمرے میں روشنی کی تو رات کھلی ہوئی کھڑکیوں سے کمرے میں اُتر آئی تھی۔

"کھانا کھائیں گے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

میں چند لمحے خالی خالی نگاہوں سے اسے تکتا رہا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"آپ . . . آپ مرد ہیں۔ آپ میں تو نازو سے زیادہ حوصلہ ہونا چاہیے۔ اگر یونہی ڈھیر ہو گئے تو اسے کس طرح تلاش کریں گے۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ اُسے آپ کی ضرورت ہو گی۔" جمیلہ کے الفاظ سخت تھے لیکن لہجے میں

احترام تھا۔ اس مرتبہ اس نے مجھے تم کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔

"مجھ میں حوصلے کی کمی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اس معاملے میں نازو سے بہت پیچھے ہوں۔ خیر... تم فکر نہ کرو۔ میں قسطوں میں پریشان نہیں ہوتا۔ ایک ہی مرتبہ پریشان ہو لیتا ہوں تاکہ پھر یکسوئی سے جدوجہد کر سکوں۔ آج کی رات میرے لیے پریشانی کی رات ہے۔"

اس نے چند لمحے مجھے پُرستائش نگاہوں سے دیکھا۔ ... پھر میں اس کی قیافہ شناسی کا قائل ہو گیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر میری ضرورت بھانپ لی تھی: "آپ آرام کریں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ بٹن دبا دیجیے گا۔ میں آجاؤں گی۔" اس نے سرہانے لگے بٹن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ چلی گئی تو میں اپنے ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

نازو کے متعلق جو حقائق سامنے آئے تھے، وہ اس قدر لرزہ خیز اور اذیت ناک تھے کہ تجسس کے باوجود مجھے نازو کی ڈائری کھولنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ انسان اپنا بڑے سے بڑا دُکھ سہہ لیتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اللہ دُکھ سے پہلے اُسے حوصلے اور ظرف سے نواز دیتا ہے، لیکن اپنی کسی محبوب ہستی کا چھوٹا سا دُکھ بھی اس کے لیے سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ پھر یہاں تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ نازو نے جو عذاب اٹھائے تھے، وہ انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ میں یہ سوچ کر لرز رہا تھا کہ وہ ڈائری بھی شاید حجرۂ ہفت بلا ثابت ہو گی۔ اس کے حوالے سے نہ جانے کیسی کیسی بلاؤں کے لیے دروازے کھلیں گے... اور بے بسی کا یہ عالم تھا کہ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو اس تک پہنچنے کا راستہ بھی نہیں جانتا تھا۔ گھنٹوں میں اسی اُلجھن میں گرفتار رہا۔ بالآخر میں نے تکیے کے نیچے سے وہ ڈائری نکال لی۔

میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔

میں نے ڈائری کا پہلا صفحہ کھول لیا۔ خوبصورت تحریر تھی... چھوٹے چھوٹے حروف میں نازو کا نام لکھا ہوا تھا۔ کہتے ہیں تحریر انسانی شخصیت اور کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ میں اس پہلے ہی صفحے پہ اٹک کر رہ گیا، جس پر نازو کے نام کے سوا کچھ بھی تحریر نہیں تھا۔

میں دیر تک اسی نام کے حروف میں اُلجھا[illegible] نظریں اُن حروف کے درمیان نہ جانے کیا [illegible] رہی تھیں۔ وہ خوبصورت نام اُس کی اپنی تحریر میں اور بھی زیادہ حسین ہو گیا تھا۔ اُس کا خط مجھے اس[illegible] یاد دلا رہا تھا۔ میری نگاہوں میں اُس باوقار، سنجیدہ، کم گو لڑکی کا سراپا گھوم گیا، جس کا وجود مقدر اور حالات [illegible] ندم گاہ بن کر رہ گیا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر میں اسی طلسم میں گرفتار رہا۔ پھر [illegible] نے وہ صفحہ الٹ دیا۔

نازو کی زندگی کا پہلا صفحہ میرے سامنے آ گیا۔ [illegible] میری بے تابی کا یہ عالم تھا کہ نگاہ ٹھہر ہی نہیں رہی [illegible] اضطراری طور پر میں صفحے الٹتا رہا اور ڈائری کو جستہ جستہ پڑھتا رہا۔ جی چاہتا تھا کہ ایک لمحے اور ایک نظر میں اس کی پوری زندگی پڑھ جاؤں۔ ایک مرتبہ ڈائری کی طرح ورق گردانی کرنے کے بعد کہیں ٹھہراؤ آیا۔ میں نے باقاعدہ طور پہ ڈائری کا مطالعہ شروع کیا۔ [illegible] ڈائری نہیں تھی... نازو کی زندگی تھی۔ اُس رات [illegible] پر اتنی مختلف کیفیات طاری ہوئیں کہ میں انھیں [illegible] نہیں کر سکتا۔ کبھی تو میرا وجود آنسوؤں میں تحلیل ہونے [illegible] اور کبھی رگوں میں دوڑتا ہوا لہو شراروں میں تبدیل ہو[illegible] اس کی زندگی کے آثار چڑھاؤ، میرے وجود پر سے اتنی تیز[illegible] بدلتے موسموں کی طرح گزرتے رہے۔ رات بھر میں [illegible] اور بکھرتا رہا، لیکن آخری صفحہ پڑھنے کے بعد میری [illegible] پہلے سے کہیں بڑھ گئی۔ بہت سی باتیں اب بھی پردۂ [illegible] میں لپٹی رہ گئی تھیں۔

وہ ڈائری آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ یہاں [illegible] اس ڈائری کو نقل کرنے کی بجائے اس کی تلخیص نا[illegible] کی زبانی پیش کروں گا تاکہ طوالت آپ کے لیے بار[illegible] نہ ہو۔ تلخیص نگاری ایک بہت بڑا فن ہے اور میں [illegible] سے نابلد ہوں۔ تاہم میری کوشش ہو گی کہ اس ڈا[illegible] میں تحریر ہر بات آپ تک پہنچ جائے۔ اس کے با[illegible] ممکن ہے کوئی بات رہ جائے۔ اس کے لیے میں [illegible] پیشگی معذرت قبول فرمائیے...

میں نے دولت کی ریل پیل میں ہوش سنبھالا۔ میری ایک فرمائش پر کھلونوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ میری ہر خواہش، اظہار کی محض چند ساعتوں کے بعد ہی پوری ہو جاتی۔ اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے میں ابّو اور امّی، دونوں کی لاڈلی تھی۔ وہ مجھ سے بے تحاشا پیار کرتے تھے۔ ذرا بڑی ہوئی تو اسکول جانے لگی۔ ماں باپ کی محبتوں اور آسائشوں کے سائے میں ابتدائی چھ سال اس طرح گزرے کہ میں دُکھ کی دھوپ سے آشنا ہی نہ ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے خوب نوازا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے عرصے ہی میں میرے جوہر کھل گئے۔ ٹیچرز کے نزدیک میں بے حد ذہین تھی... سیکھنے کے معاملے میں اپنی کلاس میں سب سے آگے تھی۔ کبھی کبھی تو ٹیچرز میری غیر معمولی ذہانت پہ حیران رہ جاتی تھیں۔

... پھر زندگی کی پُرسکون جھیل میں دُکھ کا پہلا کنکر گرا۔ میری ذہانت اور فہم و دانش میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی... ورنہ شاید دُکھ اور محرومی کا احساس اتنا شدید نہ ہوتا۔ اچانک ہی ہمارے ہنستے کھیلتے گھر کا ماحول ایک دم کشیدہ ہو گیا۔ امّی اور ابّو کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے۔ پہلے یہ کشیدگی، بارش سے پہلے کے حبس کی طرح بے آواز تھی... پھر اسے آواز مل گئی۔ امّی اور ابّو کے درمیان تلخ و ترش گفتگو روز کا معمول بنتی گئی۔ میں کچھ سمجھتی، کچھ نہ سمجھتی... لیکن مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ امّی کا انداز جارحانہ ہوتا تھا اور ابّو کا مدافعانہ۔ ابّو، امّی کو قائل کرنے کی کوشش کرتے لیکن انھیں اس مقصد میں کامیابی نہ ہوتی۔ اُن کے درمیان تنازعہ رزقِ حرام اور رزقِ حلال تھا۔ میں اتنی چھوٹی تھی کہ اس وقت یہ باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ پھر امّی اور ابّو کی تلخ گفتگو میں میرا نام بھی آنے لگا۔ امّی حوالہ دیتیں کہ یہ نازو کے لیے نقصان دہ ہو گا۔ آخر اسے ایک دن پرائے گھر جانا ہے اور یہ سب کچھ جاننے کے بعد کون اسے قبول کرے گا۔ ابّو دلیل دیتے کہ یہ سب کچھ نازو کے لیے ہی ہے... اس کے بغیر نازو دھوم دھام سے رخصت نہیں ہو سکے گی۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ امّی کا لہجہ تند تر ہوتا گیا... ابّو کی مدافعت کمزور پڑتی گئی اور ان کے پُرسکون لہجے میں جھنجلاہٹ کی دراڑیں پڑنے لگیں۔ میں معاملات کی سنگینی کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھی لیکن ذہین اور حساس ہونے کی وجہ سے انجانے، موہوم خدشوں میں گھر کر رہ گئی تھی۔ ہر لمحے یہ احساس ہوتا کہ کچھ ہونے والا ہے اور یہ احساس، اس اعتبار سے اور زیادہ سنگین تھا کہ جو کچھ ہونے والا تھا، مجھے اس کی نوعیت کا نہ تو علم تھا اور نہ ہی میں اس کا اندازہ کر سکتی تھی۔ میری تعلیمی کارکردگی متاثر ہونے لگی اور پہلی مرتبہ خوف نے میرے ذہن میں پنجے گاڑ دیے۔ میں سہمی ہوئی رہنے لگی اور شاید غیر شعوری طور پر میں نے اس کا علاج ضد میں تلاش کیا۔ میں بے حد ضدی ہو گئی، لیکن امّی اور ابّو نے ایک دوسرے سے تلخی کے باوجود، میری ناز برداریوں میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھی۔ بلکہ مجھ سے ان دونوں کی محبت اور بھی بڑھ گئی... لیکن وہ تحفظ کا احساس دلانے والی محبت نہیں تھی... بلکہ وہ محبت مجھے خوف زدہ کر دیتی تھی۔ شاید جبلی طور پہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کچھ کھونے والی ہوں... مجھ سے کوئی چیز چھننے والی ہے... محرومی میرے قلعۂ وجود میں نقب لگانے والی ہے۔

... اور پھر وہ دن آ پہنچا۔ وہ رات میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس روز امّی کے تیور بے حد کڑے تھے اور ابّو کی جھنجلاہٹ بھی عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اپنے کمرے میں تھے اور میں حسبِ معمول دروازے کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔ میرا ذہن انجانے خدشات سے گویا لبریز تھا اور دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ مجھے امّی اور ابّو کی گفتگو کا ایک ایک لفظ آج بھی یاد ہے۔

"آج میں آخری بار آپ سے کہہ رہی ہوں کہ یہ سب کچھ چھوڑ دیں۔" امّی نے کہا تھا۔

"اور میں روز روز کی اس بک بک سے تنگ آ گیا ہوں۔" ابّو نے بے حد رکھائی سے کہا۔ "میں تمھیں سمجھا رہا ہوں کہ یہ کاروبار میرا معاملہ ہے۔ اس میں تمھیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ جیسے میں گھر کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتا۔"

"حق کیسے نہیں ہے۔ ہمیں رزقِ حلال فراہم کرنا آپ کی ذمے داری ہے نہ کہ ہماری رگوں میں زہر اتارنا...

مجھے آسائشوں کی ضرورت نہیں ... مجھے سوکھی ہو لیکن حلال کی ہو۔"

"مجھے تمھاری کوئی پروا نہیں۔" ابّو کے لہجے میں بیزاری تھی۔ "لیکن میں نازو کی پرورش بڑے ناز و نعم سے کرنا چاہتا ہوں اور ایسا ہی کروں گا۔"

"نازو کو دولت سے زیادہ عزّت کی ضرورت ہوگی۔"

"عزّت بھی دولت ہی سے ہوتی ہے۔"

"دولت تو طوائفوں کے پاس بھی ہوتی ہے۔" امّی نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ تم کس قسم کا موازنہ کر رہی ہو؟" ابّو بپھر گئے۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آپ کی دولت کو میں طوائفوں کی دولت سے بھی بدتر سمجھتی ہوں۔ آپ ہمارے لیے یہ تمام آسائشیں حاصل کرنے کے لیے اپنی نسل اور اپنے مستقبل کی رگوں میں زہر اتار رہے ہیں۔ آپ . . ."

چٹاخ کی زوردار آواز سے کمرہ گونج کر رہ گیا۔ میرا بدن ہولے ہولے لرزنے لگا۔

"سنو! تھپّڑ کا کمال یہی ہے کہ وہ برداشت نہیں ہوتا۔" امّی بولیں۔ اب ان کے لہجے سے تندی کا عنصر معدوم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ٹھہراؤ نے لے لی تھی لیکن وہ ٹھہراؤ... مجھے آج بھی یاد ہے ... اس ٹھہراؤ میں سینکڑوں طوفان مچلتے محسوس ہو رہے تھے۔

"میں ... میں شرمندہ ہوں۔" ابّو کی پشیمان آواز سنائی دی۔ "میں، تمھیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ دیکھو ... میں براہِ راست کوئی غلط کام نہیں کرتا۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو . . ."

"طوائف اگر جسم نہ بیچے، ادائیں نہ بیچے ... صرف آواز بیچے تو کیا اس کی بیٹی کو عزّت مل سکتی ہے؟ کیا آپ اپنی بیٹی کو ایسی ماں کی تحویل میں دے سکتے ہیں؟"

"دیکھو ... دیکھو، میرے ضبط کا امتحان مت لو۔" ابّو پھر چیخ پڑے۔

"میں، آپ سے دو ٹوک بات کر رہی ہوں۔" امّی کا لہجہ پُرسکون تھا۔ "آپ کو دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ میری رفاقت . . . یا اپنا کاروبار . . . فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں ان حالات میں اب آپ کے ساتھ ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتی۔"

"اوہ . . . تو نوبت یہاں تک آ گئی۔" ابّو نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ "اور تم میرا جواب جانتی ہو؟"

"جی ہاں۔" امّی نے اُداس ہو کر کہا تھا۔ "لیکن پھر بھی آپ کے مُنہ سے سننا چاہتی ہوں۔"

"تو سن لو . . . تمھاری بات میرے لیے قابلِ قبول نہیں۔ میں نے یہ سب کچھ بڑی محنت سے حاصل کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"طلاق کی کارروائی کل ہی مکمل ہو جائے گی۔ حق مہر کی رقم بھی میں کل ادا کر دوں گا۔"

"نہیں . . . میں طلاق کا مطالبہ نہیں کروں گی۔ وہ آپ بعد میں خود ہی دے دیں گے۔" امّی کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ "جہاں تک مہر کا تعلق ہے تو آپ کی کمائی کا ہر پیسہ میں نے اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔ اس لیے مہر معاف کر دینا بہتر سمجھتی ہوں۔ ویسے بھی میں طلاق نہیں چاہتی۔ ایک مسئلہ اور ہے۔"

"وہ بھی کہہ ڈالو۔" ابّو کا لہجہ تلخ تھا۔

"نازو . . ." امّی کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"نازو کا نام نہ لینا۔" ابّو برہم ہو گئے۔ "جن چیزوں کی خاطر تم مجھے چھوڑ رہی ہو وہ میں نازو ہی کے لیے کر رہا ہوں۔ نازو کو تو عدالت بھی مجھ سے نہیں چھین سکے گی۔"

کمرے میں چند لمحے سکوت چھایا رہا، پھر امّی کی نرم آواز سنائی دی۔ "میں جانتی ہوں۔ آپ کے پاس دولت ہے، طاقت بھی ہے۔ میں نازو کو تنازعہ نہیں بناؤں گی لیکن ایک بات یاد رکھیے گا . . . آپ جو کچھ کر رہے ہیں خدانخواستہ وہ نازو کو کاٹنا بھی پڑ سکتا ہے۔ شاید میری دُعائیں اسے اس المیے سے بچا لیں ... میں . . ." وہ بولتے بولتے اچانک ہی چپ ہو گئیں۔

ابّو نے کوئی جواب نہ دیا۔

کچھ توقف کے بعد امّی نے پھر کہا۔ "اور میرا چیلنج ہے میں یہ بات ثابت کر کے رہوں گی کہ آپ کی کمائی کسی طوائف کی کمائی سے زیادہ رُسواکُن اور ناپائدار ہے۔ آپ نازو کو عزّت اور سکون نہیں دے سکیں گے اور ایک دن میری مامتا اسے جیت لے گی۔"

"دیکھا جائے گا۔"

دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی آہٹیں سنائی دیں لیکن میں تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی، اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ دروازہ کھلا . . . اور امّی مجھے دیکھ کر چونک گئیں۔ انھوں نے جلدی سے مجھے گود میں اٹھا لیا اور میرے کمرے میں لے آئیں۔ "کیوں رو رہی ہے، میری گڑیا؟" انھوں نے مجھے پچکارتے ہوئے پوچھا۔

"امّی . . . آپ مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی؟" نازو نے سسکیوں کے درمیان پوچھا۔

امّی چند لمحے خاموش رہیں، پھر انھوں نے مجھے سینے سے بھینچ لیا۔ "میں تو دُور جا کر بھی نہیں رہوں گی... تمھارے پاس۔"

"نہیں ... میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔" میں نے ضد کی۔

"ٹھیک ہے۔" انھوں نے جواب دیا اور میرے آنسو پونچھ دیے۔

میں ان کے سینے سے لپٹ کر سو گئی، لیکن جب میں جاگی تو وہ جا چکی تھیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے رو رو کے سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ ابّو مجھے چمکارتے، بہلاتے رہے لیکن میری تو بس ایک ہی رٹ تھی ... امّی ... امّی ... امّی . .

اس دن کے بعد امّی مجھے کبھی نہیں ملیں اور یوں میں نے زندگی میں پہلی بار سمجھوتہ کر لیا۔ البتہ خلافِ مزاج اس سمجھوتے کا انتقام میں نے یوں لیا کہ ضدی اور خودسر ہو گئی۔ دوسری طرف ابّو کو شاید احساسِ جرم ستا رہا تھا چنانچہ وہ خاموشی سے میری ہر ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے۔ اُن دنوں میں عجیب عجیب ضدیں کرتی۔ اسکول میں میری ٹیچرز دھیرے دھیرے مجھ سے نالاں ہوتی گئیں . . . کھنچتی گئیں۔ یوں میں گرد و پیش سے کٹ کر اپنے ہی خول میں سمٹتی گئی۔ میری دُنیا میں صرف تین افراد کی اہمیت رہ گئی . . . ابّو ... بڑھا چوکیدار جو اس وقت اتنا بوڑھا بھی نہیں تھا۔ اور اُس کی بیوی۔ اُن کے علاوہ امّی کی یاد تھی، جو ہمہ وقت میرے ساتھ رہتی تھی اور میں اکثر برملا اس کا اظہار کرتی رہتی تھی، مگر پھر ابّو بہت پریشان رہنے لگے۔ چڑچڑے بھی ہو گئے تھے۔ ایک دن ... معمول کے مطابق میں نے اُن سے امّی کے متعلق پوچھا ... پہلے ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ امّی جلد ہی آ جائیں گی، لیکن اُس روز امّی کا تذکرہ سنتے ہی وہ بپھر گئے۔

"مر گئی تمھاری امّی۔" انھوں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "آئندہ کبھی اس کا تذکرہ مت کرنا!"

"میں تو کروں گی۔" میں نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔ "وہ میری امّی ہیں ... اور وہ زندہ ہیں!"

ابّو کا ہاتھ اُٹھا . . . لیکن اُنھوں نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ "نہیں . . . تم آئندہ اس کا تذکرہ نہیں کرو گی۔" اُنھوں نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر اچانک اُن کا لہجہ بھی نرم ہو گیا۔ "جانتی ہو کیوں؟ میں تمھاری ہر خواہش پوری کر سکتا ہوں ... اور کروں گا ... لیکن میں اب کبھی تمھاری امّی تمھیں نہیں لوٹا سکتا۔ ہو سکتا ہے، اس سلسلے میں میرا بھی قصور ہے مگر اس نے جو جرم کیا ہے، وہ ناقابلِ تلافی ... ناقابلِ معافی ہے۔ تم اب اپنی ماں کا تذکرہ نہیں کرو گی۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں خود کو ختم کر لوں گا۔ ممکن ہے، تمھارے لیے میری کوئی اہمیت نہ ہو لیکن میرے مرنے کے بعد تم ماں کی طرح باپ سے بھی محروم ہو جاؤ گی ... سمجھیں؟"

اس وقت میں آٹھ برس کی تھی۔ ابّو کی بات سن کر میں سہم گئی۔ میں نے بالغ افراد کی سی سنجیدگی سے سوچا۔ واقعی ... میں امّی کو تو کھو ہی چکی تھی ... ابّو کو بھی کھو دیتی، پھر یہ بات بھی نہیں کہ مجھے ابّو سے محبّت نہیں تھی۔ میں اُن

سے محبت کرتی تھی اور مجھے یہ احساس بھی تھا کہ وہ مجھے زندگی کی ہر نعمت سے نوازتے ہیں ... مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ اس دن کے بعد امی کا تذکرہ کبھی میری زبان پر نہیں آیا، لیکن دل تو نہیں مانتا تھا نا ... دل بہت ضدی ہوتا ہے ... بچوں کی طرح ... اور پھر بچوں کا دل ... لیکن پچھلے دو برسوں میں، مَیں نے دماغ سے فیصلہ کرنا سیکھ لیا تھا۔ اب جب بھی امی کی یاد آتی، دماغ مجھے اُن کے تذکرے سے روک دیتا ... صرف ابو کی وجہ سے ... تب میرا ضدی اور منتقم مزاج دل نئے نئے راستے تلاش کرتا۔ میں ایسی ایسی فرمائشیں کرتی کہ ابو پریشان ہو جاتے لیکن اُن کی پیشانی پر شکن بھی نہ آتی۔ اکثر یوں ہوتا کہ میں ضد کر کے کوئی چیز حاصل کرتی اور پھر فوراً ہی اسے توڑ ڈالتی ... اسے ضائع کر دیتی۔ ابو کڑھتے لیکن منہ سے کچھ نہ کہتے۔

یہ تھا میرا آغاز ... ابتدائی چھ سال معصومیت کے تھے ... زندگی کی خوشیوں اور محبت سے عبارت تھے۔ اُس کے بعد اچانک مجھ پر وقت سے پہلے زندگی اور دُکھوں کی آگہی کا عذاب اُترا ... پھر تیرہ سال کی عمر میں زندگی نے ایک اور موڑ لیا ... اور وہ مثبت موڑ تھا۔ میں اس بات کی قائل ہوں کہ اللہ اپنے بندے کی حد سے زیادہ رہنمائی کرتا ہے، قدم قدم پر اسے ہدایت سے نوازتا ہے لیکن خودسر انسان، جن کو خدا پر یقین ہی نہیں ہوتا، اس ہدایت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ رہنمائی قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں ... تب وہ رحیم و کریم ایسے بدنصیب شخص کو نظر انداز کر دیتا ہے، اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ انسان ذرا سی تنہائی ملنے پر گھبرا جاتا ہے ... فریادیں کرنے لگتا ہے لیکن مکمل تنہائی تو وہ ہوتی ہے، جب خدا، انسان کو تنہا چھوڑ دے، لیکن میں خوش نصیب تھی۔ میں ذہین تھی ... شروع ہی سے سوچنے کی عادی تھی ... تجزیہ کر سکتی تھی، خود کو ٹٹول سکتی تھی ... اور خود کو سمجھنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی نفسیاتی پیچیدگی اور الجھاوے خود سمجھے ... اور جب انسان اپنے مسائل سمجھ لے تو چاہے وہ اُن سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے، لیکن کم از کم ان مسائل کے منفی اثرات سے ضرور بچ جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو میری شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ... میں محض ایک اسپائلڈ چائلڈ ... ایک خودسر، خودپسند، ضدی اور مغرور دولت لڑکی، جو زندگی کی تمام آسائشیں ملنے کے باوجود تشنہ ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ کی رہنمائی نے مجھے بچا لیا۔ یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ میں بہت اچھی ہوں، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ میں کیا بننے والی تھی۔

تیرہ سال کی عمر تک یہ حال رہا کہ میں اسکول میں سے الگ تھلگ رہتی۔ تنہائی مجھے محفلوں سے بہتر ہوتی، لیکن انسان کتنا ہی تنہائی پسند کیوں نہ ہو، کبھی تنہائی اسے عذاب بھی لگنے لگتی ہے۔ یوں مجھے دوست ملا ... اس دُنیا کا سب سے اچھا ... سب زیادہ فائدہ پہنچانے والا ... باوفا دوست ... کتاب ... کتابوں نے مجھے بہت کچھ دیا۔ نئی نئی دُنیا کی سیر کرائی ... باہر کی دُنیا ... اندر کی دُنیا۔ کتابوں میری دوستی اب بھی برقرار ہے۔ نصاب میں میری د بس واجبی سی تھی۔ البتہ ادب میری توجہ کا مرکز تھا۔ ا کے باوجود میں کبھی فیل نہیں ہوئی۔ شاید اس کی وجہ خداداد ذہانت تھی۔ امتحان سر پر آجاتے تو میں پڑھ کی طرف متوجہ ہوتی۔ اسی طرح میں کالج تک پہنچ گئی۔

کالج میں داخلے کے ساتھ ہی مجھے گھر سے دُور گیا۔ ابو نے میری رہائش کا بندوبست ہاسٹل میں دیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کوئی وجہ نہیں بتا اگر میں پہلے جیسی ہوتی تو اس بات کو کبھی قبول نہ کر بلکہ شاید میں کالج میں داخلہ لینے سے ہی انکار کر دی لیکن اس وقت تک میں بہت تبدیل ہو چکی تھی۔ تقریباً ہر ہفتے مجھ سے ملنے آتے اور اُن کے انداز میں ہوتی جو کہ اُن کی بے پناہ محبت کا ثبوت تھی۔ البتہ انھوں نے مجھ سے، سختی سے کہہ دیا کہ میں تعلیم مکمل کیے بغیر رُخ نہ کروں۔

اب میں آزاد اور خودمختار تھی۔ ابو نے میرا ذاتی اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا۔ مجھے ماہانہ جیب خرچ کے لیے رقم ملتی تھی، اتنی رقم کسی بڑے سے بڑے افسر کو سال میں بطور تنخواہ ملتی ہوگی، لیکن دولت میرے نزدیک ایک بے وُقعت چیز تھی۔ میں جب بھی دولت کے با میں سوچتی، مجھے امی اور ابو کے جھگڑے یاد آجاتے۔ ا

نے ابو کی دولت کو ہمیشہ حرام قرار دیا تھا۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ تازو کو دولت کی نہیں بلکہ عزت کی ضرورت ہے۔ یہ یاد آتا تو دولت میری نگاہوں میں حقیر ہو کر رہ جاتی اور نہ جانے کیوں، میں خود کو عزت سے محروم سمجھنے لگتی۔ مَیں سوچتی رہتی کہ عزت کہاں سے حاصل کی جاتی ہے ... کہاں سے خریدی جا سکتی ہے۔ بچپن کی سُنی ہوئی بہت سی باتیں اب معنویت حاصل کرنے لگی تھیں۔ مجھ میں حرام اور حلال کا شعور پیدا ہو گیا تھا، لیکن ابو کی کہی ہوئی ایک بات عملاً سچ ثابت ہو رہی تھی۔ ہاسٹل کے محدود ماحول ہی میں یہ ثابت ہو گیا تھا کہ عزت، دولت سے ہی ملتی ہے۔ ہاسٹل کی تمام لڑکیاں مجھے عزت دیتی تھیں، صرف اس لیے کہ میرے پاس دولت تھی۔ حالانکہ میں دولت سے بے نیاز بھی تھی۔ اُس کے باوجود کبھی کبھی شدت سے یہ احساس ہوتا کہ میں عزت سے محروم ہوں۔

ہاسٹل میں منتقل ہونے سے پہلے کا عرصہ میرے لیے بڑا تشویش ناک رہا تھا ... بلکہ اس کے سائے میرے ساتھ ساتھ ہاسٹل تک چلے آئے تھے۔ کبھی کبھی بس ابو کی طرف سے پریشان ہو جاتی۔ اُن دنوں ابو کے ساتھ مسلح محافظ رہنے لگے تھے۔ ابو کے کاروبار کی نوعیت میرے علم میں نہیں تھی، لیکن امی کے الفاظ کے حوالے سے وہ کوئی بے حد گھناؤنا کاروبار تھا۔ میں نے مسلح محافظوں کے سلسلے میں ابو سے پوچھا بھی لیکن وہ ٹال گئے۔ اس کے علاوہ گھر میں ابو کے جن کاروباری دوستوں کی آمدورفت رہنے لگی تھی، وہ مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ ان کے چہروں سے خباثت برستی تھی۔

چھٹیوں کے دوران بھی مجھے گھر جانے کی اجازت نہ ملی۔ اس کی بجائے ابو نے مجھے تفریحی دورے پر یورپ بھیج دیا۔ اس دورے میں، مَیں نے دُنیا دیکھ لی ... میرے مشاہدات میں ... میرے اعتماد میں اضافہ ہوا۔ اس طرح تین سال گزر گئے اور میں نے گھر کی شکل بھی نہ دیکھی۔ البتہ سیاحت اتنی کی کہ ملک ملک گھومنے کی کشش اور اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔

مجھے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ میرے والد کا بزنس کیا ہے، لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ہاسٹل کے باہر ایک پارک تھا۔ میں اکثر اپنی روم میٹ کے ساتھ شام کو اس پارک میں چلی جاتی تھی۔ مقصد چہل قدمی اور تازہ ہوا سے لُطف اندوز ہونا تھا۔ ایک شام ایک شخص نے ہمارا راستہ روک لیا۔ ہم اس آدمی کو پہلے بھی وہاں دیکھتے رہے تھے۔ وہ پارک کے سامنے والے مکان میں رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ ہمیں بڑی عجیب نظروں سے گھورا کرتا تھا۔ دیکھنے میں وہ خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مضبوط و توانا جسم، چوڑا چکلا سینہ اور چہرے پر زخموں کے دو نشانات، جن میں ایک نشان یقیناً چاقو کے زخم کا تھا۔ اس نشان نے اسے بے حد کریہہ النظر بنا دیا تھا۔ اُس شام اُس نے نہ جانے کیا سوچ کر ہمارا راستہ روک لیا۔

"کبھی ہمارے گھر بھی آجایا کرو۔" اس نے بڑی بے باکی سے کہا۔

"تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟" میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"تم ہو ہی ایسی، تمھیں دیکھ کر تو کوئی بھی پاگل ہو سکتا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

یہ سُنتے ہی میں نے اُسے ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ وہ سٹپٹا گیا۔ میرا یہ ردِعمل اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ ممکن ہے وہ کوئی جوابی قدم اُٹھاتا لیکن اسی وقت پارک میں کچھ اور لوگ داخل ہوئے اور اُس کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔

"یہ تھپڑ مار کر تم نے خود پر میرا حق تسلیم کر لیا ہے۔" اس نے بڑی سفاکی سے کہا۔ "اب تمھیں حاصل کرنا مجھ پر فرض ہو گیا ہے۔"

میں نے جواباً اُسے ایک اور تھپڑ رسید کر دیا۔ "یہ مُہرِ تصدیق ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے خونناک نگاہوں سے گھورتا ہوا چلا گیا۔

میری روم میٹ بُری طرح سہم گئی تھی جب کہ غصے سے میرا عجیب حال تھا۔ مجھے توہین کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ اتفاق سے اگلے ہی روز ابو مجھ سے ملنے آگئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے وہ سب کچھ ان سے کہہ دیا۔ میرا انداز سرسری سا تھا، جیسے میں نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی ہو۔ ابو نے بھی میری بات سرسری انداز میں ہی سُنی اور اس پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا۔ البتہ انھوں نے مجھے محتاط رہنے کی تلقین ضرور کی۔ پھر وہ

ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر واپس چلے گئے۔

اس شام ہم پارک میں ٹہلنے کے لیے نہ جاسکے۔ وہاں بہت بھیڑ تھی۔ پتہ چلا کہ قتل ہوگیا ہے۔ کسی نے پارک کے سامنے والے مکان میں رہنے والے شخص کو گولی ماردی تھی۔ میرا دل وسوسوں سے بھر گیا، لیکن پھر میں نے ذہن سے ہر خیال جھٹک دیا۔ ضروری تو نہیں تھا کہ مقتول وہی شخص ہو، جس نے کل مجھے چھیڑا تھا۔ اس کے باوجود میں مطمئن نہ ہوسکی۔ اگلی صبح اخبار میں مقتول کی تصویر دیکھ کر میں سناٹے میں آگئی۔ وہ وہی شخص تھا، جس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔

وہ میرے لیے لمحۂ فکریہ تھا۔ قاتل کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس واردات میں ابو کا ہاتھ ہے۔ میں اسے اتفاق تسلیم نہیں کرسکتی تھی کہ میں نے اس آدمی کی حرکت کے بارے میں ابو کو بتایا اور اس کے چند گھنٹوں بعد ہی اسے گولی ماردی گئی۔ ابو کے متعلق میری تشویش کچھ اور بڑھ گئی، لیکن میں اس سلسلے میں کچھ بھی تو نہیں کرسکتی تھی۔ ابو مجھے کچھ بتاتے ہی نہیں تھے۔

میں سوچتی رہی۔ ویسے بھی اب میری قید کے دن ختم ہونے والے تھے۔ یہ میرا بی۔ اے کا آخری سال تھا۔ تعلیم مکمل کرتے ہی میں اپنے گھر لوٹ جاتی اور ابو کے قریب رہتی، نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ ابو خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔ شاید اس کی وجہ وہ مسلح محافظ ہوں جو ہر وقت اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ میری الجھن بڑھتی ہی گئی۔ بالآخر میرا ضبط جواب دے گیا۔ ایک روز میں نے ہمت کی اور گھر پہنچ گئی۔ میں نے ایک بہانہ سوچ لیا تھا لیکن درحقیقت میں وہاں کے حالات کا جائزہ لینے گئی تھی۔

گھر کے دروازے پر ہی مجھے خاصی تبدیلیاں نظر آئیں۔ آہنی گیٹ پر بھی مسلح محافظ موجود تھے۔ اُن کے لیے میں بالکل اجنبی تھی۔ وہ چہرے مہرے سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔ اُن لوگوں نے مجھے گیٹ پر ہی روک لیا۔

"آپ اندر نہیں جاسکتیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"کس سے ملنا ہے؟" دوسرے نے دریافت کیا۔

"یہ میرا گھر ہے۔ میں، ابو سے ملنے آئی ہوں۔" میں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"کیا نام ہے آپ کے ابو کا؟"

میں نے ابو کا نام بتایا تو اُن کا رویہ کسی حد تک تبدیل ہوگیا۔ "صاحب میٹنگ میں مصروف ہیں۔ آپ ذرا ٹھہریں، میں معلوم کرتا ہوں۔"

. . . لیکن میں وہاں رُکنے کی بجائے پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔ احاطے میں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہاں واقعی کوئی میٹنگ ہورہی ہے۔ دونوں محافظ میرے پیچھے آرہے تھے۔ اُنھوں نے مجھے روکنے کی ہمت نہیں کی۔ اندر جابجا مسلح محافظ نظر آرہے تھے۔ وہ سب میری طرف متوجہ ہوگئے۔

"یہ صاحب کی بیٹی ہیں۔" پیچھے سے آنے والے محافظ نے انھیں بتایا اور دوڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ میرے پیچھے آنے والا دوسرا محافظ میرے قریب رُک گیا۔

میرے لیے یہ سب کچھ بے حد حیران کن تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں اپنے گھر کی بجائے کسی ممنوعہ علاقے میں چلی آئی ہوں، جہاں قدم قدم پر پہرہ ہے اور بغیر شناخت کرائے . . . بلکہ خود کو ثابت کیے بغیر اندر قدم بھی نہیں رکھا جاسکتا۔

چند ہی لمحے بعد ابو اُس محافظ کے ساتھ باہر آئے۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ "ارے تم! کم از کم آنے سے پہلے فون ہی کرلیتیں۔ کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟" اُن کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"اپنے گھر آنے کے لیے بھی اطلاع دینا ضروری ہوتا ہے؟" میں نے شکایت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں . . . ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"یہ سب کیا ہے ابو؟" میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ میرا گھر تو نہیں، جسے میں تین سال پہلے چھوڑ گئی تھی۔"

ابو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے اندر لے گئے۔ پھر وہ مجھے اوپری منزل کی طرف لے گئے۔ ماحول اجنبی تھا لیکن اس گھر کا نقشہ مجھے اب بھی یاد تھا۔ برسوں کے بچھڑے در و دیوار مجھے پکارتے اور شکوہ کرتے محسوس ہورہے تھے۔ بھولی بسری یادیں

تازہ ہوگئیں اور میں اُداس ہوگئی۔ میں یہ بھی بھول گئی کہ میں وہاں کیوں آئی تھی۔ ابو مجھے اوپر کے ایک کمرے میں لے گئے۔ "تم یہیں بیٹھو۔ میں ابھی میٹنگ نمٹا کر آتا ہوں۔"

"یہ کیسی میٹنگ ہے، ابو . . . میں بھی چلوں گی۔" میں نے لہجہ پُراشتیاق بنانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں . . . تمھارا وہاں جانا مناسب نہیں۔" ابو نے حتمی لہجے میں کہا۔ "بس، میں ابھی آتا ہوں۔"

"آخر میں کیوں نہیں جاسکتی، وہاں؟" میں نے اصرار کیا۔

"بس . . . کہہ جو دیا کہ میں، تمھیں اُن کے سامنے نہیں لے جاسکتا۔" ابو کے لہجے میں خفیف سی ندامت تھی۔

میں نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ابو چلے گئے۔ میرے ذہن میں پنپنے والے خدشات اور قوی ہوگئے۔ گھر سے دُوری . . . تین سال کی خودمختار زندگی اور مُلک مُلک کی سیاحت نے مجھے بہت کچھ دیا تھا۔ میں سوچ کے اعتبار سے اپنی عمر سے آگے تھی۔ میں نے جان لیا تھا کہ امی، ابو سے کیوں اُلجھا کرتی تھیں۔ ابو کسی غیر قانونی کاروبار میں ملوث تھے۔ ادب اور تاریخ کے مطالعے نے مجھے اخلاقی اقدار کا پاس کرنا سکھایا تھا . . . زندگی کے بارے میں بڑے آئیڈیل بخشے تھے۔ اُس وقت میں یہ سوچ کر کُڑھ رہی تھی کہ میرے ابو صحیح راستے سے ہٹے ہوئے ہیں۔ مجھے ندامت محسوس ہونے لگی کہ میں اُن کی بیٹی ہوں۔ ابو جس راستے پر چل رہے تھے، وہ سونے اور چاندی کی سڑک تھی لیکن یہ راستہ آدمی کو انسانیت اور اخلاق کے معیار سے محروم کردینے والا تھا۔

چند لمحے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور ایک نوجوان اندر آگیا۔ وہ کسرتی بدن کا ایک خوش رُو نوجوان تھا۔ میرے لیے وہ اجنبی تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا تو پتہ چلا کہ اُس کا نام دارا ہے۔ ابو نے بالخصوص اسے میری تواضع کے لیے بھیجا تھا۔ اس ماحول میں وہ مجھے ایک بالکل ہی مختلف آدمی لگا۔ وہ خوش اخلاق اور شائستہ اطوار تھا۔ اس کا انداز مہذبانہ تھا۔ مجھے ایسا لگا، جیسے وہ اس ماحول کا آدمی نہ ہو . . . اور اگر ایسا تھا تو اس پر کیچڑ میں کِھلنے والے کنول کے پھول کی مثال صادق آتی تھی۔ زندگی نے مجھے انسان شناسی سکھائی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اگر انسان آنکھیں پڑھنا جانتا ہو تو کبھی دھوکہ نہیں کھاسکتا۔ آنکھیں انسان کے باطن کا سچا عکس پیش کرتی ہیں۔ اس کی شفاف آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کی شخصیت بھی بے داغ ہے۔ مجھے اس سے باتیں کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ ہوئی اور میں دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی . . . کرید کرید کر سوالات کرتی رہی لیکن وہ پہلو بچاتا . . . اور بات کا رُخ بدلنا خوب جانتا تھا۔ ابو کا تذکرہ وہ بڑے احترام سے کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بچپن ہی میں اپنے ماں باپ سے محروم ہوگیا تھا۔ اگر ابو اُسے پناہ نہ دیتے تو آج وہ خدا جانے کن گلیوں میں خاک چھانتا پھر رہا ہوتا۔ اس نے کہا کہ وہ آج جو کچھ بھی ہے، ابو ہی کی بدولت ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آج وہ کیا ہے . . . لیکن وہ پھر پہلو بچا گیا۔ اس نے مجھے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ جو کچھ بھی ہے، میرے سامنے ہے۔ کیا میں اُسے کھلی کتاب کی طرح نہیں پڑھ سکتی۔ میں اس سے براہِ راست تو کچھ معلوم نہ کرسکی لیکن بے ساختہ ادا ہوجانے والے جملوں سے اپنے طور پر نتائج اخذ کرتی رہی۔

کچھ دیر بعد ابو بھی آگئے۔ "ہاں، اب سناؤ۔ کیا بات ہے؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ تو میرے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہے ہیں جیسے میں آپ کے گھر مہمان آئی ہوں۔" میں نے شکایت کی۔

ابو کٹ کر رہ گئے۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ تعلیم مکمل کیے بغیر گھر نہیں آؤ گی۔" انھوں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس کے باوجود تم یہاں آئی ہو تو ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔"

"ہوسکتا ہے۔ وہ آپ کے لیے کوئی خاص بات نہ ہو۔"

"یعنی؟" انھوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"مجھے آپ بہت یاد آرہے تھے۔" میں نے کہا۔

ابو کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔ "یہ تو میرے لیے بہت خاص بات ہے، میری گڑیا۔" انھوں نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"اور نہ جانے کیوں . . . میں آپ کے لیے بہت پریشان رہی ہوں۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔"

ابو کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ "پگلی . . . دُور رہنے سے ایسا ہو جاتا ہے۔" انھوں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"نہیں ابو، یہ بات نہیں۔" میں نے اصرار کیا۔ "میں آپ کے لیے خطرہ محسوس کر رہی ہوں۔ میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتی، ایک بے نام سا احساس مجھے پریشان کر رہا ہے۔"

ابو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا لیکن میں نے واضح طور پر اس کا کھوکھلا پن محسوس کر لیا۔ "بیٹا، آدمی جن سے محبت کرتا ہے، اُن سے دُوری ایسے ہی خدشات کو جنم دیتی ہے۔" انھوں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "خیر چھوڑو ان باتوں کو . . . دارا سے ملیں تم؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے احساس تھا کہ دارا مجھے بغور دیکھ رہا ہے۔

"یہ میرے لیے بیٹے کی طرح ہے، اگریا۔ مجھے اس پر بہت . . . خیر چھوڑو، اعتماد میرے جذبے کے لیے بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔ بس، یہ میرا بیٹا ہے۔ تم کو حسد تو نہیں محسوس ہوگا، اس سے؟"

ابھی میں نفی میں جواب دینے کے متعلق سوچ ہی رہی تھی کہ دارا بول پڑا۔ "بات تو جب ہے کہ اسی حوالے سے میں آپ کا بھائی بھی تسلیم کر لیا جاؤں۔"

اُس کے لہجے میں بے پناہ خلوص تھا . . . محبت تھی۔

اس روز پہلی بار میرا دل خوشیوں سے بھر گیا۔ ہاں . . . کتنی تنہا تھی، میں . . . بے حد غیر محسوس طور پر میں ایک بھائی کی کمی محسوس کرتی تھی . . . اور دارا نے مجھے پہلی ہی نظر میں متاثر کر لیا تھا۔

میری خاموشی کا دارا نے غلط مطلب لیا۔ "میں شرمندہ ہوں۔" اس نے خفت آمیز لہجے میں کہا۔ "درحقیقت میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ مجھے یہ مقام دے سکیں۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تو یہ سوچ کر خوش ہو رہی تھی . . . اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی کہ میری برسوں کی دبی ہوئی آرزو کس انداز میں پوری ہو رہی ہے۔ دارا بھائی . . . آج سے آپ میرے لیے سگے بھائی ہیں . . . آپ میرے میرے ابو کا سب سے قیمتی تحفہ ہیں۔"

دارا جیسے کھل اُٹھا۔ ابو بھی خوش نظر آنے "یہ میرے بعد بھی تمھارا سائبان ثابت ہوگا۔" انھ نے بڑے پُراعتماد انداز میں کہا۔

"مجھے بھی یقین ہے . . . لیکن ابو اب میں گھ واپس آنا چاہتی ہوں۔"

ابو پھر پہلے والے ابو ہو گئے۔ "ابھی نہیں۔" ا کے لہجے میں قطعیت تھی۔ "امتحان سے فارغ ہو کر آ

میں نے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا کچھ دیر بعد واپس چل دی۔ دارا مجھے چھوڑنے کے ہاسٹل تک آیا تھا۔

. . . لیکن گھر سے چلتے وقت جو بے نام احسا مجھے کانٹے ڈال رہا تھا، وہ بالآخر حقیقت ثابت میں گھر لوٹ کر نہیں جا سکی۔

آخری پرچہ دے کر ہاسٹل واپس آئی اور اپنا سا پیک کرنے لگی۔ اب مجھے گھر جانا تھا۔ اس روز میں بہت خوش تھی . . . بہت مگن تھی۔ اچانک چلا کہ کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے۔ اس میں تشویش کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دارا یا ابو گے اور مجھے لینے آئے ہوں گے، لیکن جب میں وزیٹرز روم میں پہنچی تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا میرا ملاقاتی میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔

"مس . . . آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے۔" اُس نے بے حد شائستہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے غصے سے اُس کی طرف دیکھا۔ "میں کیوں چلوں تمھارے ساتھ؟"

"مجھ پر بھروسہ کریں۔ مجھے دارا نے بھیجا ہے۔" اُس نے بے حد لجاجت سے کہا۔

"دارا بھائی خود بھی یہاں آسکتے تھے۔" میں نے اعتراض کیا۔

"وہ یہاں آ کر آپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا چا

"خطرہ؟ کیسا خطرہ!"

"میں وضاحت نہیں کر سکتا۔ آپ میرے ساتھ چلیے دارا خود ہی آپ کو سب کچھ بتا دے گا۔"

میں سوچ میں پڑ گئی۔ دارا کا حوالہ ایسا نہیں تھا کہ میں اسے نظرانداز کر دیتی۔ جہاں تک خطرے کا تعلق ہے، یہ احساس تو مجھے نہ جانے کب سے ستا رہا تھا۔ میرا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ خدا جانے . . . کیا حالات ہوں . . . میں دل ہی دل میں ابو کی سلامتی کے لیے دُعا مانگنے لگی . . . پھر میری خوداعتمادی نے مجھے اس آدمی کے ساتھ جانے پر مجبور کر دیا۔

اس آدمی نے باہر نکلتے ہی ٹیکسی روکی اور ڈرائیور سے میزبان ہوٹل چلنے کو کہا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس وقت مجھے کسی قسم کا خوف بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ میں ابو کے لیے ضرور پریشان تھی۔ اس وقت میں اُن کے لیے مجسم دُعا بن گئی تھی۔ شاید انسان میں قدرت نے ایسا کوئی نظام رکھ دیا ہے کہ وہ اپنی محبوب ہستیوں سے متعلق پریشانیوں کو قبل از وقت اور شدت سے محسوس کر لیتا ہے۔ اُس وقت میں بے انتہا اذیت سے دوچار تھی۔ ذہن میں خدشوں کی جھنکار کے علاوہ کچھ بھی سُنائی نہیں دے رہا تھا۔ سماعت جیسے ماؤف ہو کر رہ گئی تھی۔

میزبان ہوٹل کے سامنے ٹیکسی رُکی تو میں نیچے اُتر گئی۔ اُس شخص نے کرایہ ادا کیا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ ہوٹل کے صدر دروازے سے گزر کر ہم اندر پہنچے۔ سامنے زینے تھے۔ وہ زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ ہم اوپری منزل پر پہنچے تو اس آدمی نے ایک دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔

میں نے دروازے پر رُک کر اندر جھانکا۔ دارا کو کمرے میں موجود پا کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں تیزی سے دارا کی طرف بڑھی۔ "دارا بھائی، کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟"

"ہاں . . . خیریت ہی ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"ابو . . . میرے ابو . . . کیسے ہیں۔ وہ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"خدا کا شکر ہے کہ انھیں بچا لیا گیا ہے۔ یہ بھی اچھا ہے کہ آپ وہاں سے نکل آئیں۔ سامان کی کوئی پروا نہ کریں۔ آپ کو کچھ روز یہیں رہنا ہوگا۔"

"لیکن کیوں . . . ہوا کیا ہے؟ میں ابو سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں . . . کیا اپنے بھائی پر اعتبار نہیں؟" اُس نے زخمی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ایسی بات نہ کرو۔ میں صرف تمھارا نام سُن کر ایک اجنبی کے ساتھ یہاں چلی آئی ہوں۔"

اس کی آنکھوں سے ممنونیت جھلکنے لگی۔ "میں تمھارے لیے کپڑوں وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں۔" اس بار اُس کے انداز میں بے تکلفی تھی۔

"پہلے بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟" میں نے ضد کی۔

"ٹھیک ہے ضدی لڑکی۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تم اپنے ابو کے متعلق کیا جانتی ہو؟"

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر دو ٹوک بات کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ "میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ کسی غیر قانونی کام میں ملوث ہیں۔ یہ محض ایک اندازہ ہے۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"تم بہت سمجھ دار ہو۔" اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "یہ حقیقت ہے۔ عابد صاحب ایک بہت بڑے سنڈیکیٹ سے وابستہ تھے۔ وہ مقامی شاخ کے سربراہ تھے۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس گروہ کی جڑیں کتنی دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ بڑے بڑے سرکاری لوگ اس سنڈیکیٹ کے وظیفہ خوار ہیں . . . یہ ایک بین الاقوامی تنظیم ہے۔ عابد صاحب کا جو مقام ہے بہت سے لوگوں کو اسے حاصل کرنے کی آرزو تھی اسی لیے انھیں ہر وقت اپنی زندگی کا دھڑکا لگا رہتا تھا لیکن اُن پر وار بھی کیا تو کس شخص نے . . . جسے وہ اپنا دستِ راست سمجھتے تھے۔"

"کیا نام ہے، اُس کا؟"

"چودھری رحمت علی۔"

"اوہ . . ." میں نے ایک طویل سانس لی۔ "اس شخص کو میں نے ایک بار اپنے گھر پر دیکھا تھا اور پہلی ہی نظر میں ناپسند کیا تھا۔ وہ ابو کا دستِ راست تھا! حیرت ہے۔ مجھے تو وہ شخص مکّار لگا تھا۔"

"جی ہاں . . . بُرے وقت کے آنے کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ آدمی، غلط لوگوں پر اعتبار کرنے لگتا ہے۔ بالآخر چودھری رحمت علی نے عابد صاحب کو ڈس لیا۔" دارا نے کہا، پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "بہرحال، تم ایک حوصلہ مند لڑکی

ہو۔ حقیقت کا سامنا کر سکتی ہو۔" یہ کہہ کر اُس نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ میری دھڑکنیں بے ربط ہو گئیں۔ اب شاید میں کوئی خوفناک حقیقت جاننے والی تھی اور اُس کا تعلق ابّو سے تھا۔ وہ جو کچھ بھی رہے ہوں... بہرحال میرے ابّو تھے اور میں اُن سے محبت کرتی تھی۔ یوں بھی میرے پاس رشتوں ناتوں کا اثاثہ بہت محدود تھا۔

"ٹھیک ہے، مجھے بتاؤ۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "میں جانتی تھی کہ میرے خدشات بے معنی نہیں ہیں۔"

دارا نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "یہ انقلاب اب سے ایک ہفتہ پہلے آیا ہے۔ چودھری رحمت علی بہت پہلے سے ریشہ دوانیاں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو کئی اہم عہدوں پر فائز کر دیا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اس نے دھمکی یا لالچ کے ذریعے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اس کی مکاری کا یہ عالم تھا کہ عابد صاحب کو کبھی اس پر شبہ نہیں ہوا۔ وہ آخر وقت تک اُس پر اعتماد کرتے رہے۔ پھر اچانک چودھری نے بساط الٹ دی۔ تنظیم کے بڑوں کی نظروں میں اس اقدام کو ضروری ثابت کرنے کے لیے، اُس نے عابد صاحب کی شخصیت کو مشکوک بنانے کی سازش کی تھی اور اس میں کامیاب بھی رہا۔ ورنہ تنظیم میں کسی ایسے انقلاب کی گنجائش نہیں ہوتی... پھر عابد صاحب کی گاڑی پر فائرنگ کی گئی۔ اس وقت اتفاق سے اُن کے ساتھ محافظ بھی نہیں تھے..."

"کک... کیا مطلب! تم نے تو کہا تھا کہ وہ..."

"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ عابد صاحب خیریت سے ہیں۔ بس قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گئے۔ فائرنگ سے ان کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی ہے۔ اتفاق سے مجھے اس سازش کا علم ہوا لیکن تاخیر سے ہوا۔ اسی لیے میں بروقت وہاں نہ پہنچ سکا۔ وہ مفلوج ہو چکے ہیں۔ تاہم میں نے انھیں ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔ پھر میں چودھری رحمت علی کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس کا اعتماد حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ اسے بھی مجھ جیسے آدمی کی ضرورت تھی۔ اب اس کے ساتھ میری وہی پوزیشن ہے جو عابد صاحب کے ساتھ خود اس کی ہوا کرتی تھی۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنے ابّو کے بارے میں یہ سب کچھ سُن کر مجھے بے حد تکلیف ہوئی تھی۔ اس وقت دارا کا دَم مجھے غنیمت محسوس ہوا تھا۔ اگر وہ بھی ابّو کا ساتھ [illegible] دیتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔ "ابّو اب کہاں ہیں؟" کچھ دیر بعد [illegible] نے پوچھا۔

"رحمت علی کی نگاہوں سے بچانے کے لیے میں [illegible] ایک معمولی سے مکان میں اُن کی رہائش کا بندوبست ک[illegible] ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایک انتہائی قابلِ اع[illegible] آدمی ان کے ساتھ ہے۔ حالات بہتر ہونے پر تمھیں اُن [illegible] ملوانے لے چلوں گا، لیکن فی الوقت تمھیں اسی ہوٹل تک محدود رہنا ہوگا۔"

میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا... میں ک[illegible] روز اسی ہوٹل میں مقیم رہی۔ دارا اس دوران مجھے صورتِ حا[illegible] سے باخبر رکھتا رہا۔ اُس نے بتایا کہ وہ لوگ پاگلوں کی ط[illegible] مجھے اور ابّو کو تلاش کر رہے ہیں۔ پھر دارا نے انھیں ابّو کی م[illegible] کا یقین دلا دیا لیکن چودھری رحمت علی میری زندگی کے بھی درپے تھا۔

کچھ دن بعد دارا مجھے ابّو سے ملوانے لے گیا۔ ابّو کا حا[illegible] دیکھ کر میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ میں دیر تک ان [illegible] لپٹ کر روتی رہی۔ انھوں نے مجھے دلاسہ دیا اور کہا کہ [illegible] فکر نہ کروں۔ مجھے کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔

"میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔"

"نہیں... یہ تمھارے لیے... بلکہ میرے لیے [illegible] خطرناک ہوگا۔" ابّو نے سختی سے منع کر دیا۔ ان کی آواز، اُن کا لہجہ اب بھی وہی تھا۔ مجھے اُس لمحے اُن پر بہت [illegible] پیار آیا۔

"نازو... انسان اپنی طرف سے بہتری کی کوشش کرت[illegible] اور اکثر اس کوشش میں بُرے بھلے، غلط اور درست کو نظر ا[illegible] کر دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تمھاری امّی نے تمھ[illegible] ہی کہا تھا۔ میں تمھیں زندگی کی آسائشیں فراہم کرنا چاہتا [illegible] لیکن تمھیں دربدری کے سوا کچھ بھی نہ دے سکا۔" ابّو [illegible] آواز بھرّا گئی۔

اُن کی باتیں مجھے ماضی میں لے گئیں۔ بچپن [illegible] ابتدائی دن... جب مجھے امّی اور ابّو، دونوں کی محبت [illegible] تھی۔ جب ہمارے گھر میں محبتیں ہی محبتیں تھیں۔ پھر [illegible] اور امّی کے جھگڑے یاد آئے... اور جدائی کی وہ رات [illegible] آ گئی... آخری رات جب میں امّی سے لپٹ کر سوئی [illegible]

میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

"ابّو... آپ کو معلوم ہے، امّی کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔ ابّو مجھ سے نظریں چرانے لگے۔ "نہیں، مجھے نہیں معلوم۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے یقیناً اُن کی خبر رکھی ہوگی۔ آپ کے پاس وسائل بھی تھے۔ بتائیے نا... امّی کہاں ہیں؟"

"میں نے کہا نا کہ مجھے کچھ علم نہیں۔" اُن کے لہجے میں برہمی آ گئی... پھر وہ کسی سوچ میں گم ہو گئے۔ اُن کے چہرے پر عجیب سا کرب تھا۔ کچھ توقف کے بعد انھوں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ "بہت ضدی تھی تمھاری ماں... اُس نے اپنی بات ثابت کر دی۔"

میری سماعت میں ماضی کی آوازیں گونجتی رہیں... میری سمجھ میں بہت کچھ آ گیا تھا۔ "اگر امّی جیت گئی ہیں تو آپ شکست تسلیم کیوں نہیں کر لیتے؟" میں نے ابّو سے کہا۔

"اس نے میری انا اور اپنی واپسی کے لیے کوئی دروازہ کھلا نہیں چھوڑا۔" ابّو کے لہجے میں افسردگی در آئی۔ "میں چاہوں بھی تو اس سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"بس... نہیں کر سکتا۔ وہ... وہ مر چکی ہے۔"

ابّو کا لہجہ پھر سخت ہو گیا۔

میں نے اس مسئلے پر مزید گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتی تھی کہ ابّو مجھ سے حقائق چھپا رہے ہیں لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں ابّو کو دھیرے دھیرے ہی رام کر سکتی ہوں۔ انھیں تو میری امّی بھی قائل نہیں کر سکی تھیں۔

کچھ دیر بعد دارا واپس آ گیا۔ وہ ہمیں تنہا چھوڑ گیا تھا تاکہ ہم کھل کر باتیں کر سکیں۔ "چلو... اب چلتے ہیں۔" اُس نے واپس آتے ہی کہا۔

ابّو اسے بڑی ممنونیت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ "دارا بیٹے... میں تمھارا شکر گزار ہوں۔" انھوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔ میں اس لفظ کو اپنے خلوص کی توہین سمجھتا ہوں۔ آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ انھیں شمار بھی نہیں کر سکتا، لیکن میں نے کبھی آپ کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ صرف اسی لیے کہ یہ آپ کے خلوص کی توہین ہوگی۔" دارا نے جذباتی لہجے میں کہا اور ابّو کا ہاتھ چوم لیا۔

ابّو کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

میں اس گونگے سے ملی، جسے دارا نے ابّو کی حفاظت اور خدمت کے لیے رکھا تھا۔ وہ بڑا مستعد آدمی تھا۔ دارا کا کہنا تھا کہ وہ محض آواز پر بھی نشانہ لے سکتا ہے اور بے حد پھرتیلا ہے۔

دارا کسی نہ کسی طرح، بوڑھے چوکیدار رحیم بخش اور اس کی بیوی کو بھی نکال لایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ابّو کے خاص ملازمین ہونے کے ناتے، ان پر بھی چودھری رحمت علی کا عتاب نازل ہو سکتا ہے۔ ہمارا گھر بھی اس وقت چودھری رحمت علی کے قبضے میں تھا اور تنظیم کے مقامی ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ اب ہوٹل میں نہیں رہا جا سکتا تھا۔ یہ مسئلہ چوکیدار بابا نے حل کر دیا۔ کرشن نگر میں ان کا ایک بھتیجا رہتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں وہاں رہ سکتی ہوں۔ پھر وہ وہاں جا کر میرے اور اپنے رہنے کی بات بھی کر آئے۔

میں چوکیدار بابا اور اس کی بیوی کے ساتھ کرشن نگر کے اُس چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئی۔ دارا بھی مجھے چھوڑنے آیا تھا۔ مجھے اور اُسے... دونوں کو اس گھر کا ماحول اور وہاں رہنے والے پسند نہیں آئے تھے لیکن اُس وقت وہ ٹھکانا بہت غنیمت تھا۔

"یہ لوگ مجھے بہت لالچی معلوم ہوتے ہیں۔" دارا نے رخصت ہوتے ہوئے کہا تھا۔ "ان کے سامنے بڑی رقوم کبھی ظاہر نہ کرنا۔ ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں یہاں آتا رہوں گا۔"

اس نے رقم کی بات کی تو مجھے اپنے بینک اکاؤنٹ کا خیال آ گیا۔ پھر میں نے اس سے فرمائش کی وہ کسی طرح ٹیلی فون کا بندوبست کر دے۔ اس نے کہا کہ نیا کنکشن ملنے میں دیر لگے گی۔ البتہ وہ ایک پُرانا ٹیلی فون ٹرانسفر کروا سکتا ہے۔

اُس گھر کا ماحول بہت عجیب تھا۔ رحیم بخش کا بھتیجا کرم الٰہی ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اُس کے دو جوان بیٹے تھے، خورشید اور افضل جو کہیں چھوٹا موٹا کام کرتے تھے۔ پڑوس سے ایک چھوٹا سا لڑکا رشید ہمارے ہاں آتا تھا۔ وہ مجھ سے جلد ہی مانوس ہو گیا۔ مجھے اُس کا دَم بڑا غنیمت لگا۔ اس کی کوئی بہن نہیں تھی اور ماں اس کے بچپن ہی میں

مرگئی تھی۔ میں اس کے ساتھ محبت سے پیش آئی تو وہ میرا گرویدہ ہوگیا۔

ذرا مہلت ملی تو میں نے بینک کا رُخ کیا۔ چیک بُک تو ہاسٹل ہی میں رہ گئی تھی۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے میں نے دارا کے مشورے پر عمل کیا... یعنی برقع پہن کر نکلی۔ بینک پہنچ کر میں نے منیجر کے کمرے کا رُخ کیا۔ اس سے اپنا تعارف کرا کے، اپنے اکاؤنٹ نمبر کے حوالے سے بینک بیلنس معلوم کیا اور نئی چیک بُک طلب کی۔ منیجر میرے آگے بچھ بچھ گیا۔ اُس کا رویّہ میرے لیے حیران کُن تھا... لیکن وہاں اس سے بڑی ایک حیرت میری منتظر تھی۔ مجھے جو بیلنس بتایا گیا، وہ کروڑوں میں تھا۔ میں سکتے میں رہ گئی۔ ذہن پر کافی زور دینے کے بعد بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ابّو یقیناً میری لاعلمی میں میرے اکاؤنٹ میں بڑی بڑی رقومات جمع کراتے رہے ہوں گے۔ یہ بات شاید دارا کے علم میں بھی تھی... اسی لیے اس نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اپنے میزبانوں کے سامنے کبھی بڑی رقومات ظاہر نہ کروں۔

میں چیک بُک لے کر وہاں سے نکل آئی۔ اس روز مجھے احساس ہُوا کہ دولت بہرحال ایک قوت ہوتی ہے۔ بیلنس معلوم ہونے کے بعد میں مسلسل سوچتی رہی... میں غور کر رہی تھی کہ میں کیا چاہتی ہوں؟ اور جو چاہتی ہُوں، شاید اسے حاصل بھی کر سکتی ہُوں۔ میں اپنی آنکھوں سے ابّو کو بری دیکھنا چاہتی تھی۔ میں ابّو کے دامن پر لگا ہُوا داغ دھونا چاہتی تھی۔ میں اُن لوگوں کو سزا دینا چاہتی تھی، جنھوں نے ابّو کے اعتماد کو دھوکہ دیا تھا۔ مجھے چودھری رحمت علی سے انتقام لینا تھا... لیکن اس کے مقابلے میں، مَیں ایک بے حقیقت سی ناتواں لڑکی تھی۔

اس عرصے میں دارا نے ٹیلی فون لگوا دیا تھا۔ میں اب سنجیدگی سے انتقام کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں مجرموں کی طرح چھُپ چھُپ کر زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے کوئی ایسی ترکیب کرنا تھی کہ اعلانیہ گھوم پھر سکوں۔ دارا اب چودھری رحمت علی سے وابستہ تھا اور اس کا دست راست بن گیا تھا۔ مَیں نے انتقام کا ارادہ تو کر لیا تھا لیکن لائحہ عمل کے سلسلے میں ابھی تک اندھیرے میں تھی۔ میں، دارا سے تنظیم کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتی رہتی تھی۔ چودھری رحمت کے قریبی [illegible] آدمیوں کے متعلق معلومات حاصل کرتی رہتی تھی۔ پھر [illegible] میں نے دارا سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں، یہ فیصلہ کیا کہ سکندر نامی آدمی ان سب میں اہم [illegible] میرے ذہن میں ایک منصوبے کے خدّوخال اُجاگر ہونے لگے۔ میں نے دارا سے سکندر کا پتہ معلوم کر لیا اور [illegible] اپنے ارادے کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ سکندر سے کیسے ملا جائے۔ پھر مجھے ایک ترکیب سُوجھ گئی۔ ترکیب خطرناک لیکن بے حد مؤثر تھی اور کامیابی کے امکانات خاصے روشن تھے۔

دارا کے ذریعے مجھے تنظیم کے بارے میں جو معلومات حاصل ہُوئی تھیں، ان کے مطابق تنظیم کا انتظامی ڈھانچہ کچھ یوں تھا کہ ہر شہر کا ایک سربراہ تھا جو ملک کے سربراہ کے سامنے جواب دہ تھا [illegible] شہر کا سربراہ، دوسرے شہر کے سربراہ کو [illegible] کے علاوہ مجھے ان [illegible] کوڈ ورڈز اور اہم فائلوں [illegible] ہوگیا۔ انھی میں ایک اہم [illegible] تھری فائل بھی تھی۔ ہیڈ کوارٹر کراچی میں تھا اور ملک کا سربراہ بھی وہیں مقیم تھا۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے منصوبے پر عمل درآمد کا فیصلہ کر لیا۔ پہلا قدم میں نے یہ اُٹھایا کہ فون پر سکندر سے بات کی اور اسے اپنا نام شکیلہ بتایا۔ میں نے اس سے کہا کہ فون پر تفصیل بات نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا وہ ایک ہوٹل میں مجھ سے ملنے آ جائے۔ میں سبز لباس میں ہوں گی۔ اس نے آنے کی ہامی بھر لی۔

مقررہ وقت پر میں طے شدہ ہوٹل پہنچ گئی۔ اس نے لباس سے مجھے پہچان لیا اور میرے قریب آ گیا۔ وہ شاید پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ سکندر چہرے مُہرے ہی سے جرائم پیشہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ میری خود اعتمادی کے امتحان کا وقت تھا۔

"بیٹھ جاؤ سکندر!" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

میرے لہجے نے اُسے اُلجھا دیا۔ "تم کون ہو؟" وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے فون تم نے ہی کیا تھا؟"

"فضول باتیں مت کرو!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں ہیڈ کوارٹر سے آئی ہُوں۔ ان دنوں تمھاری فائل میرے پاس ہے۔"

ہیڈ کوارٹر کا نام سُنتے ہی وہ سٹ پٹا گیا لیکن فوراً سنبھل کر بولا۔ "اس بات کا کوئی ثبوت ہے، تمھارے پاس؟"

"احمقانہ بات ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "یونہی تو کوئی آکر ہیڈ کوارٹر کا حوالہ نہیں دے سکتا۔ تم [illegible] نے پُرانے سربراہ کے ساتھ غدّاری کی کے سنگین [illegible] کی ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ تنظیم کے قانون میں اس [illegible] کے انقلاب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" وہ بوکھلا کر بولا۔ "لیکن..."

"تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ عابد حسین کے زمانے [illegible] سالانہ آمدنی کتنی تھی؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن مادام..." اُس نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

جب میں نے اُسے اعداد و شمار سے آگاہ کیا تو [illegible] اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "یہی وجہ ہے، ہیڈ کوارٹر اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کے کسی [illegible] پُرانے اور قابلِ اعتماد آدمی کو اس طرح ہٹا دیا جائے۔"

میرے لہجے اور معلومات نے اسے یقین دلا دیا کہ میں درست کہہ رہی ہُوں۔ میں نے ایسی بہت سی باتوں کے حوالے دیے تھے، جو صرف تنظیم کے بڑوں کے علم میں ہو سکتی تھیں۔ باہر کا کوئی آدمی ان باتوں سے آگاہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی تھی۔

"دیکھو سکندر... اگر ہیڈ کوارٹر چاہتا تو براہِ راست چودھری رحمت علی سے بھی بات کی جا سکتی تھی، لیکن رحمت علی نے بہت سی باتوں سے ہیڈ کوارٹر کو لاعلم رکھا تھا۔ لہٰذا ہیڈ کوارٹر یہاں کے سربراہ کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اسی سلسلے میں بھیجا گیا ہے کہ تم سے رابطہ قائم کروں۔ تمھاری مکمل فائل میرے پاس موجود ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ ایک بار پھر چونک پڑا۔

"مطلب یہ کہ تمھیں سربراہ بنانے کے سلسلے میں غور کیا جا رہا ہے۔" میں نے فیصلہ کُن ضرب لگائی۔

اس کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ ایک ایسی خوش خبری تھی جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

"ان باتوں کا کسی سے تذکرہ مت کرنا!" میں نے تاکید کی۔ "ہیڈ کوارٹر سب کی لاعلمی میں قدم اُٹھانا چاہتا ہے۔"

"جی... ایسا ہی ہوگا۔" اُس نے یقین دلایا۔

"اب تم جاؤ۔ میں دوبارہ رابطہ قائم کروں گی۔"

وہ کچھ خوش اور کچھ سہما ہُوا سا واپس چلا گیا۔ اسے احساس تھا کہ اس مرحلے پر ہیڈ کوارٹر کی خوشنودی اس کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے... اور فی الوقت تو اس کے لیے میری ذات ہی ہیڈ کوارٹر کا درجہ رکھتی تھی۔ میں نے جال پھیلا دیا تھا اور اب اسے سمیٹنا رہ گیا تھا۔

میں وقتاً فوقتاً سکندر سے ملتی رہی۔ میں اپنا کردار اتنی خوش اسلوبی سے ادا کر رہی تھی کہ اُسے مجھ پر شُبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اعتماد تھا کہ وہ ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرنے اور میرے متعلق تصدیق کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اُس کے باوجود یہ ایک جُوا تھا، جو میں نے کھیلا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہیڈ کوارٹر کے کچھ بڑے، چودھری رحمت علی کے حق میں ہیں۔ اس دوران میں، دارا سے تازہ معلومات حاصل کر کے سکندر پر مسلسل رُعب بھی ڈالتی رہی تھی۔ پھر میں نے ایک دن جال سمیٹ ہی لیا۔

"کل میں اپنی رپورٹ مکمل کر کے بھیج رہی ہُوں۔" میں نے اُسے بتایا۔ "اس رپورٹ میں تمھاری بھرپور سفارش کروں گی۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہُوں، مادام۔"

"میں نے رحمت علی کے سلسلے میں بہت سی باتیں معلوم کر لی ہیں، لیکن کچھ باتوں سے اب بھی لاعلم ہُوں۔"

"مجھے یہاں کے تنظیمی ڈھانچے کے متعلق مکمل معلومات درکار ہیں۔" میں نے کہا۔ "بالخصوص وہ تمام لوگ جنھوں نے عابد حسین کے خلاف چودھری رحمت علی کی مدد کی تھی۔ وہ تمام اعلیٰ افسر، جو اس کے زیرِ دام ہیں... تمام کارکن، اُن کی ذمّے داریاں... مجھے یہ ساری تفصیل چاہیے۔ تاکہ جب نئے سربراہ کا تقرر ہو تو ان لوگوں سے ہوشیار رہا جا سکے۔ بلکہ ممکن ہو تو پورا ڈھانچہ ہی تبدیل کیا جا سکے۔"

"یہ کوئی بڑی بات نہیں مادام۔" اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "میں دو دن میں تفصیلات فراہم کر سکتا ہُوں۔ اتفاق سے یہ ریکارڈ میری ہی ذمّے داری ہے۔ میں مکمل ریکارڈ کی فوٹو کاپی آپ کو لا دُوں گا۔ بس آپ ذرا میری سفارش..."

"اس کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ

دی۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ "بس اب تم جاؤ۔ پرسوں وہ ریکارڈ لے آنا۔"

وہ بڑی سعادت مندی کے ساتھ واپس چلا گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے۔ اس دوران میں ابّو کے پاس بھی جاتی رہی۔ ان کے پاس میں عموماً رات کے وقت جایا کرتی تھی لیکن میں نے انھیں کچھ نہیں بتایا۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے۔ اس دوران مجھے دارا کی زبانی علم ہوا کہ چودھری رحمت علی نے تھک ہار کر میری تلاش ترک کر دی ہے۔

ٹھیک دو دن بعد سکندر نے مجھے ان اہم ترین کاغذات کی نقول لا کر دے دیں۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں اتنی آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ آدمی ارادہ کر لے اور اس کی نیت سچی ہو تو مشکلیں اسی طرح آسان ہو جاتی ہیں۔ اب وہ تنظیم میری مٹھی میں تھی۔ میں نے سکندر کو یہ یقین دلا کر رخصت کر دیا کہ دو دن بعد وہی تنظیم کا نیا سربراہ ہوگا۔

میں نے ان کاغذات میں موجود معلومات کو دو ڈائریوں میں منتقل کیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ڈائریاں رحمت علی کے لیے بے حد تباہ کن ثابت ہو سکتی ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ معلومات سے استفادہ کیسے کیا جائے۔ مجھے ان کاغذات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے افسران، جن کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، تنظیم کے غلاموں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے میں وہ معلومات حکام کو فراہم کرنا خود میرے لیے بھی مخدوش ثابت ہو سکتا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے رحمت علی کو فون کیا۔

"ہیلو!" فون خود رحمت علی نے اٹھایا تھا۔ "رحمت بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟"

"میں وہی ہوں، جس کی تلاش میں تم باؤلے ہوئے جا رہے ہو۔"

"کون ہو تم؟" اس بار اس کے لہجے میں سختی تھی۔

"عابد حسین کی بیٹی نازو۔"

چند لمحے فون پر خاموشی رہی، پھر اس نے بوکھلا کر پوچھا: "تم کہاں ہو اور کہاں سے بول رہی ہو؟"

"میں اسی شہر میں ہوں اور خیریت سے ہوں البتہ تمھاری خیریت نیک مطلوب نہیں ہے۔ میں تمھیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تم میرا اور میرے ابّو کا پیچھا چھ[...] ورنہ میں تمھیں تباہ کر دوں گی۔"

"دیوانی ہوئی ہو لڑکی۔" وہ ہنسنے لگا۔ "تم ... [...] کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔" اس نے حقارت بھرے لہجے [...]

"میں تو واقعی تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، لیکن [...] ایم تھری تمھیں برباد کر دے گی۔"

"کیا ... کیا کہہ رہی ہو؟ تمھیں ایم تھری کے [...] میں کیا معلوم ... اوہ ... تمھیں عابد حسین نے بتا[...]"

"ہرگز نہیں ... اس فائل کی مکمل نقل م[...] قبضے میں ہے۔ میں نے وہ تمام معلومات دو ڈا[...] میں لکھ کر انھیں محفوظ کر دیا ہے۔ تمھارے فرشتے [...] ڈائریوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اطلاعاً عرض ہے [...] فائل مجھے سکندر نے فراہم کی ہے۔ وہ تمھاری جگ[...] کے خواب دیکھ رہا ہے۔ رحمت علی ... تم بھی ک[...] اعتبار نہیں کر سکو گے۔ تم نے جو بویا ہے، وہی کا[...] میری بات غور سے سنو ... میں اب سامنے آ [...] اور اگر تم نے مجھے کوئی نقصان پہنچایا تو یاد رکھنا [...] نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ وہ ڈائریاں صدرِ مملک[...] تک پہنچیں گی ... انھیں خریدنا تمھاری استطا[...] سے باہر ہے۔ بہتر ہوگا کہ تمھارے آدمی مجھ سے د[...] رہیں۔ میں تمھیں دوسری وارننگ ہرگز نہیں دو[...]"

یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اس کے بعد میں کھل گئی۔ ایک ہفتے میں [...] اندازہ ہو گیا کہ کوئی مجھ میں دلچسپی نہیں لے رہا [...] اس کے باوجود میں ابّو کے پاس جانے کے سلسلے [...] محتاط رہی۔ وہ ابّو کے ذریعے مجھے ڈائریوں سے د[...] ہونے پر مجبور کر سکتے تھے ... اور اس کے بعد [...] لیے کوئی جائے پناہ نہ رہتی۔ دوسری طرف مایوس [...] بات یہ تھی کہ مجھے امّی کے بارے میں کچھ بھی معلوم [...] ہو سکا۔ امّی کے تذکرے پر ابّو سختی سے ہونٹ بھ[...] بیٹھ جاتے تھے۔

اب میں اس سلسلے میں سوچتی رہی۔ پھر [...] خیال آیا کہ میرے بینک اکاؤنٹ میں کافی د[...] ہے ... کیوں نہ امّی ابّو اور اپنی زندگی پر فلم [...] ... حقیقی فلم ... جو آئینہ دکھا سکے۔ جوں جوں [...]

اس سلسلے میں سوچا، مجھ پر اس کے فائدے کھلتے گئے۔ ایک تو اس طرح میں امّی کو پا سکتی تھی۔ دوسری طرف وہ فلم سنڈیکیٹ کے بارے میں ایک اہم دستاویزی ثبوت ثابت ہوتی۔

خاصے غور و فکر کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا اور فوراً ہی ایورنیو اسٹوڈیو کا رُخ کیا۔ اسٹوڈیو کی دُنیا بہت عجیب تھی۔ عام حالات میں تو میں وہاں چند گھنٹے بھی نہیں گزار سکتی تھی ... لیکن میرے سامنے ایک بڑا مقصد تھا۔ میں شوٹنگ دیکھتی اور فلم کی تکنیک سمجھنے کی کوشش کرتی، پھر ایک دن ایک فلم ساز نے مجھے سائڈ ہیروئن کے رول کی پیش کش کر دی۔ میں نے کچھ تفریحاً اور کچھ تجربہ حاصل کرنے کی غرض سے اُسے قبول کر لیا۔ فلم مکمل ہوئی ... ریلیز ہوئی اور سپر ہٹ ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے بے شمار آفرز ملیں لیکن میں نے بہت دیکھ بھال کر صرف تین فلمیں سائن کیں۔ اس دوران میں ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے اپنی فلم کے سلسلے میں بھی بات کر چکی تھی۔ اس فلم کا اسکرپٹ میں نے ایک نامور ادیب سے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا۔ اسکرپٹ میں کثرت سے حقیقی مناظر اور مکالمے موجود تھے۔ پھر فلم کی شوٹنگ بھی شروع ہو گئی۔ ابّو سے ملاقات پر میں نے اپنی کارگزاری سُنائی تو وہ پریشان ہو گئے۔

کرشن نگر کے اُس مکان میں میرا دم گھٹتا تھا۔ اب فلموں میں کام ملنے کی وجہ سے جواز بھی پیدا ہو گیا تھا کہ میں کوئی بنگلہ لے لوں۔ چنانچہ میں نے گلبرگ میں ایک بنگلہ کرائے پر لے لیا۔ بنگلہ خریدا بھی جا سکتا تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ کسی بھی وقت ٹھکانا بدلنے کی نوبت آ جاتی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں کرم الٰہی اور اس کے بیٹوں کو ساتھ ہی لے جاؤں گی لیکن ایک دن میں نے کرم الٰہی کو چودھری رحمت علی سے بات کرتے دیکھ لیا۔ چودھری اپنی سیاہ گاڑی میں وہاں آیا تھا ... اور اُس نے کرم الٰہی کو نوٹوں کی ایک گڈی بھی دی تھی۔ میں اسی رات چوکیدار بابا اور اس کی بیوی کو لے کر وہاں سے نکل آئی اور گلبرگ کی کوٹھی میں منتقل ہو گئی۔ دارا کو بھی اس سلسلے میں فون کر دیا تھا۔

اسی دوران چودھری فضل داد نے اپنی فلم کے لیے ایک نئے سائڈ ہیرو کو منتخب کیا۔ وہ بہت سادہ لوح اور خوددار نوجوان تھا۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے پسند آ گیا تھا۔ اس سے پہلے، میں اس انداز میں کبھی کسی سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنوں کی لے ہی بدل گئی۔ اس سے پہلے ایک اور چکر چلا تھا۔ شاہ جی نامی ایک پروڈیوسر نے مجھے اپنی فلم میں آفر کی تھی ... لیکن مجھے کردار پسند نہیں آیا، اس لیے میں نے وہ فلم قبول نہیں کی۔ شاہ جی بہت برہم ہوا اور مجھے غنڈوں کے ذریعے ہراساں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر میری اس آگ کی لپیٹ میں نیا سائڈ ہیرو جمال بھی آ گیا۔ ایک روز میں اس سے باتیں کر رہی تھی کہ شاہ جی کے غنڈوں نے مجھ سے بدتمیزی کی۔ جمال اسے برداشت نہ کر سکا اور ان سے بھڑ گیا۔ وہ خاصا زخمی ہوا۔ میں اس کی تیمارداری کرتی رہی۔

میں گلبرگ کی کوٹھی میں تین روز سے زیادہ قیام نہ کر سکی۔ جمال کے گھر سے گلبرگ آئی تاکہ چوکیدار بابا کو بتا دوں کہ میں رات کو گھر نہیں آؤں گی۔ میں جمال کو اس حال میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ میں گھر سے نکلنے ہی والی تھی کہ ابّو کی کال آ گئی۔ میں اُن سے ملنے گئی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ شکست تسلیم کر رہے ہیں۔ انھوں نے امّی کو فون کر دیا تھا کہ مجھے اپنے پاس بُلوا لیں۔ امّی کی طرف سے کوئی مجھے لینے آنے والا تھا۔ میرا دل جمال میں اٹکا ہوا تھا، لیکن امّی سے ملنے کی برسوں پُرانی آرزو نے اُسے دبا دیا۔ یوں بھی میں امّی کے پاس پہنچنے کے بعد جمال سے ملنے آ سکتی تھی۔

ابّو مجھ کو لاحق دُہرے خطرات سے ہار گئے تھے۔ ان کی دانست میں، میں نے چودھری رحمت علی کو چھیڑ کر غلطی کی تھی۔ اُس پر شاہ جی کا چکر ... ابّو آخر باپ تھے ... اور پھر ایک بیٹی کے باپ ... اُن کی پریشانی فطری تھی۔

میرا دل نئے انداز سے دھڑک رہا تھا۔ شاید یہ وہ وقت تھا، جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور ابّو نے کہا کہ گونگا اُسے نہیں آنے دے گا۔ اس لیے میں جا کر آنے والے کو اندر لے آؤں۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر جو شخص کھڑا تھا، وہ وضع قطع اور صورت شکل سے کوئی اچھا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ تاہم میں اسے ابّو

کے کمرے میں لے آئی۔ اس نے ابّو کو سلام کیا اور بولا۔
"مجھے بی بی جی نے بھیجا ہے، چھوٹی بی بی جی کو لانے کے لیے۔"
"ٹھیک ہے۔" ابّو نے کہا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گئے۔ "جاؤ بیٹا... اپنا خیال رکھنا... اپنی حفاظت کرنا۔ اگر خطرات لاحق نہ ہوتے تو میں، تمھیں کبھی تمھاری ماں کے پاس نہ جانے دیتا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تمھاری ماں کی کہی ہوئی ہر بات پوری ہوئی۔ اس سے کہنا کہ میں اس سے شرمندہ ہوں۔" یہ کہتے کہتے ان کا گلا رندھ گیا اور انھوں نے آنسو چھپانے کے لیے مُنہ پھیر لیا۔
چند لمحے بعد وہ نو وارد سے مخاطب ہوئے۔ "اپنی بی بی جی سے کہنا کہ میں اپنی عزت دار بیٹی کو اس کے سپرد کر رہا ہوں۔"
"ابّو... آپ بھی چلیے نا۔" میں نے ضد کی۔
"نہیں... میں یہیں ٹھیک ہوں۔" انھوں نے بے رُخی سے کہا۔ پھر انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔
"خدا حافظ۔"
میں انھیں اس طرح چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی لیکن برسوں کی بچھڑی ہوئی ماں کی کشش بے پناہ تھی۔ میں انھیں خدا حافظ کہہ کر اس اجنبی کے ساتھ نکل آئی جو مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن بہرحال، وہ مجھے میری بچھڑی ہوئی ماں کے پاس پہنچانے والا تھا۔
وہ مجھے لے کر بس میں بیٹھا۔ "میکلوڈ روڈ پر اترنا ہے۔" اس نے ہدایت دی۔ میں بس میں بیٹھ گئی لیکن میں عجیب اضطرابی سی کیفیت سے دوچار تھی... سانسیں رُکی رُکی جا رہی تھیں۔ طویل آرزو کے بعد کوئی خوشی ملے تو شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ میکلوڈ روڈ پہنچ کر ہم بس سے اتر گئے۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ایک طرف چل دی۔ اچانک نہ جانے کہاں سے دو آدمی میرے دائیں بائیں آگئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک بوتل دبی ہوئی تھی۔
"تمھارے لیے چوہدری رحمت کا پیغام ہے۔" اس نے کہا۔ "انھوں نے کہا ہے کہ وہ ڈائریاں وصول کرنا جانتے ہیں۔" پھر اس کا ہاتھ حرکت میں آیا اور میرے چہرے پر جیسے قیامت گزر گئی... وہ سیّال آگ تھی... یہ میں نے شعور کے ایک لمحے میں محسوس کیا، پھر میں بے ہوش ہو گئی۔ آنکھ اسپتال میں کھلی تو پتہ چلا کہ مجھ پر تیزاب پھینکا گیا اضطراری طور پر پہلو بدلنے کی وجہ سے میری آنکھیں محفوظ رہی تھیں لیکن چہرے کا بایاں حصہ تیزاب زد میں آگیا تھا۔ اسپتال میں گزرنے والے اذیت نا دنوں میں بھی مجھے بس یہی احساس تھا کہ میں اپنی ماں نہیں مل سکی ہوں۔ لیکن چھراتی کے پیغامبر نے آ یقین دلایا کہ وہ مجھے امّی کے پاس لے جائے گا۔ ا معلوم نہیں کہ میرا مستقبل کیا ہے...

نازو کی وہ ڈائری پڑھ کر میں سُن ہو کر رہ گیا اس کا پس منظر کچھ نہیں تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ و سمجھ دار اور ذہین لڑکی تھی۔ وہ جو کچھ تھی، اس کو بنایا سنوارا تھا۔ ورنہ واقعی وہ نہ جانے کیا سے ہو گئی ہوتی۔ اس کے متعلق ڈائری سے بہت کچھ ہوا تھا، اس کے باوجود مسئلہ حل نہیں ہو سکا تھا کہاں ہے... کس حال میں ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا ڈائری میں جو اس نے مجھ سے وابستگی ظاہر کی تھی پڑھ کر مجھے تکلیف ہوئی تھی۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے گلنار یاد آگئی تھی۔ میں اپنے طور پر گلنار کو اپنی بنا چکا تھا۔ اس کے انداز سے میرے فیصلے کی تائید ہوتی تھی۔ لیکن نازو دل ہی دل میں مجھے اپنا سمجھ تھی۔ میں اس کے لیے بھی دل میں کسک سی محسوس کرتا تھا۔ اگر میں نے اس کے ساتھ زیادہ وقت گزا تو شاید میری کیفیت بھی یہی ہوتی۔
بہرحال، اس الجھن سے قطع نظر اصل مسئلہ تلاش کرنا تھا۔ رات میں نے ڈائری پڑھنے اور سو میں گزار دی تھی۔ جمیلہ میرے لیے ناشتہ لے آئی۔ نا کے بعد میں پھر ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگا۔ نا کی تحریر بے حد جاندار اور خط بے حد خوبصورت تھا لفظوں کو برتنے کا فن جانتی تھی... اور یہ فن انھی میسر آتا ہے، جن کی فکر میں گہرائی ہو، جنھوں نے زن کی بے پایاں جھیل میں جھانک کر دیکھا ہو۔
دس بجے کے قریب دارا آگیا۔ خطرناک ہو کے باوجود اس کی آمد مجھے اچھی لگی۔ میں نے ڈائ تکیے کے نیچے رکھ دی۔ "کہو دارا... کیا خبر ہے" علیک سلیک کے بعد پوچھا۔
"ریشماں خیریت سے کراچی پہنچ گئی ہے۔" اس نے کہا۔
"یار یہ کراچی کا بھی کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ تمھارے وست پر اتنا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔"
"یہ کیا باتیں لے بیٹھے۔" اس نے شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔
"اور نازو کے متعلق کیا خبر ہے؟"
"اس سلسلے میں بھی چھان بین کی ہے۔ اب میں ین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تنظیم کی قید میں ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ تنظیم ابھی تک اس کے متعلق اندھیرے میں ہے۔" دارا نے کہا۔
مایوسی کی ایک لہر سی میرے وجود کو سُن کرتی ل گئی۔ نازو سے کوئی گہرا قلبی تعلق نہ ہونے کے جود میں اس کی تلاش سے مُنہ نہیں موڑ سکتا تھا۔ از کم اس کی ڈائری پڑھنے کے بعد تو یہ ممکن ہی ہیں تھا۔ لیکن اس کا کوئی سراغ بھی تو نہیں مل رہا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے ڈائری کے حوالے سے دارا سے گفتگو کرنے کا ارادہ کر لیا۔ "دارا... تم نے مجھے نازو کے متعلق کچھ نہیں بتایا حالانکہ تمھیں کم از کم وہ معلومات ور فراہم کرنا چاہیے تھیں، جو تمھارے علم میں ہیں۔" میں نے شکایتاً کہا۔
دارا چونک کر میری طرف مُڑا۔ "میرے خلوص شک نہ کرو۔" اس نے کہا۔ "اگر میں نے تم سے کچھ ہیں چھپائی ہیں تو یقین کرو کہ وہ ایسی باتیں ہیں، جو میں کسی کو بھی نہیں بتا سکتا۔"
"تم نے مجھے کرشن نگر والے مکان اور چوکیدار بابا کے متعلق بھی نہیں بتایا۔" میں نے شکایت کی۔
"وہ اتنی اہم بات نہیں تھی۔ نازو کے غائب ہونے کے بعد وہ کچھ عرصہ کرشن نگر میں رہے۔ پھر ہدری کی حویلی کے سرونٹ کوارٹر میں رہنے لگے۔"
میں نے اسے ڈائری کے متعلق بتایا تو اس کے انداز سے ہیجان جھلکنے لگا۔ "وہ ڈائری ختم کہاں ہوئی ہے؟" اس نے بے تابانہ پوچھا۔
"تیزاب پھینکے جانے کے بعد وہ اس اسپتال میں آئی تھی۔ اس کے بعد کے بارے میں ڈائری خاموش ہے۔"
وہ مایوس نظر آنے لگا۔ "میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ عابد صاحب نے اسے کسی کے ساتھ بھیجا تھا۔ تیزاب والا معاملہ میرے علم میں نہیں تھا۔ وہ تو مجھے بہت بعد میں پتہ چلا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عابد صاحب نے اس سلسلے میں مجھے اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ میں ان دنوں ایک کام سے راولپنڈی گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو چوکیدار رحمت سے پتہ چلا کہ نازو دس بارہ روز سے غائب ہے۔ میں نے عابد صاحب سے معلوم کیا تو انھوں نے بتایا کہ اسے کسی محفوظ جگہ بھجوا دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھے تفصیل نہیں بتائی۔ پھر مجھے چوہدری رحمت علی کی زبانی واقعات کا علم ہوا اور ان ڈائریوں کے متعلق پتہ چلا۔ چوہدری ہی نے بتایا کہ اس نے ڈائریوں کے سلسلے میں مجبور کرنے کیلئے نازو پر تیزاب پھنکوایا تھا۔ شروع میں تو میں سمجھا کہ نازو اسی کے قبضے میں ہے لیکن وہ خود نازو کے لیے پریشان تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے آدمی اسپتال کی نگرانی کرتے رہے تھے لیکن ایک رات نازو اچانک ہی کہیں غائب ہو گئی۔" دارا چند لمحے توقف کر کے بولا۔
"مجھے عابد صاحب اور نازو دونوں سے یہی شکایت ہے کہ انھوں نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔"
"تو عابد حسین کو یہ معلوم ہے کہ نازو پر تیزاب پھینکا گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں... میں نے بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے باوجود وہ نازو کے لیے پریشان ہیں۔"
"کیوں؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔
"انھوں نے نازو کو جہاں بھجوایا تھا، وہاں فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ لوگ کہیں اور جا چکے ہیں۔ جب سے اب تک وہ نازو کے متعلق بے خبر ہیں۔"
"اوہ، تو یہ بات ہے۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "عجیب گورکھ دھندا ہے۔"
"ہاں... اس معاملے میں بڑے اُلجھاوے ہیں۔" اس نے تائید کی۔
"میں عابد صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"ٹھیک ہے، چلو۔ میں انھی کی طرف جانے والا تھا۔"

اس وقت مجھے اُستاد کی ہدایات کا بھی خیال نہیں رہا۔ ذہن میں بس ایک ہی بات تھی۔ اس ڈائری نے نازو کے پس منظر کے ذریعے مجھے کچھ کڑیاں فراہم کردی تھیں۔ اب مجھے گمشدہ کڑیوں کو تلاش کرنا تھا... اُنھیں آپس میں ملانا تھا... تب میں نازو تک پہنچ سکتا تھا۔

دارا مجھے اس مکان میں لے گیا۔ وہاں حسبِ معمول گونگا موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اس انداز میں سر ہلایا جیسے مجھے پہچان گیا ہو۔

"ایک درخواست ہے میری۔" دارا نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے کہا۔ "عابد صاحب کو تیزاب والے واقعے کے متعلق نہ بتانا۔"

"تم بے فکر رہو۔ میں بچہ نہیں ہوں۔" میں نے اُسے اطمینان دلایا۔ "لیکن مجھے ان کے پاس تنہا چھوڑ دینا۔"

ہم اندر داخل ہوگئے۔ دارا نے انھیں سہارا دے کر بٹھایا۔ عابد صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ "کیسے ہو بیٹے؟" ان کے لہجے میں شفقت تھی۔

"جی... اللہ کا شکر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

دارا اُن سے اجازت لے کر باہر چلا گیا۔ میں ان کی طرف دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ دوسری طرف ان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر ہچکچا رہے ہیں۔

"بیٹے... وہ... نازو کا کچھ پتہ چلا؟" بالآخر وہ بولے لیکن انداز میں اب بھی ہچکچاہٹ تھی۔

"میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کچھ پیش رفت تو ہوئی ہے لیکن اب مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری مدد؟" انھوں نے حسرت آمیز نگاہوں سے اپنے مفلوج جسم کو دیکھا۔ "بیٹے... میں کسی قابل تو نہیں لیکن ہر ممکن مدد کے لیے تیار ہوں۔ بولو کیا چاہتے ہو، مجھ سے؟"

"میں آپ سے وہ پتہ اور فون نمبر معلوم کرنا چاہتا ہوں... جہاں آپ نے نازو کو بھیجا تھا۔" میں نے دھماکہ کیا۔

ان کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ "تت... تمھیں کیسے پتہ چلا؟" وہ ہکلائے۔

"یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے۔"

"میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔" انھوں نے بے رُخی سے کہا۔ "ویسے بھی وہ لوگ وہ [illegible] چھوڑ چکے ہیں۔"

"لیکن میں وہاں سے اُن کا سراغ لگانے [illegible] کوشش کر سکتا ہوں۔"

"میں نہیں بتا سکتا۔" اُن کے لہجے میں قطعیت [illegible]

"اگر آپ کی جسمانی صحت ٹھیک ہوتی تو [illegible] کو اس ضد کے معاملے میں حق بجانب سمجھتا۔ اس [illegible] میں آپ جدّوجُہد کر سکتے تھے۔ اب میں آپ کا ہا[illegible] کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیے۔"

"تم سے زیادہ میں دارا کو اپنا بیٹا سمجھتا ہوں [illegible] اور اس سلسلے میں وہ بھی بے خبر ہے۔"

"آپ کی صاف گوئی کا شکریہ۔" میں نے سرد [illegible] کہا۔ مجھے ان پر شدت سے غصّہ آیا تھا۔ میں نے [illegible] خود پر قابو پایا۔ "لیکن ایک بات بتا دوں۔ میری [illegible] دارا سے زیادہ ہیں۔"

"مثال کے طور پر...؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"مثلاً میں جانتا ہوں کہ آپ نے نازو کو اس [illegible] اُمّی کے پاس بھیجا تھا۔"

"اوہ... تمھیں کیسے پتہ چلا؟"

"میں اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا [illegible] نے انھی جیسا لہجہ اختیار کر لیا۔

"بیٹے... پلیز خفا نہ ہونا۔ وہ بات ہی ا[illegible] کہ میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔" اُنھوں نے بڑی [illegible] سے کہا۔

مجھے غصّے کی بجائے اُن پر ترس آنے لگ[illegible] ہے عابد صاحب۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "آ[illegible] عدم تعاون کے باوجود حوصلہ نہیں ہاروں گا۔ م[illegible] جدّوجُہد جاری رہے گی۔ ایک دن میں نازو کو [illegible] سے ضرور ملاؤں گا۔"

ان کی نظروں سے ممنونیت جھلکنے لگی۔ اسی [illegible] دارا اندر آگیا۔ کچھ دیر وہ عابد صاحب سے باتیں ک[illegible] پھر ہم دونوں وہاں سے چلے آئے۔ "کچھ بات [illegible]

[illegible]اس نے باہر نکلتے ہی پوچھا۔

"نہیں۔" میں اپنی جھنجلاہٹ نہ چھپا سکا۔ "انھوں [illegible]نے میری کوئی مدد نہیں کی۔ لیکن میں بھی ہار ماننے والا نہیں ہوں۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "وہ شروع [illegible]ہی سے ایسے ہیں۔" اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"اور اعتبار اس پر کرتے ہیں جو ناقابلِ اعتبار ہو۔" [illegible]میرا اشارہ چوہدری رحمت علی کی طرف تھا۔

دارا اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ہم دونوں خیریت سے اسپتال واپس پہنچ گئے [illegible]وہاں استاد مجو میرے منتظر تھے اور بے چینی سے [illegible]کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی رک گئے۔ [illegible]"کہاں گئے تھے برخوردار؟" انھوں نے سخت لہجے میں [illegible]کہا۔ "میری ہدایت کا بھی کوئی پاس ہے تمھیں؟"

میں خجل ہوگیا۔ استاد نے پہلی مرتبہ مجھ سے ایسے [illegible]لہجے میں بات کی تھی اور اس سلسلے میں وہ حق بجانب [illegible]بھی تھے۔ "ضرور بتاؤں گا استاد۔" میں نے کہا۔ "لیکن [illegible]پہلے میں معذرت کرلوں۔ میں بے حد شرمندہ ہوں کہ [illegible]حکم عدولی کا مرتکب ہوا۔ لیکن میری جذباتی کیفیت [illegible]بہت ابتر تھی۔ مجھے کچھ خیال ہی نہیں رہا۔"

استاد ایک لمحے میں موم ہوگئے۔ "ٹھیک ہے، [illegible]برخوردار۔ میں سمجھتا ہوں کہ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔ [illegible]خیر... بتاؤ، کیا ہوا؟"

دارا ہم سے اجازت لے کر چلا گیا تو میں نے ڈائری [illegible]ملنے سے لے کر عابد حسین سے ملاقات تک، تمام واقعات [illegible]استاد کو سُنا دیے۔ ڈائری سے ملنے والی معلومات [illegible]بھی ان تک پہنچا دیں۔ وہ فکرمند سے ہوگئے۔

"معاملہ کوئی لمبا ہی معلوم ہوتا ہے۔" کچھ دیر سوچنے [illegible]کے بعد اُنھوں نے کہا۔ "تو اس کا باپ تعاون کرنے [illegible]کے لیے تیار نہیں ہے؟"

"ہاں استاد... میں انھیں قائل نہیں کرسکا۔"

"خیر دیکھیں گے۔"

اچانک ہی میں بددل ہوگیا۔ مجھے گلنار شدّت سے یاد آنے لگی۔ "چھوڑو استاد... جب لوگ اپنی آگ بجھانے میں دلچسپی نہ لیں تو میں کیوں پرائی آگ میں کودتا پھروں؟"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"مطلب یہ کہ میں نازو کی تلاش سے دست بردار ہو رہا ہوں۔ میں گلنار کے پاس چلا جاؤں گا۔"

استاد نے ملامت آمیز نظروں سے مجھے گھورا۔ "بہت خوب نسیم جمال۔" انھوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آدمی کو بڑا ہونے میں برسوں لگتے ہیں اور ایک ہی لمحے میں وہ کتنا چھوٹا ہو جاتا ہے۔"

استاد کی بات نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے عابد حسین اور دارا کے سامنے دعوا کیا تھا کہ میں ہمّت ہارنے والا نہیں ہوں... اور اب... میں اپنی ہی نظروں میں حقیر ہوگیا۔

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ استاد نے مجھے روک دیا۔ "بس برخوردار... زیادہ شرمندگی کا اظہار بھی مُضر ہوتا ہے۔ میں ایک دن میں دو مرتبہ اظہارِ شرمندگی کے حق میں نہیں ہوں۔ شرمندگی ظاہر کرنے کی بجائے عمل کرو... عمل...!"

"لیکن استاد، اس اُلجھی ہوئی ڈور کا کوئی سرا بھی تو نہیں مل رہا ہے۔"

"حالانکہ سرا تو مل گیا ہے۔ پیش رفت ہوئی ہے۔ تم صرف عابد حسین کے رویّے کی وجہ سے مایوس ہو رہے ہو۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم نازو کو ضرور تلاش کرو۔ میں تمھیں صرف یہ یاد دِلا رہا ہوں کہ کل ریشماں تمھیں اپنے ساتھ کراچی لے جانا چاہ رہی تھی اور میں اس کے حق میں تھا۔ اس وقت تمھیں یاد ہے، تم نے کیا کہا تھا؟"

مجھے یاد تھا... میں نے کہا تھا کہ میں مقروض رہنا پسند نہیں کرتا... اور وہ قرض مجھ پر اسلم کے خونِ ناحق کا تھا۔

"آدمی جس سے محبت کرتا ہے، اُسے محفوظ دیکھنا چاہتا ہے۔" استاد نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ "میں بھی تمھیں خطرات میں نہیں دیکھنا چاہتا لیکن تم نے قرض کا احساس کرکے خود کو بڑا آدمی ثابت کیا تھا۔ اب پستی کی طرف کیوں بھاگنا چاہتے ہو؟"

"بس کرو استاد... ورنہ میں پھر شرمندگی کے اظہار پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" استاد نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا، اب میرے ساتھ اکھاڑے چلو۔ یہاں تمھاری طبیعت گھبرا گئی ہو گی۔ وہاں سب تمھیں یاد کرتے ہیں۔ کچھ طبیعت بھی بہل جائے گی۔"

میں استاد کے ساتھ اکھاڑے چلا گیا... گویا مجھے اپنے زنداں سے عارضی رہائی مل گئی تھی۔ اکھاڑے میں میری زبردست خاطر تواضع کی گئی۔ وہ لوگ میرے آگے پیچھے جا رہے تھے۔ وہاں وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ مجھے احساس ہی نہ ہوا۔ رات کے کھانے کے بعد میں استاد مجو کے ساتھ اکھاڑے سے نکلا اور اسپتال کا رخ اس طرح کیا، جیسے وہی میرا گھر ہو۔ استاد نے میری کیفیت بھانپ لی۔ انھوں نے میرا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے تھپ تھپایا اور بولے "بس چند روز کی بات ہے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں جانتا ہوں کہ یہ چند روز بہت زیادہ طویل بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

اسپتال پہنچ کر استاد کچھ دیر کمرے میں ٹھہرے، اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نرس جمیلہ آ گئی۔

"کھانا لاؤں؟" اس نے آتے ہی پوچھا۔

"نہیں... میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔"

اس نے مجھے بڑی شاکی نگاہوں سے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔

"ارے، میں کوئی سچ مچ مریض تھوڑا ہی ہوں۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "بستر پر پڑے پڑے میرا دل گھبرا جاتا ہے۔"

"لیکن مجھے پتہ ہے کہ باہر تمھارے لیے خطرات موجود ہیں۔"

"خطرات کا کیا ہے... وہ تو اندر بھی آ سکتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "دیکھو جمیلہ... میں تمھارا ممنون ہوں۔ تم نے نہ صرف میرا خیال کیا بلکہ میرا سب سے بڑا مسئلہ حل کرنے میں بھی میری مدد کی... اب میں تمھیں یوں خود کو ہلکان کرنے کی اجازت نہیں دوں گا

میں چاہتا ہوں کہ تم لائٹ آف کرو اور جا کر سو[...] دن کی ڈیوٹی ہی کافی ہے، حالانکہ وہ بھی غیر ضرو[...]

شاید میرے انداز کی اپنائیت نے اس [...] دل کو چھو لیا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میں [...] ہوں کہ آپ گزشتہ رات ایک پل کے لیے بھی [...] سوئے۔" اس نے کہا۔ "دن میں بھی آپ نے آرام [...] کیا۔ آپ کے لیے اس وقت نیند بہت ضروری [...] نیند آ رہی ہے نا؟"

میں اس کا مقصد سمجھ گیا۔ اگر میں نفی میں ج[...] دیتا تو وہ یقیناً مجھے خواب آور دوا دے دیتی... میں اس موڈ میں نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے زبرد[...] جماہیاں لیں اور یہ ظاہر کیا کہ مجھے واقعی نیند آ ر[...] اس نے مجھے شب بخیر کہا اور لائٹ آف کر کے چل[...]

اس کے جاتے ہی میں بستر پر دراز ہو گیا۔ آ[...] میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ تصور کے پر[...] پر دو چہرے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے... نا[...] اور گلنار کے چہرے۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ ا[...] دونوں میں کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا کس[...] دشوار ہے۔ نازو کی ڈائری کے ذریعے ہونے [...] انکشاف نے مجھے کتنی شدید کشمکش میں مبتلا [...] دیا ہے، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ نازو ایک [...] محروم لڑکی تھی۔ باپ کے ساتھ رہی تو ماں سے مح[...] رہی... ماں کے پاس خدا جانے پہنچی بھی یا نہیں [...] البتہ اس چکر میں وہ باپ کی شفقت سے بھی محر[...] ہو گئی۔ اس لڑکی نے مجھ سے نہ جانے کیا کیا توق[...] وابستہ کر رکھی ہوں گی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اظہار [...] والی لڑکی نہیں ہے۔ ایسی لڑکیاں تو اپنے جذبوں [...] خود سے بھی چھپا کر رکھتی ہیں۔ ڈائری میں میرا ذکر [...] اور مجھ سے وابستگی کا اظہار اس بات کی دلیل [...] اس کا جذبہ بے حد شدید ہے۔ اس انداز کے [...] سے میں وہ سب کچھ بھی سمجھ سکتا تھا، جو اس ڈا[...] نہیں لکھا تھا۔ ویسے بھی محرومی کے سائے میں [...] ہوئے لوگ جب کسی کو چاہتے ہیں... کچھ طلب [...] ہیں تو اس میں بڑی شدت ہوتی ہے۔ میں ا[...] کیسے سمجھا سکتا تھا... کیا میں اُسے محرومی کا [...]

[...]ور داغ دے سکتا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ میں نازو [...]یں بے حد کشش محسوس کرتا تھا۔

دوسری طرف گلنار تھی۔ وہ بازار میں تھی اور بازار سے الگ تھی۔ یہ اس کی شخصیت کی مضبوطی کی دلیل تھی۔ طوائف تو لفظ ہی ایسا ہے کہ اسے سنتے ہی محرومی اور استحصال کا خیال آ جاتا ہے۔ گلنار اگر بازار میں بیٹھ کر بھی سب سے مختلف تھی تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ حالات اور مقدر کے جبر کا شکار ہو کر وہاں تک پہنچی ہے۔ اس کے ساتھ تو اور بھی زیادہ محرومیاں ہوں گی۔ اس نے بہت دور [...]ک میرا ساتھ دیا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے بہت وقت گزارا تھا اور اسے قریب سے دیکھا تھا۔ میں اس کی محبت میں گرفتار تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے، وہ بھی تھی... لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میں [...]ک وقت دو لڑکیوں کی محبت میں مبتلا تھا۔ ایسا وقت پڑتا کہ مجھے ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو میں کہہ نہیں سکتا کہ کیا ہوتا۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ دُنیا میں بیشتر لوگ... کم از کم مرد، کئی لڑکیوں سے محبت کرتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ان میں میری طرح اعتراف کرنے والے دو چار ہی ہوتے ہوں۔ ایسا مکمل ایک شخص ملنا، جو آپ کی تمام ذہنی جسمانی اور روحانی ضروریات پر پورا اترتا ہو، عملاً ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں انتخاب کے مرحلے سے شاید ہر شخص کو گزرنا پڑتا ہے۔

میں دیر تک کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا لیکن یہ مسئلہ ایسا تھا کہ مجھے اس کا کوئی حل سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ یہ تو قبل از مرگ واویلا والی بات ہے۔ میں اس مسئلے پر اپنی توانائیاں کھپا رہا ہوں، جس کا سر دست کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ نازو کا ملنا تو در کنار، ابھی تک تو اس کے ملنے کا کوئی امکان بھی سامنے نہیں آیا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے میں سو گیا لیکن دبے ہوئے لاشعور کو اونگھتے ہوئے شعور پر حاوی آنے کا موقع مل گیا تھا۔ میری بند آنکھوں کے سامنے وہ دو شگفتہ چہرے... دو چٹکتے سراپا لہراتے رہے اور میں نیند کی پناہ گاہ میں داخل ہو گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں نے اس پناہ گاہ میں بھی نقب لگا دی تھی۔

صبح میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ وکیل نجم انصاری آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک اجنبی تھا۔ وہ ایک بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا۔ انصاری نے مجھ سے اس کا تعارف کرایا۔ "یہ ہیں جمیل صاحب... آپ کے کاروبار کے منتظمِ اعلیٰ۔"

میں نے ان دونوں سے باری باری مصافحہ کیا۔ پھر میں نے ناقدانہ نگاہوں سے جمیل کا جائزہ لیا۔ جو کچھ مجھے نظر آیا، وہ بے حد اطمینان بخش تھا۔ اسلم کو آدمی کی پرکھ تھی۔

"مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی جمیل صاحب... اور میں یہ رسماً نہیں کہہ رہا ہوں۔" میں نے جمیل سے کہا۔

وہ کچھ خفیف سا ہو گیا اور سر ہلا کر رہ گیا۔ "یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کاروبار کے معاملے میں مجھ پر انحصار کر سکتے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ بالکل لاتعلق ہو کر نہ رہ جائیں۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ لیکن فی الوقت میری مصروفیات ایسی ہیں کہ میں لاتعلق رہنے پر مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔

وکیل انصاری نے تائیداً سر ہلایا۔ "جمیل صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"میں کراچی گیا ہوا تھا، اس لیے مجھے آپ کے پاس آنے میں تاخیر ہو گئی۔" جمیل نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ پھر وہ مجھے کاروبار کے متعلق تفصیلات بتانے لگا۔ اس کے انداز میں بلا کی خود اعتمادی تھی اور اس کی بیان کردہ تفصیل، کاروبار پر اس کی گرفت کی غماز تھی۔ میں سب کچھ سنتا اور ذہن نشین کرتا رہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسلم سعید نے ایک چھوٹی سی سلطنت تعمیر کر رکھی تھی۔ اور اب وہ سلطنت میری تھی۔

اس تفصیل کے بعد کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر جمیل اور نجم انصاری اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔ کچھ دیر بعد مجو پہلوان آ گئے۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

"خیریت تو ہے استاد؟" میں نے علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

"بس برخوردار... میں تمھیں لینے آیا ہوں۔ نکل چلو یہاں سے۔" استاد نے جواب دیا۔

میرے لیے تو وہ خوش خبری تھی۔ میں بلا وجہ اسپتال میں رہتے رہتے عاجز آچکا تھا... فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ان سے یہ پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔

ہم باہر نکل آئے۔ استاد نے ٹیکسی روکی اور ڈرائیور سے اکھاڑے چلنے کو کہا۔ راستے میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ میں نے کن انکھیوں سے استاد کے چہرے کی طرف دیکھا... لیکن وہاں سنگلاخ سی خاموشی کے سوا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اکھاڑے پہنچتے ہی استاد مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔

"بیٹھو برخوردار۔" انھوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھوں گا... لیکن چکر کیا ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" اچانک استاد کے انداز میں لاپروائی آگئی۔ "وہ اپنا برخوردار تھا نا... ایس پی حامد... اُسے معطل کر دیا گیا ہے۔"

وہ خبر میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ مجھے شدید دھچکا لگا۔ پہلے تو میں کچھ نہ بول سکا... مجھے خود پر قابو پانے میں کچھ دیر لگی۔ "لیکن اُستاد، ایسا کیوں ہوا؟" میں نے پوچھا۔ "وہ مجھے بدعنوان تو نہیں لگتا۔"

"وہ کبھی بدعنوان نہیں ہو سکتا۔" استاد کا لہجہ فخریہ تھا۔ "لیکن میں حیران ہوں کہ تم اس کے معطل ہونے کی وجہ نہیں سمجھ سکے۔"

میں نے چونک کر ذہن پر زور ڈالا۔ پھر بات میری سمجھ میں آگئی۔ ذہنی جھٹکا ایسا ہی ہوتا ہے کہ بعض اوقات سامنے کی باتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ "اوہ... گویا تنظیم نے اپنے اثر و رسوخ کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"ٹھیک سمجھے۔" اُستاد نے کہا۔ "حامد کی سرگرمیاں اُن کے لیے تشویش کا باعث تھیں۔ پہلے تو انھوں نے حامد کو لالچ دیا... مختلف ذرائع سے اسے روکنے کی کوشش کی، اس میں ناکامی پر انھوں نے ڈوریاں کھینچنا شروع کر دیں۔"

"مجھے افسوس ہے استاد، میری آگ کی لپیٹ میں اور نہ جانے کون کون آئے گا۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں برخوردار۔" استاد نے میرے کندھے تھپتھپائے۔ "اچھا بیٹھ تو جاؤ۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ یہ آگ صرف تمھاری نہیں ہے... اس سے ملک و قوم کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرنا ہر محبِ وطن شخص کا فرض ہے۔"

میں کرسی پر بیٹھ گیا... لیکن میرا ذہن سنسنا رہا تھا۔ "تو اب کیا ارادہ ہے، استاد؟"

"حامد کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم اس تنظیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ ہم اپنے تمام تر وسائل استعمال میں لائیں گے۔" استاد کے لہجے میں گھن گرج تھی۔

"لیکن اُستاد، ان کے وسائل لامحدود ہیں اور ایس پی حامد کو معطل کرا کے انھوں نے اپنی طاقت کا ثبوت دیا ہے۔"

"قوت، وسائل، ہُنہ۔" استاد نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "ہم آزاد قسم کے لوگ ہیں۔ سرکاری ملازمین کی طرح پابند نہیں اور نہ ہی بڑے افسروں کے اشارۂ ابرو کے محتاج ہیں۔ دیکھو برخوردار، تم ان کے مقابلے میں احساسِ کمتری کا شکار رہو گے تو کچھ بھی نہیں کر سکو گے، حالانکہ تم نے تن تنہا ان کے چھکے چھڑا دیے ہیں۔ یاد رکھو... تم اس وقت تک زندہ ہو جب تک اوپر والے کی مرضی ہے۔ ویسے بھی خدا حق کے لیے لڑنے والوں کا ساتھ دیتا ہے اور انھیں اپنی خاص مدد سے نوازتا ہے۔"

استاد کی باتوں نے مجھ میں نئی رُوح پھونک دی۔ "ٹھیک ہے استاد۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "اب تک تو میں ذاتی جنگ سمجھ کر لڑ رہا تھا، اب یہ اجتماعی جنگ ہے۔ میں تمھارے ساتھ ہوں اُستاد۔"

"بہت خوب... مجھے یقین تھا کہ تم میری توقعات پر پورے اترو گے۔" استاد نے مجھے پرستائش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کافی دیر تک تنظیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ استاد مجھ سے کرید کرید کر سوالات کرتے رہے۔ میرے لیے اُن سے کچھ چھپا رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"ٹھیک ہے برخوردار... اب تم آرام کرو... یہاں تخت پر آجاؤ۔" استاد نے کہا۔

"میں تو آرام کرتے کرتے تھک گیا ہوں استاد۔" میں نے جواب دیا۔ پھر اچانک ہی ایک نئے خیال نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اب تک گلنار کی امّی کا حال معلوم نہیں کیا تھا۔ وہ گلنار کے لیے پریشان ہو رہی ہوں گی۔ مجھے اُن کے پاس جانا چاہیے تھا۔ "اس وقت تو مجھے ایک کام یاد آگیا ہے استاد!" میں نے مجّو پہلوان سے کہا اور گلنار کی امّی کے بارے میں بتا دیا۔

"تو تم اکیلے جاؤ گے؟"

"اگر گلنار یہاں ہوتی تو برات لے کر جانے کے متعلق سوچتا۔" میں نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے برخوردار۔" اُستاد سنجیدگی سے بولے۔ "تمھیں قدم قدم پر خطرات کا سامنا ہے۔ جب سامنے کوئی بڑا مقصد ہو تو یہ حقیر اور فانی زندگی بہت اہم ہو جاتی ہے... اس مقصد کی امانت بن جاتی ہے۔ تمھیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔"

استاد نے تخت کے نیچے سے ٹرنک کھینچا اور اس میں سے ایک ریوالور نکال کر میری طرف بڑھایا۔ "... محتاط رہنے کی ایک صورت یہ بھی ہے۔" انھوں نے کہا۔

"میں ایسے دو کھلونے پہلے بھی رکھ چکا ہوں، لیکن استعمال کرنے کی ہمیشہ حسرت ہی رہی۔" میں نے زہرخند سے کہا۔

"اس مرتبہ یہ اتنی آسانی سے نہیں چھینا جاسکے گا۔" اُستاد کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"ٹھیک ہے استاد۔" میں نے ریوالور لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"میں تمھارے لیے برابر والا کمرہ کھلوا دوں گا..."

انھوں نے کہا۔ "میں بھی ذرا کام سے جا رہا ہوں۔ ممکن ہے دیر ہو جائے، آ کر آرام سے سو رہنا۔"

میں استاد کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ گلنار کی امّی راوی روڈ والے مکان میں رہتی ہیں۔

میں نے وہاں پہنچ کر کال بیل بجائی۔ شکی دروازہ گلنار کی امّی ہی نے کھولا۔ وہ پہلے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں، پھر اُن کی آنکھوں سے برہمی جھلکنے لگی... انھوں نے مُنہ سے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ ایک طرف ہٹ گئیں۔ یہ گویا میرے لیے اندر داخل ہونے کا اشارہ تھا۔ ان کے چہرے پر بدستور برہمی تھی۔

میں نے جیسے ہی قدم اندر رکھا، انھوں نے شکی دروازہ بند کر دیا۔ میں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"جمال!" انھوں نے سخت لہجے میں مجھے پکارا۔ "یہیں رُک جاؤ، پہلے مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

اُن کے لہجے میں ایسا تحکّم تھا کہ میں ٹھٹک کر وہیں رہ گیا۔ میں نے پلٹ کر اُن کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اُن کی نگاہوں میں، لہجے سے کہیں زیادہ سختی تھی۔ "جی آنٹی... فرمایئے۔" میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"گلنار کہاں ہے؟"

"آنٹی... میں اسی کے بارے میں..."

"بکواس مت کرو۔ میں جانتی ہوں وہ تمھاری مدد کر رہی تھی۔ لیکن تم ٹھیک ٹھاک نظر آرہے ہو جب کہ وہ اب بھی غائب ہے۔"

"وہ خیریت سے ہے..."

"اور اب تم اس کی خیریت کے بدلے کوئی مطالبہ لے کر آئے ہو۔" انھوں نے شاید قسم کھا رکھی تھی کہ مجھے پوری بات نہیں کرنے دیں گی۔ ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور آواز غصّے کی شدت سے لرز رہی تھی۔

"آپ میری بات سُنیں گی بھی یا اپنے مفروضے

ہی پیش کرتی رہیں گی۔" میں نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"تمھارے پاس کہنے کو ہے ہی کیا... یاد رکھنا میری بچّی کو کچھ ہو گیا تو محفوظ تم بھی نہ رہ سکو گے۔" اُن کی آواز بھرّا گئی۔

میں ان کا کرب سمجھ رہا تھا لیکن سمجھنے کے باوجود مامتا کے کرب کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ اُن کے رویّے اور ان کے انداز میں اس کرب کی محض ایک جھلک تھی جس سے وہ پچھلے دنوں مسلسل گزرتی رہی ہوں گی۔ وہ میری بات سُننے کے لیے تیار نہیں تھیں... جب کہ میں ان کے لیے ایک خوشخبری لے کر آیا تھا۔ اب یہی ایک صورت تھی کہ میں بھی بے رُخی کا مظاہرہ کروں، لہٰذا میں پلٹ کر گیٹ کی طرف چل دیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اُن کے لہجے میں اب بھی سختی تھی۔

"آپ میری بات نہیں سُننا چاہتیں تو میرا واپس چلے جانا ہی بہتر ہے۔" میں نے رُکھائی سے کہا۔ "میں تو آپ کو گلنار کے بارے میں بتلانے آیا تھا۔"

"سنو جمال ٹھہرو۔" وہ یکدم پگھل سی گئیں۔ لہجے میں التجائیں مچلنے لگیں۔

میں نے پلٹ کر اُن کی طرف دیکھا اور رُک گیا لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولا۔

"کہاں ہے میری بچّی؟" انھوں نے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔

پہلی مرتبہ وہ مجھے بولنے کا موقع دینے پر آمادہ ہوئی تھیں۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کم سے کم لفظوں میں انھیں اطمینان دلا دوں...

"گلنار کو میں نے کراچی بھجوا دیا ہے۔" میں نے کہا اور وہ خیریت سے ہے۔ یقین کیجیے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"لیکن تم نے اُسے کراچی کیوں بھجوایا؟" اُن کے لہجے میں الجھن تھی۔ "اور... اور مجھے علم بھی نہیں۔"

"آنٹی... یہ اس کی حفاظت کے لیے ضروری تھا۔ کیا آپ کے خیال میں، میں اُسے کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہوں؟"

انھوں نے ایک لمحے تک بغور مجھے دیکھ... نفی میں سر ہلانے لگیں۔ "جمال بیٹے، معاف کر... تمھیں بُرا بھلا کہہ گئی۔ بیٹے... اولاد کا دُکھ ا... ہی ہوتا ہے۔ میں اپنے آپ میں نہیں تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ پھر میں... شروع سے تمام واقعات انھیں سُنا دی... خاموشی سے سُنتی رہیں، البتہ اس دوران اُ... آنکھیں خوب بولتی رہیں۔ اُن میں پہلے تشکّ... اپنائیت اور اس کے بعد محبّت کا تاثر اُبھر آیا...

"بیٹے... میں تمام عمر تمھارا یہ احسان نہ... سکتی۔" میرے خاموش ہوتے ہی وہ بول پڑ...

"نہیں، آنٹی۔ گلنار ہے ہی ایسی۔ سب... بڑی بات یہ کہ اس پر یہ مصیبت میری وجہ... ٹوٹی۔ میں درحقیقت آپ سے شرمندہ ہوں..."

"مجھے اس کے پاس بھجوا سکتے ہو؟" (... نے التجائیہ لہجے میں پوچھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ مناسب نہیں... پھر مجھے خیال آیا کہ اسلم مرحوم کا کاروبار کراچی میں... جمیل کے ذریعے وہاں گلنار، اس کی امّی اور... کی رہائش کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔

میری خاموشی نے گلنار کی امّی کو اور پر... کر دیا۔ "خدا کے لیے جمال بیٹے... اب میں اس... دُور نہیں رہ سکتی۔"

"ٹھیک ہے آنٹی... آپ تیاری کر لیں... کل کی فلائٹ سے آپ کو کراچی بھجوا دوں گا..." نے کہا۔

اس لمحے اُن کے چہرے پر خوشی کے رنگ... بکھرتے دیکھ کر مجھے اپنی ماں یاد آ گئیں، جن... جُدا ہوئے مجھے مدّتیں ہو گئی تھیں۔ کتنا... تھا میں... مامتا کی چھاؤں سے محروم ہو کر... کی دُھوپ میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔

"کیا بات ہے بیٹے؟" وہ اپنائیت سے... قریب آ گئیں۔

"کچھ نہیں آنٹی۔"

"نہیں، کچھ تو ہے۔ اچھا... میں سمجھ گئی تمھیں ...پنی امّی یاد آ گئی ہیں۔ ہے نا یہی بات؟"

میں مامتا کے احساس کا قائل ہو گیا۔ میں ...ے مُنہ سے تو کچھ نہ کہا لیکن شاید میری آنکھیں ...ب کچھ کہہ گئی تھیں۔

انھوں نے بڑی محبّت سے میرا ہاتھ تھاما ...ور تقریباً گھسیٹتی ہوئی ڈرائنگ روم میں لے ...ئیں اور میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ ان کی ...نگلیوں کا لمس بے حد سکون بخش تھا۔ میں جیسے ...پھولوں کی زنجیر سے بندھا ہُوا اُن کے پیچھے پیچھے ...لا جا رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں کھُلنے والے ...روازے سے وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے ...ئیں۔ وہ خواب گاہ تھی۔ مسہری پر صاف ستھری ...ادر بچھی ہُوئی تھی۔

"یہاں لیٹ جاؤ۔" انھوں نے مسہری کی طرف ...شارہ کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"نہیں آنٹی... میں بالکل ٹھیک ہُوں۔" میں ...ے احتجاج کیا۔

"فضول بات مت کرو۔" انھیں نے مجھے ڈانٹا۔ ...یسا میں کہتی ہُوں، ویسا ہی کرو۔"

ان کی ڈانٹ سُن کر مجھے پھر اپنی امّی یاد آ گئیں۔ ...یں چُپ چاپ مسہری پر دراز ہو گیا۔ وہ سرہانے ...ہی بیٹھ گئیں اور میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ ان ...کی انگلیوں کا لمس بے حد سکون بخش تھا۔

"کب سے سر میں تیل نہیں لگایا... جنگل بنا رکھا ...ہے سر کو۔" وہ مامتا کے مخصوص لہجے میں بولیں۔

میں کوشش کے باوجود جواب نہ دے سکا۔ ...یری آنکھیں مُندی جا رہی تھیں۔ نہ جانے کب کی ...لی ہُوئی تھکن اُبھر آئی تھی اور اس نے مجھے شل ...کے رکھ دیا تھا۔

"لیٹے رہنا یونہی... میں تیل لاتی ہُوں۔"

"ارے نہیں آنٹی..."

"بس چُپ۔" انھوں نے مجھے ڈانٹا اور سامنے کی ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئیں۔

بستر میں رچی مخصوص مہک بتا رہی تھی کہ وہ گلنار کی خواب گاہ ہے۔ ہر ہستی کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ ہر وجود کی اپنی مخصوص مہک ہوتی ہے۔ ذکی الحس لوگ اسے باآسانی پہچان لیتے ہیں۔ میں ذکی الحس ہونے کا دعوا تو نہیں کر رہا ہوں... لیکن محبّت آدمی کو اس مخصوص ہستی کے معاملے میں، جس سے وہ محبّت کرتا ہو، بہت زیادہ حسّاس بنا دیتی ہے۔ مجھے اس بستر پر لیٹ کر گلنار کی قربت کا احساس ہونے لگا۔

آنٹی چند لمحے بعد لوٹ آئیں۔ انھوں نے میرے سرہانے بیٹھ کر میرے سر میں خوب سارا تیل ڈالا اور مالش کرنے لگیں۔ مامتا کا وہ لمس... میں اس کی لذّت، اس کا سُرور بیان نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی وہ بہت دھیمے لہجے میں باتیں بھی کیے جا رہی تھیں۔ وہ مجھے گلنار کے بارے میں بتا رہی تھیں لیکن میری نیم خوابیدہ سماعت تک صرف اُن کی دلنشیں آواز ہی پہنچ رہی تھی۔ میں نے ان کا کہا ہُوا ایک لفظ بھی نہیں سُنا تھا۔ میں تو اس وقت بادلوں کی طرح ہلکا پھلکا ہو کر، بادلوں ہی کے دوش پر پرواز کر رہا تھا۔ اُن کی انگلیاں میرے اُلجھے ہوئے بالوں میں تھرکتی رہیں، ماں کی قربت کا احساس مجھے تھپکتا رہا اور نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

نیند کے اس نامعلوم عرصے میں گلنار میرے ساتھ رہی... لیکن کسی حقیقت کی طرح نہیں بلکہ کسی نازک تصوّر کی صورت... وہ خواب بھی عجیب تھا کہ مجھے خواب ہی محسوس ہو رہا تھا۔ یہ احساس بھی تھا کہ اگر میں نے اسے چھُونے کی کوشش کی تو میری آنکھ کھُل جائے گی۔ وہ قریب بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی رہی... اپنے مخصوص انداز میں دلاسے دیتی رہی۔

آنکھ کھلی تو اس وقت بھی آنٹی میرے سرہانے بیٹھی تھیں۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ "آپ... آپ یہیں بیٹھی ہیں اور میں سوتا رہا۔" میں نے مجوب لہجے میں کہا۔

"تو کیا ہُوا۔" انھوں نے بے پروائی سے کہا۔

"تم ماں کو ترسے ہُوئے ہو تو میں بھی بیٹے سے محروم ہوں۔"

"آ... آپ مجھے بیٹا نہیں سمجھ سکتیں؟"

"تو اور کیا سمجھ رہی ہُوں۔ مجھے تو ایسا لگا ہے، جیسے تم میرے وہ بیٹے ہو جو روزِ ازل ہی سے مجھ سے بچھڑ گیا تھا... لیکن اب تم مجھے مل گئے ہو۔" وہ جذباتی ہو گئیں۔ پھر انھوں نے خود کو سنبھالا۔ "اٹھو... باتھ روم جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمھارے لیے کھانا نکالتی ہُوں۔"

اُن کے کہنے پر مجھے احساس ہُوا کہ مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے۔ میں باتھ روم کی طرف بڑھ گیا اور وہ کچن کی طرف چلی گئیں۔ میں باتھ روم سے آیا تو وہ چھوٹی سی میز پر کھانا لگا چکی تھیں۔ سادہ سا کھانا۔ دال بھتی اور سلاد... لیکن لاہور آنے کے بعد سے اب تک مجھے کوئی کھانا اتنا لذیذ نہیں لگا تھا۔ میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ انھوں نے میرا ساتھ نہیں دیا کیونکہ وہ میری آمد سے پہلے ہی کھا چکی تھیں۔ کھانے کے بعد وہ گرم گرم چائے کی ایک پیالی لے آئیں۔

"تم سوچ رہے ہو گے کہ میں کتنی خود غرض ہُوں۔"

کچھ دیر بعد انھوں نے کہا۔ "گلنار کی خیریت معلوم ہو گئی تو تمھارے سامنے بچھی جا رہی ہوں... ورنہ تمھیں دھکّے دے کر نکالنے پر تلی ہوئی تھی۔"

"نہیں... ایسا نہ سوچیں، کیا میں آپ کے جذبات نہیں سمجھ سکتا۔"

"ہاں سمجھ سکتے ہو۔" انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میرا بس چلے تو میں ابھی اُڑ کر گلنار کے پاس پہنچ جاؤں۔"

"فکر نہ کریں۔ کل پہنچ جائیں گی اور اُڑ کر ہی پہنچیں گی، یعنی بائی ائیر۔" میں نے انھیں تسلی دی۔ پھر میں نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالی رکھ دی اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "اچھا آنٹی... اب میں اجازت چاہوں گا۔"

"تو پھر کل..." اُن کے لہجے میں بے قراری تھی۔

"آپ تیار رہیے گا۔ میں کل شام آپ کو لینے آؤں گا۔"

وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئیں۔ رخصت کرتے وقت انھوں نے میری پیشانی [چوم] لی۔ میں سرشاری کے عالم میں باہر نکل آیا۔ اس وقت میں ممتا کی خوشبو سے سرشار ہو رہا تھا۔ کوئی بھی مسئلہ مجھے پریشان نہیں کر رہا تھا۔

اکھاڑے پہنچا تو پتہ چلا کہ استاد ابھی واپس نہیں آئے۔ جیرے نے استاد کے برابر [کا] کمرہ کھول کر صفائی کر دی تھی۔ اب میرے پا[س] آرام کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اس وقت ذہن میں خوش[گوار] خیالات کا ہجوم تھا... اور یہ سب آنٹی کی کرم فرمائی تھی۔

دیر تک میں بستر پر لیٹا مستقبل کے خوش[گوار] تصورات میں کھویا رہا۔ پھر اُٹھا اور اکھاڑے پہنچ گیا۔ وہاں اچھے خاصے لوگ جمع تھے۔ تین پہلوان زور کرنے میں مصروف تھے۔

"واہ بھئی... آج تو قائم مقام استاد بھی آ[گئے]" مجھے دیکھتے ہی واحد پہلوان چہکا۔

"آج تو زور کرو گے یار۔" رشید نے پوچھا۔

"ہاں... بہت دن ہو گئے ہیں۔ میں ابھی آتا [ہوں]" میں یہ کہہ کر غسل خانوں کی طرف بڑھ گیا۔

واپس آ کر میں نے پہلے تو کچھ دیر کسرت [کی]، پھر رشید اور واحد کے ساتھ زور کرنے لگا۔ بہت [دنوں] بعد اکھاڑے کی مٹی میسر آئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ [اس میں] بکھر جاؤں۔ مغرب سے ذرا پہلے تک یہی مصروف[یت] رہی... پھر میں نے غسل کر کے لباس تبدیل کی[ا]۔ اس دوران استاد آ گئے تھے۔ اکھاڑے ہی [میں] محفل جم گئی۔ فقرے چُست کیے جاتے رہے اور [قہقہے] گونجتے رہے۔ اس روز ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بات کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔

رات کا کھانا کھا کر کچھ دیر اجتماعی چہل [قدمی] کی گئی اور پھر اکھاڑے کے اصولوں کے مطا[بق] جلدی سونے کی غرض سے میں کمرے میں [آگیا]۔ کسرت اور زور کی تھکن کے باعث بستر پر ل[یٹتے ہی مجھے]

[مجھے جلد ہ]ی نیند آ گئی۔

صبح فجر سے ذرا پہلے آنکھ کھُل گئی۔ میں نے [اس]تاد کے ساتھ باجماعت نماز پڑھی اور واپس آ [کر ن]اشتہ کیا۔ عجیب سی طمانیت کا احساس ہو رہا [تھ]ا۔ دل و دماغ روشن روشن ہو رہے تھے۔

"استاد... تمھارے ساتھ رہنے لگوں تو [ش]اید مجھ جیسا مطمئن آدمی رُوئے زمین پر نہیں [م]لے گا۔" میں نے استاد سے کہا۔

"برخوردار... بات میرے ساتھ رہنے کی [ن]ہیں ہے۔" استاد نے بڑی سنجیدگی سے جواب [د]یا۔ "کہیں بھی رہو... نماز پڑھتے رہو۔ جو وقت [ا]للہ کی قربت میں صرف ہوتا ہے، اس سے زیادہ [حس]ین اور پُرسکون وقت کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ شرمندگی کا [اح]ساس ہونے لگا تھا۔ فضول اور تکلیف دہ [مص]روفیات میں اُلجھ کر میں وقتی طور پر خدا کو بھی [بھ]ول گیا تھا... اُس خدا کو، جس نے مجھے اس [د]وران کبھی نہیں بھُلایا تھا... جس نے ہمیشہ [م]یری دستگیری فرمائی تھی۔ میں نے دل ہی دل [م]یں عہد کیا کہ ان اُلجھنوں سے نکلتے ہی سختی سے [نم]از قائم کروں گا۔

دس بجے کے قریب ثاقب جمیل آ گیا۔ وہ تنہا [ت]ھا۔ اسپتال سے اُسے مجو پہلوان کے اکھاڑے [ک]ا پتہ چل گیا تھا اور اکھاڑا تلاش کرنے میں اسے [ک]وئی دقت نہیں ہُوئی تھی۔ وہ آیا تو میں استاد [ک]ے کمرے میں بیٹھا اُن سے باتیں کر رہا تھا۔

جمیل اپنے ساتھ کچھ کاغذات اور گوشوارے [ل]ایا تھا، جو اس نے میرے سامنے رکھ دیے۔ میں اُن کی اہمیت سے ناواقف تھا، چنانچہ اس نے مجھے ان کے ذریعے اسلم مرحوم کے کاروبار کی تفصیل سمجھائی۔ کراچی میں دو ٹیکسٹائل ملز تھیں۔ فیصل آباد میں بھی ایک مل تھی جب کہ کئی ایکڑ زرعی زمین اس کے علاوہ تھی۔ وہ تفصیل سُنا چکا تو میں نے اس کے سامنے اپنا مسئلہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ "جمیل... تمھیں کچھ افراد کے لیے کراچی میں رہائش کا بندوبست کرنا ہے، کر سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں کیا کر سکتا ہُوں، مالک آپ ہیں۔" وہ مُسکرایا۔ "میں تو صرف اتنا بتا سکتا ہُوں کہ اسلم مرحوم کا ایک بنگلہ کراچی میں بھی ہے۔ ڈیفنس سوسائٹی میں بنا ہُوا ایک عالی شان بنگلہ۔"

میں کچھ دیر سوچتا رہا اور کڑھتا رہا کہ مجھے پہلے ہی یہ خیال کیوں نہ آیا۔ خیر دیر آید، درست آید۔ "کل کی فلائٹ پر کراچی کے لیے دو سیٹیں بُک کرا لو۔" میں نے کہا۔

"آپ بھی چلیں گے؟"

"نہیں ایک خاتون تمھارے ساتھ جائیں گی۔ میں تمھیں کراچی کا ایک پتہ دوں گا، وہاں دو لڑکیاں مقیم ہیں۔ اس بنگلے میں ان خواتین کی رہائش کا بندوبست کرنا ہو گا۔ ملازمین بھی رکھ سکتے ہو۔"

"ہو جائے گا جناب،" جمیل نے مستعدی سے کہا۔ "چوکیدار اور مالی تو پہلے سے وہاں موجود ہیں۔"

"اور تم ائیرپورٹ جاؤ گے؟" اچانک استاد نے مجھ سے پوچھ لیا۔

"جی ہاں۔" میں نے چونک کر کہا۔ "کیوں؟"

"نہیں برخوردار، ابھی چند دن تمھیں اپنے ہاتھ پاؤں سمیٹ کر رکھنا ہوں گے۔" استاد کے لہجے میں سختی تھی۔

میں چند لمحے سوچتا رہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ٹھیک ہے استاد، جیسا تم کہو۔" میں ثاقب کی طرف متوجہ ہُوا۔ "تم سیٹیں ریزرو کرا لو۔ کل صبح دس بجے یہاں آ جانا۔ میں تمھیں اُن خاتون کا پتہ بھی دوں گا، جنھیں تمھارے ساتھ کراچی جانا ہے۔ انھیں لے کر سب سے پہلے اس پتے پر جانا جہاں وہ دونوں لڑکیاں رہتی ہیں اور میں چاہتا ہُوں کہ تم کراچی ہی میں رہو کیونکہ مجھے وہاں کے کاروباری معاملات زیادہ اہم محسوس ہوتے ہیں۔"

"آپ کا فیصلہ درست ہے جناب۔" اس نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ پھر اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اس پر آپ کی تمام فیکٹریوں اور دفاتر کے پتے اور

فون نمبر لکھے ہوئے ہیں۔ آپ جب چاہیں رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔"

"شکریہ" میں نے کاغذ لے لیا۔

"اور میں آپ کی کراچی آمد کا منتظر رہوں گا۔" اس نے پُرخلوص لہجے میں کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

وہ چلا گیا تو کچھ دیر خاموشی رہی، پھر استاد بولے "تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ کل میں کہاں گیا تھا؟"

"میں نے سوچا اگر میرا جاننا ضروری ہُوا تو آپ خود ہی بتا دیں گے۔"

"میں حامد سے ملنے گیا تھا۔" استاد نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "اس نے ملازمت سے استعفا دے دیا ہے لیکن ابھی استعفا منظور نہیں ہُوا۔ کچھ دفتری چکر ہیں۔ شاید معطلی کے دوران استعفا نہیں دیا جا سکتا۔"

"اوہ... لیکن اس نے استعفا کیوں دیا ہے؟"

"وہ بہت پُرعزم نوجوان ہے۔" استاد نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "کوئی کام ادھورا چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ اسے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ پولیس میں رہتے ہوئے اس تنظیم کے خلاف کام نہیں کر سکتا۔ اس نے فوراً ہی متبادل لائحہ عمل تیار کر لیا۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ تنظیم کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکے گا۔ ملازمت چھوڑ کر وہ اس سلسلے میں اپنی کوئی تنظیم بنانے کے چکر میں ہے۔"

میں ایس پی حامد سے صرف ایک بار ملا تھا اور وہ ملاقات بے حد مختصر تھی۔ ایک ناگوار فیصلے کے باوجود استاد کے حوالے سے اس نے مجھ پر اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ لیکن اس روز وہ اپنے ہی حوالے سے میری نظروں میں معتبر ہو گیا۔ اس دور میں فرض شناسی کی ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔

"اور یہی ہمارا مشن ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں... حامد کے آنے سے ہمارے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے۔ اپنے اعلیٰ کردار اور دردمندی کی وجہ سے پولیس کے محکمے میں اس کے بہت چاہنے والے ہیں۔ وہ دَرپردہ ہماری مدد کریں گے۔"

یہ ایک اچھی خبر تھی۔ میں مُسکرا دیا۔ "قد... جب کوئی کام کرنا مقصود ہوتا ہے تو بات بن جاتی ہے۔ تو اب استعفے کا کیا ہوگا؟" ... دریافت کیا۔

"حامد بتا رہا تھا، اس نے اپنے افسر... کہہ دیا ہے کہ فرض کے راستے میں کوئی رُکاو... کرنے سے بہتر ہے کہ وہ وردی اُتار پھینکے... کے افسروں کو اس سے ہمدردی ہے لیکن کا... اونچی سطح پر ہوتی ہے۔ بہرحال، ہو رہے... نہ کچھ..."

دوپہر کے کھانے کے بعد استاد، حامد... چلے گئے۔ جاتے جاتے انھوں نے سختی سے... کی تھی کہ میں باہر نہ نکلوں۔ میں نے وعدہ ک... میرا وعدہ خلافی کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

استاد کو گئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہُوا ہ... جیرے نے کسی شخص کے آنے کی اطلاع د... "ہٹو ہٹو ٹو ہنڈ آدمی ہے۔" اس نے کہا۔ "پہلے ا... کو پوچھ رہا تھا، پھر تمھیں پوچھنے لگا۔"

"بُلا لاؤ۔" میں نے بے نیازی سے کہا... سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔

چند لمحے بعد ایک جوان العمر آدمی کمر... داخل ہُوا۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مالک تھا... گھنگریالے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف... تھا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت متاثر کُن...

میں اس کی پیشوائی کے لیے اٹھ کھڑ... اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ میں نے... کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف ر..."

وہ شکریہ کہہ کر کُرسی پر بیٹھ گیا۔ بریف... اس نے اپنے قدموں میں رکھ لیا تھا۔ "آپ ہیں نسیم جمال صاحب؟" اس نے شستہ... دریافت کیا۔

میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے ا... ہے کہ آپ کو پہچانا نہیں۔"

"آپ پہلے مجھ سے ملے ہی نہیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "اس لیے پہچانیں گے کیسے؟"

"تو پھر آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

"آپ کو کون نہیں جانتا صاحب؟" اس نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "بہرحال، میرا نام فیروز ہے اور میں شکاگو سے آیا ہوں۔"

"فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"میں آیا تو استاد سے ملنے تھا... لیکن پھر سوچا کہ آپ ہی کے درشن کرتا چلوں۔"

میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی اور وہ شاید مجھے مزید الجھانے کے موڈ میں تھا لیکن وہ استاد کا مہمان تھا۔ "چائے پئیں گے یا ٹھنڈا؟" میں نے پوچھا۔

"چائے ہی پلوا دیں۔ وطن کی چائے کو ترس گیا ہوں۔ چائے پی کر ہی آپ سے باتیں ہوں گی۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں اُٹھا اور جیرے کو چائے منگوانے کا کہہ آیا۔ کچھ دیر بعد چائے آ گئی۔ ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ اس نے پیالی خالی کر کے میز پر رکھی۔ میں اپنی چائے پہلے ہی ختم کر چکا تھا۔ "اب فرمایئے۔" میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"فرمانا کیا ہے... میں نے عرض کیا نا کہ بس آپ کے درشن کرنا تھے۔"

میں نے بمشکل اپنے غصّے اور جھنجلاہٹ پہ قابو پایا۔ "آپ نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"آپ کی تصویر دیکھی تھی۔"

"کہاں؟" میں مزید الجھ گیا۔

"ایک فائل میں۔" اس نے پھر مختصر جواب دیا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"فائل کا مطلب نہیں سمجھے؟" اس نے حیرت ظاہر کی۔ "آپ کے دوستوں کے پاس آپ کی مکمل فائل موجود ہے۔" اس نے دوستوں پر خاصا زور دیا۔

میں چونک پڑا۔ "اور آپ کون ہیں؟"

"میں انجم فیروز ہوں۔ اس تنظیم کا نیا سربراہ جس سے آپ کی ٹھنی ہوئی ہے۔" اس نے دھماکا کیا۔

میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور پلک جھپکتے ہی ریوالور نکال کر اس پر تان لیا۔ "اب تم یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے۔"

"لیکن میں تنہا نہیں مروں گا۔ یہ ساری بستی اُجڑ جائے گی۔ ویسے میں یہاں دُشمن بن کر نہیں آیا ہوں۔"

"تم مجھے بہلا نہیں سکتے۔" میں غرّایا۔

"ریوالور جھکا لو جمال۔ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں یہاں بُرے ارادے سے نہیں آیا تھا، پھر بھی ہم جیسے لوگ خالی ہاتھ نہیں نکلتے۔ یہ بریف کیس دیکھ رہے ہو؟" اس نے اپنے قدموں کی طرف اشارہ کیا۔ "اس بریف کیس میں انتہائی طاقتور بم ہے... اور وہ بم ایک مخصوص لفظی ترتیب سے پھٹ سکتا ہے۔ سمجھے۔ میرے مُنہ سے وہ مخصوص لفظ ادا ہونے کا مطلب تباہی ہے۔ ریوالور جھکا لو۔ میں چاہوں تو اس وقت تمھیں اپنے ساتھ بھی لے جا سکتا ہوں۔"

ریوالور والا ہاتھ جھک گیا۔ میرا جسم سنسنا رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت بساط اس کے حق میں تھی... اور وہ اس خوفناک تنظیم کا نیا سرغنہ تھا۔ میں اس کی بات پر شک کر کے بے گناہوں کی ہلاکت کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

میرا ریوالور والا ہاتھ جُھک گیا۔ مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔ اگر اس کا دعویٰ درست تھا اور وہ واقعی تنظیم کا نیا سربراہ تھا تو وہ اتنی آسانی سے قابو میں آنے کے لیے وہاں نہیں آیا ہوگا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ میں اس کی بات پر شک کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ میرے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی۔ "جیسا سُنا تھا، تمھیں ویسا ہی پایا۔" اس نے کہا۔ "تم انتہائی خراب صورتِ حال میں بھی سوچ سکتے ہو۔ ...اور میرا خیال ہے کہ تمھاری سوچ کی سمت بھی غلط نہیں ہے۔"

میں چند لمحے خاموش رہا پھر پوچھا۔ "مجھ سے کیا

چاہتے ہو؟"

"اتنی جلدی کیا ہے؟ ہو جائیں گی، یہ باتیں بھی۔"
اس نے بے نیازی دکھائی۔

اچانک میری نظر ایک لمحے کے لیے دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ میں فوراً ہی اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا، جو اپنا نام انجم فیروز بتاتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری نظروں کے تعاقب میں دروازے کی طرف دیکھے۔ مجھے تو یہ ڈر تھا کہ کہیں اس نے میری نظروں کی وہ لمحاتی لغزش بھی نہ دیکھ لی ہو، لیکن اس وقت ترپ کا اکا اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بے حد پُراعتماد تھا۔ ایسے میں آدمی عموماً جزئیات کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر سکا تھا۔

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ میں اسے باتوں میں لگائے رکھوں۔ "میں نہیں سمجھ سکتا کہ تمہارا استاد سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔" میں نے تاؤ دلانے والے لہجے میں کہا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھ لیا تھا کہ ایس پی حامد بے قدموں کمرے میں داخل ہو گیا ہے اور پشت کی طرف سے اس کی سمت بڑھ رہا ہے۔

"تمہارا خیال غلط ہے۔" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "سانپ اور نیولے کے تعلق سے کون انکار کر سکتا ہے۔"

"گویا تم سانپ ہو۔" میں نے مضحکہ اڑایا۔

"دیکھو برخوردار۔۔۔ لمبی زبان صرف عورتوں کے منہ میں اچھی لگتی ہے۔ میں۔۔۔"

اس کے الفاظ گھٹ کر رہ گئے۔ حامد نے عقب سے اس کی کنپٹی پر تلا ہوا وار کیا تھا۔ ساتھ ہی میں بھی تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ میں نے اس کا منہ دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ وہ ہاتھ پیر مار ہی رہا تھا کہ حامد کی کھڑی ہتھیلی دوسری بار اس کی کنپٹی سے ٹکرائی۔ اس مرتبہ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیے اور وہ کرسی میں گر گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

"آ۔۔۔ آپ۔۔۔" میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن حامد نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ پھر اس نے بے ہوش آدمی کی پلکیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مطمئن ہو کر مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

"جیرے۔۔۔ تم کمرے میں جاؤ۔" حامد نے [illegible] دی۔ "وہ شخص اگر ہوش میں آنے لگے تو اسے پھر [illegible] کر دینا۔ یاد رکھو۔۔۔ ذرا سا کسمسائے تو فوراً ہی [illegible] دینا۔۔۔ ورنہ یہاں ہم سب کی قبریں بن جائیں گی۔ اور ہاں، خاموش رہنا۔ ایک لفظ بھی زبان سے [illegible]"

جیرا سر ہلاتے ہوئے کمرے کی طرف چلا گیا۔

حامد میری طرف متوجہ ہوا۔ "صورت حال تو [illegible] بہتر ہو گئی ہے۔" اس نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ "لیکن [illegible] کی سنگینی بدستور ہے۔ ہمیں علم نہیں کہ وہ کون لفظ ہے، جس سے وہ بریف کیس پھٹ سکتا [illegible] اگر لاعلمی میں وہ لفظ ہمارے منہ سے ادا ہو گیا تو [illegible] صرف اپنی بلکہ بہت سے بے گناہوں کی تباہی [illegible] بن جائیں گے۔"

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ پروفیشنل تھا۔۔۔ وہی اسی انداز میں سوچ سکتا تھا۔

"اب میری بات غور سے سنو اور تیزی سے [illegible] کرو۔" اس نے مزید کہا اور چابی میری طرف بڑھا [illegible] "میری کار کھڑی ہے۔ بریف کیس لے جاؤ اور اسے دریا برد کر دو۔ میں اسے سنبھالتا ہوں، لیکن بے حد [illegible]"

میں اس کے ساتھ کمرے میں واپس آیا۔ [illegible] اب بھی بے ہوش تھا اور جیرا اس کے سامنے اس [illegible] کھڑا تھا، جیسے پلکیں جھپکتے ہی اس کے سر پر [illegible] توڑ دے گا۔ میں نے بریف کیس اٹھایا اور بغیر [illegible] باہر نکل آیا۔

بریف کیس اگلی نشست پر رکھ کر میں نے [illegible] اسٹارٹ کی۔ پھر بریف کیس پر نظر پڑتے ہی [illegible] ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ مجھے خوف آنے لگا۔ اگر [illegible] کیس میں موجود خوفناک بم پھٹ جاتا تو۔۔۔ [illegible]

ایس پی حامد نے جتنی آسانی سے یہ کام میرے سپرد [illegible] تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ایسا کوئی خطرہ نہیں [illegible] وہ جدید ترین بم تھا اور صرف ایک مخصوص لفظ کی ادا[illegible] سے پھٹ سکتا تھا۔ اس اطمینان کے باوجود میرے جسم پر پسینے کے سانپ سرسراتے رہے۔ میں ا[illegible] وقت شہر کی گنجان اور مصروف سڑکوں پر تھا۔ کون جا[illegible] [illegible]ب کوئی وہ مخصوص لفظ ادا کر دے۔۔۔ کون جانے [illegible]یف کیس میں بند تباہی کی سماعت کتنی حساس ہو۔

[illegible]ں نے کار کا رخ راوی کے پل کی طرف کر دیا اور [illegible]ن بہ تقدیر ہو گیا۔ ابھی کار پل سے کچھ ہی فاصلے پر تھی کہ [illegible]یرا ماتھا ٹھنکا۔ پل پر بے شمار پولیس والے نظر آ رہے تھے۔ [illegible]دا جانے، کوئی واردات ہو گئی تھی یا کچھ اور معاملہ تھا۔ [illegible]چھ بھی رہا ہو، میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ میں اس [illegible]صورت حال میں، بریف کیس دریا میں نہیں پھینک [illegible]سکتا تھا۔ مایوسی کی ایک تند لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔

میں نے کار سڑک سے اتاری اور کچے میں روک دی۔ پھر میں بیٹھ کر سوچتا رہا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ میرے خیال میں ایس پی حامد سے چوک ہو گئی تھی۔ بریف کیس کو دریا میں پھینکنا مخدوش تھا۔۔۔ اور بالخصوص راوی جیسے دریا میں، جو عام حالات میں بہت اتھلا رہتا تھا۔ محفوظ ترین صورت یہ تھی کہ بریف کیس کو کسی ویرانے میں دفن کر دیا جائے۔ اس کے لیے کدال اور پھاوڑے کی ضرورت تھی۔ یہ سامان میرے پاس موجود نہیں تھا۔

میں نے کار بیک کی اور شہر کی طرف واپس چل دیا۔ سب سے پہلے مجھے کدال اور پھاوڑا خریدنا تھا۔ دونوں چیزیں میں نے کار کی ڈکی میں رکھیں اور واپس آ گیا۔ پل پر صورت حال اب بھی ویسی ہی تھی۔ اس بار میں بے دھڑک آگے بڑھ گیا۔ پل سے کچھ فاصلے پر مجھے روک لیا گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" ایک اے ایس آئی نے پوچھا۔

"مقصور۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے مجھ سے ڈرائیونگ لائسنس اور گاڑی کے کاغذات طلب کیے۔ ڈرائیونگ لائسنس میرے پاس نہیں تھا البتہ میں نے ڈیش بورڈ سے گاڑی کے کاغذات نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ کاغذات دیکھتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اب وہ مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ "یہ گاڑی کس کی ہے؟" اس نے پوچھا۔ اس بار لہجہ قدرے سخت تھا۔

"ایس پی حامد کی۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"تم انھیں کیسے جانتے ہو؟"

"وہ میرا دوست ہے۔"

اے ایس آئی نے ناقدانہ نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ پھر میرے جملے نے اسے مطمئن کر دیا۔ "ایس پی صاحب کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"استاد مجو کے اکھاڑے پر۔"

وہ مزید مطمئن نظر آنے لگا۔ شاید مجو پہلوان اور ایس پی کا تعلق اس کے علم میں بھی تھا۔ "معاف کیجیے گا، میں نے آپ کو زحمت دی۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "آپ جا سکتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "میں آپ کا فرض سمجھتا ہوں۔"

گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے میں نے سکون کا سانس لیا۔ جتنی دیر تک وہ سوال و جواب کرتا رہا تھا، میری جان سولی پر لٹکی رہی تھی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ وقت پڑنے پر میں اسے اکھاڑے کا فون نمبر بھی دے سکتا تھا۔ وہ حامد سے بات کر کے میرے متعلق تصدیق کر سکتا تھا۔ بات یہ تھی کہ اس بریف کیس کی موجودگی میں گفتگو میرے اعصاب کشیدہ کر رہی تھی۔ میں نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور ایکسیلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔

کچھ دیر بعد مجھے اپنے مطلب کی جگہ مل گئی۔۔۔ وہ قدِ آدم جھاڑیوں سے بھرا ایک ویرانہ تھا۔ میں کار کچے میں اتار لے گیا۔ کار کھڑی کر کے میں نے ڈکی کھولی، کدال اور پھاوڑا نکالا اور کھدائی شروع کر دی۔ خوش قسمتی سے

زمین نرم تھی۔ میں نے کافی گہرا گڑھا کھود ڈالا۔ میرے جسم سے اب بھی پسینہ بہہ رہا تھا۔۔۔ لیکن یہ پسینہ خوف کا نہیں تھا۔

گڑھے کی گہرائی سے مطمئن ہوکر میں نے بریف کیس نکالا اور احتیاط سے گڑھے میں رکھ دیا۔ پھر پھاوڑے سے مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ بریف کیس دفن کرنے کے بعد میری جان میں جان آئی۔ میں نے کدال اور پھاوڑا ڈکی میں رکھ کر ڈکی کو لاک کیا اور کار میں آ بیٹھا۔ اب میں پُرسکون تھا۔ ایک بہت بڑی مصیبت سے پیچھا چھوٹ چکا تھا۔

راوی کے پل پر پولیس والے اب بھی موجود تھے۔ اس مرتبہ انھوں نے مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ میں تیز رفتاری سے نکلا چلا آیا۔ اکھاڑے پہنچا تو منظر بدستور تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جیرا اور ایس پی حامد سکون سے بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے وہ فیروز کے ہوش میں آنے سے خائف تھے جبکہ اب خصوصاً حامد اسے ہوش میں دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ شاید اس کے ہاتھ کچھ زیادہ ہی تگڑے ثابت ہوئے تھے۔

"پیچھا چھڑا آئے، اُس بلا سے؟" حامد نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

میں نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا تو اس کی نگاہوں میں میرے لیے ستائش نظر آنے لگی "واہ۔۔۔ یہ کام کیا ہے تم نے!" اُس نے تعریفی لہجے میں کہا: "اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا!"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فیروز کسمسانے لگا۔ ہم سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چند ہی لمحے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ اب وہ پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"جس چیز کی تمھیں تلاش ہے، وہ اتنی دُور پہنچ چکی ہے کہ تم گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخو، تب بھی کچھ نہیں ہوگا!" حامد نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

فیروز مایوس نظر آنے لگا، لیکن پھر اس نے سنبھالا لیا "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے!"

"ظاہر ہے!" حامد نے مضحکہ اُڑایا "ہم تمھیں جان سے تو مار نہیں سکتے۔ یہ ہماری تنظیم کے اصولوں کے خلاف ہے۔ البتہ ہم تمھیں اپاہج بنا کر ایک گاڑی بٹھا کر بھیک ضرور منگوا سکتے ہیں۔ اس صورت میں ہمارے لیے مستقلاً فائدہ مند ثابت ہو گے!"

فیروز کے چہرے پر لمحہ بھر کو سراسیمگی نظر آئی اُس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا "فضول باتیں مت" اُس نے اٹھتے ہوئے کہا "میں جا رہا ہوں اور تم نہیں روک سکتے!"

جیرا لپک کر دروازے پر پہنچا اور پھیل کر کھڑا حامد بھی اُٹھ کھڑا ہوا "ہاں۔۔۔ اس میں کوئی حرج اُس نے سرد لہجے میں کہا "جتنی زیادہ ٹوٹ پھوٹ اتنا ہی لوگ تم پر ترس کھائیں گے۔۔۔ اور جتنا تم ترس کھایا جائے گا، اتنی ہی زیادہ کمائی ہو گی۔ ا تو ہمارا فائدہ ہی ہے!"

فیروز ٹھٹک گیا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"پہلے تم اپنی آمد کا مقصد بتاؤ گے" حامد نے کہا ہمیں غیر معینہ مدت کے لیے شرف میزبانی بخش

"اور وہ مقصد مجھ سے کون پوچھے گا؟ تم" فیروز نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

حامد نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے فیروز کی طرف بڑھ گیا "تمھیں پر مجبور کرنے کے لیے میں ہی کافی ہوں" میں نے

"اچھا! وہ کیسے؟" اُس کا انداز مضحکہ اڑانے

"انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی بہت اہم ہو" میرا انداز ایسا تھا، جیسے کسی میڈیکل کے طالب لیکچر دے رہا ہوں "دماغ اعصابی نظام اور تمام کو اسی کے ذریعے کنٹرول کرتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی پر ڈالا جائے تو تم چلنے پھرنے سے معذور ہو سکتے ہو سلب ہو سکتی ہے۔۔۔ اور دماغ بھی ماؤف ہو ہے۔۔۔!"

"اور میری ریڑھ کی ہڈی پر دباؤ کون ڈالے اُس نے پھر مضحکہ اڑایا۔

"یہ خدمت میں بلا معاوضہ سرانجام دوں گا" نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فدویانہ انداز

وہ تیزی سے پینترا بدل کر کھڑا ہو گیا۔ اب کے چہرے پر سفاکی نظر آ رہی تھی۔ اس کے انداز سے پتا چل گیا کہ وہ مارشل آرٹس جانتا ہے۔ گویا وہ میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

"اور میری بھی سنو!" اچانک حامد کی آواز سنائی دی "یہ ریوالور بے آواز ہے!"

وہ حامد کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے نپی تلی جست لگائی اور اُس سے لپٹ گیا۔ میری انگلیاں اس کی ریڑھ کی ہڈی پر مخصوص انداز میں دباؤ ڈال رہی تھیں۔ وہ تیزی سے پلٹا۔۔۔ لیکن اس وقت تک میں اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ اس نے زور لگایا۔۔۔ اور یہ اُس کے اپنے حق میں بُرا ثابت ہوا۔ اگلے ہی لمحے وہ فرش پر پڑا تیزی سے ہاتھ پاؤں پٹک رہا تھا۔ اس کے حلق سے ذبح ہوتے ہوئے جانور کی سی آوازیں نکل رہی تھیں، وہ بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہا۔

"خ۔۔۔ خُدا کے۔۔۔ لل۔۔۔ لیے۔۔۔ مجھے اس تک۔۔۔ لیف سے نجات دلاؤ!" وہ گڑگڑانے لگا۔

"اپنی آمد کا مقصد بتاؤ!" حامد نے سرد لہجے میں کہا۔

"اس۔۔۔ تکلیف میں!" وہ گڑگڑایا۔

"ٹھیک ہے، تمھیں اس سے نجات مل جائے گی" حامد نے جواب دیا "لیکن یاد رکھنا، اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو تمھارے دونوں گھٹنوں پر فائر کر دوں گا۔۔۔ اور پھر تمھاری زندگی بھیک مانگتے گزرے گی!"

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب بولے بغیر اس کے لیے کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ بُری طرح چنگھاڑ رہا تھا۔ میں نے ایک منٹ انتظار کیا پھر اسے پلٹ کر ریڑھ کی ہڈی پر دباؤ ڈالا۔ اس کی چیخیں ختم کئیں لیکن وہ ساکت پڑا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اتنی دیر میں وہ نڈھال ہو چکا ہے۔ چند لمحے بعد اُس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن حامد نے ریوالور لہراتے ہوئے کہا "وہیں پڑے رہو۔۔۔ اور شروع ہو جاؤ!" اُس کے لہجے میں تحکم تھا۔

فیروز ساکت ہو گیا۔ چند لمحے وہ حامد کو کینہ توز نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر اُس کی نگاہوں سے بے بسی جھلکنے لگی "ٹھیک ہے، میں بتاتا ہوں!" اس نے کمزور آواز میں کہا "میں شکاگو سے آیا ہوں۔ میرا تعلق تنظیم سے ہے۔۔۔ اور میں تنظیم کا سربراہ نہیں ہوں!"

"اس کی کوئی اہمیت نہیں!" میں نے کہا "ایک دن تمھارا سرغنہ بھی اسی طرح ایڑیاں رگڑ رہا ہوگا۔ ہاں! بیان جاری رکھو!"

"میں نسیم جمال کو اغوا کرنے آیا تھا!" اُس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ڈائریوں والا معاملہ اب بھی صاف نہیں ہوا ہے۔ تنظیم کو ہر قیمت پر ڈائریاں درکار ہیں۔ مجھے شکاگو سے خاص طور پر اسی کام کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ میں اسے اغوا کر کے لے جاتا۔۔۔ اور میرے تشدد کے سامنے اسے زبان کھولنا پڑتی!"

"ہاں۔۔۔ یہ تو ثابت ہو رہا ہے، تمھاری حالت دیکھ کر!" حامد کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔ مجھے جانے دو!"

"تم بھول رہے ہو۔ میں نے کہا تھا کہ تم غیر معینہ مدت کے لیے ہمیں شرف میزبانی بخشو گے!"

"تم اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ تنظیم کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں!"

"مجھ سے زیادہ کسے اندازہ ہو سکتا ہے!" حامد نے معنی خیز لہجے میں کہا "لیکن لمبے ہاتھ کاٹ دینا اور لمبی زبانیں کھینچ لینا میری ہابی ہے!" پھر وہ جیرے کی طرف متوجہ ہوا "جیرے، رسّی لاؤ اور اس کے ہاتھ پیر باندھ کر برابر والی کوٹھری میں پھینک دو!"

جیرا باہر چلا گیا اور چند لمحے بعد رسّی لے آیا۔ اُس نے فیروز کے ہاتھ پیر باندھے اور اُسے کسی کھلونے کی طرح اٹھا لے گیا۔

"اب تمھارے جوہر سامنے آ رہے ہیں!" ایس پی حامد مجھ سے مخاطب ہوا "میرا خیال ہے، ہماری پہلی ملاقات کچھ اچھے حالات میں نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے بارے میں پہلا تاثر خراب ہی رہا ہوگا!"

"آپ کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "البتہ آپ کے بارے میں میرا تاثر خراب نہیں تھا!"

جیرا کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس نے بتایا کہ فیروز کو کوٹھری میں بند کر دیا ہے۔ پھر وہ بھی وہیں بیٹھ گیا۔ ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ موضوعِ سخن استاد ہی تھے۔

کافی دیر بعد استاد بھی آ گئے۔ "تم یہاں ہو؟" انھوں نے حامد کو دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔ "اور میں تمھاری طرف گیا تھا۔"

"میں آپ سے ملنے آیا تھا۔" حامد نے جواب دیا۔ "یہاں آ کر پتہ چلا کہ بروقت پہنچا ہُوں۔ کچھ دیر ہو گئی ہوتی تو آپ کا یہ بھتیجا اُڑ گیا ہوتا۔" اُس نے میری طرف اشارہ کیا۔

استاد نے استفسار طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے برخوردار۔ یہ میں کیا سُن رہا ہُوں۔ یعنی تم بھی رسّی تڑا کر بھاگنے کے چکر میں ہو؟" انھوں نے مخصوص شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

"میں تو بھاگنے کے چکر میں نہیں ہُوں۔" میں نے بھی خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ "البتہ ایک آدمی بریف کیس میں بم رکھ کر پُرانے وقتوں کی طرح کھل جا سم سم کی طرح کا ایک نامعلوم لفظ لیے نازل ہُوا تھا۔"

"کہاں کی ہانک رہے ہو؟" استاد سنجیدہ ہو گئے۔

"خود دیکھ لیں چل کر۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ حامد اور جیرا بھی اُٹھ گئے۔

کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ جیرے نے کنڈی کھولی ... اور فوراً ہی اس کے مُنہ سے حیرت بھری چیخ نکل گئی۔ میں نے بھی اندر جھانکا ... اور دم بخود رہ گیا۔ اندر صرف وہ رسّی پڑی تھی، جس سے فیروز کے ہاتھ پیر باندھے گئے تھے۔ گندی گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور وہ گویا ہمارا مُنہ چڑا رہی تھی۔

"یہ کیا ہُوا؟" میں نے بوکھلا کر جیرے سے پوچھا۔

اتنی دیر میں استاد اور حامد بھی اندر آ چکے تھے۔ استاد کی نگاہوں میں سوال تھا جبکہ ایس پی حامد حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔

جیرے کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ "میں ... میں کیا کہہ سکتا ہُوں۔"

"کھڑکی بند تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی ... بند تھی ... اور میں نے باندھ کر یہاں ڈالا تھا۔"

"پھر وہ کیسے نکل گیا؟" میں نے خود کلامی کی۔ استاد کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ "خیر دفع کرو۔" چند لمحے بعد وہ بے نیازی سے بولے۔ "بہرحال آدمی جی دار ہوگا ... فنکار ہوگا۔ ورنہ کا باندھا ہُوا آدمی اس طرح رسّی تڑا کر بھاگ نہیں" یہ کہہ کر وہ واپسی کے لیے پلٹ گئے۔

ہم تینوں بھی اُن کے پیچھے نکل آئے۔ ہم ا بھی کچھ بولنے کے قابل نہیں تھے۔

"کیا بات ہے ... تم لوگوں کو سانپ کیوں گیا؟" استاد نے ہمیں چھیڑا۔

"وہ استاد ... وہ تنظیم کا آدمی تھا۔ ہمارے کار آمد ثابت ہو سکتا تھا۔" حامد نے کہا۔

"خاک ڈالو اس پر ... جو گیا، وہ گیا۔" استاد کہا۔ "اور سناؤ، کیا حال ہے۔ تمھارے استعفے کا"

"وہ نامنظور رہا ... اور مجھے بحال کر دیا گیا۔ چند اچھے افسر میرے حق میں بھی ہیں۔" حامد نے

میں یہ سوچ کر چپ رہ گیا کہ اس ملازمت کچھ مدد ہی ملے گی۔ البتہ اب ذرا دیکھ بھال کے کام کرنا

"ہاں ... یہ بات تو ہے۔" استاد نے پُر لہجے میں کہا۔

"اچھا استاد، اب میں چلتا ہُوں۔" حامد بولا۔ "آدمی کا حلیہ نوٹ کرانا ہے۔ کم از کم وہ آزادانہ نقل و تو نہیں کر سکے گا۔" حامد نے سخت لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" استاد نے کہا۔

حامد رخصت ہو گیا۔ وہ چلا گیا تو استاد نے ج سے کہا کہ سب پہلوانوں کو آگاہ کر دے کہ شام کو اکھا میں جمع ہو جائیں۔

"کیا ارادے ہیں استاد؟" جیرے کے جا میں نے استاد سے پوچھا۔

"ارادے نیک ہی ہیں، برخوردار۔" استاد ہنستے ہوئے کہا۔ "شام کو تمھیں بھی معلوم ہو جائے"

میں نے بہت کریدنا چاہا لیکن استاد ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ قبل از وقت بات کرنے

آمادہ نہیں تھے۔

شام کو اکھاڑے پر چوپال جمی۔ چھڑکاؤ کر دیا گیا اور تمام چارپائیاں باہر نکال لی گئیں۔ چھ بجے تک تمام پہلوان اکٹھا ہو چکے تھے۔ وہ سب استاد کی طرف دیکھ رہے تھے اور استاد کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔

کافی دیر بعد استاد نے سر اٹھایا۔ "تم لوگ جانتے ہو کہ طاقت برائے خدمتِ خلق میرا اصول ہے۔" وہ بولے۔ "میں نے تم لوگوں کو تربیت دیتے وقت یہی بتایا ہے کہ انسانیت کا ہمیشہ بول بالا ہونا چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔ مجھے تم سب پہ فخر ہے۔" انھوں نے چاروں طرف نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "عنقریب ہم لوگوں کے لیے آزمائش کا وقت آنے والا ہے، لیکن میں اس سلسلے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہوں گا۔ بہرحال آج میں نیابت کا مسئلہ حل کر دینا چاہتا ہُوں۔" استاد نے توقف کر کے سب لوگوں کا جائزہ لیا۔ چہروں سے کھنچاؤ دُور ہو چکا تھا اور سب مسکرا رہے تھے۔ پھر استاد کی نظریں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ میرے اعصاب کشیدہ ہونے لگے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔" استاد بولے۔ "میں چاہتا ہُوں کہ میری عدم موجودگی میں جمال میری جگہ سنبھالے۔ میرے نزدیک یہ ایک موزوں ترین آدمی ہے۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ چاروں طرف تائیدی سرگوشیاں گونج رہی تھیں۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن میرے لب حرکت بھی نہ کر سکے۔

"گویا تمھیں میرا فیصلہ منظور ہے؟" استاد نے پوچھا۔

تائیدی آوازوں کا حجم کچھ اور بڑھ گیا۔

"آپ کے فیصلے سے ہم کیسے اختلاف کر سکتے ہیں۔" ایک نمایاں آواز گونجی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ رشید پہلوان تھا۔

"نہیں ... یہ بات نہیں۔ ہر شخص کو میرے فیصلے سے اختلاف کا حق ہے۔" استاد نے کہا۔

"تو پھر میں یہ حق استعمال کرنا چاہتا ہُوں۔" بالآخر مجھے زبان مل گئی۔ سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔

"تم نے کہا استاد زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ بات سبھی کے لیے درست ہے۔ جہاں تک تمھارا اور میرا تعلق ہے استاد، تو میری زندگی تمھارے مقابلے میں کہیں زیادہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس کے علاوہ میں خود کو اس منصب کا اہل نہیں پاتا۔ یہاں مجھ سے زیادہ اہل اور تجربہ کار لوگ موجود ہیں۔ یہ اُن کی حق تلفی ہوگی۔ اس کے علاوہ میں مسائل میں اس قدر اُلجھا ہُوا ہُوں کہ اکھاڑے کو وقت نہیں دے سکوں گا۔ میں شرمندہ ہُوں استاد۔"

چند سینئر پہلوانوں نے ملامت آمیز نظروں سے مجھے گھورا، لیکن اس ملامت میں بھی تعلقِ خاطر کا رنگ تھا۔

"بس جمال ... مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" حمید پہلوان نے شفقت آمیز لہجے میں مجھے ڈانٹا۔ "تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔ رہی اہلیت کی بات تو وہ ثابت ہو چکی ہے۔ ہم میں سے کون ایسا ہے جو رستمِ پنجاب کے سامنے ٹھہر سکتا ہے۔"

"لیکن وہ تو ..."

"بس ... اب ہم کچھ سننا نہیں چاہتے۔" اس بار رشید پہلوان نے میری بات کاٹ دی۔

میں ان لوگوں کے خلوص کے سامنے بے بس ہو گیا۔ میرے وجود میں طوفان مچل رہے تھے لیکن لبوں پہ خاموشی کی مہر لگ چکی تھی۔

استاد نے بڑی طمانیت سے پہلے مجھے اور پھر دیگر پہلوانوں کو دیکھا۔ وہ بہت مطمئن اور آسودہ نظر آ رہے تھے ... اس جنرل کی طرح، جس نے اہم ترین محاذ پر پیش قدمی کر لی ہو ... یا اُس بچے کی طرح، جس نے اپنی کوئی ناممکن فرمائش پوری کرا لی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ استاد کے نزدیک میری نیابت اس قدر اہم کیوں ہے۔

"گویا سب کو میرا فیصلہ منظور ہے؟" استاد نے پوچھا۔

اچانک جیرا پہلوان اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "استاد، اگر اسے گستاخی نہ سمجھا جائے تو میں کچھ کہنا چاہتا ہُوں۔"

"کہو، کیا بات ہے؟" استاد نے پوچھا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہُوں استاد کہ اکھاڑے کے نائب کی عزت تمھاری وجہ سے نہیں ہونی چاہیے۔

ایسی عزت اور محبت بنیاد سے محروم ہوتی ہے اور کسی بھی وقت ختم ہو سکتی ہے۔ جمال کی اہلیت میں کوئی شک نہیں لیکن یہ اکھاڑے کی سرگرمیوں سے دور رہے ہیں۔ اگر آج ہم تمہاری محبت میں جمال کو تسلیم کر لیتے ہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہماری اطاعت مستقل ہوگی۔"

"صاف صاف کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" استاد کا لہجہ الجھن آمیز تھا۔

"استاد، اس سلسلے میں اکھاڑے کی ایک پرانی رسم بھی تو ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں، تمہاری بات۔"

"تمہاری گدی کے کسی دعوے دار سے جمال کا مقابلہ ہونا چاہیے۔"

"کوئی دعوے دار نہیں ہے۔" بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔

"اب کیا کہتے ہو؟" استاد نے جیرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اتر رہے ہو اکھاڑے میں؟"

"استاد... مجھے تمہاری، اکھاڑے کی اور جمال کی عزت بہت عزیز ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کی طرح جذباتی نہیں ہوں۔ جذبات تو کسی ندی کی طرح ہوتے ہیں... اترتے ہیں تو کناروں سے بہت نیچے رہ جاتے ہیں اور چڑھتے ہیں تو کنارے توڑ جاتے ہیں۔ تمہاری گدی کا کوئی دعوے دار نہیں، ناممکن ہے۔ لوگ تمہارے لحاظ میں چپ ہیں... میں جمال سے ضرور مقابلہ کروں گا۔ گدی کے لیے نہیں بلکہ مستقبل میں اعتراضات کا منہ بند کرنے کے لیے... اکھاڑے کی آبرو کے لیے۔" جیرے نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا اور استاد کے قدم چھو لیے۔

"اٹھ جاؤ..." استاد نے ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کر دیا۔ ان کا چہرہ بے تاثر تھا۔ "مجھے خوشی ہے... فخر ہے کہ یہاں ایسے سمجھ دار لوگ بھی موجود ہیں۔" ان کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا... یا خدا جانے، وہ میری سماعت کا وہم رہا ہو۔ "اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔"

جیرا اپنی جگہ جا بیٹھا۔ کچھ لوگ اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"جیرے کی رائے مخلصانہ ہے اور فیصلہ کرنا میرا کام ہے۔" استاد بولے۔ "جیرے، اگر میں تمہاری نظرانداز کر کے اکثریت کے فیصلے پر جمال کو اپنا مقرر کر دوں تو تم کیا کہو گے؟"

جیرا سوچ میں پڑ گیا۔ میرا جی چاہا کہ استاد ک دوں۔ انا کے تار جھنجھنا اٹھے تھے۔ چیلنج کا جوا دینا، مردانگی کے خلاف تھا۔ گدی سے قطع نظ مقابلہ کرنا میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا، لیکن پھر آیا کہ استاد میری عزتِ نفس کو مجروح نہیں کر یہ انہی کا کھیل تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کر ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ ایسے میں مداخلت ہی ہوتی۔ چنانچہ میں نے جبر کر کے خود کو روک استاد کی طرف متوجہ ہو گیا، جو جیرے کے جواب انتظار کر رہے تھے۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں استاد۔" جیرے نے ج دیا۔ "میں نے تو بغیر کسی لالچ کے مخلصانہ رائے تھی۔ آخری فیصلہ تو تم ہی کرو گے اور مجھے اس کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔"

"تو میرا فیصلہ یہ ہے کہ کل شام تم دونوں کا م ہوگا۔" استاد نے فیصلہ سنا دیا۔

جیرے کی آنکھیں چمک اٹھیں جبکہ وہاں م بیشتر پہلوانوں کے چہرے بے تاثر تھے۔

بات چیت کا دور ختم ہوا تو فخرو پہلوان نے سب کی تواضع کی۔ اس کے بعد بھی دیر تک محفل جمی رہی۔ نوک جھونک چلتی رہی پھر عشاء کے بعد محفل منتشر ہو گئی۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد استاد میرے ک میں چلے آئے۔ "میں جانتا ہوں کہ تم کتنی الجھن میں" انہوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کچھ سمجھ بھی آیا یا نہیں؟"

"نہیں استاد، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "لیکن اتنا یقین ہے، تمہارے اس فیصلے کے پیچھے کوئی بڑا مقصد ہوگا۔"

"ٹھیک سمجھے برخوردار۔" استاد نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں اکھاڑے کے آدمیوں کو تول رہا تھا۔ اکھاڑے کی طاقت کو تنظیم کے خلاف استعمال کرنا

ابات طے ہے کہ تنظیم اب ہماری وابستگی کو خوب اچھی لرح جان چکی ہے۔"

استاد کی آخری بات میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن میں نے اسے زیادہ اہمیت بھی نہیں دی۔ "استاد! اکھاڑے کے آدمی جاندار ضرور ہیں، لیکن نہ تو ذہین ہیں اور نہ ہی جدید اسلحے کے استعمال سے واقف ہیں۔ ہم ان سے کیا کام لے سکتے ہیں؟" میں نے اعتراض کیا۔

"دیکھتے جاؤ برخوردار۔" یہ ہمارا پہلوان دستہ ہے۔ دماغ اور اسلحہ فراہم کرنا حامد کی ذمہ داری ہے۔ یوں بھی ہماری کوشش یہی ہوگی کہ براہِ راست تصادم سے گریز کیا جائے۔ ہمیں درپردہ رہ کر انہیں بڑے بڑے نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا ہے۔"

استاد بے حد رازداری سے کام لے رہے تھے۔ میں نے مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

"اب سو جاؤ برخوردار۔ صبح پانچ بجے تمہیں اٹھاؤں گا۔ تاکہ میرے ساتھ زور کر سکو۔" استاد نے سخت لہجے میں کہا۔ "جیرے سے محتاط رہنا۔"

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔

"میں معموں میں باتیں نہیں کرتا۔ سیدھا سادا آدمی ہوں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ جیرے سے محتاط رہنا۔"

"لیکن استاد، جیرا تو..."

"میں پڑھا لکھا ہوں نہیں لیکن آنکھیں، چہرے اور لہجے سمجھنے میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔ شب خیر۔" استاد نے کہا اور کمرے سے نکل گئے۔

استاد تو چلے گئے لیکن مجھے الجھن میں ڈال گئے۔ میں بستر پر لیٹا خود سے الجھتا رہا۔ جیرا پرانے پہلوانوں میں سے تھا اور مجھے اس کے خلوص پر شبہ نہیں تھا لیکن استاد اس پر شک کر رہے تھے۔ میں دیر تک الجھتا رہا۔ پھر میں نے استاد کے شک کو ان کا واہمہ سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا۔ اس وقت مجھے سو جانا چاہیے تاکہ صبح تازہ دم اٹھ سکوں۔ یکسوئی کے ساتھ سونے کی کوشش کی تو ایک چہرہ... اجنبی چہرہ تصور میں اتر آیا۔ چہرہ تو اجنبی تھا لیکن خدوخال جانے پہچانے تھے۔ وہ مرکب چہرہ... نازو اور گلنار کے چہروں سے عبارت تھا۔ آنکھیں متحرک تھیں، ہونٹ نازو کے تھے، رخسار گلنار کے... اور وہ مسکراہٹ! میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مسکراہٹ نازو کی تھی یا گلنار کی... نازو جو خدا جانے کہاں کھو گئی تھی... گلنار جو کراچی میں میری منتظر تھی۔ میں پھر نفاق کا شکار ہونے لگا۔ ان دونوں کے بارے میں سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔

صبح استاد نے مجھے پانچ بجے اٹھا دیا۔ فجر کی نماز کے بعد استاد نے مجھے زور کرایا۔ طویل عرصے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں استاد کے ساتھ اکھاڑے میں اترا تھا۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ زور کرنے کی کتنی اہمیت ہے۔ میں اکھاڑے کی مٹی سے بہت دور ہو گیا تھا۔ اس سے بہت فرق پڑا تھا۔ داؤ پیچ تو سارے یاد تھے لیکن ان کے استعمال میں جو پھرتی اور مستعدی درکار تھی، میں اس سے خاصا دور تھا۔ اس اعتبار سے وہ صبح میرے لیے ایک نعمت تھی کہ مجھے اپنی کمزوریوں کا پتہ چل رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جیرا کوئی لقمۂ تر نہیں ہے۔ ایک نقصان یہ ہوا کہ میری خود اعتمادی میں کمی آ گئی۔

استاد نے بھی یہ بات بھانپ لی تھی۔

"یاد رکھو برخوردار۔" ناشتے کے دوران انہوں نے مجھ سے کہا۔ "مقابلے کی بات اور ہوتی ہے۔ انسان جبلّی طور پر ایک خودکار عمل کے ذریعے اپنی کمزوریوں پر قابو پا لیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ تم سے میرا قلبی تعلق ہے لیکن میں نے تمہیں اپنا نائب بنانے کا فیصلہ اپنے جذبات کی بنیاد پر نہیں بلکہ تمہاری اہلیت پر کیا ہے۔"

استاد کمال کے آدمی تھے... انسان کے اندر تک جھانک لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ میری خود اعتمادی پہلے سے کہیں بڑھ گئی۔ یوں بھی میں جانتا تھا کہ کسی مقابلے میں فوقیت کا صحیح فیصلہ، حریفوں کی قوتِ ارادی اور خود اعتمادی پر ہوتا ہے۔

اس روز میں نے کچھ دیر سینئر پہلوانوں کے ساتھ بھی زور کیا۔ اس دوران یہ ثابت ہو گیا کہ استاد نے میری اہلیت پر غلط اعتماد نہیں کیا تھا۔ مجھے دوسرے پہلوانوں پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ دماغ استعمال کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سو گیا تاکہ شام کو تازہ دم رہوں۔ دوپہر کی نیند پرسکون تھی۔ سو کر اٹھا تو شام ہو چکی تھی۔ مقابلے کا وقت قریب تھا۔ میں تیار ہونے لگا پھر لنگوٹ کس کر باہر نکل آیا۔ جیرا بھی اکھاڑے میں موجود تھا اور مقابلے کے لیے تیار تھا۔

"یار جمال، ذرا نرمی سے کام لینا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لہجے میں خلوص تھا۔ "میری ہڈیاں اب کافی نرم ہو گئی ہیں۔"

مجھے اس لمحے وہ بہت اچھا لگا۔ میں اس سے لپٹ گیا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم میرے لیے بہت محترم ہو۔"

"اسے... یہ کیا ہو رہا ہے۔" دور بیٹھے ہوئے واحد پہلوان نے نعرہ لگایا۔ "کیا یہ لورا کشتی ہو گی؟"

اس پر بہت زور کا قہقہہ لگا۔ میں اور جیرا بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔

"اور جو ہارے گا، اسے لورا کا خطاب دیا جائے گا۔" رشید نے چوٹ کی۔

"چلو بہت ہو چکی محبت۔" سلامت نے مجھے پکارا۔ "یہاں آؤ مالش کر دوں۔"

میں سلامت کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اور فخرو میری مالش کرتے رہے۔ استاد مجو بھی آ چکے تھے۔ اکھاڑے کے چاروں طرف کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ مجھے اجنبی چہرے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ فخرو نے بتایا کہ وہ علاقے کے معززین ہیں جو استاد کی بہت عزت کرتے ہیں اور اُن میں سے بہت سے اکھاڑے کی مالی اعانت بھی کرتے ہیں۔ اس حوالے سے انھیں مجو کی تیاریات کے سلسلے میں دلچسپی لینی بھی چاہیے تھی۔

مقابلے کا وقت ہو گیا تو میں اور جیرا مقابل آ گئے۔ جیرے کے لبوں پر مسکراہٹ تھی... دوستانہ مسکراہٹ۔ ریفری کے فرائض فاروقی پہلوان انجام دے رہا تھا۔ وہ سب سے سینئر تھا۔ بے حد خاموش طبع تھا اور مجو کی تو گویا پرستش کرتا تھا۔ وہ اس مقابلے کے سخت خلاف تھا اور اس نے جیرے کے اس اقدام پر کھل کر تنقید بھی کی تھی۔

فاروق نے ہم دونوں کو رسماً مقابلے کے قواعد و ضوابط سمجھائے، جب کہ ہم دونوں اُن سے بخوبی آگاہ تھے۔

پھر اس نے ہمیں ایک دوسرے سے دُور ہونے کا اشارہ کیا اور مجو پہلوان سے اجازت طلب کی۔

استاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں اور جیرا اکھاڑے کے وسط میں پہنچ گئے۔ جیرے کے ہونٹوں پر چند لمحے پہلے نظر آنے والی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ اور اب اس کی نگاہوں سے سختی جھلک رہی تھی۔ میں مسکرا دیا۔ اس کی یہ ادا بھی مجھے پسند آئی تھی۔ خالص پروفیشنل تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اس کے نزدیک یہ رسمی مقابلہ نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے میری صلاحیت کا امتحان تھا۔

میں نے جیرے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہی زوردار جھٹکا دیا... لیکن خود ہی چونک کر جا پڑا۔ میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہی تیزی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔

اس نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ لیکن اس بار اس کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ وہ اٹھا اور تیزی سے میری طرف لپکا۔ ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ نہ جانے کیوں میں جارحانہ موڈ میں نہیں تھا۔ میرے نزدیک وہ ایک دوستانہ مقابلہ تھا۔

جیرا زور لگا کر مجھے اکھاڑنے کی کوشش کرتا رہا... اور میں زمین میں قدم گاڑے تنا کھڑا رہا۔ پھر اچانک اس نے اپنی گرفت ڈھیلی چھوڑ دی۔ میں نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا، جیسے نظروں ہی نظروں میں مجھے تول رہا ہو۔ اچانک اس نے پھرتی سے اُچھل کر میرے سینے پر فلائنگ کک ماری۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی کیونکہ یہ فری اسٹائل مقابلہ نہیں تھا۔ میں سنبھل نہ سکا۔ میرے گرتے ہی وہ میرے اوپر آیا لیکن میں نے ٹانگوں کی مدد سے اسے اُچھال دیا۔

اب ہم پھر آمنے سامنے کھڑے تھے۔ داؤ اور جوابی داؤ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم دونوں ہی محتاط تھے، اس لیے کوئی داؤ فیصلہ کُن ثابت نہ ہو سکا۔ ویسے بھی میرا انداز جارحانہ نہیں تھا... پھر ایک موقع پر اس کا داؤ لگ ہی گیا۔ میری گردن اس کی گرفت میں آ گئی۔ وہ شکنجہ تھا... ایسا داؤ کہ میں خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا تو مزید پھنس جاتا۔ اس نے اڑنگا لگا کر مجھے گرا دیا۔ میں نے گرتے گرتے کوشش کی کہ اپنی گردن آزاد کرا لوں لیکن وہ بہت منجھا ہوا پہلوان تھا۔ گرتے گرتے اس نے میری کمر کے گرد بھی ٹانگوں کی قینچی ڈال دی۔

یہ صورتِ حال میرے لیے بے حد خطرناک تھی۔ میری گردن پر اس کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ وہ بہت مہلک داؤ تھا۔ دوسری طرف اس کی ٹانگوں کی جکڑ بندی بھی خطرناک تھی۔ میں تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس قسم کے مقابلوں میں عموماً ایسے داؤ استعمال نہیں کیے جاتے۔ مجھے یاد آیا کہ ابتدا میں بھی اس نے ایسے داؤ استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب یہ ثابت ہو رہا تھا کہ وہ ہر قیمت پر جیتنا چاہتا ہے... یا پھر مجھے راستے سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ میں شکست تسلیم نہیں کروں گا۔ اس صورت میں وہ میری گردن توڑنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔

میری گردن اور کمر پر اس کا دباؤ خوفناک حد تک بڑھ گیا تھا... اور میں دباؤ کے انتہا پر پہنچ جانے کا منتظر تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مجھے درست اندازہ لگانا تھا اور یہ بات بے حد اہم تھی۔ انتہائی دباؤ کے بعد اس کے دباؤ ڈالنے والے اعضا میں ٹھہراؤ آنا تھا اور مجھے اس لمحے سے فائدہ اٹھانا تھا۔ اس کامیابی کا تمام تر انحصار میری جسمانی لچک پر تھا... اور جیسے ہی وہ لمحہ آیا، میں نے پہلے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑا اور پھر سکیڑ لیا۔ ساتھ ہی بجلی کی سی سرعت سے میں اس کے شکنجے سے نکل آیا۔ جسم سکڑنے کے نتیجے میں جو معمولی سا خلا پیدا ہوا تھا، اسے اُس کے شکنجہ لگانے والے اعضا فوراً ہی پُر نہ کر سکے تھے اور میں اس ایک ہی لمحے میں اس گرفت سے نکل آیا تھا۔

مجھے تماشائیوں کی داد و تحسین کا احساس نہیں تھا صرف اپنی گردن کی تکلیف کا خیال تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ اس بار اس کی نگاہوں میں نفرت دیکھ کر میرے جسم میں شرارے سے بھر گئے۔ اب میں اسے سبق دینا چاہتا تھا۔ اس نے مہلک داؤ استعمال کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس کے بارے میں استاد کا اندازہ درست ہی تھا۔

اُس کے بعد میں نے اسے مہلت نہیں دی۔ میں نے جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی کمر تھامی اور اسے زمین سے اوپر اُٹھا لیا۔ وہ ہاتھ پیر چلاتا رہا... میرے سر پر گھونسے مارتا رہا... لیکن مجھ پر دیوانگی سوار تھی۔ میں تکلیف کے احساس سے دُور تھا۔ میں نے اُسے سر سے اونچا اُٹھایا اور پوری قوت سے زمین پر پٹخ دیا۔ ابھی وہ پہلے جھٹکے سے نہیں سنبھلا تھا کہ میں نے اس بار اسے گٹھڑی کی طرح اُٹھا کر پٹخ ڈالا۔ تیسری بار وہ گرنے کے بعد ہوش میں نہ رہ سکا... اور زمین پر ساکت پڑا رہ گیا۔ خود میں بھی ہوش اور بے ہوشی کے درمیان معلق تھا۔ سر پر لگنے والے اس کے گھونسے رنگ لا رہے تھے۔ تاہم میں اپنے قدموں پر کھڑا رہا۔ فاروق پہلوان نے میرا ہاتھ اُٹھا کر مجھے فاتح قرار دے دیا۔ بہت سارے لوگ اندر گھس آئے اور مجھے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ جیسے ہی میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوا، استاد نے مجھے گلے لگا لیا۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے افتخار تھا۔ میں مسرور ہو گیا۔

"میں جانتا تھا کہ تم ہی اس منصب کے اہل ہو۔" استاد نے کہا۔

پھر وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک شخص کے پاس لے گئے۔ "ان سے ملو جمال... یہ ہیں آفتاب صاحب۔" استاد نے کہا۔ "یہ ہمارے اکھاڑے کے سرپرست ہیں۔ پہلی مرتبہ اکھاڑے میں آئے ہیں... خاص طور پر تمھارا مقابلہ دیکھنے کے لیے۔"

میں نے آفتاب صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے اُن کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ کرتے پاجامے میں ملبوس تھے۔ اُن کے چہرے پر شرافت کی چمک تھی۔ وہ بھی مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔

"دیکھا آپ نے آفتاب صاحب۔" استاد نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "میں مطمئن ہوں۔ یہ نوجوان آپ کی جگہ لینے کا اہل ہے۔" پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ "جمال میاں تمھارا تعلق کہاں سے ہے؟"

"ملانوالہ... فیصل آباد سے۔" میں نے جواب دیا۔

"تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟"

میں چونک پڑا۔ یہ ایک غیر معمولی سوال تھا۔ اکھاڑے

دوپہر کے کھانے کے بعد سوگیا تاکہ شام کو تازہ دم رہوں۔ دوپہر کی نیند پُرسکون تھی۔ سوکر اُٹھا تو شام ہو چکی تھی۔ مقابلے کا وقت قریب تھا۔ میں تیار ہونے لگا پھر لنگوٹ کس کر باہر نکل آیا۔ جیرا بھی اکھاڑے میں موجود تھا اور مقابلے کے لیے تیار تھا۔

"یار جمال، ذرا نرمی سے کام لینا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لہجے میں خلوص تھا۔ "میری ہڈیاں اب کافی نرم ہو گئی ہیں۔"

مجھے اس لمحے وہ بہت اچھا لگا۔ میں اس سے لپٹ گیا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم میرے لیے بہت محترم ہو۔"

"اسے... یہ کیا ہو رہا ہے۔" دور بیٹھے ہوئے واحد پہلوان نے نعرہ لگایا۔ "کیا یہ نورا کشتی ہوگی؟"

اس پر بہت زور کا قہقہہ لگا۔ میں اور جیرا بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔

"اور جو ہارے گا، اسے نورا کا خطاب دیا جائے گا۔" رشید نے چوٹ کی۔

"چلو بہت ہو چکی محبت۔" سلامت نے مجھے پکارا۔ "یہاں آؤ مالش کر دوں۔"

میں سلامت کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اور فخرو میری مالش کرتے رہے۔ استاد مجو بھی آ چکے تھے۔ اکھاڑے کے چاروں طرف کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ مجھے اجنبی چہرے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ فخرو نے بتایا کہ وہ علاقے کے معززین ہیں جو استاد کی بہت عزت کرتے ہیں اور ان میں سے بہت سے اکھاڑے کی مالی اعانت بھی کرتے ہیں۔ اس حوالے سے انھیں مجو کی نیابت کے سلسلے میں دلچسپی لینا ہی چاہیے تھی۔

مقابلے کا وقت ہو گیا تو میں اور جیرا مقابل آ گئے۔ جیرے کے لبوں پر مسکراہٹ تھی... دوستانہ مسکراہٹ۔ ریفری کے فرائض فاروقی پہلوان انجام دے رہا تھا۔ وہ سب سے بیتر تھا، بے حد خاموش طبع تھا اور مجو کی تو گویا پرستش کرتا تھا۔ وہ اس مقابلے کے سخت خلاف تھا اور اس نے جیرے کے اس اقدام پر کھل کر تنقید بھی کی تھی۔

فاروق نے ہم دونوں کو رسماً مقابلے کے قواعد و ضوابط سمجھائے، جب کہ ہم دونوں اُن سے بخوبی آگاہ تھے۔

پھر اس نے ہمیں ایک دوسرے سے دُور ہونے کا اشا... اور مجو پہلوان سے اجازت طلب کی۔

استاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں اور جیرا اکھاڑے کے وسط میں پہنچ گئے... کے ہونٹوں پر چند لمحے پہلے نظر آنے والی مسکراہٹ... ہو چکی تھی۔ اور اب اس کی نگاہوں سے سختی جھلک... تھی۔ میں مسکرا دیا۔ اس کی یہ ادا بھی مجھے پسند آئی تھی... خالص پروفیشنل تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اس کے نزدیک... یہ رسمی مقابلہ نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے میری صلاحیتوں کا امتحان تھا۔

میں نے جیرے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے... میرا ہاتھ تھامتے ہی زوردار جھٹکا دیا... لیکن خود ہی... جا پڑا۔ میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہی تیزی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔

اُس نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ لیکن اس... اس کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ وہ اٹھا اور تیزی سے... طرف لپکا۔ ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ نہ جانے کیوں میں جار... کے موڈ میں نہیں تھا۔ میرے نزدیک وہ ایک دوستانہ مقابلہ تھا۔

جیرا زور لگا کر مجھے اکھاڑنے کی کوشش کرتا رہا... اور میں زمین میں قدم گاڑے تنا کھڑا رہا۔ پھر اچانک ا... نے اپنی گرفت ڈھیلی چھوڑ دی۔ میں نے بھی اسے چھو... دیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا، جیسے نظروں ہی نظروں میں مجھے تول رہا ہو۔ اچانک اس نے پھرتی سے اُچھل کر میرے سینے پر فلائنگ کک ماری۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی کیونکہ یہ فری اسٹائل مقابلہ نہیں تھا۔ میں سنبھل نہ سکا... میرے گرتے ہی وہ میرے اوپر آیا لیکن میں نے ٹانگوں کی مدد سے اسے اُچھال دیا۔

اب ہم پھر آمنے سامنے کھڑے تھے۔ داؤ اور جوابی داؤ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم دونوں ہی محتاط تھے، اس لیے کوئی داؤ فیصلہ کن ثابت نہ ہو سکا۔ ویسے بھی میرا انداز جارحانہ نہیں تھا... پھر ایک موقع پر اس کا داؤ لگ ہی گیا۔ میری گردن اس کی گرفت میں آ گئی۔ وہ شکنجہ تھا... ایسا داؤ کہ میں خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا تو مزید پھنس جاتا۔ اس نے اڑنگا لگا کر مجھے گرا دیا۔ میں نے

...گرتے گرتے کوشش کی کہ اپنی گردن آزاد کرالوں لیکن وہ ...بہت منجھا ہوا پہلوان تھا۔ گرتے گرتے اس نے میری کمر کے گرد بھی ٹانگوں کی قینچی ڈال دی۔

یہ صورتِ حال میرے لیے بے حد خطرناک تھی۔ میری گردن پر اُس کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ وہ بہت مہلک داؤ تھا۔ دوسری طرف اس کی ٹانگوں کی جکڑ بندی بھی خطرناک تھی۔ میں تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس قسم کے مقابلوں میں عموماً ایسے داؤ استعمال نہیں کیے جاتے۔ مجھے یاد آیا کہ ابتدا میں بھی اس نے ایسے داؤ استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب یہ ثابت ہو رہا تھا کہ وہ ہر قیمت پر جیتنا چاہتا ہے... یا پھر مجھے راستے سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ میں شکست تسلیم نہیں کروں گا۔ اس صورت میں وہ میری گردن توڑنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔

میری گردن اور کمر پر اس کا دباؤ خوفناک حد تک بڑھ گیا تھا... اور میں دباؤ کے انتہا پر پہنچ جانے کا منتظر تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مجھے درست اندازہ لگانا تھا اور یہ بات بے حد اہم تھی۔ انتہائی دباؤ کے بعد اس کے دباؤ ڈالنے والے اعضا میں ٹھہراؤ آنا تھا اور مجھے اس لمحے سے فائدہ اٹھانا تھا۔ اس کامیابی کا تمام تر انحصار میری جسمانی لچک پر تھا... اور جیسے ہی وہ لمحہ آیا، میں نے پہلے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑا اور پھر سکیڑ لیا۔ ساتھ ہی بجلی کی سی سرعت سے میں اس کے شکنجے سے نکل آیا۔ جسم سکڑنے کے نتیجے میں جو معمولی سا خلا پیدا ہوا تھا، اسے اُس کے شکنجہ لگانے والے اعضا فوراً ہی پُر نہ کر سکے تھے اور میں اس ایک ہی لمحے میں اس گرفت سے نکل آیا تھا۔

مجھے تماشائیوں کی داد و تحسین کا احساس نہیں تھا صرف اپنی گردن کی تکلیف کا خیال تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا وہ بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ اس بار اس کی نگاہوں میں نفرت دیکھ کر میرے جسم میں شرارے سے بھر گئے۔ اب میں اسے کچل ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے مہلک داؤ استعمال کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس کے بارے میں استاد کا اندازہ درست ہی تھا۔

اُس کے بعد میں نے اسے مہلت نہیں دی۔ میں نے جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی کمر تھامی اور... اسے زمین سے اوپر اُٹھا لیا۔ وہ ہاتھ پیر چلاتا رہا... میرے سر پر گھونسے مارتا رہا... لیکن مجھ پر دیوانگی سوار تھی۔ میں تکلیف کے احساس سے دُور تھا۔ میں نے اُسے سر سے اونچا اُٹھایا اور پوری قوت سے زمین پر پٹخ دیا۔ ابھی وہ پہلے جھٹکے سے نہیں سنبھلا تھا کہ میں نے اس بار اسے گٹھڑی کی طرح اُٹھا کر پٹخ ڈالا۔ تیسری بار وہ گرنے کے بعد ہوش میں نہ رہ سکا... اور زمین پر ساکت پڑا رہ گیا۔ خود میں بھی ہوش اور بے ہوشی کے درمیان معلق تھا۔ سر پر لگنے والے اس کے گھونسے رنگ لا رہے تھے۔ تاہم میں اپنے قدموں پر کھڑا رہا۔ فاروق پہلوان نے میرا ہاتھ اُٹھا کر مجھے فاتح قرار دے دیا۔ بہت سارے لوگ اندر گھس آئے اور مجھے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ جیسے ہی میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوا، استاد نے مجھے گلے لگا لیا۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے افتخار تھا۔ میں مسرور ہو گیا۔

"میں جانتا تھا کہ تم ہی اس منصب کے اہل ہو۔" استاد نے کہا۔

پھر وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک شخص کے پاس لے گئے۔ "ان سے ملو جمال... یہ ہیں آفتاب صاحب۔" استاد نے کہا۔ "یہ ہمارے اکھاڑے کے سرپرست ہیں۔ پہلی مرتبہ اکھاڑے میں آئے ہیں... خاص طور پر تمھارا مقابلہ دیکھنے کے لیے۔"

میں نے آفتاب صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے اُن کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ کرتے پاجامے میں ملبوس تھے۔ اُن کے چہرے پر شرافت کی چمک تھی۔ وہ بھی مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔

"دیکھا آپ نے آفتاب صاحب۔" استاد نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "میں مطمئن ہوں۔ یہ نوجوان آپ کی جگہ لینے کا اہل ہے۔" پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ "جمال میاں تمھارا تعلق کہاں سے ہے؟"

"ماناوالہ... فیصل آباد سے۔" میں نے جواب دیا۔

"تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟"

میں چونک پڑا۔ یہ ایک غیر معمولی سوال تھا۔ اکھاڑے

میں مقابلہ جیتنے کے بعد کسی پہلوان کو کبھی ایسے سوال سے واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔

انھوں نے میری حیرت بھانپ لی۔ "میاں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو تمھاری پیشانی پر تحریر ہے۔"

"جی۔۔۔ میں نے گریجویشن کیا ہے۔"

"اچھا میاں، تم سے پھر ملاقات ہوگی۔" انھوں نے مجھے ایک کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ "ہو سکے تو کبھی غریب خانے پر بھی آجانا۔"

"جی۔۔۔ ضرور حاضر ہوں گا۔" میں نے کہا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

تیار ہو کر واپس آیا تو دستار بندی کی تقریب کی تیاری مکمل تھی۔ جیرے کو ہوش آچکا تھا۔ وہ مجھ سے مسکراتے ہوئے اور بے حد گرم جوشی سے ملا۔ "میں نے کہا تھا کہ ہاتھ ذرا ہلکا رکھنا۔" اس نے شوخ لہجے میں شکایت کی۔ "لیکن اتنا تو ہوا کہ اندازہ ہوگیا۔ میری ہڈیاں اتنی نرم بھی نہیں ہیں، جتنی میں سمجھا تھا۔ دیکھو نا۔۔۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ کوئی اور ہوتا تو گزر جاتا۔"

میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اتنے میں فخرو مٹھائی کے ٹوکرے لے آیا۔ تقریب کا آغاز ہوا۔ استاد نے اپنے ہاتھ سے میری دستار باندھی اور مجھے مٹھائی کھلائی۔ پھر تمام پہلوانوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور اطاعت کا عہد کیا۔ اب میں استاد مجو کی عدم موجودگی میں اکھاڑے کا سربراہ تھا۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن مجھے وہ ایک اضافی بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ مجھ پر پہلے ہی بہت بوجھ تھا۔۔۔ بہت سارے قرض تھے، جنھیں چکانا تھا۔ اس پر یہ اضافی ذمہ داری۔۔۔ میں بھلا کیسے خوش ہو سکتا تھا۔

پھر اکھاڑے کی رونق ختم ہوگئی۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ لیکن اس رات نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اکھاڑے کی ذمہ داری مجھے گراں گزر رہی تھی لیکن اس سے مفر بھی نہیں تھا۔ دیر تک میں بستر پر دراز اسی سلسلے میں سوچتا رہا۔

اچانک ایک ہارن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں چند لمحے انتظار کرتا رہا لیکن ہارن کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن میں تجسس میں مبتلا ہو کر باہر نکل آیا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں مرکزی د کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت مجھے وہ سایہ نظر آیا۔ پاؤں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا انداز تھا کہ میں اس کا تعاقب کرنے پر مجبور ہوگیا۔

وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ میں لپک پر پہنچا۔ اگلے ہی لمحے میں بھی باہر تھا۔ وہ ایک اند رات تھی۔ خوش قسمتی سے میرے جسم پر گہرے رنگ کا تھا۔ اکھاڑے سے نکلنے والا سایہ اکھاڑے کی دیوا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں دیوار سے چپک کر اس کرتا رہا۔ دیوار ختم ہوتے ہی ایک کار نظر آئی۔ سایہ قریب پہنچ کر رک گیا۔ میں الجھ کر رہ گیا۔ کار کا تعاقب تھا۔۔۔ لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ سایہ باہر ہی رہا تھا۔ جیسے کار میں بیٹھنے کا ارادہ نہ ہو۔ میں دیوا چپک گیا اور کان اس طرف لگا دیے۔ ہر طرف سناٹا ایسے میں سرگوشی بھی چیخ معلوم ہوتی ہے۔

"کیا رہا؟" کار میں بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا۔

"ناکامی۔۔۔" سائے نے جواب دیا۔ مجھے جیرے آواز پہچاننے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ "وہ بہت جان نکلا۔ میں ہار گیا۔"

"یہ تو برا ہوا۔" اجنبی آواز میں تشویش تھی۔ " تو دونوں کو راستے سے ہٹانا ہی پڑے گا۔"

"لیکن ابھی نہیں۔۔۔ کچھ ٹھہر کر۔" جیرے نے کہا کوئی گڑبڑ ہوئی تو شبہ مجھ پر ہی کیا جائے گا۔"

"ہاں ہاں، یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں۔ لیکن دیر نہیں لگنی چاہیے۔ مجو اور جمال دونوں کو صاف اکھاڑا ہمارے لیے بہت اہم ہے۔"

"بے فکر رہو۔ دو چار دن میں کام ہو جائے گا۔" نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔ محتاط رہنا۔" کار نے کہا۔

میں تیزی سے اکھاڑے کے گیٹ کی طرف لپکا دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ چند لمحے بعد کار اسٹارٹ ہو اس کی آواز دور جاتے جاتے معدوم ہوگئی۔ اسی و دروازہ کھلا اور جیرا بھی اندر آگیا۔ دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اپنے کمرے میں چ

آیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ استاد کا اندازہ بالکل درست تھا۔ جیرا اکھاڑے میں اقتدار حاصل کرنے کے چکر میں تھا۔ ان کے نزدیک اکھاڑے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ وہ استاد کو اور مجھے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ سوال یہ تھا کہ کار میں کون تھا اور اسے اکھاڑے میں اتنی دل چسپی کیوں تھی؟ ایک سوال یہ بھی تھا کہ جیرے کے سلسلے میں استاد کو بتایا جائے یا نہیں۔ خاصے غور و خوض کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس معاملے کو خود ہی دیکھنا چاہیے۔ سب سے پہلے اندازہ لگانا ہوگا کہ اکھاڑے کے پہلوانوں میں جیرے کے ساتھ کتنے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگلے روز جیرے پر کڑی نظر رکھوں گا۔ بزرگوں کا مقولہ ہے کہ آستین کا سانپ سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ مجھے کوشش کرنا تھی کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں پتہ چلا لوں کہ آستین کے ان سانپوں کی تعداد کتنی ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں بے فکر ہو کر سو گیا۔

اچانک مجھے اپنی پیشانی پر کسی لمس کا احساس ہوا۔ میں سکتے کی سی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔ میرے سرہانے امی موجود تھیں۔۔۔ میری امی! میری پیشانی پر ان کے مشفق ہاتھوں کا لمس مہک رہا تھا۔ میں حیرت سے انھیں دیکھ رہا تھا۔

"اب اٹھ بھی جاؤ۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "صبح ہوگئی ہے۔ لگتا ہے تمھاری عادتیں خراب ہوگئی ہیں۔ دیر سے سونے کے عادی ہوگئے ہو۔"

"امی۔۔۔ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟"

"ہاں اب تو اپنا گھر بھی تمھیں خواب ہی لگے گا۔" امی کے لہجے میں اداسی اتر آئی۔ "تم تو ہمیں بھول ہی گئے تھے۔۔۔ خیر، اب اٹھو۔۔۔ ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کر لو۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کمرہ بھی خواب کا ایک حصہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔ جانا پہچانا کمرہ جسے میں نے شاید برسوں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرا کمرہ تھا۔ وہی میری چھوٹی سی میز جس پر بکھری ہوئی کتابیں۔۔۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، جیسا کہ میں چھوڑ کر گیا تھا۔ لیکن مجھے خوب یاد تھا کہ میں استاد مجو کے اکھاڑے میں سویا تھا۔۔۔ اور میری آنکھ اپنے گھر میں کھلی تھی۔

میں حیرت سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔

"اب اٹھ بھی جاؤ۔" اس بار امی کا لہجہ سخت تھا۔

"میں اٹھ گیا امی۔" میں نے کہا۔۔۔ اور کمرے سے نکل آیا۔ برسوں کے معمول کے مطابق پانی کا لوٹا بھرا رکھا تھا۔ پیڑا بھی تھا۔ قریب ہی ایک صابن دانی اور منجن کی شیشی رکھی تھی۔ لمحے بھر میں ساری اجنبیت دور ہوگئی۔ میں منہ ہاتھ دھو کر آیا تو امی ناشتہ رکھ چکی تھیں۔ مکئی کی روٹی کے ساتھ ایک پیالے میں مکھن رکھا تھا۔ پھر امی ایک بڑے گلاس میں لسی بھی لے آئیں۔

میں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ اس ناشتے کو تو میں صدیوں سے ترس رہا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے طمانیت آمیز نگاہوں سے امی کی طرف دیکھا۔ "ابا جی۔۔۔ اور بالا کہاں ہے؟"

"تمھارے ابا جی تو حسب معمول کھیتوں کی طرف نکل گئے ہوں گے۔" امی نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ میں خفیف سا ہو کر رہ گیا۔ "اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمھیں لاہور جانا ہے۔"

"امی۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔ وہ بڑا عجیب شہر ہے۔۔۔ عجیب لوگ ہیں۔ محبت کرتے ہیں تو ٹوٹ کر اور نفرت کرتے ہیں تو ٹوٹ کر۔۔۔ امی بس مجھے اپنی ممتا کی پناہ میں رہنے دیں۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔" اس وقت میں خود کو چھوٹا سا بچہ محسوس کر رہا تھا۔

"تمھیں جانا ہے جمال۔" امی نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے تمھیں رات ہی سمجھا دیا تھا۔ اب بلا وجہ ضد نہ کرو۔"

"لیکن کیوں امی؟"

"تمھیں شرم نہیں آتی۔" امی کو یکایک غصہ آگیا۔ "چھوٹا بھائی تمھاری تلاش میں دھکے کھا رہا ہے اور تمھیں اس کا کوئی خیال ہی نہیں ہے۔ تم بہت غیر ذمے دار ثابت ہوئے ہو جمال۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"

"کیا؟ بالا لاہور گیا ہوا ہے؟ مجھے ڈھونڈنے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جیسے تمھیں تو کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ جمال آخر تم کتنے بے خبر ہو؟" امی نے مجھے ڈانٹا۔

اُسی وقت مجھے اذان کی آواز سُنائی دی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ وہی کمرہ تھا جہاں میں سویا تھا۔ وہاں نہ توائی تھیں اور نہ ہی میرا گھر تھا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا بس میں تھا اور میری تنہائی تھی... لیکن میرے ماتھے پر ان کے ہاتھ کے شفقت بھرے لمس کا گداز برقرار تھا۔ میری سماعت میں ان کی صدا اب بھی گونج رہی تھی۔ "جمال' آخر تم کتنے بے خبر ہو... تم بہت غیر ذمے دار ثابت ہوئے ہو جمال۔"

اُس وقت میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ دل وسوسوں سے بھرا ہُوا تھا' ایسا خواب جس کا پل پل حقیقت لگا ہو... آنکھ کھلتے ہی اذان کی آواز سُنائی دی ہو... سُنا ہے ایسے خواب سچّے ہوتے ہیں۔ اور پھر جب خواب میں ماں نظر آئے... یقیناً میری ماں نے تڑپ کر ہی مجھے پکارا ہوگا۔ مجھے احساسِ جرم ستانے لگا۔ حالات اپنی جگہ... لیکن میں نے شروع میں چند خطوط لکھے تھے... ان دنوں مزنگ میں میرا چھوٹا سا مکان تھا... کرائے کا ہی' لیکن وہ میری شناخت تھا۔ اُس پتے پر میری اپنے ماں باپ سے ملاقات ہو جاتی تھی... بالا بھی... یہ سوچتے ہی میرے تصوّر میں چھوٹے بھائی کا سراپا لہرا گیا... اقبال... وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ جب میں لاہور آیا ہوں تو وہ نویں جماعت میں تھا۔ سیدھا سادا لڑکا... ہر حکم ماننے والا۔ میں اسے بھی بھول گیا تھا۔ اب وہ میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔ مجھے پتہ نہیں کہ نتیجہ نکلا ہے یا نہیں۔ اب تو وہ کالج میں داخلہ لے رہا ہوگا شاید...

احساسِ جرم' مایوسی' گھر کی یاد اور ایک بے نام سی پریشانی... ان سب نے مل کر میرے جسم کو شل کر ڈالا۔ ہاتھ پیروں سے جیسے جان ہی نکل گئی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یوں ہاتھ پیر چھوڑنے سے کیا ہوگا۔ ایسے میں انسان کو صرف خدا کا سہارا ملتا ہے۔ میں بھی اُٹھ کھڑا۔ میں نے باہر جا کر وضو کیا۔ استاد بھی اٹھ چکے تھے۔ ہم دونوں نے مسجد میں جا کر فجر کی نماز ادا کی۔

"اب زور کرو گے میرے ساتھ؟" استاد نے کہا۔ اس وقت ہم مسجد سے واپس آ رہے تھے۔

"نہیں استاد' آج بالکل موڈ نہیں ہے۔" میں نے بُجھے بُجھے لہجے میں کہا۔

استاد نے مجھے غور سے دیکھا۔ "کیا بات ہے؟" انہوں نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں استاد۔"

"نہیں کوئی بات تو ضرور ہے۔" استاد نے اص...

"بس یونہی استاد' گھر والے یاد آ گئے تھے۔" میں نے ایک آہ بھر کے کہا۔

"خُدا کا شکر ہے۔" استاد بولے۔ "میں تو سمجھا ... لفیب دشمناں عاشق ہو گئے ہو... اور عنقریب ... کہنے لگو گے۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "چلیے... آ... کو اطمینان ہوا۔"

"ایسے نہیں مسکراتے۔" استاد نے کہا۔ پھر انہوں ... ایک شعر سنا دیا۔ "کون اسکو کہے گا مسکراہٹ۔ ہونٹوں ... یہ جبر یہ کھنچاؤ! برخوردار... زبردستی مسکرانے کی کو... کے لیے بڑا سلیقہ درکار ہوتا ہے... اور اس وقت تم خاصے پھوہڑ معلوم ہو رہے ہو۔"

میں خاموش رہا۔ کہتا بھی تو کیا کہتا۔

اتنی دیر میں ہم اکھاڑے پہنچ گئے تھے۔ اُس ... اکھاڑے میں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ مجھے بھی انہوں ... اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ نذرا اور فرید اکھاڑے میں ز... کر رہے تھے۔ استاد انہیں دیکھتے رہے... میں گھر ... خیالوں میں کھویا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد شمشاد نظر آیا ... استاد نے لسی منگوالی۔

کچھ دیر استاد مجھے دیکھتے رہے۔ مجھے ان کی ... کا احساس تھا۔ لیکن میری ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ ... ہلنا بھی دوبھر معلوم ہو رہا تھا۔ استاد کا انداز ایسا تھا ... وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہوں لیکن کچھ کہہ نہ پا رہے ہو... بالآخر انہوں نے ایک طویل سانس لے کر بات شرو... کر دی۔ "دیکھو برخوردار... آج تک میں نے تمہا... منہ سے گھر کا تذکرہ نہیں سُنا۔ آج بھی گھر تمہیں بلاو... یاد نہیں آیا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی... میں وہ جاننا چاہتا ہوں۔"

میں نے شاکی نظروں سے استاد کو دیکھا۔ ... منہ سے کچھ نہ بولا۔

"لسی پیتے رہو اور بات اگلتے رہو۔" استاد نے ہنس کر کہا۔

"بس استاد... بات یہ ہے کہ میں بہت نالائق ثابت ہوا ہوں۔" میری آواز بھرّا گئی۔ "مدتیں ہو گئیں' میں نے خط کے ذریعے بھی گھر کی خبر نہیں لی۔" میں بولتے بولتے چُپ ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ خواب کی تفصیل سن کر وہ میرا مذاق اڑانے لگیں گے۔ اس وقت وہ ویسے بھی کافی شگفتہ موڈ میں تھے۔

"ہاں' ہاں... کہتے رہو۔" استاد نے کہا۔

اتنے اصرار کے بعد میں اُن کی بات رد نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں نے انہیں خواب سُنا ڈالا۔ خلافِ توقع وہ بہت سنجیدہ اور متردّد نظر آنے لگے۔

"گھر سے خط کب سے نہیں آیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ استاد۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "پہلے بے گھر ہُوا تھا' اب بے ٹھکانا بھی ہو گیا ہوں۔ جب تک مزنگ والے مکان میں تھا' خطوط کا سلسلہ رہا تھا۔ پھر دربدری شروع ہو گئی تو خود اپنا ہی ہوش نہیں رہا۔"

"وہاں جا کر پتہ تو کرو۔ ممکن ہے' حال ہی میں کوئی خط آیا ہو۔" استاد نے مشورہ دیا۔

اُن کی بات معقول تھی۔ میرے سینے سے بوجھ قدرے کم ہو گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا تھا۔ میں نے ممنونیت آمیز نظروں سے استاد کی طرف دیکھا۔ "مان گیا استاد۔ آپ واقعی اچھے رہبر ہو۔"

"مجھے اُمید ہے' اب تم بہتر محسوس کر رہے ہو گے۔"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"صبح ہی مزنگ کا چکر لگا لو۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

آٹھ بجے کے قریب اسلم کا وکیل انصاری آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ کاروبار کا منتظم جمیل میرے لیے اسلم کی ذاتی کار چھوڑ گیا ہے۔ اُس نے کار کی چابیاں میری طرف بڑھا دیں۔ کار وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں نے استاد سے اجازت لی اور مزنگ جانے کے ارادے سے نکل کھڑا ہوا۔ انصاری کو میں نے ساتھ بٹھا لیا کہ اسے مال روڈ پر اتار دوں گا۔

انصاری کو الفلاح بلڈنگ کے سامنے اتار کر میں نے مزنگ کا رخ کیا۔ نجانے کیوں میرا دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ آج بہت عرصے بعد میں اُس علاقے کا رخ کر رہا تھا' جس نے مجھے لاہور میں پہلی بار پناہ فراہم کی تھی۔ اس عرصے میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ وقت بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ کبھی تو ہواؤں کی طرح چپ چاپ یوں گزر جاتا ہے کہ اس کے گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلتا... اور کبھی اس طرح گزرتا ہے کہ زندگی کی ہر ساعت پر اس کے قدموں کے نشان نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میں نے لاہور میں قیام کے تھوڑے سے عرصے میں ایک عمر بسر کر لی تھی۔

میں نے اپنے سابقہ ٹھکانے کے سامنے کار روکی' انجن بند کیا اور کھڑکیوں کے شیشے چڑھا کر' دروازے مقفل کر کے باہر نکلا۔ مکان کے دروازے پر کوئی کھڑا تھا۔ اُسی وقت وہ پلٹا... اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ دوسری طرف اس کا بھی یہی حال تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا' جیسے میرے روبرو اس کا چہرہ نہیں بلکہ آئینہ ہے اور میں اس میں اپنا عکس دیکھ رہا ہوں۔ وہ بالا تھا میرا چھوٹا بھائی اقبال!

چند لمحے تو جیسے زمین نے میرے قدم جکڑے رکھے... پھر میں تیزی سے اُس کی طرف جھپٹا اور اُسے سینے سے لگا لیا۔ میرا جسم اچانک ملنے والی خوشی سے ایسا شل ہو گیا کہ کچھ دیر تو مجھے اس کے ردِعمل کا پتہ ہی نہیں چلا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ گرم جوشی کا اظہار یک طرفہ ہے۔ میں نے اُسے خود سے لپٹا رکھا تھا' جبکہ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ بے جان سے انداز میں پہلوؤں میں جھول رہے تھے۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور اُسے بغور دیکھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نظروں میں اجنبیت اور سرد مہری تھی۔ میں اُسے دیکھتا رہا... اُس نے خاصا قد نکال لیا تھا۔ صحت بھی پہلے سے بہتر تھی۔ لیکن اس وقت انداز سے نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھیں متورّم تھیں اور اُن کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ رات بھر سو نہ سکا ہو۔ میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میرے ہونٹ لرز رہے ہیں لیکن میری قوتِ گویائی جیسے چھن گئی تھی بس

کا چہرہ بے تاثر تھا۔ نگاہوں کی اب بھی وہی کیفیت تھی جیسے میں اس کا بڑا بھائی نہیں بلکہ کوئی اجنبی ہوں۔
"تت... تم یہاں کیسے؟" بالآخر میں نے کہا۔
"غلطی ہوگئی۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"
اس کا لہجہ بھی نگاہوں کی طرح سرد تھا۔
"خیریت تو ہے؟"
"ہاں... اب پتہ چل گیا کہ خیریت ہے۔" اس نے کہا اور قدم بڑھائے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن وہ میرے برابر سے گزر کر آگے جا رہا تھا۔
میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"
"گھر..." اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش لیکن میری گرفت سخت تھی۔
"تم نے بتایا نہیں کہ یہاں کیوں آئے ہو؟"
"ایک ہی وجہ ہوسکتی ہے۔ تمھیں ڈھونڈنے آیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔
مجھے غصّہ آگیا۔ ایک تو میری جذباتی کیفیت اور اس پر اس کا رویّہ۔ "کیوں کیا میں کوئی بچّہ ہوں؟ کھو گیا ہوں۔"
"میں تو سمجھتا ہوں لیکن ماں نہیں سمجھتی۔" اُس نے بڑی بیگانگی سے کہا۔ "میں ماں کو سمجھاتا تھا کہ بھائی جان بچّہ نہیں ہیں' کھو نہیں جائیں گے لیکن ماں کہتی تھی کہ خط بھی نہیں آیا کب سے۔ میں لاہور آنا چاہتا تو روک دیتی۔ کہتی کہ تجھے بھی کھو دوں گی! خود چپکے چپکے تمھیں یاد کرکے آنسو بہاتی رہتی' جیسے مجھے کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ آخر کب تک برداشت کرتا... کل گھر سے چل دیا کہ تمھارے بارے میں خبر لے کر ہی واپس جاؤں گا۔" بولنے کا لہجہ تند ہوگیا۔ "ماں بوڑھی ہے اسے زندگی کا بڑا تجربہ ہے لیکن ممتا کے سامنے سارا تجربہ دھرا کا رہ جاتا ہے۔ وہی ہُوا جو میں نے کہا تھا جو میں ماں کو سمجھاتا تھا۔"
"کیا سمجھاتے تھے تم؟"
"یہی کہ بھائی جان نے خط لکھنا چھوڑ دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں ہماری ضرورت نہیں رہی۔"
"وہ کیسے؟" میں نے سختی سے پوچھا۔
"ماں نے بھی یہی پوچھا تھا۔" وہ تلخ سے انداز میں ہنس دیا۔ "لاہور بہت بڑا شہر ہے۔ بڑے شہر رشتوں کو چاٹ لیتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ اگر بھائی جان وہاں پیسہ کما لیا ہے تو ان کا خون سفید ہوگیا ہے عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خدانخواستہ کسی حادثے کا شکار ہوگئے ہوں۔ بڑے شہروں میں حادثات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ دونوں صورتوں میں بھائی جان ہماری طرف سے بے نیاز ہوچکے ہیں... لیکن ماں نہیں مانتی تھی۔"
میرا دل بھر آیا۔ میرا فرماں بردار بھائی کتنی بدگمانی کر رہا تھا... کتنی سرد مہری دکھا رہا تھا۔ لیکن میں نے اُمنڈتے ہوئے سینے پر قابو پالیا۔ "تو پھر... یہاں آکر کیا دیکھا تم نے؟" میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔
"یہ کار گواہی دیتی ہے کہ میری پہلی بات درست تھی۔" وہ پھٹ پڑا۔ "تمھارا خون سفید ہوگیا ہے۔ تم کاروں میں گھوم رہے ہو' عیش کر رہے ہو اور وہاں تمھارے لیے رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ تم اسے خط کے دو لفظ بھی نہیں لکھ سکتے؟"
"میں برا نہیں مانوں گا۔" میں نے نرم لہجے میں... "اس لیے کہ تم بچّے ہو۔ نہیں جانتے کہ بعض اوقات آنکھوں دیکھی حقیقت بھی فریب ہوتی ہے اور حقیقت اس کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم کل آئے ہو تو رات کو ٹھہرے کہاں تھے؟"
"اسٹیشن کے باہر سرائے میں' ایک چارپائی... تھی۔" اُس نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔
میں لرز کر رہ گیا۔ میں نے جب لاہور آکر وہ قطار در قطار چارپائیاں دیکھی تھیں تو میری طبیعت مکدّر ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر کبھی یہ نوبت آئی کہ مجھے وہاں سونا پڑا تو میں گاؤں واپس چلا جاؤں گا۔ میرے بھائی کو لاہور میں پہلی رات وہیں گزارنا پڑی تھی۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا ہے۔ ساتھ ہی ایک اور خیال نے مجھے چونکا دیا۔
"تم نے کھانا کھایا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔
اُس نے نظریں جھکالیں اور آہستہ سے بولا۔ "جی۔ خوب ڈٹ کر کھایا تھا۔"
میں سمجھ گیا۔ وہ بچپن ہی سے ایسا ہی تھا کہ...

دو تو دے گا۔ مانگنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔
"چلو میرے ساتھ۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔
"میں واپس گھر جاؤں گا۔"
"بکواس مت کرو۔" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "تم نے کبھی میرے ساتھ بدتمیزی نہیں کی۔ آج کی ہے۔ تم نے مجھے موقع نہیں دیا کہ میں تمھیں اپنی مجبوریاں بتاؤں۔ بس تم میرے خلاف فیصلہ کرکے بیٹھ گئے۔ چلو میرے ساتھ... کہیں چل کر سکون سے باتیں کریں گے۔"
وہ پشیمان نظر آنے لگا۔ "چلیے۔" اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔
میں نے کار کا دروازہ کھولا اور اسے اگلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ سب سے اہم کام اسے کسی اچھے سے ریستوران میں لے جاکر ناشتہ کرانا تھا۔
ریستوران پہنچ کر میں نے سب سے پہلے اسے ٹائلٹ کا راستہ دکھایا۔ وہ مُنہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو نسبتاً بہتر دکھائی دے رہا تھا۔ اتنی دیر میں میں ناشتے کا آرڈر دے چکا تھا۔
مجھے اس سے ناشتے کے لیے زیادہ اصرار نہ کرنا پڑا۔ شاید لاہور آنے کے بعد اُسے کھانا نصیب ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے ناشتہ کرنے لگا۔ میں طمانیت آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ممتا میں کتنی قوت ہے۔ میرا خواب سچّا ثابت ہوا تھا۔ امّی نے خواب میں جو کچھ کہا تھا' حرف بہ حرف سچ تھا۔ اگر میں نے خواب نہ دیکھا ہوتا تو مجھے مزنگ آنے کا خیال بھی نہ آتا... اور میں مزنگ نہ آتا تو اقبال خُدا جانے لاہور میں کب تک ٹھوکریں کھاتا پھرتا۔
"اب بتائیں بھائی جان کہ آپ نے خط لکھنا کیوں بند کر دیا تھا۔" اقبال ناشتے سے فارغ ہو کر میری طرف متوجہ ہوگیا۔ "میں رات بھی وہاں گیا تھا۔ میرے پاس آپ کا وہی پتہ تھا۔ رات وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ پھر میں صبح وہاں گیا تو پتہ چلا کہ آپ بہت پہلے مکان چھوڑ چکے ہیں۔ اس کا مطلب ہے ہمارے لکھے ہوئے بیشتر خطوط آپ تک نہیں پہنچے۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "میں حالات کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا ہوں۔ میں تو اپنے آپ سے بھی بچھڑ گیا تھا۔ یہ کار جسے دیکھ کر تم بدگمان ہوئے تھے' میری نہ ہوتے ہوئے بھی میرے پاس ہے... تمھیں کیا سناؤں بہت لمبی داستان ہے۔"
اقبال نے میرے لہجے میں پریشانی محسوس کر لی اور خود بھی پریشان ہوگیا۔ "مجھے بتائیے... شاید میں آپ کے لیے کچھ کر سکوں۔"
"ہاں... تم اتنا کر سکتے ہو کہ واپس گھر چلے جاؤ اور امّی کو تسلی دو۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم بھی کسی خطرے میں پڑ جاؤ۔"
میں نے بلا ارادہ خطرے کا تذکرہ کرکے اُسے مزید پریشان کر دیا۔ "کیا آپ مجھے اپنی پریشانیوں سے بے خبر رکھنا چاہتے ہیں؟"
"میں نے کہا نا کہ تمھیں صرف گھر واپس جانے کے متعلق سوچنا ہے۔" میرا لہجہ سخت ہوگیا۔
"ہرگز نہیں۔ میں آپ کو خطرے میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔"
اس کے لہجے سے اندازہ ہُوا کہ وہ جو کہہ رہا ہے اُس پر عمل بھی کرے گا جبکہ میرے لیے اس بات کی بہت اہمیت تھی کہ وہ خیریت سے گھر واپس پہنچ جائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جو آگ میرا دامن تھام چکی ہے' میرے گھر تک بھی پہنچ جائے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اسے لاہور میں قیام سے باز رکھنا بہت ضروری تھا۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد میں نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ "تم بلا وجہ ضد کر رہے ہو۔ لیکن میں غیر معقول رویّہ اختیار نہیں کروں گا۔ میں تمھیں دو شرطوں پر یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کر سکتا ہوں۔ پہلی شرط یہ کہ تم کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرو گے۔ دوسری یہ کہ تم خاموشی سے گھر واپس جاؤ گے۔ میں تم سے رابطہ رکھوں گا اور تم میری اجازت کے بغیر لاہور واپس نہیں آؤ گے۔ اگر یہ شرائط تمھیں منظور نہیں تو بے شک میرے ساتھ رہو۔ اب تک میں دُشمنوں سے بچتا رہا ہوں۔ تم ساتھ رہو گے تو مجھے تمھارا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ ایسے میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ ہم دونوں ہی مارے جائیں... اور امّی..." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

در حقیقت میں نے اُس کی دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھ دی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری تجویز قبول کرلے گا۔

وہ چند لمحے سوچتا رہا' پھر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں واپس چلا جاؤں گا۔"

"وعدہ خلافی تو نہیں کرو گے۔"

"میں نے پہلے کبھی آپ کا کہنا ٹالا ہے۔" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

مجھے اس لمحے اس پر بڑی شدت سے پیار آیا پھر میں نے اسے بلا کم و کاست وہ تمام واقعات سُنا دیے' جو لاہور میں قیام کے دوران مجھے پیش آئے تھے۔ وہ خاموشی سے سُنتا رہا... لیکن اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئی تھیں۔

"یہ تو بہت خراب صورتحال ہے۔" میرے خاموش ہونے پر اُس نے کہا۔

"اتنی خراب بھی نہیں ہے بلکہ اب تو صورتحال میرے حق میں ہے۔"

"وہ کیسے؟ آپ اپنے دشمنوں کے متعلق اب تک اندھیرے میں ہیں۔"

"جو لوگ سامنے آچکے ہیں' اُن کی مدد سے ہم پیش قدمی کرسکتے ہیں۔ پھر اب میں اکیلا نہیں ہوں۔"

"اب آپ ہی بتائیں بھائی جان کہ ایسے حالات میں آپ کو تنہا کیسے چھوڑ دوں؟" اُس نے شاکی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تم وعدہ کرچکے ہو۔" میرا لہجہ درشت ہوگیا۔

"ٹھیک ہے بھائی جان۔" وہ بے بس دکھائی دینے لگا۔

"اب چھوڑو ان باتوں کو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "گھر کی بات کرو۔ امّی اور ابّا جی کیسے ہیں... اور ہاں' تمھارے امتحان کا کیا ہُوا؟"

"امتحان دے دیا ہے۔ رزلٹ کا انتظار ہے۔"

"پرچے کیسے ہوئے ہیں؟"

"اللہ کے فضل سے بہت اچھے۔" وہ مسکرانے لگا۔ "انشا اللہ فرسٹ کلاس آئے گی۔ گھر میں سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے۔ بس آپ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

ہم دیر تک گاؤں کی باتیں کرتے رہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھا ہُوا ہوں۔ دونوں شاید دو گھنٹے تک گھر کی باتیں کرتے رہے۔ ادا کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ اقبال کو اکھاڑے لے جاؤں لیکن پھر یہ خیال آیا کہ یہ نامناسب ہوگا۔ دنوں اکھاڑے کی فضا ویسے ہی خراب تھی۔ ایک تو میرے علم میں آچکی تھی' مگر مجھے اُس کے پھیلاؤ کا نہیں تھا۔ ایسی مخدوش فضا میں اقبال کو لے جانا' خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

ہوٹل سے نکل کر میں اُسے انارکلی لے گیا۔ وہاں امّی' ابّا جی اور اقبال کے لیے کپڑے وغیرہ خریدے پھر جیب سے کچھ رقم نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ امّی کو دے دینا۔"

"لیکن بھائی جان..." اُس نے احتجاج کرنا چاہا۔ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمھیں صرف ہدایات پر عمل کرنا ہے۔ امّی سے کہہ دینا کہ میں ٹھیک ہوں اور مجھے بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ خطوط سلسلے میں بتانا کہ ڈاک کے نظام میں گڑبڑ کی وجہ سے اُن تک نہیں پہنچ سکے ہیں حالانکہ میں خط لکھتا رہا ہوں۔ اور ہاں' میرا وعدہ ہے کہ اب میں باقاعدگی سے خط رہوں گا۔"

وہ خاموشی سے سُنتا رہا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن تاثرات تھے' تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چلو میں تمھیں لاری اڈے چھوڑ دیتا ہوں۔ وہاں کسی بس میں بیٹھ کر چلے جانا۔" میں نے کہا۔ پھر ایک پر اکھاڑے کا فون نمبر لکھ کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ ذہن نشین کرلینا۔ کبھی ضرورت پڑے تو اس نمبر پر رابطہ قائم ہوسکتا ہے۔ گھر کا خیال رکھنا۔ اچھا؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ لاری اڈے پہنچ کر نے اسے فیصل آباد جانے والی بس میں بٹھا دیا۔ بس روانہ ہونے تک میں اس سے باتیں کرتا رہا' اسے رہا۔ پھر بس کی روانگی کا وقت آگیا۔ وہ کھڑکی میں سے نکال کر ہاتھ ہلاتا رہا۔ میں دیر تک وہیں کھڑا رہا حتیٰ کہ بس نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میرے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا لیکن ایک بے نام سی اداسی مسلط ہوگئی تھی۔ میں کار میں آبیٹھا اور اسے اسٹارٹ

گے بڑھا دیا۔

گاڑی شہر کی سڑکوں پر' میرے ذہن اور منتشر سوچوں کی طرح بے مقصد دوڑتی رہی۔ پریشان خیالی کی اس کیفیت میں مجھے کوئی منزل نہیں سوجھ رہی تھی پھر ایک بے نام سی خلش کا احساس ہونے لگا۔ میں اسے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اچانک عقب نما آئینے میں مجھے ایک سرمئی گاڑی کا عکس نظر آیا۔ لاشعور کی خلش شعور کی سطح پر اُبھر آئی... لیکن یہ میرا وہم بھی ہوسکتا تھا۔ میں نے بے مقصد سڑک گردی کا سلسلہ جاری رکھا لیکن اب میری نظر عقب نما آئینے پر تھی۔ اس دوران میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا کر بھی دیکھا۔ سرمئی گاڑی بدستور میرے تعاقب میں تھی۔ پندرہ بیس منٹ میں مجھے یقین ہوگیا کہ میرا تعاقب کیا جارہا ہے۔

میرا دل اندیشوں سے بھر گیا اور میں پریشان ہوگیا۔ دشواری یہ تھی' مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا تعاقب کب سے ہورہا ہے۔ تاہم تعاقب کا مطلب تھا کہ دشمنوں نے مجھ پر نظر رکھی ہے۔ اس صورت میں اقبال بھی اُن کی نظروں میں آگیا ہوگا۔ وہ لوگ ہمارے تعلق کے سلسلے میں حتمی نہ سہی لیکن کسی حد تک اندازہ ضرور لگا چکے ہوں گے۔ اگر میرا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا تو اقبال یقیناً خطرے میں تھا۔ وہ اُسے نقصان پہنچا سکتے تھے... اسے یرغمال بنا کر مجھ سے ڈائری کا مطالبہ کرسکتے تھے۔ اور بدترین بات یہ تھی کہ میں انھیں ڈائری واپس نہیں کرسکتا تھا کیونکہ میں نے اس منحوس ڈائری کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔

اضطراری طور پر میں نے کار موڑی اور لاری اڈے کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ ایکسلیٹر پر میرے پیر کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ عقب نما آئینے میں سرمئی گاڑی اب بھی نظر آرہی تھی۔

میں نے خود کو پُرسکون کرکے کچھ سوچنے کی کوشش کی۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ خطرات کے دوران ذہنی یکسوئی بے حد اہم ہوتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میری ذہنی حالت بہتر ہوگئی۔ اب مجھے اپنا اضطراری فعل ایک لغزش معلوم ہونے لگا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرا پیچھا کرنے والے اقبال کو رخصت کرنے سے پہلے ہی میرے پیچھے لگ چکے تھے۔ اگر وہ اقبال کے وجود سے بے خبر تھے تو میں اس وقت اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کر رہا تھا۔ میں انھیں خود ہی اقبال تک لے جا رہا تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی ایکسلیٹر سے میرے پیر کا دباؤ ہٹ گیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہوگئی۔

سرمئی گاڑی کی رفتار بھی کم ہوگئی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ پہلی ہی فرصت میں تعاقب کرنے والوں سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔ سامنے ہی ایک میڈیکل اسٹور تھا۔ میں نے کار اس کے سامنے روک دی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میرا تعاقب کون کر رہا ہے۔ سرمئی گاڑی بھی کچھ فاصلے پر رُک گئی۔ میں نے سڑک پار دیکھنے کے بہانے سرمئی کار پر نظر ڈالی لیکن کار میں بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ پھر میں نے میدان میں کُودنے کا ارادہ کرلیا اور سرمئی کار کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی میں کار سے کچھ دُور ہی تھا کہ کار تیزی سے دائیں طرف گھوم گئی اور میں اس شخص کو دیکھنے سے قاصر رہا۔ میں اُس کی صورت تو نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اس سے پیچھا ضرور چھوٹ گیا تھا۔

میں اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا اور اسے آگے بڑھا دیا۔

کچھ دیر بعد مجھے اطمینان ہوگیا کہ اب میرے تعاقب میں کوئی نہیں ہے تو میں نے کار کا رُخ اکھاڑے کی طرف کردیا۔

استاد کہیں گئے ہوئے تھے۔ مجھے اُن کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ میں اپنے کمرے میں جاکر بستر پر لیٹ گیا۔

میرا خیال تھا کہ میں نے بس کا تعاقب نہ کرکے ٹھیک ہی کیا ہے۔ تاہم پریشانی اپنی جگہ برقرار تھی۔ میں اقبال کی طرف سے فکرمند تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ نگرانی تو میری ہورہی تھی۔ میں یہ تو کرسکتا تھا کہ اکھاڑے کے کسی آدمی کو گاؤں بھیج کر اقبال کی خیریت معلوم کرلوں۔ یہ سوچ کر میں اٹھا لیکن میرے قدم دروازے کی طرف اُٹھتے ہوئے رُک گئے۔ اکھاڑہ سازشوں کا اڈہ بنا ہُوا تھا۔ جب تک صورت حال واضح نہیں ہوجاتی' وہاں کے کسی آدمی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں بے چین ہوکر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پریشانی بڑھ گئی تھی۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہورہے تھے۔ ذہن اس طرح ماؤف ہُوا کہ کچھ سجھائی نہیں دے

رہا تھا۔

مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ استاد کب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے تو اُن کی آواز نے چونکا دیا تھا۔

"کیا بات ہے برخوردار" انھوں نے کہا "بہت بے چین معلوم ہوتے ہو؟"

میں نے چونک کر دیکھا۔ استاد کے ساتھ حامد بھی تھا۔ "ہاں استاد، صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے" یہ کہہ کر میں نے انھیں سب کچھ بتا دیا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں" میں نے آخر میں کہا۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے" میں نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن استاد نے اشارے سے مجھے خاموش کرا دیا۔ "حامد کس دن کام آئے گا"

میں نے حامد کی طرف دیکھا۔

"استاد ٹھیک کہہ رہے ہیں" حامد نے کہا "پتہ بتا دو۔ میں وہاں کے تھانے کو فون کر کے معلوم کروا لیتا ہوں"

میری جان میں جان آگئی اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ "اسی لیے تو میں تمھیں یاد کر رہا تھا، استاد" میں نے ہنس کر کہا۔

"اور یاد کرتے ہی میں نازل ہو گیا" استاد نے قہقہہ لگایا۔ "ویسے میں اتفاقاً ہی آگیا تھا، اب میں جا رہا ہوں، واپسی شام کو ہو گی"

استاد چلے گئے۔ میں نے حامد کو گھر کا پتہ لکھوا دیا اور کہا کہ پولیس کا جو بھی آدمی وہاں جائے وہ کسی کو تجسس میں مبتلا کیے بغیر ہی اقبال کے بارے میں معلوم کرے۔ حامد چلا گیا تو میں نے کمرہ بند کر لیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ رات میں ٹھیک طرح سے نہیں سو سکا تھا اور دن بھی کچھ اچھا نہیں گزرا تھا۔ ذہن سے بوجھ قدرے کم ہوا تو تھکن نے سر اُبھارا اور مجھے نیند کی وادیوں میں دھکیل دیا۔

شام کو اُٹھا تو تر و تازہ تھا۔ میں نے لنگوٹ کسا اور زور کرنے اکھاڑے میں جا پہنچا۔ دو ایک پہلوانوں سے زور کرنے کے بعد کلو پہلوان سامنے آگیا۔ وہ داؤ پیچ کے معاملے میں استاد تھا لیکن اس کا جسم اس کے قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بھاری بھر کم جسم کی وجہ سے مار کھاتا تھا۔ اس کے ساتھ زور کرنے میں مجھے ہمیشہ لطف آتا تھا۔

ہم زور کرتے رہے۔ اچانک احساس ہوا کہ وہ مجھ پر مہلک داؤ لگا رہا ہے۔ مجھے اس بات کا بروقت احساس ہو گیا تھا۔ میں سنبھل گیا... لیکن توڑ کے لیے جوابی داؤ لگانا ضروری تھا۔ وہ شاید اسی بات پر انحصار کر رہا تھا کہ میں لاعلمی میں مار کھا جاؤں گا لیکن میں قبل از وقت ہوشیار ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرے جوابی داؤ کے نتیجے میں اس کا بازو لٹک گیا۔ کندھے کا جوڑ الگ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک زوردار چیخ ماری اور مجھے بُرا بھلا کہنے لگا۔ میں ایک طرف کھڑا یوں حیرت سے اُسے دیکھنے لگا جیسے یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہو۔

"تم دوستوں پر ایسے داؤ آزماتے ہو" اس نے چیخ کر کہا۔ وہاں موجود دوسرے پہلوان ساکت آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اچانک ہی استاد آگئے۔ "کیا ماجرا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

کلو پہلوان نے مجھ پر الزام لگاتے ہوئے استاد سے شکایت کر دی۔

"کیوں برخوردار" استاد نے مجھے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا "یہ کیا حرکت ہے؟"

"لیکن استاد..." میں ہکلا کر رہ گیا۔

"خاموش رہو" استاد نے میری بات کاٹ دی۔ میں نے غور سے انھیں دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں میرے لیے ایک اشارہ تھا۔ "کلو پہلوان سے معذرت کرو۔ وہ تم سے سینئر بھی ہے اور صاحبِ ظرف بھی... مجھے یقین ہے معاف کر دے گا"

استاد کا حکم میں یوں بھی نہیں ٹال سکتا تھا، پھر انھوں نے آنکھ سے مجھے اشارہ بھی کیا تھا۔ "میں معافی چاہتا ہوں، کلو بھائی" میں نے نرمی سے کہا۔ "یقین کرو میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا"

کلو پہلوان نے کڑی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"بس، کلو پہلوان۔ معاف کر دے جمال کو اور دل صاف کر لے" استاد نے جلدی سے کہا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ "چلو... گلے لگ جاؤ دونوں" میں نے کلو کو گلے لگا لیا۔ وہ گلے لگ گیا لیکن انداز سے پتہ چلتا تھا کہ طوعاً و کرہاً اس نے یہ بات قبول کی ہے۔ بہرحال ہمارے گلے لگتے ہی اکھاڑے میں تالیاں گونجنے لگیں۔ استاد بڑی خوش مزاجی سے گپیں کرتے رہے۔ پھر انھوں نے مجھے ساتھ آنے کو کہا اور اپنے کمرے میں آگئے۔

"جمال... مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی" استاد مجھ سے مخاطب ہوئے۔ لہجے میں سنجیدگی تھی۔ اُن کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ ایک پل تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ تنہائی کے باوجود مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ پھر اُن کی آنکھوں کا اشارہ سمجھ کر میں چوکنا ہو گیا۔ "خیر... جو ہوا اس پر خاک ڈالو۔ البتہ آئندہ محتاط رہنا... ورنہ میں اکھاڑے کی گدی کے سلسلے میں اپنا فیصلہ بدل بھی سکتا ہوں" انھوں نے مزید کہا۔ لہجہ سخت تھا۔

میں "بہت بہتر" کہہ کر اُن کے کمرے سے نکل آیا۔ استاد نے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ پانچ منٹ بعد میں اکھاڑے سے نکل آیا۔ اُسی وقت استاد بھی اکھاڑے سے نکل رہے تھے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ بازار کی طرف چلنے لگے۔

"برخوردار... میں دیکھ رہا ہوں کہ اکھاڑے کے معاملات میں گڑبڑ ہے" اچانک انھوں نے کہا۔ "میرا مشورہ ہے کہ آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ میری آنکھیں بہت کچھ دیکھ رہی ہیں"

میرے جی میں آئی کہ انھیں رات والے واقعے سے آگاہ کر دوں۔ لیکن اُن کی بصیرت کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ بے خبر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود وہ اس سلسلے میں کھل کر بات نہیں کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ استاد جیسے پہلوان، جو عظیم انسان بھی ہوتے ہیں، اس وقت تک کسی پر الزام عائد نہیں کرتے جب تک کہ اُن کا شک یقینِ کامل کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ مجھے خود بھی اس اصول پر عمل کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ میں ایک مرتبہ پھر ضبط کر کے رہ گیا اور میں نے استاد کو گزشتہ شب کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔

"اب تم کسی اور طرف نکل جاؤ" استاد نے دھیرے سے کہا۔ "کسی کو یہ اندازہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم مل کر نکلے تھے" یہ کہہ کر انھوں نے ہاتھ لہرایا اور سیدھے چلے گئے۔ میں ایک حلوائی کی دکان پر رک گیا اور دل نہ چاہنے کے باوجود اُس سے دودھ طلب کر لیا۔ دودھ زہر مار کرنے کے بعد میں اکھاڑے واپس آگیا۔ پہلوانوں کی خوش گپیاں جاری تھیں۔ اس کے باوجود ماحول میں کشیدگی کا احساس ہو رہا تھا۔

مغرب سے ذرا پہلے میں نے وضو کیا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ نماز کے بعد میں مسجد سے نکلا۔ بازار کی رونق شباب پر تھی۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ اچانک میری نظر ایک ہجوم پر پڑی۔ ساتھ ہی چیخم دھاڑ بھی سنائی دی۔ شاید کوئی جھگڑا ہو رہا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کسی معاملے میں اُلجھنے سے بہتر ہے کہ پہلو بچا کر نکل جاؤں، لیکن اکھاڑے کے لوگ ایسا نہیں کرتے۔ اکھاڑے کی عزت بھی اسی سے تھی کہ اکھاڑے کے لوگ ایسے معاملات سے بچتے نہیں تھے بلکہ انھیں سلجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ میں بھی ہجوم کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے مجمع میں کھڑے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا۔

"معاملہ کیا ہوتا جی" اس نے جواب دیا۔ "غنڈوں کی بن آئی ہے... چاقو لے کر ماسٹر صدیق کی دکان میں گھس گیا اور لگا بھتہ طلب کرنے... یہ بھول گیا تھا کہ ہر سیر کے لیے سوا سیر ہوتا ہے!"

اس کی تقریر سن کر کچھ اور لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے چند ایک مجھے پہچانتے تھے۔ انھوں نے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دیا۔ یوں میں اندر گھس گیا۔ لوگ مجھے راستہ دیتے رہے۔ بالآخر میں دائرے کے پہلے گھیرے میں پہنچ گیا۔ اب وہ منظر میرے سامنے تھا۔

حفیظ پہلوان ایک ایسے آدمی کو گھیرے کھڑا تھا جو صورت ہی سے لفنگا نظر آ رہا تھا۔ حفیظ اُس آدمی کو بے نقط سُنا رہا تھا۔ عام حالات میں حفیظ پہلوان بڑا متحمل مزاج انسان تھا، لیکن جب اُسے غصّہ آتا تھا تو وہ بالکل بدل کر رہ جاتا تھا۔ اس وقت وہ غصّے میں نہیں تھا۔ البتہ بدمعاش کو زوردار لیکچر دے رہا تھا۔ اُسے سمجھا رہا تھا کہ کمزوروں کو دھمکانا کوئی

اچھی بات نہیں۔ کچھ دُور ایک چاقو گرا پڑا تھا۔

"اگر تیرے اندر ذرا سی بھی غیرت ہے تو آئندہ یہ دھندا نہیں کرے گا۔" حفیظ نے کہا۔ "جاندار آدمی ہے... ہٹا کٹا، گدھے... زمین پر لات مارے تو رزق نکل آئے... لیکن حرام مُنہ کو لگ گیا ہے... یونہی حرام کھاتا رہا تو یہ جان دھری رہ جائے گی..."

اس شخص میں غیرت باقی تھی... لیکن اور طرح کی! حفیظ کی باتیں اور وہ بھی بہت سارے لوگوں کے سامنے... اسے بہت بُرا لگا تھا اور شاید اسے اپنا کیریئر بھی تباہ ہوتا نظر آیا تھا۔ اُس نے اچانک چاقو کی طرف جست لگائی اور چاقو اُٹھا لیا۔ پھر وہ چاقو لہراتے ہوئے حفیظ کی طرف بڑھنے لگا۔ حفیظ کے ہونٹوں پر مجھے تضحیک آمیز مُسکراہٹ نظر آئی۔ "اب۔ اب ہوئی نا بات۔" اُس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "اب تو نے مردوں والی بات کی ہے، لیکن تو آئندہ چاقو ہاتھ میں نہیں لے سکے گا۔"

میں نے چاقو بدست بدمعاش کو بغور دیکھا۔ انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ چاقو کے کھیل سے خوب واقف ہے۔ وہ مشاق چاقو بازوں کی طرح حفیظ کی طرف بڑھتا رہا۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے بھی حفیظ کی طرف سے غفلت نہیں برتی تھی، لیکن اُس سے ایک چُوک ہو گئی۔ مسلح ہونے کے زعم میں وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس کا مدِ مقابل کوئی عام شہری نہیں ہے۔

حفیظ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ دو قدم دُور رہ گیا تو حفیظ نے نرم لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔ "دیکھ بے نفنگے... اب تک تو میں تجھے طرح دیتا رہا ہوں لیکن تُو نے ایک وار بھی کر دیا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

جواب میں وہ شخص بڑی پھُرتی سے حفیظ پر حملہ آور ہُوا۔ حفیظ کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ ایک جانب ہٹ کر چاقو والے ہاتھ کو گرفت میں لینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ بدمعاش نے بھی یہ اندازہ لگا لیا تھا۔ عین موقعے پر اس نے اپنی سمت ذرا سی تبدیل کی اور ساتھ ہی بجلی کی سی سُرعت سے چاقو بائیں ہاتھ میں لے لیا، لیکن حفیظ نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔

اُس نے نہایت اطمینان سے اپنی جگہ کھڑے کھ بدمعاش کی بائیں کلائی گرفت میں لی اور جھٹکا چاقو بدمعاش کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ساتھ ہی نے اس کی کلائی موڑ کر اُسے گھما دیا۔ اگلے ہی لمحے کا بازو بدمعاش کے گلے کے گرد حمائل ہو گیا۔ اس

حفیظ کے لبوں پر مُسکراہٹ تھی لیکن آنکھیں سُر گئی تھیں۔ میں اُس کا یہ انداز خوب پہچانتا تھا۔ اس وہ شدید غصّے میں تھا۔ بدمعاش نہ صرف ہاتھ پیر تھا بلکہ مغلظات بھی بک رہا تھا۔ اُس کی زبان جنبش کے ساتھ حفیظ کی آنکھوں کی سُرخی میں ا ہوتا جا رہا تھا۔ بدنصیب بدمعاش کو خبر نہیں وہ اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے۔

"حفیظ... چھوڑ دو اسے۔ اس کے لیے آ سزا کافی ہے۔" میں چیخا۔

حفیظ نے اجنبی نگاہوں سے میری طرف اُس نے مُنہ سے کچھ نہیں کہا، لیکن اُس کے با کے تناؤ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی گرفت سخت ہو رہی ہے۔ نگاہوں کی اجنبیت بتا حفیظ اس وقت شدید غصّے میں ہے۔ اس ک میں وہ کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔

اب مداخلت ناگزیر تھی، لیکن میں نے مرتبہ پھر حفیظ کو سمجھانا چاہا۔

"بکواس مت کرو..." اس بار وہ دھاڑا۔

اب مجھے جسمانی مداخلت کرنا تھی۔ کس لمحے بدمعاش کی گردن ٹوٹ سکتی تھی۔ میں وہی کیا، جو مجھے ایسے موقع پر کرنا چاہیے تھا۔ آگے بڑھ کر حفیظ کے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کی پر بدمعاش کی گردن پر اس کی گرفت کمزو بدمعاش نے موقع پاتے ہی خود کو چھڑا لیا ہو گیا۔ جتنی دیر میں حفیظ سنبھلتا، وہ دور تھا۔ اس بار اُسے اپنا چاقو اٹھانے کا ہوش رہا تھا۔

حفیظ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ مجھے نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"معاف کرنا حفیظ۔" میں نے نرم لہ

اپنے آپ میں نہیں تھے۔ اگر میں مداخلت نہ کرتا تو وہ تمہارے ہاتھوں مارا جاتا۔"

"اور تمہارے خیال میں یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی۔" حفیظ کف اڑاتے ہوئے بولا۔ "تمہارے خیال میں تفریح کر رہا تھا؟ میں اس کا خون پی جاتا۔ اس ی یہ جرأت... لیکن میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔"

"اس وقت تم غصّے میں ہو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"بکواس مت کرو۔ اگر استاد کا خیال نہ ہوتا تو تمہیں یہیں مزا چکھا دیتا۔ خیر، تمہیں بھی دیکھ لوں..." یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا اکھاڑے کی طرف لا گیا۔ میری طبیعت مکدر ہو چکی تھی۔ میں نے اکھاڑے نا مناسب نہ سمجھا اور یونہی چہل قدمی کرنے لگا۔ را ذہن بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ میں حفیظ کے متعلق وب جانتا تھا۔ وہ اچھا آدمی تھا۔ وہ ہمیشہ رے ساتھ بڑی محبت اور احترام سے پیش آتا تھا۔ لیکن اس کا آج کا رویّہ... غصّے میں ہونے کے جود... اسے میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا یئے تھا۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر جیرے اور کالو وان کے بعد وہ تیسرا شخص تھا، جس نے میرے اتھ معاندانہ رویّہ اختیار کیا تھا۔ میں نے اُسے بھی کوک افراد کی فہرست میں شامل کر لیا۔ میں یونہی مقصد چہل قدمی کرتا رہا۔

بہت دیر بعد جب میں اکھاڑے پہنچا تو استاد رے منتظر تھے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ معاملہ ستاد کے علم میں لایا جا چکا تھا۔ استاد نے مجھے سمجھایا ان لوگوں کے ساتھ یوں سختی نہ برتوں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ استاد کے سامنے اس واقعے کو توڑ ڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ میں نے وضاحت کی، جو کچھ نے حفیظ کے ساتھ کیا، وہ سختی کے ذیل میں آتا۔ میرا فعل ایسا ہی تھا، جیسے موت کے گھر سی ایسے شخص کے مُنہ پر تھپّڑ مارا جائے، جو میں ہو اور ہوش و حواس کھو بیٹھا ہو۔ میں نے اد کو بتایا کہ اگر میں مداخلت نہ کرتا تو وہ بدمعاش طور پر حفیظ کے ہاتھوں مارا جاتا۔

استاد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "یہ بات میں سمجھ گیا تھا برخوردار۔ لیکن اکھاڑے کے حالات کے پیشِ نظر میرا مشورہ ہے کہ تم نرمی سے کام لو... صرف اس وقت تک، جب تک بلّی تھیلے سے باہر نہیں آ جاتی۔" انھوں نے کہا۔

میں نے استاد سے وعدہ کر لیا کہ اس سلسلے میں اور زیادہ محتاط رہوں گا۔ پھر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہ دن بڑا عجیب گزرا تھا۔ ایک دن... اور اتنے سارے واقعات! میں بیٹھا سوچتا رہا۔ اب ذرا فرصت ملی تھی تو اقبال کے متعلق پریشانی کا احساس اُبھر آیا تھا۔ حامد کی طرف سے اس سلسلے میں ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

میں اسی الجھن میں پڑا رہا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا... اور حفیظ پہلوان کو دروازے میں کھڑا پایا۔ وہ چند لمحے بغور مجھے دیکھتا رہا، پھر مسکرا دیا۔ "میں اندر آ سکتا ہوں؟" اُس نے کہا۔

"ضرور... ضرور!"

وہ اندر چلا آیا۔ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر وہ رک گیا۔ اب وہ پھر مجھے دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس کے انداز میں پشیمانی ہے۔ "یار جمال... مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔" اُس نے کہا۔

"مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" میں نے غیر جذباتی انداز میں کہا۔

"یہ تو تمہارے ظرف کی بات ہے۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے کمینگی سرزد ہوئی ہے۔" وہ محجوب لہجے میں بولا۔ "لیکن یار... تم تو جانتے ہی ہو کہ اس وقت میں اپنے آپے میں نہیں تھا۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" میں نے مختصراً کہا۔

"بس کیا کروں۔ غصّہ آ جائے تو مجھے اپنے اُوپر اختیار نہیں رہتا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ مجھے غصّہ کم ہی آتا ہے۔"

"اسی لیے تو اتنی شدت سے آتا ہے۔"

"یار تم واقعی عظیم آدمی ہو۔" اس نے بھرّائی

ہوئی آواز میں کہا اور مجھے لپٹا لیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مکاری سے کام لے رہا ہے لیکن میں نے سیکھ لیا تھا، وہاں بقا کی یہی صورت ہے کہ میں بھی اسی رنگ میں رنگ جاؤں چنانچہ میں نے بھی بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ میں نے اس کی معذرت کے جواب میں اپنے رویے پہ ندامت کا اظہار کیا۔

”نہیں جمال تمھاری کوئی غلطی نہیں تھی۔“ اس نے کہا۔ ”مجھ پر ہاتھ اٹھائے بغیر تم اسے موت سے نہیں بچا سکتے تھے۔ اس وقت تو مجھے ہوش نہیں تھا لیکن اب یاد آرہا ہے۔ میں اس کی گردن توڑنے والا تھا۔ اب مجھے احساس ہو گیا ہے کہ تم نے جو کچھ کیا، وہ ضروری تھا۔ بخدا... اگر تم مجھے نہ روکتے تو میں قاتل بن گیا تھا۔ تم نے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔“

وہ کچھ دیر بیٹھا مجھ سے محبت آمیز گفتگو کرتا رہا۔ میں اندر ہی اندر کھولتا رہا لیکن لبوں پہ مسکراہٹ چسپاں کیے بیٹھا رہا۔ پھر وہ چلا گیا اور میں اکھاڑے سے نکل آیا۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے دوپہر کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔

ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر چہل قدمی کی۔ ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ میں نے قدم قدم پہ اِدھر اُدھر دیکھا لیکن میرے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کیونکہ دوپہر سے کچھ پہلے میری کار کا تعاقب کیا جا رہا تھا... لیکن اکھاڑے کے گرد و نواح میں اب تک مجھے تعاقب کا احساس نہیں ہوا تھا۔ یہ بات اشارہ کرتی تھی کہ میرے تعاقب کا تعلق بھی اکھاڑے سے ہے، ورنہ صرف اکھاڑے سے دور ہونے کی صورت میں میرا تعاقب کیوں کیا جاتا۔ اس کا مطلب تھا کہ اکھاڑے اور اس کے اردگرد میری نگرانی کروانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہاں میں اپنے نامعلوم دشمنوں کی نظروں کے سامنے تھا۔

نو بجے کے قریب میں اکھاڑے واپس پہنچا۔ بیشتر پہلوان سو چکے تھے۔ میں بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ تخت پہ دراز ہو کر میں نے دن بھر کی تفصیلات کو اپنے ذہن میں اجاگر کیا۔ آج دو پہلوان کسی نہ کسی طور میری مخالفت کر چکے تھے... گویا ان دونوں کا

تعلق جیرے والے گروہ سے ہو سکتا تھا۔ اکھا
کے حالات کے پیشِ نظر میں نے مناسب سمجھا ک
کے پہلے حصے میں سو لیا جائے۔ آدھی رات کے بع
چوکنا رہنا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جیرا اور اس
بیرونی ساتھی میرے اور استاد کے سلسلے میں کب آ
قدم اٹھائیں گے۔ استاد کو آگاہ نہ کرنے کی صور
میں میری ذمے داری اور بڑھ گئی تھی۔

میں لائٹ آف کیے بغیر ہی سو گیا۔ ایک بجے
قریب میری آنکھ کھل گئی۔ سب سے پہلے میں
اپنے کمرے کی لائٹ آف کی۔ اس کے بعد پندرہ
تک میں تخت پر ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ پندرہ م
بعد میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر کی سُن
لی۔ پھر میں باہر نکل آیا۔ اکھاڑا سنسان تھا۔ میں ا
اُدھر دیکھتا رہا۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ کہیں کسی
کی نقل و حرکت کے آثار نہیں تھے۔ تاہم میں نے ف
کیا کہ باقی رات جاگ کر گزاروں گا۔

اچانک میں چونک گیا۔ اندھیرے میں ہلکی سی
بھی سورج کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ ایک لمحے
جل کر بجھ جانے والی اس روشنی نے میری توجہ اپنی
منعطف کرالی۔ میں نے اکھاڑے کے اس کو
طرف دیکھا، جہاں ایک بہت بوڑھا برگد استادہ
کے نیچے یا قریب ہی کہیں ایک لمحے کے لیے مجھ
انگارہ سا دہکتا نظر آیا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھا
رہا لیکن مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اندھیرے میں پل
لیے نظر آنے والی روشنی اندھیرے کے تاثر کو او
شدید کر دیتی ہے... بلکہ ایسے میں آنکھوں تک
اندھیرے اُتر آتے ہیں۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہوا

اس مرتبہ وہ انگارا پل بھر کے وقفے سے
چمکا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی سگریٹ پی رہا
سوچ میں پڑ گیا۔ اکھاڑے میں موجود لوگوں میں
کوئی بھی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ تو پھر وہ کون
اکھاڑے میں کیا کر رہا ہے۔ تشویش کی ایک ل
بدن میں دوڑ گئی۔ میرا جسم تن سا گیا۔ میں
کر دیکھا۔ اندھیرے کے باعث میں اتنا قریب ہ
باوجود اپنے کمرے کو ٹھیک طرح سے نہیں

تھا، جبکہ وہاں موجود شخص تو بہت دور تھا۔ اس اعتبار سے میری پوزیشن محفوظ تھی... یعنی میں اگر محتاط ہو کر حرکت میں آتا تو وہ شخص مجھے نہ دیکھ پاتا۔ میں نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ سفید ہونے کی وجہ سے گیٹ مجھے نظر آگیا۔ وہ نیم وا تھا۔ گویا کوئی اندر آیا تھا۔ یہ بات بھی طے تھی کہ برگد کے نیچے کھڑا ہوا شخص کوئی اجنبی ہی تھا۔ میں دھیرے دھیرے دیوار سے چپک کر برگد کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ لمبا راستہ تھا لیکن محفوظ تھا۔ سیدھا آگے بڑھنے میں خدشہ تھا کہ مجھے دیکھ لیا جائے گا۔

برگد والے حصے میں دیوار کے ساتھ خودرو جھاڑیاں کا سلسلہ خاصی دور تک چلا گیا تھا۔ وہ حصہ ایک عرصے سے یونہی پڑا تھا۔ وہاں کمرے تعمیر کرانے کا ارادہ تھا، جو ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے ٹل جاتا تھا۔ میں گیٹ تک پہنچ کر رک گیا۔ گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے محتاط رہنا تھا۔ سفید گیٹ کے پیشِ منظر میں میری نقل و حرکت دور سے بھی دیکھی جا سکتی تھی جبکہ برگد سے گیٹ ویسے بھی کچھ دور نہیں تھا۔ میں زمین پر لیٹ گیا... اور گیٹ والا حصہ میں نے سینے کے بل رینگتے ہوئے عبور کیا۔ اس کے بعد مجھے جھاڑیوں کی آڑ میسر آگئی۔ برگد اب بہت نزدیک تھا۔ میں اور محتاط ہو گیا۔ میں بے آواز قدموں سے برگد کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اپنی پیش قدمی اس وقت روکی، جب مجھے برگد کے نیچے دو سائے نظر آئے۔ اب آگے بڑھنے کا مطلب یہ خطرہ مول لینا تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھ لیتے۔ چنانچہ میں وہیں رک گیا۔

وہ دونوں سرگوشی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس پر مزید ستم تیز ہوا کا شور... ہوا پتوں میں چھپ کر کچھ زیادہ ہی پُرشور ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمہ تن سماعت ہونے کے باوجود میں ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہ سن سکا۔

پھر ان کے انداز سے ایسا لگا، جیسے ان کی ملاقات ختم ہونے والی ہے۔ میں جھاڑیوں میں سمٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں جھاڑیوں میں دبکا رہا۔ وہ دونوں میرے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ اُن میں سے ایک یقینی طور پہ اکھاڑے کا آدمی تھا... لیکن تاریکی کی وجہ سے میں اُسے پہچان نہ سکا۔

گیٹ پر پہنچ کر انھوں نے گیٹ کو کچھ اور کھولا۔ پھر ان میں سے ایک باہر چلا گیا جبکہ دوسرے نے گیٹ کو بند کیا اور رہائشی کمروں کی طرف چل دیا۔ اس بار بھی میں محتاط انداز میں حرکت میں آیا تھا۔ میری نظر اس سائے پر جمی ہوئی تھی۔ پھر میں نے اُسے ایک کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس تاریکی میں میں صرف اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔ میرے خیال میں وہ دلاور پہلوان کا کمرہ تھا۔

میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ دلاور اچھا آدمی تھا۔ وہ شیخوپورہ کا رہنے والا ایک کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اس کی اچھی خاصی زمینیں تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دلاور جیسا آدمی ان سرگرمیوں میں کیسے ملوث ہو سکتا ہے۔ اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اُس کمرے میں سے اچانک چیخ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں تیزی سے لپکا۔ اندر سے دبی دبی غراہٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر ایک کراہ سنائی دی... کسی کے گرنے کی آواز آئی اور میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

”کون ہے؟“ کمرے کے نزدیک پہنچ کر میں اضطراری طور پہ چیخا۔ پھر میں اندھا دھند کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ اسی وقت کوئی مجھے دھکا دیتا ہوا باہر نکل گیا۔ اصولاً مجھے اس کا پیچھا کرنا چاہیے تھا لیکن اس وقت میرے حواسوں پہ وہ کراہ... اور کسی جسم کے گرنے کی آواز چھائی ہوئی تھی۔ میں نے تیزی سے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور روشنی کر دی۔

دلاور زمین پر چت پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے اور خفت کے تاثرات تھے۔ میں نے اسے سہارا دے کر اُٹھایا۔

”کیا قصہ ہے؟ کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔ کسی نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔“ دلاور نے جواب دیا۔

"کون تھا؟"

"اس اندھیرے میں کیا پتہ چلتا؟" دلاور نے بھنّا کر کہا۔

"اور تم کیا کر رہے تھے؟"

وہ بُری طرح گڑبڑا گیا۔ چند لمحے تو وہ جواب ہی نہ دے سکا۔ پھر اس نے کہا "اتنی رات کو میں کیا کر سکتا ہوں؟ ظاہر ہے، سو رہا تھا۔"

"اس نے سوتے میں تم پر حملہ کیا تھا؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہو جمال؟" اُس نے بڑی معصومیت سے کہا "تمھارا کیا خیال ہے۔ وہ پہلے مجھے جگاتا... پھر مجھے اطلاع دیتا کہ دلاور، تیار ہو جاؤ میں تم پر حملہ کر رہا ہوں؟"

پہلے تو میں جھینپا... پھر مجھے غصہ آگیا۔ عین ممکن تھا کہ اس غصّے میں، میں اس سے پوچھ بیٹھتا کہ اتنی رات کو وہ بنگلے کے پیچھے کیا کر رہا تھا اور اس کا وہ ملنے والا کون تھا۔ لیکن اسی وقت دوسرے پہلوان جمع ہو گئے۔

"کیا ہوا بھئی... کیا ہنگامہ ہے؟" رشید پہلوان نے پوچھا۔

"تم سوتے میں ڈرنے بھی لگے ہو؟" وہ نذیر تھا۔

"اور جمال یار... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" واحد میری طرف متوجہ ہوا "لوری سنا رہے ہو دلاور کو؟"

"میں لوری کیا سناؤں گا۔ میں تو ہنگامے کی آواز سن کر یہاں پہنچا ہوں۔ اس وقت تک کوئی دلاور کو ٹھمری سنا کر رخصت ہو چکا تھا۔"

"ہائیں ٹھمری بھی سنائی تھی؟" فاروق چہکا۔

اُن لوگوں کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ انھیں حالات کی سنگینی کا احساس نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ زندہ دل لوگ تھے۔ پریشان ہونا جانتے ہی نہیں تھے۔ پھر سب سے آخر میں استاد آگئے۔

"کیا شور مچا رکھا ہے تم لوگوں نے؟" انھوں نے ڈانٹا "کم از کم رات کو تو سکون سے سو لیا کرو۔" پھر انھوں نے دلاور کا چہرہ دیکھا تو انھیں صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا "کیا بات ہے۔ خیر تو ہے؟"

مجھے... اور دوسرے پہلوانوں کو سناتے سناتے اب تک دلاور کو وہ کہانی بہت اچھی طرح یاد ہو چکی تھی۔ وہ بڑی روانی سے شروع ہو گیا "استاد میں سو رہا تھا کہ اچانک..."

"خواب تو نہیں دیکھا تم نے؟" استاد نے

اس پر دلاور نے زبردست احتجاج کیا۔

"نہیں استاد، دلاور ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں نے تائید کی "وہ مجھ سے ٹکرایا تھا، بھاگتے ہوئے... اگر دلاور کی فکر نہ ہوتی تو بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔"

"اچھا... تب تو معاملہ سنگین معلوم ہوتا" استاد نے دھیرے سے کہا۔

اس وقت، وہاں اکھاڑے میں رہنے وال لوگ موجود تھے۔ میں نے بغور اُن میں سے ایک کا جائزہ لیا۔ شاید کسی کے چہرے یا لباس سے اندا ہو جائے کہ وہ دلاور سے گتھم گتھا ہوا تھا۔ لیکن یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہاں موجود ہر شخص کم از کم اس معاملے میں صاف تھے۔ میں الجھن گیا۔ کیا دلاور پر کسی باہر کے آدمی نے حملہ کیا تھا؟ لیکن دلاور نے خود ایک اجنبی کو اندر بلایا تھا، اس سے باتیں کرتا رہا تھا... وہ کیا چکر تھا؟ د معصوم ہے... یا اکھاڑے سے دشمنی پر کمربستہ میں تو اس سلسلے میں بھی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔

"یہ کیا سلسلہ ہے استاد؟" نذیر نے کہا۔

"ہاں استاد... پچھلے دنوں سے کچھ عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔"

"میری بات غور سے سنو۔" استاد نے میں کہا "ہم لوگ ایک خاندان ہیں۔ یہ بتانے کی نہیں کہ اتفاق ہی میں ہماری طاقت ہے۔ میں نتیجے پر پہنچا ہوں کہ باہر کے کچھ لوگ اکھاڑے ہونا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں ابھی تک وہ کے کسی آدمی کو اپنے ساتھ نہیں ملا سکے ہیں۔ کا وقت ہے ہم سب کے لیے... اس وقت ہمیشہ سے زیادہ، اتفاق کی ضرورت ہے۔ یاد بکھر وگے تو ٹوٹ جاؤ گے۔ وقتی لالچ کے لیے برباد نہیں کیے جا سکتے۔"

اس دوران میں بڑی توجہ سے حاضر چہرے دیکھتا رہا تھا۔ ان میں سے بیشتر کے

پر حیرت کے تاثرات تھے۔ چند ایک مسکرا رہے تھے، جیسے وہ ان کے نزدیک محض مذاق ہو۔ وہ صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

"اچھا، چلو... اب اپنے اپنے کمروں کا رُخ کرو۔" استاد نے کہا۔

سب لوگوں کے جانے کے بعد استاد نے دلاور سے محتاط رہنے کو کہا اور کمرے سے نکل آئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ تھا "آؤ... ذرا باہر کا جائزہ لے لیں۔" انھوں نے بآوازِ بلند کہا۔

میں اُن کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ مجھ سے کوئی اہم بات کرنا چاہتے تھے۔ کمرے اس کام کے لیے مناسب نہیں تھے۔ ہم دونوں گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

"کیا خیال ہے۔ دلاور پر کس نے حملہ کیا تھا؟" اچانک اُستاد نے پوچھا۔

"میں نے کہا نا استاد کہ مجھے دلاور کی فکر تھی۔ ورنہ میں اُسے جانے نہ دیتا۔"

"اتنے یقین سے مت کہو؟"

"کیا مطلب استاد؟" میں نے چونک کر کہا۔ "مجھے تربیت کسی نامعلوم آدمی نے نہیں دی۔"

"وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ میں نے ہی تمھیں تربیت دی ہے نا؟"

"میں تمھارا مطلب اب بھی نہیں سمجھا استاد۔"

"برخوردار... وہ میں تھا۔ ویسے ممکن تھا کہ تم مجھے پکڑ ہی لیتے۔" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" میں نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد کہا "اگر تم تھے تو میں تمھیں ہاتھ بھی نہ لگا پاتا۔ لیکن استاد... میں نہیں سمجھا۔ تم نے ایسا سلوک کیوں کیا؟"

"نہیں سمجھے؟" استاد کے لہجے میں حیرت تھی۔ "برخوردار... میں ذرا ہلچل پیدا کرنا چاہ رہا تھا۔ اس طرح یہ پتہ چلانے میں آسانی رہے گی کہ تمہارے مخالفین کون ہیں اور ان کی تعداد کیا ہے۔ اب میں نے اُنھیں اتفاق کی برکت یاد دلائی ہے۔ ممکن ہے، مخالفین میں سے بھی کوئی سنور جائے۔ بہرحال، اسی طرح اکھاڑے کے مخلص پہلوان تو سامنے آ ہی جائیں گے۔"

میں وہ سب کچھ پی گیا، جو میں نے دیکھا تھا۔ میں بے خبر تھا کہ استاد اس سلسلے میں کس حد تک علم رکھتے ہیں "لیکن استاد، تم وہاں پہنچے کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"گڑبڑ کا احساس تو مجھے، ہو ہی چکا تھا۔" استاد نے جواب دیا "آج رات میں سب کے کمرے چیک کر رہا تھا۔ دلاور کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔ وہ شاید کسی ضرورت سے باہر نکلا ہوگا۔ میں اندر گھس گیا اور دروازے سے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سوچا تھوڑا سا ہنگامہ ہی سہی۔ دلاور واپس آیا تو میں نے آتے ہی اُسے ایک پٹخنی دی۔ پھر تم آگئے۔ لیکن تم اتنی جلدی کیسے آگئے تھے؟"

"میں تو ہنگامے کی آواز سُن کر نکلا تھا۔"

"ناممکن... اتنی جلدی تم نہیں آسکتے تھے، میرا خیال ہے، اس وقت تم دلاور کے کمرے کے قریب ہی رہے ہو گے۔"

میرے جی میں آئی کہ استاد کو سب کچھ بتا دوں۔ لیکن پھر میں نے اپنی اس خواہش کو دبا لیا۔ یہ بات طے تھی کہ استاد کو صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ البتہ وہ گڑبڑ محسوس کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت عمل کر رہے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی منصوبہ بندی سے مجھے لاعلم رکھا تھا۔ ایسے معاملات میں وہ ہمیشہ رازداری سے کام لیتے تھے۔ میرے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔ وہ درپردہ رہ کر میری مدد کرتے رہے تھے۔ شاید اسی وجہ سے اُن کی مدد میرے لیے، مؤثر اور حوصلہ افزا ثابت ہوئی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں بھی وہی طور طریقہ آزماؤں گا... ہم دونوں نے احاطے کا ایک چکر لگایا اور واپس چلے آئے۔ استاد اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دروازہ بند کر کے میں تخت پر دراز ہو گیا۔ ذہن میں سوالات کا ہجوم تھا۔ دیر تک میں الجھتا رہا۔ پھر مجھے نیند آگئی۔

صبح اُٹھ کر میں نے ناشتہ کیا۔ پھر مجھے اقبال کا خیال آگیا۔ حامد کی طرف سے اُس کے سلسلے میں ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ مجھے درپیش

مسائل میں اقبال کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ میں اُدھر سے بے فکر ہونے کے بعد ہی یکسوئی سے دوسرے مسائل کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔

میں نے گاڑی نکالی اور حامد کے دفتر کی طرف چل دیا۔ لیکن حامد سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ اُس وقت کسی میٹنگ میں شریک تھا۔ میں نے کافی دیر اُسی کا انتظار کیا۔ میٹنگ شاید بہت اہم تھی۔ بالآخر میں اس کے دفتر سے نکل آیا۔ اردلی کو میں نے بتا دیا تھا کہ حامد کو میری آمد کا بتا دے اور اُس سے کہے کہ وہ پہلی فرصت میں مجھ سے بات کر لے۔

پھر میں نے ٹیلی فون ایکسچینج جا کر وہاں سے ثاقب جمیل کو کراچی فون کیا۔ اس سے ریشماں اور گلنار وغیرہ کی خیریت دریافت کی۔ وہ لوگ وہاں بہت مزے میں تھے... البتہ دونوں مجھے بہت یاد کرتی تھیں۔ میں نے جمیل سے پوچھا کہ اُن کی رہائش گاہ پر ٹیلی فون ہے؟

"ابھی تو نہیں ہے۔" ثاقب جمیل نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "دراصل بنگلہ خالی پڑا تھا۔ اس لیے ٹیلی فون کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ درخواست دے دی ہے۔ انشاء اللہ دو چار روز میں کنکشن مل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے گلنار کی امی کو میرا سلام کہنا۔ ریشماں اور گلنار سے کہنا کہ میں جلد از جلد کراچی آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

وہاں سے میں اکھاڑے واپس آیا۔ ارادہ تھا کہ اکھاڑے میں حامد کی آمد یا اس کے فون کا انتظار کروں گا۔ لیکن اچانک مجھے وہ بدمعاش مشکوک انداز میں اکھاڑے کے گرد منڈلاتا نظر آ گیا، جس نے گزشتہ شب حفیظ پہلوان پر چاقو نکالا تھا... جس کی وجہ سے حفیظ کے اور میرے درمیان تلخی پیدا ہوئی تھی۔

میں نے گاڑی اس کے قریب روک دی۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر اُس کی نگاہوں میں شناسائی کی چمک اُبھر آئی۔

"آ جاؤ۔" میں نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ بغیر کچھ کہے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے گاڑی واپس موڑ لی۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ امکان تھا کہ میں اس لفنگے سے اہم معلومات حاصل کر سکتا ہوں۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں، جناب۔" اس نے خود ہی بات شروع کی۔ "کل آپ نے مجھے بچا لیا، ورنہ میرا تو کام تمام ہو گیا تھا۔"

"شکریے کی کیا بات ہے۔ وہ تو میرا فرض تھا۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی میں بڑے عرصے سے حفیظ کا دماغ درست کرنے کے چکر میں ہوں۔"

"کچھ بھی ہو جناب... میں آپ کا اور جیرے کا [illegible] ہوں۔" اس نے دھماکا کیا۔ میں نے بدقت تمام [illegible] پر قابو پایا۔ اُس کے منہ سے جیرے کا نام سنتے [illegible] میں چونک پڑا تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ [illegible] خاصا اہم ثابت ہو سکتا ہے۔

"جیرا وعدے کا پکا ہے۔" اس نے مزید کہا۔ "اس نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ وہ میرے تحفظ کا خیال رکھے گا۔ آپ یقیناً جیرے کے ساتھی ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ بات طے تھی کہ جیرے کا اس شخص کے ساتھ گٹھ جوڑ تھا۔ لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ شخص میرا نام نہیں جانتا۔ [illegible] اس طرح اظہارِ دوستی نہ کرتا۔ "کل جھگڑا کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ارے جناب... آپ تو جانتے ہی ہیں کہ حفیظ پہلوان نسیم جمال کے گروپ کا آدمی ہے۔" اُس نے کہا۔ "جیرے نے مجھ سے کہا تھا کہ میں [illegible] طرح حفیظ سے اُلجھ بیٹھوں اور پھر حفیظ پر چاقو کی دھار آزما لوں۔ میں نے پہلے حفیظ کی قربت [illegible] میں موجودگی کا یقین کیا... پھر میں ماسٹر صدیق کی دُکان میں گھس گیا اور اسے دھمکیاں دیں اور [illegible] طلب کیا۔ خاصا شور و غل مچایا تھا میں نے۔ [illegible] کے عین مطابق وہ خدمتِ خلق کی خاطر نکل آیا۔ پہلے ہی حملے میں اُس نے میرا چاقو گرا دیا۔ اگر آپ نہ ہوتے تو وہ یقیناً مجھے ٹھکانے لگا دیتا۔"

"اس وقت تم اکھاڑے کے گرد کیوں [illegible] تھے؟" میں نے پوچھا۔

"میں اسی کی تاک میں ہوں۔ کل کے واقعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چھپ کر وار کرنا مناسب رہے گا۔"

میں چند لمحے خاموش رہا۔ حفیظ کی پوزیشن صاف ہو چکی تھی۔ اب تشویش ناک بات یہ تھی کہ جیرے نے [illegible] راستے سے ہٹانے کی سازش کی تھی اور حفیظ پر بزدلانہ وار ہونے والا تھا۔

"تم فی الحال اس معاملے کو بھول جاؤ۔" میں نے اس سے کہا۔ "کل کے واقعے کے بعد حفیظ پر حملہ ہوا تو مشکوک تم ہی ٹھہرو گے۔"

"بات تو آپ کی معقول ہے لیکن جیرا..."

"جیرے سے بھی بات کر لوں گا۔ کوئی اور صورت [illegible] لیں گے۔" میں نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ "اب تم اُتر جاؤ۔ ہمارا ایک ساتھ نظر آنا ٹھیک نہیں ہے۔" [illegible] نے کہا۔

وہ گاڑی سے اُتر گیا اور میں نے گاڑی آگے بڑھا [illegible]۔ صورتِ حال دن بہ دن ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اُلجھنیں [illegible] کر بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

میں اکھاڑے پہنچا۔ اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ اُستاد نے آواز دے لی۔ وہ اپنے کمرے [illegible] بیٹھے ہوئے تھے۔ "کہاں تھے تم؟ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔"

"میرا انتظار... واہ استاد، یہ تو میرے لیے اعزاز ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "خیر تو ہے؟"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے اُستاد کو جیرے کی سازش اور لفنگے کے بارے میں بتانا مناسب نہ سمجھا۔ "میں حامد کی طرف گیا تھا اُستاد۔"

"کچھ پتہ چلا؟"

"حامد سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ وہ کسی میٹنگ میں گیا ہوا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "اب آپ بتائیں، کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے برخوردار کہ ساجن کے اکھاڑے [illegible] کی طرف سے چیلنج آیا ہے۔"

میں حیران رہ گیا۔ پچھلی بار ہمارے اکھاڑے نے ان لوگوں کو ایسی عبرت ناک شکست دی تھی کہ ہمارا خیال تھا، دو تین سال کی چھٹی ہو گئی۔ پچھلے مقابلے میں ہم نے انھیں ایک کشتی بھی جیتنے نہیں دی تھی اور کوئی مقابلہ پانچ منٹ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا تھا۔

"حیران ہو؟" استاد نے پوچھا۔

"بات ہی حیرانی کی ہے۔"

"نہیں... ایسی کوئی بات نہیں۔" استاد بولے۔ "تم لاعلم ہو۔ ساجن نے کچھ نئے پٹھے پالے ہیں۔ سُنا ہے، بہت اچھے ہیں۔ یہ بھی سُنا ہے کہ انھیں پٹھے کہنا غلط ہے، یوں سمجھو کہ ساجن کو پلے پلائے پہلوان مل گئے ہیں۔"

"لیکن استاد... اس وقت ہم اندرونی انتشار سے دوچار ہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے... لیکن چیلنج کو ٹالا نہیں جا سکتا۔" استاد کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔

"خیر دیکھا جائے گا۔" استاد نے کہا۔ "بس یہ ہے کہ مجھے جوڑی لگانے کے معاملے میں محتاط رہنا ہو گا اور ہاں... میں تم پر انحصار کروں گا اس مقابلے کے سلسلے میں۔"

"یہ بھی کہنے کی بات ہے کوئی۔ میں حاضر ہوں۔"

کچھ دیر ہم مقابلے کے سلسلے میں لائحۂ عمل طے کرتے رہے۔ پھر اچانک حامد آ گیا۔ میں نے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہا ہے۔ میں نے اُس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن میرے ہونٹ لرز گئے۔ مجھے یقین تھا کہ میرے بے نام اندیشے حقیقت کا روپ دھار گئے ہیں۔

"خیریت تو ہے حامد؟" استاد نے پوچھا۔

"نہیں استاد، میں اچھی خبر نہیں لایا ہوں۔ میں نے کل ہی فیصل آباد فون کیا تھا۔ آج جوابی فون آیا ہے۔ جمال کا بھائی ابھی تک گھر نہیں پہنچا..."

جب آدمی کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں تو ذہنی جھٹکا اتنا شدید نہیں رہتا۔ میرے

ساتھ ہی یہی کچھ ہُوا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ اقبال گھر نہیں پہنچ سکے گا۔ میرے دشمن اُسے راستے ہی سے اُچک لیں گے۔ اب حامد مجھے وہی خبر سُنا رہا تھا۔ غیر متوقع نہ ہونے کی وجہ سے مجھ پر اس کا ردِ عمل بھی خلافِ توقع ہُوا۔ میرا ذہن ماؤف نہیں ہُوا بلکہ برہمی کی ایک تُند لہر نے میری رگوں میں شرارے بھر دیے۔ میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اگر خدانخواستہ اقبال کو کچھ ہوگیا تو میں اپنے دشمنوں کے لیے انسان ثابت نہیں ہوں گا۔ وہ میری درندگی دیکھیں گے اور اپنی اس قبیح حرکت پر ٹھیک طرح سے پچھتا بھی نہیں سکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت میری آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوں گے۔

"کوئی جذباتی فیصلہ نہ کر بیٹھنا برخوردار۔" استاد نے میری حالت بھانپ لی۔ "ہمیں صورتِ حال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا۔"

"میں نے کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کیا ہے اُستاد۔" میں نے اپنے اندر کے طوفان پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اکلوتے بھائی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہو تو جذباتیت یوں بھی دھری رہ جاتی ہے۔"

حامد میری بات سُن کر قدرے مطمئن ہوگیا۔۔ جبکہ استاد مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے۔

"پھر اس سلسلے میں کیا سوچا ہے تم نے؟" انھوں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ اس میں سوچنے کی بات ہی کیا ہے؟" میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"اُستاد سے اُڑنے کی کوشش کر رہے ہو؟" اُستاد نے کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی بڑی بات ہو جائے اور تم کچھ سوچو بھی نہیں۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں اُستاد۔" میں نے انھیں یقین دلایا۔ "درحقیقت اس میں میرے سوچنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اگر اقبال دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے تو وہ اسے اپنی پلاننگ کے مطابق استعمال کریں گے۔ ان کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوگا۔۔۔ اور وہ مجھ سے رابطہ قائم کریں گے۔ میں سوائے انتظار کے کیا کر سکتا ہوں۔ میری حالت تو ایسی ہے کہ میں یقین سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔"

"جمال ٹھیک کہہ رہا ہے اُستاد۔" حامد نے کہا۔ "جب تک صورتِ حال کا علم نہ ہو، کیا کیا جا سکتا ہے۔ ویسے ایک بات طے ہے کہ وہ اقبال کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔" اُستاد نے فکرمندی سے مجھے دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ "لیکن مجھے یقین آتا۔ یہ جمال اس طرح کا آدمی نہیں ہے کہ اتنی سے بات پی لے۔"

"اُستاد، یقین کریں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"چلو، یقین کیے لیتا ہوں۔" اُستاد نے کہا۔

اس کے بعد ساجن کے اکھاڑے سے د جانے والے چیلنج کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ میں جب کیے نہ صرف بیٹھا رہا۔۔۔ بلکہ گفتگو میں حصہ بھی رہا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا، اس کے لیے اُستاد کو یہ یقین دلانا ضروری تھا کہ میرا فی الحال کوئی عملی قدم اٹھا کا ارادہ نہیں ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس معاملے کو اپنے طور پر نمٹاؤں گا۔ اُستاد کو اس اُلجھانا ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن ابھی تک میں کوئی عمل طے نہیں کر سکا تھا۔

کچھ دیر بعد حامد اٹھ کھڑا ہوا۔ اُستاد بھی اس کے ساتھ ہی اُٹھ گئے۔ "برخوردار۔۔۔ میں کچھ دیر آتا ہوں۔" انھوں نے مجھ سے کہا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد میں نے سک کا سانس لیا۔ باہر نکلنے سے پہلے مجھے کچھ دیر انت کرنا تھا۔ اتنی دیر میں سوچ بچار کرتا رہا۔ لیکن اپنے سامنے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اصولاً خود گھر جانا چاہیے تھا۔۔۔ لیکن اس میں قباحت کہ اتنی بے مجھے کسی قیمت پر واپس نہ آنے دیتیں لیے میں چاہتا تھا کہ سارے قرض اتار کر گھر واپس جاؤں۔۔۔ میں دیر تک سوچتا رہا۔۔۔ لیکن اقبال سلسلے میں اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چنا میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے گھر جانا ہی ہوگا۔ یہ سو میں تن بہ تقدیر ہوگیا۔

اُستاد کے جانے کے بیس منٹ بعد میں اکھ سے نکلا۔۔۔ اور کار میں بیٹھ گیا۔ پہلے کچھ دیر مختلف سڑکوں پر بے مقصد گھماتا رہا۔ جب مجھے ہو گیا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا ہے، تو میں کار کو لاری اڈے کی طرف جانے والی

ڈال دیا۔ میں جلد از جلد مانانوالہ پہنچنا چاہتا تھا۔ میرا ن بالکل خالی تھا۔ مجھے کچھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسی خالی الذہنی کی کیفیت میں میں نے گاڑی ری اڈے کے سامنے والے چائے خانے کے قریب ک دی۔ مجھے اس بات کا احساس بھی چند لمحے بعد وا۔ کار روکنے کے بعد میں ساکت بیٹھا کچھ دیر سوچتا ا۔ میں لاشعور کی قوتوں کا قائل ہوں۔ خود بخود طاری جانے والی کیفیات کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ یرے خیال میں ان کی اہمیت مخفی سہی لیکن ہوتی ر ہے۔ پیاس اس وقت لگتی ہے، جب جسم میں نی کی کمی ہونے لگے۔ خلش اس وقت ہوتی ہے جب وئی اہم بات وقوع پذیر ہونے والی ہو۔۔ جب کوئی راغ موجود ہو۔۔۔ لیکن ذہن اسے قبول نہ کر پا رہا ہو۔

یں کار سے اتر آیا۔ یہ بات میں نہیں مان سکتا تھا کہ یں نے بلاوجہ گاڑی روک دی تھی۔

چند لمحے میں سوچتا رہا، پھر ہچکچاتے ہوئے چائے نے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ویسا ہی، عام سا چائے خانہ تھا، جو عموماً طویل سفر کرنے والی بسوں کے راستے میں بسوں کے اڈوں پر پائے جاتے ہیں۔ وہاں بے شمار نہیں پڑی تھیں۔ میرا تجربہ تھا کہ ایسے چائے خانوں یں چائے اور کھانا بہت عمدہ ہوتا ہے۔ اس وقت جھے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں سائبان کی رف بڑھ گیا۔ وہاں بہت سے ڈرائیور اور کنڈکٹر بیٹھے وش گپیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی صورت جھے جانی پہچانی سی لگی۔ میں اُسی بنچ کی طرف بڑھ گیا۔ ائے کا آرڈر دینے کے بعد میں سوچوں میں گم ہو گیا۔ یب مسئلہ تھا۔۔۔ میں غور و فکر کیے جا رہا تھا لیکن مجھے وئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"بس یار۔۔۔ مجھے وہ شخص کچھ مشکوک سا لگا تھا۔"

ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے کن انکھیوں سے یکھا۔ وہ ایک کنڈکٹر تھا۔ اس دوران چائے والا میرے سامنے چائے کی پیالی رکھ گیا تھا۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ لیکن میرے کان ان لوگوں کی گفتگو پر لگے تھے۔

"مشکوک لگا تھا۔" اُس کنڈکٹر نے مُنہ بگاڑ کر نقل اتاری، جس کی صورت مجھے جانی پہچانی لگی تھی۔ "ابے ۔۔۔ کوئی بات بھی ہوئی؟"

"بات تو کچھ نا یار۔" پہلے کنڈکٹر نے جواب دیا۔ "مجھے خیال آ رہا تھا کہ وہ ایک بار پہلے بھی میری گاڑی میں سفر کر چکا ہے۔"

"کوئی وجہ تو ہوگی اس کی بھی؟"

"ہاں۔۔۔ اس کا لباس دیہاتیوں کا سا تھا۔۔۔ لیکن شوٹ کیس بڑا زوردار تھا۔"

"یہ بات تو ہے۔" جانی پہچانی صورت والے کنڈکٹر نے کہا۔ "پھر کیا ہُوا؟"

"میں نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔۔ 'تم فیصل آباد اترو گے نا؟'۔۔۔ بس یہ سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ بولا۔۔ 'میں تو شیخوپورہ جا رہا ہوں۔ بس،' پھر وہ شیخوپورہ پر اتر گیا۔"

"خواہ مخواہ راستہ کھوٹا کیا تو نے غریب کا۔" ایک ڈرائیور نے تبصرہ کیا۔

"کیا پتہ ٹھیک ہی کیا ہو۔"

میں اُن کی باتیں بڑی دلچسپی سے سُن رہا تھا۔ میں نے چائے ختم کی۔۔۔ اور نظریں اُٹھا کر جانی پہچانی صورت والے کنڈکٹر کو بغور دیکھا۔ چند لمحے میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر اچانک مجھے یاد آگیا کہ میں نے اُسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ وہ وہی کنڈکٹر تھا، جس کی بس میں میں نے اقبال کو بٹھایا تھا۔ یہ یاد آتے ہی ان کی گفتگو میں میری دلچسپی دوچند ہوگئی۔ وہ اب آنچلوں کے۔۔۔ رنگوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ اقبال کی بس والا کنڈکٹر ان میں پیش پیش تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ ان کی گفتگو میں شریک ہُوا جائے۔ ممکن ہے، اقبال کے متعلق کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میری دلچسپی انھیں میری طرف سے مشکوک بھی کر سکتی تھی۔ میں اپنے لباس اور انداز کے اعتبار سے اُن سے بہت مختلف تھا۔ میں چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر میں نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا۔ "واقعی دوست۔" میں نے اپنے مطلوبہ کنڈکٹر کو مخاطب کیا۔ "تم لوگوں کا مشاہدہ اور یادداشت قابلِ رشک ہے۔ اس کے علاوہ تمھاری نظر میں گہرائی ہے۔ تم آدمی کے اندر تک جھانک سکتے ہو۔"

میری بات سُن کر وہ سب چونک اُٹھے۔ وہ کنڈکٹر

توبالخصوص بدکا ہوا نظر آرہا تھا۔ پھر وہ واضح طور پر ہچکچایا۔ لیکن میں سمجھ گیا کہ اس کی ہچکچاہٹ میرے اندازے سے بالکل مختلف ہے۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں میں ان لوگوں کا مضحکہ تو نہیں اُڑا رہا ہوں۔

"میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔" میں نے بات آگے بڑھائی۔ "میں یونیورسٹی میں نفسیات پڑھتا ہوں۔ تم لوگوں کی باتیں سُن کر اندازہ ہوا کہ ہم کتابوں سے جتنا سیکھتے ہیں، تم لوگ عملی زندگی سے اس سے کہیں زیادہ سیکھ لیتے ہو۔"

میرے لہجے کی ستائش نے اپنا کام دکھایا۔ وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔ "جی ہاں... یہ بات تو ہے۔" اس نے مفکرانہ لہجے میں کہا۔

"تمھیں تو برسوں پرانے پسنجر بھی یاد رہ جاتے ہوں گے۔" میں نے مزید مکھن لگایا۔

"ہر پسنجر تو یاد نہیں رہتا۔" اس نے مفکرانہ انداز میں کہا۔ "لیکن بعض رنگ... بعض رُوپ... بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں، جو دل پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یوں ہر پسنجر یاد رہنے لگے تو دماغ کا کباڑہ ہو جائے۔"

"اور وہ رنگ آنچل کے ہوتے ہوں گے۔" میں نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ "وہ چہرے... وہ رُوپ، رنگین آنچلوں میں چھپے ہوتے ہوں گے، جو تمھاری نظروں میں کھب جاتے ہوں گے۔"

وہ شرمندہ سا نظر آنے لگا۔ "کچھ کچھ یہ بات بھی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "دراصل رنگ آدمی کو نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ شوخ رنگوں کے کپڑے عام طور پر خواتین ہی پہنتی ہیں۔ مَردوں کا معاملہ اور ہے۔ اگر کبھی وہ شوخ رنگ کا کوئی کپڑا استعمال کریں تو بھولنے کا سوال ہی نہیں لیکن ایسا کم ہوتا ہے۔ البتہ کسی کی مونچھیں غیر معمولی ہوں... کوئی گنجا ہو... یا معذور ہو تو ظاہر ہے کہ یاد رہ جاتا ہے۔"

میں نے ذہن پر زور دیا۔ میرے دل میں اُمید کی کرن جاگ اٹھی۔ "کل تمھاری بس میں ایک لڑکے نے سفر کیا تھا۔" میں نے اس سے کہا۔ "وہ سُرخ چارخانے والا مفلر لپیٹے ہوئے تھا... اور..."

"مجھے یاد ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ لہجہ فاتحانہ تھا۔ "مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے۔"

"واہ... واقعی تمھاری یادداشت قابلِ ر
ہے۔" میں نے اسے مزید مکھن رسید کیا۔

"یہ تو کوئی خاص بات نہیں کیونکہ کل ہی کی با
ہے۔" وہ کچھ اور پھیل گیا۔ "اس کے ساتھی اُٹھ
تھے... لیکن اس کا اُٹھنے کا کوئی ارادہ معلوم نہیں
تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے مانانوالہ کا ٹکٹ لیا

میرے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں
نے کوشش کی کہ میرا اندرونی ہیجان چہرے سے نہ
پائے۔ "تو پھر وہ کہاں اُترا تھا؟" میں نے خود پر ق
پاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" کنڈیکٹر نے جواب دیا
بتا سکتا ہوں کہ وہ مانانوالہ سے پہلے کہیں اُتر گیا

"تنہا اُترا تھا یا کسی کے ساتھ؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔"

میں نے چند لمحے غور کیا۔ تفتیش کی گاڑی
ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس گاڑی کو دھکیل
لیے کنڈیکٹر کی انا پر ضرب لگانا ضروری تھا۔ "پھر کیا
ہے تمھاری یادداشت کا۔" میں نے طنزیہ لہجہ اخ
کیا۔ "کل کی بات ہے... اور تمھیں یہ بھی یاد
کہ وہ لڑکا کہاں اُترا تھا۔"

کنڈیکٹر کے چہرے پر خفت اور جھنجلاہٹ کا
تاثر نظر آیا۔ اس بار وہ بولا تو اس کے لہجے میں
جھنجلاہٹ تھی۔ "اس کا یادداشت سے کوئی تعلق
جب ایک چیز میں نے دیکھی ہی نہیں تو مجھے یاد کیسے
بات اب بھی نہیں بنی تھی۔ چنانچہ میں نے
اور ضرب لگائی۔ "نہیں دوست... یہ تو تم بہانے
رہے ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم نے اسے دیکھا ہی
میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں
کے آثار دیکھ کر اضافہ کیا۔ "اچھا... میں تمھاری
مان لیتا ہوں کہ لڑکا نظر بچا کر اتر گیا ہو۔ پھ
تمھیں یہ تو یاد ہوگا کہ تم نے اسے کہاں تک د
... میرا مطلب ہے کہ کسی ایک مقام تک تو وہ
نظروں میں رہا ہوگا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اثبا
میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی ہاں... مجھے
طرح یاد ہے۔ شیخوپورے تک تو وہ بس میں موجو

اس کے بعد مجھے یاد نہیں آتا۔"

"شیخوپورے کے بعد بس کہاں رُکتی ہے؟"

"اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ مجھے یاد ہی نہیں ہے کہ شیخوپورہ کے بعد میں نے اسے دیکھا تھا۔"

"اس دوران..."

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "اوہ... یاد آیا۔ شیخوپورہ سے چھ میل آگے بس کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ ہم وہاں ٹائر تبدیل کرنے کی غرض سے رُکے تھے۔ وہاں بھی وہ موجود تھا۔"

"گویا وہ وہاں اُترا ہوگا؟"

"یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بہرحال لگتا ایسا ہی ہے۔ بہت سارے پسنجر اُترے تھے وہاں... کچھ رفع حاجت کے لیے... اور کچھ پانی وغیرہ پینے کے لیے۔"

"میرا تو خیال ہے، شیخوپورہ سے چھ میل آگے اجاڑ علاقہ ہے۔" میں نے اُسے مزید کچھ اگلنے پر اکسایا۔

"جی نہیں... اتفاق سے جہاں بس خراب ہوئی تھی، وہیں کسی چھوٹے موٹے زمیندار کا کچا مکان بھی ہے۔ یہ بات مجھے اس لیے یاد رہ گئی کہ گاڑی کا ٹائر ٹھیک چھ میل پر پنکچر ہوا تھا۔ کچے مکان کے آگے وہاں کھیتوں کا سلسلہ بھی تھا۔ کچھ لوگ رفع حاجت کے لیے اس طرف بھی نکل گئے تھے۔"

میں اس سے اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن گفتگو کو اچانک ختم کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اب تک اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ میں اس کی یادداشت کو چیلنج کر کے اس سے کسی خاص مقصد کے تحت معلومات حاصل کر رہا ہوں... لیکن کسی بھی لمحے اسے یہ احساس ہو سکتا تھا۔ "میں مان گیا بھائی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تمھاری یادداشت واقعی بہت اچھی ہے۔"

"لیکن تم نے خاص طور پر اس لڑکے کے بارے میں کیوں پوچھا؟" اس نے شک آمیز لہجے میں پوچھا۔

"اس کی وجہ بھی تقریباً وہی ہے، جو تم نے بیان کی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں نے بتایا نا کہ میں نفسیات کا طالب علم ہوں۔ نفسیات بھی یہی بتاتی ہے کہ آپ کو وہ لوگ یاد رہ جاتے ہیں، جو اپنے حلیے اور لباس کے اعتبار سے عام روش سے ہٹ کر ہوں۔ مثلاً کوئی مَرد ساڑھی باندھے ہوئے ہو تو تم اسے بھول نہیں سکو گے۔ ایسے ہی اگر کوئی عورت کوٹ پتلون میں ہو تو وہ بھی ذہن سے چپک کر رہ جائے گی۔ مجھے بھی وہ لڑکا سُرخ مفلر کی وجہ سے یاد رہ گیا۔ کل یہاں سے گزرتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا۔ آج میں نے تمھاری گفتگو سُنی تو سوچا، تمھاری یادداشت کا امتحان ہی لے لوں۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔" اس نے بے حد گرمجوشی سے کہا۔ "یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا۔"

"اچھا دوست، میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اُٹھ گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ اٹھ گیا تھا۔ چائے کے پیسے دے کر میں باہر نکلا اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ کار میں بیٹھ کر میں نے انجن اسٹارٹ کیا۔ کار آگے بڑھاتے ہوئے میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اسی کنڈیکٹر کو اپنی طرف متوجہ پایا۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔

میں بہت محتاط تھا۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے میں نے عقب نما آئینے پر نظر رکھی تھی۔ ٹریفک معمول کے مطابق تھا... اور یہ فیصلہ کرنا ناممکن تھا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے یا نہیں۔ البتہ راوی کے پُل تک پہنچتے پہنچتے ٹریفک چھٹ گیا۔ اب میری کار کے عقب میں صرف ایک سفید فیاٹ موجود تھی۔ اب بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ مجھے یہ سوچ کر افسوس ہونے لگا کہ میں انتہائی عجلت میں اکھاڑے سے نکلا ہوں۔ مجھے اپنا ریوالور ساتھ لینے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ جبکہ مجھے کسی بھی وقت اس کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔

خوش قسمتی سے تعاقب کی خلش جلد ہی دُور ہو گئی۔ شاہدرہ پہنچ کر میں نے گاڑی شیخوپورہ جانے والے روڈ پر ڈال دی... جبکہ متعاقب فیاٹ جی ٹی روڈ کی طرف نکل گئی۔ میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے ایکسیلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔

شیخوپورہ کی حدود سے نکل کر میں نے کار کی رفتار کم کر دی۔ اب میں سنگ میل دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔

شیخوپورہ سے چھٹے میل پر میں نے کار سڑک سے اتار کر کچے میں' جھاڑیوں کے ساتھ روک دی' اور دروازے مقفل کر کے باہر نکل آیا۔ باہر آکر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اطراف میں سرسبز کھیت لہلہا رہے تھے۔ میں آگے کی سمت بڑھ گیا۔ کوئی بیس قدم چلنے کے بعد مجھے بائیں جانب ایک کچا مکان نظر آیا۔ وہ وہی مکان معلوم ہوتا تھا جس کا کنڈکٹر نے تذکرہ کیا تھا۔ پھر بھی احتیاطاً کچھ اور آگے تک جا کر میں نے دونوں جانب نگاہ دوڑائی... لیکن مجھے دُور دُور تک کوئی دُوسرا مکان نظر نہیں آیا۔ میں مطمئن ہو کر پلٹا... اور مکان کی طرف بڑھ گیا۔ اگر اقبال گاڑی سے اسی جگہ اُترا تھا تو اس کچے مکان کے باسیوں سے اس کے متعلق معلومات حاصل ہوسکتی تھیں۔ خود اُترنے کی صورت میں وہ کہیں اور نہیں جاسکتا تھا۔

میں مکان کے سامنے والے حصّے کی طرف پہنچا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہُوا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد ایک بوڑھی خاتون نمودار ہوئیں۔ ان کی آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ ان کی عمر اتنی زیادہ نہیں' جتنی نظر آتی ہے۔ میں نے انہیں سلام کیا جس کا جواب بے حد مشفقانہ لہجے میں دیا گیا۔

"ماں جی... مجھے پانی مل سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"آجاؤ بیٹا' اندر آجاؤ۔" خاتون نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اللہ کی رحمت آئی ہے ہمارے گھر... پانی کیا' جو چاہو مل سکتا ہے۔"

میں اندر داخل ہوگیا۔ خاتون نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور صحن میں دائیں جانب ایک سائبان کی طرف بڑھ گئیں۔ سائبان تلے' ایک بوڑھا آدمی بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

"آؤ بیٹا... کھانا کھاؤ۔" بڑے میاں نے مجھے دعوت دی۔

"بسم اللہ کیجیے۔ اللہ بہت دے۔"

خاتون کمرے کی طرف چلی گئی تھیں۔ بڑے میاں نے چند لقمے اور لیے... پھر ہاتھ اٹھا لیا۔ "زینب... دستر خوان سمیٹ لے۔" انھوں نے خاتون کو پکارا۔ خاتون آئیں۔ انھوں نے پانی کا گلاس مجھے دیا اور دستر خوان سمیٹنے لگیں۔ بڑے میاں میری طرف متو[جہ] ہوگئے۔ "ہاں بیٹا... اب سُناؤ' کیسے آئے؟" انھ[وں] نے پوچھا۔

"کافی دیر سے پیاس لگ رہی تھی۔ پھر مجھے آ[پ] کا مکان نظر آگیا۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت اچھا کیا۔ چائے یا لسّی پیو گے؟" بڑ[ے] میاں نے کہا۔ "شہری معلوم ہوتے ہو۔ اسی لیے چا[ئے] کا پوچھ رہا ہوں۔"

"جی' بڑی مہربانی۔" میں نے کہا۔ "شہری ہو[ں] تو نہیں لیکن آج کل شہر میں رہ رہا ہوں۔ گاؤں وال[وں] کی مہمان نوازی سے واقف ہوں۔ چائے کی واقع[ی] عادت سی ہوگئی ہے۔ مل جائے تو اچھا ہے۔"

"میں ابھی لائی۔" خاتون نے کہا... اور چلی گئیں۔

"کہیں جا رہے تھے تم؟" بڑے میاں نے استفسار کیا۔

"جی... جی نہیں۔ میرا مطلب ہے' یہیں ک[ے] ارادے سے نکلا تھا۔"

"بس پر آئے ہو؟"

"جی نہیں... اپنی گاڑی ہے۔" میں نے مجبو[ر] ہو کر کہا۔

"اچھا... اچھا' تو یہاں کس لیے آئے ہو۔ یہاں تو دُور دُور تک کوئی آبادی نہیں۔"

میں چند لمحے سوچتا رہا۔ اس گھر میں ان دونوں میاں بیوی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ سیدھے سادے لوگ تھے۔ ان سے گھماؤ پھراؤ کی بجائے براہ راست بات کر لینا زیادہ مناسب تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے جناب' کہ میں اپنے بھائی کی تلاش میں نکلا ہوں۔"

"بھائی کی تلاش میں؟"

"جی ہاں... اسے میں نے کل لاہور سے مانانو[الہ] کے لیے بٹھایا تھا' لیکن وہ گھر نہیں پہنچا۔ میں اسے ڈھونڈنے نکلا ہوں۔"

"وہ اب تک گھر نہیں پہنچا؟" بڑے میاں کے لہجے میں استعجاب تھا۔

میں اُلجھ کر رہ گیا۔ میرا تجربہ ہے کہ ایسے لوگ دوسرے کی ذرا سی پریشانی پر پریشان ہو جاتے ہیں

لیکن بڑے میاں بے حد پُرسکون تھے... جیسے میرے بھائی کی گمشدگی کوئی اہمیت ہی نہ رکھتی ہو۔ "اب تک کا تو مجھے علم نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "البتہ کل رات تک وہ گھر نہیں پہنچا تھا۔"

"تو اب پہنچ گیا ہوگا۔" انھوں نے بے حد اطمینان سے کہا۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"دراصل بڈھا آدمی ہوں۔ خود کو عقل مند سمجھتا ہوں۔ ہر بات میں یہ سمجھتا ہوں کہ معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔ حالانکہ پہلے کچھ معلوم کر لینا چاہیے۔ اچھا' یوں کرو بیٹا کہ تم اپنے بھائی کا حُلیہ بتاؤ۔ ممکن ہے' میں نے اسے دیکھا ہو۔"

میں اور اُلجھ گیا۔ تاہم میں نے اقبال کا حُلیہ بتا دیا۔ بڑے میاں کچھ دیر سوچتے رہے۔ اس دوران بوڑھی خاتون میرے لیے چائے لے آئی تھیں۔ میں نے چائے کی پیالی پکڑ لی اور متوقع نگاہوں سے بڑے میاں کو دیکھتا رہا۔ "اس نے لال رنگ کا مفلر بھی باندھا ہُوا ہوگا؟" چند لمحے بعد انھوں نے پوچھا۔

"جی ہاں... لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"بس اب پریشان نہ ہو۔" انھوں نے مجھے تسلی دی۔ "وہ گھر پہنچ گیا ہوگا۔"

"آپ یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے بتائیں... یہ سب کیا ہے؟"

"اس لڑکے کا نام اقبال ہے؟"

"جی ہاں۔"

"وہ رات یہیں رہا تھا... ہمارے ہاں۔"

"میں... میں سمجھا نہیں۔"

"دراصل کل یہاں ایک بس خراب ہوگئی تھی..."

"جی ہاں۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "اقبال اسی بس میں سفر کر رہا تھا۔"

"میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔" بڑے میاں نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں کھیتوں میں کام کر کے واپس آیا تھا... اور کھانا کھانے کے بعد آرام کر رہا تھا۔ پھر میں باہر نکل آیا۔ اسی وقت مجھے کھیت کی طرف سے کسی کی کراہ سُنائی دی... پھر دبی دبی سسکیوں کی آواز... میں کھیت کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مجھے وہ لڑکا نظر آیا۔ وہ نیچے گرا ہُوا تھا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شدید تکلیف میں ہے..."

"وہ... وہ خیریت سے تو تھا؟" میں بے تابانہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "کیا ہُوا تھا اُسے؟"

"میں نے کہا نا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" بڑے میاں نے مجھے اطمینان دلایا۔

لیکن میرے لیے مطمئن ہونا ناممکن تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے تھے۔

"آپ جلدی سے مجھے پوری بات بتا دیں۔" میں نے کہا۔

"بتا تو رہا ہوں لیکن تم بار بار ٹوک دیتے ہو۔ بیٹے' وہ خیریت سے ہے... اور آج صبح ہی یہاں سے گیا ہے۔" بڑے میاں نے کہا۔ "خیر... تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ درد کی شدت سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ اس کا ٹخنہ بُری طرح سُوجا ہُوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے پاؤں میں موچ آئی ہے۔ میں اسے اٹھا کر یہاں لے آیا۔ یہ زینب' دل کی بہت چھوٹی ہے۔ یہ گھبرا گئی اسے دیکھ کر۔ یہ پلٹس بنانے میں مصروف ہوگئی۔ اس دوران میں نے اطمینان کر لیا کہ ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ بس' لڑکے کو آرام کی ضرورت تھی۔ پھر زینب نے پلٹس باندھ دی۔ اور کچھ دیر بعد لڑکے کو خاصا آرام آگیا۔ اس نے ہمیں بتایا اس کا نام اقبال ہے۔ وہ مانانوالہ' اپنے گھر جا رہا تھا۔ اچانک بس خراب ہوگئی۔ وہ نیچے اتر آیا... اور چہل قدمی کے لیے کھیتوں کی طرف نکل آیا۔ وہاں نہ جانے کیسا جھٹکا لگا... اور اس کے پیر میں موچ آگئی۔" بڑے میاں نے بات ختم کی اور بوڑھی خاتون کی طرف متوجہ ہوگئے جو اُلجھن آمیز نظروں سے کبھی انھیں اور کبھی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ "یہ اقبال کا بھائی ہے۔" انھوں نے خاتون کو بتایا۔ اقبال کا نام لیتے ہوئے ان کے لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی۔

خاتون کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "بڑا پیارا لڑکا ہے وہ۔" انھوں نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "بہت ذمے دار... اور ماں باپ سے پیار کرنے والا لڑکا ہے۔ یہاں ٹھہرنے کو کسی طرح تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔"

میں اندر ہی اندر شرمسار ہو کر رہ گیا۔ اقبال چھوٹا

ہونے کے باوجود ذمّے داری کا مفہوم سمجھتا تھا اور ایک مں تھا کہ ایک مرتبہ گاؤں سے آنے کے بعد پلٹ کر گھر والوں کی خبر تک نہیں لی تھی۔

"ہاں... زینب نے کہا کہ وہ یہاں آرام کر لے... لیکن وہ بضد تھا کہ گھر جاؤں گا۔" بڑے میاں نے بوڑھی خاتون کی تائید کی۔ "ہم نے اسے سمجھایا کہ ابھی پاؤں پر زور دینا اچھا نہیں۔ زینب کو تو اس پر ممتا آ رہی تھی۔ اس نے کہا کہ کسی قیمت پر واپس نہیں جانے دوں گی۔ لیکن جب اس نے کہا کہ مجھے جانا ہے' ورنہ ماں پریشان ہوگی... تو زینب نے ہار مان لی۔"

میرا دل پھر اندیشوں سے بھر گیا۔ "لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ وہ آج صبح گیا ہے؟"

"سُن تو لو پوری بات۔" بڑے میاں نے کچھ خفا ہو کر کہا۔

"کیوں جھنجلاتے ہو۔" بڑی بی نے انھیں ٹوک دیا۔ "دیکھتے نہیں کہ بچہ اپنے بھائی کے لیے کتنا پریشان ہے۔" ان کے لہجے میں ممتا تھی۔

"ہاں' یہ تو ہے۔" بڑے میاں نے نرم لہجے میں کہا۔ "خیر... تو اس کے اصرار پر میں اسے سہارا دے کر بس تک لے گیا... لیکن وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ بس تو جا چکی ہے۔ پھر میں اسے مجبور کر کے واپس لے آیا۔ ورنہ وہ تو اس پر تُلا ہوا تھا کہ دوسری بس میں چلا جائے گا۔"

یہ وضاحت سُن کر میری جان میں جان آئی۔

"تو رات وہ یہیں ٹھہرا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... اور بڑی دیر تک ہم سے باتیں کرتا رہا۔ ماں کے گُن گائے جا رہا تھا۔ بڑا پیارا لڑکا ہے۔ صبح سو کر اُٹھا تو تکلیف بہت کم ہو چکی تھی۔ میں کھیتوں کو پانی لگا کر آیا۔ پھر ہم سب نے ساتھ ناشتہ کیا۔ اس کے بعد میں اُسے بس میں بٹھا آیا۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ دل و دماغ پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ البتہ ایک خلش اب بھی تھی۔ اقبال کے گھر پہنچنے کی تصدیق ہی اس خلش کو دور کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے وہاں سے اُٹھنے کا فیصلہ کیا۔ پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے' جس میں سے میں نے ایک گھونٹ بھی نہیں لیا ہے۔

"اوہ... چائے ٹھنڈی ہوگئی۔ سچ بات پریشانی میں کچھ بھی تو اچھا نہیں لگتا۔" خاتون کہا۔ میں چائے کی پیالی ہونٹوں تک لے جا کہ انھوں نے مجھے ٹوک دیا۔ "لاؤ... یہ مجھے دو۔" انھوں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں چائے لاتی ہوں۔"

میں احتجاج کرنا ہی چاہ رہا تھا کہ بڑے میا بول پڑے۔ "کمال کرتی ہو تم... ارے بھئی کھا کا وقت ہے۔ کھانا لے آؤ نا۔"

"نہیں... مجھے بالکل بھوک نہیں ہے نے کہا۔

ان دونوں نے کافی اصرار کیا... لیکن مجھے درحقیقت بھوک لگ ہی نہیں رہی تھی۔ پھر وہ خا میرے لیے تازہ چائے بنانے کے لیے چلی گئیں۔ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ پھر خاموشی گراں گزرنے بڑے میاں بھی خاموش بیٹھے تھے۔

"آپ کا گھر بہت سُونا ہے۔" میں نے کہا۔ کہاں ہیں؟"

"بچے؟" بڑے میاں نے ایک سرد آہ بھر "بچے تو بہت ہیں ہمارے... لیکن ہم تنہا ہیں۔"

ان کا جملہ وضاحت طلب تھا۔ "میں آپ کا مط نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔ اسی دوران خاتون چا لے آئی تھیں۔ میں نے چائے کی پیالی تھامی او جواب طلب نگاہوں سے بڑے میاں کو دیکھنے لگ

"میرا مطلب تھا... تم بھی تو میرے بچے اقبال بھی ہمیں اپنے بیٹے کی طرح لگا تھا۔" بڑے میاں نے کہا۔ بوڑھی خاتون ایک لمحے کے لیے چ پھر ان کی آنکھوں میں اداسی کے سائے اتر آئے

"میرا مطلب ہے' آپ کے اپنے بچے؟"

"ہمارا تو ایک ہی لڑکا تھا۔" بڑے میاں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"تو کیا خدانخواستہ..."

"نہیں' نہیں۔" بوڑھی خاتون تڑپ کر بولیں مرا نہیں ہے۔ وہ تو زندہ ہے۔" پھر ان کی آنکھو آنسو آ گئے۔

"تو آپ اتنی رنجیدہ کیوں ہو گئیں؟"

خاتون خاموش رہیں۔ بڑے میاں چند لمحے سر جھکائے بیٹھے رہے' پھر بولے۔ "ہاں... ہمارا بیٹا مرا نہیں۔ وہ تو زندہ ہے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ جو میری راہ میں شہید ہوا' وہ حیاتِ ابدی پا گیا۔ سو ہمارا بیٹا زندہ ہے۔ ہم مر جائیں گے لیکن وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔" ان کے لہجے میں گہری اداسی تھی۔ "یہ تو پگلی ہے۔" انھوں نے خاتون کی طرف اشارہ کیا۔ "بس' وہ ہم سے دُور ہے نا۔ اسی لیے کبھی کبھی یہ اداس ہو جاتی ہے... ان ماؤں کی طرح جن کے بیٹے انھیں اکیلا چھوڑ کر پردیس چلے جاتے ہیں۔ ممتا ایسی ہی بے صبری ہوتی ہے۔"

میں سُن ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ پنجاب والوں کے لیے یہ المیہ کوئی نئی چیز نہیں۔ پنجاب کے بیشتر گھرانے اپنے کئی کئی بیٹوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ پاکستان کی بنیادوں میں ہندوستان سے لُٹ پٹ کر آنے والوں کا لہو شامل ہے... اور اس کی دیواروں کو استحکام دینے کے لیے پنجاب نے اپنا لہو دیا ہے۔

بوڑھی خاتون نے تیزی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ "میں رو تھوڑا ہی رہی ہوں۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم نے تو ایک بیٹا دے کر ملک بھر کے سارے بیٹے لے لیے ہیں... اُس کسان کی طرح جو زمین کو ایک بیج دیتا ہے اور فصلوں کی صورت خزانے حاصل کرتا ہے۔ اقبال بھی میرا بیٹا ہے... تم بھی میرے بیٹے ہو۔ قوم کے سب جوان میرے بیٹے ہیں۔"

میں اس وقت شدید جذباتی کیفیت سے دوچار تھا۔ میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ "ہاں ماں... مجھے تم پر... اور اپنے اس بھائی پر فخر ہے جس نے اپنی جان قوم کی نذر کر دی۔ تم واقعی قوم کی ماں ہو۔ ہاں... میں آپ کا بیٹا ہوں۔"

ان دونوں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ لیکن چند لمحے بعد نہ جانے کیوں وہ چمک ماند پڑ گئی۔ "لیکن کتنی عجیب بات ہے۔ ایک بیٹے نے مجھے اس قدر تنہا نہیں کیا تھا' جتنا میرے ہزاروں' لاکھوں بیٹوں نے کر دیا ہے۔ آخر کیوں؟" بوڑھی خاتون کے لہجے میں بلا کا درد تھا۔ "اب کبھی کبھی آیا کرو گے نا؟... جب بھی کبھی فرصت ملے... آؤ گے نا؟"

"ہاں ماں... میں ضرور آؤں گا۔ اقبال کو بھی ساتھ لاؤں گا۔"

کچھ دیر بعد جب میں وہاں سے نکلا تو مجھے ایسا لگا' جیسے اپنے گھر سے رخصت ہو رہا ہوں۔ بعض اوقات صرف چند لمحے انسان کی زندگی میں ایسی تبدیلی لے آتے ہیں' جو برسوں میں بھی رُونما نہیں ہوتی۔ ان دونوں نے دُعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ بڑے میاں تو مجھے چھوڑنے کے لیے سڑک تک آئے۔ میں نے انھیں خدا حافظ کہا... اور کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ پھر میں نے کار آگے بڑھا دی۔ عقب نما آئینے میں بابا کا سراپا نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ سراپا آہستہ آہستہ ایک نقطے میں تبدیل ہوا... اور بالآخر معدوم ہو گیا۔

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے کچھ بھی سوچا سمجھا نہیں تھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اصولاً وہ ٹھیک ہی تھا' جو میں کر رہا تھا۔ مجھے مانانوالہ جا کر تصدیق کرنا تھی کہ اقبال واقعی گھر پہنچ گیا ہے۔ لیکن اس میں ایک قباحت تھی۔ مانانوالہ پہنچ کر فوری واپسی میرے اختیار میں نہ رہتی۔ امی کا اصرار ایک طرف... خود میرا دل بھی نہ چاہتا کہ فوراً واپس جاؤں۔ میں رُکے بغیر نہ رہتا۔ دوسری طرف لاہور واپس جانے کو بھی دل نہیں مانتا تھا۔ چند لمحے خود سے اُلجھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اقبال کے مانانوالہ پہنچنے کی تصدیق حامد کے ذریعے بآسانی کرائی جا سکتی ہے۔ میں نے گاڑی کا رُخ موڑا... اور اسے لاہور کی طرف دوڑا دیا۔

اکھاڑے پہنچ کر میں نے گاڑی لاک کی۔ اتفاق سے استاد اور حامد اکھاڑے ہی میں موجود تھے۔ "کہو برخوردار... کیا کرتے پھر رہے ہو؟" استاد نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "ہم تو سمجھے تھے کہ تم گئے ہاتھ سے۔"

"کیا مطلب؟"

"استاد کا خیال تھا کہ تم اقبال کی تلاش میں تنہا ہی نکل کھڑے ہوئے ہو۔ صبح ہم تمھیں یہیں چھوڑ

کر گئے تھے... واپس آئے تو تم کار سمیت غائب تھے۔" حامد نے کہا۔

"بہرحال مبارک ہو۔ اقبال گھر پہنچ گیا ہے۔" اُستاد نے کہا۔

مجھ پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری رہی۔ چند لمحے تو میں گُنگ سا کھڑا رہا پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"عجیب آدمی ہو۔ پہلے یہ خبر سننے کے لیے پریشان تھے۔ اب خبر سننے کے بعد بھی چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔" استاد نے مضحکانہ لہجے میں کہا۔

"اس وقت تو تم نے دھماکا کیا ہے اُستاد۔" چند لمحے بعد میں نے سنبھل کر کہا۔ "بہرحال، یہ کب اور کیسے پتہ چلا؟"

"میں اور حامد یہاں سے نکل کر اس کے دفتر گئے تھے۔" استاد نے بتایا۔ "وہاں ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ اقبال دس، ساڑھے دس بجے کے قریب خیریت سے گھر پہنچ گیا ہے۔ البتہ وہ قدرے لنگڑا کر چل رہا تھا۔"

"خدا کا شکر ہے۔"

"اب تو تم مطمئن ہو؟" حامد نے کہا۔

"بالکل مطمئن ہوں... اور تمھارا شکر گزار بھی ہوں۔"

"ہوتے رہو۔ میرا کیا بگاڑ لوگے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" اُستاد نے کہا اور اس کے جاتے ہی میری طرف متوجہ ہو گئے۔ "حیرت ہے برخوردار... تم نے اقبال کے لنگڑانے پر کوئی تشویش ظاہر نہیں کی۔ کیا بات ہے؟"

میں نے سوچا کہ اُستاد کو اپنی تفتیشی کارروائی سے آگاہ کر دوں... لیکن اس میں ان کی ناراضگی کا خطرہ تھا۔ میں ان کی ہدایت کے برعکس تنہا ہی اقبال کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اپنی سرگرمیوں کا تذکرہ نہ کروں۔ "وہی معاملہ ہے استاد..." میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "جب آدمی کو زندگی ہاتھ سے جاتی دکھائی دے تو معذوری کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ پھر اقبال لنگڑاتا ہوا ہی سہی... کسی سہارے کے بغیر گھر پہنچا تھا نا۔ مجھے تو اس میں تشویش کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ موچ آگئی ہوگی۔ جوان لڑکوں کے لیے تو یہ کوئی بڑ بات نہیں۔"

اُستاد مطمئن نظر آنے لگے۔ "اور سناؤ... گھوم پھر آئے؟" انھوں نے پوچھا۔

"بس، یونہی مٹرگشت کر رہا تھا۔"

"مٹرگشت، اور کار پر؟" اُستاد نے زور د لگایا... اور میں جھینپ کر رہ گیا۔ "تم بھی عجیب آدمی ہو یار۔"

"بس اُستاد... ہوں مٹرگشت کرنے میں سے... اور خدا نے کار عطا فرما دی مٹرگشتی سے تو باز آنے سے رہا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ زیادہ تقریر" اُستاد نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "یہ بتاؤ، آج کسی سے تو واسطہ نہیں پڑا۔"

"نہیں اُستاد... بس کل ایک کا سے کیا تھا میرا... اس سے پہلے کئی دن سے کچھ"

"گویا ان کی سرگرمیاں سُست پڑ گئی ہیں برخوردار... میرا مشورہ ہے کہ محتاط رہو۔ مجھے سکوت کسی طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوتا ہے۔ کا اس طرح خاموش بیٹھنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔ میں محتاط ہو" میں نے جواب دیا۔

"اور مجھے تو یہ ساجن کا چیلنج بھی معنی خیز معـ ہوتا ہے۔" اُستاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں... اصولاً تو انھیں گزشتہ شکست بعد سر ہی نہیں اُٹھانا چاہیے تھا۔"

"دوسری طرف اکھاڑے کے اندر کا انتشار معنی خیز ہے۔ اس پر ساجن کا چیلنج!"

"چیلنج کا جواب بھجوا دیا آپ نے؟"

"ہاں... کل سے مقابلے شروع ہو رہے ہیں میں نے اس سلسلے میں حامد سے بھی بات کی" اُستاد نے بتایا۔

"کیا آپ کسی گڑبڑ کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں؟"

"ان حالات میں یہ امکان نظر انداز تو کیا جا"

"تو پھر حامد نے کیا مشورہ دیا؟"

"طے یہ پایا ہے کہ اکھاڑے میں اور اکھاڑے اِردگرد سادہ لباس والے متعین کر دیے جائیں... وہ گرد و پیش پر نظر رکھیں گے۔ اور چوکنا رہیں تاکہ کسی بھی ناخوشگوار صورتِ حال سے بچا جا سکے۔"

"میں کل ہی مقابلے پر اُتروں گا۔" میں نے جوش لہجے میں کہا۔

"نہیں برخوردار... میرا پروگرام ہی کچھ اور ہے۔"

"لیکن اُستاد... آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ ری طرح مجھ پر ہی انحصار کریں گے۔" میں نے ھیں یاد دلایا۔

"یہی سوچا تھا میں نے... لیکن بعد میں ارادہ ل دیا۔"

"ارادہ بدلنے کی کوئی خاص وجہ؟" میں نے پوچھا۔

اُستاد کچھ ہچکچائے۔ "بات یہ ہے برخوردار کہ نے محسوس کیا ہے، تم بہت سے لوگوں کی روں میں کھٹکنے لگے ہو۔ یہ چیلنج اسی لیے تو مجھے اور نی خیز معلوم ہو رہا ہے۔ نہ جانے کیوں، مجھے ایسے تا ہے کہ تم خطرے میں ہو۔"

"ارے نہیں اُستاد... مجھے اکھاڑے میں کیا طرہ لاحق ہوگا۔" میں نے ہنستے ہوئے بڑی بے پروائی سے کہا۔ "اور ہوگا بھی تو موہوم سا... ویسے بھی خطرات رے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ جب سے لاہور آیا ہوں، خطرات ہی میں گھرا ہوا ہوں۔ مجھے اصل خطرہ س تنظیم کی طرف سے ہے، جو ڈائریوں کے سلسلے میں پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔"

"نہیں برخوردار... یہ معاملہ سنگین ہے، ورنہ میں اتنا سنجیدہ نہ ہوتا۔" اُستاد کے لہجے میں سنگینی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔"

"برخوردار... جب وہ پتے ہوا دینے لگیں جن پہ تکیہ ہو... تو آدمی کو بہت زیادہ محتاط ہو جانا چاہیے۔"

"خیر چھوڑیں ان باتوں کو۔ یہ بتائیں کہ جوڑ لگنے کے بارے میں کیا سوچا آپ نے۔"

"حسبِ معمول ہر روز تین مقابلے ہوں گے۔" اُستاد نے کہا۔ "دو چھوٹے اور ایک بڑا۔ چھوٹے مقابلے تمھیں معلوم ہی ہے کہ زیادہ اہم نہیں ہوتے۔ ہار جیت کا فیصلہ بڑی کشتیوں پر ہوتا ہے۔ کل کے بڑے اور اہم مقابلے میں میں حفیظ کو اتار رہا ہوں۔ پہلی دو کشتیاں شدّو اور صابر لڑیں گے۔ میرا خیال ہے، کل کے مقابلے کے بعد صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے اُستاد... جیسے تمھاری مرضی۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" اُستاد نے مجھے چمکارا۔ "بچوں کی طرح روٹھ نہ جایا کرو۔"

"تمھارے سامنے تو واقعی بچہ بن جانے کو دل چاہتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہاں سے اُٹھ گیا۔

شام کے وقت اکھاڑے میں زور ہوا۔ اُستاد نے اُن پہلوانوں کو مطلع کر دیا تھا، جنھیں اگلے روز مقابلے میں حصہ لینا تھا۔ انھیں خاص طور پر زور کروایا گیا۔ حفیظ میرے ساتھ زور کرتا رہا۔ پھر اُستاد اکھاڑے میں اُتر آئے۔ وہ بڑے مشفقانہ انداز میں حفیظ کو زور کراتے... اور مقابلے کے سلسلے میں مشورے دیتے رہے۔ اس روز اکھاڑے میں کشیدگی نام کو بھی نہیں تھی۔ بلکہ یکجہتی کی فضا بن گئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر گپیں رہیں۔ پھر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ بڑے عرصے کے بعد مجھے وہ پہلی رات میسر آئی تھی کہ... میں بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ بڑی پُرسکون نیند آئی۔ اس صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی۔ میں نے جلدی جلدی حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہو کر غسل کیا اور قضا پڑھی۔ پھر میں باہر نکل آیا۔ اُستاد اکھاڑے میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ اس روز میدان میں اترنے والے پہلوان دوسرے پہلوانوں سے زور کر رہے تھے۔ میں سیدھا اُستاد کی طرف چلا گیا۔ میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے جواب دے کر اشارے سے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں پائینتی کی طرف بیٹھ گیا۔ اُستاد کی توجہ زور کرنے والے پہلوانوں کی طرف تھی۔

"اُستاد... آج تم نے مجھے صبح نہیں اٹھایا۔" میں

نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں تو خود دیر سے اٹھا ہوں۔" اُستاد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "کئی راتوں کی بے آرامی کے بعد یہی کچھ ہوتا ہے۔ چلو۔۔۔ اچھا ہی ہوا کہ ایک رات تو پُرسکون نیند سو لیے۔ ناشتہ کر لیا تم نے؟"

"نہیں۔۔۔ ابھی تو نہیں کیا۔"

"پھر ساتھ ہی کریں گے۔ یہ لوگ زور کر کے فارغ ہو لیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اُستاد پھر پہلوانوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔۔۔ اور میں سوچوں میں گم ہو گیا۔ اس وقت اچانک ہی نہ جانے کیوں مجھے گلنار یاد آ گئی۔ پھر نازو کا خیال آ گیا۔ کچھ عرصے سے یہی ہو رہا تھا۔ ان دونوں کی یاد لازم و ملزوم بن کر رہ گئی تھی۔ ایک یاد آتی تو میں دوسری کے بارے میں سوچے بغیر نہ رہ پاتا۔ ایسے میں میں بُری طرح جھنجلاتا بھی۔۔۔ کہ کیسا ڈھلمل یقین ہو گیا ہوں لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ ان دونوں کے درمیان میں ہمیشہ معلق رہتا تھا کسی یقین پر نہیں پہنچ پاتا تھا۔

نہ جانے میں کتنی دیر سوچتا رہا۔ پھر اُستاد نے اچانک مجھے چونکا دیا۔ "کل شام ان لوگوں کو زور کرتے ہوئے دیکھا تھا تم نے؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"جی؟" میں چونک کر بولا۔ پھر شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ "جی ہاں، دیکھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اور اس وقت۔۔۔ دیکھو، تمھیں کچھ فرق محسوس ہوتا ہے؟"

میں پہلوانوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اُستاد بھی خاموش رہے۔ میں توجہ سے ان لوگوں کو دیکھتا رہا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد اُستاد کی بات میری سمجھ میں آئی اور میں اُن کے مشاہدے کی گہرائی کا قائل ہو گیا۔

"جی ہاں۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے، رات ہی رات میں کوئی انقلاب آ گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"وضاحت سے بات کرو۔"

"یہ لوگ کل بے حد پُرجوش تھے۔ ان میں جذبہ تھا۔۔۔ اور اس وقت یہ اس سے محروم معلوم ہیں۔ مجھے تو ان کے انداز سے نیم دلی جھلکتی ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے۔"

"ٹھیک سمجھے ہو تم۔" اُستاد نے پُرستائش لہجے میں کہا۔ "یہی بات ہے۔۔۔ اور میں اس کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔" اُستاد کے لہجے میں [illegible] تھی۔ میں نے نظریں اُٹھا کر انھیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر تازگی اور بشاشت تھی۔ ان کی کا یہی حُسن میرے لیے سب سے زیادہ [illegible] تھا۔ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔ وہ پریشان نظر نہیں آتے تھے۔

"پھر۔۔۔ کس نتیجے پر پہنچے آپ؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اُستاد نے سر جھٹکا۔

"پھر بھی؟"

"دیکھو۔۔۔ مقابلے کے بعد ہی کچھ کہا جا سکے گا۔ جو بھی ہو گا بھگتیں گے۔ بھاگنے والے تو نہیں ہیں۔"

ہم ناشتہ کر کے بیٹھے ہی تھے کہ ثاقب کا فون آ گیا۔ اُستاد نے مجھے بتایا کہ فون میرے لیے ہے۔

"ہیلو۔۔۔ نسیم جمال بول رہا ہوں۔" میں نے ریسیور میں کہا۔

"میں ثاقب جمیل ہوں جناب۔۔۔ کراچی سے۔"

میرے دل میں پھر وسوسے جاگ اُٹھے۔ نہ جانے کیا خبر ملے۔ اپنی تو زندگی ہی گردشوں سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔۔۔ اور ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں۔ "کیا بات ہے جمیل؟ خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں جناب، اللہ کا کرم ہے۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس میں نے آپ کو وہ فون نمبر دینے کے لیے زحمت دی ہے۔ جہاں خاتون گلنار مقیم ہیں وہاں فون لگ گیا ہے۔ نمبر نوٹ کر لیجیے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا، اسے ہولڈ کرنے کو کہا۔۔۔ اور جا کر اپنے کمرے سے کاغذ قلم لے آیا۔ جمیل نے فون نمبر نوٹ کرا کے رابطہ منقطع کیا۔ میں ڈائریکٹری کی طرف جھپٹا تاکہ کراچی کا ڈائلنگ کوڈ بھی نوٹ کر لوں۔

"کیا بات ہے برخوردار؟" اُستاد نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "گلنار کی طرف سے خیر خبر ملی ہے کیا؟"

میں محجوب ہو کر رہ گیا۔ اُستاد بَلا کے معاملہ فہم تھے۔ یہ بات بھی انھوں نے بھانپ لی تھی۔۔۔ حالانکہ فون پر میں نے ہُوں ہاں کے سوا کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ "جی ہاں اُستاد۔" میں نے کہا۔ "جمیل نے فون کیا تھا۔ اس نے مجھے گلنار کا فون نمبر دیا ہے۔"

"جبھی اتنے بے صبرے ہو رہے ہو۔" اُستاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں جھینپ کر رہ گیا۔ پھر میں نے ڈائریکٹری سے کراچی کا نمبر بھی اسی کاغذ پر نوٹ کر لیا۔

"لگتا ہے، ابھی اور اسی وقت فون کرو گے۔" اُستاد نے چوٹ کی۔

"آپ کہتے ہیں تو رُک جاتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ بے تابی تو مجھے بھی ہو رہی ہے۔" اُستاد بھی سنجیدہ ہو گئے۔ "مجھے بھی تو اپنی بیٹی ریشماں سے بات کرنا ہے۔"

میں نمبر ملانے میں مصروف ہو گیا۔ کئی کوششوں کے بعد بالآخر نمبر مل ہی گیا۔ اب مجھے گھنٹی بجنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ میرا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ تصور میں گلنار کا سراپا لہریں لینے لگا تھا۔ پھر کسی نے ریسیور اُٹھایا اور ہیلو کہا۔

میں ایک لمحے کے لیے گُنگ ہو کر رہ گیا۔ بھلا میں اس آواز کو بھُلا سکتا تھا۔ وہی خوبصورت کھنک دار آواز۔۔۔ وہی گُنگناتی ہوئی آواز۔۔۔ وہی مترنم لہجہ۔۔۔ لیکن وہ ہانپ رہی تھی۔۔۔ جیسے بہت دُور سے بھاگ کر آئی ہو۔

"ہیلو۔" اس بار اُس کے لہجے میں تشویش تھی۔

میں اس کے لہجے کے سحر سے آزاد ہو گیا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ رابطہ ملنے کے باوجود میری آواز نہ سُن کر وہ کس قدر پریشان ہو گئی ہو گی۔ وہ تو ٹیلیفون نصب ہونے کے بعد سے اب تک میرے فون کی بے چینی سے منتظر ہو گی۔ اُسے یقین ہو گا کہ پہلی مرتبہ فون کی گھنٹی بجے گی۔۔۔ وہ ریسیور اُٹھائے گی تو مجھ سے ہمکلام ہو پائے گی۔ اس کی سانسوں کے مضطرب ساز گواہی دے رہے تھے کہ وہ بے تابانہ بھاگتی ہوئی فون تک پہنچی ہے، اور اب۔۔۔ میں شاید کچھ اور بھی سوچتا، لیکن اس کی آواز نے پھر مجھے چونکا دیا۔ "ہیلو۔۔۔ بولتے کیوں نہیں؟" اس بار اضطراب اور تشویش پہلے سے بڑھ گئی تھی۔

"کیسی ہو گلنار؟" میری آواز بکھر بکھر گئی۔

"اوہ جمال۔۔۔ خُدا کا شکر ہے۔۔" اس نے کہا۔۔۔ اور پھر شاید وہ بھی گُنگ ہو کر رہ گئی۔

میں نے کن انکھیوں سے اُستاد کی طرف دیکھا، پھر ماؤتھ پیس میں کہا۔ "پہلے اُستاد سے بات کرو۔" اُستاد نے مجھے بڑی طرح گھورا۔ لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولے۔

"ن۔۔۔" وہ شاید انکار کرتے کرتے رُک گئی۔ "ٹھیک ہے جمال۔ بُرا نہ ماننا۔ دراصل میں اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں ہوں۔ تمھارے اُستاد میرے لیے بھی بہت محترم ہیں۔۔۔ ریسیور انھیں دے دو۔"

میں نے ریسیور اُستاد کو دے دیا۔ اُستاد بڑے مشفقانہ انداز میں اس سے باتیں کرتے رہے۔ پھر انھوں نے گلنار سے فرمائش کی کہ وہ ریشماں سے بات کرائے۔ ریشماں یقیناً وہیں کھڑی تھی، کیونکہ اُستاد کو ہولڈ آن بھی نہیں کرنا پڑا۔ ریشماں سے باتیں کرتے وقت اُستاد کے لہجے میں ایسی محبت اور نرماہٹ اُتر آئی تھی، جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

۔۔۔ کچھ دیر وہ اس سے باتیں کرتے رہے، پھر بولے۔ "اچھا، اب اپنے بھیّا سے بات کرو۔" یہ کہہ کر انھوں نے ریسیور مجھے دے دیا اور خود کمرے سے نکل گئے۔

"ہیلو گُڑیا، کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں بھیّا۔ اب آپ گلنار سے بات کریں۔"

"کیوں۔۔۔ تم کوئی بات نہیں کرنا چاہتیں؟"

"یہ بات نہیں بھیّا۔۔۔ لیکن حق داروں کی ترتیب کی بھی تو اہمیت ہوتی ہے۔"

"پگلی ہو تم۔۔۔ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ تم گلنار سے کم اہم ہو۔ اری بے وقوف، بہنیں تو امانت ہوتی ہیں۔ پرائے آنگن کی چڑیاں، جانے کب رخصت ہو جائیں۔

اسی لیے انھیں سب پر فوقیت دی جاتی ہے۔"

"ایسی باتیں نہ کریں بھیا۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی اُداسی اُتر آئی۔ "لیجیے... گلنار سے بات کیجیے۔"

دوسرے ہی لمحے گلنار کی آواز سنائی دی۔ "مجھ سے کچھ نہ پوچھنا جمال۔ مختصر بات یہ ہے کہ ہم سب خیریت سے ہیں۔"

"اور میری خیریت خداوندِ کریم سے نیک مطلوب ہے۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔

وہ دھیرے سے ہنس دی... وہی کھنکتی ہوئی ہنسی جیسے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔ "خدا کا شکر ہے۔" اس نے کہا۔ "تمھارا لہجہ... تمھاری جملے بازی اب بھی ویسی ہی ہے۔ ہاں... تو میں کہہ رہی تھی کہ ہمارا حال پوچھنے کی بجائے اپنے حالات تفصیل سے بیان کر چلو۔"

"جلدی کیا ہے۔ میں کوئی پبلک فون سے تو کال نہیں کر رہا ہوں۔ جب تک جی چاہے گا، بات کریں گے۔" میں نے سخت بُرا مانتے ہوئے کہا۔

وہ پھر ہنس دی۔ "دیوانے ہو تم تو۔" اس کا لہجہ دیوانہ بنا دینے والا تھا۔ "بات صرف یہ ہے کہ میں تمھارے بارے میں جاننے کے لیے مری جا رہی تھی۔" اس نے کچھ توقف کیا، پھر تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔ "تنظیم والوں سے پیچھا چھوٹ گیا یا نہیں۔"

"ایسا لگتا ہے کہ میرا پیچھا تو چھوٹ گیا... البتہ اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے میں نے۔ بہرحال، اس دوران مجھ پر کوئی حملہ نہیں ہوا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔" اس نے کہا۔ "کراچی کب آرہے ہو؟"

"فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"نہیں کہہ سکتے تو ہم لوگ خود لاہور آجائیں گے۔"

"ارے نہیں... ایسا غضب نہ کرنا۔ گلنار پلیز مجھے یہاں حالات سے نمٹنے دو۔ تم لوگ محفوظ ہوتے ہو تو مجھے یکسوئی میسر آتی ہے۔"

"نہیں... تمھیں آنے کے متعلق بتانا ہوگا۔ ورنہ کم از کم میں تو واقعی آہی جاؤں گی۔"

"کیا ہو گیا ہے تمھیں۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "اس قدر فہیم اور سلجھی ہوئی لڑکی ہو اور ایسی بچوں جیسی ضد کر رہی ہو۔"

"ڈانٹو مت... یہ تصور میرے لیے جان لیوا ہے کہ تم وہاں تنہا خطرات میں گھرے ہوتے ہو..."

"یعنی تم بھی میرے ساتھ خطرات میں گھرنا چا[ہتی ہو]..."

"ہاں... یہی بات ہے۔"

بڑی مشکل سے اُسے سمجھایا۔ پھر میں نے ... اکھاڑے کا نمبر نوٹ کرا دیا۔ اس کے بعد ریشماں ... بات ہوئی۔ اس کی آواز کی دبی دبی شوخی محسوس ... یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ وہی ریشماں ہے ... گم صم رہتی تھی۔ پھر آنٹی سے بھی گفتگو ہوئی، جو ... تمام دُعاؤں پر مشتمل تھی۔ پھر میں نے ریسیور رکھ ... اور کمرے سے نکل آیا۔

اُستاد اکھاڑے ہی میں موجود تھے۔ ایک ... کچھ پہلوان مجمع لگائے بیٹھے تھے۔ رشید نے مجھے ... ہی پکارا۔ "آجاؤ پہلوان، سیپ جمے گی۔"

"نہیں یار... اس وقت تو اُستاد کے پاس ... گے۔" میں نے جواب دیا۔

"جاؤ جاؤ... کھیل لوتا۔" اُستاد نے کہا۔ پھر ... کے اصرار پر میں اُن لوگوں کی طرف بڑھ گیا۔

دوپہر تک ہم لوگ سیپ کھیلتے رہے۔ رشید ... پارٹنر تھا۔ وہ مخالفین پر فقرے چُست کرتا رہا۔ ا... وقت گزر گیا۔ پھر سب نے مل کر کھانا کھایا... ا... کھانے کے بعد قیلولے کا پروگرام بنا۔ کچھ لوگ شام ... مقابلے کے انتظامات کے سلسلے میں مصروف ہو گئے ... تک میرا پیش پیش تھا۔

میں نے کچھ دیر آرام کیا۔ اس روز سونے کا ... ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کیونکہ میں رات بہت دیر ... سویا تھا۔ میں کمرے سے نکلا اور اکھاڑے کی طرف ... آیا۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ اکھاڑے کے ... اطراف میں کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ ایسے مقابلوں ... دیکھنے کے لیے تماشائی خاصی تعداد میں آتے ہیں ... عام تو نہیں... البتہ درپردہ ان مقابلوں پر شرطیں ... بھی لگائی جاتی ہیں۔ باقاعدہ سٹہ چلتا ہے۔ ہر پہلوان ... ساکھ کے مطابق شرطوں کا بھاؤ طے ہوتا ہے۔ اُستاد ... کو آخری شکل دے رہے تھے۔ اس وقت وہ الیکٹریشن ... کو ہدایات دے رہے تھے کہ روشنی کا انتظام کیسے ... جائے۔ مجھے دیکھا تو وہ میری طرف بڑھ آئے... ا... [کا] ہاتھ تھام کر مجھے ایک طرف لے گئے۔ "دیکھو برخوردار ... [خبر]ت آ پہنچا ہے۔ تم ذرا چوکنے رہنا۔" انھوں نے سرگوشی ... [میں] کہا۔

میں نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ پھر میں نے گردوپیش ... [کا] جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ مقابلہ شروع ... [ہو]نے میں ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا، اور تماشائی ... [آ]نے لگے تھے۔ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ میں نے ... [اپن]ی حیرت کا اظہار اُستاد پر بھی کر دیا۔

"یہ تماشائی نہیں ہیں، جمال۔" اُستاد نے کہا۔ "یہ ... [س]ب سادہ لباس والے ہیں، جنھیں حامد نے بھیجا ہے ... [ا]ن کی صورتیں ذہن نشین کر لو تاکہ مشکوک قسم کے لوگوں ... [پر] نظر رکھنے میں آسانی رہے۔ کچھ لوگ اکھاڑے کے باہر ... بھی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں باہر کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔" میں ... نے کہا اور اکھاڑے کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ باہر نکل ... [ک]ر میں نے سرسری انداز میں گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اُستاد ... [ک]ا کہنا ٹھیک تھا۔ وہاں بھی کئی سادہ لباس والے موجود ... تھے۔ پولیس کے لوگوں کی بہرحال اپنی پہچان ہوتی ہے... ... [ب]شرطیکہ دیکھنے والی نظر موجود ہو۔

مقابلہ شروع ہونے میں خاصی دیر تھی۔ میں مٹھو ... [حل]وائی کی دکان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں میں نے لسی پی ... [او]ر مٹھو سے خاصی دیر گپ شپ کرتا رہا۔ پھر میں اکھاڑے ... [ک]ی طرف لوٹ آیا۔ اب چہل پہل خاصی بڑھ گئی تھی۔ ... [تم]اشائی بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ علاقے کے لوگ ... [ا]پنے پہلوان کی عقیدت کے حوالے سے بڑے جوش و خروش ... [کا] مظاہرہ کر رہے تھے۔ بیشتر کرسیوں پر تماشائی قابض ... ہو چکے تھے۔ سامنے والی قطار میں ہمارے علاقے کے ... [او]ر ساجن کے علاقے کے معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ ساجن ... [ک]ے اکھاڑے کے پہلوان زور کر رہے تھے۔ اُن کے علاقے کے ... لوگ اُن کی حوصلہ افزائی کے لیے نعرے لگا رہے تھے... ... تالیاں بجا رہے تھے۔

پھر ریفریوں کی آمد کا غلغلہ اُٹھا۔ ایسے مقابلوں کیلئے ... جو ریفری منتخب کیے جاتے ہیں، وہ دونوں اکھاڑوں کیلئے ... قابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔ اس بار شاہنواز اور دلبر کو منتخب ... کیا گیا تھا۔ وہ دونوں اپنے زمانے میں ٹھیک ٹھاک پہلوان رہ چکے تھے۔ یہ کشتیاں مغربی انداز کی فری اسٹائل کشتیاں تھیں جن میں دونوں پہلوان مُکّا وکراٹے کے داؤ تک استعمال کر سکتے تھے۔ تمام مقابلے چھ راؤنڈ کے ہونا تھے۔

میں اُستاد کے پاس جا کھڑا ہوا، جن کا چہرہ فرطِ جوش سے تمتما رہا تھا۔ چند لمحے بعد ساجن، ریفری شاہنواز کے ساتھ وہاں آگیا۔ شاہنواز نے اُستاد کی طرف کاغذ بڑھایا۔ "اس پر ان پہلوانوں کے نام ترتیب سے لکھے ہوئے ہیں، جو ساجن کی طرف سے آج اکھاڑے میں اُترنے والے ہیں۔" اس نے خالص پیشہ ورانہ انداز میں اُستاد سے کہا۔ پھر اس نے اکھاڑے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ رہے تینوں۔"

میں نے... اور اُستاد نے اکھاڑے کی طرف دیکھا وہ تینوں ہماری طرف رُخ کیے، تنے کھڑے تھے۔ "دائیں طرف ساکا ہے... بیچ میں توفیق ہے اور بائیں طرف شمس پہلوان ہے۔"

اُستاد نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ میں نے ناقدانہ نگاہوں سے ان تینوں کا جائزہ لیا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ ان تینوں میں سے بڑی کشتی کون لڑے گا۔ وہ یقیناً شمس تھا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑا تھا... لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اُن سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ بہت خوبصورت جسم کا مالک تھا... اور عام پہلوانوں کی طرح اس کی توند بالکل نہیں تھی... بلکہ اس کا پیٹ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ اُن پہلوانوں میں سے معلوم ہوتا تھا، جنہوں نے ورلڈ کلاس ریسلنگ کے مقابلے دیکھ دیکھ کر اپنی تربیت کی ہو۔ ایسے لوگ بہت سخت جان ہوتے ہیں... اور جدید داؤ پیچ کے ماہر بھی ہوتے ہیں۔ اُستاد نے مجھے بتایا تھا کہ بڑی کشتی کے لیے اُن کا ارادہ حفیظ کو میدان میں اُتارنے کا ہے۔ حفیظ بہت اچھا پہلوان تھا... لیکن وہ روایتی پہلوان تھا۔ بڑی ساری توند وزن پر انحصار کرنے والا۔ اسے شمس کے مقابلے میں اتارنا میرے خیال میں مناسب نہیں تھا۔ میرے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ میرا جی چاہا کہ کاش اُستاد اس کے مقابلے میں مجھے میدان میں اُترنے کا حکم دیں۔

"اب آپ ان کے مقابلے میں لڑنے والوں کے نام دے دیں۔" شاہنواز نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ذرا مشورہ کرلوں۔" اُستاد نے کہا... اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک طرف لے گیا۔
ان مقابلوں کا ایک قاعدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ چیلنج کرنے والا اکھاڑا اپنے پہلوانوں کے نام دیتا ہے... اور جوڑی لگانے کا حق دوسرے اکھاڑے کو حاصل ہوتا ہے۔
اُستاد ایک گوشے میں رُک گئے، جہاں سے ہماری آواز دوسروں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ "جی اُستاد... تو پھر کیا خیال ہے؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔
"خیال کیا ہوگا برخوردار۔ درحقیقت مشورے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو میں تمھیں یونہی لے آیا ہوں۔ میں انھیں تاثر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے۔ بس چند منٹ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہیں گے۔ پھر تم کاغذ پر نام لکھ کر انھیں دے دینا۔"
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"
"فیصلہ تو میں پہلے ہی کرچکا ہوں۔" اُستاد نے جواب دیا۔
"اور اس فیصلے میں تبدیلی کا کوئی ارادہ نہیں ہے!"
"کیوں ہو؟ تمھارے خیال میں ہونا چاہیے؟"
"تو آپ اس لڑکے شمس کے مقابلے میں حفیظ کو اتار رہے ہیں؟"
"ہاں... کوئی حرج ہے اس میں؟"

"کیا آپ پہلے مقابلے میں یقینی شکست کھانا چاہتے ہیں؟"
"یہی سمجھ لو۔" اُستاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں ایک تیر سے دو شکار کررہا ہوں۔"
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"
"سمجھ جاؤ گے۔" اُستاد نے پُراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ سنجیدہ ہوگئے۔ "تم یہی چاہتے ہو نا کہ شمس پہلوان گے مقابلے میں اترو۔ لیکن میں ترپ کا اِکّا آخر کے لیے بچانا چاہتا ہوں۔ اگر حفیظ یہ مقابلہ ہار جاتا ہے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ اس صورت میں ہم دونوں میدان میں اُتریں گے۔ میں آخری بازی سامنے رکھ کر بساط بچھا رہا ہوں۔ سمجھے کچھ؟"
"جی سمجھ گیا۔" میں نے اُستاد کو احترام آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اُستاد واقعی دُور تک دیکھنے اور سوچنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ کچھ دیر پہلے جو فیصلہ مجھے مخدوش نظر آرہا تھا، وہ بہترین ثابت
"چلو... اب نام لکھ دو۔" استاد نے کہا۔
"میرے کمرے میں چلیے۔"
ہم دونوں کمرے میں آگئے۔ میں نے کاغذ رکھا اور قلم سنبھال لیا۔ "جی... اب بتائیے۔" "شمس کے سامنے حفیظ کا نام لکھتے ہوئے کہا۔ اور توفیق کے لیے جوڑیاں لکھوا دیں۔"
"ساکا کے سامنے نثار کا نام لکھ دو۔ اور توفیق کے سامنے بھُورے کا۔" اُستاد نے بلاجھجک کہا۔
میں نے نام لکھ کر کاغذ اُستاد کے حوالے کیا۔ پھر ہم دونوں کمرے سے نکل آئے اور ساجن اور شاہنواز کی طرف بڑھ گئے۔ اُستاد نے خاموشی سے کاغذ شاہنواز کی طرف بڑھا دیا۔ شاہنواز نے ساجن کو نام پڑھ کر سنائے۔ ساجن کے ہونٹوں پر لمحہ بھر کو ایک بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی... اور فوراً ہی معدوم بھی ہوگئی۔ اس کے بعد ہم چاروں اکھاڑے کی طرف بڑھ گئے۔
چند لمحے بعد شاہنواز نے پہلی کشتی کا اعلان کیا۔ "ساکا بمقابلہ نثار۔"
تماشائیوں میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ اگلے ہی لمحے ساکا اور نثار اکھاڑے میں اتر آئے۔
پہلے مقابلے کا ریفری دلبر تھا۔ اس نے دونوں پہلوانوں کو کشتی کے قواعد و ضوابط سے آگاہ کیا۔ پھر مقابلہ شروع ہونے کی گھنٹی بج گئی۔
مقابلہ شروع ہی سے سُست تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں پہلوان کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ دونوں پہلوانوں کے حامی مسلسل انھیں بڑھاوا دے رہے تھے۔ لیکن پانچویں راؤنڈ کے اختتام پر وہ چُپ سادھ کر بیٹھ گئے۔ شاید انھیں احساس ہوگیا تھا کہ وہ اپنا وقت اور توانائی ضائع کررہے ہیں۔ چھٹے راؤنڈ کے آغاز ہی میں ساکا کا داؤ چل گیا۔ داؤ کوئی ایسا خاص نہیں تھا لیکن نثار کے کچے پن کی وجہ سے کام کر گیا۔ بلکہ ایک لمحے کے لیے تو یہ محسوس ہُوا کہ نثار اپنی خوشی سے کشتی ہار رہا ہے۔ پھر ہُوا بھی یہی... نثار خود کو اس داؤ سے نہ نکال سکا۔ دلبر نے ساکا کو فاتح قرار دے دیا۔ ساجن

علاقے کے لوگ دیوانہ وار تالیاں پیٹنے لگے۔
دوسرا مقابلہ، پہلے مقابلے کا ایکشن ری پلے معلوم ہوتا تھا۔ بھُورا پہلوان بہت پھرتیلا تھا۔ لیکن اُس روز اُس کی پھُرتی نہ جانے کہاں جا سوئی تھی۔ میں اسے بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ کبھی کبھی وہ کشتی سے دھیان ہٹا کر تماشائیوں کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ ایسے میں اس کی نگاہوں کا تاثر عجیب سا ہوتا تھا... اور میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا۔
پہلے ہی راؤنڈ سے توفیق، بھُورے پر چھا گیا تھا۔ بھُورا صرف مدافعت کررہا تھا۔ پھر چوتھے راؤنڈ میں وہ مدافعت بھی دم توڑ گئی۔ توفیق کے جیتتے ہی اکھاڑا تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ میں نے کن انکھیوں سے اُستاد کی طرف دیکھا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ لرز رہی تھی۔ شاید میرے لیے وہ دن ہی معمّوں کا تھا۔ اُستاد کی معنی خیز مسکراہٹ کا مفہوم بھی میں نہ پاسکا۔
ہمارے علاقے کے لوگوں کے چہرے مُرجھا سے گئے تھے۔ وہ خاصے مایوس نظر آرہے تھے۔ پھر میں نے رشید کو ان کی طرف جاتے... اور اُن سے باتیں کرتے دیکھا۔ شاید وہ انھیں سمجھا رہا تھا کہ چھوٹے مقابلوں کی اہمیت کچھ نہیں ہے۔ لوگ قدرے مطمئن نظر آنے لگے۔
تیسرا اور سب سے اہم مقابلہ شروع ہونے سے پہلے وقفہ ذرا طویل ہوگیا۔ لوگ اضطراب کے عالم میں پہلو بدل رہے تھے۔ ہر شخص ہیجانی کیفیت سے دوچار تھا۔ سب لوگ اصل مقابلے کے منتظر تھے۔
پھر تیسرے مقابلے کا اعلان ہُوا... اور دونوں پہلوان اکھاڑے میں اُتر آئے۔ وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ اُن کی عمروں میں بھی خاصا فرق تھا۔ دونوں جسمانی اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ وہ قدیم و جدید کا ٹکراؤ معلوم ہوتا تھا۔ شاہنواز اُس مقابلے کا ریفری تھا۔ اس نے دونوں پہلوانوں کو مقابلے کے قواعد و ضوابط سے آگاہ کیا... حالانکہ وہ دونوں ہی اُن سے خوب واقف تھے۔

اب لوگ دم سادھ کر بیٹھ گئے تھے۔ انھیں مقابلہ شروع ہونے کی گھنٹی کا انتظار تھا۔ پھر گھنٹی بجی۔ دونوں پہلوانوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو تولا... پھر تیزی سے جھپٹے۔ پہلے ہی لمحے میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ مقابلہ بالکل مختلف ثابت ہوگا۔ اور ہُوا بھی یہی... حفیظ بہت اچھا پہلوان تھا لیکن اُس روز اُس کی کارکردگی سبھی کے لیے حیران کن تھی۔ وہ انتہائی جارحانہ مقابلہ تھا۔ دونوں پہلوان خطرناک داؤ استعمال کررہے تھے۔ پہلے راؤنڈ کے خاتمے پر دونوں پہلوان لہولہان ہوچکے تھے۔
پھر دوسرا راؤنڈ شروع ہُوا۔ اس میں بھی دونوں پہلوان تیزی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ میں حفیظ کی تکنیک سمجھ گیا۔ وہ کوشش کررہا تھا کہ نیچے نہ گرنے پائے۔ جانتا تھا کہ توند کی وجہ سے وہ پھُرتی سے نہیں اُٹھ سکے گا... اور حریف کے لیے ایک لمحے کی مہلت بھی کافی ثابت ہوگی۔ ویسے وہ بڑی پھُرتی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ شمس نے کئی بار فلائنگ ٹنگ کے ذریعے اسے گرانا چاہا تھا لیکن ہر بار حفیظ بڑی پھُرتی سے کاوا کاٹ گیا تھا... اور شمس خود ہی زمین بوس ہُوا تھا۔
وہ بے حد پُرتشدد مظاہرہ ثابت ہورہا تھا۔
پھر پانچویں راؤنڈ میں اسٹیمنا کا فرق رنگ لانے لگا۔ حفیظ تھک گیا تھا، جبکہ شمس ابھی تک تازہ دم تھا۔ حفیظ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب اس کے لیے جیتنا ناممکن ہے۔ اب وہ صرف مدافعت کررہا تھا۔ اب مقابلے کا ہار جیت کے بغیر ختم ہونا بھی اس کے لیے جیت کے مترادف تھا۔ سچی بات ہے کہ کوئی جذبہ ہی تھا، جو اُسے ڈٹے رہنے پر مجبور کررہا تھا۔ یوں تو دونوں پہلوان لہولہان تھے۔ لیکن حفیظ کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ اسی راؤنڈ کے آخر میں شمس نے آرم لاک لگا دیا۔ حفیظ کا بایاں ہاتھ اس کی گرفت میں تھا... اور وہ بتدریج دباؤ بڑھا رہا تھا۔ حفیظ کا چہرہ کرب کی شدت سے سیاہ ہورہا تھا۔ ریفری شاہنواز اس سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ وہ ہار مان رہا ہے یا نہیں۔ حفیظ بار بار نفی میں سر ہلاتے

جارہا تھا۔ پھر لاک گرفت کی حد سے نکل گیا۔ حفیظ کی زبردست چیخ سُنائی دی۔ اسی وقت راؤنڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور شمس اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ حفیظ دانتوں سے ہونٹ بھینچے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ ۔ ۔ اور بایاں بازو بے جان سے انداز میں پہلو کے ساتھ جھول رہا تھا۔ میں۔ ۔ ۔ اُستاد مجو اور چند سینئر پہلوان تیزی سے حفیظ کی طرف لپکے۔ حفیظ بُری طرح جھول رہا تھا۔ ڈاکٹر اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔

"بس، مقابلہ ختم سمجھو۔" ڈاکٹر نے حفیظ سے کہا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔" حفیظ بپھر گیا۔

"نہیں حفیظ۔ ۔ ۔ اب تم مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتے۔" اُستاد نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

"اُستاد۔ ۔ ۔ تم بھی۔ ۔ ۔"

"ہاں حفیظ، حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے۔"

"نہیں اُستاد۔ ۔ ۔ میں نہیں مانتا۔"

"یہ میرا حکم ہے۔"

"اُستاد۔ ۔ ۔ یہ جان تمہاری ہے۔ گلا گھونٹ کر مار دو۔ ۔ ۔ لیکن پیٹھ دکھانے کا حکم نہ دو۔" حفیظ جذباتی ہو گیا۔

"بے وقوف۔ ۔ ۔ یہ پیٹھ دکھانا نہیں ہے۔"

"تم کچھ بھی کہو اُستاد۔ ۔ ۔ تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ ۔ ۔ میں ہار مان لیتا ہوں۔ ۔ ۔ لیکن خُدا کی قسم پھر میں کل کا دن بھی نہیں دیکھ سکوں گا۔"

حفیظ کے لہجے کی مضبوطی نے سب کو دہلا دیا۔ اُستاد بھی کشمکش میں پڑ گئے۔ پھر انھوں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے حفیظ۔ ۔ ۔ خُدا تمھیں اپنی امان میں رکھے۔ ہم تمہارے لیے دُعا ہی کر سکتے ہیں۔"

حفیظ نے تیزی سے جُھک کر استاد کے پیر چھو لیے۔ اُستاد نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "اُستاد۔ ۔ ۔ اکھاڑے کی۔ ۔ ۔ تمہاری آبرو کے سامنے میری جان کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بس، میرے حق میں دُعا کرنا۔"

"ہاں۔ ۔ ۔ اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔" اُستاد نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن حفیظ۔ ۔ ۔ یہ میری یا اکھاڑے کی آبرو کا سوال نہیں ہے۔"

"ہے۔ ۔ ۔ اُستاد ہے۔" حفیظ نے زور دے کر کہا۔

ہم وہاں سے ہٹ آئے۔ تماشائی دم سادھے بیٹھے تھے۔ ہمارے حامیوں کے چہرے فق تھے۔ سب جانتے تھے کہ اس حال میں حفیظ، شمس کے مقابلے میں چند لمحے بھی نہیں ٹھہر سکے گا۔ لیکن اس راؤنڈ میں جو کچھ ہُوا، وہ قوتِ ارادی کی مثال بن گیا۔ حفیظ پورے راؤنڈ میں ڈٹا رہا۔ شمس نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ ۔ ۔ لیکن حفیظ کو زیر نہ کر سکا۔ اب وہ خود بھی ڈگمگانے لگا تھا۔ پھر راؤنڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔ ۔ ۔ اور اکھاڑے کے پہلوانوں نے حفیظ کو سر پر اٹھا لیا۔ شمس بے حد دل گرفتگی کے عالم میں اکھاڑے سے نکلا۔ وہ ایک یقینی فتح سے محروم ہو گیا تھا۔ علاقے کے لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے اور ہمیں مبارکباد دینے لگے۔

دیر تک یہ ہنگامہ رہا۔ پھر سب لوگ چلے گئے۔ حفیظ کی حالت اچھی نہیں تھی لیکن اس نے اسپتال جانے سے انکار کر دیا۔ اُسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سب پہلوانوں نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ پھر کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن وہاں کی فضا میرے لیے مایوس کُن تھی۔ ۔ ۔ ۔ یہ چاہیے تھا کہ حفیظ کی کارکردگی سے اُن سب کے حوصلے بڑھتے۔ ۔ ۔ لیکن مجھے ہر شخص مایوس نظر آ رہا تھا۔ بالآخر کچھ دیر کے بعد سب سونے کے لیے چلے گئے۔

میں اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ پہلوانوں کی مایوسی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ نہ جانے وہ کس خوف کا شکار تھے۔ میں دیر تک اسی سلسلے میں سوچتا رہا۔ پھر میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن وہ اچھی نیند نہیں تھی۔ پریشان خیالوں نے پریشان کُن خوابوں کا رُوپ دھار لیا تھا۔ میں نیند کے عالم میں بھی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ مجھ پر عجیب سی وحشت طاری تھی۔ کمرے میں دم گھٹا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں باہر نکل آیا۔

اکھاڑے میں ہر سُو اندھیرا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ کر سامنے دیکھتا رہا۔ پھر مجھے ایسا لگا، جیسے کچھ

لوگ اکھاڑے کی دیوار پر چڑھ رہے ہیں۔ پہلے تو میں اسے فریبِ نظر سمجھا۔ پھر دیوار پر چڑھتے ہوئے وہ لوگ واضح طور پر نظر آئے تو میں دیوار کی طرف لپکا۔ لیکن جب تک میں وہاں پہنچا، وہ دیوار پھلانگ چکے تھے۔ میں دیوار پر چڑھا۔ دیوار پر چڑھ کر میں نے دوسری طرف دیکھا۔ اسی وقت انجن کے غرانے کی آواز سُنائی دی۔ اور ایک گاڑی کی جھلک نظر آئی۔ وہ گہرے رنگ کی گاڑی تھی۔

میں مایوس ہو کر نیچے اُتر آیا۔ پھر میں نے سوچا کہ تمام کمروں کا جائزہ ہی لے لوں۔ حفیظ کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ اس کی حالت کے پیشِ نظر استاد نے شمشاد کو حکم دیا تھا کہ وہ رات حفیظ کے کمرے میں گزارے۔ میں نے دروازے پر سُن گُن لی۔ میں حفیظ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حفیظ کے کراہنے کی آواز نہیں سُنائی دے رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ پُرسکون نیند سو رہا ہے۔ پھر بھی احتیاطاً میں اندر داخل ہُوا۔ میں نے سوئچ آن کیا۔ ۔ ۔ لیکن روشنی ہوتے ہی! جیسے میں پتھر کا ہو گیا۔ وہ منظر کچھ اتنا ہی لرزہ خیز تھا۔ دو جسم خون کے ایک تالاب میں ڈوبے ہُوئے تھے۔

میں چند لمحے تو سناٹے کے سے عالم میں کھڑا ہی رہ گیا۔ ۔ ۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اکھاڑے میں قتل۔ ۔ ۔ دو دو قتل! بہت ہی خوفناک صورتِ حال تھی۔ میری پوزیشن۔ ۔ ۔ اُستاد کی پوزیشن۔ ۔ ۔ میں چکرا کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھا۔ حفیظ کے پیٹ میں ایک چاقو دستے تک پیوست تھا۔ اس کا جسم بے حس و حرکت تھا۔ یہ اندازہ لگانا دُشوار نہیں تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ البتہ شمشاد کے سانسوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں شمشاد کے قریب گھٹنوں کے بل جُھک گیا اور اس کا جائزہ لیا۔ سر کے علاوہ اس کے پورے جسم پر کہیں کوئی زخم نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ حملہ آور صرف حفیظ کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔ شمشاد کو راستے سے ہٹانے کے لیے اس کے سر پر وار کیا گیا تھا۔ اُسے بے ہوش کرنے کے بعد ہی حملہ آور نے حفیظ کے پیٹ میں چاقو گھونپا ہوگا۔ شمشاد، حفیظ کے خون میں نہایا ہُوا تھا۔ حالانکہ پہلی نظر میں تو مجھے ایسا ہی لگا تھا، جیسے وہ دوہرے قتل کا کوئی منظر ہو۔

میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔

سب سے پہلے اُستاد کو اُٹھا کر صورتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ میں نے اُستاد کے دروازے پر دستک دی۔ پھر مجھے دروازہ خاصی زور سے پیٹنا پڑ گیا۔ شاید اُستاد گہری نیند سو رہے تھے۔ اُستاد سے اُٹھنے سے پہلے ہی جیرا اُٹھ گیا۔ ۔ ۔ اور آنکھیں ملتا ہُوا اپنے کمرے سے نکل آیا۔ "کیا مصیبت ہے؟ تم چین سے سونے کیوں نہیں دیتے؟" اس نے بھنا کر کہا۔

میں نے پھر دروازہ پیٹ ڈالا۔ اس بار اندر سے آہٹ سُنائی دی تھی۔ "مجھے تمہارے سونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ جاکر سو جاؤ۔" میں نے جیرے سے کہا۔ وہ جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اُستاد نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے جمال؟ خیریت تو ہے؟" اُستاد نے پوچھا۔

"خیریت ہوتی تو اتنی رات کو آپ کے کمرے کا دروازہ کیوں پیٹتا۔" میں نے کہا۔ "ذرا میرے ساتھ آیئے۔"

استاد میرے ساتھ ساتھ چل دیے۔ جیرا بھی پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ہم تیز قدموں سے حفیظ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔ "کوئی واردات ہو گئی ہے کیا؟" استاد نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "کسی نے حفیظ کو قتل کر دیا ہے۔"

استاد ٹھٹک گئے۔ "اوہ۔ ۔ ۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ معاملہ اس قدر بڑھ جائے گا۔" انھوں نے کہا، پھر وہ جیرے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "جاؤ۔ ۔ ۔ اور سب کو جگا دو۔"

جیرا بغیر ایک لفظ کہے پلٹ گیا۔ استاد حفیظ کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اس بار وہ آگے آگے تھے۔

کمرے کے منظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہر چیز جوں کی توں تھی۔ استاد نے کمرے کا جائزہ لیا۔ حفیظ کی نبض دیکھی۔ ۔ ۔ پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے شمشاد کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "یہ صرف بے ہوش ہے۔" انھوں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ "جاؤ۔ ۔ ۔ فوراً حامد کو فون

کرو۔ اس کے گھر کا نمبر ہے تمھارے پاس؟" انھوں نے مجھ سے کہا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اُستاد نے مجھے فون نمبر بتایا۔۔۔ اور میں زیر لب اُس نمبر کو دُہراتا ہُوا ان کے کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے حامد کا نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ تو فوراً ہی مل گیا لیکن دوسری طرف دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ حامد یقیناً سو رہا ہوگا۔ میں ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا۔ خدا خدا کر کے دس منٹ بعد کسی نے ریسیور اُٹھالیا۔

"ہیلو۔۔۔" ایک بھرّائی ہوئی آواز سُنائی دی۔

"مجھے حامد صاحب سے بات کرنی ہے۔"

"میں حامد ہی ہوں۔" اُس کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

"معاف کرنا حامد۔۔۔ میں نسیم جمال بول رہا ہوں۔" میرا لہجہ معذرت آمیز ہوگیا۔

"اوہ۔۔۔ خیریت تو ہے؟" اُس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"اکھاڑے میں قتل ہوگیا ہے۔ اُستاد کے کہنے پر تمھیں فون کیا ہے۔"

وہ بہت معاملہ فہم آدمی تھا۔ اس نے فون پر بازپُرس میں وقت ضائع نہیں کیا۔ "میں آرہا ہوں۔" اُس نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے ریسیور کریڈل پر ڈالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اُستاد اب بھی حفیظ کے کمرے میں موجود تھے۔ وہ پریشان اور متاسف دکھائی دے رہے تھے۔ "فون کر دیا؟" انھوں نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "جی ہاں۔۔۔ حامد آرہا ہے۔"

استاد گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ "یہ پہلا موقع ہے کہ اکھاڑے میں کوئی واردات ہوئی ہے۔" اُن کے لہجے میں تاسف تھا۔ "ہماری بنی بنائی ساکھ برباد ہو سکتی ہے۔ پانی سر سے گزر گیا ہے۔ اب مجھے تیزی سے کوئی قدم اُٹھانا ہوگا۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں اس لیے خاموش ہی رہا اور سوچتا رہا۔ عجیب گورکھ دھندا تھا۔ استاد کی گدّی سے معاملہ شروع ہُوا تھا۔۔۔ اور اب نوبت قتل تک آپہنچی تھی۔ یقیناً کچھ جرائم پیشہ لوگ اکھاڑے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ویسے بھی اس قماش کے لوگوں کے لیے اکھاڑے بہت پُرکشش ہیں۔ اکھاڑے کے پہلوان اگر جرائم کی پُشت پناہی کرنے لگیں تو مجرموں اور قانون کے درمیان طاقت کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ ہمارا اکھاڑہ اب تک اُستاد مجّو کے کردار کی مضبوطی کی وجہ سے محفوظ رہا تھا۔ استاد کے کردار کی چند جھلکیاں تو میں خود دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک عظیم انسان تھے۔۔۔ امن پسند، قانون پسند۔۔۔ عام اور کمزور لوگوں سے محبت کرنے والے اور ان کے دُکھ درد بانٹنے والے۔۔۔ ان کے جیتے جی اکھاڑا مجرموں کا اڈّا نہیں بن سکتا تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ مجرموں کے کسی گروہ نے اکھاڑے پر قابض ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تشویش ناک بات یہ تھی کہ انھوں نے اکھاڑے کے کچھ پہلوانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اُستاد کے ہوتے ہوئے ان کی دال نہیں گل سکتی تھی۔ یہ ایک اور تشویش ناک بات تھی گویا استاد اُن کے لیے دیوار کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ یعنی استاد ان لوگوں کی نظروں میں کھٹک رہے ہوں گے۔ حفیظ کو ٹھکانے لگانے والے استاد کو بھی راستے سے ہٹانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب مزید چوکس رہوں گا۔

میرے خیالوں کا سلسلہ حامد کی آمد پر ٹوٹا۔ حامد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اُستاد کو سلام کیا اور فوراً ہی حفیظ اور شمشاد کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"تنہا آئے ہو؟" اُستاد نے پوچھا۔

"فی الحال تو تنہا ہی ہوں۔ تھانے میں فون کر دیا تھا۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔" حامد نے جواب دیا۔

اس دوران شمشاد کچھ کسمسانے لگا تھا۔ وہ ہوش میں آرہا تھا۔

"لاش کس نے دریافت کی؟" حامد نے پوچھا۔

"میں نے۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

"تفصیل سے بتاؤ۔" حامد نے خشک لہجے میں کہا۔ اس وقت اس کا انداز خالص افسرانہ تھا۔

میں نے تفصیل سے اُسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سُنتا رہا۔ اس دوران دیگر پولیس والے بھی آگئے تھے۔ تھانے کا انچارج خود بھی دوڑا دوڑا آیا تھا۔ اس نے آتے ہی حامد کو زوردار سیلوٹ کیا۔ شمشاد نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"اسے فی الحال یہاں سے ہٹادیں۔" حامد نے اُستاد سے کہا۔

استاد نے میری طرف دیکھا۔ اُن کا اشارہ پاکر میں شمشاد کی طرف بڑھا۔ اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔۔۔ لیکن ابھی اُس کی نظر لاش پر نہیں پڑی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اُسے اُٹھایا۔۔۔ اور کھڑا کر دیا۔ شاید اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ وہ ہوش میں آنے کے باوجود چکرا رہا تھا۔ میں نے اُسے لاش کی طرف نہیں دیکھنے دیا اور کمرے سے نکال لایا۔ اس کے کپڑے اور چہرہ خون میں تربتر ہو رہا تھا۔ تمام پہلوان راہداری میں جمع تھے۔ انھوں نے شمشاد کو اس حال میں دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ چند ایک کی دبی دبی چیخیں بھی سُنائی دیں۔

شمشاد کی حالت پوری طرح نہیں سنبھلی تھی تاہم محسوسات جاگ اُٹھے تھے۔ "یہ۔۔۔ یہ میں بھیگ کیسے گیا؟" اس نے پوچھا۔ اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے اُسے تسلی دی۔

لیکن راہداری میں روشنی تھی۔ اس نے اپنے چپچپاتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا اور بے اختیار چیخ اُٹھا۔ "خ۔۔۔ خون۔۔۔ یہ تو خون ہے۔"

کچھ پہلوان ہماری طرف بڑھ آئے۔ "کیا یہ بہت زخمی ہے؟" رشید نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ صرف سر میں چوٹ لگی ہے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ خون کس کا ہے؟"

"یہ سب کچھ بعد میں پوچھ لینا۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "فی الحال اسے سنبھالو۔ اسے باتھ روم لے جاؤ تاکہ یہ کپڑے تبدیل کرے۔ اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔"

"میں پوچھتا ہوں۔۔۔ یہ خون کس کا ہے؟" شمشاد چیخا۔

"تمھیں یاد نہیں کہ۔۔۔ تم کہاں تھے؟"

"یاد ہے۔۔۔ میں حفیظ کے کمرے میں تھا۔"

"تو تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ خون تمھارا نہیں تو صرف حفیظ ہی کا ہو سکتا ہے۔"

"نہیں۔۔۔" وہ زور سے چیخا۔ پھر اس نے جھٹکے سے خود کو چھڑایا اور حفیظ کے کمرے کی طرف دوڑ پڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ کمرے میں پہنچ کر جیسے ہی اُس کی نظر حفیظ کی لاش پر پڑی، اس پر جنون سا طاری ہوگیا۔ وہ "نہیں نہیں" کی گردان کرتے ہوئے جھُومنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہوتا، میں نے اُسے سنبھال لیا۔ رشید بھی ہمارے پیچھے ہی کمرے میں چلا آیا تھا۔ کمرے کا منظر اُس کے لیے بھی روح فرسا ثابت ہوا تھا۔ میں نے اُسے ہدایت کی کہ وہ شمشاد کو باہر لے جائے۔ رشید نے ایک اور پہلوان کی مدد حاصل کی اور دونوں، شمشاد کو باہر لے گئے۔

پولیس والے اب لاش اُٹھانے کا بندوبست کر رہے تھے۔ انھوں نے چاک سے کچھ نشانات لگا دیے تھے۔ انسپکٹر نے حامد کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "میرے لیے کیا حکم ہے سر؟" اُس نے پوچھا۔

"اس کیس کی تفتیش تم ہی کرو گے لیکن مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔ میں تمھاری مدد کرتا رہوں گا۔"

"بہت بہتر۔" انسپکٹر نے سر ہلا کر کہا۔

"لاش دریافت انھوں نے کی تھی۔" حامد نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے استاد کا ہاتھ تھاما اور انھیں لے کر کمرے سے نکل گیا۔ انسپکٹر اپنے ماتحتوں کی طرف متوجہ ہُوا۔ "ٹھیک ہے، لاش اُٹھالو۔" اُس نے انھیں ہدایت کی۔

میری عدم موجودگی میں پولیس والے اسٹریچر لے آئے تھے۔ ایمبولینس غالباً احاطے میں کھڑی تھی۔ انھوں نے جلدی جلدی لاش کو اسٹریچر پر رکھا اور باہر لے گئے۔ اب انسپکٹر کی توجہ میری طرف تھی۔ "آپ یہیں رہتے ہیں؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔۔ فی الحال تو یہیں مقیم ہُوں۔"

"تو پلیز۔۔۔ اپنے کمرے میں چلیے۔"

میں اُسے اپنے کمرے تک لے آیا۔ اُس نے کمرے کو ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا۔ "تشریف رکھیے۔" میں نے کُرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ شکریہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں تخت پر بیٹھ گیا۔۔۔ لیکن میری نگاہیں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"اب آپ تفصیل سے بتایئے۔" اس نے کہا۔ انداز

بے حد مہذبانہ تھا۔ یا تو وہ کوئی بے حد خلیق پولیس افسر تھا یا پھر ایس پی حامد کی وجہ سے اُس نے تہذیب کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس لیا اور وہ کہانی دُہرا دی، جو میں پہلے حامد کو سُنا چکا تھا۔ انسپکٹر خاموشی سے سُنتا رہا۔

"آپ کی آنکھ کس وجہ سے کُھلی تھی؟" میرا بیان مکمل ہونے کے بعد اس نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔" میں نے جواب دیا۔"بس میری آنکھ کُھلی اور میں بلا ارادہ باہر نکل آیا۔ میرا خیال تھا کہ تازہ ہوا میں چند گہرے گہرے سانس لُوں گا تو وحشت کچھ کم ہو جائے گی۔"

"دیوار پھاندنے والوں میں سے کسی کو دیکھ سکے تھے؟"

"نہیں... تاریکی بہت گہری تھی۔ مجھے تو وہ محض ہیولے ہی نظر آ رہے تھے۔"

"پھر بھی جثے اور قد کاٹھ کا تو پتہ چل ہی گیا ہوگا۔"

"میں تو ان کی تعداد بھی نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔"شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میں گہری نیند سے اُٹھا تھا۔ ایسے میں یوں بھی ذرا کم ہی سجھائی دیتا ہے، اس پر گہری تاریکی بھی تھی۔"

"کار کیسی تھی؟ اس کے رنگ اور ساخت کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟"

"جی نہیں۔" میں نے مختصراً کہا۔

"ٹھیک ہے۔ فی الحال اتنا کافی ہے۔ میں آپ کا تحریری بیان بعد میں لے لوں گا۔" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

اپنے کمرے سے نکل کر میں نے اُستاد کے کمرے کا رُخ کیا۔ حامد وہیں موجود تھا۔"آؤ جمال۔" اُس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں استاد سے کہہ رہا تھا کہ بہتر ہے، مقابلے ملتوی کرا دیں۔" حامد نے کہا۔

"اور استاد کا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔" اُستاد نے جواب دیا۔ اُن کے لہجے میں قطعیت تھی۔"یہ قتل مقابلوں ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس وقت

اکھاڑے کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ میں اُ جذباتیت کی نذر نہیں کر سکتا۔ مجھے حفیظ کی موت افسوس ہے۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا... لیکن اس قدردانی اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے قاتل پتہ چلا کر اسے قانون کے حوالے کیا جائے۔" استا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس قتل کا تعلق مقابلوں سے ہے؟" حامد نے اعتراض کیا۔

"میں وجہ نہیں بتا سکتا۔ بس میں جانتا ہوں معاملہ یہی ہے۔"

"تو آپ مقابلے ملتوی نہیں کریں گے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تمھارا کیا خیال ہے جمال؟" حامد نے مجھ سے پو

"میں اُستاد کا ہم خیال ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" حامد نے سر جھٹک کر کہا۔"لاش اٹھوا لی گئی ہے؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہ کس سلسلے میں؟" اُستاد چونک کر بولے۔

"پوسٹ مارٹم ہوگا۔"

"تم لوگوں کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔" اُستاد تلخ لہجے میں کہا۔"ایک شخص قتل ہوا ہے۔ اس کے پیٹ میں چاقو گھونپا گیا ہے۔ اس میں پوسٹ مارٹم کیا تُک ہے؟"

"قاعدہ یہی ہے استاد۔" حامد نے مدافعانہ لہجہ اختیار کیا۔"ویسے میں اس کی درجنوں وجوہ بتا سکتا ہوں... لیکن میرا خیال ہے، اس وقت میری بات آپ سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"کیوں نہیں آئے گی۔ بتاؤ تو سہی۔"

"فرض کیجیے حفیظ کو زہر دیا گیا ہو... فرض کیجیے جس وقت اس کے پیٹ میں چاقو گھونپا گیا تھا، اس وقت وہ مردہ ہو۔ پوسٹ مارٹم کے بغیر ہمیں اس بات کا پتہ چلے گا۔ ہم تو چاقو گھونپنے والے کو ہی ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔"

"اچھا... میں نے مانا کہ حفیظ کو زہر بھی دیا گیا ہے۔ زہر اثر کر ہی رہا تھا کہ اس کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا گیا۔ اب یہ کیسے پتہ چلے گا کہ اس کی موت کی اصل وجہ کیا تھی۔ اس کا قاتل کسے قرار دیا جائے گا؟" استاد اس وقت کچھ زیادہ ہی حجتی ہو رہے تھے۔

"ڈاکٹر موت کے اصل سبب کا پتہ چلا لے گا۔" حامد نے جواب دیا۔"جہاں تک قاتل ہونے کا سوال ہے تو قاتل وہی ہوگا، جس کے وار سے موت واقع ہوئی تھی۔ لیکن دوسرا شخص بھی اقدامِ قتل کے الزام میں پکڑا جائے گا۔"

"خیر... رہنے دو یہ باتیں..." اُستاد جھلا گئے۔"یہ بتاؤ کہ ہمیں لاش واپس کب ملے گی؟"

"شاید کل... یا ممکن ہے آج ہی مل جائے۔"

"کل صبح مل جائے تو اچھا ہے۔" استاد کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"میں اس سلسلے میں اسپتال والوں سے بات کروں گا۔" حامد نے اُٹھتے ہوئے کہا۔"اب میں چلتا ہوں۔"

"خُدا حافظ۔" اُستاد نے کہا۔

حامد چلا گیا تو استاد چند لمحے خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ اس قدر بڑھ جائے گا۔" انھوں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ یہی جملہ بالکل اسی انداز میں وہ پہلے بھی کہہ چکے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہو اُستاد؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"کچھ نہیں... وقت کیا ہو رہا ہے؟"

"پانچ بجے ہیں۔"

"چلو... تیاری کرو نماز کی۔ صبح ہو گئی ہے۔"

میں خاموشی سے اٹھ آیا۔ وضو کر کے باہر نکلا تو اُستاد میرے منتظر تھے۔ ہم دونوں مسجد کی طرف چل دیے۔ استاد بہت گم صُم دکھائی دے رہے تھے۔ میں بھی خاموش رہا۔ نماز پڑھ کر باہر نکلے تو میں نے واپسی پر پوچھا۔"آج کا کیا پروگرام ہے؟" اپنی بات مجھے خود بھی بُری لگی۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے مجھے حفیظ کی موت کی کوئی پرواہ ہی نہیں تھی... جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔

استاد نے میری بدمزگی بھانپ لی۔"صورتِ حال کو درست پہلو سے دیکھنے کی کوشش کرو برخوردار۔" انھوں نے نصیحت کی۔"حفیظ نے اپنی جان دانستہ قربان کی ہے۔ اس نے اکھاڑے کی آبرو بچانے کے لیے خود کو قربان کر دیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس کی قربانی کو رائگاں نہ جانے دیں۔ سمجھ رہے ہو، میری بات؟"

باغی

معاشرے کی سنگلاخ چٹانوں پر
سفر کرنے والے بیٹے کی داستان

"جی ہاں... سمجھ رہا ہوں۔ لیکن ذہن پھر بھی قبول نہیں کرتا۔"

"یہی تو جذباتیت ہے۔ ہر چیز کو اپنے پسندیدہ نکتۂ نگاہ سے دیکھنا... ہر چیز کو محض اپنے جذبات کے حوالے سے محسوس کرنا..."

"آج کا پروگرام کیا ہے؟" میں نے اُستاد کی بات کاٹ دی۔

"کس سلسلے میں؟"

"مقابلوں کے سلسلے میں۔"

"آج کی بڑی کشتی کے لیے میں جیرے کو میدان میں اُتار رہا ہوں۔" استاد نے جواب دیا۔

"جیرے کو!" میں حیران رہ گیا۔"یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کالی بھیڑ ہے۔"

"ہم یہ بات وثوق سے تو نہیں کہہ سکتے۔" استاد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"ویسے میں اس مقابلے کے بعد ضرور کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔"

"آج کل آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" میں نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"شاید میں زیادہ دُور تک دیکھ کر بات کرتا ہوں۔"

"یقیناً یہی بات ہے۔"

اکھاڑے پہنچتے ہی استاد نے تمام پہلوانوں کو طلب کر لیا۔ استاد نے انھیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ کچھ لوگوں نے دبا دبا سا احتجاج کیا لیکن استاد کے استدلال کے آگے سب کو خاموش ہو جانا پڑا۔

"لاش کل صبح تک مل جائے گی۔ اب ہمیں آج کی کُشتیوں کے لیے تیاری کرنا ہے۔" استاد نے اعلان کیا۔

پہلوان واضح طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ کو استاد کی باتوں نے جذباتی اور پرجوش بنا دیا تھا۔ اب وہ ہر قیمت پر جیتنا چاہتے تھے... جبکہ دوسرے گروہ کے پہلوانوں کے چہرے اُتر گئے تھے۔ وہ

پژمُردہ دکھائی دے رہے تھے۔ پھر استاد نے اس روز کی تین کشتیوں میں حصّہ لینے والوں کا اعلان کر دیا۔
جیرا اپنا نام سُن کر ششدر رہ گیا... شاید اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اُستاد کسی اہم کشتی میں اکھاڑے کی نمائندگی کا فرض اُسے بھی سونپ سکتے ہیں۔ پھر وہ پریشان اور متوحش نظر آنے لگا۔ لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔
کچھ ہی دیر بعد پہلوان لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اُتر آئے۔ ان تینوں کو زور کرانے کے لیے استاد، میں اور رشید پہلوان اکھاڑے میں اترے۔ استاد نے مجھے اشارہ کیا کہ میں جیرے کو زور کراؤں۔ میں خاموشی سے جیرے کی طرف بڑھ گیا۔ کون جانے، اس میں بھی استاد کی کوئی مصلحت ہو۔
وہ صبح تمام صبحوں سے مختلف تھی۔ عام طور پر زور کے وقت تمام پہلوان اکھاڑے کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن اسی روز وہاں زور کرنے والوں کے سوا اِکا دُکا ہی کوئی بیٹھا تھا۔ میں جیرے کو زور کراتا رہا لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی توجہ کسی اور ہی طرف ہے۔ وہ کسی اُلجھن میں مبتلا تھا۔ اس کی اعصابی کشیدگی مجھ پر پوری طرح روشن تھی۔ وہ اس روز بہت اُکھڑا اُکھڑا سا لگ رہا تھا۔
زور سے فارغ ہوتے ہی جیرا کہیں چلا گیا اور استاد مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہاں ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے بھی اُستاد سے اجازت چاہی اور باہر آ کر جیرے کو تلاش کیا... لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا... اور وہ یہ کہ وہ اپنی کسی پُراسرار سرگرمی میں مصروف ہو گا۔ اُس کے نام کا اعلان اُس کے لیے دھماکا خیز ثابت ہُوا تھا۔
ایک رسم ہے کہ موت کے گھر میں پڑوسیوں کی طرف سے کھانا آتا ہے۔ ہم اکھاڑے پہنچے تو زبیری صاحب کی طرف سے کھانا آ چکا تھا۔ زبیری صاحب کے بیٹوں نے دسترخوان بچھایا اور کھانا لگا دیا۔ خود زبیری صاحب ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے۔ یہاں بھوک کسے تھی... لیکن زبیری صاحب اصرار کر کے کھانا کھلاتے رہے۔ ان کی وجہ سے بہرحال کھانا کھا لیا گیا۔ کھانے کے دوران ہی جیرا بھی آ گیا۔ اسے بھی کھانے پر بٹھا لیا گیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میرے جی میں آئی کہ جیرے سے استفسار کروں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ کہیں وہ کھُل کر ہی سامنے نہ آ جائے۔ یہ موقع کم از کم ایسا نہیں تھا۔
کھانے کے بعد سب اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ رات بھر کا جاگا ہُوا تھا، چنانچہ میں سو گیا۔ سو کر اُٹھا تو مقابلے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ اُستاد نے بتایا، ساجن کا آدمی یہ پوچھنے کے لیے آیا تھا کہ مقابلہ ہو گا یا نہیں... اور وہ بے حد مایوس واپس گیا ہے۔
حسبِ سابق اکھاڑے میں اور اکھاڑے کے باہر خاصی تعداد میں سادہ لباس والے گھوم رہے تھے۔ میں گزشتہ روز کی طرح باہر نکل گیا اور گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے شندو حلوائی کی دُکان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے لسی پی کر آیا تو اُستاد مجھے ایک طرف لے گئے۔
"کیا بات ہے اُستاد؟"
"بات یہ ہے برخوردار کہ آج خصوصیت سے تماشائیوں پر نظر رکھنا۔"
"لیکن یہاں سادہ لباس والے اسی لیے تو موجود ہیں۔"
"بحث مت کرو۔ میں جو کہہ رہا ہوں تو کیا بلاوجہ ہی کہہ رہا ہوں۔" استاد جھنجلا گئے۔
استاد اتنے چڑچڑے نہیں تھے۔ ان کی جھنجلاہٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ اُلجھے ہوئے ہیں۔ انھیں کچھ نامعلوم لوگوں کی طرف سے کوئی خدشہ تھا۔ میں فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا۔ "ٹھیک ہے استاد... میں خیال رکھوں گا۔" میں نے کہا۔
اس دوران باقاعدہ تماشائیوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ پھر ساجن کے اکھاڑے والوں کا جلوس آ پہنچا۔ اس جلوس میں اُن کے علاقے کے لوگ بھی خاصی بڑی تعداد میں شامل تھے۔
کچھ دیر بعد شاہنواز استاد کے پاس آیا اور ایک کاغذ اُن کی طرف بڑھا دیا۔ استاد نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور ہم کمروں کی طرف بڑھ گئے۔ میرے کمرے میں پہنچ کر انھوں نے کاغذ مجھے تھما دیا۔ میں نے میز سے قلم اُٹھایا اور استاد کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"شامو کے سامنے دینے کا نام لکھ دو۔" انھوں نے

کہا۔ میں نے کاغذ پر نام گھسیٹ دیا۔ "تحسین کے سامنے رحیم کا... اور نصیرے کے سامنے جیرے کا۔"
میں نے نام لکھ کر کاغذ اُن کی طرف بڑھا دیا۔
"چلو..." انھوں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔
شاہنواز نے کاغذ لے کر ایک نظر ڈالی اور اسے لے کر ساجن کی طرف چلا گیا۔
کچھ ہی دیر بعد مقابلہ شروع ہونے کا اعلان ہو گیا۔ شامو اور دینا اکھاڑے میں اُتر چکے تھے۔ پھر شاہنواز ریفری کے فرائض انجام دینے کے لیے اکھاڑے میں اُتر گیا۔
شامو اور دینے کی کشتی میں بھی گزشتہ روز کی ابتدائی کشتیوں جیسا رنگ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دینا پہلے ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہو جانا چاہتا ہے۔ لیکن شامو اسے طرح دیتا رہا۔ وہ شاید مقابلے کو طول دینے کے موڈ میں تھا۔ لیکن اس چیز نے تاثر مزید خراب کر دیا۔ تماشائی سرگوشیاں کرنے لگے۔ چند منچلوں نے تو "نورا کشتی، نورا کشتی" کے نعرے بھی لگا دیے۔ یہ نعرے سُن کر دینے میں کچھ تیزی آئی لیکن جلد ہی دم توڑ گئی۔ اس مقابلے کا فیصلہ تیسرے راؤنڈ میں ہُوا۔ مقابلہ ختم ہوتے ہی دینا سر جھکائے، مرے مرے قدموں سے باہر نکل آیا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ معمول کے مطابق اکھاڑے ہی میں رہنے کی بجائے وہ کمروں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بے حد شرمسار نظر آ رہا تھا۔
پندرہ منٹ کے وقفے سے دوسری کشتی کا اعلان ہُوا۔ تحسین اور رحیم اکھاڑے میں اُتر آئے۔ اس مقابلے کا ریفری دلبر تھا۔ اس مرتبہ حسبِ روایت دونوں پہلوانوں کے استقبال کے لیے تالیاں نہیں بجیں۔ شاید تماشائیوں کو پچھلی کشتی نے بُری طرح بیزار کر دیا تھا۔ اس وقت وہاں وہ خاموشی بھی نہیں تھی، جو عموماً مقابلے کے آغاز سے ماحول پر طاری ہو جاتی ہے۔ لوگ بے فکری سے ایک دوسرے سے باتیں کیے جا رہے تھے، جیسے انھیں مقابلے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اسی ماحول میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ لوگوں کی بے نیازی برقرار رہی لیکن اس مقابلے نے جلد ہی جمود توڑ دیا۔ کم از کم مجھے وہ کشتی نہیں بلکہ کوئی ذاتی جنگ معلوم ہو رہی تھی۔ رحیم بُری طرح بپھرا ہُوا تھا۔ وہ گھنٹی بجتے ہی تحسین پر یوں ٹوٹ پڑا تھا، جیسے اُسے مار ڈالنے کا ارادہ لے کر اکھاڑے میں اُترا ہو۔ تحسین ابتدا ہی سے مدافعت پر مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن رحیم کے جوش و خروش کے سامنے اس کی مدافعت بھی بے حیثیت ہو کر رہ گئی تھی۔
پہلا راؤنڈ ختم ہوتے ہوتے تحسین نیم جاں ہو کر رہ گیا۔ اس کا سُوجا ہُوا چہرہ خون میں بُری طرح لتھڑا ہُوا تھا۔ تماشائی زبردست ہیجان میں مبتلا تھے۔ ہمارے حامی رحیم کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ تحسین مقابلے سے دستبردار ہونا چاہتا تھا۔ لیکن ایک اجنبی شخص اس کے پاس پہنچا۔ اُن دونوں کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد تحسین نے دلبر کو بتا دیا کہ وہ مقابلہ جاری رکھے گا۔ گھنٹی بجی تو سب دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ وہ لوگ جنھوں نے مقابلے کے ابتدائی حصّے کو نظر انداز کر دیا تھا، اب یقیناً پچھتا رہے ہوں گے۔
دوسرے راؤنڈ کا آغاز پہلے راؤنڈ سے بڑھ کر تھا۔ رحیم کسی چیتے کی طرح تحسین پر جھپٹا تھا۔ اسی وقت مجھے استاد کی بات یاد آ گئی۔ استاد نے کہا تھا کہ تماشائیوں پر خصوصیت سے نظر رکھنا۔ چنانچہ دیر آید درست آید کے مصداق میں مقابلے کو نظر انداز کر کے تماشائیوں کا جائزہ لینے لگا۔ میری نگاہیں ایسے لوگوں کو تلاش کر رہی تھیں جو مقابلے میں دلچسپی نہ لے رہے ہوں۔ لیکن ایسے تمام لوگ سادہ لباس والے تھے۔ ان کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ماحول پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ تماشائیوں کے شور و غل سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کشتی اختتام کو پہنچ رہی ہے۔ اسی دوران کھڑے ہوئے تماشائیوں میں مجھے تیز نقل و حرکت کا احساس ہُوا۔ ساتھ ہی کچھ آوازیں اُبھریں۔ وہ آوازیں... اُدھر شور و غل عام تماشائیوں کے شور سے مختلف تھا، جو رحیم کو بڑھاوے دے رہے تھے۔
میں تیزی سے شور کی سمت میں جھپٹا۔ میرے پہنچتے پہنچتے ایک دھماکا ہو چکا تھا اور مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا تھا۔ مجھے دو آدمی نظر آئے، جو ایک دوسرے سے زور آزمائی کر رہے تھے۔ ان میں سے سادہ لباس پولیس والے کو پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہوئی۔ اس نے دوسرے شخص کا ہاتھ تھام رکھا تھا... جبکہ اس آدمی کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا ریوالور والا ہاتھ پکڑا اور اسے بُری طرح مروڑ دیا۔ دو آوازیں اور ایک چیخ سُنائی دی۔ ایک آواز کلائی کی

ہنسلی ٹوٹنے اور دوسری ریوالور گرنے کی تھی۔ جبکہ چیخ اس شخص کے حلق سے بے اختیار نکلی تھی۔ اب وہ مسلسل چیخے جارہا تھا۔

"کیا بات تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا جی... میں کافی دیر سے اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی حرکات مشکوک نظر آرہی تھیں۔ پھر اس نے ریوالور نکال کر پہلوان کو نشانہ بنانا چاہا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اوپر اٹھا دیا۔"

اس دوران نعروں کی گونج نے مجھے احساس دلایا کہ مقابلہ ختم ہوچکا ہے۔ سادہ لباس والے کا ایک اور ساتھی آچکا تھا۔ وہ ریوالور والے کو گھسیٹتے ہوئے اکھاڑے کے گیٹ کی طرف لے گئے۔ وہ شخص اپنا ہاتھ پکڑے دردناک انداز میں کراہ رہا تھا۔

میں اکھاڑے کی طرف متوجہ ہوا تو کچھ لوگ تحسین کو اٹھا رہے تھے، جو بے ہوش تھا۔ دوسری طرف کچھ لوگوں نے رحیم پہلوان کو کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ ہمارے تمام پہلوان رحیم کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ یہ جوش وخروش کچھ دیر میں ختم ہوگیا۔ وہ کشتی غیر اہم تھی۔ تیسری اور اہم کشتی ابھی باقی تھی۔ تماشائی پھر بے چین نظر آنے لگے۔ کچھ وقفے کے بعد تیسری کشتی کا اعلان ہوا۔ اس بار شاہنواز ریفری تھا۔

تیسرا مقابلہ ہیجانی کیفیت میں شروع ہوا لیکن جلد ہی لوگوں کا جوش وخروش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ دونوں پہلوان برابر کے داؤ لگا رہے تھے۔ لیکن لوگوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ مقابلہ یک طرفہ ہے۔ نصیرا بہت اچھا پہلوان تھا لیکن اس روز وہ نصیرا معلوم نہیں ہورہا تھا۔ اس کے باوجود فیصلہ چوتھے راؤنڈ میں ہوا۔ شاہنواز نے چیرے کو فاتح قرار دیا۔ مقابلے کی بے رنگی کا ثبوت یہ تھا کہ دونوں پہلوانوں کے خراش تک نہیں آئی تھی۔ ساجن کے اکھاڑے والوں کے چہرے اتر گئے تھے لیکن ساجن کے چہرے پر تردد کی کوئی علامت نہیں تھی۔

مقابلے کے بعد پہلوانوں نے جو پال جمالی جبکہ استاد مجھے اور حامد کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آگئے۔

"آؤ بھئی، بیٹھ جاؤ۔" استاد نے ہم دونوں سے کہا۔ "یہ معاملہ بھی تقریباً نمٹ ہی گیا ہے۔ کل اس سے بھی پیچھا چھوٹ جائے گا۔" پھر وہ خصوصیت سے حامد سے مخاطب ہوئے۔ "لاش کے سلسلے میں بات کی تھی؟"

"جی ہاں... کل صبح نو بجے لاش مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" استاد نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "مٹی کی امانت جتنی جلدی مٹی کے سپرد کر دی جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ تفتیش کی گاڑی کہاں تک پہنچی؟"

"فی الحال تو بس گھسٹ ہی رہی ہے۔ کوئی سراغ تو نہیں ملا البتہ قتل کا محرک کچھ کچھ سمجھ میں آرہا ہے۔" حامد نے جواب دیا۔

"گویا تم کسی نتیجے پر پہنچ رہے ہو۔"

"شک تو پہلے بھی تھا لیکن آج کے واقعے نے اُسے یقین میں بدل دیا ہے۔"

"کس واقعے کی بات کر رہے ہو؟"

"آج ایک شخص نے دوسرے مقابلے کے دوران ریوالور نکال کر رحیم پہلوان پر گولی چلانا چاہی تھی۔ اس سے پہلے ہی اُسے پکڑ لیا گیا۔ اس وقت وہ تھانے میں ہے اور اس سے یقیناً قیمتی معلومات حاصل ہوں گی۔"

"تو اب تمھارا کیا خیال ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ کوئی آپ کے پہلوانوں کو دھمکیاں دے رہا ہے۔" حامد نے خیال آرائی کی۔

"کس سلسلے میں؟" استاد نے پوچھا۔

"یہ بات عام ہے کہ ایسے مقابلوں پر شرطیں لگائی جاتی ہیں۔ عموماً وہ چھوٹی رقمیں ہوتی ہیں لیکن اس بار شاید اس سلسلے میں بڑی بڑی رقمیں لگ گئی ہیں۔ کوئی گروہ اپنی رقم بچانے کے لیے ان پہلوانوں کو قتل کی دھمکیاں دیتا ہے، جن کے خلاف اس نے شرطیں لگا رکھی ہیں۔"

"لیکن یہاں بات دھمکیوں تک محدود نہیں رہی۔" میں نے نکتہ اٹھایا۔

"اسی سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شرطیں بہت تگڑی ہیں۔" حامد نے کہا۔

میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ اُن کے لبوں کی مُسکراہٹ بتا رہی تھی کہ حامد جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ ان کے اندازوں کے مطابق ہی ہے۔ "لیکن یہ تو مفروضہ ہے کہ ہمارے پہلوانوں کو دھمکیاں دی جارہی تھیں۔ ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"ثبوت بھی مل جائے گا۔" حامد نے بے پروائی سے کہا۔ پھر وہ استاد سے مخاطب ہوا۔ "میں حنیف کے قتل کے سلسلے میں خود تفتیش کرنا چاہتا ہوں بس، آپ کی اجازت درکار ہے۔"

"اجازت کی کیا بات ہے۔ میں تمھارے کام میں مداخلت کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔" استاد نے جواب دیا۔

"مجھے تمام پہلوانوں سے بیانات لینے ہوں گے۔"

"ضرور لو۔ کب کرنا چاہتے ہو یہ کام؟"

"آج... ابھی..."

"ٹھیک ہے۔ میں یہ جاننے کے لیے بے تاب رہوں گا کہ تمھاری تفتیش میرے اندازوں کی کس حد تک تائید کرتی ہے۔" استاد نے کہا۔ "جاتے وقت مجھ سے ضرور ملتے جانا۔"

"جی، بہت بہتر۔" حامد اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔

"گویا تم نے کچھ اندازے بھی قائم کر رکھے ہیں استاد؟" حامد کے جاتے ہی میں نے کہا۔

"ظاہر ہے... اپنے گرد وپیش سے لاتعلق تو نہیں رہ سکتا۔"

"لیکن مجھے ان اندازوں کی بھنک بھی نہیں ملی۔" میرا لہجہ شکایت آمیز تھا۔

"مناسب نہیں سمجھا۔" استاد نے مختصراً کہا۔ "شک کرنا تو فطری ہے... لیکن بات جب تک یقین کی منزل میں داخل نہ ہوجائے، اس کا اظہار بے سود ہوتا ہے۔"

استاد کی بات معقول تھی۔ میں ان کی طبیعت سے واقف تھا... ورنہ غیریت کا احساس کیے بغیر نہ رہتا۔ "لیکن اب تو آپ اس سلسلے میں مجھ سے گفتگو کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اب تو بات یوں بھی سامنے آہی جائے گی۔ آخری لمحوں میں بے صبری کیوں کرتے ہو۔"

میں خاموش ہوگیا۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد نصیب نے آکر اطلاع دی کہ کھانے پر انتظار ہورہا ہے۔ ہم اُٹھ کر باہر چلے آئے۔ رات کا کھانا غیاث الدین صاحب کی طرف سے آیا تھا جو ساتھ والی گلی میں رہتے تھے۔ حامد، پہلوانوں سے بیان لینے میں مصروف تھا۔ کھانے کے لیے اس نے وقفہ کر دیا۔ پھر استاد کے اصرار پر وہ بھی ہمارے ساتھ آبیٹھا۔ کھانے سے فارغ ہوکر حامد نے پھر تفتیش شروع کر دی۔ استاد مجھے ساتھ لے کر باہر نکل آئے۔ ہمارا رُخ مٹھو حلوائی کی طرف تھا۔ راستے میں بے شمار لوگ ملے۔ وہ ہمیں سلام کرتے، مزاج پوچھتے اور پھر حنیف مرحوم کے سلسلے میں پُرسا دیتے۔ ان کے انداز میں، لہجوں میں احترام ہوتا۔ الفاظ تو وہی رسمی سے ہوتے، جو ایسے موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن لہجوں سے اُن کے تعلقِ خاطر کا پتہ چلتا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے، ایسے موقعوں پر ہمیشہ لگے بندھے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے کہ موت ایک ایسی اٹل حقیقت بھی ہے، جس سے مفر ممکن نہیں ہے... اور ایسا المیہ بھی ہے جس کے کرب میں ہر شخص، دوسرے شخص کے ساتھ شریک ہونا چاہتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اسے خود بھی اس المیے سے دوچار ہونے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ پھر یہ بھی طے ہے کہ کوئی جذبہ... اور کیفیت، جس قدر شدید ہوگی، اس کے لیے اتنے ہی محدود الفاظ... اور وہ بھی بہ زار دقت میسر آئیں گے۔ اگر دُنیا میں شاعر اور ادیب نہ ہوتے تو شاید انسان، اظہار کے سلسلے میں گونگا ہی رہ جاتا۔

ہم مٹھو کی دُکان پر پہنچ گئے۔ مٹھو نے بھی، ہماری سماعت کو تعزیتی مرحلے سے گزارا۔ استاد نے اُسے لسی بنانے کو کہا... اور وہ لسی بنانے میں معروف ہوگیا۔ استاد کے لیے وہ خاص طور سے لسی بناتا تھا۔ اس میں وہ پانی بالکل نہیں ڈالتا تھا... وہ خالص دودھ اور دہی کی لسی ہوتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ استاد میٹھا بہت ہلکا پسند کرتے ہیں۔

"اب بتاؤ برخوردار... کیا پروگرام ہے تمھارا؟" استاد نے بنچ پر بیٹھتے ہی پوچھا۔

"میرا پروگرام تو تمھارے حکم سے مشروط ہے استاد۔" میں نے کہا۔

"کل کے لیے تیار ہوجاؤ۔ کل تمھیں اکھاڑے میں اُترنا ہوگا۔"

"مجھے تیار کیا ہونا ہے۔ میں تو بے تاب ہورہا ہوں۔ بڑا عرصہ ہوگیا۔ ہاتھ پیروں کو زنگ لگنے لگا ہے۔"

استاد کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ "فی الحال تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کل کی اہم کشتی کے لیے ساجن مقابلے میں کسے اُتارے گا۔" کچھ دیر بعد انھوں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ وہ خاصے فکرمند دکھائی دے رہے تھے۔

"لیکن ضروری نہیں کہ کل کا اہم مقابلہ تم ہی کرو۔ حریف کا نام سامنے آنے پر ہی فیصلہ کریں گے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد انھوں نے مزید کہا۔

"نہیں استاد... کل کا دن میرا دن ہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ حریف کون ہوگا۔ میں عضوِ معطل بن کر رہنا پسند نہیں کرتا۔"

"تم یہ بھول رہے ہو کہ میرے دستِ راست ہو۔" استاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یوں خود کو عضوِ معطل قرار دے کر تم میرے پورے جسم کی توہین کر رہے ہو۔ بہتر ہے کہ اپنے الفاظ واپس لے لو۔"

"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔" میں بھی ہنس دیا۔ "ویسے استاد... تمھاری حاضر جوابی کا بھی جواب نہیں۔ گھما پھرا کر بالآخر اپنی بات منوا ہی لیتے ہو۔"

"آخر استاد کس کا ہوں۔"

اتنی دیر میں مٹھو نے لسی کا بڑا سا جگ اور دو پیالے لا کر سامنے رکھ دیے۔ "ملائی شلائی بھی ڈالی ہے، مٹھو میاں؟" استاد نے پوچھا۔ "جانتے ہو، کل برخوردار جمال اکھاڑے میں اترنے والا ہے۔"

"استاد مجو کے لیے تو میں خاص طور پر لسی بناتا ہوں۔ ویسے آپ کے لیے دکان حاضر ہے۔" مٹھو نے فخریہ لہجے میں کہا۔ پھر اپنے لڑکے کو آواز لگائی۔ "اوئے ملائی اتار... اور پیالے میں ڈال کر دے آ۔" اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "استاد نے تو بڑی زوردار خبر سنائی ہے۔" اس نے کہا۔ "کل میں ضرور آؤں گا۔ اکھاڑہ... کل تو رنگ جمے گا۔"

میں محجوب سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ ایسے مرحلے مجھے ہمیشہ گراں گزرتے تھے۔

استاد نے پیالوں میں لسی انڈیلی... اور ایک پیالہ میری طرف بڑھا دیا۔ "لو برخوردار... مٹھو کی لسی پیو... اور جان بناؤ۔" انھوں نے کہا۔

ہم دونوں نے لسی کے دو دو پیالے پیے... اور وہاں سے اٹھ آئے۔ اب ہمارا رخ اکھاڑے کی طرف تھا۔ اس مرتبہ راستے میں جو بھی ملا، استاد نے اسے، میرے، اکھاڑے میں اترنے کی نوید سنا دی۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ ان معاملوں میں تو بے حد رازداری سے کام لیا جاتا ہے جبکہ استاد مقابلے سے تقریباً ۲۴ گھنٹے

پہلے ہی یہ اعلان کر رہے تھے۔ مجھے تو اپنا اکھاڑے میں اترنا ہی مشکوک نظر آنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی استاد کی کوئی چال ہے۔ لیکن میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ مقابلہ کیے بغیر نہیں رہوں گا۔ استاد مجھے اتنی آسانی سے نہیں ٹال سکیں گے۔

ہم اکھاڑے واپس آئے تو دس بج چکے تھے۔ حامد بدستور تفتیش کا دفتر کھولے بیٹھا تھا۔ اس نے استاد کے کمرے ہی میں ڈیرہ جما رکھا تھا۔ وہ فرداً فرداً ہر پہلوان کو بلا کر اس کا بیان لے رہا تھا۔ جو پہلوان سوال و جواب سے فارغ ہو چکے تھے، وہ اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے تھے۔ جو پھنسے ہوئے تھے، وہ جمائیاں لے رہے تھے لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔

"تو تم نے میرے کمرے میں اپنا دفتر قائم کر لیا؟" استاد نے مذاقاً کہا۔

حامد اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ آجائیں... میں کسی اور کمرے میں چلا جاتا ہوں۔"

"ارے نہیں... میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔"

"آپ آجائیے نا..."

"نہیں بھئی... میں تمھارے معاملات میں دخل دینا پسند نہیں کرتا۔ تم آزادی سے اپنا کام کرو۔ میں جمال کے کمرے میں جا رہا ہوں۔" استاد نے زور دے کر کہا۔ یہ گویا حامد کے لیے پیغام تھا کہ وہ فارغ ہو کر وہیں آجائے۔ پھر استاد میرے کمرے میں چلے آئے۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد حامد بھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کئی کاغذ تھے۔

"کہو بھئی کیا رہا؟" استاد نے پوچھا۔

حامد بغیر کچھ کہے پلٹا... اور اس نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ پھر وہ کمرے میں چلا آیا اور بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ "میں نے ہر شخص کا بیان لے لیا ہے۔" اس نے بتایا۔ میں نے پوچھا کہ حفیظ کے قتل کے سلسلے میں انھیں کس پر شبہ ہے [illegible]

"تو کس کس پر شبہ ظاہر کیا گیا؟"

"تمام ووٹ صرف دو خوش نصیبوں میں تقسیم [illegible]" حامد نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"ان خوش نصیبوں کے نام بتاؤ۔" استاد نے

"ایک تو میرا ہے... اور دوسرا آپ کا برخوردار۔" اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔ "جمال۔"

"اوہ... مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔" استاد بولے۔ "لیکن کام کی معلومات شاید تم فراہم نہیں کر سکو گے؟"

"کیسی معلومات؟ آپ حکم تو کریں۔"

"ظاہر ہے۔ یہ تو تمھیں یاد نہیں رہ سکتا کہ کس نے تیرے پر شبہ کیا... اور کس نے جمال پر۔"

"جی ہاں... یاد تو نہیں رہ سکتا لیکن میں بتا سکتا ہوں۔"

"عجیب سی باتیں کر رہے ہو..."

"آپ کا شاگرد ہوں میں بھی... داؤ پیچ کے معاملے میں نہ سہی۔" حامد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے ان تمام افراد کی الگ الگ فہرست بنا لی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے استاد کی طرف دو کاغذ بڑھا دیے۔

استاد نے تحسین آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر وہ اوپر والے کاغذ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چند لمحے وہ کاغذ پر نظر دوڑاتے رہے، پھر انھوں نے نیچے والا کاغذ اوپر کر دیا۔ اور اس کا جائزہ لینے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے وہ دونوں کاغذ میری طرف بڑھا دیے۔ میں نے حامد کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا۔

"اصولاً تو یہ تمھیں نہیں دکھائے جا سکتے۔" حامد نے سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ زیرِ تفتیش قتل کے کیس میں تم مشتبہ افراد میں شامل ہو لیکن..."

"کیا بات کر رہے ہو۔" استاد بھڑک اٹھے۔ "جمال پر شبہ کیا جا سکتا ہے کیا؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں شبہ کر رہا ہوں۔" حامد نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ "بہرحال کچھ لوگوں نے شبہ ظاہر کیا ہے..."

"انھوں نے شبہے کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی؟"

"ظاہر ہے۔"

"ذرا میں بھی تو سنوں؟"

"وہ کہتے ہیں کہ دو تین روز پہلے جمال کا حفیظ سے جھگڑا ہوا تھا... سرِ بازار ہاتھا پائی کی نوبت آگئی تھی... اور حفیظ نے جمال کو دھمکیاں دی تھیں۔"

"جمال نے تو حفیظ کو دھمکیاں نہیں دی تھیں نا؟" استاد کے لہجے میں طنز تھا۔ وہ بہت خفا نظر آ رہے تھے۔

اس معاملے میں وہ اتنے جذباتی ہو گئے تھے کہ انھوں نے حامد کے انداز پر غور کرنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ حامد کا انداز میرے لیے معاندانہ ہرگز نہیں تھا۔ اس کے باوجود استاد بری طرح بپھر گئے تھے... اور یہ ان کی مجھ سے محبت کا ثبوت تھا۔

"استاد..." میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم بیچ میں مت بولو برخوردار۔" استاد نے مجھے ڈانٹ دیا... اور حامد سے مخاطب ہوئے۔ "ہاں تو آگے چلو ایس پی صاحب..."

"استاد، آپ نے مجھے بات تو پوری کرنے ہی نہیں دی۔" حامد نے شکایتاً کہا۔ "میں جمال سے کہہ رہا تھا کہ اصولاً میں وہ فہرست اسے نہیں دکھا سکتا کیونکہ یہ اس پر قتل کے سلسلے میں شبہ کرنے والوں کی فہرست ہے لیکن اس لیے دکھا رہا ہوں کہ وہ میری نظر میں اس قتل سے لاتعلق ہے۔ آپ بات بیچ میں سے ہی لے اڑے... اور دیکھتے ہی دیکھتے بات کا رخ تبدیل کر کے رکھ دیا۔"

"تو یوں کہو نا۔" استاد ڈھیلے پڑ گئے۔

"بات یہی تھی استاد۔ آپ خواہ مخواہ جذباتی ہو گئے۔" میں نے کہا۔

"لو بھئی، یہ بھی اچھی رہی۔" استاد نے مجھے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ "جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔"

"نہیں استاد، یہ بات نہیں۔ روایتی تفتیش کے مطابق تو سب سے مشکوک آدمی میں ہی ہوں۔ موت سے دو دن پہلے حفیظ سے میری جھڑپ... دھمکیاں... اور پھر اس کی لاش دریافت بھی میں نے ہی کی تھی۔"

"چلو۔ یک نہ شد، دو شد۔" استاد نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو یار، تم یہ فہرستیں دیکھو۔" حامد نے مجھ سے کہا۔ "استاد کو میں سمجھاتا ہوں۔"

میں فہرستوں کی طرف متوجہ ہوا اور حامد استاد کو صورتِ حال کے متعلق بتانے میں مصروف ہو گیا۔ مجھ پر شبہ کرنے والے پہلوانوں کی تعداد صرف نو تھی۔ ان میں صرف ایک پہلوان سینیئر تھا، باقی سب نوآموز پٹھے تھے۔ سینیئر پہلوان، نواز تھا۔ اس کا تعلق سیالکوٹ سے تھا، اور اس کی جیرے سے گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک خاص بات

یہ تھی کہ مجھ پر شبہ کرنے والوں میں جیرے کا نام شامل نہیں تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ موقع ملتے ہی اس سلسلے میں حامد سے پوچھوں گا کہ جیرے نے کیا بیان دیا ہے۔ دوسری فہرست خاصی طویل تھی۔ میں نے اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ چند ایک بڑے پہلوانوں کو اور مجھ پر شبہ کرنے والوں کو چھوڑ کر اس میں اکھاڑے کے تقریباً سبھی پہلوانوں کے نام شامل تھے۔ میں نے فہرست سے نظر ہٹائی اور استاد کی طرف متوجہ ہو گیا، جواب مسکرا رہے تھے۔ حامد نے بالآخر انھیں رام کر ہی لیا تھا۔

"جیرے نے کیا بیان دیا ہے؟" میں نے حامد سے پوچھا۔ "اتنا تو مجھے پتہ چل گیا ہے کہ اس نے کسی پر شبہ ظاہر نہیں کیا ہے۔"

"اس سوال کا جواب دے دوں استاد؟" حامد نے شریر لہجے میں استاد سے پوچھا۔

"تمھاری مرضی ہے۔ میں تم دونوں کے معاملے میں دخل نہیں دے سکتا۔"

"واہ... پہلے تو ہم دونوں کے معاملے میں مجھے خوب ڈانٹ لیا اور اب یہ بات کہہ رہے ہیں۔" حامد نے کہا... پھر استاد کے تیور بھانپ کر جلدی سے بات کا رُخ بدل دیا۔ "ٹھیک ہے، بتاتا ہوں۔ جیرے کا بیان ہے کہ اُسے کسی پر شک نہیں ہے۔ اس نے یہ بات خاص طور پر زور دے کر کہی کہ حفیظ کے قتل میں کم از کم ہمارے اکھاڑے والوں کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ یہی بات آپ کے چند سینیئر پہلوانوں نے بھی کہی ہے۔"

"جیرے کو تو یہ بات کہنا ہی چاہیے تھی۔" استاد نے تبصرہ کیا۔

حامد نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"اور جیرے پر شبہ ظاہر کرنے والوں نے کیا جواز پیش کیا؟" استاد نے پوچھا۔

"بہت دلچسپ بات ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاید یہ گدی نشینی کا چکر ہے۔ جیرا گدی میں بہت دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کی یہ دلچسپی بھی بلاوجہ معلوم نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ بدمعاشوں کا کوئی گروہ اکھاڑے کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اور انھوں نے جیرے کو آلۂ کار بنا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استاد نے جمال کو اپنا جانشین بنایا تو جیرے نے جمال کو چیلنج کر دیا۔ اگر وہ جیت گیا ہوتا تو آج اکھاڑے کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔"

"معقول بات ہے۔" استاد نے سر ہلا کر کہا۔ "پہلوانوں میں منطقی شعور کا اس حد تک ارتقا حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے... اور تمھارا کیا خیال ہے اس سلسلے میں؟"

"جیرا مشکوک تو معلوم ہوتا ہے۔" حامد نے کہا۔ "لیکن میں اُسے قاتل نہیں سمجھتا۔ حفیظ کا قتل، شرطوں والے سلسلے کی ایک کڑی تھی ہے شاید... میرا خیال ہے۔ دو ایک روز میں مجرم سامنے آجائیں گے۔"

"میں بھی تم سے متفق ہوں۔" استاد نے کہا، پھر انھوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "ذرا یہ فہرستیں مجھے دینا۔"

میں نے فہرستیں انھیں تھما دیں۔ وہ چند لمحے کاغذوں پر نظریں دوڑاتے رہے۔ پھر ان کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ اُبھر آئی۔ حامد استاد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "خیریت تو ہے استاد... یہ مسکراہٹ معنی خیز معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں... دراصل میں خود کو داد دے رہا ہوں۔"

"ہمیں بتائیں تو ہم بھی داد دیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے اندازہ لگایا تھا کہ کون وفادار ہے... اور کون غدار۔" استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال صدفی صد درست ثابت ہوا ہے۔ حفیظ کو میں نے پہلے دن سے ہی وفاداروں میں شمار کیا تھا... اور وہ مر کر اپنی وفا ثابت کر گیا۔ یہ فہرستیں میرے اندازے کی تائید کرتی ہیں۔ حامد، حفیظ کے قاتلوں کو جلد از جلد بے نقاب کرو تاکہ انھیں اپنے کیے کی سزا مل سکے۔ حفیظ کا خون رائگاں نہیں جانا چاہیے۔"

"انشاء اللہ استاد، ایسا ہی ہوگا۔" حامد نے بڑے یقین سے کہا۔ "میں ان کے لیے جال بچھا رہا ہوں۔"

"میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔" استاد کے لہجے میں خلوص تھا۔

"اچھا استاد، اب میں چلتا ہوں۔" حامد اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے خدا حافظ کہا۔ استاد اسے گیٹ تک چھوڑنے چلے گئے تھے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بج چکے تھے... اور صبح جلدی اٹھنا تھا۔

زور بھی کرنا تھا، کیونکہ اگلے روز زورِ بازو کی آزمائش ہونا تھی۔ استاد، حامد کو چھوڑ کر آئے تو چند لمحوں کے لیے میرے کمرے میں رُکے۔ انھوں نے صبح کے متعلق کچھ ہدایات دیں اور خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ میں نے دروازہ بند کیا اور بستر پر لیٹ گیا... بہت مصروف دن گزرا تھا۔ میں تھکا ہوا تھا... اور وقت بھی زیادہ ہو چکا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ مجھے لائٹ آف کرنے کا بھی ہوش نہ رہا۔

صبح استاد نے دروازہ پیٹ پیٹ کر مجھے بیدار کیا۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے زور کیا۔ استاد نے خود مجھے زور کرایا۔ انھوں نے باقاعدہ اعلان بھی کر دیا کہ تیسرے دن کی اہم کشتی میں، اکھاڑے کی نمائندگی میرے ذمے ہے۔

زور کے بعد ناشتہ کیا گیا۔ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اسپتال سے ایمبولینس آگئی۔ وہ حفیظ کی لاش لے کر آئے تھے۔ ایمبولینس کے آتے ہی محلے کے لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ استاد رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوئے تھے۔ رات خود جا کر انھوں نے گورکن سے رابطہ قائم کیا تھا اور قبر کھدوائی تھی۔ تدفین میں، پوسٹ مارٹم کی وجہ سے ویسے بھی کافی دیر ہو گئی تھی۔ استاد مزید تاخیر نہیں چاہتے تھے، کیونکہ تدفین میں تاخیر، سنا ہے مردے کے لیے اذیت کا باعث ہوتی ہے۔

پھر غسل کا مرحلہ آیا۔ استاد خود غسال کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ اس دوران اکھاڑے میں دریاں بچھا دی گئی تھیں اور قرآن خوانی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ قرآن خوانی میں پہلوان بھی شریک تھے... اور محلے والے بھی... خواتین کی قرآن خوانی پڑوس کے ایک گھر میں ہو رہی تھی۔

ساڑھے آٹھ بجے تک حفیظ کو اس کے آخری سفر کے لیے تیار کر دیا گیا۔ پھر منہ سے کفن ہٹا دیا گیا تاکہ آخری دیدار کی رسم پوری ہو سکے۔ حفیظ کے چہرے پر بلا کی رونق تھی۔ وہ عجیب شے تھی۔ حفیظ گزشتہ روز مرا تھا... لیکن گریہ وزاری دوسرے دن ہو رہی تھی۔ رشید پہلوان کا تو برا حال تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ محلے کے لوگ بھی سوگوار تھے لیکن ان میں سب سے برا حال ٹیلر ماسٹر برکت کا تھا۔ آدمی کی اچھائیاں اور برائیاں اس کے مرتے ہی سامنے آنے لگتی ہیں۔ حفیظ محلے والوں کے... اور بازار میں دکانداروں کے کام آتا رہتا تھا۔ وہ محلے کے شریف النفس لیکن کمزور لوگوں کے لیے تحفظ کی علامت تھا۔ دوسری طرف وہ دکانداروں کو بھتہ وصول کرنے والوں سے نجات دلایا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر شخص اسے ہمیشہ کے لیے الوداع کہتے ہوئے سوگوار تھا۔

جنازہ اُٹھا تو گویا محلے میں کہرام مچ گیا۔ حفیظ کو آخری بار کاندھوں پر اٹھانے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بارہا کندھوں پر اٹھایا جا چکا تھا... لیکن ہمیشہ اسے اٹھانے والوں کی آنکھوں میں مسکراہٹ اور ہونٹوں پر نعرے ہوا کرتے تھے۔ لیکن آج سب سوگوار تھے۔ ان کی آنکھیں اشکبار تھیں... اور ہونٹوں پر آہیں تھیں۔ جنازہ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ کندھے تیزی سے بدلے جا رہے تھے۔ بالآخر ہم قبرستان پہنچ گئے۔ قبر تیار تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے حفیظ کو منوں مٹی کے نیچے اتار دیا گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ بے چارہ انسان عمر بھر اپنی تکمیل کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اسے کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ اس کی تکمیل قبر میں اتر کر ہی ہوتی ہے۔ میں اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا۔

اب حفیظ کو مٹی دی جا رہی تھی۔ اُسے مٹی دیتے ہوئے میرا دل بھر آیا۔ وہ درحقیقت بہت اچھا انسان تھا۔ دل کا بے حد صاف... اس کی مجھ سے تلخی ہوئی تھی... لیکن اپنی غلطی محسوس کرتے ہی وہ بلا جھجک معافی مانگنے میرے پاس چلا آیا تھا۔ پھر اس کی آخری کشتی... وہ مقابلہ بہت سخت تھا۔ اتنے سخت مقابلے کے بعد ہارنا توہین کا باعث نہیں ہوا کرتا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا، اس حال میں مزید لڑنے کی کبھی ہمت نہ کرتا، لیکن وہ حفیظ تھا... استاد سے محبت کرنے والا... خود کو اکھاڑے کی آبرو کا محافظ سمجھنے والا... اس نے اپنا کیریئر اور اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دی تھی... اور وہ سرخرو ہوا تھا۔ اس ایک لمحے میں مجھے کیا کیا یاد آ گیا۔ میں نے سر جھٹک کر گویا اس کی یادوں کو جھٹکنا چاہا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں اکیلا میں ہی نہیں تھا۔ ہر شخص کا یہی حال تھا۔ پھر فاتحہ پڑھی گئی... اور سب لوگ حفیظ کو اس اندھیرے گھر میں تنہا چھوڑ کر واپس چل دیے۔

اب جو کچھ ہونا تھا... حفیظ کو جس امتحان سے گزرنا تھا' وہ اللہ رب العزت سے اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ قبر ویران اور اندھیر اگھر سہی' لیکن انسان کے لیے کتنا بڑا پردہ ہے۔ انسان کو سب سے بڑی بے پردگی سے بچا لیتی ہے۔ اللہ تعالٰی خود ہی سب سے بڑا پردہ رکھنے والا اور ستار ہے۔

انہی سوچوں میں غلطاں میں دیگر لوگوں کے ہمراہ اکھاڑے لوٹ آیا۔ اس روز میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ آدمی کو کسی بھی قسم کا مقابلہ درپیش ہو' اس طرح کی ذہنی کیفیت اُس کے لیے بے حد مخدوش ثابت ہوتی ہے۔ میرا معاملہ تو ویسے بھی بہت مشکل تھا کیونکہ مجھے جسمانی مقابلہ کرنا تھا۔ جسمانی مقابلے کے لیے ذہنی طور پر مستعد ہونا بہت اہم ہوتا ہے۔ داؤ پیچ حساب کتاب کر کے نہیں لگائے جاتے... اتنی مہلت ہی نہیں ہوتی۔ ایسے مقابلوں میں تو ذہن اور اعضا کے درمیان مکمل ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوچا... اور عمل کیا... سوچ اور عمل کے درمیان ایک لمحے کا فاصلہ بھی مخدوش ثابت ہو سکتا ہے۔

اس وقت ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں اکھاڑے پہنچتے ہی اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بستر پر لیٹ کر میں نے کوشش کی کہ تھوڑی دیر سو جاؤں۔ رات بھی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ شام کے مقابلے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پرسکون ہونا ضروری تھا۔ میں ذہن سے اس بے نام مایوسی اور پژمردگی کو جھٹک دینا چاہتا تھا کہ جسم کو کچھ آرام مل سکے۔ لیکن نیند کا آنکھوں میں نام و نشان تک نہیں تھا۔ پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد میں نے بالآخر ہار مان لی... اور باہر نکل آیا۔ اکھاڑے میں لوگ ٹولیوں کی صورت بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کا جائزہ لیا۔ اُن میں اُستاد نظر نہیں آئے۔ میں چند لمحے کٹی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر ڈولتا رہا۔ پھر اکھاڑے سے نکل آیا۔ ارادہ تھا کہ چہل قدمی کروں گا۔ ممکن ہے' اس طرح ذہنی کیفیت سدھر جائے۔

میں بغیر سوچے سمجھے چلتا رہا۔ کچھ آگے جا کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ دونوں جانب کھیت تھے اور آگے نہر تھی۔ میں نہر کی طرف چلتا رہا۔ اچانک آبشیں ابھریں... اور دائیں جانب سے چھ مسلح افراد نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں موجود رائفلوں کا رُخ میری طرف تھا۔ انھوں نے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ میں اُن کی صرف آنکھیں ہی دیکھ سکتا تھا۔ اُن میں بلا کی سفاکی تھی۔

میں بے خوف نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھتا رہا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ یہ اتفاق ہے یا یہ لوگ مجھے ہر حال میں گھیرنے کی کوشش کرتے۔ اگر میں اکھاڑے میں ہی رُکا رہتا' تو یہ لوگ کیا کرتے... میں سوچتا رہا۔ لیکن میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اب ایک ہی صورت تھی۔ مجھے اپنی مطلوبہ معلومات انہی لوگوں سے حاصل ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ میں نے اُن میں سے ایک کو سوال و جواب کے لیے چُن لیا۔ وہ قد کاٹھ میں ان سب سے زیادہ تھا۔ "کیوں بھئی' کیا معاملہ ہے؟" میں نے تاؤ دلانے والے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "یہ کس کی برات ہے۔ یہ پٹاخے والی چیزیں لے کر کہاں کے لیے نکلے ہو؟" میں نے رائفلوں کی طرف اشارہ کیا۔

"برات تو تمھاری ہی ہے شہزادے۔" اس نے تپ کر کہا۔ "یہ الگ بات کہ تم بے خبر ہو۔"

"یہ میری برات نہیں ہو سکتی۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میری برات میں پردہ پوش خواتین کا کیا کام؟"

"بہت بڑھ چڑھ کر بول رہا ہے لونڈا۔" اس نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کو مخاطب کیا۔ "کیا خیال ہے... پتّا صاف کر دیں۔"

"نہیں۔" اس کا ساتھی بولا۔ اس کی آواز بہت باریک تھی۔ "صبر سے کام لو۔ ہمیں اپنا مقصد نہیں بھولنا چاہیے۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو... لیکن معمولی سی ٹھکائی سے اس کا کیا بگڑ جائے گا۔"

"نہیں... پہلے اس سے بات کرو۔ بات نہ بنی تو ٹھکانے لگانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔" باریک آواز والے نے کہا۔

صورتِ حال سنگین تھی۔ لیکن میری ذہنی کیفیت اب تھی کہ یہ صورتِ حال اس کے لیے دوا بن گئی۔ میری پژمردگی ہوا ہو گئی اور نہ جانے کیوں میں خود کو بے حد تر و تازہ اور ہشاش بشاش محسوس کرنے لگا۔ اب تک میں نے ان کی خرافات خاموشی سے سُنی تھی لیکن اب زبان میں کھجلی ہونے لگی تھی۔ "میری مانو تو مجھے فوراً ہی ٹھکانے لگا دو کیونکہ میں تم لوگوں سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" میں نے قوی الجثہ نقاب پوش کو مخاطب کیا۔

"زندگی سے اتنے ہی بیزار ہو؟" اُس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں نہر تک چھلانگ لگانے کا ارادہ کر کے آیا تھا۔"

"بیزاری کی کوئی خاص وجہ؟" باریک آواز والے نے پوچھا۔

"ہاں... کل میری محبوبہ کسی اور کی منکوحہ بن گئی ہے۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر عاشقانہ لہجے میں کہا۔

"یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟" قوی الجثہ شخص نے اُلجھن آمیز لہجے میں اپنے ساتھی سے پوچھا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "تمھارا دماغ خراب ہے کیا؟"

"بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے اُسے ڈانٹ دیا۔ "میں چہل قدمی کے لیے نکلا ہوں' جاؤ اپنا راستہ لو۔"

"ہم تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔" باریک آواز والے نے کہا۔ لہجہ نرم تھا۔

"کس خوشی میں... میں تو تمھیں جانتا بھی نہیں۔"

"دیکھو' وقت ضائع نہ کرو۔" اس بار اس کے لہجے میں درشتی تھی۔ "کہیں تم ان رائفلوں کو کھلونا تو نہیں سمجھ رہے ہو؟"

"ہرگز نہیں۔ خیر' پہلے تم اپنا تعارف تو کراؤ۔"

"چہرے پر نقابیں باندھنے والے اپنا تعارف نہیں کراتے۔" قوی الجثہ نقاب پوش نے پھر ٹانگ اڑائی۔ "ہم صرف گولیوں کی زبان میں تعارف کرا سکتے ہیں۔"

"میں نے تم سے تو نہیں پوچھا تھا۔" میں نے اُسے آنکھیں دکھائیں۔

اس نے رائفل سیدھی کر لی... اور میری طرف بڑھنا ہی چاہ رہا تھا کہ باریک آواز والے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "دماغ ٹھنڈا رکھو۔" اس نے سرد لہجے میں اس سے کہا۔ "اور بہتر ہے کہ مجھے بات کرنے دو۔" پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "ہاں جوان... میرا مشورہ ہے کہ ناممکن قسم کے مطالبے نہ کرو۔ ویسے بھی تم مطالبے کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم اپنا تعارف نہیں کرا سکتے۔"

"چلو... یہی بتا دو کہ تم چاہتے کیا ہو؟"

"آدمی جی دار ہو۔" اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "بہرحال' ہم جانتے ہیں کہ ساجن اور تجو کے اکھاڑوں کے درمیان چیلنج کا آخری دن ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آج کے آخری اور اہم مقابلے کے لیے تم اکھاڑے میں اُترو گے۔ بس' ہم اسی سلسلے میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو جلدی سے کر لو نا... مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

"واپس جانے کے متعلق اتنے یقین سے مت کہو۔" قوی الجثہ نقاب پوش نے پھر ٹانگ اڑائی۔

باریک آواز والے نے ملامت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا... لیکن مُنہ سے کچھ نہ کہا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "مطلب کی بات سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمھیں اپنی زندگی سے کتنا پیار ہے۔" اس نے کہا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" میں نے اُلجھنے کی سی اداکاری کی۔ "اب تک یہ جاننے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"یہ ذہن میں رکھ کر سوچو کہ آج تم دن کی آخری دھوپ دیکھ رہے ہو۔ کل کا سورج تمھارے لیے طلوع نہیں ہو گا۔ اب بتاؤ کہ آج کا غروبِ آفتاب دیکھنا چاہتے ہو یا نہیں۔"

"انسان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔" میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ وہ قیامت کے بور یے سمیٹے۔ لوگ آبِ حیات کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ میں بھی جینا چاہتا ہوں' لیکن مہلت صرف آج تک کے لیے ہے تو میں اسی وقت مرجانا پسند کروں گا۔ محض چند گھنٹوں سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے تم اب بھی معموں میں بات کر رہے ہو۔ اس وقت مروں یا شام کو مروں' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"پڑتا ہے۔" باریک آواز والے نے کہا۔ "اس وقت تم ہماری گولی کا نشانہ بنو گے' جبکہ شام کو کوئی پہلوان تمھارے ہاتھ پاؤں توڑ کر تمھیں موت سے ہمکنار کرے گا۔"

"میں بڑی بات تو نہیں کرتا... لیکن نہ تو میں تمھاری گولی سے مروں گا اور نہ ہی اکھاڑے میں کوئی پہلوان مجھے اتنی آسانی سے مار سکے گا۔"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ وہ سب سوچ میں پڑ گئے۔ مجھ سے گفتگو شاید ان کے اندازوں کے بالکل برعکس ہوئی تھی۔ یہ بالکل ایسا ہی معاملہ تھا جیسے کوئی کھلاڑی کسی مخصوص گراؤنڈ میں کھیلنے کے لیے منصوبہ بندی کرتا رہا ہو... اور میچ شروع ہونے کے وقت اسے پتہ چلے کہ اُس گراؤنڈ میں پانی بھر گیا ہے۔

اُن کی بساط اُلٹ گئی تھی۔ اب انھیں متبادل گراؤنڈ کی تلاش تھی، جبکہ وقت کم تھا۔ وہ مجھ پر جھنجلا بھی رہے ہوں گے۔ میں نے گفتگو کے میدان میں ان کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ اب ان کے پاس صرف رائفلوں کا سہارا تھا۔ گویا مجھے بھی اپنی حکمتِ عملی تبدیل کرنا تھی۔ جھنجلایا ہُوا دشمن خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اُن کے اعصاب پر ضرورت سے زیادہ دباؤ پڑ رہا تھا۔ اس عالم میں آتشیں اسلحہ بہت زیادہ مخدوش ہو جاتا ہے۔

"تم صاف صاف گفتگو کیوں نہیں کرتے۔" میں نے نسبتاً نرم لہجے میں کہا۔ لیکن لہجہ اتنا نرم بھی نہیں ہونے دیا کہ ان پر میری کمزوری کا کوئی تاثر مرتب ہوتا۔ "مجھے بھی تو پتہ چلے کہ آخر بات کیا ہے؟"

رائفل پر اُن کے ہاتھوں کی گرفت تھوڑی سی نرم پڑ گئی۔ باریک آواز والے نے ایک گہرا سانس لیا۔ "آج شام تمھاری کشتی کس سے طے ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

"جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ حریف کوئی بھی ہو... تم یہ کشتی ہار جاؤ۔ کیسے ہارتے ہو؟ اس کا انحصار تم پر ہے۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو...؟"

"تو ہم ابھی تمھارا خاتمہ کر دیں گے۔" اُس کے لہجے میں سفاکی تھی۔

"اور تمھاری بات مان لُوں تو مجھے کیا ملے گا؟" میں نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔

"دنیا کی سب سے بڑی دولت ملے گی... یعنی زندگی!" اس نے ڈرامائی انداز اختیار کر لیا۔

"بے شک... زندگی بڑی دولت ہے... ہَوا کی طرح، دُھوپ کی طرح، چاندنی کی طرح... لیکن یہ تمام دولتیں خداداد ہیں۔ خُدا نے ہر انسان کے لیے فراہم کی ہیں... بلا قیمت... لہٰذا میں مفت میں ملنے والی چیز کی قیمت کیوں ادا کروں۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ ہار جیت تمھارے لیے بہت اہم ہے؟"

"کس کے لیے نہیں ہوتی؟"

"زندگی سے بھی زیادہ اہم؟"

"زندگی اور موت خُدا کے اختیار میں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم زندگی بھر کے لیے اپاہج بھی ہو سکتے ہو۔"

"میں مقدر پر یقین رکھتا ہوں۔"

وہ پھر زچ ہو گیا۔ یہ ان کے زچ ہونے کا د[...] مرحلہ تھا۔

"میں تمھاری بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں[...]" میں نے کہا۔ "میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ میری ہار ج[...] سے تمھارا کیا تعلق ہے۔ اگر میں ہار جاؤں تو تمھ[...] اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟"

"بچہ نادان ہے۔" قوی الجثہ نقاب پوش نے [...] کہا۔ "بڑوں کی باتیں اس کی سمجھ میں آسانی [...] نہیں آتیں۔"

"بڑے بات کر رہے ہوں تو درمیان میں نہ[...] بولتے۔" میں نے متانت آمیز لہجے میں کہا۔

"تم خاموش رہو۔ مجھے بات کرنے دو۔" بار[یک] آواز والے نے اس سے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "بات یہ ہے جوان کہ ہم لوگوں نے تمھاری [...] پر بڑی بڑی رقمیں لگائی ہوئی ہیں۔ اگر تم جیت [...] ہماری رقم ڈوب جائے گی۔"

"تم لوگوں نے غلطی کی ہے۔ میری فتح پر شرط لگ[اتے] تو یقینی طور پر کامیاب ہوتے۔"

"کامیاب تو ہم اب بھی ہوں گے۔" اُس نے [...] "اور اب ہمیں زیادہ رقم ملے گی۔ عام خیال یہی [...] تم جیت جاؤ گے۔ اسی لیے تو ہم نے تمھارے [...] میں شرط نہیں لگائی۔ ہمیں ملتا ہی کیا... اصل [...] تو اس گھوڑے کی جیت میں ہوتا ہے، جس کے [...] کا یقین ہو۔"

میرا خون کھول کر رہ گیا۔ بات پوری طرح سمجھ میں آگئی تھی۔ غصّہ اس بات پر آیا تھا کہ وہ [...] سلسلے میں گھوڑے کی مثال دے رہا تھا۔ "تو میں [...] فائدہ پہنچانے کے لیے ہار جاؤں۔" میں نے کہا۔ [...] ناممکن ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ روک سکو تو رو[ک لو] مجھ کو۔"

قوی الجثہ نقاب پوش نے ٹریگر پر انگلی [...] بڑھا دیا۔ "ہل کر دیکھو... یہیں گولی مار دوں [گا]۔" اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم مجھے گولی نہیں مار[و گے]"

میں نے مضحکانہ انداز میں کہا۔

"وہ کیوں... تم کوئی نازک اندام حسینہ تو نہیں ہو کہ تمھارے ساتھ رعایت کی جائے گی۔"

"تمھارے لیے میں نازک اندام حسینہ سے زیادہ نازک ہوں۔" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اگر تم اس وقت مجھے ختم کر دو گے تو میں شام کو مقابلہ کر ہی نہیں سکوں گا۔ یوں تمھاری رقم ڈوب جائے گی۔"

"ہرگز نہیں۔ تمھارے مرنے کی صورت میں صرف اتنا ہو گا کہ مقابلہ نہیں ہو سکے گا۔ شرط خود بخود کالعدم ہو جائے گی... البتہ ہم لمبی کمائی سے محروم ہو جائیں گے۔ سو، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ آج نہیں کل سہی۔" باریک آواز والے نے کہا۔

میں آگے بڑھنے والا تھا لیکن اس کی بات سُن کر ٹھٹک گیا۔ "کچھ بھی ہو، میں بغیر کسی منافع کے تمھاری بات نہیں مان سکتا۔" میں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "میری شکست بے قیمت تو نہیں ہونی چاہیے... خاص طور سے اس صورت میں کہ تمھیں اس سے فائدہ پہنچے گا۔"

"یعنی تم شکست پر آمادہ ہو؟" اس کے لہجے میں اُلجھن تھی۔

"بشرطیکہ قیمت معقول ہو؟"

"کوئی قیمت ہے تمھارے ذہن میں؟"

میں چند لمحے سوچتا رہا... بلکہ سوچنے کی اداکاری کرتا رہا۔ پھر میں نے اُسے جواب دیا۔ "ایک لاکھ روپے۔"

اس کی آنکھوں کا استعجاب بتاتا تھا کہ زیرِ نقاب اس کا مُنہ یقیناً کُھل گیا ہو گا۔ "آدمی دلچسپ ہو۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "جان بچانے کی بجائے سودے بازی کر رہے ہو۔"

"میں نے کہا نا... مجھے جان کی اتنی زیادہ پروا نہیں ہے۔"

"لیکن یہ رقم بہت زیادہ ہے۔"

"کچھ زیادہ نہیں ہے۔ تم مجھے دینے والی رقم بھی شرط کے ذریعے حاصل کر سکتے ہو۔"

وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ "ٹھیک ہے۔" کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ "کل صبح رقم تمھیں مل جائے گی۔"

"واہ... کل صبح کس نے دیکھی ہے۔" میں نے مضحکہ اڑایا۔ "میں تمھیں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ میرے پاس تو تمھارا شناختی کارڈ بھی نہیں ہے۔"

"تم وقت ضائع کر رہے ہو۔" قوی الجثہ نقاب پوش نے باریک آواز والے سے کہا۔ وہ بُری طرح بپھر گیا تھا۔ "ایک لاکھ روپے کی بات کر رہے ہو... حالانکہ اس کے لیے تین ساڑھے تین روپے کا ایک کارتوس ہی کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے، رقم تمھیں مقابلے سے پہلے مل جائے گی۔" باریک آواز والے نے کہا۔

"اور اگر میں عہد شکنی کا مرتکب ہوا تو؟"

"ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ تمھیں یاد نہیں کہ تم اپنے ایک ساتھی کو دفنا کر واپس آئے ہو۔" اس کے لہجے میں کُھلی دھمکی تھی۔ "وہ بہت ضدی اور احمق تھا۔ اس نے ہماری بات نہیں مانی۔ تم تقریباً مان گئے ہو۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو تم اس سے زیادہ احمق ثابت ہو گے۔ تمھاری موت اتنی آسان بھی نہیں ہو گی۔"

میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ میرا شدت سے جی چاہا تھا کہ اُن پر ٹوٹ پڑوں۔ لیکن میرا وہ اقدام احمقانہ اور بے سود ثابت ہوتا۔ اس لیے میں خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ "ویسے ساجن کو اتنا لمبا چکر نہیں چلانا چاہیے تھا۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"ساجن!" اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "وہ بے چارہ تو خود بڑی آفت میں گرفتار ہے۔ پولیس کو سب سے زیادہ شک اسی پر ہے۔ اس کے اکھاڑے پر تو زوال آیا ہوا ہے۔"

میں چکرا کر رہ گیا۔ حامد نے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ یہ قدرتی بات ہے۔ پولیس والے تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہوں گے۔ اور پھر کون جانے ان واقعات کی پشت پر اسی کا ہاتھ ہو۔ پیشہ ورانہ رقابت بُری چیز ہوتی ہے۔

"ٹھیک ہے، اب تم جاؤ۔" باریک آواز والے نے کہا۔ "ہم خود تم سے رابطہ قائم کریں گے۔"

میں پلٹ گیا۔ اب چہل قدمی کا موڈ نہیں رہا تھا۔ ذہنی کسلمندی دور ہو گئی تھی۔ چہل قدمی کی کوئی ضرورت

ہی نہیں رہی تھی۔ میں واپس چل دیا۔

"چہل قدمی نہیں کرو گے؟" عقب سے قوی الجثہ نقاب پوش کی آواز سنائی دی۔

"چہل قدمی کا وقت تو تم لوگوں نے ضائع کر دیا۔" میں نے بغیر پلٹے کہا۔۔۔ اور آگے بڑھتا رہا۔ جلد ہی میں کافی دور نکل آیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نہر میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اسی وقت مجھے فائرنگ کی آوازیں۔۔۔ اور پھر ایک کربناک چیخ سنائی دی۔ میرا جی چاہا کہ واپس پلٹوں۔۔۔ اور دیکھوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ جو کچھ ہو چکا ہے، سارے دن کے لیے بہت کافی ہے۔ ممکن ہے، وہ لوگ آپس میں اُلجھ گئے ہوں۔ قوی الجثہ نقاب پوش اور باریک آواز والے کے درمیان ہم آہنگی بالکل نہیں تھی۔ وہ دونوں یکسر مختلف مزاج رکھتے تھے۔ ایسے میں اور کیا اُمید کی جا سکتی ہے۔ میں پلٹا اور اکھاڑے کی طرف بڑھتا رہا۔

اکھاڑے پہنچا تو استاد میرے منتظر تھے۔ ان کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکے۔ "کہاں چلے گئے تھے تم؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"یونہی۔۔۔ چہل قدمی کرنے کے لیے نکل گیا تھا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تمھیں معلوم ہے، ساجن نے ہمارے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے۔" انھوں نے دھماکا کیا۔

"کس سلسلے میں؟"

"اس کا کہنا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے تم نے چند مسلح افراد کے ساتھ اسے ایک ویرانے میں گھیر لیا تھا۔ تم نے اسے دھمکیاں دیں کہ اگر وہ آج کے مقابلے میں جی جان سے لڑا تو کل کا سورج نہیں دیکھ سکے گا۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"درست کہہ رہا ہوں۔ اس نے باقاعدہ رپورٹ درج کرائی ہے۔"

"یعنی میں اس قدر احمق ہوں کہ منہ اُٹھائے کھلے عام اُسے دھمکیاں دینے کے لیے پہنچ گیا۔" میں نے بھنا کر کہا۔

"نہیں۔۔۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے گھیرنے والوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔"

"تو پھر اُس نے مجھے کیسے پہچان لیا؟"

"بقول اس کے تم آواز بدل کر بولنے کی ناکا[م] کوشش کر رہے تھے۔" استاد نے جواب دیا۔

میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ میرے ذہن میں بھی ایک خلش موجود تھی۔ قوی الجثہ نقاب پو[ش] کی آواز مجھے کھٹک رہی تھی۔ اب خیال آیا کہ مجھے اس سلسلے میں کیا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیس[ے] ساجن آواز بدل کر بول رہا ہو۔ "اور میرا خیال ہے ابھ[ی] دس منٹ پہلے اس نے پانچ نقاب پوشوں کے ہم[راہ] نہر کے پاس مجھے گھیر لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے مجھ[ے] دھمکیاں دیں کہ مجھے آج کے مقابلے میں بہرحال شکس[ت] کھانا ہے۔۔۔ ورنہ میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو[ں] گا۔ اس نے تو مجھے دولت کا لالچ بھی دیا۔۔۔ بلکہ پیشک[ش] بھی کی ہے۔ یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ طے شدہ رقم آج مقابلے سے پہلے پہنچا دی جائے گی۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" استاد نے حیرت سے کہا۔

میں نے انھیں پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ [وہ] خاموشی سے سُنتے رہے۔ پھر بولے۔ "یہ تو دُہرا چکر معلوم ہوتا ہے۔"

"جی ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"بہتر ہوگا کہ تم بھی رپورٹ درج کرا دو۔" اُستا[د] نے مشورہ دیا۔

میں فوری طور پر اُستاد کے ساتھ نکل کھڑا ہو[ا]۔ ہم نے متعلقہ تھانے کا رُخ کیا۔ تھانے کا انچارج حا[...] حوالے سے ہمیں جانتا تھا، بڑے تپاک سے ملا۔ پا[نچ] منٹ میں رپورٹ درج ہو گئی۔ البتہ انچارج اس با[ت] پر حیران تھا کہ ایک ہی دن دو ایک جیسی رپورٹیں فریقی[ن] کی جانب سے درج کرائی گئی ہیں۔ ہم رپورٹ در[ج] کرانے کے بعد اکھاڑے لوٹ آئے۔

اب مجھ پر نیند کا دباؤ تھا۔۔۔ اور صورتِ حال تقاضا تھا کہ میں جاگتا رہوں۔ نقاب پوشوں نے مقا[بلے] سے پہلے رابطہ قائم کرنے کو کہا تھا۔۔۔ اور میں اُ[س] سے پہلے نہیں سونا چاہتا تھا۔ استاد نے صورتِ حا[ل] بھانپ لی۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے کمرے میں لے آ[ئے]۔ "دیکھو برخوردار۔۔۔ تمھارے لیے اس وقت سونا [ض]روری ہے۔ تم سو جاؤ۔۔۔ اگر کوئی تم سے ملنے ک[ے لیے]

آیا تو میں تمھیں جگا دوں گا۔"

"نہیں استاد۔۔۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"اگر نہیں سوؤ گے تو آج آخری کشتی کے لیے مجھے تمھارا متبادل تلاش کرنا ہوگا۔" انھوں نے سخت لہجے میں کہا۔

میں گڑبڑا گیا۔ استاد نے شرط ہی ایسی عائد کر دی تھی۔ "ٹھیک ہے استاد، میں سو رہا ہوں۔" میں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"میں یہیں بیٹھا ہوں۔" استاد نے کرسی کھینچی اور میرے بستر کے پاس بیٹھ گئے ———— بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھیں مندتی چلی گئیں۔ چند لمحوں بعد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب اُستاد نے مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کر اُٹھایا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ "کوئی آیا ہے کیا؟" میں نے اُستاد سے پوچھا۔ میرے ذہن میں وہی خیال تھا کہ کوئی رقم لے کر آیا ہوگا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے پکڑ کر اس سے سب کچھ اگلواؤں گا۔ بس ایک خدشہ تھا۔۔۔ اتنا لمبا کھیل کھیلنے والے اس طرح کا خطرہ مول کیسے لے سکتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے رابطے کا کون سا طریقہ سوچا ہوگا۔

"نہیں برخوردار۔ تمھارا متوقع ملاقاتی تو نہیں آیا۔" استاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "البتہ اُٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔"

میں اُٹھ گیا۔ نہا دھو کر میں نے مقابلے کی تیاری کی۔ باہر آیا تو تقریباً مقابلہ شروع ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔ ساجن اور اس کے اکھاڑے والے بھی آ چکے تھے تماشائی بھی اپنی کرسیوں پر قابض ہو چکے تھے۔ میں استاد کی طرف بڑھا۔ اسی وقت شاہنواز ہاتھ میں ناموں کا کاغذ لیے ان کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ میں اور وہ تقریباً ساتھ ہی اُستاد تک پہنچے۔ "اس پر جوڑیاں لکھ دیں استاد۔" شاہنواز نے کاغذ استاد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

استاد نے کاغذ لیا اور اس پر ایک نظر ڈالی۔ اُن کا رنگ متغیر ہو گیا۔ میں نے اُن کے کندھے کے اُوپر سے کاغذ پر نگاہ ڈالی۔ آخری اور اہم ترین کشتی کے لیے خود ساجن کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے استاد کے چہرے کی طرف دیکھا، جہاں تشویش اور ارتکاز کا عجیب سا امتزاج تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ وہ مجھے ساجن کے مقابلے میں اُتارنا نہیں چاہتے تھے۔

میں استاد کی طرف دیکھتا رہا جب کہ استاد میری طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔ کچھ بھی سہی، ساجن ایک تجربے کار پہلوان تھا۔ استاد کے برعکس میں یہ سوچ کر ہیجانی کیفیت سے دوچار تھا کہ ساجن سے مقابلہ میری صلاحیتوں کے لیے آزمائش ثابت ہوگا۔ مقابلے کا نتیجہ تو کچھ بھی نکل سکتا تھا، لیکن یہ طے تھا کہ وہ ایک پُرلطف مقابلہ ہوگا۔ سوال صرف یہ تھا کہ استاد مجھے ساجن کے مقابلے میں اُتارتے ہیں یا نہیں۔ ان کے انداز سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اُن کے ارادے کچھ اور ہیں۔ وہ متردّد نظر آ رہے تھے۔ شاہنواز اکھاڑے کی طرف واپس جا چکا تھا۔ "کس سوچ میں پڑ گئے اُستاد؟" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

"ایں۔۔۔ کیا کہا؟" استاد چونک سے گئے۔

"کیا تھیں مجھ پر۔۔۔ اپنی تربیت پر اعتماد نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو برخوردار، یہ بات نہیں ہے۔" استاد نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے زنگ خوردہ ہاتھ پیروں پر بھی تھوڑی سی پالش کر لی جائے۔ بہت دن ہو گئے ہیں، کچھ کیا ہی نہیں۔"

"نہیں استاد، یہ نہیں ہو سکتا۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "ساجن اچھا پہلوان ہے لیکن میں اُسے اِس قابل نہیں سمجھتا کہ تم اس سے مقابلہ کرو۔"

"اس میں کچھ حرج بھی نہیں ہے برخوردار۔"

"حرج ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "ہمارے لیے تو یہ بات مر جانے کے برابر ہے۔ میرے جیتے جی یہ نہیں ہو سکتا۔"

"تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ میں۔۔۔"

"نہیں استاد یہ ممکن نہیں ہے۔"

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا میرے لہجے میں کیا بات تھی۔۔۔ بہرحال کچھ تھا ضرور۔ استاد نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں عجیب سی، متضاد کیفیتیں نظر آئیں۔ پھر انھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "آؤ۔۔۔ اپنے کمرے کی طرف چلو۔ جوڑیاں لکھ دو جلدی سے۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں ان کے ساتھ چل دیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے قلم اٹھایا اور سب سے پہلے آخری کشتی کے لیے ساجن

کے نام کے سامنے اپنا نام لکھ دیا، پھر میں نے نظریں اٹھا کر استاد کو دیکھا اور کہا "لکھوائیے جوڑیاں!"

استاد مسکرائے۔ وہ مسکراہٹ صرف ان کے ہونٹوں تک محدود نہیں تھی۔ ان کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

"بہت ضدی ہو" انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ بھی آپ کی محبتوں کا کمال ہے!"

"خیر، ٹھیک ہے!" استاد سنجیدہ ہو گئے "اب ایسا کرو۔ ادریس کے سامنے گاما اور جمجو کے سامنے طاہر کا نام لکھ دو۔"

میں نے حسب ہدایت نام لکھ کر کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا۔ پھر ہم دونوں کمرے سے نکل آئے اور اکھاڑے کی طرف بڑھ گئے۔ اس وقت تک اکھاڑے کی رونق اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی۔ اس روز تماشائی کچھ زیادہ ہی تھے ہمارے محلے کے لوگ بھی بڑی تعداد میں موجود تھے... وہ بالخصوص میری کشتی دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ دوسری طرف ساجن کے علاقے کے لوگ بھی گزشتہ ادوار کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔ ظاہر ہے، ان کے علاقے کا استاد اکھاڑے میں اتر رہا تھا۔ انھیں یہ توقع بھی رہی ہوگی کہ ساجن کے مقابلے میں استاد جمجو خود اکھاڑے میں اتریں گے۔ دونوں اکھاڑوں کے حامیوں کا شوق دیدنی تھا۔ سادہ لباس پولیس والے بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔

استاد نے جوڑیوں والا کاغذ شاہنواز کو تھما دیا۔ شاہنواز نے کاغذ پر ایک چھلتی ہوئی نگاہ ڈالی اور ساجن کی طرف بڑھ گیا۔ شاہنواز نے وہ کاغذ ساجن کی طرف بڑھا دیا۔ میں ساجن کو بغور دیکھ رہا تھا۔ کاغذ پر ایک نگاہ ڈالتے ہی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ تلملایا ہوا نظر آنے لگا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ... وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ استاد جمجو خود اس کے مقابلے میں اتریں گے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں یہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ توہین اور بے بسی کے شدید احساس سے دوچار ہے۔ مجھ سے مقابلہ اس کے لیے توہین آمیز تھا۔ کوئی استاد یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی جونیئر پہلوان کے ساتھ اس کی جوڑی لگے۔ یہ سراسر نقصان کا سودا ہوتا ہے۔ جیت گئے تو جیت کی کوئی اہمیت نہیں... اور برابر بھی

رہے تو ڈوب مرنے کا مقام آ گیا۔ شکست تو بالکل منہ چھپانے پر مجبور کر سکتی ہے۔ دوسری طرف وہ بے[...] تھا۔ اپنا نام دے چکا تھا اور اب پیچھے ہٹنے کا کو[...] سوال نہیں تھا۔

میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ساجن [...] کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر تاسف تھ[...] ان کا یہ تاثر میرے لیے حیران کن تھا۔

"کیا بات ہے استاد؟" میں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"یہ ہم نے اچھا نہیں کیا ساجن کے ساتھ!" استا[...] کے لہجے میں ہلکی سی برہمی تھی۔

"میں سمجھا نہیں!" میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تمھارے ساتھ اس کی جوڑی لگانا ہتک آمیز او[...] ہے" استاد نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "وہ بہرحال است[...] ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے تھا[...] بادشاہ، بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ میں نے تھا[...] جذباتیت کے سامنے ہتھیار ڈال کر غلطی کی ہے[...]"

پہلے تو میں سن ہو کر رہ گیا۔ پھر میرے دل میں[...] استاد کے لیے فخر و محبت کا اتنا تند جذبہ جاگا کہ میں[...] خود حیران رہ گیا۔ میں نے بے ساختہ استاد کا ہاتھ[...] تھام لیا "استاد، ہم اپنا فیصلہ واپس لے سکتے ہیں[...]" میں نے پوچھا "درحقیقت میں نے اس پہلو پر تو سو[...] ہی نہیں تھا۔"

"اب کچھ نہیں ہو سکتا!" استاد متاسفانہ انداز[...] میں سر ہلاتے ہوئے بولے "اور یہ تمھارے نہیں میر[...] سوچنے کی بات تھی۔ جانتے ہو، ساجن عنقریب رئیس[...] ہونے والا تھا!"

یہ میرے لیے ایک اور دھماکا تھا۔ اب میں واقع[...] متاسف تھا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یہ احساس بھی ہ[...] کہ استاد کی پوزیشن بھی کم و بیش وہی ہوتی، بنیاد[...] غلطی ساجن سے ہوئی۔ اسے خود اکھاڑے میں اترنے[...] فیصلہ کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ویسے بھی یہ استاد[...] کی شان کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کی جاہ طلبی نے [...] دن دکھایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ استاد جمجو خود اس[...] مقابلہ کریں گے۔ یوں مقابلہ جیتنے کی صورت میں ا[...]

کی شہرت کہیں سے کہیں پہنچ جاتی، حالانکہ اس کا امکان نہیں تھا۔

استاد نے میرے چہرے کے تاثرات سے میری سوچوں کا اندازہ لگا لیا تھا "یہ درست ہے برخوردار کہ ساجن نے غلطی کی" انھوں نے نرم لہجے میں کہا "لیکن تم ایک بات نظرانداز کر رہے ہو۔ وہ مجھ سے یہ امید کر ہی نہیں سکتا تھا کہ میں اس کے مقابلے میں کسی اور کو اتاروں گا۔ مجھے عمر بھر اس پر شرمندگی رہے گی کہ میں اس کی بجا توقعات پر پورا نہیں اتر سکا۔"

استاد کی بات سن کر میں شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ میری نظر میں استاد کا مقام کچھ اور بلند ہو گیا۔ ان کی عظمت کا نقش میرے ذہن پر کچھ اور گہرا ہو گیا۔ وہ بہت بڑے انسان تھے۔ میری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اخلاقی اصول نظرانداز کر بیٹھے تھے... اور اب پچھتا رہے تھے یہ سب کچھ میری جذباتیت کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں نادم اور شرمسار کھڑا تھا۔ اب میں استاد سے آنکھ بھی نہیں ملا سکتا تھا۔

"تو استاد، اب ہم فیصلہ تبدیل نہیں کر سکتے؟" میں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"نہیں برخوردار، کمزور فیصلے کر کے نبھانا بھی سیکھو" انھوں نے کہا "حقیقت کا سامنا کرنے سے نہیں گھبرانا چاہیے۔ میں غلطی کرتا ہوں تو غلطی پر برملا پشیمان ہونے کا ظرف بھی رکھتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ پشیمانی غلط فیصلے کے نتیجے میں ہونے والے نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی۔ اتنا ضرور ہوتا ہے کہ اچھے لوگ آئندہ کے لیے محتاط ہو جاتے ہیں۔"

اب میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ استاد کے پاس کھڑے رہنے کا یارا بھی نہیں رہا تھا، چنانچہ میں وہاں سے ہٹ آیا۔ پہلا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ چھوٹی کشتی تھی لیکن گزشتہ ادوار میں ہونے والی کشتیوں کی طرح روکھی پھیکی نہیں تھی۔ گاما اور ادریس دونوں جان لڑا رہے تھے۔ دونوں طرف کے حامی اپنے اپنے پہلوان کو بڑھاوے دے رہے تھے۔ وہ یقیناً ایک سنسنی خیز کشتی تھی لیکن میں کشتی پر توجہ نہیں دے پا رہا تھا، میرا ذہن تو اسی مسئلے میں الجھا ہوا تھا، جس سے میں دوچار تھا وہ مسئلہ تھا بھی لاینحل۔ ایسے مسائل پر سوچنا بس وقت

ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہے... لیکن انسان کی مجبوری ہے کہ وہ سوچے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔

اچانک مجھے تالیوں کے شور نے چونکا دیا۔ میں نے رنگ کی طرف نگاہ کی۔ گاما اور ادریس کا مقابلہ برابر رہا تھا... لیکن تماشائیوں کی مسلسل تالیاں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ اس کشتی کے ایک ایک لمحے سے پوری طرح محظوظ ہوئے ہیں۔ اب دونوں پہلوان اکھاڑے سے باہر آ رہے تھے۔ میں پھر اپنی سوچ میں گم ہو گیا۔ مجھے اپنی کشتی کا لائحہ عمل ترتیب دینا تھا۔ ساجن صرف پہلوان نہیں تھا، استاد بھی تھا۔ اور استاد کا درجہ یونہی بندر بانٹ میں نہیں ملا کرتا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ میری زندگی کا سخت ترین حریف ثابت ہوگا۔ البتہ مجھے ایک معاملے میں اس پر فوقیت حاصل تھی۔ میرا اسٹیمنا اس سے زیادہ تھا۔

دوسری کشتی شروع ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دن نورا کشتی کا دن ہے ہی نہیں۔ اس روز دونوں طرف کے چھوٹے پہلوانوں تک کے لیے ہار جیت بڑی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ شروع میں تو جگنو پہلوان چھایا رہا۔ اس نے ہمارے طاہر پہلوان کو تھکا مارا... اور بڑے برجستہ داؤ استعمال کیے۔ لیکن آخری راؤنڈ میں طاہر نے حیرت انگیز طور پر اسے زیر کر لیا۔ اگلے ہی لمحے پورا اکھاڑا تالیوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ ہمارے پہلوانوں نے طاہر کو کندھے پر اُٹھا لیا اور اسے اکھاڑے سے باہر لے گئے۔

میرا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ مقابلہ آسان نہیں تھا... بلکہ بہت سخت تھا۔ وہ صرف میرے لیے نہیں، استاد مجو کے لیے بھی آزمائش کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے جان پر کھیل کر بھی سرخروئی حاصل کرنا تھی... اور میں نے خود سے اس بات کا عہد بھی کر لیا تھا۔

چند لمحے بعد میں ساجن کے ساتھ اکھاڑے میں موجود تھا۔ شاہنواز نے آخری کشتی کے آغاز کا باضابطہ اعلان کیا۔ پھر اس نے ہم دونوں کو قواعد و ضوابط سمجھائے۔ میں نے اس کی کوئی بات نہیں سنی۔ میں تو اپنے ذہن کو صرف مقابلے پر مرتکز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر مقابلہ شروع ہونے کی گھنٹی بجی۔ اب میں اور ساجن ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ ایک لمحہ ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ پورے اکھاڑے پر مہیب سکوت مسلط تھا۔ تماشائی بھی دم سادھے دیکھ رہے تھے اور ہم ایک دوسرے کو۔ ساجن کی آنکھوں میں شدید نفرت تھی... غصہ تھا۔ ان آنکھوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگر اس کا بس چلا تو وہ مجھے پیس ڈالے گا... کچل دے گا۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ مجھے خود کو ٹھنڈا رکھنا ہے اور اپنے اسٹیمنا سے فائدہ اٹھانا ہے۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے یہ کشتی کس طرح لڑنا ہے۔

ساجن نے بڑے پُروقار انداز میں میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ جواباً میں نے بھی اس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے میرا ہاتھ تھامنے کی بجائے صرف چھوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بجلی کی سی سرعت سے حملہ آور ہوا تھا۔ وہ مجھے دور تک دھکیلتا چلا گیا۔ اُس نے اپنی پوری قوت استعمال کی تھی۔ یہی بہت تھا کہ میرے قدم نہیں اکھڑے۔ پھر رنگ کی رسیوں نے مجھے روک لیا۔ میں نے جواباً زور لگا کر اسے پیچھے دھکیلا... اور میرے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ ابھی میں سنبھل ہی رہا تھا کہ اس نے فلائنگ کک لگائی۔ میں رسیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا رنگ سے باہر جا گرا۔ باہر گرتے ہی میں اٹھا۔ میں نے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی اور رسیاں پھلانگ کر اندر آ گیا۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ مجھے غصے سے گریز کرنا ہے۔ وہ محض بجھتے ہوئے چراغ کی مانند بھڑک رہا تھا۔

ساجن نے اس کے بعد بھی کئی داؤ آزمائے لیکن اب میں مدافعت کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں اس کے ہر داؤ کا توڑ کرتا رہا۔ اسی میں پہلا راؤنڈ ختم ہو گیا۔

وقفے کے دوران میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ رشید پہلوان میرے کارنر میں آ گیا تھا... لیکن استاد نہیں آئے۔ وہ محلے کے معززین سے باتوں میں مصروف تھے۔ البتہ ایک بار انھوں نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا... اور مسکرائے۔ وہ بے حد حوصلہ افزا مسکراہٹ تھی، جیسے وہ کہہ رہے ہوں... مجھے تم پر اعتماد ہے برخوردار۔

"تم ٹھیک جا رہے ہو یار۔" رشید پہلوان کی سرگوشی نے مجھے چونکا دیا۔ "بس اسے تھکا مارو۔ آج اس کے اکھاڑے کی موت کا دن ہے۔"

میں خاموش رہا۔

گھنٹی بجتے ہی میں اکھاڑے کے وسط کی طرف

بڑھا۔ ساجن بھی بہت تیزی سے بڑھا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ساجن اپنی پوری قوت آزما رہا تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے ایسا لگا جیسے میری سانسیں رک جائیں گی۔ وہ بے حد جاندار آدمی تھا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ مجھے اپنے اسٹیمنا کی برتری سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملے گا... وہ اس سے پہلے ہی میرا کریا کرم کر ڈالے گا۔

اس کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت میں نے بہت تیزی سے اپنی کہنیاں چلائیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے بہت تیزی سے فضا میں اچھل کر اس کے سینے پر فلائنگ کک لگائی۔ ہم دونوں ساتھ ہی زمین پر گرے۔ میرا اندازہ تھا کہ میں اس سے پہلے اٹھوں گا لیکن اس نے بھی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ ہم دونوں ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے . . .
چند لمحے ایک دوسرے کو نگاہوں ہی نگاہوں میں تولتے رہے۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کی آگ اور شدت سے بھڑکتی نظر آ رہی تھی۔

میں اپنی جگہ ڈٹا کھڑا رہا۔ میری حکمت عملی یہی تھی کہ داؤ وہ لگائے... اور میں صرف مدافعت کروں۔ اس نے آگے بڑھ کر آرم لاک لگانے کی کوشش کی لیکن میں کا داؤ کاٹ گیا۔ دوسرا راؤنڈ بھی پہلے راؤنڈ کے سے انداز میں ختم ہوا۔

تیسرے اور چوتھے راؤنڈ میں بھی یہی ہوا... میں زیادہ تر مدافعت کرتا رہا۔ تین بار میں نے لاک لگایا۔ لیکن وہ بآسانی میری گرفت سے نکل گیا۔ تماشائی دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک انتہائی سخت مقابلہ دیکھ رہے ہیں۔

پانچویں راؤنڈ کے آغاز میں ہم سامنے آئے تو ساجن کچھ تھکا تھکا سا تھا جب کہ میں پہلے کی طرح تازہ دم تھا۔ ساجن نے بھی یہ بات بھانپ لی تھی۔ اور شاید تماشائیوں نے بھی... کیونکہ ہمارے حامیوں نے نعرے لگانا اور مجھے بڑھاوے دینا شروع کر دیا تھا۔ میں ایک لمحے ساجن کو دیکھتا رہا، پھر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب پہل مجھے کرنا ہوگی۔ معاملہ اُلٹ رہا تھا۔ اب ساجن مدافعت کے موڈ میں تھا۔ میں نے مسلسل کئی داؤ لگانے کی کوشش کی لیکن وہ کسی چکنی مچھلی کی طرح میری گرفت سے نکل گیا۔ پانچویں راؤنڈ کے آخر میں ایسے ہی ایک داؤ سے بچتے ہوئے ساجن کا توازن بگڑ گیا۔ وہ میرے لیے ایک سنہرا موقع تھا لیکن پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے میں اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ جب تک میں سنبھلتا ساجن بھی سنبھل چکا تھا۔ اسی وقت راؤنڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔

رشید پہلوان میرے کارنر میں موجود تھا اور بے حد مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ استاد بدستور معززین کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔

"بڑا اچھا موقع ضائع کر دیا تم نے۔" رشید متاسفانہ لہجے میں بولا۔ "یہ موقع نہ گنوایا ہوتا تو تم یہ مقابلہ جیت چکے ہوتے۔"

"یہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میں مطمئن ہوں۔"

رشید نے میرے لہجے میں قطعیت محسوس کر لی تھی، چنانچہ اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔ خاموش کھڑا تولیے سے میرا جسم پونچھتا رہا۔ پھر راؤنڈ کے آغاز کی گھنٹی بجی اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اس بار ساجن کے انداز میں تھکن اور مایوسی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ آخری اور فیصلہ کن قدم اٹھانے کا وقت آ گیا ہے۔ اب موقع ضائع کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ میں اپنے منصوبے پر عمل نہیں کر سکوں گا۔

میں بہت تیزی سے اس کی طرف جھپٹا اور ہتھیلی کے نچلے حصے سے اس کے منہ پر متعدد ضربیں لگائیں۔ تماشائی یک دم پُرجوش ہو گئے۔ وہ آخری راؤنڈ تھا۔

میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ساجن کے انداز میں بھی تیزی آ گئی۔ اس کے ہاتھ اور گھٹنے بہت تیزی سے چل رہے تھے۔ ایسے ہی ایک موقعے پر میں نے جھکائی دی۔ اس کا توازن بگڑا اور میں نے تیزی سے پلٹ کر اس کی گردن گرفت میں لے لی۔ اس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا تھا اور چہرہ آسمان کی طرف تھا۔ اس کی رنگت سپید پڑ گئی تھی۔ میرے کانوں میں استاد کی آواز گونجنے لگی... لفظوں سے محروم آواز... لیکن شعور میں لفظ احساس کی صورت چبھ رہے تھے۔ ساجن اس گرفت سے نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ داؤ اس کے عہد کا خاتمہ کرنے والا تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ ہر اچھا

پہلوان ایسے موقعے پر ایسا ہی کرتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ خود کو چھڑانے کی آخری کوشش کے لیے اپنی قوت مجتمع کر رہا ہے۔ مجھے یہ اندازہ بھی تھا کہ وہ توجہ بٹانے والا وار کس طرف سے کرے گا۔ یہ بات ساجن بھی جانتا تھا کہ اب اس کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

دوسری طرف تماشائیوں پر سکوت طاری تھا۔

... اچانک میں نے گہرا سانس لیا۔ اس کے ساتھ ہی ساجن کی گردن پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ تماشائی اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کیونکہ میرے بازو اور کلائی کے عضلات کی سختی اور تناؤ میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ساجن کے آسمان کی طرف اٹھے ہوئے چہرے پر ایک لحظے کے لیے استعجاب سا جھلکا... اور فوراً ہی معدوم بھی ہو گیا۔ ساتھ ہی اس کی دونوں کہنیاں حرکت میں آئیں... میں کراہتے ہوئے پیچھے ہٹا۔ ساجن اتنی دیر میں سنبھل چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میری، اس کی نگاہیں ملیں، اس کی نگاہوں میں احترام تھا۔ پھر وہ تیزی سے میری جانب جھپٹا۔ اس کی ہتھیلیوں کے نچلے حصے میری ناک سے ٹکرائے... میری ناک سے بَھل بَھل خون بہنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ساجن نے اڑنگا لگا کر مجھے گرا دیا۔ اب میں بہت خراب پوزیشن میں تھا۔ اس کا ایک گھٹنا میرے سینے پر تھا اور ہاتھ کے زور سے وہ میری ٹانگوں کو میرے سر کی جانب دھکیل رہا تھا۔ میں کسی کمان کی سی صورت اختیار کر گیا تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی پر ناقابلِ برداشت دباؤ پڑ رہا تھا۔ ساجن عقل مند آدمی ثابت ہوا تھا۔ وہ داؤ ایسا تھا کہ کوئی پہلوان ہار مانے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، ورنہ وہ داؤ مہلک ثابت ہوتا۔

میں اذیت کی اس کیفیت میں اس کے چہرے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کی نگاہوں سے اب بھی احترام جھلک رہا تھا۔ شاہنواز مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں شکست تسلیم کر رہا ہوں یا نہیں۔ تماشائیوں کے لیے کشتی کے آخری لمحوں کو دلچسپ بنانے کے لیے میں نے آخری کوشش کی۔ ٹانگوں سے زور لگاتے ہوئے میں نے ساجن کو الٹنے کی کوشش کی... اور ساتھ ہی میری ہتھیلیاں اس کی ناک سے ٹکرائیں۔ اس کی نکسیر کھل گئی اور وہ بری طرح چیختا ہوا میرے اوپر سے ہٹ گیا۔ میں اٹھ سکتا تھا... لیکن وہیں پڑا رہا۔ میں ریفری کا منتظر تھا کہ وہ میرے خلاف فیصلہ دے لیکن چند لمحوں تک کچھ نہ ہوا۔ ریفری ساجن سے کچھ پوچھتا رہا تھا۔ میں نے ساجن کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا... اور وہ ہاتھوں سے اپنی رانوں کے درمیانی حصے کو دبائے بُری طرح لوٹ رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے میری لات اس کی رانوں... کے درمیانی حصے پر لگی ہو۔ میں حیران رہ گیا کیونکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

پھر ریفری شاہنواز میری طرف آیا۔ "تم مقابلہ جاری رکھ سکتے ہو؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ساجن بھی مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے میں اعلان کر رہا ہوں کہ مقابلہ برابر رہا ہے۔" اس نے کہا

میں نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اس کے فیصلے سے متفق ہوں۔ اگلے ہی لمحے شاہنواز نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تالیاں بجنے لگیں... نعرے لگائے جانے لگے... اور دونوں طرف کے پہلوان اکھاڑے میں اتر آئے۔ ساجن کے اکھاڑے والے اسے سہارا دے کر باہر لے گئے... میرے ساتھیوں نے مجھے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے اکھاڑے سے باہر آ گیا۔

پھر مقابلے کا حتمی فیصلہ سنایا گیا۔ تین بڑی کشتیوں میں سے دو برابر رہی تھیں اور ایک ہمارے اکھاڑے کے تیسرے پہلوان نے جیتی تھی۔ اس بنیاد پر ہمارے اکھاڑے کو فاتح قرار دے دیا گیا۔ اب لوگ ہمیں مبارک باد دے رہے تھے۔ ان میں ساجن کے علاقے اور اکھاڑے کے لوگ بھی تھے۔ میں اپنے کمرے کی طرف چلا آیا۔

جلد ہی وہ ہنگامہ ہاؤ ہو ختم ہو گیا۔ سب لوگ واپس چلے گئے۔ اب وہاں صرف اکھاڑے کے لوگ رہ گئے تھے۔ پھر استاد کے ساتھ ہی وہ سب میرے کمرے میں چلے آئے۔

"کیا بات ہے۔ بہت اداس نظر آ رہے ہو۔" رشید نے مجھے چھیڑا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ویسے تم نے ساجن کو تقریباً گرا ہی دیا تھا۔" ناظم ستائشی لہجے میں بولا۔ "آخری لمحوں میں تو تم نے کمال ہی کر دیا۔ اس داؤ سے کوئی بچ کر نہیں نکلتا۔"

وہ سب لوگ تبصرے کرتے رہے۔ استاد خاموشی سے سنتے رہے اور میں مسکراتا رہا۔ کوئی ایک گھنٹہ وہ میرے کمرے میں بیٹھے رہے۔ پھر استاد نے انھیں کہا کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں اور مجھے آرام کرنے دیں۔ وہ سب چلے گئے۔ استاد چند لمحوں تک مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے رہے، پھر بولے۔ "تم نے میری لاج رکھ لی، برخوردار۔"

"شکست کھا کر؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"خیر یہ شکست تو نہیں ہے۔ اور ہوتی، تو بھی میری فتح ہی ہوتی۔ مجھے فخر ہے کہ تم پر کی ہوئی محنت رائیگاں نہیں گئی۔"

"مجھے معلوم تھا استاد کہ اسی میں تمھاری اور میری سرخروئی ہے۔"

"بے شک۔"

"لیکن استاد ساجن کا بے کار ہو جانا میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"وہ استاد ہے۔ وہ جان گیا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ جیت جاتا تو ہمارا اکھاڑا فتح سے محروم ہو جاتا۔ اس نے تمھارے مثبت جذبے کا جواب مثبت جذبے ہی سے دیا۔ حالانکہ تمھارے ساتھ اس کا برابر مقابلہ اس کی شکست کے برابر ہے۔ لیکن اس نے یہ گوارا کر لیا۔ استاد یونہی خالی خولی لوگ نہیں ہوتے برخوردار، ان کے اندر بڑائی چھپی ہوتی ہے اور ایسے موقعوں پر سامنے آجاتی ہے۔ مجھے تو یہ ڈر تھا کہ کہیں تم مقابلہ جاری رکھنے پر آمادہ نہ ہو جاؤ کیونکہ وہ تو پہلے ہی انکار کر چکا تھا۔ اس صورت میں اسے شکست خوردہ قرار دیا جاتا اور تمھارے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ امکانات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔ بہر حال، جو ہوا، سو اچھا ہوا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ انسانیت کتنی بڑی چیز ہے اور انسان ہونا کتنا مشکل کام ہے۔ وقت انسان کو انسانیت کی کسوٹی پر کس کس طرح پرکھتا ہے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ "آجاؤ۔" میں نے کہا۔ استاد اٹھ کھڑے ہوئے۔ "ساجن آیا ہوگا۔" انھوں نے سرگوشی کی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور ساجن اندر داخل ہوا۔ میں استاد کے اندازے کی درستی پر حیران رہ گیا۔ ساجن نے باآواز بلند سلام کیا اور پھر جھپٹ کر استاد کے قدموں میں جھک گیا۔ استاد نے کھینچ کر اسے کھڑا کیا اور سینے سے لگا لیا۔

"نہیں استاد، میری جگہ آپ کے قدموں میں ہے۔" ساجن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

"کیسی باتیں کرتے ہو استاد ساجن۔ تم میرے لیے بہت محترم ہو۔" استاد نے کہا۔

"یہ تو آپ کے ظرف کی بات ہے استاد۔" ساجن کی آواز بکھر بکھر گئی۔ "مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میں آپ کے پیروں کی خاک بھی نہیں ہوں۔"

"تم میرے گھر مجھے شرمندہ کرنے آئے ہو؟" استاد کے لہجے میں خفیف سی برہمی تھی۔ "ایسی باتیں مت کرو میرے بھائی۔"

ساجن نے ایک لمحہ استاد کے چہرے کو دیکھا... پھر اس نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ "تم استاد مجو کے شاگرد ہو لیکن مجھے بھی تم پر فخر ہے۔" اس نے کہا اور میری پیشانی چوم لی۔

"آؤ بیٹھو۔" استاد نے ایسے کہا جیسے اب تک کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

ہم تینوں بیٹھ گئے۔ "میں شرمندہ ہوں استاد مجو۔ میں نے اپنا نام دے کر حماقت کی تھی۔ آپ نے میرا بھرم رکھ لیا۔" ساجن نے کہا۔

"غلطی مجھ سے بھی ہوئی تھی۔" استاد نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"نہیں استاد... بنیادی غلطی میری ہی تھی۔ میں نے آپ کو امتحان میں ڈالا تھا۔ آپ نے تو مجھے میری غلطی پر بخش دیا۔" ساجن نے پر خلوص لہجے میں کہا۔

"یہ تمھاری غلط فہمی ہے کہ میں نے کچھ کیا ہے۔ میں نے جمال کو کوئی ہدایت نہیں کی۔ اسے صرف اتنا بتایا تھا کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔"

"تب تو جمال اور بھی قابلِ فخر ہے۔" ساجن نے احترام آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"یہ بھی استاد ہی کا فیض ہے۔" میں نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"پہلی بار میری سمجھ میں آیا ہے کہ تربیت کتنی بڑی چیز ہوتی ہے۔" ساجن نے عجیب لہجے میں کہا۔ "میں معترف

داؤ پیچ سکھانے کو تربیت سمجھتا ہوں۔ استاد، ایک التجا ہے میری آپ سے۔"

"کہو... کہو۔"

"میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" استاد نے چونک کر کہا۔

"میرا مطلب ہے، میں آپ کے اکھاڑے میں آپ کے زیرِ سایہ رہنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تمھارا اپنا اکھاڑا ہے ساجن... لیکن میں تمھیں یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ تم اپنا اکھاڑا چھوڑ دو۔"

"نہیں استاد... میں خود کو اپنے اکھاڑے کی گدی کا اہل نہیں سمجھتا۔"

"دیکھو ساجن... تم بہت اچھے پہلوان ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے پٹھوں کو مکمل تربیت بھی دے سکو گے اور یہ بہت بڑا کام ہے۔"

ساجن چند لمحے سوچتا رہا۔ اس کے انداز میں اعتماد نہیں تھا۔ "یہ درست ہے استاد کہ آج کے مقابلے سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں گدی کا اہل نہیں ہوں۔"

"اور تمھارے خیال میں میں گدی کا اہل ہوں؟" استاد نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بالکل ہیں۔"

"تو میری رائے کی کوئی اہمیت بھی ہوگی؟"

"بالکل۔"

"تو میری رائے یہ ہے کہ تم اپنے پہلوانوں کو تربیت سے محروم نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے استاد۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" ساجن نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے کبھی کبھی یہاں آنے کی اجازت ہوگی؟"

"یہ تمھارا اپنا گھر ہے ساجن۔"

"شکریہ استاد۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "کسی بھی وقت، کسی بھی سلسلے میں آپ مجھے حکم دے سکتے ہیں۔ مجھے اپنی ہر خدمت کے لیے مستعد پائیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور رخصت ہو گیا۔

"اب تم بھی آرام کرو برخوردار۔" استاد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے انھیں روکنا چاہا لیکن ان کا کہنا تھا کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔

استاد کے جانے کے بعد میں نے لائٹ آف کر دی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ تھکن بہت زیادہ تھی تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔

صبح حسبِ معمول فجر کے وقت استاد نے مجھے جگا دیا۔ ہم نماز پڑھ کر آئے۔ پھر ناشتہ آ گیا۔

"اب کیا ارادہ ہے برخوردار؟" ناشتے کے بعد استاد نے پوچھا۔

اس وقت میری ذہنی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ اتنے دن اکھاڑے کے چکر میں ذہنی طور پر اس قدر مصروف رہا تھا کہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اکھاڑے کا مسئلہ ابھی پوری طرح حل نہیں ہوا تھا۔ ابھی تو حفیظ کے قاتلوں کا بھی پتہ نہیں چلا تھا اور اکھاڑے کی کالی بھیڑیں سامنے نہیں آئی تھیں لیکن نہ جانے کیوں اب اس سنگینی کا احساس نہیں رہا تھا جو گزشتہ کئی روز سے بے چین کیے ہوئے تھی۔ ذرا سا سکون میسر آیا تو میرا بنیادی مسئلہ بہت بڑے سوالیہ نشان کی طرح پھن کاڑھے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ میرا بنیادی مسئلہ نازو تھی۔ جسے میں تلاش کرتا پھر رہا تھا لیکن کامیابی کا اب تک کوئی امکان نظر نہیں آیا تھا۔ اب تو مجھے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کا آخری سراغ مجھے کب ملا تھا۔ میں الجھ کر رہ گیا۔

"میرا ارادہ کراچی جانے کا ہے استاد۔" میں نے کہا۔

"اچھا خیال ہے۔" استاد نے کہا۔ "کب جاؤ گے؟"

"میرا خیال ہے، آج وکیل سے بات کر لوں۔ کل روانہ ہو جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے برخوردار۔ وہ لوگ بھی تمھارے لیے بہت پریشان ہو رہے ہوں گے۔ میری بٹیا تمھیں بہت چاہتی ہے۔" استاد شفقت آمیز لہجے میں بولے۔

مجھے بے ساختہ ریشماں یاد آ گئی۔ وہ معصوم اور پاکیزہ لڑکی، جو اپنا سب کچھ کھو بیٹھی تھی۔ پھر مجھے گلنا یاد آئی اور میرا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا۔ میرا جی چاہا کہ اڑ کر کراچی پہنچ جاؤں۔

اسی وقت شمشاد نے آ کر اطلاع دی کہ میرا کوئی ملاقاتی آیا ہے۔

"تو اسے اندر بھیج دو نا۔" استاد نے کہا۔ "یہاں کونسا پردہ ہے۔"

شمشاد چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے ایک دُبلا پتلا مریل سا آدمی کمرے میں داخل ہُوا۔ اس کا سر بالوں سے یکسر محروم تھا۔ عمر چالیس پچاس کے درمیان رہی ہو گی۔ اس کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا... وہ جوان العمر تھا لیکن چہرے پر چاپلوسی کا آسنا گہرا تاثر سجائے ہُوئے تھا کہ مجھے یقین ہو گیا.. وہ ادھیڑ عمر آدمی کا مصاحب ہے۔

جوان العمر آدمی نے بہت لپک کر سلام کیا جب کہ گنجے مدقوق آدمی نے بہت دبے لہجے میں سلام کیا تھا۔

ہم نے ان سے ہاتھ ملائے اور بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ میں سوالیہ نگاہوں سے انھیں دیکھتا رہا لیکن وہ اس اطمینان سے بیٹھے تھے جیسے سب وضاحتیں ختم ہو چکی ہوں۔ "آپ لوگوں کو کس سے ملنا ہے؟" میں نے تنگ آ کر پوچھا۔

گنجے آدمی نے جوان العمر آدمی کو جن نظروں سے دیکھا، وہ میرے اندازے کی تائید کرتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ گنجے کے لیے بولنا کسرِ شان ہے۔ "ہمیں نسیم جمال سے ملنا ہے۔" جوان العمر آدمی کی آواز اور لہجے میں بھی خوشامد کا تاثر تھا۔ وہ کوئی منجھا ہُوا درباری معلوم ہوتا تھا۔

"میں ہی نسیم جمال ہُوں۔" میں نے استاد کی طرف دیکھتے ہُوئے جواب دیا جو اُن دونوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھے جا رہے تھے۔

"ہم جانتے ہیں۔ آپ کی تصویر دیکھ چکے ہیں۔" جوان نے کہا۔

"میری تصویر؟ کہاں دیکھی؟" میں چونک گیا۔

"آج کے اخبار میں۔" اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "ساحین سے آپ کی کُشتی کی بڑی گرما گرم خبریں چھپی ہیں۔ آج کے اخبار میں آپ کی تصویر بھی ہے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ "آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "اور آپ حضرات کون ہیں۔ میں تو آپ کو نہیں جانتا۔"

مدقوق آدمی کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ اس کی بھویں کھنچ گئیں۔ جوان العمر آدمی کچھ گڑبڑایا ہوا نظر آنے لگا۔ "میں تو خیر کوئی مشہور آدمی نہیں ہُوں۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن خلیل اعوان صاحب کا نام تو آپ نے سُنا ہو گا۔"

میں نے چند لمحے ذہن پر زور دیا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ خلیل اعوان صاحب ہیں... مشہور فلم ڈائریکٹر۔ ابھی حال ہی میں ان کی فلم چین جگنو نے ڈائمنڈ جوبلی منائی ہے۔ خاکسار کو رمضان کہتے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں انھیں نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "خیر، یہ فرمائیے، کیسے زحمت کی آپ لوگوں نے؟"

رمضان نے اجازت طلب نظروں سے خلیل اعوان کی طرف دیکھا۔ خلیل اعوان نے کھنکار کر گویا اسے بولنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔

"دراصل اعوان صاحب اپنی نئی فلم 'پکھ پہلوان دی' کا آغاز کرنے والے ہیں۔ فلم کی کاغذی کارروائی مکمل ہو چکی ہے۔ یہ بھی بتا دوں کہ خلیل اعوان صاحب بہت حقیقت پسند ہدایت کار ہیں... اور اپنی فلموں کے لیے حقیقی ماحول اور حقیقی کرداروں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں..."

"یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس کا مطلب ہے، یہ ہیرو کی موت کا منظر فلمائیں گے تو درحقیقت اسے مروا دیں گے۔"

خلیل اعوان کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ رمضان بُری طرح گڑبڑا گیا۔ "آ... آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔ "... بات صرف اتنی سی ہے کہ فلم پکھ پہلوان دی کے ہیرو کے کردار کے لیے آپ موزوں ترین آدمی ہیں۔ اعوان صاحب نے ازراہِ عنایت آپ کو اس کردار کے لیے منتخب فرما لیا ہے۔"

اعوان صاحب کی گردن تننے کی کوشش میں ایک جانب جھک گئی۔

"اعوان صاحب کی عنایت کا شکریہ۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "لیکن مجھے فلموں میں کام کرنے کا شوق نہیں ہے۔ میں معذرت چاہتا ہُوں۔"

اعوان صاحب کی گردن ڈھیلی پڑ گئی جب کہ رمضان اور زیادہ بوکھلا گیا۔ "کک... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اس نے کہا۔ "یہ تو آپ کے لیے اعزاز ہے کہ اعوان صاحب نے آپ کو منتخب کر لیا۔ لوگ تو ایسے چانس کے لیے ترستے ہیں جمال صاحب۔"

اس بار مجھے بہت زور کا غصہ آیا لیکن میزبانی کے



آداب کا خیال کر کے مَیں نرم پڑ گیا۔ "اس صورت میں میرا مشورہ ہے کہ آپ ان ترسے ہُوئے لوگوں میں سے کسی کو چانس دے دیں۔ مجھے آپ کی پیش کش سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" مَیں نے خشک لہجے میں کہا۔

"یہ... یہ کیسے ممکن ہے!" رمضان ہکلایا۔

مَیں نے اس پر اظہارِ خیال کرنا مناسب نہ سمجھا، چنانچہ خاموش رہا۔

"آپ شاید رمضان کی بات پُوری طرح سمجھ نہیں سکے۔" اس بار اعوان نے اپنی خاموشی کا قفل توڑا۔ اس کی آواز اس کے جثّے کے برعکس بہت بھاری تھی۔ "مَیں آپ کو اپنی فلم کے مرکزی کردار کی پیش کش کر رہا ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ پیش کش قبول کرتے ہی آپ راتوں رات صفِ اوّل کے ہیرو بن جائیں گے۔"

"اور وہ مَیں بننا نہیں چاہتا۔" مَیں نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ شخص جس رویّے کا مظاہرہ کر رہا تھا، وہ میرے لیے قطعًا ناقابلِ قبول تھا۔ مَیں اس کی پیش کش کسی طور قبول نہیں کر سکتا تھا۔ "مَیں عرض کر چکا ہوں کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

رمضان تو دم بخود ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ خلیل اعوان چند لمحے سوچتا رہا۔ وہ بھی گومگو کی کیفیت سے دوچار تھا۔ "ہم آپ کو معقول معاوضہ دیں گے۔" بالآخر اس نے کہا۔

"اگر آپ کشتی لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں تو مَیں آپ کو اس سے زیادہ معاوضہ پیش کروں گا جو آپ مجھے پیش کرنے والے ہیں۔" مَیں نے توہین آمیز لہجے میں کہا۔

خلیل اعوان کا چہرہ خفت کے احساس سے سُرخ ہو گیا۔ "ہم آپ کو پچیس ہزار روپے دیں گے۔" اس نے کہا۔

"مَیں آپ کو تیس ہزار کی پیش کش کرتا ہوں... صرف ایک کشتی کے لیے۔"

وہ مایوس نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے مصاحب کی طرف دیکھا۔ اس بار مصاحب نے اسٹارٹ لیا۔ "ہم بڑے جذبے سے آپ کے پاس آئے تھے۔" اس نے کہا۔ "ہمیں بڑی اُمید تھی آپ سے۔"

"جی ہاں۔ آپ کو اُمید تھی کہ مَیں یہ مژدۂ جانفزا سنتے ہی اعوان صاحب کے قدموں میں لوٹنے لگوں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو نااُمیدی ہُوئی۔"

خلیل اعوان کچھ پشیمان نظر آنے لگا... پھر بولا تو اس کے لہجے میں بھی پشیمانی تھی۔ "مجھے احساس ہے کہ میرا رویّہ نامناسب تھا۔" اس نے کہا۔ "اس لیے مَیں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اپنی تمام ترخامیوں کے باوجود مَیں اپنے فن کے ساتھ مخلص ہُوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کردار کے لیے آپ سے مناسب آدمی نہیں مل سکتا۔ پلیز اب انکار نہ کیجیے گا۔"

اس کے رویّے نے مجھے بری طرح تپا دیا۔ ویسے بھی مَیں فلموں میں کام کرنے کے موڈ میں نہیں تھا... مجھے تو اگلے روز کراچی جانا تھا۔ "میرا جواب اب بھی نفی میں ہے۔" مَیں نے کہا۔

"گویا آپ نے مجھے معاف نہیں کیا؟"

"یہ بات نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے والوں میں سے ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "یہ بڑائی ہے آپ کی... لیکن میری مصروفیات ایسی ہیں کہ مَیں آپ کی پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اب وہ بے حد مایوس نظر آ رہا تھا۔ رمضان نے بھی اس کی تقلید کی۔ "مجھے اس کا قلق رہے گا۔" اعوان نے کہا۔ "بہرحال، یہ بات طے ہے کہ مَیں آپ کے بغیر وہ فلم نہیں بناؤں گا۔ مَیں شاہ جی سے انکار کر دوں گا۔"

شاہ جی کے تذکرے نے مجھے چونکا دیا۔ مَیں شاہ جی کے بارے میں استفسار کرنے ہی والا تھا کہ مجھے خیال آ گیا کہ شاہ جی میں یہ اچانک دلچسپی اسے میری طرف سے مشکوک کر سکتی ہے۔ معًا مجھے کچھ سوجھ ہی گئی۔ "مَیں آپ کو اس طرح تو نہیں جانے دوں گا۔" مَیں نے کہا۔ "ٹھنڈا پئیں گے یا چائے؟"

"آپ تکلّف نہ کریں۔" اعوان نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ پھر بے حد اصرار پر اس نے چائے پینا قبول کر لیا۔ مَیں نے باہر جا کر بھولے کو چائے لانے کو کہا اور کمرے میں لوٹ آیا۔ اعوان اور رمضان سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مَیں نے استاد کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری ہی طرف متوجہ تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ بھی شاہ جی کے تذکرے کی اہمیت کو سمجھ گئے ہیں۔ ہمارے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ بات ہوئی۔ پھر استاد میدان میں اتر آئے۔ اب تک وہ خاموش ہی رہے تھے۔ "اعوان صاحب، یہ شاہ جی کون ہیں؟" انھوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"افتخار شاہ نام ہے اُن کا۔" اعوان نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "وہ پروڈیوسر ہیں ہماری فلم کے۔"

"یہ پروڈیوسر کیا ہوتا ہے؟"

"فلم میں سرمایہ کاری کرنے والا۔"

"فلم انڈسٹری میں تو بہت سے شاہ جی ہیں۔" مَیں نے کہا۔

"جی ہاں... لیکن ہمارے شاہ جی بہت بڑے آدمی ہیں۔" اعوان نے کہا۔ "عجیب بات ہے، آپ دوسرے آدمی ہیں جنھوں نے شاہ جی کی فلم میں کام کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس سے پہلے ایک ہیروئن نے بھی انکار کر دیا تھا۔"

"کون سی ہیروئن؟" استاد نے بے حد معصومیت سے پوچھا۔

اعوان چند لمحے یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ "نازو نام تھا اس کا۔" بالآخر اس نے کہا... اور میرا دل اچھل کر حلق تک آ گیا۔ "یہ ان دنوں کی بات ہے جب مَیں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوا کرتا تھا۔"

بھولا چائے لے آیا تھا۔ ہم سب چائے پینے میں لگ گئے۔ میرے لیے اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانا دشوار ہو گیا۔

"جمال... میرا خیال ہے، اعوان صاحب کی پیش کش قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں... یہ مجھے روایتی ہدایت کار نہیں معلوم نہیں ہوتے۔"

"جی ہاں... جی ہاں۔" رمضان نے جلدی سے تائید کی۔ خلیل اعوان پُراُمید نظروں سے مجھے تکنے لگا۔

"لیکن استاد..." مَیں نے ہچکچانے کی اداکاری کی۔

"میرا مشورہ تو یہی ہے۔" استاد نے کہا۔

"یقین کیجیے، آپ کو میری پیش کش قبول کر کے افسوس نہیں ہو گا۔ آپ کو ہمارے یونٹ کا ماحول بالکل مختلف ملے گا۔" خلیل اعوان نے کہا۔

"بہتر ہے... مَیں سوچوں گا۔" مَیں نے بظاہر نیم دلی سے کہا... حالانکہ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ "مَیں پہلے آپ کے آفس آؤں گا، ماحول کا جائزہ لوں گا اور آپ کے پروڈیوسر سے ملوں گا، اس کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کر سکوں گا۔"

"ضرور... ضرور" خلیل اعوان نے بے حد خوش ہو کر کہا "مجھے یقین ہے، آپ ہمارے حق میں فیصلہ کریں گے تو کب تشریف لا رہے ہیں آپ؟"

میرے جی میں آئی کہ فوراً اس کے ساتھ چل دوں، لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ جلد بازی کی وجہ سے کام بگڑ جائے "میں کل صبح گیارہ بجے حاضر ہو جاؤں گا..." میں نے کہا۔

"بہت بہتر۔ اچھا اب اجازت" اعوان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ رمضان بھی اٹھ گیا تھا۔ انھوں نے ہم سے معانقہ کیا اور رخصت ہو گئے۔ جانے سے پہلے اعوان نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا تھا جس پر اس کے دفتر کا پتہ تحریر تھا۔ اس کے علاوہ دفتر اور گھر کے فون نمبر بھی تھے۔ اس کے ادارے کا نام راکسی پکچرز تھا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد میں نے کار نکالی اور ملتان روڈ کی طرف چل دیا۔ لاہور کے بیشتر فلم اسٹوڈیوز ملتان روڈ ہی پر ہیں۔ کار کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ چوکیدار نے بلا چون و چرا گیٹ کھول دیا... بلکہ اس نے مجھے ایک زوردار سیلوٹ سے بھی نوازا۔ اندر پہنچ کر دفتر تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ایک آراستہ و پیراستہ دفتر تھا۔ خلیل اعوان دفتر ہی میں موجود تھا۔ اس کا مصاحب رمضان بھی موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے دانت نکال دیے "آیا... آئیے جناب، تشریف لائیے۔ آپ ہی کا انتظار ہو رہا ہے۔"

اعوان نے اسے تیکھی نگاہوں سے دیکھا، پھر اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے دفتر کا تفصیلی جائزہ لیا۔ میز پر اعوان کے سامنے ٹیلی فون رکھا تھا۔ کمرے کی بیشتر آرائش فلموں کے پوسٹرز کی مرہونِ منت تھی۔

"کہیے جمال صاحب، کیسے مزاج ہیں" خلیل اعوان نے شستہ لہجے میں پوچھا۔ آج وہ بالکل مختلف آدمی نظر آ رہا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔"

"کیا منگواؤں آپ کے لیے؟"

"چائے مناسب رہے گی۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"جاؤ... چائے کے لیے بول دو۔ فرسٹ کلاس چائے" اس نے رمضان سے کہا جو فوراً ہی باہر چلا گیا۔ میں پھر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

"دراصل یہاں صبح دیر سے ہوتی ہے" اعوان نے وضاحت کی "رات کو البتہ میلہ سا لگا رہتا ہے۔ اسی لیے تو یہ روشنیوں کی دنیا کہلاتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مختصراً کہا۔

وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا... لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

"میں ایک بار فلم میں سائڈ ہیرو کے لیے منتخب ہو چکا ہوں" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا "میک اپ اور گیٹ اپ وغیرہ کے مرحلوں سے بھی گزر گیا تھا... لیکن کیمرے کا سامنا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔"

"کس نے چانس دیا تھا آپ کو؟" اس نے پوچھا۔

"نام تو مجھے پوری طرح سے یاد نہیں" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "کوئی چوہدری صاحب تھے۔ پھر ان کی فلم کی ہیروئن بھی غائب ہو گئی۔ انھوں نے فلم بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں بھی گول ہو گیا کیونکہ مجھے بھی فلم میں کام کرنے سے دلچسپی نہیں تھی۔"

"لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ فلمی دنیا کا کمبل آپ کو نہیں چھوڑے گا" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

میں بھی ہنس دیا "جی ہاں... لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

رمضان واپس آ چکا تھا۔ اس نے بھی ایک کرسی سنبھال لی تھی، لیکن وہ خاموش تھا۔ غالباً یہ اعوان کی تنبیہی نگاہ کا کمال تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ اسٹوڈیو کا ماحول تو آپ کا دیکھا بھالا ہے" اعوان نے اظہارِ خیال کیا۔

"جی ہاں۔ میں اس ماحول سے بالکل ہی ناآشنا نہیں ہوں۔"

"آپ نے میری پیشکش کے سلسلے میں غور بھی کیا ہو گا؟"

"جی ہاں... اور میں آپ کی پیشکش قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔"

"لیکن میں اپنے کردار کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں...؟"

"وہی ہیرو کا روایتی سا کردار ہے" اعوان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "فلم کا موضوع اسمگلنگ ہے۔ ہمارا ہیرو پیشہ ور پہلوان ہے۔ سادہ لوح ہے، اسی لیے اسمگلروں کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ پھر جب اسے پتہ چلتا ہے تو وہ ان کی بیخ کنی کے چکر میں لگ جاتا ہے۔ آپ کو اداکاری کا خاصا موقع ملے گا اس فلم میں۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ مجھے اسکرپٹ کی ایک کاپی عنایت فرما دیں..." میں نے کہا۔

"اسکرپٹ کی کاپی؟" وہ حیران نظر آنے لگا "مکمل اسکرپٹ تو لکھا ہی نہیں جاتا۔ اسکرپٹ رائٹر سیٹ پر ہی سین لکھتا ہے۔ یوں مشورہ بھی ہو جاتا ہے۔"

"کمال ہے، پھر کاغذی کارروائی مکمل ہو جانے سے آپ کی کیا مراد تھی؟"

"بس یونہی... یہ تو ایک اصطلاح ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ سے معاہدے کے بعد کاسٹ فائنل ہو جائے گی۔"

"خیر... تو مجھ سے معاہدہ کب کرنا چاہیں گے آپ؟"

"نیک کام میں دیر کیسی؟"

"لیکن پہلے میں آپ کے شاہ جی سے ملنا چاہتا ہوں" میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ پروڈیوسر کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ وہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ بعد میں کوئی بدمزگی ہو۔ میرے مزاج میں سرکشی بہت ہے۔"

"ارے... اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں" اعوان نے لہک کر کہا "ہمارے شاہ جی اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ہمارے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتے۔ انھیں تو شیڈول کے مطابق فلم تیار چاہیے... اور بس۔"

"پھر بھی معاہدے سے پہلے میں ایک بار ان سے ملنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

"تو چلیے، آج ہی مل لیتے ہیں" اعوان نے کہا۔ "چائے ختم کر لیجیے۔"

میں نے چائے کی پیالی خالی کر کے میز پر رکھی۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اعوان نے رمضان کو دفتر ہی میں ٹھہرنے کی ہدایت کی اور میرے ساتھ باہر نکل آیا "دراصل شاہ جی کا ڈسٹری بیوشن کا بھی کاروبار ہے۔ اس وقت وہ اپنے لکشمی چوک والے دفتر میں ہوں گے۔" وہ اچانک خاموش ہو گیا "بہتر ہے کہ میں ٹیلی فون پر انھیں مطلع کر دوں۔ یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ وہ موجود ہیں یا نہیں۔ آپ ایک منٹ رکیں... میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ دفتر میں چلا گیا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ چند لمحے بعد وہ دفتر سے برآمد ہوا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "شاہ جی موجود ہیں۔" اس نے کہا۔

احاطے میں پہنچ کر میں اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ "آئیے... تشریف لائیے۔" میں نے اس کے لیے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"یہ کار آپ کی ہے؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں۔"

"اکھاڑے میں آپ کی، معاوضے والی بات کو میں مذاق سمجھا تھا..."

"وہ مذاق نہیں تھا" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"جی ہاں... اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ ویسے آپ اپنا مکمل تعارف کرا دیں نا۔"

"تعارف کیا... میرا نام نسیم جمال ہے۔ ویسے اسلم انڈسٹریز میری ہی ملکیت ہے۔ کراچی میں بھی میرا کاروبار ہے۔"

وہ بُری طرح مرعوب ہو گیا۔

لکشمی چوک میں ڈسٹری بیوشن کے سینکڑوں دفاتر ہیں۔ وہاں پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ شاہ جی کا ڈسٹری بیوشن کا کاروبار دینار فلمز کے نام سے ہے۔ وہ ایک کمرے کا عام سا دفتر تھا جسے پارٹیشن کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی سیکریٹری کی میز تھی، جس پر ٹیلی فون اور انٹرکام رکھے تھے۔ ایک سائڈ پر ٹائپ رائٹر تھا۔ سیکریٹری اس وقت موجود نہیں تھی۔ خلیل اعوان نے ایک کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی... پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

اندرونی کمرہ اس قدر مختلف تھا کہ باہر سے اس کے متعلق اندازہ لگایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے کشادگی کے سلسلے میں بھی میرے اندازے کو مات دے دی تھی۔ آرائش کے اعتبار سے وہ کسی بہت بڑے بنگلے کے ڈرائنگ روم سے کم نہیں تھا۔ جہازی سائز کی میز تھی۔ میز کے ایک طرف قیمتی صوفہ سیٹ تھا

... اور دوسری طرف ایک کاؤچ۔ وزیٹرز چیئرز بھی بے حد قیمتی رہی ہوں گی۔ دیواروں پر فلموں کے پوسٹرز کی بجائے خوبصورت پینٹنگز آویزاں تھیں، لیکن شاہ جی مجھے کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ میز کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر ایک جواں سال آدمی بیٹھا ایک بے حد حسین پینٹنگ سے گفتگو کررہا تھا۔ وہ اس کمرے کی حسین ترین پینٹنگ تھی ... اور لطف یہ کہ وہ متحرک تصویر سانس بھی لے رہی تھی۔ وہ جواں سال آدمی کی میز پر اس ادا سے دونوں ہاتھ ٹکائے جھکی کھڑی تھی کہ بے ساختہ بنارس کی صبح کا خیال آتا تھا، جس کے بارے میں، میں نے صرف پڑھا ہی پڑھا تھا ... جسے دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ میز کے اس طرف کرسی پر ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کا جسم گردن سے محروم تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ درمیان سے گردن نکال کر اس کے سر کو کندھوں سے منسلک کر دیا گیا ہو۔ اس کا چہرہ کسی پھٹی ہوئی قمیص کی طرح تھا، جسے بڑی بے پروائی سے سوئی دھاگے کی مدد سے سی کر کسی حد تک قابلِ قبول بنا لیا گیا ہو۔

خلیل اعوان کے سلام کرنے پر میز کے عقب میں بیٹھا ہوا جواں سال آدمی چونکا ... تصویر بھی چونکی۔ اُن دونوں نے بیک وقت ہماری طرف دیکھا۔ میں ایک نظر میں اُن دونوں کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا ... بلکہ ایک نظر تو اُس بُتِ طناز کے چہرے کا جائزہ لینے کے لیے بھی ناکافی تھی۔ اس نے بھی سرتاپا میرا جائزہ لیا، پھر اس کی نگاہوں میں لمحے بھر کو پسندیدگی جھلکی ... اور معدوم ہوگئی۔ میں نے جواں سال آدمی کی طرف دیکھا۔ اس سے میری نظریں ملیں۔ اس کی آنکھوں سے اس کی جہاں دیدگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ جتنا کم عمر نظر آرہا تھا، اتنا تھا نہیں۔ بظاہر اس کی عمر تیس، اکتیس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی، لیکن اس کی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ اس کی عمر ۴۵ سے کم نہیں ہے۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ وہ اوباش فطرت کا مالک ہے۔

"آؤ اعوان، بیٹھو۔" اس نے کہا۔

اعوان نے میرا اور اس کا تعارف کرایا۔ "یہ نسیم جمال صاحب ہیں۔" اس نے کہا۔ "جن کے سلسلے میں ابھی میں نے فون پر آپ سے بات کی تھی ... اور جمال صاحب! یہ ہیں شاہ جی۔"

میں حیران رہ گیا۔ میرے ذہن میں شاہ جی کا جو تصور تھا، وہ اس سے بہت مختلف تھا۔ وہ کوئی بہت ہی ماڈرن شاہ جی تھا۔ وہ فیشن کوٹ سوٹ میں ملبوس کلین شیو آدمی تھا۔ میرے تصور والے شاہ جی کی کوئی بات اس میں نہیں تھی۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" شاہ جی نے رسمی انداز میں کہا اور مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا ہاتھ بے حد پلپلا تھا جب کہ دوسری طرف اُس کے جبڑوں کی بناوٹ سفاکی کی مظہر تھی۔

"اور کیا حال ہے، فلم کی شوٹنگ شروع ہوگئی؟" شاہ جی نے اعوان سے پوچھا۔

"بس ... انشاءاللہ جلد ہی شروع ہو جائے گی۔ کاسٹ فائنل ہو چکی تھی۔ ہیرو کے رول کے سلسلے میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ پھر جمال صاحب نے میری مشکل حل کر دی۔ میں اس فلم کے لیے انھیں سائن کر رہا ہوں۔"

اس بار شاہ جی نے مجھ پر تفصیلی نظر ڈالی۔ فوراً ہی اُس کی آنکھوں میں ایک لحظے کے لیے شناسائی کا تاثر جھلکا ... لیکن اگلے ہی لمحے وہ سپاٹ ہوگئیں۔ دوسری طرف لڑکی بھی مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ میرا جسم سنسنانے لگا۔ شاید شاہ جی نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"تب تو تفصیلی تعارف کرانا ہوگا اعوان صاحب!" لڑکی نے رسیلی آواز میں کہا۔ "ہمیں پتہ تو چلے کہ مستقبل کا بہت بڑا ہیرو کس طرح دریافت کیا گیا ہے۔"

میں نے چونک کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر طنز کر رہی ہے ... لیکن اس کی نگاہوں میں ستائش ہی ستائش تھی۔

"شہلا ٹھیک کہہ رہی ہے۔" شاہ جی نے لڑکی کی تائید کی۔ وہ مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میری فلم کا ہیرو ایک پیشہ ور پہلوان ہے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ کردار کوئی ایسا شخص ادا کرے جو ہیرو لگتا بھی ہو اور پہلوانی کے ... داؤ پیچ سے آشنا بھی ہو۔ خوش قسمتی سے کل کے اخبار میں جمال اور ساجن کی کشتی کے بارے میں خبر چھپی۔ جمال کی تصویر بھی موجود تھی۔ مجھے ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ جمال اس کردار کے لیے موزوں ترین آدمی ہے۔"

"اچھا ... تو یہ پہلوان ہیں۔" شاہ جی نے کہا۔ اس دوران اُس نے گردن بغیر کی طرف دیکھا تھا اور اس کی آنکھیں کوئی پیغام دیتی محسوس ہوئی تھیں۔

"بناسپتی پہلوان ہوگا۔" گردن بغیر نے توہین آمیز لہجے میں کہا۔

"اس کا پتہ تو تمھیں اکھاڑے ہی میں چل سکتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ بُری طرح تپ گیا۔ "اکھاڑے کے محتاج تو تم جیسے بناسپتی پہلوان ہی ہوسکتے ہیں۔ میں تو یہاں بھی اپنے جوہر دکھا سکتا ہوں۔"

"اکھاڑے کا حوالہ تو صرف کھیل کے لیے ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے لیے تو آپریشن تھیٹر مناسب جگہ ہوگی۔"

"اوئے، مطلب کیا ہے تمھارا؟" وہ آستینیں چڑھانے لگا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم گردن سے محروم ہو۔ لیکن ایک اچھا ڈاکٹر تمھارے کندھوں کے ایک حصے کو خاصی لمبی ... میرا مطلب ہے، صراحی دار گردن میں تبدیل کر سکتا ہے لیکن اس صورت میں تم زرافہ لگنے لگو گے۔ کہو تو میں آپریشن کر دوں؟"

وہ کف اڑانے لگا۔ میں سکون سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

"شاہ جی ... آپ ساکے کو سمجھائیں۔ یہ بدتمیزی کر رہا ہے۔" اعوان نے احتجاج کیا۔

"یہ نہیں دیکھتے کہ اس نے کیا کیا بکواس کی ہے۔ اب تو میں اس کی پہلوانی نکالوں گا۔" گردن بغیر نے دہاڑ کر کہا۔

"پہل تم نے ہی کی تھی۔ تم نے جمال صاحب کو بناسپتی پہلوان کہا تھا۔" اعوان نے ترکی بہ ترکی کہا۔ پھر وہ شاہ جی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "آپ اسے سنبھالیں شاہ جی۔ میں نے آپ سے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ میں اپنے معاملات میں آپ کی مداخلت بھی برداشت نہیں کروں گا۔ یہ تو محض آپ کا چمچہ ہے۔"

ایک لمحے کے لیے شاہ جی کا رنگ متغیر ہوگیا۔ لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ "اے ساکے ... چپ چاپ سے ایک طرف بیٹھ جاؤ۔" اس نے گردن بغیر کو حکم دیا۔

میں اس دوران اس حسینہ کو دیکھتا رہا تھا جس کا نام شہلا تھا۔ اس کی نگاہوں میں چمک تھی جیسے وہ صورتِ حال سے محظوظ ہو رہی ہو۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ اعوان نے شاہ جی سے اس لہجے میں بات کی ... اور شاہ جی نے اُسے برداشت بھی کر لیا۔ لیکن میں بات ختم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"اعوان صاحب! میں آپ کا ... اور شاہ جی کا شکرگزار ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ نے میزبانی کے آداب کا خیال رکھا۔ لیکن میرے خیال میں اس لفنگے کو سبق دینا بہت ضروری ہے تاکہ اسے علم ہو جائے کہ مہمانوں سے کس طرح بات کی جاتی ہے۔"

ساکا پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کافی تھا۔

"بیٹھ جاؤ ساکے۔" اعوان نے کہا۔ "شاہ جی، اسے سنبھالیں۔"

"اب صورتِ حال مختلف ہے۔" شاہ جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب میں ساکے کو روکنا ضروری نہیں سمجھتا۔"

"خواہ میرے اور آپ کے کاروباری تعلق کا خاتمہ ہو جائے۔"

"دیکھو اعوان۔ میں نے کبھی تمہارے معاملات میں مداخلت نہیں کی۔ لیکن یہ اب تمہارا معاملہ نہیں رہا ہے۔" شاہ جی کا لہجہ نرم تھا لیکن اس میں قطعیت تھی۔ "جمال صاحب نے ساکے کو چیلنج کیا ہے۔ اب یہ معاملہ میرا ہے اور نہ تمہارا۔ ذرا معقولیت سے سوچو... اور اس کے باوجود تعلق توڑنا چاہو تو تمہاری مرضی۔ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"لیکن پہل ساکے نے کی تھی۔" اعوان نے کمزور لہجے میں کہا۔

"اسے جواب بھی اسی لہجے میں ملا تھا۔ پھر میں نے بھی اسے ڈانٹ کر بٹھا دیا تھا۔ وہ بات ختم ہو گئی تھی۔ اب بات دوسری ہے۔"

اعوان کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "آپ فکر نہ کریں اعوان صاحب۔ آپ نے تعلق داری بخوبی نبھائی ہے۔"

"تو پھر... اب باہر آ جاؤ۔" ساکے نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"باہر کیوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "تم تو ہر جگہ لڑ سکتے ہو۔"

"تم شاہ جی کے دفتر کا کباڑہ کرنا چاہتے ہو؟" ساکا غرایا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" شاہ جی نے ہنس کر کہا۔ "میں تو ویسے بھی دفتر کا فرنیچر اور ڈیکوریشن کا انداز تبدیل کرانا چاہتا ہوں۔"

"وہ آپ کی مرضی ہے جناب۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ یہاں ٹوٹ پھوٹ بالکل نہیں ہوگی... بشرطیکہ اس جانور کا شمار آپ فرنیچر میں نہ کرتے ہوں۔ اس کے علاوہ جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی، اس کا ہرجانہ میں ادا کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" شاہ جی نے گویا منظوری دے دی۔

"اور خاتون... آپ یہاں اسی طرح کھڑی رہیے گا۔" میں نے شہلا سے کہا۔ "انشاء اللہ آپ کو ہلنے کی زحمت بھی نہیں کرنا پڑے گی۔"

شہلا نے متبسم نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں صوفے سے اٹھا اور ننگا ہوں ہی ننگا ہوں میں ساکے کو تولتا ہوا اس کی طرف بڑھ گیا۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ روایتی بدمعاش ہے، جو ہر خوش پوش آدمی کو تر نوالہ سمجھ لیتا ہے۔ "آؤ بھی گردن بغیر۔" میں نے قریب پہنچ کر اسے پکارا۔ "میں تمہارا آپریشن کر دوں۔ اس کے بعد تم چڑیا گھر میں سجو گے۔"

وہ دانت پیستا ہوا میری طرف جھپٹا۔ میں اپنی حکمت عملی پہلے ہی ترتیب دے چکا تھا، چنانچہ افتادہ تر دیوار کی طرف پسپا ہو گیا۔

"لونڈیوں کی طرح بھاگ کیوں رہے ہو؟" اس نے چنگھاڑ کر کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں تم پر ہاتھ اٹھانا کسر شان سمجھتا ہوں۔ اس لیے اسی طرح اپنا کام چلاؤں گا۔"

اس بار وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ نسبتاً زیادہ رفتار سے میری طرف جھپٹا۔ میں نے اس پر نظر رکھی۔ اس نے لات چلائی۔ میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے اس کی بڑھتی ہوئی ٹانگ کو تیزی سے بائیں جانب گھما دیا۔ یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا... وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس پر ستم ٹانگ کی خلاف مرضی حرکت نے ڈھایا۔ وہ ایک کربناک چیخ مار کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے کولہے کی پیالی کی ہڈی تڑخ گئی ہے۔ میں اطمینان سے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ ساکا دردناک انداز میں چیختے جا رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" شاہ جی نے تیز لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن آپ لوگ گواہ ہیں کہ میں نے حسب وعدہ اس پر ہاتھ اٹھانے سے گریز کیا ہے۔"

شہلا کی نگاہوں میں پسندیدگی اور ستائش کے علاوہ ایک اور جذبہ بھی چمکنے لگا تھا۔ لیکن وہ کوئی خوبصورت اور لطیف جذبہ نہیں تھا۔ میں اس سے نگاہیں چرانے پر مجبور ہو گیا۔

"اب اس کا کیا ہوگا؟" شاہ جی نے پوچھا۔ روئے سخن ساکے کی طرف تھا، جو اب بھی کسی ذبح ہوتے ہوئے جانور کی طرح ڈکراتے جا رہا تھا۔

"کچھ عرصہ اسپتال میں رہے گا... اور مفت کی روٹیاں توڑے گا۔ ویسے مفت کی روٹیاں تو یہ یہاں بھی توڑتا رہا ہوگا۔"

"تو اسے اسپتال لے کر چلو نا۔"

"میں یہاں ہیرو کی حیثیت سے آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ مجھ سے کباڑ ڈھونے کا کام نہیں لے سکتے۔"

"اسپتال ٹیلی فون کر کے ایمبولینس منگوا لیں۔" شہلا نے مشورہ دیا۔

شاہ جی جلدی سے اسپتال کا نمبر ملانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ اس نے کسی پرائیویٹ کلینک سے رجوع کیا ہے۔ وہاں غالباً اس کے ذاتی تعلقات رہے ہوں گے۔ گفتگو کے دوران ساکے کی چیخیں اسے ڈسٹرب کرتی رہیں۔ ایک مرتبہ تو وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر دہاڑا بھی تھا۔ "چپ ہو جا مردود۔" لیکن مردود اتنی اذیت میں تھا کہ اس تک وہ دہاڑ پہنچی بھی نہیں ہو گی۔

ریسیور کریڈل پر ڈال کر شاہ جی نے اپنی عرق آلود پیشانی کو رومال سے صاف کیا۔ پھر بولا۔ "اسے بیرونی کمرے میں پہنچا دو۔"

"یہ آپ کی چیز ہے۔ آپ ہی اسے برتیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

شاہ جی دانت پیس کر رہ گیا۔ لیکن اسے اٹھانا ہی پڑا۔ اس نے ساکے کو اٹھانا چاہا لیکن وہ اس کے بس کا نہیں تھا۔ کامگری خلیل اعوان اس کی مدد کے لیے بڑھ گیا۔ ان دونوں نے بمشکل گھسیٹ کر ساکے کو باہر نکالا۔ بند دروازے کے پیچھے سے اب بھی اس کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن آواز بہت ہلکی تھی۔

اچانک اپنے قریب گرم سانسوں کے لمس نے مجھے چونکا دیا۔ ساتھ ہی دلنواز خوشبو کا احساس بھی ہوا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ شہلا میرے قریب کھڑی تھی۔

"آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔" اس نے سرگوشی کی۔ میں بری طرح گڑبڑا کر رہ گیا۔ چند لمحے پہلے اس کی آنکھوں کے تاثر ہی نے مجھے دہلا دیا تھا۔ کجا یہ کہ وہ اب مجھ پر مہربان بھی ہو رہی تھی۔

"مجھ سے ملیے گا... لیکن آفس سے باہر۔" اس نے مزید کہا۔ "دراصل شاہ جی... میرے سلسلے میں بہت جلدی رقابت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کھنک دار ہنسی ہنسنے لگی۔

اب مجھے اس سے کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا بے پناہ حسن میرے لیے اہمیت کھو بیٹھا تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

"آپ مجھے فون کر لیجیے گا۔ ملنے کا وقت طے کر لیں گے۔" اس نے کہا اور پیچھے ہٹ گئی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور شاہ جی اور اعوان اندر داخل ہوئے۔ وہ دونوں بری طرح ہانپ رہے تھے۔ شاہ جی بھی میرے ساتھ ہی صوفے پر آ بیٹھا۔ اعوان صاحب کی حالت خراب تھی۔ شاہ جی چند لمحے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے شہلا کو مخاطب کیا۔ "جاؤ... اب اچھی سکریٹری کی طرح کافی بلواؤ ہمیں۔"

شہلا شاخِ گل کی طرح لچکتی ہوئی باہر نکل گئی۔ شاہ جی کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "عجیب انداز میں آپ سے تعارف ہوا ہے جمال صاحب۔" اس نے کہا۔ "تاہم، مجھے آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی۔"

"ابھی پوری طرح تعارف نہیں ہوا ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"وہ بھی ہو جائے گا۔ آخر اب آپ ہم سے وابستہ ہو ہی گئے ہیں۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "ویسے آپ پہلوان کہیں سے نہیں لگتے۔ اسی لیے تو ساکا بھی دھوکا کھا گیا، ورنہ اتنی آسانی سے آپ اسے زیر نہیں کر سکتے تھے۔"

"اس قماش کے لوگ ایسے دھوکے اکثر کھاتے رہتے ہیں۔" میں نے بیزار لہجے میں کہا۔ "طاقت اور فن سے زیادہ اہم چیز مدمقابل کے بارے میں اندازہ لگانا ہوتا ہے۔ ہر پہلو پر نظر رکھنا ہوتی ہے۔ آپ دیکھ لیں، آپ کے دفتر کی کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچا۔"

وہ مسکرا کر رہ گیا۔ پھر وہ اعوان کی طرف متوجہ ہوا۔ "جمال صاحب کو سائن کر لیا ہے آپ نے؟" اس نے پوچھا۔

اعوان نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میرا خیال ہے، اب یہ رسمی کارروائی بھی مکمل کر ہی لی جائے۔" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" میں نے جواب دیا۔

اعوان صاحب نے فوراً جیب سے کنٹریکٹ فارم نکالا... میز سے قلم اُٹھایا اور فارم کی خانہ پُری میں مصروف ہو گیا۔

"معاوضہ کیا طے پایا ہے؟" شاہ جی نے پوچھا۔

اعوان نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "پچیس ہزار مناسب رہے گا؟" اُس نے پوچھا۔

میں جواب دینے ہی والا تھا کہ مجھے معاوضے کی کوئی پروا نہیں... اور نہ ہی ضرورت ہے، لیکن اس سے پہلے ہی شاہ جی بول پڑا۔ "پہلی فلم کا معاوضہ ۲۵ ہزار... کیا باتیں کر رہے ہیں اعوان صاحب؟" اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں اتنے کم معاوضے پر کام نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "میں ۵۰ ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔"

شاہ جی کا منہ فرطِ حیرت سے کھل گیا... اور دیر تک کھلا رہا۔

"چلیے یہی سہی۔" اعوان نے کہا اور پھر فارم پر جھک گیا۔

"کیا اندھیر مچا رہے ہو اعوان صاحب۔" شاہ جی نے واویلا کرنے والے انداز میں کہا۔

اعوان نے پھر نظریں اٹھائیں۔ "شاہ جی... یہ میرا معاملہ ہے اور یہ طے ہے کہ آپ اس میں مداخلت نہیں کریں گے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" شاہ جی نے ہتھیار ڈال دیے۔

اعوان نے فارم بھر کر میری طرف بڑھایا اور میں نے اس پر دستخط کر دیے۔ اتنی دیر میں شہلا کافی لے آئی تھی۔

"ایڈوانس کتنا؟" اعوان نے مجھ سے پوچھا۔

"جتنا جی چاہے... اور جب جی چاہے، دے دیجیے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

شاہ جی نے یہ سن کر سکون کا سانس لیا۔

"ٹھیک ہے۔ کل لے لیجیے گا۔" اعوان نے کہا۔

کافی پی کر میں اور اعوان اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ٹھیک ہے۔ اب تو آپ سے ملاقات رہے گی جمال صاحب۔" شاہ جی نے کہا۔

"جی ہاں، کیوں نہیں۔" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ شہلا کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ میں اور اعوان کمرے سے نکل آئے۔

"مجھے تمہارا یہ نیا ہیرو ایک آنکھ نہیں بھایا۔" بند ہوتے ہوئے دروازے کے پیچھے سے مجھے شہلا کی آواز سنائی دی۔ وہ آواز جذبات سے بوجھل تھی۔ میں زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔

"تو آپ کل دس بجے اسٹوڈیو والے دفتر میں آ جائیے گا۔" اعوان نے باہر آنے کے بعد مجھ سے کہا۔ "کہانی پر اور آپ کے کردار پر کچھ گفتگو کریں گے... شوٹنگ بھی جلد ہی شروع ہو جائے گی۔"

"بہت بہتر۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا خدا حافظ۔"

"کیا مطلب؟ آپ میرے ساتھ نہیں چلیں گے؟"

"آپ زحمت نہ کریں۔ میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔"

بہت اصرار کے بعد اس نے کار میں بیٹھنا قبول کیا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی۔ کار آگے بڑھاتے بڑھاتے میری نظر اٹھ گئی۔ بیرونی کمرے کی کھڑکی سے شہلا جھانک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔

میں نے اعوان کو اسٹوڈیو ڈراپ کیا اور الٹے واپس چلا آیا۔ پتہ چلا کہ میری عدم موجودگی میں کراچی سے گلنار کا فون آیا تھا۔ استاد نے اسے میری خیریت سے مطلع کر دیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر میں آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ یہ وقت تھا نئی صورتِ حال پر غور کرنے کا...

مجھے یقین تھا کہ شاہ جی نے مجھے پہچان لیا ہے... لیکن کس حیثیت سے۔ وہ تو شاید مجھے اس شخص کی حیثیت سے جانتا تھا، جو نازو کی خاطر اُس کے غنڈوں سے ٹکرا گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب اُس کے ذہن میں کیا ہے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس سے قریب ہو جاؤں تاکہ نازو کے سلسلے میں اس سے معلومات حاصل ہو سکیں۔ نہ جانے کیوں... لیکن مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں جلد ہی منزل کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

اگلی صبح میں اسٹوڈیو پہنچا۔ دفتر میں خلیل اعوان اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اس کی کوئی فلم نہیں دیکھی تھی... بلکہ مجھے تو بڑی مدت سے فلم دیکھنے کی فرصت نہیں ملی تھی

... لیکن اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت اچھا ہدایت کار ہے۔ عام ہدایت کاروں کے برعکس وہ مناظر کو زیادہ حقیقی انداز میں فلم بند کرنے کا قائل تھا۔ تجارتی اعتبار سے وہ بہت کامیاب ہدایت کار تھا۔ اس کی فلموں کے موضوعات میں کوئی ندرت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن وہ فلم بینوں کے مزاج کو پہچاننے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی فلمیں بارہ مسالے کی چاٹ ہوتی تھیں۔ فائٹ کے سین بکثرت ہوتے تھے... اور اس قدر جاندار ہوتے تھے کہ فلم بین بے ساختہ تالیاں پیٹنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ وہ انھیں بے حد حقیقی انداز میں عکس بند کرتا تھا۔ اس کے اندر ایک بہت مشکل پسند فنکار چھپا ہوا تھا۔ تشدد کے مناظر فلمانے میں اُس کا جواب ہی نہیں تھا۔ اس کے ہیرو... چاکلیٹ ہیرو نہیں ہوتے تھے۔ وہ عموماً جاندار اداکاروں کو کاسٹ کرتا تھا تاکہ فائٹ کے سین تاثر انگیز ثابت ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ معروف اداکار اُس کی فلموں میں کام کرنے سے کتراتے تھے، لیکن اس کی فلموں کی مسلسل کامیابی نے کئی ایسے اداکاروں کو صفِ اول میں پہنچا دیا تھا، جو اُس کی فلموں میں کام کرنے سے پہلے تیسرے درجے کے اداکار کہلاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اب ہر معروف اداکار اس بات کا منتظر رہتا تھا کہ خلیل اعوان اسے اپنی فلم میں کاسٹ کرے۔ اس کے لیے وہ اپنی نکسیر بہنے اور ہڈی ٹوٹنے کا خطرہ مول لینے کے لیے بھی تیار تھے۔

"گنگ پہلوان" کے ہیرو کی حیثیت سے میرا انتخاب بھی اس کی مشکل پسندی کا مرہونِ منت تھا۔ کہانی کا ہیرو پہلوان تھا۔ فلم میں اس کی کئی فائٹس تھیں۔

"مجھے ایسے ہیرو کی ضرورت تھی، جسے فائٹ انسٹرکٹر کی ہدایت کی ضرورت نہ ہو۔" اُس نے وضاحت کی۔ "جو اسکرین پر لڑتا ہوا نظر آئے تو اسٹریٹ فائٹر نہ لگے، بلکہ ایسا پہلوان لگے جو رنگ کے باہر لڑنے پر مجبور ہو گیا ہو..."

میں نے ستائشی نظروں سے اُسے دیکھا۔ اگر اُس کا ذہن حقیقت سے قریب تر موضوعات کی طرف چل پڑا ہوتا تو اُس نے تہلکہ مچا دیا ہوتا۔ وہ یقیناً عالمگیر شہرت حاصل کر سکتا تھا۔

اس نے کہانی کا مکمل خاکہ مجھے سنا دیا تھا... اور

میرے کردار کے بارے میں بھی بہت کچھ بتا دیا تھا۔ مجھے وہ کردار پسند بھی آیا... حالانکہ فلم میں کام کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تاہم جب تک شاہ جی سے معلومات حاصل نہ ہوں، مجھے فلم میں کام کرنا ہی تھا، کیا پتہ، اس دوران فلم مکمل بھی ہو جائے۔

پھر فلم کا مصنف بھی آ گیا۔ اس کا نام جاذب بریلوی تھا۔ وہ انتہائی موٹا اور پلپلا آدمی تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے آتے ہی کچھ کاغذات اعوان کی طرف بڑھا دیے۔ اعوان چند لمحے ان کاغذات کا بغور جائزہ لیتا رہا، پھر اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ "یہ کیا لکھ لائے ہو تم؟" وہ بری طرح دہاڑا۔ "تمھیں لکھنا کب آئے گا۔ پانچ سال سے مصنف بنے بیٹھے ہو... گدھے کہیں کے۔"

اُس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ جاذب بریلوی آہم ہاتھی ہے۔ وہ ہر چیز جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس وقت اس کے وجود اور رویے کے پیش نظر مجھے اس کے لیے صرف ایک تشبیہ سوجھ رہی تھی... وہ تھی اسفنج!

جاذب بریلوی نے اعوان کی ڈانٹ ڈپٹ کو بڑی خندہ پیشانی سے جذب کر لیا۔ "فائٹ سین لکھا ہے جناب!" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"فائٹ سین! کس اُلو کے پٹھے نے تم سے فائٹ سین لکھنے کو کہا تھا..."

"عالی جناب... آپ ہی نے تو کہا تھا..."

"تو پھر میں واقعی اُلو کا پٹھا ہوں۔" اعوان نے اپنا سینہ پیٹتے ہوئے کہا۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی، لیکن اعوان بڑی بے نیازی سے اپنی ہانکتا رہا۔ "اللہ کے بندے... میں تو فائٹ سین فلمانے کا قائل ہوں... لکھوانے کا نہیں اور پھر فائٹ سین لکھوانا بھی پڑا تو تم سے لکھواؤں گا! تم سے تو بلا بھی نہیں جاتا۔ تم کیا فائٹ سین لکھو گے۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں۔" جاذب بریلوی نے بے حد خلوص سے کہا۔ "میں مزاج کے اعتبار سے رومانی آدمی ہوں۔ رومانوی سین ایسے لکھ سکتا ہوں..."

"رومانوی سین!" اعوان نے بُرا سا منہ بنایا۔ "تمھارے لکھے ہوئے رومانوی سین من و عن فلما لیے جائیں تو معاملہ سنسر کی حدود سے نکل کر حدود کی حدود میں داخل ہو جائے... اور تمام یونٹ ہتکڑی پہ بندھا نظر آئے۔"

اس بار میں نے چھت شگاف قہقہہ لگایا۔ اعوان یوں میری طرف متوجہ ہوا، جیسے اسے پہلی بار میری موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ "دیکھ لیجیے آپ۔" اس نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔ "آپ کو حیرت تھی کہ مکمل اسکرپٹ نہیں ہے۔ اگر میں مکمل اسکرپٹ لکھواؤں اور اسے بڑی سعادت مندی سے پکچرائز کر لوں تو یقین کیجیے ایڈیٹنگ کے بعد فلم تو ہوگی کوڑے کی ٹوکری میں... اور ٹریلر کو بطور فلم ریلیز کرنا پڑے گا۔"

مجھے پھر ہنسی آ گئی۔ جاذب نے بھی بتیسی نکال دی۔ "عالی جناب... آپ کی حسِ مزاح کا تو میں پہلے ہی سے قائل ہوں۔" اس نے اعوان کو مکھن رسید کیا۔ "میرا دعویٰ ہے کہ آپ سے اچھے مزاحیہ سین، مع مکالمات اس پوری انڈسٹری میں کوئی نہیں لکھ سکتا۔"

"لعنت ہے تمھارے ذوق پر۔" اعوان نے جھنجلا کر کہا۔ "تم ٹریجڈی کو کامیڈی قرار دے رہے ہو؟"

اور جاذب صاحب نے بڑے خلوص سے وہ لعنت بھی جذب کر لی۔

اعوان نے ان کاغذات کے پرزے پرزے کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیے، جو اسے جاذب نے لا کر دیے تھے۔

"عالی جناب... ابھی تک میں نے صرف دو سین لکھنے کی ان گنت لیکن ناکام کوششیں کی ہیں... اور میرا ڈیڑھ کلو کاغذ خرچ ہو چکا ہے۔" جاذب نے فریاد کی۔

"بکواس مت کرو۔" اعوان نے نرم لہجے میں کہا۔ "عنقریب میں تمھیں فائٹ کی فائنل شوٹنگ دکھاؤں گا... ٹیکنگ کے وقت... اسے دیکھ کر تم اسکرپٹ لکھنا تاکہ یہ کہہ سکو کہ تم اس ملک کے سب سے بڑے اسکرپٹ رائٹر ہو۔"

"بہت بہتر جناب۔ میں نے تو سب کچھ آپ ہی سے سیکھا ہے۔" جاذب نے خاکسارانہ انداز میں کہا۔ "آپ میرے استاد..."

"بس بس... کیوں میرا بیڑا غرق کراؤ گے۔" اعوان نے احتجاج کیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں... کیوں نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو آئیے۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "یار جاذب، تم یہیں بیٹھو۔ ممکن ہے، شاہ جی آئیں۔ مجھے پوچھیں تو کہہ دینا کہ لوکیشن تلاش کرنے نکلا ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔"

باہر نکل کر ہم کار میں آ بیٹھے۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق ڈرائیو کرتا رہا۔ کار لاہور کے نواحی علاقے کی طرف چلتی رہی۔ پھر ہم لاہور کی حدود سے نکل آئے۔ راستے میں کئی جگہ اس نے کار رکوائی۔ اسے کسی ویرانے کی تلاش تھی... حالانکہ وہاں ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ تھا۔

اس نے چوتھا ویرانہ بھی مسترد کر دیا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ "آپ کس قسم کے سین کے لیے لوکیشن تلاش کر رہے ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"فائٹ سین کے لیے۔"

"میرے خیال میں تو وہ ساری جگہیں مناسب تھیں، جو آپ نے رد کر دیں۔"

"آپ نہیں سمجھے۔" اس نے مختصراً کہا۔ پھر میرے چہرے کا تاثر دیکھتے ہوئے فوراً ہی وضاحت بھی کر دی۔ "مجھے ایک ایسے ویرانے کی تلاش ہے، جہاں جھاڑیوں کے درمیان گھومتی ہوئی ایک طویل پگڈنڈی ہو۔"

میں نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور کار کی طرف چل دیا۔ بالآخر اعوان کو اپنی پسند کی جگہ مل ہی گئی۔ وہ جگہ بالکل ویسی ہی تھی، جیسی اس نے بیان کی تھی۔

"بس... اب سمجھیے کھیل شروع ہو گیا۔" اس نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "یہ جگہ خوب اچھی طرح پہچان لیجیے۔ کل دوپہر بارہ بجے آپ براہ راست یہیں آ جائیے گا۔ سارا یونٹ موجود ہوگا۔ ہم کل سے شوٹنگ شروع کر رہے ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور تنہا آئیے گا۔ میں آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔

گزشتہ روز کی طرح میں نے اسے اسٹوڈیو چھوڑا۔ "آپ بھی آئیے نا۔" اس نے کہا۔ "ممکن ہے، شاہ جی آئے ہوئے ہوں۔ آپ نے انھیں متاثر کر دیا ہے۔ کل بھی وہ آپ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے تھے۔" مجھے ایسا لگا کہ اس کا لہجہ معنی خیز ہے۔ میں خاموشی سے نیچے اُتر آیا۔

دفتر میں شاہ جی واقعی موجود تھا۔ وہ مجھ سے بہت تپاک سے ملا۔

"سارا بندوبست ہو گیا ہے شاہ جی۔" اعوان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "کل شوٹنگ ہے۔"

"بہت خوب۔" شاہ جی نے طمانیت بھرے انداز میں سر ہلایا۔ "لیکن مجھے افسوس ہے، میں لوکیشن پر موجود نہیں ہوں گا۔" پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "اور جمال صاحب... کیا حال ہیں۔ بھئی ہمیں تو آپ نے اپنا بنا لیا ہے۔ ہمارے دفتر کب تشریف لا رہے ہیں۔ پرسوں آئیے نا۔"

"جی ہاں... ضرور آؤں گا۔" میں نے بے حد خلوص سے کہا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ بچو تمھارے ہی لیے تو اتنے پاپڑ بیل رہا ہوں میں...

"نہ جانے کیوں... آپ مجھے کچھ جانے پہچانے سے لگتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"محبت ہے آپ کی۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا... میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ "ویسے مجھے بھی آپ جانے پہچانے لگتے ہیں۔"

اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا... لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ "ممکن ہے، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ہو۔"

کچھ دیر بعد میں وہاں سے نکل آیا۔ تمام راستے میں اس بات پر غور کرتا رہا۔ اعوان کے لہجے میں کیا بات تھی... کیسی معنویت تھی۔ ممکن ہے، شاہ جی نے مجھے پہچان لیا ہو۔ پھر میں نے ذہن سے ہر خیال جھٹک دیا۔

میں اکھاڑے پہنچا تو استاد موجود تھے۔ میں نے اب تک کا تمام احوال سنا دیا، لیکن میں نے انھیں اعوان کے معنی خیز لہجے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بلاوجہ کسی کو پریشان کرنا اچھا نہیں لگتا۔

استاد سر جھکائے سنتے رہے۔ "میرا خیال ہے برخوردار کہ تم منزل کے قریب پہنچ رہے ہو۔" میرے چپ ہونے کے بعد وہ بولے۔ "لیکن ذرا محتاط رہنا۔"

اگلے روز گیارہ بجے کے قریب میں کار میں نکل کھڑا ہوا۔ بارہ بجنے میں دس منٹ تھے، جب میں لوکیشن پر پہنچا۔ اعوان کی ہدایت کے مطابق میں نے کار آدھا میل پیچھے ایک درخت کے سائے میں کھڑی کر دی تھی، لیکن مجھے

یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ گویا ابھی فلم یونٹ کے لوگ وہاں نہیں پہنچے تھے۔

میں یونہی وقت گزاری کی غرض سے پگڈنڈی پر دُور تک نکل گیا، تاکہ گرد و پیش کا جائزہ لے سکوں... لیکن وہاں گرد و پیش سرے سے تھا ہی نہیں۔ ہر طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں یا وہ شیطان کی آنت کی طرح طویل پگڈنڈی۔ خاصی دُور جا کر میں واپس آیا۔ ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ سوا بارہ بج چکے تھے۔ وہاں دُور دُور تک سائے کا نام و نشان نہیں تھا۔ کار وہاں سے خاصی دُور تھی... ورنہ میں اُس میں جا کر بیٹھ جاتا۔ ناچار میں پھر پگڈنڈی کے افتادہ حصے کی طرف چل دیا۔ چلچلاتی دھوپ میں وہ چہل قدمی مجھے گراں گزر رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں خلیل اعوان کو بُرا بھلا کہتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بجے تھے۔ گویا مجھے اس چلچلاتی دھوپ میں گرد پھانکتے چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ ذہنی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ میری یہاں موجودگی کا کیا سبب ہے۔ جھنجلا کر میں پلٹا اور واپس چل دیا، لیکن اس بار مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا... جیسے بہت سے لوگ... دُور کہیں... بہت دُور... میری جانب نگراں ہوں۔ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ بظاہر میں بڑی بے پروائی سے آگے بڑھ رہا تھا... لیکن درحقیقت میں چوکنا تھا۔

ابھی میں نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ عقب سے گولی چلنے کی آواز سُنائی دی۔ میں نے بہت تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ میرے عقب میں محض دس قدم کے فاصلے پر چار آدمی کھڑے مجھے خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بظاہر تو وہ نہتے تھے... لیکن گولی کی آواز انھیں مسلح ثابت کر رہی تھی۔ میرے نکتۂ نظر سے یہی بات زیادہ خطرناک تھی۔

"اب تم بھاگنے کی کوشش کرو گے... یا پھر جھاڑیوں میں چھپو گے" عقب سے کسی نے کہا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس طرف بھی چار آدمی تھے۔ یہاں بھی درمیانی فاصلہ دس قدم تھا۔

"نہیں... میں تمھیں ان جھاڑیوں میں دفن کر کے ہی واپس جاؤں گا" میں نے جواب دیا۔ اس وقت مجھے بڑی شدت سے غصّہ آیا تھا... اُن پر نہیں... اپنی حماقت پر کہ میں کتنی آسانی سے شاہ جی کے پھیلائے ہوئے جال میں چلا آیا تھا۔ پھر میں نے خود کو دماغ ٹھنڈا رکھنے کی تلقین کی۔ ورنہ اس صورتِ حال میں واپسی ناممکن ہی ہو جاتی۔

میں ایک طرف رُخ کر کے کھڑا ہو گیا تاکہ دونوں جانب سے پیش قدمی کرنے والوں پر نظر رکھ سکوں۔ ابھی تک اُن میں سے کسی کے ہاتھ میں پستول نظر نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یہ بات بھی ذہن میں رکھنا تھی۔

وہ بڑے نپے تلے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر وہ دونوں گروہ ٹھہر گئے۔ ان کے درمیان نگاہوں میں کچھ گفتگو ہوئی۔ اس دوران میں ان کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ پیشہ ور قاتل معلوم ہو رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ایسے لوگ بے حد خطرناک ہوتے ہیں۔ اُن کے چہرے بتا رہے تھے کہ انھوں نے لڑائی بھڑائی میں عمر گزاری ہے۔ اس بار میرا واسطہ آٹھ افراد سے تھا... اور وہ سڑک چھاپ لفنگے نہیں تھے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ شاہ جی کے فرستادہ ہیں۔ اعوان اس سازش میں یقیناً شاہ جی کا شریک تھا۔ ایک اور بات بھی یقینی تھی۔ وہ مجھے ٹھکانے لگانے نہیں آئے تھے۔ ... ٹھکانے تو کہیں بھی لگایا جا سکتا تھا۔ یہ نکتہ حوصلہ افزا [illegible]

پھر جیسے اُن کے درمیان کچھ طے ہو گیا۔ دائیں جانب والے افراد ایک قدم آگے بڑھ آئے جبکہ بائیں جانب والے اپنی جگہ ڈٹے کھڑے تھے۔ وہ سب بے حد محتاط تھے۔ یہ ان کے پیشہ ور ہونے کا... اور اس بات کا ثبوت تھا کہ انھیں میرے بارے میں تفصیل بتایا گیا ہے۔ وہ سڑک چھاپ لفنگے ہوتے تو [illegible] کے زعم میں اکڑ جاتے... اور میں اس کا فائدہ اٹھا لیتا، لیکن وہ بے حد چوکس تھے۔ پگڈنڈی زیادہ چوڑی نہیں تھی اور وہ چاروں کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے یعنی میرے لیے دائیں بائیں ہونے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میرا ذہن بہت تیزی سے اس اُلجھن کا حل سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دائیں جانب والے چاروں لڑاکوں کے انداز [illegible]

چل رہا تھا کہ وہ مجھ پر بیک وقت حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کے حرکت میں آتے ہی میں نے قلابازی کھائی۔ فضا میں اُچھلتے ہوئے میری دونوں ٹانگیں تیزی سے حرکت میں آئیں۔ بیچ کے دونوں لڑاکے کربناک چیخ مار کر اُلٹ گئے۔ قلابازی کھانے کے بعد میرے پیر زمین سے لگے تو میں ان چاروں کے سامنے تھا جو اپنی دانست میں میرے فرار کا راستہ روکے کھڑے تھے۔

... میرے پھرتیلے پن نے انھیں مبہوت کر دیا تھا۔ میں نے ان کی اس کیفیت سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا... اور دونوں ہاتھوں سے ان میں سے دو کی کنپٹیاں سہلا دیں۔ ان کے بارے میں مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ مقابلے سے باہر ہو گئے ہیں۔ البتہ اُن دونوں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا، جنھیں میں نے پہلے نشانہ بنایا تھا۔ ان دونوں کے ڈھیر ہوتے ہی اُن کے دونوں ساتھی حرکت میں آ گئے۔ اس دوران عقب سے کسی نے مجھے جکڑ لیا۔ اس کے باوجود میں نے اچھل کر لاتیں چلائیں۔ حریفوں میں سے ایک پھرتیلا تھا۔ وہ ایک طرف ہٹنے کی وجہ سے بچ گیا جبکہ دوسرا اُلٹ کر گرا اور گرتے ہی ساکت ہو گیا۔ لات سے بچنے والے نے میرے منہ پر زوردار گھونسہ رسید کیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے ہونٹ پھٹ گئے ہیں کیونکہ منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سامنے والے کو نظرانداز کر دیا اور اس کی طرف متوجہ ہوا جس نے مجھے عقب سے جکڑ لیا تھا۔ میں نے زمین پر مضبوطی سے پیر جماتے ہوئے زور لگایا۔ اس دوران سامنے والا مجھے تین چار گھونسے رسید کر چکا تھا۔ بالآخر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔ عقب والے کے پیر اکھڑ گئے۔ ساتھ ہی میری گردن پر اس کا دباؤ کم ہو گیا۔ میں نے جھٹکے سے اسے اپنے اوپر لادا اور اس آدمی پر پٹخ دیا جو سامنے سے میرے منہ پر ایک اور گھونسہ مارنے والا تھا۔ ساتھ ہی میں نے اندھا دھند پیچھے کی طرف لات چلائی۔ میری ایڑی کسی کے پیٹ سے ٹکرائی۔ ایک چیخ... اور پھر دھپ کی آواز سُنائی دی۔ سامنے والا میرے پھینکے ہوئے بوجھ تلے دب گیا تھا۔ اب مجھے پیچھے دیکھنے کی مہلت مل گئی۔ وہاں تازہ ترین شکار زمین پر پڑا سر جھٹک کر غالباً اپنے ذہن کو صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ پہلے دو شکار زمین سے اٹھنے والے تھے۔ میں تیزی سے اُن کی طرف جھپٹا۔ ایک کے مُنہ پر میری ٹھوکر پڑی۔ وہ چیختا ہوا اُلٹ گیا۔ دوسرا سنبھلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں ان میں سے چار کو بیکار کر چکا ہوں۔ گویا اب بھی ان کی تعداد چار تھی۔ میں نے اپنی گرفت سخت کر دی۔ میں اس لڑاکے کو بے بس کر ڈالنا چاہتا تھا جو مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ اب اس کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا لیکن عقب والے میرے اندازے سے کچھ پہلے ہی سنبھل گئے تھے۔ اُن کی طرف سے بے خبری مجھے بہت مہنگی پڑی۔ عقب سے میری گردن پر کھڑے ہاتھ کا وار کیا گیا تھا۔ بروقت احساس ہو جانے کی وجہ سے مجھے اپنے عضلات اکڑا لینے کا موقع مل گیا تھا... ورنہ میرا فیوز اُڑ گیا ہوتا۔ میں نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے تیزی سے گھوم کر اپنی گرفت میں پھنسے ہوئے حریف کو سامنے کر دیا۔ [illegible] وار کا نشانہ اس کی کھوپڑی بنی... اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ اب میرے سامنے صرف تین لڑاکے تھے... اور وہ بھی مجھ سے کترا رہے تھے۔ پھر شاید اُن تینوں نے جان پر کھیل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک ساتھ مجھ پر پل پڑے۔ وہ اندھا دھند ہاتھ چلا رہے تھے۔ مجھے احساس تھا کہ میرا چہرہ لہولہان ہو گیا ہے، لیکن اس افراتفری میں مجھے نپے تلے ہاتھ مارنے کا موقع مل گیا تھا۔ جلد ہی اُن میں سے دو ڈھیر ہو گئے... اور تیسرے نے دوڑ لگا دی۔ [illegible] بھی اس کے پیچھے بھاگا لیکن اس کی رفتار بہت [illegible] تھی۔ میں پلٹ آیا۔

اب میرے بھی قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میں بُری طرح نڈھال ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ ساتوں حملہ آور پگڈنڈی پر بکھرے پڑے تھے۔

"کٹ" اچانک ایک طرف سے آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے ایک جھاڑی کی اوٹ سے خلیل اعوان برآمد ہوا۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اسی جھاڑی کے پیچھے ایک مووی کیمرہ بھی تھا۔

"بہت خوب!" اس نے پُرستائش لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" میں بھنّا گیا۔

"شوٹنگ شیڈول کے مطابق ہوئی ہے!" اس نے

نہایت اطمینان سے انکشاف کیا۔ "ایسی فائٹ کبھی کسی نے نہیں فلمائی ہوگی۔ ویسے آپ نے بہت عمدہ اداکاری کی ہے۔ میں آپ کے کام سے مطمئن ہوں۔"

"اب اور مطمئن ہو جاؤ گے۔" میں نے کہا اور ایک ہاتھ اس کے بھی جڑ دیا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

اردگرد کی جھاڑیوں سے بہت سارے لوگ نکل آئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ پورا یونٹ ان جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ انہی میں جاذب بریلوی بھی تھا۔ وہ تیزی سے میری طرف بڑھا: "یہ... یہ آپ نے کیا کر دیا؟" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"میں تو اداکاری کر رہا تھا۔ یہ سچ مچ بے ہوش ہو گیا۔" میں نے جھنجھلا کر کہا

"دیکھیے... کہیں مر تو نہیں گئے حضرت۔" جاذب نے کہا۔ "اعوان پان سے تو ہیں۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم ہی دیکھتے رہو۔" یہ کہہ کر میں ایک کیمرہ مین کی طرف بڑھ گیا۔ جاذب، اعوان پر جھک گیا۔ وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ کیا سلسلہ تھا؟" میں نے کیمرہ مین سے پوچھا۔

وہ بے چارہ سہم کر رہ گیا۔ "ہم تو حکم کے غلام ہیں جناب۔" اس نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ پھر شاید اس بات سے اس کا حوصلہ بندھ گیا کہ میں نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا ہے۔ "ہم لوگ گیارہ بجے ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ اعوان صاحب نے چاروں کیمرے مختلف جھاڑیوں میں فٹ کروا دیے تھے تاکہ فائٹ ہر زاویے سے عکس بند کی جا سکے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بہتر فائٹ سین آج تک عکس بند نہیں کیا گیا ہوگا۔"

میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ اعوان جیسے خبطی آدمی سے میرا پہلے کبھی پالا نہیں پڑا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اداکار اس کی فلموں میں کام کرنے سے کیوں بچتے ہیں۔ اس کا فارمولا تھا کہ جس اداکار کی جگہ ڈپلی کیٹ استعمال کرنا پڑ جائے، وہ اس کردار کا اہل ہی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کام کرنا مخدوش تھا۔ بہتر یہی تھا کہ میں اسے اسکرپٹ مکمل کرنے پر مجبور کر دوں۔ کچھ عجب نہیں تھا کہ اچانک میں خود کو کسی آگ سے گھرے ہوئے گھر میں پھنسا ہوا پاؤں اور کیمرے ایک حقیقی منظر کی عکس بندی میں مصروف ہوں۔

"ونڈر فل... ویل ڈن۔"

میں نے چونک کر دیکھا۔ خلیل اعوان ہوش میں آ چکا تھا اور میری طرف اس طرح بڑھ رہا تھا، جیسے بغل گیر ہو جانے کا ارادہ رکھتا ہو، لیکن میرے تیور دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ "وہ گھونسہ بھی بہت شاندار تھا، جو تم نے میرے رسید کیا۔ کاش میں نے سین کٹ کرایا ہوتا۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اس نے بھی دانت نکال دیے۔

"اس حماقت کی وضاحت نہیں کرو گے؟" میں نے کہا

"وضاحت کیا کروں۔ سب کچھ شیڈول کے مطابق ہوا ہے۔ بس، وہ گھونسہ اسکرپٹ میں شامل نہیں تھا جو تم نے مجھے مارا ہے، لیکن میں اس کا مستحق بھی تھا۔ یہ الگ بات کہ فلم کا یہ سین دیکھ کر تم خود بھی ششدر رہ جاؤ گے۔ اتنے حقیقی تاثرات تھے تم دونوں کے... وہ لڑاکے بھی اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ فلمی لڑائی ہے۔ میں نے ان سے بھی رابطہ قائم کیا تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ انھیں ایک آدمی کی مرمت کرنی ہے۔ میں نے یہ اطمینان بھی کر لیا تھا کہ وہ مسلح نہیں ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں انھیں یہاں ساڑھے گیارہ بجے ملوں گا۔ گیارہ بجے تک میں نے اپنے یونٹ کو جھاڑیوں میں مناسب مقامات پر چھپا دیا تھا۔ پھر میں ان سے ملا۔ انھیں میں نے مناسب جگہوں پر چھپنے کے لیے کہا۔ یہ کہہ دیا کہ گولی کی آواز سنتے ہی وہ حرکت میں آ جائیں۔ اگر تم ان سے پٹتے تو ایک حد تک میں انھیں پٹنے دیتا، لیکن اس حد کے بعد مجھے مداخلت کرنا پڑتی۔ یہ الگ بات ہے کہ مداخلت کی نوبت ہی نہیں آئی۔"

"میرا خیال ہے، مجھے معاوضے کے سلسلے میں اپنے مطالبے پر نظرِ ثانی کرنا پڑے گی۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"تمھارا کہنا درست ہے۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "معاوضے کا حق تو تم نے صرف اس فائٹ ہی میں ادا کر دیا ہے۔"

"اور مجھے اپنی زندگی کا بیمہ بھی کرانا ہوگا۔"

اس بار وہ ہنس دیا۔ "نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ یقین کرو، اب تمھاری زندگی تمھارے لیے اتنی اہم نہیں

جتنی میرے لیے ہے۔" اس کے لہجے میں خلوص تھا۔ پھر وہ جاذب بریلوی کی طرف مڑا۔" اب تم اپنی زندگی کا سب سے جاندار سین لکھ سکتے ہو۔" اس نے جاذب سے کہا۔

جاذب نے دانت نکال دیے۔" خدا کا شکر ہے کہ مجھے اداکاری کا شوق نہیں ہے۔"

"شوق سے کیا ہوتا ہے۔ ممکن ہے، میں تمھارے لیے بھی کوئی سچویشن نکال لوں . . . اور ایسا تمھاری لاعلمی میں ہوگا۔"

"مجھ پر کرم ہی فرمائیے۔" جاذب نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اچھا . . . اب چل دو۔" اعوان نے کہا۔ پھر وہ یونٹ والوں کو روانگی کے سلسلے میں ہدایات دینے لگا۔ اس وقت مجھے علم ہوا کہ یونٹ کی گاڑیاں اس مقام سے آدھا میل آگے پارک کی گئی ہیں۔ اعوان نے منظر کی حقیقی عکس بندی کے سلسلے میں ہر بات کا خیال رکھا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شوٹنگ ہے۔ میری دانست میں تو وہ میرے خلاف سازش تھی۔۔ کیونکہ یونٹ سرے سے آیا ہی نہیں تھا۔

"چلو . . . میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔" اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔" اسٹوڈیو میں لنچ کا بندوبست کیا ہے۔"

ہم دونوں کار کی طرف بڑھ گئے۔

لنچ اسٹوڈیو کے لان میں تمام یونٹ نے ایک ساتھ کیا۔ کھانے کے سلسلے میں خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ خلیل اعوان واقعی بہت مہنگا ہدایت کار ہے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ خلیل اعوان کا موڈ بے حد خوشگوار رہا۔

"یہ اس لیے ہے کہ شوٹنگ ان کی مرضی کے مطابق ہوئی ہے۔" اعوان کے اسسٹنٹ نصیر نے مجھ سے کہا۔ "کام ان کی مرضی کے مطابق نہ ہو تو ہر شخص کی شامت آجاتی ہے۔ اس صورت میں اس کھانے کا ایک ایک لقمہ زہر ثابت ہوتا۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" چائے کے بعد میں نے اعوان سے پوچھا۔

"شوٹنگ پیک اپ۔" اس نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ پھر وہ سنجیدہ ہو گیا۔" اب میں کراچی میں آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں انتظامات کروں گا۔ اس سلسلے میں کوسٹ گارڈ والوں کا تعاون بھی درکار ہوگا۔ اسمگلنگ کے سین فلمانے ہیں۔ لانچ کا بندوبست تو پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔"

"وہ اسمگلنگ بھی کہیں حقیقی تو نہیں ہوگی؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"کاش ایسا ممکن ہوتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔" خیر . . . اپنا فون نمبر لکھوا دو۔ انتظامات مکمل ہونے کے بعد میں تمھیں مطلع کر دوں گا کہ کراچی روانگی کا وقت آگیا ہے۔"

میں نے اسے اکھاڑے کا فون نمبر لکھوا دیا۔" اب فی الوقت تو تمھیں میری ضرورت نہیں پڑے گی . . ." میں نے پوچھا۔

"ایک ہفتے تک تو امکان نہیں ہے۔ ضرورت پڑی تو میں تمھیں رِنگ کر لوں گا۔ ویسے شاہ جی تمھیں یاد کر رہے تھے۔"

"میں خود بھی انھیں یاد کر رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔" اچھا . . . اب میں چلتا ہوں۔"

اکھاڑے پہنچ کر میں نے استاد کو شوٹنگ کا احوال سنایا۔

"واہ . . . سچا فن کار معلوم ہوتا ہے۔" استاد نے ہنس کر کہا۔

"کچھ زیادہ ہی فنکار ہے۔" میں نے جھلا کر کہا۔ "کسی دن میں انتہائی حقیقی منظر کی عکس بندی کی غرض سے اسے سمندر میں دھکا دے دوں گا۔"

"میں تمھیں اتنا بیوقوف نہیں سمجھتا۔" استاد نے کہا۔ پھر بات کا رُخ بدل دیا۔" اچھا ہوا برخوردار کہ تم آگئے۔ ہمیں تھانے چلنا ہے۔"

"تھانے؟ ابھی تو میں غنڈوں کو بھگت کر آ رہا ہوں۔ اب تھانے بھی جانا ہوگا، لیکن کس سلسلے میں؟"

"حفیظ کے قتل کے سلسلے میں کسی کو گرفتار کیا ہے انھوں نے۔ اس کے علاوہ شاید ہماری اور ساجن کی ایک دوسرے کے خلاف رپورٹ بھی زیرِ بحث آئے گی۔"

"ٹھیک ہے، چلیے۔" میں نے کہا۔

باہر آکر میں نے استاد کے لیے کار کا دروازہ کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ہم تھانے پہنچے تو ساجن اور اس کے دو آدمی پہلے ہی سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ساجن ہمیں دیکھتے ہی تیزی سے ہماری طرف لپکا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ پھر ہم ایک ساتھ ایس ایچ او کی طرف بڑھ گئے۔

"آئیے استاد۔" ایس ایچ او نے کہا۔" ساجن صاحب نے جمال صاحب کے خلاف اپنی رپورٹ واپس لے لی ہے۔"

"مجھے اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ نقاب پوش جمال کی سی آواز بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔" ساجن نے مسکراتے ہوئے کہا۔" جبکہ میں اس وقت یہ سمجھا کہ جمال آواز بگاڑ کر بول رہا ہے۔"

میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ استاد کی آنکھوں میں تائیدی اشارہ پا کر میں بولا۔" عجیب بات ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، تمھاری آواز بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"تو آپ بھی ساجن صاحب کے خلاف اپنی رپورٹ واپس لے رہے ہیں؟" انچارج نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ دونوں کو تحریری بیان دینا ہوگا، کیوں کہ رپورٹ باضابطہ طور پر درج کرائی گئی تھی۔" تھانہ انچارج نے کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے بھی۔" ساجن نے میری تائید کی۔

ایس ایچ او نے الزام واپس لینے کے سلسلے میں ایک تحریر تیار کی اور اس پر ہم دونوں کے دستخط لیے۔ پھر حامد بھی آگیا۔ ہم سب کھڑے ہو گئے۔ انچارج نے اُسے زوردار سیلوٹ مارا۔

حامد نے مجھے اور استاد کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔" تشریف رکھیے۔" اس نے اپنی میز کے عقب میں پہنچ کر کہا۔

ہمارے بیٹھنے کے بعد وہ بھی بیٹھ گیا۔

"میں نے سنا ہے کہ حفیظ کا قاتل گرفتار ہو گیا ہے؟" استاد نے اس سے پوچھا۔

"جی ہاں . . . اور اس نے اعترافِ جرم بھی کر لیا ہے۔"

"تفصیل نہیں بتاؤ گے؟"

"کیوں نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے آپ کے اکھاڑے سے اُس روز ایک مسلح آدمی کو گرفتار کیا تھا۔ وہ مقابلے کے دوران کسی پہلوان پر فائر کرنے والا تھا۔ اسے تھانے لا کر پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ شروع میں تو اس نے زبان نہیں کھولی . . . لیکن مرمت کے بعد اس نے سب کچھ اُگل دیا۔ اس کے بعد ہمیں حفیظ کے قاتل کو گرفتار کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے اعترافِ جرم بھی کر لیا۔"

"اور یہ سب سلسلہ تھا کیا؟" استاد نے پوچھا۔

"شرط بازوں کا ایک گروہ تھا، جو دوسرے گروہ کے چونا لگانے پر تلا ہوا تھا۔ انھوں نے دونوں طرف کے پہلوانوں کو دھمکیاں دی تھیں۔ حفیظ کے خلاف انھوں نے شرطیں لگائی ہوئی تھیں لیکن حفیظ اُن کی دھمکیوں میں نہیں آیا۔ اس کے رویے سے انھیں اندیشہ ہوا کہ دوسرے پہلوان بھی یہی طرزِ عمل اختیار کریں گے۔ اس لیے انھوں نے تنبیہ کے طور پر حفیظ کو راستے سے ہٹا دیا۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ ان مقابلوں پر کتنی بڑی بڑی شرطیں لگی ہوئی تھیں۔ اسی لیے تو زور آزمائیاں ہو رہی تھیں۔"

"تو قاتل ایک شخص تو نہ ہوگا؟" . . . استاد نے اعتراض کیا۔

"آپ درست کہتے ہیں۔ قاتل کی نشاندہی پر گروہ کے سرغنہ کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ عنقریب وہ کیفرِ کردار کو پہنچ جائیں گے۔"

"خدا کا شکر ہے۔" استاد نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔" اکھاڑے کا کوئی آدمی اس میں ملوث نہیں تھا۔"

"لیکن آپ کا جیرا مجھے اب بھی مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے ہوشیار رہیے گا۔" حامد نے کہا۔

"ارے، یہ کوئی خاص بات نہیں۔ یہ معاملہ بھی نمٹا لوں گا۔" استاد نے کہا۔

حامد کے دفتر میں چائے پی کر ہم باہر نکل آئے۔ ساجن جا چکا تھا۔ ایس ایچ او نے بڑے تپاک سے ہمیں رخصت کیا۔

"میرا خیال ہے، یہ جیرے والا معاملہ بھی آج نمٹا دیا جائے۔" استاد نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ کے ذہن میں کوئی پلاننگ ہے استاد؟" میں نے پوچھا۔

"آج جیرے سے دو ٹوک بات ہوگی۔" استاد نے کہا۔

"تم نے اب تک جو کچھ دیکھا ہے، اس کے سامنے بیان کر دینا، میں بھی ایسا ہی کروں گا۔ پھر ہم اس سے وضاحت طلب کریں گے۔ اس سلسلے میں وہ ہمارا خاما مقروض ہے۔"

میں نے عقب نما آئینے میں استاد کے چہرے کا عکس دیکھا۔ ان کے چہرے کی خفیف سی سُرخی ان کے اندرونی جوش کی غمازی کر رہی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھے۔

اکھاڑے پہنچ کر استاد نے رشید، جیرے اور چند سینیئر پہلوانوں کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔

"حفیظ کا قاتل گرفتار ہو گیا ہے۔" استاد نے جیرے کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ میری نظریں بھی جیرے کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کو جیرے کی آنکھوں میں اضطراب سا نظر آیا۔۔۔ لیکن فوراً ہی معدوم ہو گیا۔

"خدا کا شکر ہے۔" رشید نے کہا "قتل کس سلسلے میں ہوا تھا، کچھ پتہ چلا؟"

"یہ تو جیرا ہی بتا سکتا ہے۔" استاد نے کہا۔

جیرا بُری طرح گڑبڑا گیا "میں۔۔۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"انجان بننے سے کچھ فائدہ نہیں ہو گا جیرے۔" استاد نے سخت لہجے میں کہا "پولیس نے حقیقت معلوم کر لی ہے۔"

"کیسی حقیقت۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتا استاد۔"

دوسرے پہلوان جیرے کو کڑی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ استاد بغیر ثبوت کے کسی پر الزام لگانے کے قائل نہیں ہیں۔

"چلو۔۔۔ تم نہ بتاؤ۔ میں بتائے دیتا ہوں۔" استاد نے سرد لہجے میں کہا اور دوسرے پہلوانوں کی طرف متوجہ ہو گئے "یہ چکر شرط بازوں کا تھا۔" انھوں نے کہا "انھوں نے بڑی بڑی شرطیں لگائی ہوئی تھیں۔۔۔ اور جن پہلوانوں کو وہ ہروانا چاہتے تھے، انھیں دھمکیاں دے کر کام چلا رہے تھے۔ حفیظ کو بھی انھوں نے دھمکیاں دی تھیں۔ لیکن حفیظ نے اپنے فن اور اکھاڑے کی آبرو کے لیے ان کی دھمکیوں کو نظر انداز کر دیا۔" استاد کی آواز رُندھ گئی۔ "ان مردودوں نے مثال قائم کرنے کے لیے حفیظ کو قتل کر دیا۔ اللہ مغفرت کرے۔۔۔ حفیظ بہت اچھا آدمی تھا۔"

"اوہ۔۔۔ تو یہ چکر تھا۔" رشید نے کہا۔

"اور اس میں میں کہاں سے آتا ہوں؟" جیرے نے پوچھا۔ اس کا لہجہ اعتماد سے محروم تھا۔

"ابھی بتاتا ہوں، لیکن پہلے تمھیں کچھ وضاحتیں کرنا ہیں۔" استاد نے کہا، پھر انھوں نے اُس رات کا تجربہ بیان کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے اپنے مشاہدات بیان کر ڈالے۔ جیرے کا چہرہ سپید پڑ گیا۔

"اس سے پہلے تم گدی کے سلسلے میں بے چین تھے۔" استاد نے میری بات پوری ہونے کے بعد کہا "اب وقت آ گیا ہے کہ کھل کر بات کر لی جائے۔ تم گدی کیوں لینا چاہتے تھے، اس سلسلے میں تم نے کس سے ساز باز کی تھی۔۔۔ اور کیوں کی تھی۔ ہمیں تمام حقائق سے آگاہ کر دو۔ اتنا بہت کچھ ہونے کے بعد بھی میں تمھیں گھٹیا آدمی نہیں سمجھتا کیونکہ تمھاری تربیت بھی میں نے ہی کی ہے۔ بس، اب شروع ہو جاؤ۔"

جیرے نے جھپٹ کر استاد کے پیر پکڑ لیے "استاد۔۔۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا "تم۔۔۔ تم بہت عظیم آدمی ہو استاد۔"

"استاد عظیم نہیں ہوتے احمق۔" استاد نے سنگین لہجے میں کہا "استاد تو شاگردوں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ میری شناخت تو تم لوگوں سے ہے۔۔۔ اور تمھارے حوالے سے میں خود کو بہت پست محسوس کر رہا ہوں جیرے۔۔۔"

جیرے نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ تمام پہلوان دم بخود بیٹھے تھے۔

"استاد۔۔۔ میں اب تمھارے اس پاک اکھاڑے میں قدم رکھنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔" جیرے نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا "میں اب یہاں سے منہ کالا کر جاؤں گا۔۔۔ لیکن جانے سے پہلے میں اپنے ضمیر کا ہر بوجھ ہلکا کر دینا چاہتا ہوں۔" اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنا چہرہ پونچھا۔ پھر وہ بولا تو اس کا لہجہ مستحکم تھا "لالچ اور بُری صحبت بڑی بلا ہے استاد۔ میں لالچی ہو گیا تھا۔ علاقے کے بدمعاشوں کی بڑے عرصے سے اکھاڑے پر نظر تھی۔ تمھارے ہوتے ہوئے اس علاقے میں ان کی دال نہیں گل سکتی تھی۔ تمھاری گدی نشینی کا مسئلہ اٹھا تو وہ جوڑ توڑ میں مصروف ہو گئے۔ اپنے اکھاڑے کے

ایک پہلوان کے ذریعے انھوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ ان کی پیشکش ایسی تھی کہ میں لالچ میں آ گیا۔ جمال سے مقابلہ ہارنے کے بعد وہ میری انا کا مسئلہ بن گیا۔ اکھاڑے میں کالی بھیڑیں بھی تھیں۔ ایسے تمام پہلوان میرے ساتھ مل گئے۔ میرے دل میں جمال کے خلاف زہر بھرا ہوا تھا مجھے بُرے بھلے کی تمیز نہیں رہی تھی۔ میں جمال کو راستے سے ہٹانے کے چکر میں لگ گیا، پھر ان دنوں ساجن کے اکھاڑے سے مقابلے کا چکر چل نکلا جس شرط باز گروہ نے حفیظ کو قتل کیا ہے، وہ وہی گروہ تھا، جو میری پشت پناہی کر رہا تھا۔ انھوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ انھوں نے کن کن پہلوانوں پر شرطیں لگائی ہیں۔ وہ مجھے جتوانا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد صرف روپیہ کمانا نہیں تھا۔۔۔ بلکہ ایک اور مقصد بھی تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارے اکھاڑے کو شرمناک شکست ہو۔۔۔ اور صرف میں جیتوں۔ تاکہ اکھاڑے میں میری ساکھ قائم ہو جائے۔۔۔ اور باقی سارے پہلوان ذلیل و خوار ہو جائیں۔ اس طرح وہ میری گدی نشینی کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے، لیکن حفیظ ان کے راستے کی رکاوٹ بن گیا۔ یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ حفیظ کو قتل کر دیں گے۔ بہرحال، حفیظ کے قتل نے میری آنکھیں کھول دیں، لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں ان کے ساتھ پوری طرح ملوث ہو چکا تھا۔ ایک بار میرے جی میں آئی کہ بے گناہ حفیظ کے قتل کے سلسلے میں زبان کھول دوں لیکن بات مجھے نقصان پہنچنے کی نہیں تھی۔ میں اکھاڑے سے وابستہ تھا۔۔۔ اور مسئلہ اکھاڑے کی آبرو کا تھا، لہٰذا۔۔۔"

"مجھے خوشی ہے کہ دیر ہی سے سہی، لیکن بہرحال تمھیں اکھاڑے کی آبرو کا خیال تو آیا۔" استاد نے کہا۔

جیرے نے چونک کر استاد کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ استاد طنز کر رہے ہیں، لیکن استاد کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"لہٰذا میں خاموش رہا اور ضمیر پر بوجھ اٹھائے پھرتا رہا۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی "لیکن اب یہ بوجھ ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ بالواسطہ ہی سہی، لیکن میرے ہاتھ اپنے ایک ساتھی کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا استاد۔۔۔ بس ایک خلش ہے۔۔۔ تم اور جمال مجھے معاف کر دو تو میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں۔"

"تم کہیں نہیں جاؤ گے جیرے۔" استاد بولے "تمھاری پشیمانی تمھاری اچھائی کی دلیل ہے۔ اب تم نے ٹھوکر

کھالی ہے... آئندہ نہیں کھاؤ گے۔"
اس بار جیرا بالکل بکھر گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "نہیں استاد... اب میں یہاں کسی سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا۔ میں تمھارے نیفے پر بھی ایک داغ کی طرح ہوں۔ مجھے دھوڈالنا ہی اچھا ہے۔ بس... ایک بار مجھے معاف کردو۔" وہ پھر استاد کے قدموں میں جھک گیا۔

استاد نے اس کے ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کر دیا۔ "میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے تمھیں معاف کر دیا ہے۔"

"شکریہ استاد۔" اس نے کہا... اور پھر پلٹ کر میرے قدموں میں جھک گیا۔ "جمال بھائی... تم بھی اپنے اس مجرم کو معاف کردو۔"

میں نے اسے سینے سے لگالیا۔ "میں استاد سے چھوٹا ہوں جیرے۔" میں نے کہا۔ "استاد نے تمھیں معاف کردیا تو میں نے بھی تمھیں معاف کر دیا۔"

اس کے سینے سے جیسے کوئی بوجھ سا ہٹ گیا۔ چہرے پر پہلی بار رونق نظر آئی۔ پھر اس نے ان پہلوانوں کے نام بتانے جو اس کے ساتھی تھے۔ "استاد... ان میں سے کسی پر اعتبار نہ کرنا۔ میرے جانے کے بعد انھیں یہاں سے نکال دینا۔" اس نے آخر میں کہا۔

"ٹھیک ہے جیرے۔ میں بہت خوش ہوں۔ بھٹکنے کے باوجود تم نے میری تربیت کی لاج رکھ لی۔" استاد نے کہا۔ پھر وہ دوسرے پہلوانوں کی طرف متوجہ ہوئے جو سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے یہ ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ "یہ گفتگو اس کمرے سے باہر نہیں جائے گی۔" انھوں نے سخت لہجے میں کہا۔ سب پہلوانوں نے سر ہلادیے۔ "اب تم لوگ جاؤ... آرام کرو۔" استاد نے کہا۔

"استاد... آپ نے اسے معاف کر دیا ہے نا؟" ان کے جانے کے بعد میں نے استاد سے پوچھا۔

"ہاں بھئی... میں دل کا بہت صاف آدمی ہوں۔"

"تو پھر آپ نے اس کے اکھاڑے میں رہنے پر اصرار کیوں نہیں کیا؟ تائب ہونے کے بعد آدمی بہت اچھا ثابت ہوتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں، لیکن مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی۔"

میں سوالیہ نگاہوں سے استاد کو دیکھتا رہا۔

"میں نے سینئر پہلوانوں کو بلا کر غلطی کی۔" استاد نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اگر یہ بات صرف میرے اور تمھارے درمیان رہتی تو میں اسے ہرگز نہ جانے دیتا لیکن دوسرے پہلوان دل سے اسے معاف نہیں کریں گے۔ ان کی نظر میں وہ حفیظ کا قاتل ہی رہے گا۔ وہ اسے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھیں گے... اس سے حقارت بھرا سلوک کریں گے... اور ایسا سلوک آدمی کو راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔ جیرا بھی انسان ہے۔"

میں استاد کی دوراندیشی کا قائل ہوگیا۔ واقعی بہت دور تک دیکھتے تھے۔

"اب تم بھی جاکر آرام کرو برخوردار۔ آج تو بہت تھک گئے ہو تم۔" استاد نے کہا۔

ان کے کہنے پر مجھے اپنی تھکن یاد آئی۔ آخر خلیل اعوان کی فلم کی حقیقی شوٹنگ بھگتا کر آرہا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر میں بستر پر لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

شام کو میں سو کر اٹھا تو اکھاڑے میں انقلاب آچکا تھا۔ استاد نے ان نو پہلوانوں کو اکھاڑے سے نکال دیا تھا، جن کے نام جیرے نے بتائے تھے۔ جیرا خاموشی سے کہیں نکل گیا تھا۔ چار سینئر پہلوانوں کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا کہ جیرا اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ باقی حالات معمول کے مطابق تھے۔ مجھے جیرے کے اس طرح چلے جانے پر دکھ سا ہوا... لیکن کچھ بھی تو نہیں جاسکتا تھا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد میں نے کار نکالی... اور لکشمی چوک کی طرف روانہ ہوگیا۔ شاہ جی کے دفتر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے شہلا سے سامنا ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کی آنکھوں کی چمک سے خوف آرہا تھا۔

"زہے نصیب۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔ "وہ آئے گھر میں ہمارے..."

"شاہ جی موجود ہیں؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

اس کی آنکھوں کی چمک معدوم ہوگئی۔ "جی... ہیں تو سہی، لیکن کسی سے گفتگو میں مصروف تھے۔ آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں، میں انتظار کرلوں گا۔"

"چائے پئیں گے؟"

"پی لوں گا۔"

اس نے چپراسی کو چائے لانے کو کہا... اور میری طرف متوجہ ہوگئی۔ "آپ سے مکمل تعارف تو نہیں ہے۔ اعوان صاحب سے بس اتنا پتہ چلا تھا کہ آپ صنعت کار ہیں اور بڑی مشکل سے ان کی فلم میں رول کرنے کے لیے تیار ہوئے ہیں۔ اپنے بارے میں بتائیے نا۔" اس کی آنکھیں پھر چمکنے لگیں۔

"میرا مکمل تعارف لوگوں کو راس نہیں آتا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ یہ لڑکی کمبل بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

"آپ کرائیے تو سہی، ممکن ہے، مجھے راس آجائے۔" اس نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو یہی کہہ رہا تھا۔" میں نے بات بنائی۔ "یہی میرا مکمل تعارف ہے۔ میں اسلم انڈسٹری کا مالک ہوں۔ اب اعوان کی فلم میں کام کر رہا ہوں۔ ایک شوٹنگ بھگتا چکا ہوں اور مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ میں نے اعوان کی پیشکش قبول کرکے کتنے خطرات کو دعوت دی ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "جی ہاں... کل کی شوٹنگ کا احوال تو اعوان صاحب سے معلوم ہوچکا ہے۔ وہ بہت خوش تھے۔"

چپراسی نے چائے کی دو پیالیاں لاکر میرے اور اس کے سامنے رکھ دیں۔ شہلا مسلسل میری آنکھوں میں جھانکے جارہی تھی۔ میں نے گھبرا کر چائے کی پیالی اٹھائی اور چائے کے گھونٹ لینے میں مصروف ہوگیا۔

اچانک شاہ جی کے دفتر کا دروازہ کھلا اور شاہ جی ایک دراز قامت آدمی کے ساتھ باہر نکلا۔ شاہ جی نے دراز قامت آدمی کو رخصت کیا اور اسی دوران اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ میری طرف لپکا۔ "واہ... آج تو ہمارے نصیب جاگ گئے۔" اس نے لہک کر کہا۔ "اندر آئیے نا۔"

"چائے پی کر حاضر ہوتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ وہ کمرے میں واپس چلا گیا۔

"اب آپ چلے جائیں گے۔" شہلا نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے خاموشی سے چائے کی پیالی خالی کرکے میز پر رکھی اور شاہ جی کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ گزشتہ روز کی شوٹنگ کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ پھر اچانک ہی بولا۔ "یہ بات اب بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کو دیکھ کر شناسائی کا احساس کیوں ہوتا ہے۔"

"میں بتاتا ہوں۔" میں نے اس سے براہ راست بات کرنے کا ارادہ کرلیا۔ "نازو یاد ہے آپ کو؟"

"کون نازو؟" وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ اداکاری نہیں کر رہا ہے۔

"اداکارہ نازو... جو پراسرار طور پر غائب ہوگئی تھی۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"اوہ... وہ لڑکی... ہاں، یاد ہے۔"

"میں اس کے ساتھ ایک فلم میں سائڈ ہیرو کا رول کر رہا تھا۔"

"تو پھر؟" اس کے لہجے میں اُلجھن تھی۔

"پھر یہ کہ آپ اسے اپنی فلم میں کاسٹ کرنا چاہتے تھے۔ اس نے انکار کر دیا تھا۔ آپ اپنے غنڈوں کی مدد سے اسے پریشان کرتے رہے تھے۔ ایسے ہی ایک موقعے پر میرا ٹکراؤ آپ کے غنڈوں سے ہو گیا تھا۔"

"ہاں... اب مجھے یاد آ گیا۔ میں نے آپ کو اسٹیج میں دیکھا تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "وہ لڑکی بلا کی ضدی تھی۔"

"آپ بھی کم ضدی نہیں تھے۔ آپ نے اسے اٹھوا لیا تھا، لیکن آپ نے اس کا حشر کیا کیا، وہ آج تک غائب ہے۔"

وہ سراسیمہ ہو گیا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں نے اسے ہرگز نہیں اٹھوایا تھا۔ میں تو صرف اسے خوفزدہ کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ میری پیشکش قبول کر لے۔ میرا خیال ہے، وہ کچھ زیادہ ہی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ خود ہی رُوپوش ہو گئی۔"

"بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں جانتا ہوں، وہ اتنی آسانی سے خوفزدہ ہونے والی لڑکی نہیں تھی۔"

"زیادہ مضبوط لوگ جب خوفزدہ ہوتے ہیں تو بہت شدت سے ہوتے ہیں۔" اس نے دلیل دی۔

"گویا اس کی گمشدگی میں آپ کا ہاتھ نہیں ہے؟"

"یقیناً... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی تھی۔"

"اس کے باوجود آپ اسے اپنی فلم میں کام کرنے پر مجبور کرنے کے لیے غنڈے بھیجتے رہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ اور بات تھی۔ میرے ایک کاروباری دوست کی فرمائش تھی۔"

میں چند لمحے سوچتا رہا۔ بات بنتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دوسری طرف اس کے لہجے میں مجھے اب تک جھوٹ محسوس نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

اس نے بھی شاید میری اُلجھن بھانپ لی۔ "میں تم سے سچ بول رہا ہوں۔" اس بار اس کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔ "وجہ یہ ہے کہ تم میرے مطلب کے آدمی ہو۔ وہ گدھا اعوان تمھیں فلم کا ہیرو بنا کر خوش ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ تم بہت کام کے آدمی ہو۔ میرے ساتھ برابری کی بنیاد پر کام کرو۔ میں یاروں کا یار ہوں۔"

"میں تمھارے اس کاروباری دوست کا نام جاننا چاہتا ہوں، جس نے نازو کو فلم میں کاسٹ کرنے کے سلسلے میں تم سے فرمائش کی تھی۔" میں نے بھی بے تکلفی سے کام لیا۔

"اس کا نام نادر حسین ہے۔" اس نے کہا۔ میں بھونچکا رہ گیا، لیکن وہ میرے تاثرات سے بے خبر اپنی ہانکتا رہا۔ "لیکن وہ بڑا ذلیل آدمی ثابت ہوا... بے حد ابن الوقت... اس نے کاروبار میں بھی مجھے دھوکا دیا۔ منافعے کا موقع آتا ہے، دودھ سے مکھی کی طرح نکال دیا۔ میرا بس چلے تو اس کی بوٹی بوٹی اڑا دوں۔"

مجھے اس کی بات پر پوری طرح یقین آ گیا... نادر حسین کے پاس اس سلسلے میں جواز موجود تھا۔ وہ ڈائریوں کی وجہ سے نازو سے خوفزدہ تھا اور براہِ راست اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا، لیکن مجھے یہ یقین بھی ہو گیا کہ نازو کا سراغ یہاں سے نہیں مل سکتا۔ نادر حسین تو خود ڈائریوں کی... اور نازو کی تلاش میں تھا۔

اب میں یہی توقع کر سکتا تھا کہ نازو خود رُوپوش ہوئی ہو گی۔ اس کی ڈائری پڑھنے کے بعد یہ پتہ تو چل گیا تھا کہ اس پر تیزاب پھینکا گیا تھا۔ میں مایوس ہو گیا۔ اب تو شاید میں اسے پہچان بھی نہیں سکتا تھا۔

"نادر حسین کا کوئی ٹھکانا معلوم ہے تمھیں؟" میں نے شاہ جی سے پوچھا۔

"ہاں... لیکن میں تمھیں بتاؤں گا نہیں۔"

"کیوں؟"

"ابھی ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم نہیں ہوا ہے۔"

"تو ہو جائے گا۔" میں نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟"

"ہمارا ایکسپورٹ کا کاروبار ہے۔ میں اس کے ذریعے کچھ مال پوشیدہ طور پر باہر بھیجتا رہوں گا۔ منافع آدھا آدھا۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے میں اعوان کی فلم سے منٹ لوں گا۔ بہت عرصے سے میں نے اپنے کاروبار کی خبر نہیں لی ہے۔ کام کو منظم کرنا پڑے گا۔"

محی الدین نوابؒ کے نشتر قلم سے ایک لازوال ناول

شعلوں کی سیج

"ٹھیک ہے، ملاؤ ہاتھ۔" اس نے کہا۔

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

"اب مجھے نادر حسین کے سب سے اہم ٹھکانے کا پتہ بتاؤ۔" میں نے فرمائش کی۔

"جلدی کیا ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "آج کا پورا دن تم میرے ساتھ گزارو۔ ابھی کھانا منگواتے ہیں، پھر میں تمھیں اپنی ایک فلم کی شوٹنگ دکھانے لے چلوں گا... اعوان حقیقت سے قریب تر فلموں کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ میں تمھیں بتاؤں گا کہ میں کتنی حقیقی فلمیں بناتا ہوں۔ حد یہ ہے کہ شوٹنگ سیٹ کی بجائے میری کوٹھی پر ہوتی ہے۔ دل خوش ہو جائے گا تمھارا۔"

مجھے کوئی خاص کام تو تھا نہیں۔ میں نے ہامی بھر لی۔ اس نے کھانا منگوایا۔ ہم دونوں کھانے سے فارغ ہوئے تو چپراسی کافی رکھ گیا۔ شاہ جی فون پر مصروف ہو گیا۔ وہ غالباً شوٹنگ کا شیڈول کنفرم کر رہا تھا، پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"ہمیں چار بجے پہنچنا ہے۔ پونے چار بجے یہاں سے اٹھیں گے۔" اس نے مجھ سے کہا۔ میں تفہیمی انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے بزر دے کر شہلا کو بلایا۔

"یس باس؟" شہلا نے کسی مستعد سیکریٹری کے انداز میں پوچھا۔

"آج چھٹی مناؤ۔ یہیں بیٹھو۔ گپ شپ کریں گے۔" شاہ جی نے کہا۔

"خیریت تو ہے؟"

"آج کچھ پر شوٹنگ ہے۔ میں جمال کو شوٹنگ دکھانے لے جا رہا ہوں۔"

"میں بھی چلوں؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" شاہ جی نے کہا، پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "شہلا تمھیں کیسی لگتی ہے پارٹنر؟ خوبصورت ہے کہ نہیں؟"

میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ شہلا متوقع نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔

"یہ بے پناہ حسن کی مالک ہیں۔" میں سچ بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"میرا دعویٰ ہے کہ فلم انڈسٹری کی حسین ترین ہیروئن بھی شہلا کے سامنے ماند پڑ جائے گی۔" شاہ جی کا لہجہ فخریہ تھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔" میں نے شہلا سے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔ شہلا مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"میں نے کئی بار اسے اپنی فلموں میں مرکزی کردار کی پیشکش کی... لیکن اس نے ہر بار انکار کر دیا۔"

میں نے حیرت سے شہلا کی طرف دیکھا۔ یہ بات تھی کہ مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس کے بارے میں غلط تاثر لیا ہے۔ یہاں تو ہر لڑکی ہیروئن بننے کے خواب دیکھتی ہے۔ "آپ قبول کیوں نہیں کر لیتیں ان کی پیشکش؟" میں نے پوچھا۔

نہ جانے کیوں اس کے رُخسار دہک اٹھے لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میری پیشکش تو آج بھی قائم ہے۔" شاہ جی نے کہا۔

"آج میں قبول بھی کر لوں گی، بشرطیکہ جمال صاحب

ہیرو ہوں۔" شہلا نے کہا اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔
ایک لمحے کو شاہ جی کی رنگت متغیر ہو گئی، لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔" جمال اب میرا عزیز دوست ہے ۔۔۔ اور میں یاروں کا یار ہوں۔" اس نے بہت سنجیدگی سے کہا۔" ورنہ اس بات پر میں رقابت کا شکار ہو جاتا ۔۔۔ اور پھر انجام تم جانتی ہی ہو۔"
شہلا تھرا کر رہ گئی۔
"لیکن اب کوئی بات نہیں۔" شاہ جی نے اسے دلاسہ دیا۔" میری طرف سے اجازت ہے۔ تم جمال کی ہیروئن بن سکتی ہو۔"
شہلا مسکرانے لگی۔ مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ دہک اٹھا ہوگا۔ میں محجوب ہو کر رہ گیا تھا۔
پونے چار بجے تک ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر شاہ جی اٹھ کھڑا ہوا۔" چلو بھئی، وقت ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔
ہم نیچے آ گئے۔" شہلا، تم جمال کی گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" شاہ جی نے کہا اور خود اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔
شہلا اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے لہرا رہے تھے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور شاہ جی کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔
"آپ میرے ساتھ فلم میں کام کریں گے؟" شہلا نے پوچھا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔
"مجھے فلموں میں کام کرنے کا شوق نہیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔
"پلیز ۔۔۔ میری خاطر۔"
میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بھی خاموش رہی۔
چند منٹ بعد شاہ جی کی کار جدید طرز کے ایک بنگلے میں داخل ہوئی۔ اس نے پورچ میں کار روک دی۔ میں نے اپنی کار اس کی کار کے پیچھے پارک کر دی۔ پھر میں کار لاک کر کے باہر نکل آیا۔
شاہ جی ہمیں ساتھ لے کر بنگلے میں داخل ہو گیا۔ ڈرائنگ روم میں مکروہ چہرے والا ایک آدمی ہمارا منتظر تھا۔
"اس سے ملو ۔۔۔ یہ ہے فلم ڈائریکٹر شمیم انبالوی۔" شاہ جی نے مجھے اس سے متعارف کرایا اور پھر اس سے مخاطب ہو گیا۔" انتظامات مکمل ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"جی ہاں ۔۔۔ صرف آپ کی آمد کا انتظار تھا۔"
"آئیے چلیں۔" شاہ جی نے کہا۔
ہم اس کے پیچھے چل دیے۔ راہداری کے اختتام پر شاہ جی نے ایک چھوٹے فانوس کو دائیں جانب گھمایا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ فرش کا ایک حصہ سرک گیا۔ اب نیچے جاتے ہوئے زینے ہمارے سامنے تھے۔ نیچے گہرا اندھیرا تھا۔
پہلے شمیم، پھر شاہ جی اور اس کے بعد میں اور شہلا نیچے اترے۔ زینے شاید فاسفورس کے استعمال کی وجہ سے چمک دار تھے۔ اس لیے اترنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ البتہ نیچے آتے ہی تاریکی کا احساس شدید ہو گیا۔
"آجاؤ۔" شاہ جی نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ خود بھی بیٹھ گیا تھا۔ شہلا میرے برابر والی نشست پر بیٹھ گئی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہاں ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔
"اب ہم تیک کریں گے۔" اندھیرے میں ایک آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی تہ خانہ بقعۂ نور بن گیا۔ میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ چند لمحے بعد بینائی بحال ہوئی تو میں سکتے میں رہ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک انسانیت سوز منظر تھا۔ دوسری طرف شہلا کا کانپتا ہوا ہاتھ میرے ہاتھ پر جم گیا تھا، لیکن میں اس سے بے خبر، سامنے دیکھے جا رہا تھا۔ وہاں تین کیمرے تھے ۔۔۔ اور تینوں اسٹارٹ ہو گئے تھے۔ کیمروں کا ہدف ایک لڑکی تھی ۔۔۔ جو خود کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ۔۔۔ اور اس کا چہرہ ۔۔۔
اس لڑکی کا چہرہ بہت حسین تھا ۔۔۔ لیکن اس کے بے پناہ حُسن کو بے بسی، جھنجلاہٹ اور احساسِ توہین کے تاثر نے مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ خود کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس گھناؤنے فعل پر آمادہ کرنے کے لیے بلیک میلنگ کے ذریعے مجبور کیا گیا ہوگا۔ میرا سارا جسم غصے کی شدت سے لرز رہا تھا اور خون گویا کنپٹیوں میں ٹھوکریں مار رہا تھا۔ میں نے چیخنا چاہا۔ لیکن میرے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے لرزتے ہوئے ہاتھ پر شہلا کا نرم و نازک ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ اُس نے شاید میرے جسم کی لرزش کو جذباتی کیفیت پر محمول کیا تھا۔ مجھے کراہت کا شدید احساس ہوا ۔۔۔ اور شاید اسی

احساس نے مجھے میری گویائی واپس دلا دی۔ میں نے بڑی نفرت سے شہلا کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اب میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ کسی قسم کی فلموں میں کام کرنے سے انکار کرتی رہی تھی ۔۔۔ اور میرے ساتھ کس قسم کی فلم میں ہیروئن کا کردار کرنے پر رضامند ہوئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اسے ٹھوکروں پر رکھ لوں ۔۔۔ لیکن وہ عورت تھی۔ یہ الگ بات کہ اس کا کردار نسوانیت کے منافی تھا۔ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہی میں شاہ جی کی طرف متوجہ ہوا۔
"بہتر ہوگا کہ اس مکروہ کھیل کو رکوا دو۔" میں نے کہا۔
وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔
"ورنہ مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" میں نے اپنی بات پوری کر دی۔
ایک لمحے کو اس کی نگاہوں میں سختی سی جھلکی۔ لیکن اسے میری نگاہوں سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ بات کس حد تک بڑھ سکتی ہے۔" شوٹنگ پیک کر دو۔" اس نے بہ آوازِ بلند کہا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس دوران میرا ذہن بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ مجھے شاہ جی سے نادر حسین کا ٹھکانا معلوم کرنا تھا۔ لیکن محض اس مصلحت کی وجہ سے میں اس صورتِ حال سے چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا۔
"اب ذرا وضاحت بھی کر دو۔" شاہ جی نے سرد لہجے میں کہا۔" میرا خیال تھا کہ تم نے میری شراکت کی پیشکش قبول کر لی ہے۔"
"اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"اسی بنیاد پر تو میں تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ یہ لڑکی میرے ساتھ جائے گی۔"
شاہ جی مسکرا دیا۔" اوہ، یہ بات ہے۔" اس نے بائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔" میں تمھاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔" اس نے اشارہ کیا اور لائٹ آف کر دی گئی۔ چند لمحے بعد روشنی ہوئی تو مجھے وہ لڑکی دوبارہ نظر آئی۔ وہ اب بھی سہمی ہوئی تھی۔
"تم اب جمال کے ساتھ جاؤ گی۔" شاہ جی نے لڑکی کو حکم دیا۔" حکم کی خلاف ورزی کی تو تم جانتی ہو کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔"
لڑکی خاموش رہی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بلیک میل کی جا رہی ہے۔ گویا مجھے اس سلسلے میں بھی کچھ کرنا تھا۔
"لڑکی کو اوپر بھجوا دو۔" میں نے شاہ جی سے کہا۔

لڑکی کے جانے کے بعد میں شاہ جی سے مخاطب ہوا۔
"اس کی وہ تصویریں بھی مجھے دے دو، جن کی بنیاد پر میں اُسے قابو میں رکھ سکوں۔"
"لگتا ہے، وہ تمھارے دل میں اتر گئی ہے۔" شاہ جی نے کہا۔ پھر اس نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ چند لمحے بعد ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے تصویریں نکالے بغیر ٹٹول کر اندازہ کر لیا کہ اس میں نیگیٹو بھی موجود ہیں۔ میں نے نظریں اُٹھائیں۔ شہلا مجھے بے حد نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس نے جلد ہی نگاہیں جھکا لیں۔
"اور کچھ؟" شاہ جی نے مجھ سے پوچھا۔
"بس ۔۔۔ اب وعدے کے مطابق نادر حسین کے ٹھکانے کا پتہ اور بتا دو۔" میں نے کہا۔
اُس نے مجھے سمن آباد کے ایک بنگلے کا پتہ بتایا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس بنگلے میں ایک تہ خانہ بھی ہے ۔۔۔ پھر اس تہ خانے تک پہنچنے کا طریقہ بھی سمجھایا۔ میں نے اس کی ہر بات ذہن نشین کر لی۔
"اب تم بھی مجھے ایک بات بتاؤ۔" اس نے آخر میں کہا۔" تم اب کیا کرو گے ۔۔۔ اور تم اس کے ٹھکانے کا پتہ کیوں معلوم کرنا چاہتے تھے؟"
"مجھے نازو کی تلاش ہے۔" میں نے بلا جھجک کہا۔" ممکن ہے، وہاں مجھے نازو کا کوئی سراغ مل جائے۔ یہ بات میرے علم میں ہے کہ نازو کی نامکمل فلم کی ریلیں نادر حسین نے فضل داد سے خرید لی تھیں۔"
وہ مطمئن نظر آنے لگا۔" بات یہ ہے کہ میں اس قصے میں

پولیس کو نہیں لانا چاہتا۔ میرا نادر حسین سے کاروباری تعلق تھا۔ اُس نے مجھے دھوکا بھی دیا... لیکن میں اس کا بدلہ جب بھی لوں گا، اپنے طور پر لوں گا۔ ہم جیسے لوگ اپنے ذاتی معاملات پولیس کی مدد سے حل نہیں کرتے۔“

”اچھا... اب میں چلتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”پھر ملاقات ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ میں اور شہلا یہاں کچھ دیر رکیں گے۔“

میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے، شہلا کی طرف دیکھا، جو بے حد زہریلے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں میرے لیے عناد تھا۔ میں زینوں کی طرف بڑھ گیا۔

پورچ میں شاہ جی کا ایک آدمی لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ لڑکی خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ میں نے چابی نکال کر کار کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد عقبی دروازہ غیر مقفل کردیا۔ پھر میں نے کھڑکی کا شیشہ اتارا اور لڑکی سے کہا کہ وہ عقبی نشست پر بیٹھ جائے۔ لڑکی نے سہم کر تعمیل کی۔ شاہ جی کے آدمی نے کوئی تعرض نہ کیا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ٹرن لے کر گیٹ کی طرف بڑھا دی۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ گاڑی مین روڈ پر پہنچ گئی۔

”پلیز... مجھ پر رحم کیجیے۔“ اچانک لڑکی گھگھیا کر بولی۔ ”آپ مجھے کہاں لے جارہے ہیں؟ مجھے برباد کرکے آپ کو کیا ملے گا؟“

”بکواس مت کرو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر میں نے جیب سے تصویروں والا لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اس نے لفافے میں سے تصویریں نکالیں۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”اس میں... اس میں تو نیگیٹو بھی ہیں۔“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں... پہلی فرصت میں انھیں ضائع کردو۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اب تم آزاد ہو۔“

وہ عقب نما آئینے میں میرے عکس کو دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔

”اگر مناسب سمجھو تو مجھے بتاؤ کہ تم اس چکر میں کیسے پھنسی تھیں؟“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ بے چاری، نجانے کب سے اس جنجال میں پھنسی ہوگی... اور کتنی اذیت سہی ہوگی اس نے!

اس نے چہرے پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں لینا شروع کردیں۔ چند لمحے بعد اُس نے ہاتھ ہٹالے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”میں آپ کو نہیں جانتی... لیکن آپ نے مجھے تباہی سے بچالیا ہے۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میرا نام افشاں ہے۔ میں ایک باعزت اور خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں نے کسی ضرورت یا مجبوری کے تحت گھر سے باہر قدم نہیں نکالا ہے۔ بلکہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ شاہ جی نے مجھے پیش کش کی اور میں نے وہ پیش کش بلاجھجک قبول کرلی۔ چند روز پہلے مجھ سے کہا گیا کہ شوٹنگ ہے... اور شوٹنگ حقیقی ماحول میں ہوگی۔ پورا یونٹ ساتھ تھا... اس لیے بلا جھجک یہاں چلی آئی۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ میں تو اُن لوگوں کے رحم و کرم پر ہوں۔ انھوں نے زبردستی تصویریں لے لیں اور...“ پھر وہ رونے لگی۔ میں خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے خود پر قابو پالیا۔ ”پھر شاہ جی نے مجھے یہ تصویریں دکھائیں۔ اُس نے کہا کہ اگر کبھی میں نے اس کے حکم سے انکار کیا تو وہ مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔“

”اب تم آزاد ہو۔ میں نے تصویریں مع نیگیٹوز تمہارے حوالے کردی ہیں۔“

”میں آپ کی احسان مند ہوں۔“ اس نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

”اور امید ہے کہ اب تم ہیروئن بننے کے چکر میں کبھی خوار نہیں ہوگی۔ اللہ نے تمھیں یہ موقع دیا ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسرا موقع بھی ملے۔“

”مجھے سبق مل گیا ہے۔ میں اپنی غلطی کبھی نہیں دُہراؤں گی۔“ اس نے محجوب ہوکر کہا۔

”میں تمھیں کہاں چھوڑ دوں؟“ میں نے پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے وہ حیران نظر آئی۔ شاید اُسے خدشہ رہا ہوگا کہ اب میں اس کے سامنے کوئی ناروا مطالبہ رکھوں گا۔ پھر اس کی نگاہوں سے عقیدت جھلکنے لگی۔ ”مجھے انار کلی کے قریب اتار دیجیے۔“ اس نے کہا۔ اُسے اندازہ ہوگیا کہ میں اس کے بارے میں تفصیل جاننے کا خواہش مند بھی نہیں ہوں۔ حد یہ تھی کہ میں نے اپنا تعارف بھی نہیں کرایا تھا۔

افشاں کو انار کلی پر اتار کر میں اکھاڑے چلا آیا۔ استاد اکھاڑے ہی میں موجود تھے۔ میں نے انھیں دن بھر کی کارگزاری

سے آگاہ کیا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ حامد سے بات کرنا ضروری ہوگیا ہے۔“ انھوں نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

استاد نے اسی وقت فون کرکے حامد کو اکھاڑے بلالیا۔ میں نے صورتِ حال حامد کے سامنے رکھ دی۔

”یہ تو بہت قیمتی معلومات فراہم کی ہیں تم نے۔“ حامد نے پرستائش لہجے میں کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اس بار میں اس گروہ کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔“

”لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم جلد بازی سے کام نہ لو۔“ میں نے کہا۔

”کوئی خاص منصوبہ ہے تمھارے ذہن میں؟“

”میرا مشورہ ہے کہ نادر حسین کے اس بنگلے کی نگرانی کراؤ، جس کا پتہ میں نے تمھیں ابھی بتایا ہے۔ اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھو۔ اس طرح تمھیں مناسب وقت پر چھاپہ مارنے کا موقع مل جائے گا۔“

”میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی۔ اچھا، شاہ جی کے سلسلے میں تمھارا کیا مشورہ ہے؟“

”میرا خیال ہے، اُسے بھی رنگے ہاتھوں پکڑا جانا چاہیے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اس تہ خانے میں اس وقت بھی تمھیں فلموں کی شکل میں متعدد ثبوت مل جائیں گے۔ لیکن بہتر یہی ہوگا کہ چھاپہ اس وقت مارا جائے، جب وہاں وہ گھناؤنی شوٹنگ ہو رہی ہو۔ اس کے علاوہ تمھیں اس کے کاروبار کے متعلق بھی چھان بین کرنی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی فلمیں مشرقِ وسطیٰ بھجواتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، اب میں چلتا ہوں۔“ حامد اُٹھ کھڑا ہوا۔

”اتنی جلدی کیا ہے۔“ استاد نے اُسے ٹوکا۔

”میں فوری طور پر نگرانی شروع کروا رہا ہوں۔ آپ کے پاس پھر آؤں گا۔“

اس بار استاد نے اُسے نہیں روکا۔

میں نے سوچا تھا کہ چھاپے میں، میں خود بھی شامل ہوں گا لیکن اگلی صبح خلیل اعوان کا فون آگیا۔ ”سارے انتظامات ہوگئے ہیں۔“ اس نے ہیجانی آواز میں کہا۔ ”تم دس بجے تک ائیرپورٹ پہنچ جاؤ۔ بس ایک بیگ میں کچھ سامان رکھ لو۔ زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے استاد کو بتا کر اُن سے اجازت لی، چند جوڑے کپڑے بیگ میں رکھے اور اکھاڑے سے نکل آیا۔ میں اس وقت شدید ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ میں کراچی جا رہا تھا۔ کراچی... جہاں میری گلنار موجود تھی۔ گلنار... جس سے بچھڑے ہوئے مجھے صدیاں ہوگئی تھیں۔ اس وقت میرے تصور میں اس کا سراپا لہرا رہا تھا۔

میں نے کار وہیں چھوڑ دی اور ٹیکسی پکڑ کر ائیرپورٹ پہنچ گیا۔ ائیرپورٹ پر صرف خلیل اعوان موجود تھا۔ اُس نے بتایا کہ یونٹ کے دیگر لوگ پہلے ہی کراچی کے لیے روانہ ہوچکے ہیں۔

ہم کراچی ائیرپورٹ پر اترے تو ساڑھے بارہ بجے تھے۔ اعوان نے ایک ٹیکسی والے سے بات کی اور ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اعوان نے ٹیکسی والے کو ہوٹل مہران چلنے کے لیے کہا۔ سفر کے دوران گفتگو نہیں ہوئی۔ میں خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ مجھے کراچی، لاہور سے کچھ زیادہ مختلف نہیں لگا۔ بس ٹریفک بہت زیادہ تھا اور اس میں تانگے نظر نہیں آرہے تھے۔

مہران ہوٹل بہت خوبصورت ثابت ہوا۔ معلوم ہوا کہ اعوان نے پہلے ہی کمرے بک کروا رکھے ہیں۔ ہم دونوں کے کمرے برابر برابر تھے۔

”میرا ارادہ ڈیفنس جانے کا ہے۔“ میں نے اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے کہا۔

”کل چلے جانا۔“ اعوان بولا۔ ”آج رات میں اسمگلنگ کا سیکوینس فلمانے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔ کوسٹ گارڈ والوں سے بھی وقت لے لیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور اس کمرے میں چلا گیا، جو میرے لیے مخصوص تھا۔ میں نے غسل کرکے لباس تبدیل کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ اعوان میرے کمرے میں چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔

”کھانا یہیں منگوا لیتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”یہ اسکرپٹ ہے۔ سین سمجھ لو۔ مکالمے بہت کم ہیں۔ انھیں یاد کرنے میں تمھیں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔“ اُس نے کاغذات میری طرف بڑھائے اور خود فون کا ریسیور اٹھا کر روم سروس کو کھانا لانے کی ہدایت کی۔

میں وہ سین پڑھتا رہا۔ بے حد جاندار سین تھا وہ... اور مجھے یقین تھا کہ اعوان جیسا خبطی آدمی، جب اسے حقیقی انداز میں فلمائے گا تو وہ کس قدر متاثر کن ہوگا۔

کھانا کھانے کے بعد اعوان میرے کمرے ہی میں پسر گیا۔ میں

اسکرپٹ کا دوبارہ مطالعہ کرنے میں مصروف ہوگیا۔ میرے مکالمے واقعی بہت تھوڑے سے تھے... اور انھیں یاد کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

"میں نے گاڑیوں کا بندوبست کرلیا ہے۔" اعوان نے مجھے بتایا۔ "شام چھ بجے ہم ابراہیم حیدری کے لیے روانہ ہوں گے۔"

شام چھ بجے میں اعوان کے ساتھ نیچے آیا۔ نیچے اچھا خاصا ہنگامہ تھا۔ تمام ضروری سامان سوزوکیوں پر بار کیا جاچکا تھا۔ اعوان مجھے لے کر ایک ڈاٹسن کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور پہلے ہی سے موجود تھا۔ میرے ہاتھ میں اسکرپٹ تھا۔ میں نے کپڑوں کے سلسلے میں اعوان سے پوچھا تھا۔ اعوان نے کہا کہ جو کپڑے میں پہنے ہوئے ہوں، وہی مناسب ہیں۔

ہم دونوں عقبی نشست پر بیٹھ گئے۔ یوں قافلہ ابراہیم حیدری کے لیے روانہ ہوا۔ ابراہیم حیدری پہنچ کر معلوم ہوا کہ یونٹ کے کچھ افراد پہلے ہی آچکے ہیں۔ انھوں نے ساحل پر چھولداریاں نصب کردی تھیں۔ اس ویرانے میں اچھا خاصا جشن کا سماں پیدا ہوگیا تھا۔

اعوان نے اپنی نگرانی میں سارا سامان اتروایا۔ سامان میں دو چھوٹے چوبی بکس بھی تھے۔ وہ اس نے اپنی چھولداری میں رکھوا دیے۔

"یہ بکس میں نے خاص طور پر بنوائے ہیں۔" اعوان نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "یہ نیچے سے کھوکھلے ہیں۔ اوپری حصے میں اوزار وغیرہ رکھے ہوتے ہیں۔ نچلے حصے میں ہیروئن ہے۔"

"سچ مچ کی ہیروئن؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"اب میں اتنا حقیقت پسند بھی نہیں ہوں۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "ان میں بے ضرر سفید پوڈر بھرا ہوا ہے۔ یہ الگ بات کہ پردۂ سیمیں پر وہ ہیروئن ہی نظر آئے گا۔"

"اعوان صاحب... کوسٹ گارڈ والے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" باہر سے اعوان کے اسسٹنٹ نے پکارا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔ بے چارے میرے ساتھ بڑا تعاون کررہے ہیں۔" اعوان نے کہا اور باہر چلا گیا۔

میں چند لمحے بیٹھا ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ چھولداری میں کم قوت کا بلب روشن تھا جس کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک میری نظر دونوں بکسوں پر پڑی۔ نجانے کیوں مجھے تجسس ہوا۔ پھر میں نے اوزاروں کے درمیان ہاتھ گھمایا۔ اچانک کھٹکے کی آواز آئی... اور اوپر والا حصہ قدرے باہر کو کھسک گیا۔ اب نچلا حصہ نصف کے قریب میرے سامنے تھا۔ اس میں واقعی پوڈر بھرا ہوا تھا۔ میں نے انگلی پر ذرا سا پوڈر لگا کر اُسے چکھا۔ وہ بالکل پھیکا اور بے مزہ تھا۔ مطمئن ہوکر میں نے اوپری حصے کو دھکیل کر برابر کردیا۔ پھر میں چھولداری سے باہر آگیا۔ باہر یونٹ کے کچھ لوگ گھوم پھر رہے تھے... لیکن اعوان کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ میں نے دو قدم آگے بڑھائے... لیکن ٹھٹک گیا۔ اعوان مجھے اپنی چھولداری میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میرا اس طرح وہاں سے آنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں پلٹا اور پھر چھولداری میں آگیا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے خاصی دیر ہوگئی۔ اعوان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اب میں کچھ بے چینی محسوس کررہا تھا۔

پھر میں اٹھا اور دوسرے بکس کی طرف بڑھ گیا۔ تجسس کی تسکین ہوچکی تھی۔ اب تو بیکار مباش کچھ کیا کر والا معاملہ تھا۔ میں نے دوسرا بکس کھولا اور اوزاروں کے درمیان ہاتھ گھماتا رہا۔ اس کے میکنزم سے میں بے خبر تھا چنانچہ اندھوں کی طرح ٹٹولتا رہا۔ اس بار صندوق کا خفیہ خانہ کھلنے میں کچھ دیر لگی۔ بہرحال کھٹکا سا ہوا اور اگلے لمحے صندوق کا خفیہ خانہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس خانے میں بھی سفید پوڈر بھرا ہوا تھا۔ میں نے از حد بے پروائی سے انگلی سے پوڈر کو چھوا... اور انگلی کو زبان سے لگا لیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

ہیروئن سے میرا سابقہ کبھی نہیں پڑا تھا... لیکن وہ ذائقہ کچھ ایسا تھا کہ مجھے یقین ہوگیا کہ اس خفیہ خانے میں ہیروئن بھری ہوئی ہے۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ میں نے تیزی سے صندوق کے اوپری حصے کو دھکیلا اور اپنی جگہ آبیٹھا۔ اب مجھے کچھ سوچنا تھا... اور بہت تیزی سے سوچنا تھا۔

مجھے یقین ہوگیا کہ اسمگلنگ کا منظر بھی حقیقتاً فلمایا جائے گا۔ میں نے اسکرپٹ کھولا اور اس پر نظریں دوڑائیں۔ منظر کے مطابق مجھے باری باری وہ دونوں بکس لانچ پر منتقل کرنا تھے۔ دوسرا بکس منتقل ہوتے ہی کوسٹ گارڈ والوں کی طرف سے مداخلت ہوتی۔ کوسٹ گارڈ والوں کے آتے ہی لانچ پر موجود اسمگلر دونوں بکس لانچ کے نچلے حصے میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے... لیکن ایک بکس اوپر ہی رہ جاتا۔ کوسٹ گارڈ والے اس بکس کو توڑتے... خفیہ خانہ سامنے آتا... لیکن اس میں بے ضرر پوڈر بھرا ہوتا۔ کوسٹ گارڈ والے منہ کی کھاتے... اور لانچ روانہ ہوجاتی۔ منظر کے آخری شاٹ دور ہوتی ہوئی لانچ کے لانگ شاٹ ہوتے یوں ہیروئن سچ مچ اسمگل آؤٹ ہوجاتی۔

خلیل اعوان واقعی بہت حقیقت پسند ڈائریکٹر تھا۔ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ اُس کی حقیقت پسندی اس کے لیے منفعت بخش بھی ہے۔ اب مجھے اس پر ثابت کرنا تھا کہ بالآخر اس کی حقیقت پسندی ہی اسے ڈبونے والی چیز ہے۔ اگر وہ سچ مچ کے کوسٹ گارڈز کے چکر میں نہ پڑتا تو میرے پاس اسے رنگے ہاتھوں پکڑوانے کا کوئی موقع نہ ہوتا۔ اب مجھے صرف اتنا کرنا تھا کہ عین موقعے پر کوسٹ گارڈز والوں کو خبردار کردیتا۔ یہ سوچ کر میں مطمئن ہوگیا۔

کچھ دیر بعد اعوان دو آدمیوں کے ساتھ چھولداری میں داخل ہوا۔ "بس، اب چل دو۔" اس نے مجھ سے کہا۔ "اب ہمیں شوٹنگ کرنا ہے۔ میرا خیال ہے، ریہرسل کی ضرورت نہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اب وہ اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "یہ دونوں بکس اٹھاؤ اور جیپ کی عقبی نشست پر رکھ دو۔"

ان دونوں نے بکس اٹھا لیے۔ میں اور اعوان بھی ان کے پیچھے نکل آئے۔ باہر جیپ کھڑی تھی۔ انھوں نے بکس عقبی نشست پر رکھ دیے۔

اعوان نے مجھے جیپ کا راستہ اور رکنے کا مقام سمجھایا۔ کیمرے وہ پہلے ہی مناسب جگہوں پر رکھوا چکا تھا۔ دو کیمرے تھے اور دونوں کو بیک وقت مختلف زاویوں سے جیپ کی آمد کی عکس بندی کرنا تھی۔ وہ لوگ چھوٹی لائٹس جنھیں بے بی لائٹس کہا جاتا ہے، استعمال کررہے تھے، تاکہ رات کا بھرپور تاثر دے سکیں۔

"تم جیپ کو اس سڑک تک لے جاؤ۔ اس کے بعد میرے بتائے ہوئے راستے پر آنا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے کیمرہ جیپ کو فوکس میں لے گا۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ "سمجھ گئے نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا... اور جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور اُسے سڑک تک لے گیا۔ سڑک سے میں نے یوٹرن لیا اور اس کے بعد اعوان کے بتائے ہوئے راستے پر جیپ دوڑا دی۔ حسب ہدایت میں نے جیپ کی رفتار خاصی تیز رکھی تھی۔ ساحل کے قریب لاکر میں نے زوردار بریک مارے اور گاڑی رک گئی۔

لہو کا سراغ

محمود احمد مودی

میں جیپ میں ہی بیٹھا رہا۔ اعوان نے کٹ کا نعرہ لگایا۔ کیمرہ مینوں سے کچھ گفتگو کی اور پھر میری طرف چلا آیا۔ "ویری گڈ... میں بہت مطمئن ہوں۔" اُس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ پھر اس نے میری طرف ٹارچ بڑھا دی۔ "اب تمھیں جیپ سے اترنا ہے۔ اس کے بعد تم اس ٹارچ کا رُخ سمندر کی طرف کرکے تین بار جلاؤ بجھاؤ گے۔ یہ لانچ کے لیے سگنل ہوگا۔ ذرا ایک بار کرکے تو دکھاؤ۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

میں جیپ سے اترا۔ میں نے اُس کی ہدایت کے مطابق ٹارچ سے سگنل دیا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے طمانیت بھرے انداز میں سر ہلایا، پھر زور سے چیخا۔ "کیمرے لاؤ۔ یہ منظر دونوں سائڈ سے فلمایا جائے گا۔"

اس کے بعد وہ کیمروں کی پوزیشن ٹھیک کرنے میں مصروف ہوگیا۔ ایک کیمرے کا رُخ جیپ کی طرف تھا جبکہ دوسرا کیمرہ سگنل دینے کے دوران سائڈ سے مجھے فوکس کرنے کے لیے تیار تھا۔

"ایک بار اور ریہرسل کریں گے۔" اعوان نے مجھ سے کہا۔ "پہلے صرف جیپ سے اترو اور ٹھہر جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ سائڈ والے کیمرے کے پیچھے چلا گیا۔

"کم آن۔"

اس کی آواز سن کر میں جیپ سے اترا۔ میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔

"ٹھیک ہے، یہیں کھڑے رہو۔ میرے آواز دینے پر حرکت میں آنا۔" اس نے مجھے مزید ہدایت کی، پھر وہ دوسرے کیمرے کی طرف چلا گیا۔ "تمھیں کیمرے کو جمال کے ساتھ ساتھ حرکت دینا ہے۔ جب وہ ٹھہر جائے تو پہلے تمھیں ایک سیکنڈ ٹھہرنا ہے پھر زوم لینس استعمال کرنا۔" اب وہ کیمرہ مین سے مخاطب تھا۔ "اب دیکھ لو کہ کیمرے کی پوزیشن درست ہے

نہیں " پھر وہ ہاتھوں کا بھونپو بنا کر زور سے چیخا "کم آن جمال"
اس کی آواز سن کر میں حرکت میں آ گیا۔ پھر بچے کھلے
...یوں سے ساحل کی طرف بڑھا، یہاں تک کہ پانی میرے
...ٹخنوں کو چھونے لگا۔ میں نے اسے سگنل دیا۔
"اوکے" کیمرہ مین نے کہا۔
"ٹھیک ہے جمال، واپس جاؤ۔ اب ہم ٹیک کریں
گے" اعوان نے کہا۔
میں دوبارہ جیپ میں جا بیٹھا۔ میرے اعصاب قدرے
...کشیدہ ہو رہے تھے۔
"کیمرہ اسٹارٹ" اعوان نے نعرہ لگایا۔ فضا میں کیمرے
...ہلکی سی آواز گونجنے لگی "فائنل ٹیک... یس جمال" اس
...دوبارہ نعرہ لگایا۔
میں جیپ سے اترا اور ساحل کی طرف بڑھ گیا۔ زیادہ
...شارشات نہیں تھا۔ ایک ہی ٹیک میں اوکے ہو گیا۔
"اب میں لانچ کی آمد کا منظر فلماؤں گا" اعوان نے
...اور کیمروں کی پوزیشننگ میں مصروف ہو گیا۔ میں پھر جیپ
...طرف چلا آیا۔
لائٹس کا رُخ ساحل کی طرف کر دیا گیا تھا۔ لانچ ساحل
...سے کچھ دور تھی۔ اعوان نے اس کے لیے شاید پہلے سے ہی فائر
...سگنل مقرر کر دیا تھا۔ کیمروں کی طرف سے مطمئن ہوتے ہی اس
...جیب سے ریوالور نکالا اور ہوائی فائر کر دیا۔
ایک دو لمحے کے بعد نیم تاریکی میں انجن کی آواز سنائی دی۔
"کیمرہ اسٹارٹ" اعوان نے نعرہ لگایا اور کیمرہ اسٹارٹ ہو گیا۔
وہ منظر بھی بخیر و خوبی فلما لیا گیا۔ لانچ اب ساحل کے
...قریب کھڑی تھی۔ اب میرے لانچ پر بکس پہنچانے والا منظر فلمبند
...ہونا تھا لیکن اس سے پہلے لانچ والوں سے میرے مکالمے تھے۔
...لانچ پر موجود شخص کو مجھ سے پوچھنا تھا "مال لائے ہو؟" اور مجھے
...جواب دینا تھا "میرا مال تمہارا ہے" وہاں ساؤنڈ ریکارڈنگ
...نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود ہمیں مکالمے ادا کرنے تھے۔
...آواز بعد میں ڈب ہونا تھی۔
ہم اس مرحلے سے بھی گزر گئے۔ اس دوران کیمرے
...بغیر رکاوٹ مسلسل متحرک رہے تھے۔ اعوان نے پھر کیمروں
...کی پوزیشن سیٹ کی۔ پہلا بکس لانچ تک لے جانے کا منظر
...فلما لیا گیا۔
"دوسرا بکس پہنچا کر وہیں رکنا" اعوان نے مجھ سے کہا۔
...اب ہم کوسٹ گارڈ کے ریڈ کا منظر فلمائیں گے"

میں نے دوسرا بکس لانچ پر پہنچا دیا۔ اعوان پھر کیمرہ مین سے
باتوں میں اُلجھ گیا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے
واکی ٹاکی پر شاید کوسٹ گارڈ والوں سے رابطہ قائم کیا۔ پھر
اس نے ہمیں آخری ہدایات دیں۔ اس منظر میں میرے علاوہ
کچھ اور لوگوں کا کام بھی تھا۔ سمندر کی طرف سے لانچ کی
آواز سنائی دیتے ہی اُس نے ایکشن اسٹارٹ کا نعرہ لگایا۔
اُسی وقت ہمیں کوسٹ گارڈ والوں کی لانچ نظر آئی۔ اگلے ہی
لمحے پورا ساحل بقعۂ نور بن گیا۔ کوسٹ گارڈ لانچ پر طاقتور
سرچ لائٹس نصب تھیں۔
"جہاں ہو، وہیں کھڑے رہو" لانچ پر سے چیخ کر کہا گیا۔
میں بکسوں کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا
نہ رہی کہ ایک بکس غائب ہو چکا تھا۔ جس دوران میں کوسٹ
گارڈ لانچ کی طرف متوجہ تھا، لانچ پر موجود لوگوں نے ایک
بکس نچلے حصے میں چھپا دیا تھا۔ اعوان کی ہدایت کے مطابق
سب نے ہاتھ کھڑے کر لیے تھے۔ میں نے بھی ہاتھ کھڑے کر لیے۔
کوسٹ گارڈ والوں کی لانچ سے تین باوردی افراد
کود کر ہماری لانچ پر آ گئے۔ ان میں سے ایک اپنے نشانات
کی وجہ سے مجھے افسر لگ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر
سرگوشی میں کہا "یہ سچ مچ اسمگلنگ ہو رہی ہے جناب"
وہ بڑی طرح گڑبڑا گیا۔ اُس نے مجھے یوں دیکھا جیسے
اس کی نظروں میں میری دماغی صحت مشکوک ہو۔
"لانچ کے نچلے حصے میں دوسرا بکس موجود ہے اور
اس میں ہیروئن ہے" میں نے مزید کہا "اور فلم کا ہدایت کار
مسلح ہے۔ اس کے پاس ریوالور ہے"
اس کا ہاتھ تیزی سے اپنے ہولسٹر کی طرف گیا۔ اگلے
ہی لمحے اس نے ریوالور نکال لیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی
اس کی پیروی کی "تم یہاں کے معاملات سنبھالو، میں نیچے
جا رہا ہوں" اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور نیچے کود گیا۔
اس کے ساتھیوں نے لانچ پر موجود لوگوں کو کور کر لیا۔ دوسری
طرف وہ کوسٹ گارڈ والے جو اب بھی اپنی لانچ پر تھے الرٹ
ہو گئے۔ سرچ لائٹس کی روشنی میں اعوان نے پانسہ پلٹتے دیکھ
لیا تھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے اپنی جیب کی طرف بڑھا لیکن
کوسٹ گارڈ افسر کی آواز سن کر وہ ٹھٹک گیا، جو اب اس کے
بہت قریب پہنچ چکا تھا۔
"ہاتھ اٹھا لو اور ساکت کھڑے رہو" افسر نے اُسے حکم دیا۔
اعوان نے اُس کے حکم کی تعمیل کی۔

"اور تم اس کی تلاشی لو" افسر نے ایک کیمرہ مین کو
حکم دیا "اس کی جیب سے ریوالور نکال کر میرے حوالے کر دو"
چند لمحے بعد اعوان کا ریوالور افسر کے ہاتھوں میں
تھا "ممکن ہے، تم میں سے کچھ اور لوگ بھی مسلح ہوں لیکن
یہ مت بھولنا کہ اس وقت تم سب میرے آدمیوں کی زد میں
ہو..." اُس نے لانچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
اس کے اشارہ کرتے ہی لانچ سے متعدد باوردی
اور مسلح افراد اترے اور انھوں نے پورے یونٹ کو نرغے
میں لے لیا۔ اپنے آدمیوں کو چوکس کر کے، افسر نے اعوان
کو ساتھ لیا اور لانچ پر چلا آیا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ
میں تھا "چلو۔ اب یہ بکس کھولو" اس نے اعوان سے کہا۔
"جناب، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" اعوان نے
مؤدبانہ انداز میں کہا "مجھے سچ مچ اسمگلنگ کرنا ہوتی تو میں
آپ لوگوں سے تعاون کیوں طلب کرتا"
افسر اس کی بات سے متاثر نظر آیا۔ لیکن اس کے
لہجے کی سختی برقرار رہی "میں کہہ رہا ہوں یہ بکس کھولو"
اعوان نے بکس کھول کر تمام اوزار نکالے۔ بکس کی
اُوپری تہ میں ایک اُبھری ہوئی سی جگہ تھی۔ اُس نے اُس
پر ہاتھ پھیرا۔ کھٹاک کی آواز کے ساتھ خفیہ خانہ سامنے آ
گیا "لیجیے... دیکھ لیجیے" اعوان نے افسر سے کہا۔
افسر نے ذرا سا پوڈر چکھا۔ اس کے انداز سے معلوم
ہو رہا تھا کہ یہ کارروائی بھی اس نے رسمًا کی تھی۔ اسے ایک
نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ہیروئن نہیں ہے۔
"یہ ہیروئن نہیں ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔
"میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا جناب" اعوان بولا۔
"ایک بکس اور بھی ہے" میں نے افسر سے کہا "وہ
بکس ان لوگوں نے لانچ میں کہیں چھپا دیا ہے"
افسر نے لانچ پر موجود افراد کو گھورا۔ ان میں سے
ایک بڑی طرح گڑبڑا گیا۔ وہ فلم کی کاسٹ میں شامل تھا۔
باقی لوگ بے خوف نگاہوں سے افسر کو دیکھتے رہے مجھے یقین
ہو گیا کہ وہ سچ مچ کے اسمگلر ہیں، گڑبڑانے والا شاید کوئی
ایکسٹرا تھا "خدا کی قسم سر... مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ میں
تو ہدایات کے مطابق کام کر رہا تھا"
"تمھیں معلوم ہے، دوسرا بکس کہاں ہے؟" افسر
نے پوچھا۔

"جی ہاں جناب"
"تو لے کر آؤ"
وہ ایک طرف چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا تو
اس کے ہاتھوں میں دوسرا بکس تھا۔ بکس اس نے افسر کے
سامنے ڈال دیا۔
"اسے بھی کھولو" افسر نے اعوان سے کہا۔
"میں عرض کر رہا ہوں جناب..."
"میں کہتا ہوں، بکس کھولو" افسر نے دہاڑ کر کہا۔
اعوان نے بکس کھول دیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ
گیا "اب آپ خود ہی اپنا اطمینان کر لیں"
میں چوکنا ہو گیا۔ عین ممکن تھا کہ اعوان بھاگنے کی
کوشش کرتا۔ لیکن وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز
میں طمانیت تھی۔
افسر نے پھر ذرا سا پاؤڈر زبان پر رکھا اور فوراً ہی
تھوک دیا "لاحول ولا قوۃ..." اس نے منہ بنا کے کہا۔
"یہ تو چاک کا پوڈر ہے"
"آپ میری بات مان ہی نہیں رہے تھے" اعوان
منمنایا۔
افسر نے کڑی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں جواباً اسے
گھورتا رہا۔ شرمندگی تو مجھے صرف اعوان سے تھی۔
"آپ نے ہمارا وقت ضائع کرایا" افسر نے سخت

یا نہیں" پھر وہ ہاتھوں کا بھونپو بنا کر زور سے چیخا "کم آن جمال"
اس کی آواز سن کر میں حرکت میں آ گیا۔ پھر بڑے تُلے قدموں سے ساحل کی طرف بڑھا، یہاں تک کہ پانی میرے قدموں کو چھونے لگا۔ میں نے اسے سگنل دیا۔
"اوکے" کیمرہ مین نے کہا۔
"ٹھیک ہے جمال، واپس جاؤ۔ اب ہم ٹیک کریں گے" اعوان نے کہا۔
میں دوبارہ جیپ میں جا بیٹھا۔ میرے اعصاب قدرے کشیدہ ہو رہے تھے۔
"کیمرہ اسٹارٹ" اعوان نے نعرہ لگایا۔ فضا میں کیمرے کی ہلکی سی آواز گونجنے لگی "فائنل ٹیک... یس جمال" اس نے دوبارہ نعرہ لگایا۔
میں جیپ سے اترا اور ساحل کی طرف بڑھ گیا۔ زیادہ دشوار شاٹ نہیں تھا۔ ایک ہی ٹیک میں اوکے ہو گیا۔
"اب میں لانچ کی آمد کا منظر فلماؤں گا" اعوان نے کہا اور کیمروں کی پوزیشننگ میں مصروف ہو گیا۔ میں پھر جیپ کی طرف چلا آیا۔
لائٹس کا رُخ ساحل کی طرف کر دیا گیا تھا۔ لانچ ساحل سے کچھ دور تھی۔ اعوان نے اس کے لیے شاید پہلے سے ہی فائر کا سگنل مقرر کر دیا تھا۔ کیمروں کی طرف سے مطمئن ہوتے ہی اس نے جیب سے ریوالور نکالا اور ہوائی فائر کر دیا۔
ایک دو لمحے کے بعد نیم تاریکی میں انجن کی آواز سنائی دی۔
"کیمرہ اسٹارٹ" اعوان نے نعرہ لگایا اور کیمرہ اسٹارٹ ہو گیا۔
وہ منظر بھی بخیر و خوبی فلما لیا گیا۔ لانچ اب ساحل کے قریب کھڑی تھی۔ اب میرے لانچ پر بکس پہنچانے والا منظر فلمبند ہونا تھا لیکن اس سے پہلے لانچ والوں سے میرے مکالمے تھے۔ لانچ پر موجود شخص کو مجھ سے پوچھنا تھا "مال لائے ہو؟" اور مجھے جواب دینا تھا "میرا مال تیار ہے۔" وہاں ساؤنڈ ریکارڈنگ نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود ہمیں مکالمے ادا کرنے تھے۔ آواز بعد میں ڈب ہونا تھی۔
ہم اس مرحلے سے بھی گزر گئے۔ اس دوران کیمرے مع ٹرالی مسلسل متحرک رہے تھے۔ اعوان نے پھر کیمروں کی پوزیشن سیٹ کی۔ پہلا بکس لانچ تک لے جانے کا منظر فلما لیا گیا۔
"دوسرا بکس پہنچا کر وہیں رکنا" اعوان نے مجھ سے کہا۔ "اب ہم کوسٹ گارڈ کے ریڈ کا منظر فلمائیں گے"

میں نے دوسرا بکس لانچ پر پہنچا دیا۔ اعوان پھر کیمرہ مین سے الجھ گیا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے واکی ٹاکی پر شاید کوسٹ گارڈ والوں سے رابطہ قائم کیا۔ پھر اس نے ہمیں آخری ہدایات دیں۔ اس منظر میں میرے علاوہ کچھ اور لوگوں کا کام بھی تھا۔ سمندر کی طرف سے لانچ کی آواز سنائی دیتے ہی اس نے ایکشن اسٹارٹ کا نعرہ لگایا۔ اسی وقت ہمیں کوسٹ گارڈ والوں کی لانچ نظر آئی۔ اگلے ہی لمحے پورا ساحل بقعۂ نور بن گیا۔ کوسٹ گارڈ لانچ پر طاقتور سرچ لائٹس نصب تھیں۔
"جہاں ہو، وہیں کھڑے رہو" لانچ پر سے چیخ کر کہا گیا۔
میں بکسوں کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک بکس غائب ہو چکا تھا۔ جس دوران میں کوسٹ گارڈ لانچ کی طرف متوجہ تھا، لانچ پر موجود لوگوں نے ایک بکس نچلے حصے میں چھپا دیا تھا۔ اعوان کی ہدایت کے مطابق سب نے ہاتھ کھڑے کر لیے تھے۔ میں نے بھی ہاتھ کھڑے کر لیے۔
کوسٹ گارڈ والوں کی لانچ سے تین باوردی افراد کود کر ہماری لانچ پر آ گئے۔ ان میں سے ایک اپنے نشانات کی وجہ سے مجھے افسر لگ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر سرگوشی میں کہا "یہ سچ مچ اسمگلنگ ہو رہی ہے جناب"
وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے اس کی نظروں میں میری دماغی صحت مشکوک ہو۔
"لانچ کے نچلے حصے میں دوسرا بکس موجود ہے اور اس میں ہیروئن ہے" میں نے مزید کہا "اور فلم کا ہدایت کار مسلح ہے۔ اس کے پاس ریوالور ہے"
اس کا ہاتھ تیزی سے اپنے ہولسٹر کی طرف گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ریوالور نکال لیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی پیروی کی "تم یہاں کے معاملات سنبھالو، میں نیچے جا رہا ہوں" اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور نیچے کود گیا۔
اس کے ساتھیوں نے لانچ پر موجود لوگوں کو کور کر لیا۔ دوسری طرف وہ کوسٹ گارڈ والے جو اب بھی اپنی لانچ پر تھے، الرٹ ہو گئے۔ سرچ لائٹس کی روشنی میں، اعوان نے پانسہ پلٹتے دیکھ لیا تھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے اپنی جیب کی طرف بڑھا لیکن کوسٹ گارڈ افسر کی آواز سن کر وہ ٹھٹک گیا، جو اب اس کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔
"ہاتھ اٹھا لو اور ساکت کھڑے رہو" افسر نے اسے حکم دیا۔ اعوان نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔

"اور تم اس کی تلاشی لو" افسر نے ایک کیمرہ مین کو حکم دیا "اس کی جیب سے ریوالور نکال کر میرے حوالے کر دو"
چند لمحے بعد اعوان کا ریوالور افسر کے ہاتھوں میں تھا "ممکن ہے، تم میں سے کچھ اور لوگ بھی مسلح ہوں لیکن یہ مت بھولنا کہ اس وقت تم سب میرے آدمیوں کی زد میں ہو۔" اس نے لانچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
اس کے اشارہ کرتے ہی لانچ سے متعدد باوردی اور مسلح افراد اترے اور انھوں نے پورے یونٹ کو نرغے میں لے لیا۔ اپنے آدمیوں کو چوکس کر کے، افسر نے اعوان کو ساتھ لیا اور لانچ پر چلا آیا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا "چلو۔ اب یہ بکس کھولو" اس نے اعوان سے کہا۔
"جناب، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" اعوان نے مؤدبانہ انداز میں کہا "مجھے سچ مچ اسمگلنگ کرنا ہوتی تو میں آپ لوگوں سے تعاون کیوں طلب کرتا"
افسر اس کی بات سے متاثر نظر آیا۔ لیکن اس کے لہجے کی سختی برقرار رہی "میں کہہ رہا ہوں یہ بکس کھولو"
اعوان نے بکس کھول کر تمام اوزار نکالے۔ بکس کی اوپری تہ میں ایک ابھری ہوئی سی جگہ تھی۔ اس نے اس پر ہاتھ پھیرا۔ کھٹاک کی آواز کے ساتھ خفیہ خانہ سامنے آ گیا "لیجیے... دیکھ لیجیے" اعوان نے افسر سے کہا۔
افسر نے ذرا سا پوڈر چکھا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ کارروائی بھی اس نے رسمًا کی تھی۔ اسے ایک نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ہیروئن نہیں ہے۔
"یہ ہیروئن نہیں ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔
"میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا جناب" اعوان بولا۔
"ایک بکس اور بھی ہے" میں نے افسر سے کہا "وہ بکس ان لوگوں نے لانچ میں کہیں چھپا دیا ہے"
افسر نے لانچ پر موجود افراد کو گھورا۔ ان میں سے ایک بری طرح گڑبڑا گیا۔ وہ فلم کی کاسٹ میں شامل تھا۔ باقی لوگ بے خوف نگاہوں سے افسر کو دیکھتے رہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سچ مچ کے اسمگلر ہیں۔ گڑبڑانے والا شاید کوئی ایکسٹرا تھا "خدا کی قسم سر... مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ میں تو ہدایات کے مطابق کام کر رہا تھا"
"تمھیں معلوم ہے، دوسرا بکس کہاں ہے؟" افسر نے پوچھا۔

"جی ہاں جناب"
"تو لے کر آؤ"
وہ ایک طرف چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں دوسرا بکس تھا۔ بکس اس نے افسر کے سامنے ڈال دیا۔
"اسے بھی کھولو" افسر نے اعوان سے کہا۔
"میں عرض کر رہا ہوں جناب..."
"میں کہتا ہوں، بکس کھولو" افسر نے دہاڑ کر کہا۔
اعوان نے بکس کھول دیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "اب آپ خود ہی اپنا اطمینان کر لیں"
میں چوکنا ہو گیا۔ عین ممکن تھا کہ اعوان بھاگنے کی کوشش کرتا۔ لیکن وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز میں طمانیت تھی۔
افسر نے پھر ذرا سا پاؤڈر زبان پر رکھا اور فوراً ہی تھوک دیا "لاحول ولا قوۃ..." اس نے منہ بنا کے کہا۔ "یہ تو چاک کا پوڈر ہے"
"آپ میری بات مان ہی نہیں رہے تھے" اعوان منمنایا۔
افسر نے کڑی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں جواباً اسے گھورتا رہا۔ شرمندگی تو مجھے صرف اعوان سے تھی۔
"آپ نے ہمارا وقت ضائع کرایا" افسر نے سخت

لہجے میں مجھ سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے یہ ناخوشگوار صورتِ حال پیش آئی۔ لیکن جناب، مجھے شک تھا... اور ایک اچھا شہری ہونے کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ میں آپ کو اپنے شبہے سے آگاہ کرتا۔"

"لیکن آپ کا شبہ بے بنیاد تھا۔"

"آپ گمنام اطلاعات کو بھی تو اہمیت دیتے ہیں۔"

پہلے تو اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے۔ پھر شاید وہ میری بات سمجھ گیا۔ "اس کے باوجود مجھے ضابطے کی کارروائی تو کرنا ہوگی۔"

"میرا خیال ہے، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" اعوان نے مداخلت کی۔ "جمال نے وہی کچھ کیا، جو ایک محبِ وطن پاکستانی کو کرنا چاہیے۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ ایک معزز صنعت کار ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے..."

"تو بہتر ہوگا کہ میں آپ کے کمانڈر سے بات کرلوں۔ انہی کے ذریعے مجھے آپ کے محکمے کا تعاون حاصل ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے، وہ میری بات سمجھ لیں گے۔"

افسر چند لمحے سوچتا رہا، پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں جناب۔ آپ کو کمانڈر سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں جمال صاحب سے درخواست کروں گا کہ آئندہ محتاط رہیں۔"

بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ کوسٹ گارڈ والوں کی واپسی کے بعد اعوان نے شوٹنگ پیک کرنے کا حکم دیا۔ سامان گاڑیوں پر لادا جانے لگا۔ اعوان نے اپنے اسسٹنٹ کو تفصیلی ہدایات دیں اور میرا ہاتھ تھام کر اس گاڑی کی طرف بڑھ گیا، جس کے ذریعے ہم یہاں آئے تھے۔ ڈرائیور پہلے ہی سیٹ پر موجود تھا۔ واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔ اعوان بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ وہ خاموشی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ لیکن کچھ کہنے کا حوصلہ بھی نہیں تھا۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" بالآخر اعوان نے پوچھا۔

میں چند لمحے سوچتا رہا۔ وہ مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔

"فلم کے چکر سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ کیوں؟" اس نے پوچھا۔ لہجے میں حیرت تھی۔

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا کوئی شوق ہے اور نہ ہی لگن۔ دوسرے میں محسوس کرتا ہوں کہ فلمی دنیا مجھے راس آئی ہے، نہ کبھی آئے گی۔ پہلی بار بھی فلم انڈسٹری میں داخل ہوتے ہی میں دبال میں پھنسا تھا... اور اب خدا جانے، میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ تیسری بات یہ کہ میں آپ سے شرمندہ ہوں... اور آپ کا سامنا کرنا نہیں چاہتا۔"

"آخری جواز میں تسلیم نہیں کرسکتا۔" اعوان نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے جو کچھ کیا، میرے نزدیک وہ قابلِ تعریف ہے۔ تمہاری جگہ میں بھی ہوتا تو شاید یہی کچھ کرتا۔ اس سے مجھے جو سبق ملا ہے، وہ بھی بہت اہم ہے۔ مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ میرا خبط بے حد خطرناک ہے، مجھے اپنی حقیقت پسندی کو معقولیت کی حدود میں رکھنا چاہیے۔"

میں حیران رہ گیا۔ مجھ پر اس کا پہلا تاثر کچھ اچھا نہیں تھا۔ لیکن وہ شخص درحقیقت بہت اچھا اور ذی فہم آدمی ثابت ہوا تھا۔

"اس کے باوجود میں اب فلم سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تمہیں کھو کر مجھے بھی افسوس ہوگا۔ لیکن یہ میں محسوس کرچکا ہوں کہ فلمی دنیا واقعی تمہارے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس لیے میں تم سے اصرار نہیں کروں گا۔"

"میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ کیونکہ اس کا اصرار مجھے مجبور بھی کرسکتا تھا۔ "تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گے۔ میں نے تمہارے ساتھ تھوڑا لیکن بہت یادگار وقت گزارا ہے۔"

"مجھے خوشی ہوگی... اگر تم مجھے اچھے دوست کی حیثیت سے یاد رکھو۔" اس نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "تمہارا دیا ہوا سبق مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میری حقیقت پسندی سفاکی کی حدوں کو پہنچ گئی تھی۔"

مہران پہنچ کر ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس وقت گلنار کی طرف جانا مناسب نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اعوان بھی آگیا۔ معلوم ہوا کہ اس نے روم سروس کو فون کرکے میرے کمرے میں کھانا منگوالیا ہے۔

کھانے سے فارغ ہوکر اعوان میری طرف متوجہ ہوا۔

"اب کیا ارادہ ہے دوست؟" اُس نے پوچھا۔

"کل صبح میں رخصت ہوجاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "زندگی میں کسی بھی مرحلے پر میری ضرورت پڑے تو تم بلاجھجک مجھ سے رابطہ قائم کرسکتے ہو۔ اب میں چلتا ہوں... شب بخیر۔"

"صبح بھی تو ملاقات ہوگی؟"

"نہیں... میں دیر تک سوؤں گا۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ پھر اس نے وضاحت بھی کی۔ "پسندیدہ لوگوں سے جدائی میرے لیے بے حد ناخوشگوار ہوتی ہے۔ میں اسی قسم کا آدمی ہوں۔ اسی لیے ایسی صورتِ حال سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ویسے بھی میں تمہیں الوداع نہیں کہوں گا تاکہ دوبارہ ملنے کا امکان بھی ذہن میں رہے۔"

میں نے بڑی گرمجوشی سے اس سے مصافحہ کیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا اور بستر پر دراز ہوگیا۔ ایک لمحے کے لیے تصور میں گلنار کا سراپا لہرایا۔ پھر اُس کی جگہ بے چہرہ نازو نے لے لی۔ اس کا چہرہ مسخ شدہ تھا لیکن آنکھیں وہی تھیں... لوٹتی ہوئی آنکھیں! اس وقت اُن نگاہوں میں شکایت تھی۔

"تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں۔" میں نے آہستہ سے اُسے مخاطب کیا۔ "کوشش کے باوجود مجھے تمہارا سراغ نہیں مل رہا ہے۔ تم نے اپنا کوئی نشان بھی تو نہیں چھوڑا!"

نازو کے لب ہلے۔ شاید وہ کیسا لمحہ تھا کہ تصور بھی حقیقت میں ڈھل کر رہ گیا تھا۔ "میں تو تمہارے بہت قریب ہوں۔ ہمیشہ قریب رہی ہوں۔" اس کی آواز سنائی دی۔ "لیکن تمہاری نظروں میں میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ اسی لیے تم مجھے پہچان نہیں سکے ہو۔ کب پہچانو گے مجھے؟" اس کے لہجے میں کرب تھا۔

"میں تمہیں کیسے پہچانوں...؟"

"ہاں... تم تو چہرے کے... خدوخال کے محتاج ہو۔ تمہارا بھی کیا قصور ہے اس میں! انسان کی شناخت اس کے چہرے ہی سے تو ہوتی ہے اور میں اپنا چہرہ کھو بیٹھی ہوں۔" اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔

میں نے آنکھیں موند لیں۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ نازو کو تلاش کیے بغیر میرے لیے پرسکون اور پرمسرت زندگی گزارنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ میں ان دونوں لڑکیوں کے درمیان اس طرح تقسیم ہوا تھا کہ یکجائی و یکسوئی کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اس وقت میں

یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں ان دونوں میں سے کس کا طلبگار ہوں۔ میرے لیے تجزیہ کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ نازو کے ملنے پر ہی صحیح صورتِ حال سامنے آسکتی تھی۔ ممکن ہے کہ نازو کی گمشدگی ہی میرے لیے اصل مسئلہ ہو۔ مجھے اُس سے کوئی جذباتی لگاؤ نہ ہو... محض اُس کی گمشدگی کی وجہ سے ایک وقتی جذباتی رابطہ استوار ہوا ہو۔ نازو کے ملنے پر ہی مجھے اندازہ ہوسکتا تھا کہ میں اس کے متعلق اپنے دل میں کس طرح کے جذبات رکھتا ہوں... لیکن نازو کے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ گویا میری زندگی اسی نفاق میں کٹ جائے گی اور میں گلنار کو بھی کبھی پوری طرح نہیں اپنا سکوں گا۔ یہ میرے لیے بہت بڑا مسئلہ تھا اور سردست اس مسئلے کا کوئی حل میرے سامنے نہیں تھا۔

رات اسی اُدھیڑ بُن میں... سوتے جاگتے کٹ گئی۔

صبح ہوتے ہی میں نے اپنا سامان بیگ میں رکھا... ڈیفنس کا پتہ جیب میں ڈالا اور اپنے کمرے سے نکل آیا۔ اعوان کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں ٹھٹک گیا۔ بڑی شدت سے جی چاہا کہ اس کے دروازے پر دستک دوں اور اس سے ملے بغیر رخصت نہ ہوں۔ لیکن پھر اُس کے الفاظ یاد آگئے۔ میں آگے بڑھ گیا۔

ہوٹل کے ٹیلیفون بوتھ سے میں نے گلنار کو فون کیا۔ تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھالیا گیا۔ "ہیلو۔" وہی مترنم آواز سنائی دی، جسے میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

"میں بول رہا ہوں۔" میں نے نام بتائے بغیر کہا۔

"اوہ جمال... شکر ہے۔ تمہاری آواز سنے مدتیں ہوگئی تھیں۔ کتنی ہی بار فون کیا لیکن تم سے بات نہ ہوسکی۔ تم

خیریت سے تو ہو؟"
"الحمدللہ۔" میں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "اچھا آواز سُنے تو مدتیں ہو گئیں۔ صورت دیکھنے کے متعلق کیا کہتی ہو؟"
"چڑا رہے ہو۔" وہ غالباً جھلا گئی۔ "خدا کی قسم... ابھی اور اسی وقت لاہور کے لیے روانہ ہو جاؤں گی۔ تنگ آ چکی ہوں میں۔"
"حالانکہ جب چاہو، مجھے طلب کر سکتی ہو۔" میں نے شوخی سے کہا۔ اس کی آواز سنتے ہی سارا تکدر دور ہو گیا تھا اور طبیعت میں شگفتگی آ گئی تھی۔ "لیکن تم ہمیں طلب کیوں کرنے لگیں۔"
"میں طلب کرنے کا حق ہی کب رکھتی ہوں۔" اُس نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ "تم سے کہا تھا کہ کراچی آجاؤ یا ہمیں لاہور بلوا لو۔ لیکن تم کسی کی سنتے کب ہو۔"
"کب کہا تھا تم نے؟ مجھے تو یاد نہیں آتا۔"
"اچھا... چلو، اب کہہ رہی ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
"اگر سواری میسر آجائے تو پندرہ منٹ میں تمہارے پاس پہنچ سکتا ہوں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "پردیسی ہوں۔ بھٹک جانے کا ڈر ہے۔ ورنہ خود ہی آجاتا۔"
"جمال... کہاں سے بول رہے ہو تم؟" اس نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔ آواز بکھری جا رہی تھی۔
"مہران ہوٹل کراچی سے۔"
دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ صرف اس کی اُلجھی ہوئی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
"ہیلو۔" میں نے کہا۔ "تم خیریت سے تو ہو؟"
"ہاں... خیریت سے تو ہوں۔ بس یقین نہیں آ رہا۔"
"تو آزما کیوں نہیں لیتیں؟"
"جمال میں گاڑی بھیج رہی ہوں۔" اُس نے مخمور لہجے میں کہا۔ "گرے کلر کی ٹویوٹا ہو گی۔ نمبر یاد کر لو... ۵۹۷-۲۲۴... باقی باتیں گھر پر ہوں گی۔ ٹھیک ہے نا؟"
"ٹھیک ہے۔" اس وقت تک کے لیے خدا حافظ۔" میں نے اناؤنسروں کے سے انداز میں کہا اور ریسیور رکھ دیا۔
پھر میں باہر نکل آیا۔ اب مجھے صرف گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ میں ہوٹل کے باہر ٹہلتا رہا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ خود اُڑ کر گلنار تک پہنچ جاؤں۔

مجھے ٹہلتے ہوئے بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ میری مطلوبہ کار آگئی۔ عقبی نشست پر گلنار بیٹھی تھی۔ وہ جھپٹ کر کار سے نکلی اور والہانہ انداز میں میری طرف بڑھی۔ لیکن قریب پہنچ کر ٹھٹک گئی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ہم دونوں گُنگ کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھے جا رہے تھے۔ اس کی نگاہوں میں وارفتگی تھی۔ وقت جیسے ہم دونوں کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ پھر اسے ہی پہلے ہوش آیا۔
"چلو نا... کیا یہیں کھڑے رہو گے؟" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔
"جی تو یہی چاہتا ہے۔"
"فضول باتیں مت کرو۔ چلو، گھر چلیں۔" اس نے مجھے پیار سے ڈانٹا۔
"یہ مصیبت ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "دور رہنے سے انسان کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے جبکہ قربت میں وہی حال ہوتا ہے، گھر کی مرغی دال برابر۔"
"بس... تنگ مت کرو۔ چلو۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔
ڈرائیور بھی نیچے اتر آیا تھا۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں "سلام صاحب" کہا اور عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ ہمارے بیٹھنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
"میرا تو خیال تھا، تم خود نہیں آؤ گی۔" میں نے گلنار کو چھیڑا۔
"تم نے دھماکا ہی ایسا کیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ فون پر کیا کہہ رہی ہوں۔ لیکن پھر ہوش آ ہی گیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں نہ آتی۔"
"اور باقی لوگ؟"
"امی کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ ریشماں ان کی دیکھ بھال کر رہی ہو گی۔ ویسے بھی میں انھیں کچھ بتا کر نہیں آئی ہوں۔ اچانک تمھیں سامنے پا کر کتنی خوش ہوں گی وہ دونوں!"
"امی کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟" میں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔
"ارے نہیں... پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ معمولی سا بخار ہے۔"
ہماری گفتگو وہیں موقوف ہو گئی۔ اب ہم صرف ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ اب گفتگو نگاہیں

کر رہی تھیں... کیونکہ وہ گفتگو کا ایسا مرحلہ تھا، جو صرف خلوت میں بھلا معلوم ہوتا ہے۔
کوئی پندرہ منٹ بعد ڈرائیور نے ایک بنگلے کے سامنے کار روکی۔ وہ علاقہ بہت صاف ستھرا تھا۔ ہر طرف بڑی بڑی خوبصورت کوٹھیاں تھیں۔ مجھے بنگلے کی نیم پلیٹ پر اپنا نام دیکھ کر حیرت ہوئی۔ گلنار نے بھی میری نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔
"یہاں پہلے کس کا نام تھا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔ اسی دوران ڈرائیور کا ہارن سن کر چوکیدار نے آہنی گیٹ کھول دیا تھا۔
"اسلم سعید کا۔" گلنار نے جواب دیا۔
"تو پھر نام بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔
"یہ ریشماں کی ضد تھی۔ اس کی ضد کے سامنے ہم سب کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔" گلنار نے نرم لہجے میں کہا۔
کار پورچ میں رک گئی تھی۔ ہم دونوں کار سے اتر کر بنگلے میں داخل ہو گئے۔ بنگلا بے حد وسیع و عریض اور آراستہ پیراستہ تھا۔ گلنار کے ساتھ چلتا ہوا میں زینوں پر چڑھ کر اُوپری منزل پر پہنچا۔ وہ مجھے اُوپری منزل کے ایک کمرے میں لے آئی۔ وہ ایک خواب گاہ تھی۔ گلنار کی امی بستر پر دراز تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ریشماں ان کے سرہانے کرسی ڈالے بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گئی۔ پھر بے تابانہ اُٹھ کر میری طرف لپکی۔ "بھائی جان... آپ" اس کے لہجے میں بے پناہ خوشی تھی لیکن لفظ بے یقینی کا تاثر دے رہے تھے۔ اُس نے آکر میرے ہاتھ کو یوں چھوا، جیسے میری موجودگی کا یقین کرنا چاہ رہی ہو۔
"ہاں گڑیا... یہ میں ہی ہوں... تمھارا بھائی جان۔" میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا اور پھر گلنار کی امی کی طرف متوجہ ہوا، جو اُٹھ بیٹھی تھیں۔ وہ کچھ کمزور نظر آ رہی تھیں۔ میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے نقاہت زدہ آواز میں جواب دیا اور پوچھا۔ "کب آئے جمال؟" اُن کے لہجے میں شفقت تھی۔ "آؤ بیٹھو۔"
میں اس کرسی پر بیٹھ گیا، جس پر چند لمحے پہلے ریشماں بیٹھی تھی۔ گلنار کی امی نے مشفقانہ انداز میں میرے سر پر ہاتھ رکھا۔
"آپ بہت نڈھال نظر آ رہی ہیں۔ لیٹ جائیے۔" میں نے کہا... اور وہ دوبارہ دراز ہو گئیں۔ "میں کل آیا تھا۔ رات بہت دیر ہو گئی تھی۔ اسی لیے آنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"تو رات کہاں گزاری؟" انھوں نے پوچھا۔

"ہوٹل میں۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا ہوا، تم آ گئے۔ ہم لوگ بہت تنہائی محسوس کر رہے تھے۔" انھوں نے کہا۔ "یہ دونوں بھی گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ دونوں بہت یاد کرتی رہی ہیں تمھیں۔ جمیل آ مار رہتا ہے۔ کتنی بار کہا کہ گھوم پھر آؤ لیکن یہ۔۔۔"

"امی۔۔۔ آپ نے پھر باتیں شروع کر دیں۔" گلنار نے انھیں ٹوک دیا۔

"دیکھ لو۔" گلنار کی امی نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "ان دونوں نے زبردستی مجھے بیمار بنا رکھا ہے، باتیں بھی نہیں کرنے دیتیں۔"

"ابھی ہو جائیں گی تو جی بھر کے باتیں کر لیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ جا کر جمال کے لیے کمرہ ٹھیک کر دو۔" انھوں نے کہا۔

"چلیے جناب۔" گلنار نے بڑی ادا سے کہا۔ میں ان دونوں کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔

"کون سا کمرہ پسند کریں گے جہاں پناہ؟" گلنار نے پوچھا۔

"ارے۔۔۔ یہ تم مجھ سے چڑ کیوں رہی ہو؟"

"چڑ رہی کیوں نہیں۔ آپ میری امی تک پر قابض ہو گئے ہیں۔ اتنی محبت اور شفقت تو انھوں نے کبھی میرے ساتھ بھی نہیں برتی۔"

"یہ باتیں تمھاری سمجھ میں آنے والی نہیں۔" میں نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔ "دوسری طرف ہم تم پر قابض ہو گئے ہیں تو تمھاری امی بھی ظاہر ہے ہماری امی ہو گئیں۔"

گلنار کا چہرہ سچ مچ گلنار ہو گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے ریشماں کی طرف اشارہ کیا، جو زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

"تو ایسی باتیں نکالتی ہی کیوں ہو؟" میں نے اسے مزید چھیڑا۔

"میں کہاں کچھ کہہ رہی ہوں۔" گلنار نے بے حد معصومیت سے کہا۔

"اور آپ بھائی جان کو لیے کہاں جا رہی ہیں؟" ریشماں نے گلنار کو مخاطب کیا۔

"ان کا کمرہ دکھانے۔۔۔"

"بغیر صفائی کے۔۔۔ یعنی بھائی جان کی موجودگی ہی میں صفائی ہو گی تاکہ سانسوں کے ذریعے گرد و غبار کا ناشتہ کر سکیں۔"

گلنار جھینپ گئی۔ "بہت تیز ہو گئی ہو۔" اس نے کہا۔

"تمھارے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟"

"آپ کی پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ کی صحبت کا اثر ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ آپ بھائی جان کو ڈرائنگ روم میں لے جائیں۔ میں اُن کے لیے کمرہ سیٹ کر کے خود بلا لوں گی۔" ریشماں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

ہم دونوں نیچے چلے آئے۔ گلنار میرے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ "اور سناؤ، لاہور کا کیا حال ہے؟" اس نے کہا۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"میرے لیے تو لاہور اجڑ چکا ہے۔ اب ایک ہستی کے سوا وہاں رکھا ہی کیا ہے۔"

"کیوں، خیریت تو ہے؟" اس کے لہجے نے مجھے چونکا دیا۔

"خالہ کا انتقال ہو گیا۔ تم نہیں جانتے۔۔۔ لیکن میں امی سے زیادہ ان کے قریب تھی۔" گلنار کے لہجے میں سوگواری تھی۔

"یہ کس خالہ کا تذکرہ کر رہی ہو؟" میرے لہجے میں الجھن تھی۔

"میری سگی خالہ تھیں وہ۔۔۔ وہی جن کے بالاخانے پر میں بیٹھتی تھی۔ لیکن جمال، خدا کے لیے امی کے سامنے میرے اور اُن کے تعلق کا تذکرہ نہ چھیڑ بیٹھنا۔ یہ بازار والی بات امی کے علم میں نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے بے ساختہ کہا۔ "آخر تم راتوں کو غائب رہتی تھیں؟"

"بڑی لمبی کہانی ہے۔ تمھیں تفصیل سے سناؤں گی کسی دن۔۔۔ امی کا خیال تھا کہ مجھے ایئر ہوسٹس کی جاب مل گئی ہے۔ یوں میرے غائب رہنے کا معقول جواز تھا ان کے پاس۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ عجیب بات بتا رہی تھی وہ۔۔۔ اب اس کی امی کا رویّہ۔۔۔ اُن کا سراپا میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ کس قدر باوقار خاتون تھیں وہ۔۔۔ گلنار کے غائب ہونے پر اُن کی پریشانی۔۔۔ اُن کا ردِ عمل۔۔۔ میرے ساتھ سخت رویّہ۔۔۔ پھر مجھے کچھ یاد آ گیا۔ "لیکن تمھاری امی کو علم تھا کہ تم میری وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہوئی ہو۔" میں نے معترضانہ انداز میں کہا۔

"ہاں، یہ درست ہے۔" گلنار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے امی کو نواب خان والے معاملے کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس طرح تو ان پر یہ تکلیف دہ راز کھل جاتا کہ میں بالاخانے پر بیٹھتی ہوں۔ البتہ تمھارے متعلق بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔" اس کا لہجہ شرمگیں ہو گیا۔

"بلکہ یہ تو ضروری تھا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اس صورت میں تمھیں بالاخانے پر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں نے کہا نا کہ موقع آنے پر تمھیں سب کچھ بتا دوں گی۔" گلنار کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

اسی وقت ریشماں ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"کمرہ ٹھیک ہو گیا؟" گلنار نے پوچھا۔

"ابھی تو میں نے صفائی شروع بھی نہیں کی۔" ریشماں نے جواب دیا۔ پھر مجھ سے پوچھا۔ "بھائی جان۔۔۔ ناشتہ بھی کیا آپ نے؟"

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں تو ہوٹل سے، اٹھتے ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔ "نہیں بھئی۔۔۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔" میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ گلنار باجی اتنا تیز کام کرتی ہیں کہ لگتا ہے، جنات ان کے قبضے میں ہیں۔ آپ دیکھیے گا۔ ابھی جائیں گی اور دو منٹ کے اندر اندر ناشتہ آپ کے سامنے ہو گا۔" ریشماں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا۔۔۔ میں تو چلی کمرہ صاف کرنے۔" یہ کہہ کر وہ جھپاک سے ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی گلنار بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم کہاں چلیں؟"

"تمھارے لیے ناشتہ تیار کروں گی۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں گھڑی پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔" میں نے کہا۔ "دعوے کے مطابق دو منٹ کے اندر اندر ناشتہ پہنچ جانا چاہیے۔"

گلنار مسکرائی لیکن اس کی مسکراہٹ بجھی بجھی تھی۔

"ارے۔۔۔ کس کی باتوں میں آ گئے تم۔۔۔ ریشماں بہت شرارتی ہو گئی ہے۔" اس نے پژمردہ لہجے میں کہا اور چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی نجی زندگی پر گفتگو کے بعد میں نے اس کے انداز میں واضح تبدیلی محسوس کی تھی۔ وہ کچھ کھنچ سی گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب اس سے مستقبل کے بارے میں کھل کر بات کر لینی چاہیے۔ دوسری طرف وہ میرے لیے ایک مشکل پہیلی تھی، جسے میں بوجھ نہیں سکتا تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔۔۔ اور اب تو اور پیچیدگیاں سامنے آ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا حق رکھتا ہوں۔۔۔ جبکہ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنی نجی زندگی کے بارے میں تجسس پسند نہیں ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں چند روز توقف کر کے گفتگو کرنا بہتر رہے گا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گلنار ناشتے کی ٹرے اٹھائے ہوئے، ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ میں نے حیرت سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اسے گئے ہوئے دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے۔

"واقعی۔۔۔ ریشماں ٹھیک کہہ رہی تھی۔ تمھارے قبضے میں یقیناً جنات ہیں۔ اس کا کہنا حرف بحرف درست ثابت ہوا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" گلنار محجوب ہو کر بولی۔ "یہ ریشماں ہی کی شرارت ہے۔ کمرے کی صفائی کرنے کی بجائے اس نے پہلے ناشتہ تیار کر لیا تھا۔ میں تو صرف ٹرے اٹھا کر لائی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹرے میرے سامنے میز پر رکھ دی۔

ناشتہ ٹوسٹ، انڈے، شہد اور مکھن پر مشتمل تھا۔ ٹرے میں چائے دانی اور دو پیالیاں بھی موجود تھیں۔

"تم بھی آؤ نا۔" میں نے گلنار سے کہا۔

"میں تو تمھارا فون آنے سے پہلے ہی ناشتہ کر چکی تھی۔"

"تو چائے پی لو۔"

"تم ناشتہ کر لو پہلے۔ چائے ساتھ ہی پئیں گے۔" اس مختصر سی گفتگو کے بعد یہ گلنار کا پہلا جملہ تھا جس سے اپنائیت جھلک رہی تھی۔ میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ الفاظ اور لہجے کے برعکس اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

میں خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا۔ ناشتے سے فارغ ہوا۔ گلنار نے تمام برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھے اور ٹرے کو ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس نے پیالیوں میں چائے انڈیلی اور ایک پیالی میری طرف بڑھا دی۔

میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔۔۔ جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ اس کی نگاہیں اپنے سامنے رکھی چائے کی پیالی پر جمی ہوئی تھیں۔

"ایک بات پوچھوں؟" بالآخر وہ بولی۔

"کیا بات ہے؟ یہ تمھیں اچانک ہو کیا گیا ہے؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "اگر میرا آنا ناگوار گزرا ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔ تم جانتے ہو کہ ایسا نہیں ہے۔ بس، میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ وعدہ کرو کہ میری بات کا جواب پوری دیانت داری سے دو گے۔"

میں نے اُسے بغور دیکھا۔ پہلے کی طرح اس کے چہرے پر بھی بے پناہ سنجیدگی تھی "ٹھیک ہے، پوچھو، کیا پوچھنا چاہتی ہو؟" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟"

میں بھونچکا رہ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ آج بالاخانے کے حوالے سے ہونے والی گفتگو نے اس کے وہ زخم ہرے کر دیے ہیں، جن سے میں واقف بھی نہیں تھا۔ اس کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔

"تم خوب جانتی ہو کہ میں تمھیں کیا سمجھتا ہوں۔"

"لیکن میں الفاظ میں سننا چاہتی ہوں۔"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"یہ عجیب سوال ہے۔ ایسا ہی ہے، جیسے تم مجھ سے پوچھو کہ میں کھانا کیوں کھاتا ہوں۔" میں نے لہجہ شگفتہ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے باوجود میں اس سوال کا جواب چاہوں گی۔ دوسری صورت میں تمھاری اس مثال کے حوالے سے تمھارے جذبے کا محرک تلاش کروں گی۔ ویسے تمھاری مثال درست ہے۔"

میں بڑی طرح گڑبڑا گیا۔ معاملہ بے حد سنگین تھا۔ اب مجھے جو کچھ بھی کہنا تھا، سوچ سمجھ کر کہنا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر میں نے محبت کا کوئی معقول جواز پیش نہ کیا تو گفتگو کیا رُخ اختیار کرے گی۔ اس صورت میں گلنار میری کھانے والی بات کے حوالے سے محبت کو بھوک سے مماثل احتیاج قرار دے گی اور یوں محبت غذا جیسی اہم... لیکن غذا ہی کی طرح بے وقعت قرار پائے گی۔

"دیکھو... محبت ایک ایسا جذبہ ہے، جو آہستہ آہستہ اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم پہلی بار ملیں... اور میں تم سے متاثر ہوا۔ تم حسین تھیں... تمھارے انداز میں وقار اور شائستگی تھی، بلا کا اعتماد تھا تم میں۔ پھر ایک ربط پیدا ہوا۔ میں نے تم میں استقلال، استقامت اور ہر حال میں خوش رہنے جیسی خوبیاں دیکھیں۔ عورت ہونے کے باوجود تم نے مشکل حالات میں نہ صرف قدم قدم پر میرا حوصلہ بڑھایا بلکہ عملاً میرا ساتھ دیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم سے بہتر زندگی کا ساتھی مجھے نہیں مل سکتا۔ یہ ہے تمھارے لیے میری محبت کا پس منظر۔"

"تم محبت اور ذہنی پسندیدگی کو آپس میں گڈمڈ کر رہے ہو جمال۔ محبت ایک بے ساختہ جذبہ ہے۔ تم تو ایسا لگتا ہے کورٹ شپ کی بات کر رہے ہو۔ میرے اوصاف تمھیں پسند آئے۔ تم نے فیصلہ کر لیا کہ میں تمھارے لیے اچھی شریکِ حیات ثابت ہو سکتی ہوں۔ یہ محبت تو نہ ہوئی۔"

میرا دماغ گھوم گیا۔ "تم خود ہی ایک لطیف جذبے کو منطق اور استدلال کی ترازو میں تول رہی ہو۔ ورنہ تم یہ سوال ہرگز نہ کرتیں کہ میں تم سے محبت کیوں کرتا ہوں۔"

"یہ تو مجبوری ہے۔ میں تمھاری نظروں میں اپنا مقام جاننا چاہتی ہوں۔" گلنار نے کہا۔ "تم بارہا کہہ چکے ہو کہ میں نے مشکل حالات میں تمھارا ساتھ دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے تم جذبۂ احسان مندی کو محبت کا روپ دے رہے ہو۔"

"ایسا نہیں ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "میں تمھارے بارے میں بہت لطیف احساسات رکھتا ہوں۔ یہی محبت ہے۔"

"اور نازو کے بارے میں تمھارے احساسات کیا ہیں؟"

اس بار میں بالکل ہی ڈگمگا گیا۔ نازو کے سلسلے میں تو میں خود الجھن کا شکار تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے بارے میں میرے کیا محسوسات ہیں۔

"اور یہ نہ سمجھنا کہ میں نے رقابت کے زیرِ اثر یہ سوال کیا ہے۔" گلنار نے مزید کہا۔

"میں صاف گوئی سے کام لوں گا۔" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "نازو مجھے اچھی لگی تھی۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اس کی بے تابانہ تلاش کے پیچھے جذبۂ محبت کارفرما نہیں ہے۔ البتہ اُسے تجسّس کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اُس کی شخصیت پُراسرار تھی اور انسان ازل سے اسرار کے پیچھے بھاگتا رہا ہے... اس میں کشش محسوس کرتا رہا ہے۔"

"بس یہیں تم خود کو دھوکا دے رہے ہو۔" گلنار نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ وہ تمھاری پہلی محبت ہے۔ میں نے تمھیں اس کے لیے بے قرار دیکھا ہے۔ تم نے اس کی تلاش میں بہت صعوبتیں اٹھائی ہیں اور میں خود بھی تمھارے ساتھ رہی ہوں۔ کوئی اور جذبہ اتنا توانا نہیں ہو سکتا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ دشواری یہ تھی کہ اس سلسلے میں میرا ذہن صاف نہیں تھا۔ "اس سلسلے میں میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے فرض کر لیتا ہوں کہ تمھاری بات درست ہے۔ لیکن میں یہ بات بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں نازو سے بھی محبت کرتا ہوں۔ نازو تو کھو گئی ہے۔ اب وہ مجھے کبھی نہیں

ملے گی۔"

"ایسا نہ کہو۔ وہ تمھیں ضرور ملے گی۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تمھاری نظر میں ہم دونوں کا کیا مقام ہے۔"

"یہ تو میں نازو کے ملنے کے بعد ہی بتا سکتا ہوں۔" بالآخر مجھے سچ بولنا پڑا۔

"اس وقت تو بہت دیر ہو چکی ہو گی۔" گلنار نے اصرار کیا۔

"تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟"

"ہے... لیکن میں تمھیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی ہوں... ناخوش نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمھاری نگاہوں میں نازو کی کیا اہمیت ہے۔ میں خود بھی رہی چاہتی ہوں۔ میں خود کو تمھارے قابل نہیں سمجھتی۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ طوائف دنیا کی نظروں میں ہمیشہ طوائف رہتی ہے۔ لوگ اُسے کسی کی بیوی کی حیثیت سے کبھی قبول نہیں کرتے۔"

"اب تم نے یہ لفظ استعمال کیا تو میں تمھارے مُنہ پر تھپڑ رسید کر دوں گا۔" میں آپے سے باہر ہو گیا۔ "تم بلاوجہ اپنی توہین کر رہی ہو۔ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ تم کبھی غزل سرائی سے آگے نہیں بڑھیں۔ تم کیچڑ کے درمیان کھلنے والے پاکیزہ کنول کی طرح ہو... مجھے تمھاری اسی خوبی نے تو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔"

"یہ تمھاری محبت ہے... ذرّہ نوازی ہے۔ لیکن جذبات کے زور سے حقائق نہیں بدلتے۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مجھے اپنا کر تم زندگی بھر کا کرب خرید لو گے۔ یہ چہرہ وہ لوگ کبھی نہیں بھول سکتے، جنھوں نے کبھی مجھے بالاخانے پر دیکھا ہے... اور ایسے لاکھوں ہوں گے۔ تم کس کس کا مُنہ بند کرو گے۔ تمھیں میرے مُنہ سے میرے لیے لفظ طوائف سننا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن جب لوگ کہیں گے تو کیا کرو گے۔ اہمیت لفظوں کی نہیں ہوتی، حقائق کی ہوتی ہے۔ جمال... اور حقائق بے لچک اور اٹل ہوتے ہیں۔"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں اپنی دانست میں بُرا وقت گزار آیا تھا اور اب سکون کی تلاش میں تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ بُرا وقت تو اب شروع ہوا ہے۔ اس کی باتیں معقول تھیں لیکن اس کے لیے میرا جذبہ بھی سچا تھا۔

"میری دعا ہے کہ تم صرف نازو کے ہو جاؤ۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ میں جانتی ہوں، تم نازو سے محبت کرتے ہو۔ درمیان میں میں بھی ہوں۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم یکسوئی کے ساتھ صرف نازو کو چاہو۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم میری عزت... میرا احترام کرتے ہو... اور تم نے کچھ عرصہ مجھ سے محبت بھی کی ہے۔ یقین کرو... مجھے اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں۔ نازو کو رہنا ہے... اور مجھے فنا ہو جانا ہے۔ پلیز... اگر تمھیں مجھ سے محبت ہے تو میری بات مان لو۔ صرف نازو کو اپنا مرکزِ نظر بناؤ۔"

"لیکن گلنار... میں تمھیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"میں تنہا نہیں ہوں گی۔ میں تمھیں سمجھا نہیں سکتی۔ میرے پاس بھی ایک جیتا جاگتا نسیم جمال ہو گا۔ خدا کی قسم میں تنہا نہیں ہوں گی۔ یقین کرو۔" اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

میں الجھ کر رہ گیا۔ وہ عجیب باتیں کر رہی تھی۔ اس کا یہ دعوا بھی تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے، جبکہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ نازو مجھے کبھی نہیں ملے گی۔"

"کیوں نہیں ملے گی؟"

"اس لیے نہیں ملے گی کہ وہ اپنی شناخت، اپنا چہرہ کھو بیٹھی ہے۔ اس کے چہرے پر کسی نے تیزاب پھینک دیا تھا۔"

گلنار کا چہرہ یوں سپید پڑ گیا، جیسے کسی نے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو۔ چند لمحے وہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی رہی، پھر لرزیدہ آواز میں بولی۔ "تت... تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے اُسے اسپتال میں جمیلہ سے ملاقات اور ڈائری کے حصول کی کہانی سنا دی۔ وہ حیرت سے مُنہ کھولے میری باتیں سنتی رہی۔

"وہ ڈائری کہاں ہے؟" میرے خاموش ہونے پر اُس نے پوچھا۔

"میرے پاس ہے... میرے بیگ میں۔"

"وہ ڈائری مجھے دے سکتے ہو؟"

میں اٹھا اور میں نے بیگ کھول کر ڈائری نکالی اور اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے ڈائری لے لی لیکن اُسے کھول کر نہیں دیکھا۔ "فرصت سے پڑھوں گی اسے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر گلنار بولی۔ "ایک وعدہ کرو مجھ سے۔"

"کہو۔"

"نازو کے بارے میں اپنے محسوسات سے مجھے باخبر رکھو گے۔"

میں نے وعدہ کر لیا۔ اس تمام گفتگو میں ایک بات میرے لیے باعث حیرت تھی۔ گلنار جب نازو کا تذکرہ کرتی تو اس کے لہجے میں ایسی اپنائیت ہوتی، جیسے وہ خود اپنے بارے میں بات کر رہی ہو۔ اس کے برعکس اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے اُس کے لہجے میں بیگانگی در آتی تھی۔ میری نازو سے محبت کا تذکرہ کرتے وقت اس کے لہجے میں بے پناہ مسرت تھی... بجائے دُکھ اور کرب کے... اُس کا رویّہ میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے کہ ریشماں نے آ کر مجھے چونکا دیا۔ "چلیے... اپنے کمرے میں۔" اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ "اور یہ آپ لوگ اتنے چپ چپ کیوں بیٹھے ہیں؟"

میں نے خاموشی سے بیگ اٹھا لیا۔ گلنار بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں امّی کے پاس جا رہی ہوں۔" اوپر پہنچ کر گلنار نے کہا اور اپنی امّی کے کمرے میں چلی گئی۔ میں ریشماں کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ وہ ایک کمرے کے دروازے پر رک گئی۔

"یہ ہے آپ کا کمرہ۔" اس نے کہا۔ "اور یہ برابر والا کمرہ گلنار باجی کا ہے۔" وہ شوخ لہجے میں بولی۔

"اچھا... اب مجھے اندر بھی جانے دو گی یا نہیں؟"

اُس نے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ صوفہ سیٹ، کرسیاں میز اور بستر۔ ایک ڈریسنگ ٹیبل بھی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر گلدان رکھا تھا، جس میں تازہ پھول سجے ہوئے تھے۔ کمرہ بے حد دلکش اور ہوادار تھا۔

"پسند آیا؟" ریشماں نے بچوں کے سے انداز میں پوچھا۔

"بہت زیادہ۔"

"اب بیٹھ بھی جائیے۔"

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ باہر جانے لگی۔ میں نے آواز دے کر اسے روکا۔ "ارے... یہ تم کہاں بھاگی جا رہی ہو؟"

وہ دروازے پر رک گئی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بڑی سادگی سے بولی۔ "آپ کے لیے چائے بنانے جا رہی ہوں۔"

"ابھی تو پی ہے میں نے چائے۔ بیٹھو... بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرو۔ اتنے دنوں کے بعد تو ملی ہو تم۔"

"جناب... مجھے آپ دونوں کی خاموشی سے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ نے صرف ایک پیالی چائے پی ہو گی۔ دونوں منہ پھلائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے تو آپ کو دوسری پیالی دی بھی نہیں ہو گی۔"

"مجھے چائے کی طلب نہیں۔ یہاں بیٹھو اور مجھ سے باتیں کرو۔"

"ناشتے میں دو پیالی چائے پینی چاہیے۔" اُس نے بے حد عالمانہ انداز میں کہا۔ "میں چائے لاتی ہوں۔ پھر بیٹھ کر آپ سے ڈھیر ساری باتیں کروں گی۔" اس نے کہا اور دروازہ بند کرتے ہوئے باہر بھاگ گئی۔

میں اٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ کھڑکی لان کی طرف کھلتی تھی۔ لان کی زیبائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی مناسب نگہداشت کی جاتی ہے۔ کیاریوں کی صفائی اور پودوں کی تراش خراش تازہ معلوم ہو رہی تھی۔ کیاریوں میں رنگ برنگے پھول جھوم رہے تھے۔ مجھے تازگی کے خوبصورت احساس نے سرشار کر دیا۔ پھر مجھے پُرخلوص اسلم یاد آ گیا۔ یہ گھر اسی کا تو تھا۔ میری نگاہوں میں اس کی صورت گھوم گئی۔ وہ عجیب آدمی تھا۔ بڑی شان سے جیا تھا اور بڑی شان سے مرا تھا۔ اس نے یہ نکتہ پا لیا تھا کہ زندگی کی... جسم و جان کی آسودگی کیلئے محبت بہت ضروری ہے۔ اس نے تمام آسائشات کو محبت کی خاطر قربان کر دیا تھا۔ وہ کروڑ پتی آدمی تھا... لیکن میں نے اُسے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے... اپنا ناشتہ خود بناتے... ٹیکسی چلا کر روزی کماتے دیکھا تھا۔ وہ محبت کرنا جانتا تھا۔ مجھے ریشماں نے اس کے پاس بھیجا تو اس نے مجھے ریشماں کے تحفے کی حیثیت سے قبول کیا... اور بالآخر مجھ پر اپنی جان وار دی۔ مرنے کے بعد بھی وہ اپنا سب کچھ مجھے سونپ گیا تھا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر میں پلٹا۔ ریشماں چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں صوفے کی طرف پلٹ آیا۔ ریشماں نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھ دی اور خود کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گئی۔ "اب کریں گے۔ ڈھیر ساری باتیں۔" اُس نے کہا۔ پھر وہ چونک پڑی۔ "یہ کیا؟ آپ رو رہے ہیں؟"

"ارے نہیں گڑیا۔" میں نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں بھلا کیوں رونے لگا۔"

"کوئی بات تو ہے۔ بتائیے نا؟" اس نے اصرار کیا۔

"یونہی... کوئی یاد آ گیا تھا۔"

"جو لوگ قریب ہوں، انھیں یاد نہیں کیا جاتا بھائی جان۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

میرا جی چاہا کہ کہوں... جو لوگ دُور ہوں، انھیں تو یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن میں خاموش رہا۔ بلاوجہ... اس کے زخم ہرے کرنے سے کیا فائدہ! میری بہ نسبت اسلم سے اُس کا زیادہ گہرا تعلق تھا۔ سو میں بات پی گیا۔

"یہاں کی مصروفیات تو سناؤ مجھے۔" میں نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔

"کوئی مصروفیت نہیں ہے۔ اسی لیے تو میں نے نصرت خالہ کو کھانا پکانے سے منع کر دیا ہے کہ کوئی مصروفیت تو رہے۔"

"یہ نصرت خالہ کون ہیں؟"

"ملازمہ ہیں۔ صفائی ستھرائی کا خیال وہی رکھتی ہیں۔ ایک روز تو انھوں نے کھانا بھی پکایا تھا لیکن پھر میں نے یہ ذمے داری خود سنبھال لی۔"

"ہوں... گویا یہاں کی فضا بہت بور ہے۔"

"تھی بھیّے... اب تو آپ آ گئے ہیں۔"

"اور تم لوگوں نے کراچی کی سیر بالکل نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔ "جی بھی نہیں چاہتا تھا تمھارا؟"

"جی تو بہت چاہتا تھا۔ کئی بار گلنار باجی سے کہا بھی۔ لیکن وہ کہتی تھیں کہ آپ آئیں گے تو خوب گھومیں پھریں گے۔"

"دیکھو... تمھاری گلنار باجی اب کیا بہانہ کرتی ہیں۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"جی نہیں۔ پتہ بھی ہے، وہ آپ کو کتنا یاد کرتی تھیں؟"

"پتہ ہے۔"

"کیا بات ہے۔ لڑائی ہو گئی ہے اُن سے؟" ریشماں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"نہیں... البتہ اُس کا دماغ ضرور خراب ہو گیا ہے۔"

"ایسے نہ کہیں۔ وہ آپ کو بہت چاہتی ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن اُسے میری چاہت قبول بھی نہیں ہے۔"

"یہ بھی غلط ہے۔"

اس بار میں چڑ گیا۔ "تم گلنار کو جانتی بھی ہو۔ ایسے ہی ہانکے جا رہی ہو۔ تمھیں اُس کے خیالات کا علم ہی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"فی الحال آپ انھیں اتنا نہیں جانتے، جتنا میں جانتی ہوں۔" اُس نے فی الحال پر خصوصاً زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ بہت خوش نصیب ہیں۔ آپ نے جو کچھ بھی چاہا ہے، آپ کو ملے گا۔ اتنا ملے گا کہ آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ بس میری ایک بات مان لیں۔ گلنار باجی جو کہیں اس پر عمل کر لیں۔ ان کی ہر بات مان لیا کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دراصل آپ کو کچھ بھی نہیں معلوم۔"

"عجیب بات ہے۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کہا۔ "کراچی کی فضا میں ہی شاید پاگل پن کے جراثیم ہیں۔ تم کہہ رہی ہو کہ گلنار کی ہر بات مان لوں۔ اس کا کہنا ہے کہ صرف نازو کو مرکزِ نگاہ بناؤں اور اس کا خیال دل سے نکال دوں۔ آخر یہ کیا پاگل پن ہے۔"

"ان کی بات مان لینے میں حرج ہی کیا ہے۔" ریشماں نے بے حد سکون سے کہا۔

"حرج ہی کیا ہے!" میں بھنا گیا۔ "ایک طرف تم مجھے خوش نصیب قرار دے رہی ہو۔ یہ نوید سنا رہی ہو کہ میں جو کچھ چاہتا ہوں، مجھے ملے گا۔ دوسری طرف مجھے خوشیوں سے دستبردار ہونے کا مشورہ دے رہی ہو۔ تم لوگ پاگل ہو گئے ہو یا میں کھسک گیا ہوں۔"

"آپ ان کی بات مان لیں۔ یقین کیجیے، آپ کو سب کچھ ملے گا۔" ریشماں نے اصرار کیا۔

"یہ بات میرے حلق سے نہیں اترتی۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"آپ میری ایک بات نہیں مان سکتے۔" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔ "اچھا، آپ اُن سے یہ کہہ دیجیے کہ آپ کو نازو سے محبت ہے لیکن آپ انھیں کھونا بھی نہیں چاہتے... پلیز بھائی جان... میری خاطر۔"

میری عقل خبط ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "میں بھول گئی تھی کہ مجھے آپ پر اتنا حق حاصل نہیں ہے کہ اس قسم کی کوئی بات منوا سکوں۔" اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھ جاؤ بے وقوف۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اسے بٹھا دیا۔ میں اُسے اُداس کیسے کر سکتا تھا۔ اسلم اُسے مجھے سونپ کر گیا تھا۔ پھر میں نے اسے بہن کہا تھا اور بہنوں کی خاطر تو بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی ہے۔ "جیسا تم کہو گی، ویسا ہی ہو گا۔ میں آج ہی گلنار کو بتا دوں گا..."

"سچ بھیّا!" وہ روتے روتے ہنس پڑی... بھادوں کی رُت کی طرح۔ "لیکن آپ اُداس تو نہیں ہوں گے؟"

"نہیں... اس میں اُداسی کی کون سی بات ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یقین کیجیے، مجھے آپ کی خوشی بہت عزیز ہے۔"

"مجھے یقین ہے میری گڑیا بہن۔"

"اب میں جاتی ہوں۔ کھانا پکانا ہے۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو اور مجھ سے باتیں کرتی رہو۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ "آج کھانا پکانے کا کام اپنی نصرت خالہ کے سپرد کر دو۔"

"واہ... کیوں کر دوں۔ آج تو آپ آئے ہیں۔ آج تو میں آپ کے لیے کھانا پکاؤں گی۔ آپ جب تک آرام کریں۔"

اس کے جانے کے بعد میں بستر پر دراز ہو گیا۔ میرے ذہن میں گلنار کا سوال گردش کر رہا تھا... نازو کے بارے میں سوالات ... میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بات طے تھی۔ نازو کا خیال آتے ہی میری دھڑکنیں بے ربط ہو جاتی تھیں اور جسم میں لطیف سی سنسنی کا احساس ہوتا تھا۔ گلنار کی یہ دلیل بھی وزن رکھتی تھی کہ محض تجسّس کی خاطر کوئی کسی کے لیے اتنا خوار نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

دیر تک میں اسی ادھیڑبن میں رہا۔ پھر میری آنکھ لگ گئی۔ میری اُلجھنوں نے نیند میں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میں نے خواب میں گلنار اور نازو، دونوں کو دیکھا اور ملتفت دیکھا۔ میرا انداز بھی دونوں کے ساتھ والہانہ تھا۔ البتہ ایک بات عجیب تھی وہ دونوں الگ الگ میرے سامنے نہیں آئی تھیں۔ اُن کا جسم ایک ہی تھا... لیکن چہرہ بدل جاتا تھا۔ کبھی گلنار کا چہرہ میرے سامنے ہوتا اور کبھی اس کے عقب سے نازو کا چہرہ طلوع ہو جاتا۔ مجھے یہ تک یاد نہیں تھا کہ میں نے کس سے کیا کہا ہے۔ میں خواب میں اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ اظہارِ محبت ایک ہی تھا لیکن اس کا ہدف دو ایسی ہستیاں تھیں، جو اُس وقت ایک ہی قالب میں تھیں۔ یعنی میں ان دونوں سے یکساں محبت کا اظہار کر رہا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو ذہن قدرے ہلکا تھا۔ کچھ بوجھ سا ہٹ گیا تھا۔ میں خواب کو یاد کرتا رہا... اور سوچتا رہا۔ خواب اور اس کا مطلب بالکل واضح تھا۔ میرا نفاق کھل کر سامنے آگیا تھا۔ میں دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں کھونا چاہتا تھا۔ خواب میں ایک جسم نظر آنا اور چہرے بار بار بدلنا میرے لاشعور کی اس خواہش کا ثبوت تھا کہ میں اُن دونوں کو یکساں طور پر چاہتا ہوں۔ گویا میں کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ نفاق اگرچہ میرے لیے خوش کن نہیں تھا، تاہم دل و دماغ پر سے بوجھ کم ہو گیا تھا۔ گلنار نے مجھ سے کہا تھا کہ میں دیانت داری سے فیصلہ کروں۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ پوری صورتِ حال دیانت داری کے ساتھ اُس کے سامنے رکھ دوں گا۔ کم از کم اپنی اندرونی کشمکش سے تو میں بڑی حد تک واقف ہو گیا تھا۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد مجھے طمانیت کا احساس ہوا۔ میں نے باتھ روم جا کر منہ دھویا۔ باہر آ کر میں تولیے سے منہ پونچھ ہی رہا تھا کہ ریشماں آگئی۔

"چلیے... کھانا لگا دیا ہے۔" اس نے کہا۔

میں اس کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ ہم نیچے ڈائننگ روم میں پہنچے۔ گلنار اور اس کی امّی وہاں پہلے ہی سے موجود تھیں۔

"آنٹی... آپ بھی آگئیں؟" میں نے گلنار کی امّی سے کہا۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے تو اِن دونوں نے زبردستی بیمار بنا رکھا تھا۔" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ان کے چہرے پر بشاشت نظر آ رہی تھی۔

"دراصل بھائی جان کی آمد نے آپ کو اچھا کر دیا ہے۔" ریشماں بولی۔

"ہاں، یہ تو ہے۔"

"میرے بھائی جان ہیں ہی ایسے۔" ریشماں نے اترا کر کہا اور میں خفیف سا ہو کر رہ گیا۔

"آخر بھائی جان کس کے ہیں؟" گلنار نے چوٹ کی۔

"جی نہیں۔ یہ بات نہیں۔" ریشماں کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "مجھ پر بھائی جان کا اثر پڑ سکتا ہے۔ میری تو روشنی ہی بھائی جان ہیں۔" وہ خاصی جذباتی ہو گئی تھی۔

"ارے... میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ تم بُرا مان گئیں؟"

"نہیں باجی۔ آپ کی بات کا بُرا مان سکتی ہوں میں؟ میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔"

ہم سب کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ریشماں نے کھانے کے سلسلے میں خاصا اہتمام کیا۔ کھانا بے حد لذیذ اور شاندار تھا۔ گلنار ریشماں کو چھیڑتی رہی کہ اتنے دن وہ اُسے روکھی سوکھی کھلاتی رہی ہے۔ آج بھائی جان آئے ہیں تو کہیں کھانا نصیب ہوا ہے۔ ریشماں جھینپتی اور مسکراتی رہی۔

کھانے کے بعد گلنار کی امّی اٹھ گئیں۔ ریشماں انہیں کمرے تک چھوڑنے کے لیے اُن کے ساتھ گئی۔ "امّی کو ان کے کمرے میں چھوڑ کر میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" جاتے جاتے پلٹ کر اس نے گویا دھمکی دی۔

"بہت محبت کرتی ہے تم سے۔" اس کے جانے کے بعد گلنار نے کہا۔ اب وہ پھر سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"ہاں... یہی ہے، میں بہت خوش نصیب ہوں... اور اس کی محبت مجھے اس بات کا یقین بھی دلا دیتی ہے۔"

گلنار خاموش رہی۔ میں چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا "میں تمھاری بات پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں، پوری سچائی کے ساتھ تمھیں بتا دوں گا۔"

گلنار نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس سوالیہ نظروں سے مجھے تکتی رہی۔

"میں اب جان گیا ہوں کہ مجھے نازو سے محبت ہے... لیکن میں تمھیں بھی کھونا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا اور اُسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"تو میں کھو بھی کہاں رہی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم سمجھتے ہو، مجھ سے پیچھا چھڑا لوگے؟ نہیں جمال... میں تو سائے کی طرح تمھارے ساتھ رہوں گی۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی۔

"تمھیں مجھ سے نفرت نہیں ہو جائے گی؟"

"نفرت کیوں ہوگی؟"

"میں بیک وقت دو لڑکیوں سے محبت کا دعوا جو کر رہا ہوں۔"

"یہ تو دل کا معاملہ ہے اور دل پر کسے اختیار ہوتا ہے۔"

"تو تم مجھے ہرجائی نہیں سمجھو گی؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"اور تم نازو کی شراکت بھی برداشت کر لو گی؟"

"بسر و چشم۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "البتہ یہی سوال تمھیں نازو سے بھی کرنا ہوگا۔ ضروری نہیں کہ وہ مجھے بھی برداشت کر لے۔"

"وہ ملے بھی تو سہی۔" میں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ "اس کے ملنے کا مجھے تو کوئی امکان نظر نہیں آتا اور پھر کیا ضروری ہے کہ وہ بھی میرے بارے میں اسی انداز سے سوچے۔"

"میں جتنا سن چکی ہوں، وہ مجھے یقین دلانے کے لیے کافی ہے کہ وہ بھی تمھیں چاہتی ہے۔ رہی اس کے ملنے کی بات تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ عنقریب تمھیں مل جائے گی۔"

اس کے لہجے میں بلا کا یقین تھا۔ میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مجھے اس لڑکی پر حیرت ہو رہی تھی۔

پھر ریشماں چائے لے آئی۔ اس نے چائے کی پیالیاں ہمارے سامنے رکھ دیں اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ "ہاں باجی... اب تو سیر ہو گی کراچی کی؟" اس نے کہا۔

"ہاں... کیوں نہیں۔ جمال آج آرام کر لیں۔ کل سے تفریح ہو گی۔ یہی کراچی گھمائیں گے ہمیں۔" گلنار نے کہا اور ریشماں بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

"میں کیا سیر کراؤں گا۔ میں تو خود پردیسی ہوں یہاں۔" میں نے احتجاج کیا۔

"میرا مطلب ہے، انچارج تو تم ہی ہو گے۔ میں وحید سے بات کر لوں گی۔"

"اب اس وحید کے جغرافیے سے بھی آگاہ کر دو۔"

"دیکھا تو ہے تم نے اسے... ارے وہی ڈرائیور۔" گلنار نے کہا۔

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ریشماں کے مشورے سے ایک فائدہ تو بہرحال ہوا تھا۔ گلنار کا رویہ یک لخت تبدیل ہو گیا تھا۔ اب وہ خوش نظر آ رہی تھی اور یہ بات میرے لیے باعثِ حیرت تھی۔ اپنی دانست میں میں نے اُسے کوئی اچھی خبر نہیں سنائی تھی۔

اگلے روز میں نے لاہور فون کیا لیکن استاد سے بات نہ ہو سکی۔ وہ پورا ہفتہ اسی طرح گزرا۔ ہر صبح میں لاہور فون کرتا لیکن یہی جواب ملتا کہ استاد اکھاڑے آئے ہی نہیں ہیں۔ اس ایک ہفتے کے دوران ہم نے کراچی کے تمام قابلِ ذکر مقامات دیکھ لیے۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ کراچی کتنا بڑا شہر ہے۔ وہ مسائل کا شہر تھا... انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ بہرحال وقت بہت خوشگوار گزر رہا تھا۔ گلنار تو مجھ سے قریب تھی ہی... اسی دوران اس کی امّی اور ریشماں میرے اور قریب آگئی تھیں۔ ریشماں بیچاری تو محبت اور توجہ کو نہ جانے کب سے ترسی ہوئی تھی۔ اسے تو ایک گھرانہ میسّر آگیا تھا۔ گلنار کی امّی کی مجھ پر شفقت کچھ اور سوا ہو گئی تھی۔

آٹھویں صبح میں کپڑے تبدیل کر ہی رہا تھا کہ ریشماں

دوڑتی ہوئی میرے کمرے میں آئی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ "بابا کا فون آیا ہے۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں بھائی جان!" وہ استاد جو کو بابا کہتی تھی۔ نیچے پہنچ کر میں نے فون اٹینڈ کیا۔

"استاد... تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟" میں نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں تم کو ہر روز فون کرتا رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے برخوردار لیکن میں بہت مصروف تھا۔"

"اور میں اس تمام عرصے میں بے خبر رہا۔ لاہور میں کیا حالات ہیں؟"

"تم سے بالمشافہ گفتگو ہو گی برخوردار۔ میں شام کی فلائٹ سے کراچی آ رہا ہوں۔"

میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ "خیریت تو ہے استاد؟" میں نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"میرے آنے کا یہ مطلب ہے کہ خیریت نہیں ہے تو میں ٹکٹ واپس کیے دیتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تم میری کمی محسوس کر رہے ہو گے۔" استاد نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"یہ حقیقت ہے استاد۔ تمہاری کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ خیر یہ بتاؤ، فلائٹ کس وقت آ رہی ہے تاکہ میں گاڑی لے کر ایئرپورٹ پہنچ جاؤں۔"

استاد نے مجھے فلائٹ کا وقت بتا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اس روز ہم نے تمام تفریحی پروگرام کینسل کر دیے۔ ہم سب استاد سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔

شام کو مقررہ وقت پر میں خود جاکر استاد کو ایئرپورٹ سے لے آیا۔ گلنار اور ریشماں تو استاد سے کیبل ہو کر رہ گئیں۔ ایئرپورٹ سے آتے ہوئے میں نے استاد سے پوچھنا چاہا تھا کہ نادر حسین اور شاہ جی والے معاملات کا کیا بنا لیکن استاد نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ فرصت سے بتائیں گے۔

رات کے کھانے کے بعد میں نے گلنار کو الگ لے جاکر کہا کہ وہ ریشماں کو لے جائے۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔

وہ دونوں چلی گئیں۔ اب ڈرائنگ روم میں میرے اور استاد کے علاوہ صرف گلنار کی امی تھیں۔ وہ استاد کو بھائی صاحب کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں۔ پھر وہ بھی چلی گئیں۔ میں استاد کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن استاد لب سیے بیٹھے تھے۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے لب ہلائے ہی تھے کہ استاد نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "میں جانتا ہوں برخوردار کہ تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہوں گے۔ لیکن باتیں بہت زیادہ ہیں۔ میں پریشان ہوں کہ کہاں سے شروع کروں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ میں بھی خاموشی سے انھیں دیکھتا رہا۔ اس وقت انھیں چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔

"تم تو انھیں آگاہ کرنے کے بعد کراچی آ گئے تھے۔" کچھ توقف کے بعد استاد نے اسٹارٹ لیا۔ "حامد نے اُن دونوں کے ٹھکانوں کی نگرانی شروع کرا دی تھی۔ پھر میں نے دارا سے رابطہ قائم کیا۔ میں نے دارا کو حامد سے ملوایا۔ معلوم ہوا کہ جو پتہ تم نے شاہ جی سے لے کر حامد کو دیا تھا، اس سے دارا بھی لاعلم تھا۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ نادر حسین کا نہیں بلکہ چوہدری رحمت کا اہم ترین ٹھکانا ہے۔ بہرطور نگرانی کا سلسلہ جاری رہا۔ پرسوں رات وہاں سرگرمیاں کچھ زور پکڑ گئیں۔ حامد نے ریڈ کیا۔ تہ خانہ منشیات کا سلحے اور دیگر غیرقانونی اشیاء سے بھرا ہوا تھا۔ نادر حسین اور چوہدری رحمت علی دونوں پکڑے گئے۔ حامد نے ریڈ سے پہلے فوجی حکام سے رابطہ قائم کر لیا تھا تاکہ اثر و رسوخ کی مداخلت کا امکان نہ رہے۔ نادر حسین اور چوہدری رحمت کو ملٹری والوں نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ وہاں انھیں تنظیم کے بارے میں اگلتے ہی بن پڑی۔ اُن کے زبان کھولنے کے نتیجے میں کل اور آج جگہ جگہ چھاپے مارے گئے۔ بس یوں سمجھ لو کہ تنظیم فنا ہو گئی۔ کل اس بدبخت انجم فیروز کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ سنا ہے، فوجی عدالت میں مقدمہ چلے گا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی سزا سے نہیں بچ سکے گا۔"

میں سناٹے کے عالم میں بیٹھا استاد کی باتیں سن رہا تھا۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ استاد بہت بڑی خبر لائے تھے۔

"اور اس مردود شاہ جی کا کیا بنا؟" میں نے استاد سے پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آج کل اخبار نہیں پڑھ رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ یہی بات ہے۔" میں نے جھینپ کر اعتراف کیا۔

"شاہ جی کے بنگلے پر پانچ روز پہلے چھاپہ پڑا تھا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اس کے تہ خانے سے متعدد بلیو فلموں کے پرنٹ اور کیسٹ برآمد ہوئے۔ جس وقت چھاپہ مارا گیا اس وقت بھی وہ اپنے مذموم کام میں مصروف تھے۔ فلمیں بنائی جا رہی تھیں۔ شاہ جی کا مقدمہ تو فوجی عدالت میں پیش ہو بھی گیا۔"

"اور دارا کا کیا بنا؟"

"اسے اور عابد حسین کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا تھا..."

"عابد... کیا کہہ رہے ہو؟" نقاہت زدہ نسوانی آواز سن کر ہم چونکے۔ ہم اپنی گفتگو میں اتنے محو تھے کہ ہمیں گلنار کی امی کی آمد کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ چہرہ پسینے میں تر تھا اور وہ یوں جھول رہی تھیں جیسے گر پڑیں گی۔ میں تیزی سے اٹھا اور میں نے انھیں سنبھالا۔ "کیا بات ہے، آنٹی۔ خیریت تو ہے۔ آپ یہاں کیسے؟" میرے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے سر ابھار رہے تھے۔

"میں تو یہ پوچھنے کے لیے آئی تھی کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔" انھوں نے کمزور آواز میں کہا۔

"آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی جبکہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔"

"یقین کرو بیٹے... میری طبیعت خراب نہیں ہے۔" انھوں نے کہا۔ پھر وہ استاد کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ "آپ کیا باتیں کر رہے تھے بھائی صاحب؟"

"اچھا... بیٹھ تو جائیے۔" میں نے انھیں سہارا دے کر سامنے والے صوفے پر بٹھا دیا۔ "اب آپ کچھ دیر آرام کریں۔"

"میں ٹھیک ہوں بیٹے... ہاں بھائی صاحب آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں تو مجرموں کی ایک تنظیم کے بارے میں بات کر رہا تھا بہن۔" استاد گڑبڑا کر بولے۔

"آپ نے عابد حسین کا نام لیا تھا۔"

"جی ہاں۔ عابد حسین ہی کسی زمانے میں اس تنظیم کا سرغنہ تھا۔ پھر چوہدری رحمت علی نے اسے راستے سے ہٹایا اور خود سرغنہ بن بیٹھا۔ عابد حسین کے ایک وفادار دوست دارا نے اس کی زندگی بچالی تھی لیکن عابد حسین کا نچلا دھڑ آج تک مفلوج ہے۔"

"اور آپ بتا رہے تھے کہ تنظیم فنا ہو گئی۔ تمام سرکردہ لوگ گرفتار ہو چکے ہیں۔" آنٹی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"اور عابد حسین کا کیا ہو گا؟"

استاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ حیرت سے آنٹی کو تکتے رہے۔ آنٹی سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھتی رہیں۔

"آنٹی... آپ عابد حسین کو کیسے جانتی ہیں؟" میں نے مداخلت کی۔

"بیٹے... میں سب کچھ بتا دوں گی۔ پہلے مجھے بھائی صاحب سے بات کرنے دو۔" آنٹی نے قدرے سخت لہجے میں کہا اور استاد کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ "بھائی صاحب، آپ نے جواب نہیں دیا۔"

استاد اب قدرے سنبھل چکے تھے۔ "جی بہن... آپ عابد حسین کے بارے میں پوچھ رہی ہیں نا؟ اسے اور دارا کو سلطانی گواہ بنا لیا گیا ہے۔ ان دونوں کے تعاون اور بیانات سے چوہدری رحمت علی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف کیس بہت مضبوط ہو گیا ہے۔"

"گویا عابد حسین کو سزا نہیں ہو گی۔" آنٹی نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"آپ درست سمجھی ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے۔" آنٹی نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ پھر انھوں نے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر گہری سانس لی۔ اُن کے چہرے پر آہستہ آہستہ رنگ واپس آ رہا تھا۔ "خدایا... تیرا شکر ہے میرے معبود۔" وہ بولیں۔

"برخوردار! مجھے تو نیند آ رہی ہے۔" استاد نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "بہن! میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ ان شاء اللہ صبح آپ سے تفصیلی گفتگو ہو گی۔ شب بخیر۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف چل دیے۔ میں بھی ان کے پیچھے لپکا۔ وہ باہر نکل چکے تھے۔ میرے قدموں کی آہٹ پا کر وہ پلٹے۔

"برخوردار... تمھیں معلوم ہے، بڑھاپا مجھے میرا کمرہ دکھا چکا ہے۔ میں خود چلا جاؤں گا۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ تم جاکر بہن کو سنبھالو۔"

"لیکن استاد، میں جانتا ہوں تم نیند کا بہانہ کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"سمجھ دار ہو۔ تم ٹھیک سمجھے۔ میری موجودگی غیر ضروری تھی۔ بہن میری موجودگی میں تم سے کھل کر بات نہیں کر سکتی تھیں۔ جاؤ... ان کے پاس بیٹھو۔ صبح ملیں گے۔"

میں ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ آنٹی اب رو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے آنٹی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟"

"بیٹے... یہ تو خوشی کے آنسو ہیں... شکر کے آنسو ہیں۔"

میرا ذہن بُری طرح اُلجھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بھید ہے۔ گلنار کی امی اور عابد حسین صاحب کے بارے میں تجسس... ان دونوں کے درمیان تعلق سمجھ میں آنے والی چیز نہیں تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم الجھ رہے ہو گے۔" انھوں نے میرے چہرے کے تاثرات سے میری کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ "بھائی صاحب کے سامنے میں تم سے کھل کر بات نہیں کر سکتی تھی لیکن تم سے کوئی پردہ نہیں۔ میں تمھارے ہر سوال کا جواب دوں گی۔"

"آپ عابد حسین صاحب کو کیسے جانتی ہیں؟"

اُن کے چہرے پر کرب کا سایہ سا لہرا گیا۔ "وہ میرے شوہر ہیں بیٹے۔ برسوں پہلے میں صرف اس بات پر ان سے علیحدہ ہو گئی تھی کہ وہ اس گندے کاروبار سے ہاتھ کھینچ لیں لیکن ان کی آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔"

مجھے بے ساختہ نازو کی ڈائری یاد آ گئی... میرے ذہن میں کچھ سوالات مچلے... لیکن میں نے انھیں زبان تک نہ آنے دیا۔ ان کا احترام مانع تھا۔ خود انھوں نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ انھوں نے عابد حسین کی کمائی کو طوائف کی کمائی سے بدتر قرار دیا تھا اور عابد حسین کو سزا دینے کے لیے طوائف کی کمائی ہی قبول کر لی تھی لیکن ایک سوال ایسا بھی تھا جسے میں زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔

"تب تو آپ نازو کو بھی جانتی ہوں گی آنٹی؟" میں نے پوچھا۔

"نازو... میری نازنیں... میں اپنی بیٹی کو نہ جانوں گی بھلا!"

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میرا ذہن اس بدلتی ہوئی صورتِ حال کو یکسوئی کے ساتھ سمجھنے سے قاصر تھا۔

"نازو... نازو کہاں ہے آنٹی؟" میں نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"یہیں ہے... اسی گھر میں۔ وہ جسے تم گلنار کہہ کر پکارتے ہو!"

میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ آنٹی میرے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے میرا ہاتھ تھاما اور اسے بڑی محبت اور شفقت سے سہلانے لگیں۔

"میں جانتی ہوں بیٹے، تم نے اسے تلاش کرنے کی کتنی کوشش کی ہے۔ لیکن میں مجبور تھی بیٹے۔ نازو خطرے میں تھی۔ پھر اس کے چہرے پر تیزاب پھینکا گیا۔ بے ہوشی کی حالت میں اس کا پلاسٹک سرجری کا آپریشن ہوا۔ میں وہیں موجود تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی تصویر مانگی لیکن میں نے معذرت کر لی کہ نازو کی کوئی تصویر میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ نازو کو کوئی چہرہ بھی دے سکتے ہیں۔ یوں

[illegible] کا چہرہ ملا۔ ہوش میں آ کر اس نے بڑا واویلا کیا [illegible] اس کی شناخت چھین لی گئی ہے۔ اسی ہذیانی [illegible] میں نے پہلی بار اس کے منہ سے تمھارا نام [illegible] نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ اس طرح [illegible] سے محفوظ ہو گئی ہے۔ پھر میں نے اس کا نام [illegible] دیا۔ میں اسے اپنے پاس بھی نہیں رکھنا چاہتی [illegible] عابد حسین کی بیوی ہونے کی وجہ سے میں تنظیم [illegible] نظروں میں یقیناً ہوں گی۔ کسی بھی طرح انھیں نازو تک [illegible] اور میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ اب [illegible] یہی صورت تھی کہ اسے اس کی خالہ کے گھر چھوڑ [illegible] بعض وجوہات کی بنا پر میں ایسا نہیں کرنا چاہتی [illegible]" وہ کہتے کہتے رُک گئیں۔ ان کے انداز میں ہچکچاہٹ [illegible] اندازہ ہو گیا کہ وہ معاملات کا یہ رخ میرے [illegible] نہیں چاہتیں... اور گلنار... بلکہ نازو کی [illegible] سے بھی بے خبر ہیں۔

[illegible] یہ مسئلہ یوں حل ہوا کہ گلنار کو ایئر ہوسٹس کی [illegible] عموماً ہفتے میں وہ ایک یا دو بار گھر آتی تھی۔"

[illegible] آنٹی وہ مجھے تو بتا سکتی تھی۔ میں دیوانوں کی [illegible] تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ وہ مجھے بتا دیتی تو کیا میں [illegible] کو اس کی حقیقت بتا دیتا؟" "مجھے یقین ہے [illegible] ہو گیا ہو گا۔"

"[illegible] شروع ہی سے کچھ خبطی رہی ہے۔" آنٹی نے جواب [illegible] تم اسی سے پوچھنا۔ اسی نے تو مجھے بھی مجبور [illegible]

"[illegible]... ایک وعدہ آپ کو مجھ سے بھی کرنا ہو گا۔" میں [illegible]

[illegible] استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھتی رہیں۔ [illegible] نہ بولیں۔

"[illegible] گلنار کو... میرا مطلب ہے نازو کو کچھ نہیں بتائیں گی [illegible] ذمہ داری آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اس نے بھی مجھے [illegible] کیا ہے۔"

"[illegible] ہے بیٹے۔"

"[illegible]... اب آپ آرام کریں۔"

[illegible] انھیں ان کے کمرے میں چھوڑا اور استاد کے [illegible] دروازے پر دستک دی۔ استاد نے دروازہ [illegible] رہا نہیں گیا برخوردار۔ صبح کا انتظار نہیں

کر سکتے تھے؟"

"صبح تک تو میں دھماکے سے پھٹ جاتا استاد۔ بڑی دھماکا خیز خبر ہے۔"

"خیر! اس کا اندازہ تو تمھارے چہرے ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔"

میں نے استاد کو ہر بات بتا دی۔ وہ سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔

"واہ برخوردار... بہو تو ہمیں بیٹے کی ٹکر کی ملی ہے!" سب کچھ سن کر انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹکر کی! بیٹے سے بارہ ہاتھ آگے ہے بہو۔"

"خوب چہک رہے ہو۔ لگتا ہے، آج چین سے سو سکو گے۔"

"ہرگز نہیں... صبح تو تمھاری بہو کے ساتھ فائنل ہو گا۔"

"میرے لائق کوئی خدمت؟"

"جی ہاں۔ میں نازو کو لے کر باہر جاؤں گا۔ ریشماں بھی ہمارے ساتھ جانا چاہے گی۔ اسے روکنا آپ کی ذمے داری رہی۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔" استاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب جاؤ... اگر چین سے سو نہیں سکتے، تو دوسروں کو تو مت جگاؤ۔"

میں استاد کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ گلنار کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ شاید وہ پُرسکون نیند سو رہی تھی۔

میری وہ رات کروٹیں بدلتے کٹی۔ نیند تھوڑی بہت آئی بھی تو جھپکیوں کی صورت میں۔ صبح سویرے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ تیار ہو کر باہر نکلا تو سات بجے تھے۔ ریشماں بیدار ہو چکی تھی اور کچن میں کھٹر پٹر کر رہی تھی۔ میں بھی کچن میں جا گھسا۔

"کیا بات ہے بھائی جان! رات کا کھانا نہیں کھایا تھا کیا؟"

"کھانا تو خوب ڈٹ کر کھایا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ آج دیکھا جائے کہ کون کس وقت اٹھتا ہے۔ وہ تمھاری باجی تو دس بجے سو کر اٹھتی ہو گی۔"

"جی نہیں، وہ اس وقت قرآن شریف کی تلاوت کر رہی ہوں گی۔"

"ایسی لگتی تو نہیں۔ میرا خیال ہے کہ دس بجے سے

پہلے وہ سو کر اٹھتی ہی نہیں ہو گی۔ گیارہ بجے ناشتہ کرتی ہو گی۔ دوپہر کا کھانا شام چھ بجے اور رات کا کھانا..."

"جی نہیں... وہ تو..." ریشماں نے میری بات کاٹ دی لیکن پھر وہ ٹھٹک گئی۔ "آپ سن رہی ہیں نا باجی!"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ گلنار کچن کے دروازے پر کھڑی تھی۔ "ہوں... تو یہ حرکتیں ہو رہی ہیں صبح صبح..." اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ "ویسے میں واقعی دس بجے سو کر اٹھتی ہوں۔"

"تب پھر میرا کام کیسے چلے گا؟"

"اس میں تمھارا کیا نقصان ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔" میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ میرا دل خالی رہ جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"تم نے وہ مقولہ نہیں سنا۔ کسی دانش مند نے کہا ہے کہ مرد کے دل کا راستہ معدے سے گزرتا ہے۔ معدہ خالی! دل بھی خالی۔"

وہ جھینپ گئی۔ "میں دیکھ رہی ہوں کہ تم فضول باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہو۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

"تم مجھے عرصۂ بحران میں ملی تھیں۔ میرے جوہر تو اب کھلیں گے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟"

"اچھا بس، کچن سے نکلو۔ یہاں تمھارا کوئی کام نہیں۔"

"کام ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "میں اپنے دفاع کی تربیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ صرف تمھارے رحم و کرم پر رہا تو گزر جاؤں گا۔ اسی لیے سوچا ہے کہ اپنی بقا کے لیے کھانا پکانا

"میں جانتی ہوں کہ تم الجھ رہے ہو گے" انھوں نے میرے چہرے کے تاثرات سے میری کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ "بھائی صاحب کے سامنے میں تم سے کھل کر بات نہیں کرسکتی تھی۔ لیکن تم سے کوئی پردہ نہیں۔ میں تمھارے ہر سوال کا جواب دوں گی۔"

"آپ عابد حسین صاحب کو کیسے جانتی ہیں؟"

اُن کے چہرے پر کرب کا سایہ سا لہرا گیا۔ "وہ میرے شوہر ہیں بیٹے۔ برسوں پہلے میں صرف اس بات پر ان سے علاحدہ ہو گئی تھی کہ وہ اس گندے کاروبار سے ہاتھ کھینچ لیں۔ لیکن ان کی آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔"

مجھے بے ساختہ نازو کی ڈائری یاد آ گئی... میرے ذہن میں کچھ سوالات مچلے... لیکن میں نے انھیں زبان تک نہ آنے دیا۔ ان کا احترام مانع تھا۔ خود انھوں نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ انھوں نے عابد حسین کی کمائی کو طوائف کی کمائی سے بدتر قرار دیا تھا اور عابد حسین کو سزا دینے کے لیے طوائف کی کمائی ہی قبول کر لی تھی لیکن ایک سوال ایسا بھی تھا جسے میں زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔

"تب تو آپ نازو کو بھی جانتی ہوں گی آنٹی۔" میں نے پوچھا۔

"نازو... میری نازنین... میں اپنی بیٹی کو نہ جانوں گی بھلا!"

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میرا ذہن اس بدلتی ہوئی صورتِ حال کو یکسوئی کے ساتھ سمجھنے سے قاصر تھا۔

"نازو... نازو کہاں ہے آنٹی؟" میں نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"یہیں ہے... اسی گھر میں۔ وہ جسے تم گلنار کہہ کر پکارتے ہو۔"

میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ آنٹی میرے قریب آکر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے میرا ہاتھ تھاما اور اسے بڑی محبت اور شفقت سے سہلانے لگیں۔

"میں جانتی ہوں بیٹے، تم نے اسے تلاش کرنے کی کتنی کوشش کی ہے۔ لیکن میں مجبور تھی بیٹے۔ نازو خطرے میں تھی۔ پھر اس کے چہرے پر تیزاب پھینکا گیا۔ بے ہوشی کی حالت میں اس کا پلاسٹک سرجری کا آپریشن ہوا۔ میں وہیں موجود تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی تصویر مانگی لیکن میں نے معذرت کر لی کہ نازو کی کوئی تصویر میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ نازو کو کوئی چہرہ بھی دے سکتے ہیں۔ یوں اسے گلنار کا چہرہ ملا۔ ہوش میں آکر اس نے بڑا واویلا کیا کہ اس سے اس کی شناخت چھین لی گئی ہے۔ اسی کیفیت میں میں نے پہلی بار اس کے منہ سے تمھارا نام سنا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ اس طرح وہ خطرات سے محفوظ ہو گئی ہے۔ پھر میں نے اس کا نام بھی بدل دیا۔ میں اسے اپنے پاس بھی نہیں رکھنا چاہتی تھی کیونکہ عابد حسین کی بیوی ہونے کی وجہ سے میں تنظیم والوں کی نظروں میں یقیناً ہوں گی۔ کسی بھی طرح انھیں شک ہو سکتا تھا اور میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ اب صرف ایک ہی صورت تھی کہ اسے اس کی خالہ کے گھر چھوڑ دوں، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی..." وہ کہتے کہتے رُک گئیں۔ ان کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ معاملات کا یہ رخ میرے سامنے لانا نہیں چاہتیں... اور گلنار... بلکہ نازو کی غزل سرائی سے بھی بے خبر ہیں۔

"خیر... یہ مسئلہ یوں حل ہوا کہ گلنار کو ایئر ہوسٹس کی جاب مل گئی۔ عموماً ہفتے میں وہ ایک یا دو بار گھر آتی تھی۔"

"لیکن آنٹی وہ مجھے تو بتا سکتی تھی۔ میں دیوانوں کی طرح اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ وہ مجھے بتا دیتی تو کیا میں تنظیم والوں کو اس کی حقیقت بتا دیتا؟" مجھے یقین ہے کہ میرا لہجہ تلخ ہو گیا ہو گا۔

"وہ شروع ہی سے کچھ خبطی رہی ہے۔" آنٹی نے جواب دیا۔ "یہ بات تم اسی سے پوچھنا۔ اسی نے تو مجھے بھی مجبور کر دیا تھا۔"

"آنٹی... ایک وعدہ آپ کو مجھ سے بھی کرنا ہو گا۔" میں نے کہا۔

وہ استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھتی رہیں۔ منہ سے کچھ نہ بولیں۔

"آپ گلنار کو... میرا مطلب ہے نازو کو کچھ نہیں بتائیں گی۔ یہ ذمے داری آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اس نے بھی مجھے بہت تنگ کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹے۔"

"چلیے... اب آپ آرام کریں۔"

میں نے انھیں ان کے کمرے میں چھوڑا اور استاد کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ استاد نے دروازہ کھولا۔ "تم سے رہا نہیں گیا برخوردار۔ صبح کا انتظار نہیں کر سکتے تھے؟"

"صبح تک تو میں دھماکے سے پھٹ جاتا استاد۔ بڑی دھماکا خیز خبر ہے۔"

"خیر، اس کا اندازہ تو تمھارے چہرے ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔"

میں نے استاد کو ہر بات بتا دی۔ وہ سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔

"واہ برخوردار... بہو تو ہمیں بیٹے کی ٹکر کی ملی ہے۔" سب کچھ سن کر انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ٹکر کی! بیٹے سے بارہ ہاتھ آگے ہے بہو۔"

"خوب چہک رہے ہو۔ لگتا ہے، آج چین سے سو سکو گے۔"

"ہرگز نہیں... صبح تو تمھاری بہو کے ساتھ فائنل ہو گا۔"

"میرے لائق کوئی خدمت؟"

"جی ہاں۔ میں نازو کو لے کر باہر جاؤں گا۔ ریشماں بھی ہمارے ساتھ جانا چاہے گی۔ اسے روکنا آپ کی ذمے داری رہی۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔" استاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب جاؤ... اگر چین سے سو نہیں سکتے، تو دوسروں کو تو مت جگاؤ۔"

میں استاد کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ گلنار کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ شاید وہ پُرسکون نیند سو رہی تھی۔

میری وہ رات کروٹیں بدلتے کٹی۔ نیند تھوڑی بہت آئی بھی تو جھپکیوں کی صورت میں۔ صبح سویرے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ تیار ہو کر باہر نکلا تو سات بجے تھے۔ ریشماں بیدار ہو چکی تھی اور کچن میں کھٹر پٹر کر رہی تھی۔ میں بھی کچن میں جا گھسا۔

"کیا بات ہے بھائی جان! رات کا کھانا نہیں کھایا تھا کیا؟"

"کھانا تو خوب ڈٹ کر کھایا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ آج دیکھا جائے کہ کون کس وقت اٹھتا ہے۔ وہ تمھاری باجی تو دس بجے سو کر اٹھتی ہوگی۔"

"جی نہیں، وہ اس وقت قرآن شریف کی تلاوت کر رہی ہوں گی۔"

"ایسی لگتی تو نہیں۔ میرا خیال ہے کہ دس بجے سے

پہلے وہ سو کر اٹھتی ہی نہیں ہوگی۔ گیارہ بجے ناشتہ کرتی ہوگی۔ دوپہر کا کھانا شام چھ بجے اور رات کا کھانا..."

"جی نہیں... وہ تو..." ریشماں نے میری بات کاٹ دی لیکن پھر وہ ٹھٹک گئی۔ "آپ سن رہی ہیں نا باجی۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ گلنار کچن کے دروازے پر کھڑی تھی۔ "ہوں... تو یہ حرکتیں ہو رہی ہیں صبح صبح..." اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ "ویسے میں واقعی دس بجے سو کر اٹھتی ہوں۔"

"تب پھر میرا کام کیسے چلے گا؟"

"اس میں تمھارا کیا نقصان ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔" میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ میرا دل خالی رہ جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"تم نے وہ مقولہ نہیں سنا۔ کسی دانش مند نے کہا ہے کہ مرد کے دل کا راستہ معدے سے گزرتا ہے۔ معدہ خالی! دل بھی خالی۔"

وہ جھینپ گئی۔ "میں دیکھ رہی ہوں کہ تم فضول باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہو۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے عرصۂ بحران میں ملی تھیں۔ میرے جوہر تو اب کھلیں گے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟"

"اچھا بس، کچن سے نکلو۔ یہاں تمھارا کوئی کام نہیں۔"

"کام ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "میں اپنے دفاع کی تربیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ صرف تمھارے رحم و کرم پر رہا تو گزر جاؤں گا۔ اسی لیے سوچا ہے کہ اپنی بقا کے لیے کھانا پکانا

بھی سیکھ لوں گی۔"

اس بار اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں فہمائش تھی۔ پھر اس نے مجھے دھکیل کر کچن سے نکال دیا۔ میں باہر آیا اور استاد کے کمرے کی طرف چل دیا۔ لیکن استاد مجھے راستے ہی میں مل گئے۔ میں انھیں لے کر اندر چلا آیا۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد آنٹی بھی آگئیں۔ وہ استاد سے بڑے پُرتپاک انداز میں باتیں کرتی رہیں اور میں بور ہوتا رہا۔ میں بہت بے چین تھا۔ گلنار سے تفصیلی گفتگو کے لیے تڑپ رہا تھا۔

پھر نصرت خالہ نے ناشتہ لگایا۔ گلنار اور ریشماں بھی شریک ہوگئیں۔

"امی... آج آپ بہت خوش نظر آرہی ہیں۔" گلنار نے اپنی امی سے پوچھا۔

"صرف نظر نہیں آرہی بلکہ خوش ہوں۔" انھوں نے جواب دیا۔

"کوئی خاص بات ہے؟"

"ارے... بھائی صاحب گھر آئے ہیں اور بھائی گھر آئیں تو خوشی ہی لاتے ہیں۔" آنٹی نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ناشتے کے بعد آنٹی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"اچھا، اب تیار ہو جاؤ۔ میرا بڑا زوردار پروگرام ہے آج۔" میں نے اعلان کیا۔

"ابھی لیجیے۔" ریشماں چہکی۔

"کوئی خاص پروگرام ہے کیا؟" استاد محترم نے پوچھا۔

"یہاں ہر پروگرام خاص پروگرام ہوتا ہے بابا... آپ بھی چلیں گے۔"

"نہیں بیٹا، میں تو بہت تھکا ہوا ہوں۔ بس باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔" استاد نے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں، پروگرام کینسل۔" ریشماں نے فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔

"نہیں... یہ بات مجھے پسند نہیں آئے گی۔"

"تو پھر ایسا کریں۔ میں نہیں جاتی۔ میں آپ کے ساتھ باتیں کروں گی۔ پھر ہم شام کو سیر کو چلیں گے۔"

گلنار نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ "یہ پروگرام بنانے کا کون سا موقع ہے۔ بابا کے ساتھ ہی چلیں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے بے حد معصومیت سے کہا۔ "میں تو بغیر سوچے سمجھے کہہ گیا تھا۔ معافی چاہتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔ اب اپنا پروگرام کینسل کرو گے تو میں تم لوگوں سے ناراض ہو جاؤں گا۔" استاد نے کہا۔ "بس میرے کان کھانے کے لیے میری بٹیا ہی کافی ہے۔"

اس پر استاد کی بٹیا نے انھیں گھور کر دیکھا۔ استاد اسے منانے میں مصروف ہوگئے۔

"نہیں استاد، واقعی کچھ اچھا نہیں لگتا کہ..."

"بکو مت۔" استاد نے گرج کر کہا۔ "ورنہ تم میرا غصہ جانتے ہو۔" ان کا چہرہ سچ مچ سرخ ہو گیا۔ وہ غضب کی اداکاری کر رہے تھے۔

میں نے بے بسی سے گلنار کی طرف دیکھا اور باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ خاصی حجت کے بعد میں نے اسے باہر چلنے پر رضامند کیا۔

"کہاں چلیں گے؟" اس نے کار میں بیٹھتے ہی پہلا سوال کیا۔

"دیکھتی رہو۔" میں نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ وہ مجھے کریدتی رہی۔ لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ کلفٹن پہنچ کر میں نے کار روک دی۔ اس نے اترنا چاہا مگر میں نے اسے روک دیا۔ "ہم کار ہی میں بیٹھیں گے۔"

"لیکن کیوں؟"

"میری مرضی۔"

"کیا مصیبت ہے؟" اس نے جھنجھلا کر کہا۔ "اتنے پُراسرار کیوں ہو رہے ہو؟"

"تم سے تو کم ہی ہوں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمھیں یاد نہیں، میں نے کہا تھا نا کہ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"تو کرو۔" وہ میری طرف رُخ کر کے بیٹھ گئی۔

"میں تمھیں ایک خوش خبری سناتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمھاری دعائیں رنگ لائیں۔ بالآخر مجھے تازو مل گئی۔"

اس کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ "کک... کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"ریشماں سے کچھ بات ہوئی ہے کیا؟"

"نہیں۔ ریشماں زبان کی بہت پکی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "آنٹی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے نا"

نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور سسکنے
ں نے ایسا کیوں کیا؟" وہ بڑبڑائی۔
ب کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں رہی تھا
مطلب؟" اس نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا ہوا
ا اور حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔
ہو، میرے پاس بہت سی خبریں ہیں مگر پہلے
چھ پوچھنا ہے۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم نے مجھ سے اس
خبر کیوں رکھا کہ تم ہی نازو ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ
لاش میں میری معاونت کرتی رہیں۔ آخر کیوں؟"
تانا ضروری ہے؟"
ت ضروری ہے۔"
کی حیثیت سے میں نے تمھیں بہت نہیں دیکھا
نے نظریں جھکاتے ہوئے شرمیلے لہجے میں کہا۔
سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ پھر بالاخانے
لاقات ہوئی۔ اس وقت میں گلنار تھی۔ میں نے
ں بتا دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ تمھیں پرکھنے
چھا موقع ملا ہے۔ ظاہر ہے، تم نے مجھے طوائف
سے جانتے تھے... اور طوائفوں کا احترام کون
س کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ یوں مجھے تمھیں قریب
ا موقع ملا۔ تمھارا باطن مجھ پر پوری طرح سے
... اور وہ باطن تمھارے ظاہر سے کہیں زیادہ
تھا۔ مجھے فخر ہے کہ تم عورت کو طوائف کے
ی کھلونا نہیں سمجھتے۔"
کے بعد تو تم بتا سکتی تھیں۔" میں نے اعتراض

میری بات پوری نہیں ہوئی ہے۔ نازو کی تلاش
ے ساتھ رہی۔ اس طرح میں تنظیم سے باخبر
یونکہ میں تنظیم کو جڑ سے اکھاڑنا چاہتی تھی۔
ڈائریوں سے محروم ہو گئی تھی جن میں میں نے
ق معلومات اکٹھا کی تھیں۔ وہ ڈائریاں پرس
یک اچکا میرا پرس لے اڑا تھا۔ بہرحال چوہدری
مجھتا تھا کہ ڈائریاں میرے پاس ہی ہیں...
پہچاننے کے بعد میرا جی چاہا کہ تمھیں بتا
کی جستجو میں تم پھر رہے ہو وہ میں ہی ہوں
بھی تھا کہ تم اسے نازو کی طرف سے توجہ
ہٹا لو گے اور میری بات پر یقین نہیں کرو

گے۔ دوسری طرف مجھے اس آنکھ مچولی میں لطف آنے لگا تھا۔"
"بس مجھے ایک بات کی وضاحت اور درکار ہے۔"
میں نے کہا۔ "گلنار بننے کے بعد کیا ضروری تھا کہ تم بازار میں بیٹھو؟"
"اگر میں یہ وضاحت نہ کرنا چاہوں تو؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔
"تو میں اصرار نہیں کروں گا۔"
"اور... اور مجھے چھوڑ جاؤ گے؟" اس نے یاس انگیز لہجے میں کہا۔
"پاگل ہوئی ہو؟" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ میں تو گلنار کے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ اب اس اعتبار سے مطمئن ہوں کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ نازو اور گلنار ایک ہی ہیں اور ایک دوسرے کو قبول بھی کر لیں گی۔"
"خدا کا شکر ہے۔" اس نے طمانیت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ ویسے میں اس بات کی وضاحت ضرور کروں گی۔ کیونکہ اس کے بغیر میرے دل پر سے بوجھ نہیں ہٹے گا۔ تم نے میری ڈائری پڑھی ہے نا؟"
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"تمھیں اندازہ ہو گا کہ میں ابو کے کاروبار کی وجہ سے خود کو حقیر سمجھنے لگی تھی۔ پھر ابو اور امی کے درمیان جھگڑا اور علیحدگی... اس کے علاوہ امی کا یہ کہنا کہ ابو کی کمائی طوائف کی کمائی سے بدتر ہے۔ ان تمام چیزوں نے مجھ پر بے حد منفی اثرات مرتب کیے تھے۔ پھر مجھ پر تیزاب پھینکا گیا۔ مجھے ایک عذاب سے گزرنا پڑا۔ پلاسٹک سرجری کے عمل سے گزری۔ ہوش میں آئی تو معلوم ہوا کہ میں اپنا چہرہ... اپنی شناخت کھو چکی ہوں۔ وہ دور میرے لیے اذیتوں کا دور تھا۔ میں نے ہر طرح کی اذیتیں سہیں... ذہنی بھی اور جسمانی بھی۔ اب سوچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان دنوں ایب نارمل ہو گئی تھی۔ میری ذہنی حالت بہت ابتر تھی۔ مجھے وہ نیا چہرہ قبول نہیں تھا۔ وہ مجھ پر تھوپ دیا گیا تھا۔ شاید میں اس چہرے کو ذلیل کرنا چاہتی تھی۔ میں اسپتال سے خالہ کے گھر پہنچی۔ انھوں نے مجھے گنگناتے سنا تو میری حوصلہ افزائی کی۔ مجھے گانے کی تربیت دی گئی۔ میں اداکاری کرتی رہی تھی۔ میں نے آواز اور لہجہ بھی بدل لیا۔ خالہ بچپن ہی سے اغوا کر لی گئی تھیں۔ بعد میں خاندان والوں نے انھیں قبول نہیں کیا تھا۔ مجھے خالہ پر ترس بھی آتا تھا اور میں ان سے محبت بھی کرتی تھی۔ ان دنوں میں غور بھی کرتی رہی۔ خالہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ بالاخانوں پر فلم انڈسٹری کے لوگ بکثرت آتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ فلمساز شاہ جی، جو مجھے اپنی فلم میں کام کرنے پر مجبور کر رہا تھا، چوہدری رحمت کا کارندہ ہے۔ میں نے سوچا بالاخانے پر بیٹھ کر ممکن ہے، شاہ جی سے ملاقات ہو جائے اور میں چوہدری رحمت کے متعلق باخبر رہ سکوں۔ ویسے بھی ان دنوں میری کیفیت اور قوتِ فیصلہ کچھ اچھی نہیں تھی۔ میں نے خالہ سے بات کی۔ وہ بہت خفا ہوئیں، لیکن میں نے اپنی وضاحتوں سے انھیں قائل کر لیا۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ وہ چہرہ گلنار کا تھا، جس کی پیشانی پر تم نے طوائف کی مہر لگا دی۔ لیکن میں نے اس جسم کی آبرو ہمیشہ عزیز رکھی جو نازو کا تھا۔ میں نے اپنی روح کی پاکیزگی کی ہمیشہ حفاظت کی۔ میں نے خود کو غزل سرائی کی حد تک محدود رکھا۔ رقص تک گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ مقام میرے لیے ایک چیلنج تھا۔ پہلے ہی روز مجھے ایک چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ نواب خان بدتمیزی پر اتر آیا۔ خالہ نے میری عافیت کا بندوبست کیا۔ شاہ جی، جس کی آمد کا مجھے یقین تھا، وہاں نہ آیا لیکن تم نہ آ گئے، جس سے میں نے اپنی جگہ ملنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا... اس وقت مجھے بالاخانے پر بیٹھتے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔ بس یہ ہے کل کہانی۔ اس کے بعد کی تمام باتیں تم پہلے ہی جانتے ہو۔"
وہ بہت افسردہ اور ملول نظر آ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ "کیا ہوا... اتنی افسردہ کیوں ہو گئیں؟" میں نے پوچھا۔
"کچھ یونہی... سوچتی ہوں، وقت بھی کیا کیا تماشے دکھاتا ہے۔ میں اپنے ابو کی وجہ سے اپنی نظروں سے ایسے گری تھی کہ خود ذلتیں اوڑھنے پر تل گئی تھی۔ اب پچھتا رہی ہوں... ایک امی ہیں کہ انھوں نے خالہ سے کسی قسم کی مدد نہ لی۔ وہ اپنے ذاتی زیور لائی تھیں۔ انھیں بیچ کر مکان خریدا اور زندگی بسر کرتی رہیں۔ لیکن ابو کو سزا دینے کے لیے انھوں نے یہی تاثر دیا جیسے خدانخواستہ وہ خالہ پر انحصار کر رہی ہوں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ابو اس طرح راہِ راست پر آ جائیں گے۔"
"اچھا... بس اب یوں سوچنے اور افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے پیار سے اسے ڈانٹا۔ "چلو اب ہنس دو۔"
وہ بجھی بجھی سی مسکراہٹ سے آگے نہ بڑھ سکی۔
"اب میں تمھیں خوش خبری سناؤں گا۔ دل تھام کر سنو۔" میں نے کہا۔ "چوہدری رحمت علی اور نادر حسین گرفتار ہو چکے ہیں۔ تنظیم کے بیشتر افراد ان کی نشان دہی کے نتیجے میں پکڑے گئے ہیں۔ تنظیم عملاً ٹوٹ چکی ہے۔ وہ مردود شاہ جی بھی کیفرِ کردار تک پہنچ چکا ہے۔"
میں نے خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سکتے کے سے عالم میں بیٹھی تھی۔ میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ "کیا ہوا تمھیں۔ تم خوش نہیں ہوا! یہی تو چاہتی تھیں تم؟"
"مجھے یقین نہیں آ رہا۔"
"یقین کرو۔ یہ مصدقہ اطلاعات ہیں۔ ان سب لوگوں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلے گا۔ ان کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"
"اور ابو...؟" اس نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔
"انھیں اور دارا کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا ہے۔ کیس سے فارغ ہوتے ہی ہم انھیں یہاں بلا لیں گے۔ اب ہم یہیں رہیں گے۔"
اس کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ وہ بیک وقت ہنس بھی رہی اور رو بھی رہی تھی۔ میں اس کا ہاتھ تھپتھپاتا رہا۔ منہ سے کچھ نہیں بولا کہ جتنا جلدی غبار نکل جائے اچھا ہے۔ اسے نارمل ہونے میں کچھ دیر لگی۔ پھر وہ محبت آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ "اور تم... تم خوش ہو؟" اس نے پوچھا۔
"مجھ سے زیادہ خوش کون ہو گا۔"
"تم کس خوشی میں خوش ہو؟" اس بار اس کے لہجے میں شوخی تھی۔
"پہلے یہ بتاؤ، تم مجھ سے شادی کرو گی؟"
"یہ درخواست تم کس سے کر رہے ہو؟"
"یہ درخواست میں دو بار کروں گا... پہلے گلنار سے اور پھر نازو سے۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے گلنار سے تو میں پہلے بھی پوچھ چکا ہوں، اسے نازو کی شراکت پر کوئی اعتراض نہیں۔"
"تم گلنار کو بھول نہیں سکتے؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا اور سسکنے لگی۔ "انھوں نے ایسا کیوں کیا؟" وہ بڑبڑائی۔

"اب کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں رہی۔"

"کیا مطلب؟" اس نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا اور حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"دیکھو، میرے پاس بہت سی خبریں ہیں مگر پہلے مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے اس راز سے بے خبر کیوں رکھا کہ تم ہی نازو ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ تم نازو کی تلاش میں میری معاونت کرتی رہیں۔ آخر کیوں؟"

"یہ بتانا ضروری ہے؟"

"بہت ضروری ہے۔"

"نازو کی حیثیت سے میں نے تمھیں بہت نہیں دیکھا تھا۔" اس نے نظریں جھکاتے ہوئے شرمیلے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں تم سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ پھر بالاخانے میں تم سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت میں گلنار تھی۔ میں نے سوچا کہ تمھیں بتا دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ تمھیں پرکھنے کا یہ بہت اچھا موقع ملا ہے۔ ظاہر ہے، تم مجھے طوائف کی حیثیت سے جانتے تھے۔۔۔ اور طوائفوں کا احترام کون کرتا ہے؟" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "یوں مجھے تمھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ تمھارا باطن مجھ پر پوری طرح سے عیاں ہو گیا۔۔۔ اور وہ باطن تمھارے ظاہر سے کہیں زیادہ خوب صورت تھا۔ مجھے فخر ہے کہ تم عورت کو طوائف کے روپ میں بھی کھلونا نہیں سمجھتے۔"

"اس کے بعد تو تم بتا سکتی تھیں۔" میں نے اعتراض کیا۔

"ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی ہے۔ نازو کی تلاش میں بھی تمھارے ساتھ رہی۔ اس طرح میں تنظیم سے باخبر رہ سکتی تھی کیونکہ میں تنظیم کو جڑ سے اکھاڑنا چاہتی تھی۔ لیکن میں ان ڈائریوں سے محروم ہو گئی تھی جن میں، میں نے تنظیم کے متعلق معلومات اکٹھا کی تھیں۔ وہ ڈائریاں پرس میں رکھی تھیں اور ایک اچکا میرا پرس لے اڑا تھا۔ بہرحال چوہدری کرامت کو یہی سمجھتا تھا کہ ڈائریاں میرے پاس رہی ہیں۔۔۔ تمھیں پوری طرح پہچاننے کے بعد میرا جی چاہا کہ تمھیں بتا دوں کہ جس نازو کی جستجو میں تم پھر رہے ہو، وہ میں ہی ہوں لیکن یہ امکان بھی تھا کہ تم اسے نازو کی طرف سے توجہ ہٹانے کا حربہ سمجھو گے اور میری بات پر یقین نہیں کرو

گے۔ دوسری طرف مجھے اس آنکھ مچولی میں لطف آنے لگا تھا۔"

"بس مجھے ایک بات کی وضاحت اور درکار ہے۔" میں نے کہا۔ "گلنار بننے کے بعد کیا ضروری تھا کہ تم بازار میں بیٹھو؟"

"اگر میں یہ وضاحت نہ کرنا چاہوں تو؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"تو میں اصرار نہیں کروں گا۔"

"اور۔۔۔ اور مجھے چھوڑ جاؤ گے؟" اس نے یاس انگیز لہجے میں کہا۔

"پاگل ہوئی ہو؟" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ میں تو گلنار کے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ اب اس اعتبار سے مطمئن ہوں کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ نازو اور گلنار ایک ہی ہیں اور ایک دوسرے کو قبول بھی کر لیں گی۔"

"خدا کا شکر ہے۔" اس نے طمانیت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ ویسے میں اس بات کی وضاحت ضرور کروں گی کیونکہ اس کے بغیر میرے دل پر سے بوجھ نہیں ہٹے گا۔ تم نے میری ڈائری پڑھی ہے نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمھیں اندازہ ہو گا کہ میں ابو کے کاروبار کی وجہ سے خود کو حقیر سمجھنے لگی تھی۔ پھر ابو اور امی کے درمیان جھگڑا اور علیحدگی۔۔۔ اس کے علاوہ امی کا یہ کہنا کہ ابو کی کمائی طوائف کی کمائی سے بدتر ہے۔ ان تمام چیزوں نے مجھ پر بے حد منفی اثرات مرتب کیے تھے۔ پھر مجھ پر تیزاب پھینکا گیا۔ مجھے ایک عذاب سے گزرنا پڑا۔ پلاسٹک سرجری کے عمل سے گزری۔ ہوش میں آئی تو معلوم ہوا کہ میں اپنا چہرہ۔۔۔ اپنی شناخت کھو چکی ہوں۔ وہ دور میرے لیے اذیتوں کا دور تھا۔ میں نے ہر طرح کی اذیتیں سہیں۔۔۔ ذہنی بھی اور جسمانی بھی۔ اب سوچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان دنوں ایب نارمل ہو گئی تھی۔ میری ذہنی حالت بہت ابتر تھی۔ مجھے وہ نیا چہرہ قبول نہیں تھا۔ وہ مجھ پر تھوپ دیا گیا تھا۔ شاید میں اس چہرے کو ذلیل کرنا چاہتی تھی۔ میں اسپتال سے خالہ کے گھر پہنچی۔ انھوں نے مجھے گنگناتے سنا تو میری حوصلہ افزائی کی۔ مجھے گانے کی تربیت دی۔ میں اداکاری کرتی رہی تھی۔ میں نے آواز اور لہجہ بھی بدل لیا۔ خالہ بچپن ہی سے اغوا کر لی گئی تھیں۔ بعد میں خاندان

والوں نے انھیں قبول نہیں کیا تھا۔ مجھے خالہ پر ترس بھی آتا تھا اور میں ان سے محبت بھی کرتی تھی۔ ان دنوں میں غور بھی کرتی رہی۔ خالہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ بالاخانوں پر فلم انڈسٹری کے لوگ بکثرت آتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ فلمساز شاہ جی، جو مجھے اپنی فلم میں کام کرنے پر مجبور کر رہا تھا، چوہدری رحمت کا کارندہ ہے۔ میں نے سوچا بالاخانے پر بیٹھ کر ممکن ہے، شاہ جی سے ملاقات ہو جائے اور میں چوہدری رحمت کے متعلق باخبر رہ سکوں۔ ویسے بھی ان دنوں میری کیفیت اور قوت فیصلہ کچھ اچھی نہیں تھی۔ میں نے خالہ سے بات کی۔ وہ بہت خفا ہوئیں، لیکن میں نے اپنی وضاحتوں سے انھیں قائل کر لیا۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ وہ چہرہ گلنار کا تھا، جس کی پیشانی پر تم نے طوائف کی مہر لگا دی۔ لیکن میں نے اس جسم کی آبرو ہمیشہ عزیز رکھی جو نازو کا تھا۔ میں نے اپنی روح کی پاکیزگی کی ہمیشہ حفاظت کی۔ میں نے خود کو غزل سرائی کی حد تک محدود رکھا۔ رقص تک گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ مقام میرے لیے ایک چیلنج تھا۔ پہلے ہی روز مجھے ایک چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ نواب خان بدتمیزی پر اتر آیا۔ خالہ نے میری عافیت کا بندوبست کیا۔ شاہ جی، جس کی آمد کا مجھے یقین تھا، وہاں نہ آیا لیکن تم نہ آ گئے، جس سے میں نے اپنی جگہ ملنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔۔۔ اس وقت مجھے بالاخانے پر بیٹھتے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔ بس یہ ہے کل کہانی۔ اس کے بعد کی تمام باتیں تم پہلے ہی جانتے ہو۔"

وہ بہت افسردہ اور ملول نظر آ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ "کیا ہوا۔۔۔ اتنی افسردہ کیوں ہو گئیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس یونہی۔۔۔ سوچتی ہوں، وقت بھی کیا کیا تماشے دکھاتا ہے۔ میں اپنے ابو کی وجہ سے اپنی نظروں سے گری تھی کہ خود ذلتیں اوڑھنے پر تل گئی تھی۔ اب پچھتا رہی ہوں۔۔۔ ایک امی ہیں کہ انھوں نے خالہ سے کسی قسم کی مدد لی۔ وہ اپنے ذاتی زیور لائی تھیں۔ انھیں بیچ کر مکان خریدا اور زندگی بسر کرتی رہیں۔ لیکن ابو کو سزا دینے کے لیے انھوں نے یہی تاثر دیا جیسے خدانخواستہ وہ خالہ کا [illegible] کر رہی ہوں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ابو اس طرح راہ راست پر آ جائیں گے۔"

"اچھا۔۔۔ بس اب یوں سوچنے اور افسردہ ہونے کی

ضرورت نہیں۔" میں نے پیار سے اُسے ڈانٹا۔ "چلو اب ہنس دو۔"

وہ بجھی بجھی سی مسکراہٹ سے آگے نہ بڑھ سکی۔

"اب میں تمھیں خوش خبری سناؤں گا۔ دل تھام کر سنو۔" میں نے کہا۔ "چوہدری رحمت علی اور نادر حسین گرفتار ہو چکے ہیں۔ تنظیم کے بیشتر افراد ان کی نشان دہی کے نتیجے میں پکڑے گئے ہیں۔ تنظیم عملاً ٹوٹ چکی ہے۔ وہ مردود شاہ جی بھی کیفرِ کردار تک پہنچ چکا ہے۔"

میں نے خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سکتے کے سے عالم میں بیٹھی تھی۔ میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ "کیا ہوا تمھیں۔ تم خوش نہیں ہو! یہی تو چاہتی تھیں تم؟"

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"یقین کرو۔ یہ مصدقہ اطلاعات ہیں۔ ان سب لوگوں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلے گا۔ ان کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

"اور ابو۔۔۔" اس نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"انھیں اور دارا کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا ہے۔ کیس سے فارغ ہوتے ہی ہم انھیں یہاں بلا لیں گے۔ اب ہم یہیں رہیں گے۔"

اس کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ وہ بیک وقت ہنس بھی رہی اور رو بھی رہی تھی۔ میں اس کا ہاتھ تھپتھپاتا رہا۔ منہ سے کچھ نہیں بولا کہ جتنا جلدی غبار نکل جائے اچھا ہے۔ اسے نارمل ہونے میں کچھ دیر لگی۔ پھر وہ محبت آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ "اور تم۔۔۔ تم خوش ہو؟" اس نے پوچھا۔

"مجھ سے زیادہ خوش کون ہو گا۔"

"تم کس خوشی میں خوش ہو؟" اس بار اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"پہلے یہ بتاؤ، تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"یہ درخواست تم کس سے کر رہے ہو؟"

"یہ درخواست میں دوبار کروں گا۔۔۔ پہلے گلنار سے اور پھر نازو سے۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے گلنار سے تو میں پہلے بھی پوچھ چکا ہوں، اسے نازو کی شراکت پر کوئی اعتراض نہیں۔"

"تم گلنار کو بھول نہیں سکتے؟"

"نہیں... یہ ممکن نہیں ہے"
"میرے نزدیک وہ قابلِ نفرت ہے"
"تم میری خوشی کا اندازہ نہیں کرسکتیں" میں نے
ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "مجھے گلنار اور نازو
ہی عزیز تھیں۔ میں ان دونوں میں سے کسی ایک
بھی دست بردار نہیں ہوسکتا تھا میرے لیے یہ
بڑا امتحان تھا۔ تم نے مجھے اس امتحان سے بچالیا
کرو۔ میں بہت خوش ہوں۔ اب بولو... مجھ سے
ی کروگی"
"تمھیں شرم نہیں آتی۔ یہ مجھ سے پوچھنے کی بات
" اس نے نظریں جھکا کر کہا "ویسے گلنار اب مجھے
عزیز ہے۔ اس لیے کہ تمھیں عزیز ہے۔ تم نے اس کا
م کیا... یہ تمھارا مجھ پر احسان ہے۔ لیکن اب کوئی
یں... کوئی خوف نہیں۔ میں نازو ہوں اور نازو ہی
چاہتی ہوں۔ میں اپنے اکاؤنٹ میں موجود تمام رقم
ست کے حوالے کردوں گی تاکہ اپنے ابّو کی پیشانی کا
دھوسکوں"
میں اسے پُرستائش نظروں سے دیکھتا رہا۔
ہم واپس چلے آئے۔ اس دن کے بعد گھر کی فضا بدل
اب ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ میں اپنے
وں کو بُلانا چاہتا تھا لیکن نازو کا اصرار تھا کہ وہ ان
امنے نازو ہی کے روپ میں آئے گی۔ اپنے ابّو کے سلسلے
ی اس کا یہی کہنا تھا۔ چنانچہ پلاسٹک سرجری کے
سلسٹ سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اسے نازو کی تصویر
ی گئی۔ کامیاب آپریشن کے بعد مجھے میری نازو مل
گلنار میرے تصوّر میں زندہ تھی۔ میری امی اور ابا
و بہت پسند آئی۔ اقبال تو اس کا دیوانہ ہی بن گیا
ی طرف ریشماں کی صورت میں ایک بہن بھی میسّر آ
ی جس کے لیے وہ ہمیشہ سے ترستا آیا تھا۔ عابد حسین
ب بھی کراچی آگئے تھے۔ وہ نازو اور اپنی بیگم سے
پشیمان تھے، لیکن وہ دونوں انھیں معاف کرچکی
۔ دارا کو بھی ہم نے کراچی بُلوا لیا تھا۔
ہم اب بھی کراچی میں مقیم ہیں... یعنی اسلم کے مکان
میں نے بھائی بن کر ریشماں کے لیے سوچا تھا اور
ھے پسند آیا تھا۔ ریشماں پہلے تو تیار نہیں ہوئی پھر
نے ایک شرط عاید کردی۔ میں اسلم کا کاروبار ایک

ٹرسٹ کے سپرد کرنا چاہتا تھا تاکہ پنجاب کی آبائی زمین
بیچ کر اپنے طور پر کچھ کرسکوں۔ ریشماں کا کہنا تھا کہ یہ ناسپاسی
ہوگی اور اسلم کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ اس نے اس
شرط پر دارا کو قبول کیا کہ میں اپنے ارادے سے باز رہوں
گا۔ چنانچہ کاروبار حسبِ معمول چل رہا ہے۔ ہم سب خوش
ہیں اور ایک کنبے کی طرح رہتے ہیں۔ استاد البتہ کوشش
کے باوجود نہیں رُکے۔ انھوں نے اپنی بِٹیا... میری بہن
ریشماں کی بھی ایک نہیں سُنی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے
مشن سے دست بردار نہیں ہوسکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ
ان کا مشن واقعی بہت بڑا ہے۔ وہ بہت بڑے آدمی
ہیں۔ البتہ مہینے دو مہینے میں وہ ہم لوگوں سے ملنے ضرور
آتے ہیں۔ کچھ دن ٹھہرتے ہیں اور پھر لاہور چلے جاتے ہیں۔
میرے دو بچے ہیں۔ بڑا لڑکا کمال ہے۔ لڑکی کا نام
میں نے گلنار رکھا ہے۔ ریشماں کی صرف ایک لڑکی ہے۔
میرے کمال سے ڈیڑھ سال چھوٹی۔ نازو بہت اچھی بیوی
ثابت ہوئی ہے۔ اس کا گلنار والا کمپلیکس بھی ختم ہوگیا
ہے۔ میں کبھی کبھی فرمائش کرتا ہوں اس غزل کی... ہے
یہ عالم تجھے بھلانے میں۔ اشک آتے ہیں مسکرانے میں۔ اب
وہ بلا جھجک میری فرمائش پوری کردیتی ہے۔
اسلم مجھے آج بھی بڑی شدت سے یاد آتا ہے۔ اس
کا بنگلا اس کی قربت کا احساس دلاتا ہے۔ بہت زیادہ
بے چین ہوجاؤں تو میں لان میں... گھاس پر لیٹ جاتا
ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے مجھے سینے
سے لگالیا ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے
مجھے اتنی خوشیاں دیں۔ اتنے پیارے... محبت کرنے
والے لوگ دیے۔ اب تو بچوں کی تربیت ہی میری زندگی
کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ میں مستقبل کی تعمیر کر رہا ہوں
انفرادی، اجتماعی مستقبل!

خَتم شُد

"نہیں... یہ ممکن نہیں ہے۔"

"میرے نزدیک وہ قابلِ نفرت ہے۔"

"تم میری خوشی کا اندازہ نہیں کرسکتیں۔" میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "مجھے گلنار اور نازو دونوں ہی عزیز تھیں۔ میں ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی دست بردار نہیں ہوسکتا تھا۔ میرے لیے یہ بہت بڑا امتحان تھا۔ تم نے مجھے اس امتحان سے بچا لیا۔ یقین کرو، میں بہت خوش ہوں۔ اب بولو... مجھ سے شادی کروگی؟"

"تمھیں شرم نہیں آتی۔ یہ مجھ سے پوچھنے کی بات ہے؟" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔ "ویسے گلنار اب مجھے بھی عزیز ہے۔ اس لیے کہ تمھیں عزیز ہے۔ تم نے اس کا احترام کیا... یہ تمھارا مجھ پر احسان ہے۔ لیکن اب کوئی ڈر نہیں... کوئی خوف نہیں۔ میں نازو ہوں اور نازو ہی رہنا چاہتی ہوں۔ میں اپنے اکاؤنٹ میں موجود تمام رقم حکومت کے حوالے کردوں گی تاکہ اپنے ابّو کی پیشانی کا داغ دھو سکوں۔"

میں اسے پُرستائش نظروں سے دیکھتا رہا۔

ہم واپس چلے آئے۔ اس دن کے بعد گھر کی فضا بدل گئی۔ اب ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ میں اپنے گھر والوں کو بُلانا چاہتا تھا لیکن نازو کا اصرار تھا کہ وہ ان کے سامنے نازو ہی کے روپ میں آئے گی۔ اپنے ابّو کے سلسلے میں بھی اس کا یہی کہنا تھا۔ چنانچہ پلاسٹک سرجری کے اسپیشلسٹ سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اسے نازو کی تصویر فراہم کی گئی۔ کامیاب آپریشن کے بعد مجھے میری نازو مل گئی۔ گلنار میرے تصوّر میں زندہ تھی۔ میری امّی اور ابا کو نازو بہت پسند آئی۔ اقبال تو اس کا دیوانہ ہی بن گیا۔ دوسری طرف ریشماں کی صورت میں ایک بہن بھی میسّر آ گئی تھی جس کے لیے وہ ہمیشہ سے ترستا آیا تھا۔ عابد حسین صاحب بھی کراچی آ گئے تھے۔ وہ نازو اور اپنی بیگم سے بہت پشیمان تھے، لیکن وہ دونوں انھیں معاف کرچکی تھیں۔ دارا کو بھی ہم نے کراچی بُلوا لیا تھا۔

ہم اب بھی کراچی میں مقیم ہیں... یعنی اسلم کے مکان میں۔ میں نے بھائی بن کر ریشماں کے لیے سوچا تھا اور دارا مجھے پسند آیا تھا۔ ریشماں پہلے تو تیار نہیں ہوئی پھر اس نے ایک شرط عاید کردی۔ میں اسلم کا کاروبار ایک ٹرسٹ کے سپرد کرنا چاہتا تھا تاکہ پنجاب کی آبائی زمین بیچ کر اپنے طور پر کچھ کرسکوں۔ ریشماں کا کہنا تھا کہ یہ ناسپاسی ہوگی اور اسلم کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ اس نے اس شرط پر دارا کو قبول کیا کہ میں اپنے ارادے سے باز رہوں گا۔ چنانچہ کاروبار حسبِ معمول چل رہا ہے۔ ہم سب خوش ہیں اور ایک کنبے کی طرح رہتے ہیں۔ استاد البتہ کوشش کے باوجود نہیں رُکے۔ انھوں نے اپنی بٹیا... میری بہن ریشماں کی بھی ایک نہیں سُنی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے مشن سے دست بردار نہیں ہوسکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا مشن واقعی بہت بڑا ہے۔ وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ البتہ مہینے دو مہینے میں وہ ہم لوگوں سے ملنے ضرور آتے ہیں۔ کچھ دن ٹھہرتے ہیں اور پھر لاہور چلے جاتے ہیں۔

میرے دو بچے ہیں۔ بڑا لڑکا کمال ہے۔ لڑکی کا نام میں نے گلنار رکھا ہے۔ ریشماں کی صرف ایک لڑکی ہے۔ میرے کمال سے ڈیڑھ سال چھوٹی۔ نازو بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی ہے۔ اس کا گلنار والا کمپلیکس بھی ختم ہوگیا ہے۔ میں کبھی کبھی فرمائش کرتا ہوں اس غزل کی... ہے یہ عالم تجھے بھلانے میں۔ اشک آتے ہیں مسکرانے میں۔ اب وہ بلا جھجک میری فرمائش پوری کردیتی ہے۔

اسلم مجھے آج بھی بڑی شدت سے یاد آتا ہے۔ اس کا بنگلا اس کی قربت کا احساس دلاتا ہے۔ بہت زیادہ بے چین ہو جاؤں تو میں لان میں... گھاس پر لیٹ جاتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے مجھے سینے سے لگا لیا ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اتنی خوشیاں دیں۔ اتنے پیارے... محبت کرنے والے لوگ دیے۔ اب تو بچوں کی تربیت ہی میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ میں مستقبل کی تعمیر کر رہا ہوں۔ انفرادی، اجتماعی مستقبل!

ختم شد